گھڑ بھی لی تو ہزاروں توجیہات میں ایک اور سہی۔

"شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا"

وہ ادب بھی جو براہ راست مذہب سے تعلق نہیں رکھتا، لیکن کسی ادبی واسطے سے اسلامی معتقدات کی بنیاد پر جذباتی طور پر استوار کرتا ہے۔ اسلامی ادب کے زمرے میں شمار ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم حمد، نعت، یا منقبت وغیرہ کو پیش کر سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے ادب کا دائرہ بہت محدود ہے اس میں زندگی کی وسعتوں یا رنگا رنگیوں کی جھلک نہیں ملتی اور ایسے ادب کو ہم صحیح معنوں میں زندگی کا ترجمان نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے ہم ادب کے لفظ کو جس مفہوم میں استعمال کرتے ہیں اس کی رنگا رنگ جلوہ آرائیوں سے اسے سروکار نہیں پھر یہاں بھی دقت پیش آتی ہے یعنی بہت سے عقیدے دوسروں کے جذباتی معتقدات سے میل نہ کھانے کے باعث ان کے نقطۂ نظر سے اسلامی نہیں رہتے۔ اس کے علاوہ اگر یہ ادب مرثیہ کی مانند کسی ایک فرقے کے مذہبی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے تو دوسرے فرقے کے لوگ اس کی ادبی یا شاعرانہ خوبیوں کی بنا پر تو متاثر ہو سکتے ہیں لیکن مذہبی اپیل کی بنیاد پر نہیں۔ پھر اسلامی ادب کی اس جذباتی تقسیم میں اگر ہم متصوفانہ شاعری کو بھی شامل کریں تو الجھن اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ بعض اسلامی مفکرین نے سرے سے ان رجحانات ہی کو الحاد و زندقہ سے تعبیر کیا ہے، یہی نہیں، تاریک کمرے میں کالی بلی کی تلاش کرنے والے بعض اوقات ایسی ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اسلامی ادب کے ایک نئے دعویدار جو خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہو گئے ہیں، ملک محمد جائسی کو پکا مسلمان صوفی مانتے ہوئے بھی اس کی تصنیف "پدماوت" کو اس لئے سولہ آنے اسلامی شاعری نہیں مانتے کہ اس کے یہاں ہندو دیو مالا اور اس کے تصورات کو کچھ اس نہج سے پیش کیا گیا ہے کہ ایک عام قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا چنانچہ اس دلیل کے مطابق محسن کاکوروی کی نعت کے یہ اشعار بھی غیر اسلامی ہی کہے جائیں گے۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

گھر میں اشنان کریں سرو قدان گوکل!

جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طول عمل

خبر اڑتی ہوئی آتی ہے مہابن سے ابھی

کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل

راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلیں

تار بارش کا جو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل

کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی

ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل

شاہد فکر ہے کھڑے سے اٹھائے گھونگھٹ

چشم کافر میں لگائے ہوئے کافر کاجل

ابھی پتہ نہیں کہ فکری تضاد کو منطق کے ترتیب سے چھپانے کی کوشش کیا کیا مضحک صورتیں اختیار کرے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی ادب کا یہ نظریہ مناظرانہ کٹ حجتی اور ملّایانہ تنگ نظری کا شکار ہے۔ لیکن وسیع النظری کا مشرب رکھنے والوں کے دعوے بھی کچھ قابل قبول نہیں وہ تمام اردو ادب کو اسلامی ادب قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں یہ کسی نہ کسی طرح اسلامیت کا پروپیگنڈہ کرتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اردو

صرف مسلمانوں کی زبان نہیں، یہاں تک کہ بادشاہوں کی مدح میں "قصائد" بادشاہوں کو اعلیٰ اسلامی اخلاق پر پورا اترتے ہوئے پیش کرونا کافی ہے جو لاکھ تاویلوں کے باوجود اکثر مسلمانوں کے گلے سے نیچے نہیں اتر سکتا۔

دیکھ ہاتھی پہ تجھ کو بولی خلق　　　　ہے تجلّیِ حق بہ کوہ طور!

دراصل اردو ادب میں جہاں جہاں شعائر اسلامی کی تضحیک کی گئی ہے یا کفر کو اسلام سے بلند تر درجہ دیا گیا ہے وہاں ہم اسے بھلے ہی تصوف کی اصطلاح کہہ لیں لیکن ان روایات و اصطلحات کو اسلامی ثابت کرنے کے لئے ہفت خواں طے کرنا پڑے گا۔

مذہبیت کے گہرے یا پُرکار شعور سے قطع نظر اس ادب کو بھی اسلامی ادب کہا جا سکتا ہے جس میں مسلمانوں کی سماجی یا سیاسی زندگی کے تقاضوں کو پیش کیا جائے۔ حالیؔ، شبلیؔ اور اکبرؔ کی شاعرانہ روایات ان ہی سماجی تقاضوں کی بنیاد پر استوار ہوئی ہیں۔ حالیؔ مسلمانوں کو شاندار ماضی کی یاد دلا کر ان کے ذہنی اور قومی زوال کا مرثیہ پڑھتے ہیں۔ شبلیؔ مسلمانوں کے مسائل کو ہندوستان کے مجموعی مسائل سے الگ نہیں سمجھتے اور انھیں صرف اسلام کی جمہوری روایات اپیل کرتی ہیں۔ اکبرؔ عقلی علوم اور مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے خوف زدہ ہیں کہ کہیں سنگ تہذیب پرانے عقاید کے شیشے کو پاش پاش نہ کر دے حقیقت یہ ہے کہ ان رجحانات کو مذہبی تصورات یا مابعد الطبیعات سے زیادہ مادی ضروریات کا پر تو سمجھنا چاہیے۔ سرسید کی تحریک نے مسلمانوں میں جس نئے تعلیم یافتہ طبقے کی نمو چاہی تھی۔ حالیؔ کی شاعری اس کے لئے مناسب ذہنی فضا تعمیر کرتی ہے لیکن اس طبقے کا ـــــ جس کی سرپرستی انگریزی سامراج نے کی تھی ـــــ جلد ہی وسائل کی کمی کی وجہ سے برطانوی مفاد سے تصادم ہو جاتا ہے۔ اس تصادم میں اسے ہندوستان کی جمہوری تحریکوں سے سہارا ملتا ہے۔ چنانچہ شبلیؔ کی شاعری مسلمانوں کے الگ تھلگ رہنے کی پالیسی کو مذموم قرار دیتی ہے اور انھیں ترقی پسند قوتوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے دیکھنا چاہتی ہے۔ اب تک اسلام کے قدیم دعویداروں یعنی علماء کا طبقہ انگریزی سیاست کا حریف رہا تھا کیونکہ جدید تہذیب کے ترقی پذیر عناصر میں انھیں اپنے وجود کے لئے خطرے کی گھنٹی سنائی دے رہی تھی۔ لیکن حالات کے بدلتے ہی برطانوی پالیسی بھی بدل گئی اور کل کے حریف آج کے حلیف بن گئے۔ ایک طرف برطانوی سیاست کو ذہنی بیداری سے خطرہ پیدا ہو چکا تھا اور دوسری جانب رجعت پسند مسلمان برطانوی استبداد کو قبول کر سکتا تھا لیکن جدید تہذیب کو نہیں۔ چنانچہ اکبرؔ کی شاعری میں ہمیں اسی مفاہمت کی جھلک ملتی ہے۔ جہاں وہ سرسید، گاندھی، کانگریس اور جنگ آزادی میں مسلمانوں کی شرکت کی مخالفت کرتے ہیں وہاں ریل، انجن، تار برقی اور بائسکل بھی ان کے طنز کے بے پناہ نشتروں کی زد میں ہیں۔ یہ بدلتے ہوئے رجحانات ایک مخصوص گروہ کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کے ترجمان ہیں۔ انھیں محض اسلامی قرار دینا تاریخ، سیاسیات و عمرانیات سے ناواقفیت کا ثبوت فراہم کرنا ہے۔ پھر یہ ادب اگر اسلام کے بنیادی عقاید کا ترجمان ہے تو اس اختلاف کے کیا اسباب ہیں۔ اس سوال کا جواب منطقی ہیتروں سے دینا بھی آسان نہیں! اور جہاں مابعد الطبیعات کے مسائل کو چھیڑا ہی نہ گیا ہو وہاں ان کی بنیاد پر کسی فرضی وحدت کی تعمیر، ذہنی انتشار کا بیّن ثبوت ہے۔

اسلامی ادب کی اس تقسیم میں سب سے اہم وہ شاخ ہے جس میں مذہب سے گہرے طور پر متاثر ہو کر اس کی روحانی اقدار کا پرچار کیا گیا ہو۔ اس لحاظ سے اقبالؔ کی شاعری اسلامی ادب کے دعویداروں کو تقویت پہنچاتی ہے۔ اقبالؔ کی صورت میں انھیں ایک بڑا ذہنی رہنما مل جاتا ہے۔ دراصل موجودہ نسل نے اسلام کو سمجھا ہی اقبالؔ کی تعلیمات کے ذریعے ہے اس لئے اسے ان کے افکار اور اسلام کے ابتدائی اصولوں میں کوئی اختلاف نظر نہیں آتا۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اقبالؔ نے اسلام سے گہرے طور پر متاثر ہو کر اپنی شاعری کے ذریعہ اس تاثر کا حد درجہ فنکارانہ اظہار کیا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر روحانی ہونے کے ساتھ ساتھ آفاقی بھی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعرانہ اثر پذیری و اثر آفرینی کے عمل میں مذہبی عقیدت کے دوش بدوش سماجی احساس کی کارفرمائی بھی ملتی ہے۔ اسی خلاقانہ امتزاج میں ان کی شاعری کی عظمت کا راز پنہاں ہے۔

لیکن اقبال نے مذہبی تجربے کو اس کے رسمی مفہوم میں استعمال نہیں کیا۔ مذہب کی ضرورت کا احساس بھی انھیں اس لئے ہوا کہ سرمایہ دارانہ استحصال نے انسانی اقدار کو پامال کر کے سماج میں لین دین کا جو رشتہ قائم کیا ہے وہ انسانی عظمت کے منافی ہے۔ اقبال انسانی عظمت کے علمبردار ہیں اس لئے وہ سرمایہ دارانہ نظام پر کاری ضرب لگاتے ہیں اور یہاں وہ ان تمام ترقی پسند قوتوں کے ہمنوا ہیں جو اس ناجائز استحصال کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ اگرچہ اقبال بھی افلاطون کی طرح کائنات کو بنیادی طور پر تصورات سے مرکب ملتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کی دنیا میں بھی خیالات کی بادشاہی نظر آتی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اقبال بڑی گہری نظر رکھتے ہیں اور عصر رواں کے فلسفیانہ رجحانات سے بخوبی آشنا ہیں۔ جس کے اثر سے ان کا فلسفہ خیال کی برتری تسلیم کر لینے کے باوجود جدید عصر کے عمل کے تقاضوں سے خالی نہیں۔ اقبال عمل کی غایت متعین کرنے میں ضرور خیال پرستی سے کام لیتے ہیں لیکن ان کے یہاں بھی ماحول اور فطرت کی تسخیر ہی عمل کے کارگر ہونے کی پہچان ہے وہ انسان کو ہنگامۂ موجود میں حصہ لیتے دیکھنا چاہتے ہیں اور اسے وارفتہ و معدوم رکھنا پسند نہیں کرتے۔ اسی لئے اقبال نے افلاطونی اعیان نامشہود کو مردود قرار دیا اور یونانی فکر کے اثر سے مسلمانوں میں جو مسلک گوسفندی آگیا تھا اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس کے علاوہ اقبال نے ہر لحظہ بدلتی ہوئی متحرک کائنات کا جو تصور پیش کیا وہ قدیم ٹھیری ہوئی کائنات کے تصور سے جن کی تخلیق مکمل ہو چکی ہے اور جس میں مطلق العنان خدا کی حکمرانی ہے، بہت کچھ مختلف ہے، ان کے یہاں انسان تخلیق کے عمل میں خدا کا شریک کار ہے اور خود خدا انسان کے ذریعہ ہی اپنی مشیت کی تکمیل کرتا ہے۔ تقدیر کا وہ پرانا تصور کہ "بے رضائے تو کے برگ نہ جنبد ز درخت" انسان کے تخلیقی عمل سے بدل جاتا ہے۔ اگرچہ اقبال نے زمانے کی کلیت سے اس کی فلسفیانہ توجیہ کی صورت نکالی ہے لیکن ہمارے لئے تقدیر کا یہ انقلابی تصور بھی کم نہیں کہ اس پھیلی ہوئی کائنات میں خارج سے عاید کئے ہوئے جبر کے بدلے وہ انسان کے لئے

"عزم او خلاق تقدیر حق است"

کی تفسیر بن جاتی ہے۔ اقبال کے نقطۂ نظر سے اس دگرگوں ہوتی ہوئی کائنات میں خدا کی مرضی پر راضی رہنا مستحسن نہیں ٹھیرتا بلکہ اپنی مرضی کے مطابق جدوجہد کرنا ہی برتر مذہبی قدر قرار پاتی ہے۔ اسی طرح ان کے یہاں اوامر و نواہی کا پابند خیر و شر کا وہ پرانا شرعی مفہوم باقی نہیں رہتا بلکہ ہر وہ چیز خیر ٹھیرتی ہے جو خودی کے استحکام میں مدد دے اور وہ چیز شر بن جاتی ہے جو اسے ضعیف کرے۔ قدیم اسلام میں خدا سے انکار ناقابل معافی جرم تھا لیکن اقبال کے پیش کردہ اسلام میں خودی سے انکار ناقابل معافی گناہ ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"منکر او اگر شدی منکر خویشتن مشو"

ان تصورات کے پیش نظر اقبال کے یہاں اسلام کا رسمی مفہوم باقی نہیں رہتا۔ اور وجدان کے رچاؤ سے انسان کا عمل ہی کفر و اسلام میں امتیازی خطوط کھینچتا ہے چنانچہ مرد مسلماں بھی کافر و زندیق ہو سکتا ہے اور کافر کے لئے مسلمان ہونا بھی کوئی حیرت انگیز امر نہیں۔ اسی طرح اقبال کے یہاں ایرانی "زروانیت" کی جھلک جاوید نامہ میں ملتی ہے جہاں زمان و مکاں کی روح "زرواں" شاعر سے مخاطب ہو کر کہتی ہے۔

من حیاتم من مماتم من نشور
من حساب و دوزخ و فردوس و حور

اقبال کی شاعری میں حیات بعد الموت کا معرکہ آرا مسئلہ بھی کہیں کہیں یقین کی سرحد چھوڑ کر امکانی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ عام مذہبی تصور کے بالکل برعکس ـــــ جس کے مطابق اس دنیا کے سارے اعمال کی غایت اس دنیا کی دوامی زندگی میں سزا یا جزا کا حصول ہے ـــــ اقبال دوسری زندگی کو مشروط قرار دیتے ہیں یعنی ہم اسے پا سکتے ہیں اگر حاصل کرنے میں تگ و دو کریں۔ گویا اب تک یہ دنیا مجاز تھی اور وہ دنیا حقیقت لیکن اقبال اس زندگی کو مشروط اور اس زندگی کو حقیقی قرار دیتے ہیں۔

دراصل اقبال کا خدا کا تصور بھی ان کے دائرۂ فکر کا اسیر ہے جس کا اعتراف وہ خود کرتے ہیں

تراشیدم صنم بر صورتِ خویش
بہ شکل خود خدا را نقش بستم
مرا از خود برون رفتن محال است
بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مذہب سے حاصل کردہ روحانی تاثر بھی ـــــ جو ادیب کی فکر و نظر کے حدود متعین کرتا ہے ـــــ دراصل اپنے ماحول کے اثرات کے تابع ہے اور خارجی بنیادوں سے الگ ہو کر اس کا تجزیہ ہم محض مذہبی معتقدات کی روشنی میں نہیں کر سکتے۔

ہم جانتے ہیں کہ ماضی کے تہذیبی رجحانات کی چھاؤں حال کے حریری پردوں سے اپنی جھلک دکھاتی رہتی ہے اور آرٹ کے متنوع پیرایوں میں جانے یا ان جانے طور پر رنگ رنگ کے تار بنتی رہتی ہے۔ انسانوں کی کوئی معاشرت ماضی کے عظیم تہذیبی ورثہ سے اپنا تعلق منقطع نہیں کر سکتی انسان پیدائش سے لے کر موت تک رسم و رواج کے پھیلے ہوئے سلسلوں میں گھرا رہتا ہے۔ کچھ چیزوں سے وہ بغاوت کر سکتا ہے لیکن اپنے ماحول کے تمام اثرات کو نظرانداز کر دینا ممکن نہیں۔ اگرچہ زندگی کی تغیر پذیر صلاحیتیں ان رسم و رواج کے سانچوں کو بھی نئی نئی صورتوں میں ڈھالتی رہتی ہیں چنانچہ اسلام نے بھی عرب سے لے کر ہندوستان تک ایک طویل تہذیبی مسافت طے کی ہے۔ یہ تہذیب بارہا دم لینے کے لئے راستے میں ٹھیری، اکثر مقامات کی دلکشیوں میں کھو گئی اور منزل پر پہنچ کر یہاں کی رنگ ریلیوں میں شریک ہو گئی ہے۔ اپنی موجودہ صورت میں ہم اسے اسلامی کی بجائے ہند اسلامی تہذیب کہہ سکتے ہیں۔ اس تہذیب کے اثرات اپنے ماحول کے سماجی تقاضوں سے مل جل کر ادیبوں کی ذہنی تخلیقات میں مارحریہ دورنگ بنتے ہیں۔ اردو ادب میں بھی ہمیں اس تہذیب کی چھاؤں مل سکتی ہے۔ لیکن ادیبوں کی ذہنی تخلیقات میں ان مؤثرات کو مذہبی یا مابعد الطبیعاتی عقائد کی جگہ اس مخصوص تہذیب کا پیداوار کہنا صحیح ہوگا۔

پاکستان کی تشکیل کے ساتھ البتہ حالات نے نئی کروٹ لی ہے اور اگر اس تاریخی حقیقت کی جھلک ہمارے ادب یا ہماری شاعری میں ملتی ہے تو یہ حقیقت نگاری کے خلاف نہیں۔ یہاں کے تہذیبی مسائل دوسرے ملکوں سے مختلف ہو سکتے ہیں اور ان ہی کی بنیادوں پر مستقبل کی تعمیر عمل میں آئے گی لیکن محض اس بنیاد پر ادب میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کا کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اس اختلاف کا تعلق مذہبی عقاید سے زیادہ اس سرزمین کے مخصوص مسائل اور یہاں کے تہذیبی تصورات سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہاں کا ادب مقامی رنگ کی تمام خصوصیات اپنے اندر جذب کر لینے کے باوجود عالمگیر انسانیت کی تہذیبی میراث ہوگا۔

آج اگر کسی گوشہ سے اسلامی ادب کی آواز اٹھتی ہے تو ہمیں یہ ضرور دیکھ لینا چاہئے کہ اس کی تہ میں اسلامی ہمدردی سے زیادہ اپنی اغراض کا تحفظ تو نہیں؟ مذہب کے نام پر یہاں کے سیدھے سادے عوام کو ان کی جائز جدوجہد کی راہ سے الگ ہٹانے کا کام عرصے سے جاری ہے اسی کے ساتھ ساتھ خود طاقت حاصل کرنے کے لئے بھی اسے بہترین وسیلہ بنایا گیا ہے۔ اس لئے آج اگر کوئی جماعت اسلامی ادب کی آواز بلند کرتی ہے تو ہمیں اس نعرہ سے قطع نظر یہ پرکھنا ہوگا کہ اس کے پیش کردہ افکار کس حد تک انسانیت، سماجی بہبود اور جمہوریت کے معیار پر پورے اترتے ہیں؟ ان میں کہاں تک ہماری معاشرت کی صلاح و فلاح مدنظر رکھی گئی ہے؟ نہ استحصال کے خلاف جدوجہد میں کہاں تک محنت کش عوام کا ساتھ دیتے ہیں یا اس سیل رواں کے راستے میں بند باندھنے کی کوشش کا نام ہیں؟

(شمارہ ۴۹-۵۰ ۱۹۵۵ء)

وجدی الحسینی

حقیقت کا تصوّر

اس طلسم زار کائنات میں سب سے زیادہ حیرت افزا معمّہ یا پریشان کن مرحلہ انسان کے لئے حقیقت کا ادراک ہے خواہ ادیبانہ نقطۂ نظر سے اس کو حل کرنے کی کوشش کی جائے یا فلسفیانہ زاویہ نگاہ سے اس کو طے کرنے کی ہمت کی جائے بہر صورت یہ نظام تکوینی اور اس کا یہ وسیع و عریض پھیلاؤ ہے کیا؟ جو اپنے اندر کن اسرار و رموز کو پنہاں رکھتا ہے جس میں خود انسان ہی ہے؟ یہ سوال حیرت ناک انسانی دل و دماغ میں، شعور و لاشعور کی گہرائیوں میں ڈوبتا ابھرتا رہتا ہے اور تحیر و استعجاب کی بیکراں، جوب اور بے پایاں نہریں ہیں کہ انسانی خیالات کے سمندر میں گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہیں۔

جب ہم اس مشکل مگر ضروری مسئلہ کی عقدہ کشائی کے لئے قدم آگے بڑھاتے ہیں تو ہمارے سامنے دو راستے نمایاں ہوتے ہیں۔ ایک مادّیت کا راستہ ہے۔ دوسرا فکر و روحانیت کا۔ پہلے فلسفہ کے ماننے والوں کا قطعی خیال یہ ہے کہ عالم کی ماہیت زمانی و مکانی کے سوائے کچھ اور نہیں۔ ہمارے تمام ادراکات و احساسات، تصورات و خیالات، یہ سب کے سب اسی مادہ کی خارجی حقیقتوں کا پرتو ہیں۔ فکر و خیال کی کوئی بھی طاقت ایسی نہیں ہے جو مادّی محسوسات و مشاہدات سے مستعار نہ لی گئی ہو۔ ذاتی تجربات کسی طرح بھی ادراک حقیقت کے معیار نہیں ہو سکتے۔ خود شعور یا ذہن خارجی دنیا سے راستہ قائم کرتا ہے جس کے پس پردہ حقیقتیں عکس ریز ہوتی ہیں۔ بہر حال خارجی دنیا کا وجود ٹھوس حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ ہیں ان کے دعاوی اور خیالات۔ اس مادی تعبیر کے اعتبار سے اصل حقیقت مادہ ہے جو چند جوہروں کا مجموعہ ہے جس کی توجیہ کے لئے عالم طبعی کی تشریحات کافی و وافی ہے صرف خارجی حالات ہیں جو مادی مظاہر پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کی بدولت عمل ارتقا بروئے کار آتا ہے جو اس کے لئے اور کسی بلند و بالا ذات یا کسی برتر و بزرگ ہستی کی چنداں ضرورت نہیں جو کچھ ہے مادہ ہی ہے۔

اس بظاہر صاف و سادہ اور سپاٹ فلسفہ کی رو سے ہم بہت سے مابعد الطبیعیاتی جھگڑوں سے صاف بچ کر ضرور نکل جاتے ہیں۔ لیکن حقیقۃً کائنات کے عقدہ مشکل میں ایسی مزید پیچیدگیاں پیدا کر دیتے ہیں جو انسانیت کے شرف کو خاک میں ملا دیتی ہیں۔ اس خالص مادی توجیہ کی وجہ سے سب سے پہلے تو کائنات کے پُر حکمت و منظم سلسلۂ وجود کو مادہ کی اندھی، گونگی، لنگڑی طاقت کا نتیجہ ماننا پڑتا ہے جس کا اس تخلیقی ارتقاء سے نہ کوئی مقصد ہے نہ غرض و غایت۔ نہ کوئی ارتقائی منصوبہ ہے نہ کوئی نصب العین، یہ تمام فردوس نظر مناظر، اور حیرت آفریں مظاہر محض اتفاق سے چند کیمیاوی قوتوں کے ناگہانی توازن و اتصال سے وجود پذیر ہو گئے۔

اور انسانی ذہن کا تعلق بھی خالص اتفاقی طور پر ہوگیا۔خود انسانی زندگی غلطی سے یا اتفاق سے اس ننھے سے کرۂ زمین میں بہت ہی قریبی مدت سے بھٹک آئی ہے اگر اس کا سبب ارتقاء قرار دیا جائے جیسا کہ ڈارون اور اس کے موافقین مانتے ہیں تو یہ بھی غلط ہے اس لئے کہ ایک اندھی قوت کے لئے یہ کیسے ممکن ہوا کہ وہ نوت و حرکت میں توازن کو پیدا کرے، ایک بے شعور و بے مقصد طبعی قوت کے لئے ایک باشعور و مقصد آفریں کائنات کی تخلیق خود ایک ناقابلِ حل معمّہ ہے۔جس مصیبت سے بچ کر نکلنا چاہتے تھے وہ پھر سامنے ہے۔پھر زندگی کا مختلف ماحول سے گذرنا اور اس سے مطابقت پیدا کرنا خود ایک باشعور حکمت انگیز مشغلہ ہے اس میں مادّی توجیہ کو کسی طرح تشفی بخش نہیں قرار دیا جا سکتا۔اجرام فلکی کی مقررہ رفتار، ستاروں کی منظم گردش، سمندروں کا جوار بھاٹا موسموں کی بر وقت آمد و رفت کو اندھی مشیت کی کارگزاری کسی طرح نہیں کہہ سکتے خود انسان کی حیثیت اس اندھی جبلّت کے آگے کھلونے سے زیادہ نہیں رہتی ہے چاہے وہ خود اپنی تسخیری طاقتوں کا غلغلہ کتنا ہی بلند کرے لیکن کائنات کے اس نقارخانہ کی طوطی کی صدا سے زیادہ اس کی حیثیت نہ رہے گی۔اس کے علاوہ حیاتیاتی نقطۂ نظر سے تمام مظاہر حیات کی توجیہ ناممکن ہو جائے گی اور جمالیاتی زاویہ نظر سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔

کیونکہ یہ غیر ممکن ہے کہ غیر حکیم سے حکیمانہ افعال صدور پذیر ہوں اور بے شعور سے باشعور اور بے جان سے جاندار اور بدصورت و زشت رُو مادہ سے حسین و جمیل پیکر پیدا ہوں اگر مادہ کی کیمیا دی ترکیب ہی حیات کا اصلی سبب ہوتی تو تخلیقِ حیات سائنس کے لئے ممکن ہو جاتی۔لیکن یہ سن کر بحرِ حیرت میں ڈوب جانا پڑے گا کہ خود سائنس میکانکی نظریہ کے بجائے توانائی (انرجی) کے محیر العقول کرشموں کا قائل ہو چکا ہے۔کائنات کی مادی توجیہ برقیاتی طاقتوں کے تسلیم کرنے کی صورت میں بدل چکی ہے۔اب مادہ کوئی مستقل اور ٹھوس چیز نہیں رہی ہے۔جیسا کہ مادّئین کہا کرتے تھے بلکہ وہ برقی لہروں کا ایک مستقل سلسلہ ہے۔مادہ کی ساری طاقت جوہری طاقت میں مرکوز ہے۔اور ادھر جوہر اپنے اندر ایک ننھا سا نظامِ شمسی رکھتا ہے۔جس میں تمام برق پارے اس کے مرکز کے اردگرد چکر لگا رہے ہیں۔یہ ضرور ہے کہ ان لہروں میں منفی و مثبت برقیئے ہیں لیکن جس کائنات میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں یہ لہروں اور صرف لہروں پر مشتمل ہے اور جس فضا میں یہ گردش جاری ہے وہ ایتھر کی فضا ہے۔لیکن یہ لہریں یا برقیوں کی رو کیا ہمارے تجربہ کے پیمانہ سے بھی پائی جا سکتی ہے۔صرف خیالی یا ذہنی تصور سے آگے نہیں بڑھتی جہاں تک سائنس کے تجربات کا تعلق ہے وہ اس میں ناکام رہا اور اس نتیجہ تک پہنچا ہے کہ حرکتِ مطلق کو کسی تجربہ سے شکار نہیں کیا جا سکتا۔مشہور ماہر ریاضی آئن اسٹائن کی نظریۂ اضافیت کی بنیاد اس نظریہ ہی پر رکھی گئی ہے جس نے مادہ کے قدیم سپاٹ نظریہ کو جڑ سے اکھیڑ پھینکا ہے اور اس نے زمان و مکان کے علیحدہ علیحدہ تصور کے ایک سانچے میں ڈھال کر متحد تصور کی شکل میں پیش کیا ہے۔ڈارون اور نیوٹن کی بنی بنائی عمارتیں اب منہدم ہو چکی ہیں۔اس لئے اب مادہ کا ٹھوس وجود اور اس کا ٹھہراؤ تغیرات کے ساتھ ساتھ کسی طرح قابلِ تسلیم نہیں رہا۔

تو پھر اصل حقیقت کیا ذہن ہے اور مادہ کچھ نہیں؟ یہ ہے وہ دوسرا راستہ جس کی طرف ابتدائی بحث میں ہم اشارہ کر چکے ہیں۔پہلے خیال کے حامی حکمائے یونان کی ایک بڑی جماعت اور جدید فلاسفہ میں ڈارون و اسپنسر لاک اور شوپنہار وغیرہ ہیں اور دوسرے نظریہ کے حامی قدیم حکماء میں افلاطون جدید حکماء کی ایک بڑی جماعت ہے جن میں دکھارٹ، برکلے۔اور ہیگل، نٹشے وغیرہ شامل ہیں۔

افلاطون کا مشہور عالم نظریہ "عینیت" اسی فلسفہ کی یادگار ہے۔ وہ اثبات کرتا ہے کہ ذہن کے خارجی حقائق اصلیت سے بیگانہ ہیں۔ زمان و مکان، مادہ اور علیت و معلولیت کا منطقی سلسلہ حقیقت سے دور ہے۔ اصلیت اور حقیقت خارجی عالم سے ماورا ہے۔ نصب العین ایک چمکارا ہے۔ ابدی و سرمدی اور غیر مرئی عین کا اصلی حقیقت عالم غیب میں جلوہ فرما ہے۔ جس کی جھلکیاں عالم شہود میں خارجی اشکال کی صورت میں رونما ہوئی ہیں۔ انھیں افلاطونی خیالات کا دوسرا تنقیدی پہلو وہ ہے جو عہد حاضر کے فلاسفہ کے یہاں نظریہ "تصوریت" کی شکل میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ جس کو دکھارٹ سے لے کر برکلے، فخطے اور ہیگل تک صاف کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور جس کو اسی صدی کے مشہور اطالوی فلاسفر کروچے اور جنٹائل اور انگریزی فلاسفر برٹیڈے نے نہایت مجتہدانہ حیثیت سے ثابت کیا ہے۔

اس نظریہ کی بنیاد اسی دعویٰ پر ہے کہ فکر ہی ایک زندہ و پائندہ اور ہمہ گیر حقیقت ہے۔ لیکن اس فکر کے دو رخ حقیقی ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کے اندر سموئے ہوئے اور سرایت کئے ہوئے ہیں۔ ایک کلی فکر، دوسرے انفرادی فکر۔ اور اس کلی فکر کی وجہ سے ہی انفرادی فکر حقیقت کا جامہ پہنتی ہے۔ اس کے ساتھ براہ راست ہر تجربہ اور ہر فکر میں فکر کی مجموعی وحدت ہی اثر آفریں ہے گو بظاہر یہ نظریہ دو متضاد و متناقص حقیقتوں کا حامل نظر آتا ہے، لیکن یہی تضاد ہیگل کے فلسفہ عمل و رد عمل کی جان ہے جس سے کائنات کی دائمی تخلیق کا سراغ لگتا ہے اور عالم کے مسکونی نظریہ کے بجائے حرکتی حقیقت کی کارفرمائی معلوم ہوتی ہے۔ اس فلسفہ کی رو سے دنیا میں صرف تجربہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس کا ہم یقین کر سکتے ہیں۔ لہذا تجربہ ہی حقیقی ہے یا اس کے متعلقات اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اور تجربہ محض حال ہے۔ ماضی اور مستقبل صرف اس لئے حقیقی کہے جا سکتے ہیں کہ وہ حال پر منحصر یا اس سے وابستہ ہیں۔ ممکن ہے کہ کہا جائے کہ تجربہ کے ساتھ وہ شے بھی ہے جو تجربہ کے متعلق ہے۔ اور صاحب تجربہ کے سامنے ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں کیونکہ تجربہ اور تجربہ سے متعلق ہونے والی چیز کا فرق اس بات کو لازم کرتا ہے۔ تجربہ کو تجربہ سے الگ کیا جائے حالانکہ وہ ایک وحدت تام اور سراسر ماہیئت ذہنی ہے۔ پھر تجربہ اور تجربہ میں آنے والی چیز کا امتیاز خود صاحب تجربہ کی ذہنی پیداوار ہے لہذا "شے" کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ تجربہ ہمیشہ مفروضہ شے کا تجربہ ہے۔ لہذا حقیقی معرفت ہم کو صرف اپنے تجربہ کی ہوتی ہے۔ "شے" جس کو خارجی دنیا کہتے ہیں ذہن کی ایجاد سے زیادہ نہیں۔ جب خارجی شے کا کوئی وجود نہیں تو یہ اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ ذہن اپنی اشیاء کی تخلیق کرے بہ الفاظ دیگر تجربہ اپنا خالق بھی ہے اور اپنی مخلوق بھی، اور جو کچھ بھی دنیا میں ہو رہا ہے یا ہوگا وہ سب اسی سلسلہ کی کڑی ہوگا اس لئے اب ہمیں اس کے تقسیم کرنے میں کوئی دشواری نہیں کہ حقیقت ایک عالمگیر ذہن یا ہمہ گیر روح ہے جو اپنے آپ اور اپنے ماحول کو یکساں طور پر پیدا کرتی ہے۔ پھر چونکہ کوئی حقیقت بے صورت نہیں ہوتی۔ اس لئے ہر وہ صورت جس کو حقیقت اختیار کرتی ہے وہ لازمی طور پر ذہن یا تجربہ پر بنی ہوگی۔ پس ایسی کوئی حقیقت ہماری دانست میں نہیں جس کی تجربہ پر بنیاد نہ رکھی گئی ہو۔ لیکن حقیقت کا اظہار چونکہ گوناگوں صورتوں میں ہوتا ہے اور ہر صورت تجربہ پر بنی ہوتی ہے اس لئے ہر صورت کی حقیقت مساویانہ ہوگی۔ ان حالات میں فلسفہ کا کام یہ ہے کہ ان رنگ برنگ صورتوں کو موزوں ترتیب سے جمع کرکے باہمی رشتہ کو متعین کرے۔

اس تشریح کے ماتحت ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ذہن یا تجربہ یکسر وحدت ہے۔ جو اول بھی وحدت ہے اور آخر بھی وحدت، پھر یہ کثرت کہاں سے آئی تو اس کے متعلق کہا جائے گا کہ یہ وحدت سے ماخوذ ہے۔ گویا ہماری دنیا شاہد روح کی جلوہ گاہ ہے

زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ یہاں پہنچ کر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ حقیقت جب ایک ہے تو ہماری دنیا کی یہ بوقلمونی اور رنگا رنگی کہاں سے آموجود ہوتی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مجاز کی یہ کثرت حقیقت کے ظہور کی مختلف شکلیں ہیں لیکن ہمارے خیال میں سوال مذکورہ بالا جوں کا توں موجود ہے کہ حقیقت کے ظہور میں اشکال کا یہ اختلاف کیوں ہے؟ اس لئے اس کا حقیقی جواب یہ ہے کہ موضوع اور معروض کا فرق اعتباری ہے۔ اس لئے کہ یہ فرق اس اضافت کی پیداوار ہے جو شعور ذات میں موجود ہوتی ہے جس کو ہم معرفت کا علم کہتے ہیں۔ وہاں جاننے والا موضوع بھی ——— ہوتا ہے اور علم میں آنے والا معروض بھی ذہن ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک ہی ذہن ایک ہی وقت میں عالم بھی ہوتا ہے اور معلوم بھی۔ ذہن کا عالم ہستی کی شکلوں میں تفریق کرتا اور اپنی اپنی سمتوں میں بڑھے جانے کی اجازت دینا خود اپنے آپ میں تفریق کرتے اور اپنے آپ کو مختلف سمتوں میں بڑھے جانے کی اجازت دینے کے مترادف ہے۔ اس لئے شعور ذات دو ایسی ممتاز صورتوں سے تشکیل پاتا ہے جن میں سے ایک کا روپ اگر ذہن دھارے تو موضوع کہلاتا ہے اور دوسرے کا معروض۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ آپ ذہن کو ذہن سے جدا کریں اس لئے وہ ہر شکل میں کامل اور مکمل ہوتا ہے۔ لہٰذا اس توضیح کے پیش نظر ذہن کی وحدت برقرار رہتی ہے اور اب یہ ماننے میں کوئی دقت نہیں رہتی کہ کل حقیقت کا نمونہ خود شعور ذات ہے اور شعور ذات ہی تجربہ کا بلند مطمح نظر ہے یا ذہن کی اعلیٰ ترین خصوصیت ہے۔ اب ذہن کا مطالعہ دو طرح ممکن ہے موضوع کے شعور کی حیثیت سے اور معروض کے شعور کی حیثیت سے۔ جب اوّل الذکر حیثیت سے اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو فنون لطیفہ اور ادبیات وجود میں آتی ہے۔ اور جب موخر الذکر حیثیت سے ہم اس پر غور کرتے ہیں تو مذہبی اقدار موجود ہوتی ہیں۔ اور فلسفہ ان دونوں کا مجموعہ ہے۔ وہ نہ خالص موضوعی ہے۔ اور نہ قطعی معروضی ہی۔ بلکہ موضوع و معروض کی ترکیب سے فلسفہ عالم وجود میں آتا ہے۔ اسی لئے حقیقت کی تحقیق فلسفہ ہی کی مرہون منت ہے۔

مذکورہ بالا تشریحات سے اس میں کوئی شک نہیں کہ ذہن یا تجربہ کا بلند مقام نمایاں ہوتا ہے۔ لیکن فلسفۂ تصوریت کا یہ بلند بانگ دعویٰ کہ "تجربہ ہی دنیا کی واحد حقیقی شے ہے اور کچھ نہیں" تشنۂ اثبات ہے۔ یہ ہمیں تسلیم ہے کہ تجربہ کا وجود بدیہی ہے۔ اور یہ بھی درست کہ شعور ذات تجربہ کی سب سے مستقل واضح قسم ہے۔ لیکن یہ مان لینا کہ جملہ کائنات ذہن ہی کی سب سے اعلیٰ فعلیت ہے، محتاج ثبوت ہے کیونکہ فلسفۂ تصوریت کے بنیادی دعویٰ کلی فکر کا وجود ابھی تک ثبوت طلب ہے۔

خنٹائل اور کروچے نے جن مقدمات و دلائل سے اپنے تصوریت کی فلسفہ طرازی میں کام لیا ہے ان میں سے کوئی سی ایسی مضبوط دلیل نہیں ہے کہ جس سے ایسی چیز کے وجود کو ماننے کے لئے مجبور ہونا پڑے جو بلا واسطہ علم میں نہیں آتی یا جس کا علم تجربہ کی بنا پر نہیں ہوتا لیکن پھر بھی اس کا اقرار کیا جائے۔ لہٰذا مجموعی یا کلی تجربہ کی حیثیت کچھ نہیں رہتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ جدید تصوریت میں کثرت کی توجیہ حقیقی معنیٰ میں نہیں ہوتی حالانکہ ہر فلسفہ کی کامیابی و ناکامی کا مدار وحدت و کثرت کی حقیقی معقول توجیہ سے وابستہ رہا ہے۔ تاریخ فلسفہ کا یہ معرکہ آرا مسئلہ رہا ہے اور اس کی صحیح تعبیر پر فلسفہ کی خوبی اور برائی کا مدار رہا ہے۔ یہاں حقیقت کی وحدت تمام مجاز کی کثرت کی گتھی کو اور الجھا رہی ہے۔ کیونکہ وحدت کا کثرت سے صدور صرف اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس کی بات تصوریت وحدت میں پہلے سے سمائی ہوتی ہو لیکن اگر کثرت کا امکان بھی وحدت میں موجود ہو تو خود اس کو وحدت نہیں کہہ سکتے۔

اور سب سے بڑی مصیبت اس فلسفہ میں یہ ہے کہ ذہن کی فعلیت کے سبب کا پتہ نہیں چلتا کہ آخر ہے تو کیوں؟ یہی وجہ ہے

کہ ہم نے آغاز بحث میں کلی وانفرادی فکر کے متضاد عمل کے سلسلہ میں ہیگل کے فلسفۂ عمل ورد عمل کا حوالہ دے کر اس کمزوری پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی تھی تاکہ بحث کو آگے بڑھایا جاسکتا۔ چلتے۔ چلاتے اس امر کے ظاہر کر دینے میں کوئی حرج نہیں کہ ہیگل نے ان اعتراضات سے بچاؤ کے لئے کیا توجیہات کی ہیں۔ وہ اپنے فلسفہ میں رقم طراز ہے کہ

تجربہ بلا واسطہ تمنا ہی اور جزئی ہے جس میں نہ کلی حقیقت مکمل طور پر موجود ہے اور نہ وہ یکسر حقیقتی ہے یعنی ہر انفرادی تجربہ ایک بڑے کل کا ایک چھوٹا سا جز ہے لہٰذا ہر کل اپنے جزو میں موجود ہے۔ اور چونکہ یہ تجربہ تضاد عملیوں سے معمور ہے اس لئے اجزاء بھی متضاد و متناقض ہوئے اور تناقضات سے بلند ہونے کی کوشش ذہن کی نعلیت کی محرک ہے جس سے کائنات کی ارتقائی رفتار کا سلسلہ جاری ہے۔ بنا بریں نہ تو کلی فکر کے ثبوت کی ضرورت رہتی ہے نہ کثرت و وحدت کی توجیہ میں کسی قسم کی گنجلک پیدا ہوتی ہے اور نہ ذہن کی نعلیت کے محرک کے سراغ لگانے کی حاجت باقی رہتی ہے۔ کلی فکر کا اعتراض اس وقت لازم آتا جب کہ اس کو بہ تمام و کمال موجود مانا جاتا کثرت کا سوال اس وقت پیدا ہوتا جب کہ وحدت نام کے اجزاء کو یک رنگ مانا جاتا اور ذہن کی نعلیت کے محرک کے کھوج لگانے کی ضرورت اس وقت پیش آتی کہ اس کا پتہ نہ چل سکتا۔ لیکن ہیگلی فلسفہ کے پیش نظر چونکہ کلی حقیقت کا اثبات اس درجہ میں کہ اس سے ہی جزئی فکر حقیقت کی صورت اختیار کرتی ہے" سرے سے ہے ہی نہیں اس لئے اس سلسلہ میں مزید کاوش فکر یا ترتیب استدلال کی ضرورت نہیں رہتی اس کے ساتھ تجربہ کی تضاد عملی وحدت و کثرت کے عقدہ لانیحل کو خود کھول ہی ہے۔ کیونکہ تجربہ کا وسیع دائرہ کثرت و وحدت دونوں کو گھیرے ہوتے ہے اور ذہن ان متضاد خیالات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش میں مسلسل مصروف ہے یہی مصروفیت فعلیتِ ذہن کی محرک بنی ہوئی ہے۔ اس توجیہ کی وجہ سے فلسفۂ تصوریت کا ایک دوسرا پہلو ہمارے سامنے روشن ہو جاتا ہے اور یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ افلاطون کی خالص عینیت نہ تو ادراک حقیقت کا مکمل سامانِ اطمینان بہم پہنچا سکتی ہے اور نہ ہماری عملی قوتوں کے لئے سرمایہ تسکین بن سکتی ہے کیونکہ یہ تصورات اس قدر تجریدی ہیں کہ قوائے فکریہ کی حد سے آگے بڑھ کر عملی استعداد کے لئے کبھی دعوت حرکت نہیں دے سکتے۔ مزید برآں یہ فلسفہ وہ ذہن اور زندگی میں جو گہرا ربط ہے اس سے یکسر چشم پوشی کر کے خیالی دنیا کی خانقاہ میں لے جاتا ہے۔ اور عملی دنیا کے میدان کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس لئے اس تصوریت کو تو کسی طرح قابل قبول نہیں کہا جاسکتا۔ ہاں! تصوریت کا وہ نظریہ ہمارے لئے قابل تسلیم ہے۔ جس میں انسانی ذہن در روح کا امکان ہو اور حقیقت بھی ایک تخلیقی عمل ہو جس میں ہماری فکری وعملی قوتوں کا مساویانہ ہاتھ ہو۔

چنانچہ دور حاضر کے محقق فلاسفہ کا رجحان "معروضی تصوریت" کی طرف ہے۔ یہ نظریہ موضوع و معروض کے بنیادی تعلق کی نفی نہیں کرتا۔ نہ یہ تصوریت زندگی سے جداگانہ تجریدی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ اس کے امکانات کو واضح کرتی ہے معروضی تصوریت کی بنا پر انسانی وجود ایک ابدی تحریک اور دائمی فعلیت کی حالتوں سے گذرتا ہوا چلا جا رہا ہے خلق و آفرینش کا یہ عمل ہے کہ پردۂ دہر پہ مسلسل طور پر نت نئے جلووں کے ساتھ عکس ریز ہوتا جا رہا ہے۔ اور تصویر کے اعلیٰ نمونہ کی تشکیل میں مصروف ہے۔ اور خود زندگی ایک ادائے شوخ کی مستقل آرائش و پیرائش یا دائمی فعلیت کا نام ہے، لیکن یہ بھی جان لینا چاہیے کہ اس نظریہ کے مطابق موضوع و معروض کوئی مستقل و علیحدہ وجود نہیں رکھتے بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ ذہن اور فطرت یا مادہ اور روح الگ الگ نہیں ہیں جیسا کہ اب تک خیال کیا جاتا رہا ہے کیونکہ جدید تحقیقات سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ مادہ حوادث کے ایک غیر تمنا ہی سلسلہ سے زیادہ نہیں جو بعض قوانین کا مرہون منت ہے۔ حقیقت کے اس معروضی تصور کے ادراک کرنے کی وجہ سے انسان اور عالم امکان میں ایسا عملی رشتہ قائم ہو جاتا ہے کہ زندگی کی حرکت کیفیت اور نئے نئے

خارجی حالات سے موافقت پیدا کرنے کی قابلیت کو وہ اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے اور اپنی زندگی و ماحول کی کشمکش سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت کو اپنے اندر موج زن پاتا ہے۔ اور ظاہری دنیا کو فریب نظر یا دروغ مصلحت آمیز خیال کرنے کے بدلے کائنات کی اصل حقیقت تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ فطرت کے عمل تغیر و انقلاب کی لذت سے آشنا ہوجاتا ہے اس کو افلاطون کی طرح عالم کے مختلف و متضاد احوال سے گھبرا کر اعیان نامری کے گوشۂ عافیت میں پناہ لینے کی ضرورت نہیں رہتی۔

ہمارے زمانہ کے بہت بڑے فلسفی شاعر، ڈاکٹر اقبال مرحوم کا رجحان بھی حقیقت کی اس تصوریت کی طرف ہے۔ ایک مقام پر اس کی تشریح اس طرح فرماتے ہیں:۔ "کائنات کی تمام اشیا کے متعلق جو میرے اردگرد نظر آتی ہیں، میرا علم سطحی و خارجی ہے لیکن میری اپنی خودی کے متعلق میرا علم داخلی و یقینی ہے اس طرح شعوری تجربہ وجود کی ایسی صورت ہے جس میں ہم حقیقت سے ہم آغوش ہوجاتے ہیں۔ اس تجربہ کی بدولت ہم اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ وجود کا انتہائی منشا کیا ہے؟

حیات و کائنات کے بارے میں دوسری جگہ اپنے خیالات کو یوں ظاہر کیا ہے۔ زندگی کی خصوصیت تفرد ہے۔ عالمگیر زندگی کوئی حیثیت نہیں رکھتی یہ قول میک ٹگرٹ کائنات افراد کے مجموعہ سے عبارت ہے لیکن اس مجموعہ میں جو نظم و ربط اور توافق و تطابق پایا جاتا ہے وہ بذاتہ کامل اور حتمی نہیں ہے وہ جبلی یا شعوری مساعی کا نتیجہ ہے۔ ہمارا قدم تدریجی طور پر انتشار و بے ترتیبی سے نظم و ترتیب کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اور خود ہم اس تدریجی تکمیل کے عمل میں ممد و معاون ہیں۔ چونکہ کائنات ابھی تک ناتمام و نامکمل ہے اور صدائے کن فیکون برابر بلند ہورہی ہے عمل تخلیق جاری ہے انسان اس میں شریک ہے اس لئے وہ جس حد تک کائنات کے غیر مربوط حصہ میں ربط و نظم پیدا کرے گا اسی حد تک اس کو عمل تخلیق میں ممد و معاون قرار دیا جائے گا۔ لیکن ہمارے ذہن میں یہ بات بھی رہنا چاہیے کہ شعور انسانی کے پیدا ہونے سے ہزارہا سال پہلے کائنات موجود تھی اقبال عام تصور میں کسی طرح حقیقت کو صرف ذہن ہی کا کرشمہ قرار دینے کے لئے تیار نہیں کہ اقدار حیات اور خالق حیات کو ریاضی کے صفر کی طرح ایک اختراع ذہنی ماننے کے لئے مجبور ہو بلکہ عالم انفس کی طرح وہ عالم آفاق کے وجود کو بھی تسلیم کرتا ہے شعوری تجربہ کا گہرا مطالعہ اس طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ انسانی ذہن واقعی زندگی میں مرکز سے باہر کی طرف بھی حرکت کرتا ہے۔ اسی حرکت سے زندگی کی قدریں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ ہم خارجی اشیا کے مشاہدہ میں اس طرح محو ہوجاتے ہیں کہ قدرتاً خودی کے احساس سے بیگانہ ہوجاتے ہیں۔ اور جب ہم عمیق مراقبہ میں رہتے ہیں تو موثر خودی معرض التوا میں آجاتی ہے۔ اور ہم اپنی خودی کی گہرائیوں میں پہنچتے اور تجربہ کے اندرونی مرکز تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ یہاں تجربہ کی مختلف شعوری کیفیات ایک دوسرے میں مدغم ہوجاتی ہیں۔ مگر اس اتحاد کی ماہیت بالکل کیفی ہے۔ یہاں حرکت موجود تو ہے لیکن غیر منقسم، ان کے عناصر ایک دوسرے میں ضم اور بالکل غیر مسلسل ہیں۔ بہرحال مادی و ذہنی تجربے اپنے اندر ایک زبردست حقیقت کو نہاں رکھتے ہیں۔ خود انسان کا تجربہ امتزاجی رنگ لئے ہوئے ہے۔ تجربہ میں موضوع و معروض کا جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کو بالکل مٹا دینے کی ضرورت نہیں بلکہ بقول اقبال ضرورت اس بات کی ہے کہ انھیں ایک قسم کے عضوی تعلق کی لڑی میں پرو دیا جائے۔ تاکہ وہ ایک دوسرے سے مغائر نہ رہ سکے شاعرانہ زبان میں اس حقیقت کو کس خوبصورتی سے ادا کیا گیا ہے ؎

مستی ز بادہ می رسد و از ایاغ نیست
ہر چند بادہ را نتواں خورد بے ایاغ

GOVT. GIRLS COLLEGE
ACC. NO. 15-227
LIBRARY

(مارچ ۱۹۴۷ء)

اصغر بٹ

مونٹاج کی فنی حیثیت

مون ٹاج انگریزی کا لفظ ہے ۔ لیکن اس کا منبع فرانسیسی ہے ۔ معنوی طور پر "ایک مطلوبہ تاثر کے حصول کے لئے فلمی ٹکڑوں کی خاص ترتیب" کو مون ٹاج کہتے ہیں ۔

برطانوی فلم ڈائرکٹر پال روداسنے اس کی تعریف یوں کی ہے ۔

"چھوٹے چھوٹے فلمی جملوں کا مجموعہ جس سے ایک خاص ماحول یا موڈ وغیرہ کا تاثر حاصل کرنا مقصود ہو"

کچھ عرصے سے ہمارے ادب میں رپورتاژ کی طرح "مونتاژ" کا رواج ہو چلا ہے ۔ جیسے رپورتاژ مقالے کی ایک قسم ہے ۔ ویسے "مونتاژ" کو افسانے کی قسم بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔ یوں افسانہ بن جاتا ہے یا نہیں ۔ بحث طلب بات ہے ۔ البتہ خواجہ احمد عباس نے اپنی ایک اسی قسم کی تحریر کو افسانے کا ہی نام دیا ہے ۔ لکھتے ہیں ۔

"بظاہر غیر متعلق ۔ ان مل بے جوڑ اور بے معنی مناظر میں ایک خاص ڈھنگ سے ربط پیدا کرنے کو فلمی ٹیکنیک میں مونتاژ کہتے ہیں یہ افسانہ . . . . . اصلی واقعات کو اسی طرح ترتیب دے کر بنایا گیا ہے"۔

فلم ٹیکنیک کے اعتبار سے مونتاج کی یہ تعریف غیر مکمل ہے ۔ اور کسی حد تک شاید گمراہ کن بھی ۔ لیکن اس کا تجزیہ کرنے سے بیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مون ٹاج کے فنی پس منظر کا جائزہ لے لیا جائے ۔

فلموں میں مونتاج ٹاکیز کے آنے سے بہت پہلے تھا ۔ لیکن یہ ٹیکنیک فلموں کے لئے مخصوص نہیں تھی ۔ فلموں نے یہ خیال شاید ادب سے لیا ۔ یورپ اور انگلستان میں انیسویں صدی کے ناولوں میں جا بجا یہی تکنیک ملتی ہے ۔ ڈیوما[1] اور ڈکنز[2] کہانی میں المیہ تاثر گہرا کرنے کے لئے ۔ منظر میں اشاریت کو تقویت دینے کے لئے یا بحرانی کیفیت کے لئے قلمی تصاویر کو کچھ اسی طرح مرتب کیا کرتے تھے ۔ مثلاً ڈکنز کے ناول آلیور ٹوسٹ[3] میں ڈکنز یکے بعد دیگرے ایک طرف آلیور کے والدین کی تشویش دکھاتا ہے ۔ اور دوسری طرف آلیور کی قید سے بچ نکلنے کے لئے کاوش ۔ قاری کے ذہن میں اس کشمکش کا نتیجہ دیکھنے کے لئے جو امنگ پیدا ہوتی ہے ۔ وہی مون ٹاج کو مؤثر بنانے کا راز ہے۔

---

[3] OLIVER TWIST   [2] CHARLES DICKENS   [1] ALEXANDAR DUMAS

لیکن مونتاج محض ایک فنی شعبدہ نہیں۔فنی اسلوب ہے۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب میں الفاظ۔مصوری میں رنگ۔موسیقی میں سُر حقیقی تصور کی عکاسی کرنے کے لئے انفرادی طور پر نا کافی ہیں۔اور ان کے محدود وسائل اظہار خام ہیں۔ مثلاً زبان میں بیان کی کمزوری دیکھئے۔غم کھایا جاتا ہے۔جس طرح روٹی کھائی جاتی ہے۔عاشق ناز اٹھاتے ہیں۔جس طرح قلی سامان اٹھاتے ہیں۔چونکہ کھانے اور اٹھانے کے فعل پہلی حالت میں خاص معانی رکھتے ہیں۔اس لئے اصولی طور پر مؤخرالذکر حالتوں کے لئے مختلف الفاظ ہونے چاہئے تھے۔لیکن نہیں ہیں۔اردو میں ہی نہیں ہر زبان میں اس سے مماثل لسانی تنگ دامانی کی مثالیں موجود ہیں۔ادب کے علاوہ دوسرے فنون میں بھی ایسی ہی حدود ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مصور رنگوں میں نغمہ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اور مغنی نغموں میں رنگ بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔صحیح فنی اظہار کے لئے الفاظ یا سُر یا رنگ کا موضوع پر منطقی طور سے منطبق ہونا ضروری نہیں۔اظہار کی تکمیل تمام فنون سے اور زندگی کی تمام کیفیات سے حسنِ انتخاب کے بعد ہوتی ہے۔اور اس حسنِ انتخاب کی بعض حالتوں کو مونتاج کہتے ہیں۔

مونتاج کی ایک خصوصیت اس کی رفتار (TEMPO) ہے اور اس لئے۔یعنی رفتار کے اندر تال کے ٹکڑے چھوٹی بڑی معنوی تصویروں سے بنتے ہیں۔موسیقی میں یہ تصویریں صوتی ہیں۔اور مصوری میں رنگین۔

مثلاً اگر نیویارک کی ایک تصویر بنائی جائے۔جس میں ایک لمبی سڑک کے کنارے سربفلک عمارتیں ہوں۔تو یہ بھی نیویارک ہوگا۔لیکن تمام نیویارک نہیں۔مصوری نے کنوس کی حدود توڑ کر نکلنے کی جو راہیں نکالی ہیں۔انھیں تاثراتی اور سریلزم کی مصوری کہتے ہیں۔اور یہ مونتاج ہے یعنی نیویارک کی دو ایک اونچی عمارات۔کئی گذرگاہیں اور کاٹتی ہوئی سڑکیں۔موٹروں کے پہیئے۔خوش پوش مرد اور برہنہ عورت کی تصویروں کو اتنے ہی بڑی کنوس پر جس پر پہلے نیویارک کی سیدھی سی تصویر بنائی گئی تھی۔یوں فنی طور پر مرتب کر دیا جاتا ہے کہ نیویارک کی انفرادیت اور شخصیت نمایاں ہو جاتی ہے۔پہلی تصویر میں نہ مونتاج ہے نہ لے۔دوسری میں ایک لے ہے اور مونتاج ہے۔

اسی طرح ایک ہی موضوع پر کیمرے کی بہت سی تصویروں کو کاٹ چھانٹ کر جب اخبارات اور رسائل ایک دوسرے سے ملا کر رکھتے ہیں کہ مرقع سا معلوم ہونے لگے۔تو اس کا فنی نام بھی مونتاج ہے۔

انگریزی ادب میں مونتاج کی مثال پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ہمارے ہاں کے نثری ادب میں کرشن چندر اور قرۃ العین حیدر نے خصوصاً اس فن سے استفادہ کیا ہے۔اگرچہ ان کی کہانیاں عام طور پر واقعاتی سسپنس (SUSPENSE) پر مبنی نہیں اور اس لئے دو مختلف حالات کی تصویروں کا بیک وقت دکھانا ان کے لئے غیر ضروری ہے۔لیکن ماورا الطبیعاتی تصور کو طبیعاتی حقیقتوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے انھیں جس تصویر کشی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔وہ مونتاج ہی ہے۔مثلاً قرۃ العین اپنے ایک افسانے میں لکھتی ہیں۔

(اس میں نمبر میرے شامل کئے ہوئے ہیں۔اور فقروں کی بانٹ بھی میری طرف سے ہے۔

(۱) یہ تیز رفتاری ہی تو زندگی ہے۔ذکر ذرا سوچو تو کتنا مزا ہوگا۔اگر ہم زناٹے سے چلتے رہیں۔

(۲) اور کار کے سارے بیرنگ جل جائیں۔اور ٹائر برسٹ ہو جائیں۔

(۳) ساری کائنات میں آگ لگ جائے سچ مچ کی آگ۔اف وہ میں تو خوشی کے مارے مر جاؤں بالکل اور پھر۔

(۴) جب نظام عالم جل بھن کر راکھ کا اونچا سا ڈھیر ہو جائے اور کھنڈر بن جائے۔

(۵) تو پھر اس دھواں دھار اندھیرے میں ہم ایک دوسرے کو پکارتے پھریں کہاں ہو اسما ۔ اسما اور فریڈا اور امبریش اور وکٹر
(۶) آؤ سب مل کر رقص کریں ۔ موت اور تیسا ہی کا رقص ۔

اس ایک ٹکڑے میں نفسیاتی ارتقاء کی چھ منزلیں ہیں ۔ اور چھ منفرد تصویریں ۔ جب ان سب کو یک جا کیا جاتا ہے تو تاثر کی وحدت یعنی زندگی کی بے بضاعتی واضح ہو جاتی ہے ۔

کرشن چندر "شکست" کے آخر میں ہیرو کی روحانی موت، جس مونتاج سے حاصل کرتا ہے ۔ وہ بھی محل نظر ہے ۔

وہ دن جب وقت تھما ہوا تھا ۔
(۱) جب زندگی راکھ تھی ۔
(۲) پیڑوں پر آشیانے اس طرح خاموش اور ساکن تھے ۔ گویا کسی نے انھیں مٹی سے بنا کر درختوں پر لٹکا دیا تھا ۔
(۳) مٹی اور راکھ
(۴) اور اس کا جی چاہا کہ وہ اٹھ کر ساری کائنات کو اچھی طرح جھنجوڑ دے ۔ جاگو ۔ جاگو ۔ ہلو ۔ حرکت ۔ مضطرب اور بے قرار ہو جاؤ ۔
(۵) اور اسے الف لیلیٰ کی وہ کہانی یاد آگئی ۔ جب کوئی غریب الوطن شہزادہ اپنی محبوبہ پری کی تلاش میں گھومتا گھومتا ایک مقام پر آکر پتھر ہو گیا تھا ۔ ایک پتھر کے بت میں مبدل ہو گیا تھا ۔ اور ہزار کوشش پر بھی حرکت نہ کر سکتا تھا ۔ یہی اس کی روح کی حالت تھی ۔ شاید پتھر کے بت میں تبدیل ہونا اس حالت سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا ۔
(۶) اور اسے احساس ہوا کہ وہ ماندر کے کنارے ندی کی ایک اونچی چٹان پر بس پتھر ہو گیا ہے ۔

اس میں جمود اور تنہائی کا تصور چھ تصویروں سے مرتب کیا گیا ہے ۔ مونتاج بنانے کے مشاہدے اور پرانی داستانوں کے ٹکڑوں کو کہیں مقابل اور کہیں متوازی جمایا گیا ہے ۔

ویسے دیکھا جائے تو فلمی تصاویر کی یہ ترتیب نئی طور پر نادر نہیں ۔ شاعری میں تشبیہ اور استعارہ مونتاج ہی کی ایک کیفیت کا نام ہے ۔ انگریزی ادب میں ٹی ۔ ایس ایلیٹ کی نظم "ویسٹ لینڈ"[۱] مونتاج کی ایک اچھی خاصی مثال ہے ۔ ہمارے ہاں بھی نئی شاعری میں اس کی مثالیں اکثر ملتی ہیں ۔ مثلاً ن ۔ م ۔ راشد کی نظم "خودکشی" میں یاجوج ماجوج کا دن بھر میں دیوار کو چاٹ چاٹ کر ناقابل کر دینا اور صبح ہونے تک اس کا دوبارہ بلند ہو جانا مرکزی خیال یعنی خودکشی کے ارادوں کی تعمیر اور تخریب کے متوازی چلتا ہے ۔ مجموعی طور پر نظم مونتاج سے مرتب معلوم ہوتی ہے ۔

ڈرامے کی صنف میں اسٹیج کی پابندیوں کے پیش نظر مونتاج تھیٹر میں پنپ نہیں پایا ۔ لیکن ریڈیو ڈرامے اور فلمی ڈرامے میں مونتاج نے اہم ترقی کی ہے بلکہ ریڈیو ڈرامے کا مونتاج دراصل فلموں سے ماخوذ ہے ۔ فلموں کے کٹ[۲]، وائپ[۳] اور ڈزالو[۴] ریڈیو ڈرامے نے صوتی طور پر اپنائے ہیں ۔ اور ان سے جذبات کو اکسانے ۔ دھچکا لگانے کا اور تلاطم پیدا کرنے کا کام لیا ہے ۔

جس طرح فلم میں ہر شاٹ[۵] یا تصویری وحدت کی لمبائی یا چھوٹائی ایک تسلسل کے بعد مربوط تاثر کو معین کرتی ہے ۔ اسی طرح ریڈیو میں مختلف چھوٹے ۔ بڑے واقعات کو جب یکجا کیا جاتا ہے ۔ تو ایک مخصوص تاثر حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے ۔

۱؎ WASTELAND　۲؎ CUT　۳؎ WIPE　۴؎ DISSOLVE　۵؎ SHOT

مثلاً :۔

(۱) ریل گاڑی کی چیخ ۔ ریل پھر گڑگڑاہٹ سے آہستہ آہستہ چل کر رفتار پکڑتی ہے ۔ آواز مدھم ہو جاتی ہے ۔

ایک مرد ـــــ " اس رات، گھپ اندھیرا تھا ۔ اور میں ریل کے ڈبے میں اکیلا تھا ۔ ریل کی آواز بھی اور گھٹا ٹوپ تاریکی ۔ میں ذہن سے اس کسک کو بار بار نکال پھینکنا چاہتا تھا ۔ لیکن ذہن جانے کیوں اسی طرف لوٹتا تھا ۔ تجربے نے مجھے دھوکا دیا ۔ تجربے نے مجھے دھوکا دیا ۔ میرا سر چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں تھا ۔ اور چکی آہستہ آہستہ چل رہی تھی "

(۲) چکی کے چلنے کی آواز ۔ جو ریل گاڑی کے چلنے کی آواز کے ساتھ مدغم ہو جاتی ہے ۔

" میرا جسم آہستہ آہستہ کانپ رہا تھا ۔ پھر ریل کے پہیے میرا سینہ کوٹتے ہوئے گزر رہے تھے مجھے ایسا لگا گویا میں ریل کی پٹری پر کٹا پڑا ہوں ۔ اور لوگ میرے گرد جمع ہیں ۔ ان کو معلوم نہیں میں کون ہوں ۔ اور میں کس لئے مرا ہوں ۔ میرا کوئی وارث نہیں ۔ میرا کوئی وارث نہیں ! "

(۳) لوگوں کی سرگوشیاں اُبھرتی ہیں، اور پھر دب جاتی ہیں ۔

" میں ایک پردیسی ہوں ۔ میرا کوئی نہیں ۔ خون میں لتھڑا ہوا اور روندا ہوا میں پڑا ہوں اور پھر مجمع کو چیرتی ہوئی ایک عورت آگے بڑھتی ہے ۔ عورت اب تم مجھ پر ہنس نہ سکو گی ۔ میری محبت پر نہ ہنس سکو گی ۔ ریل کے پہیے میرے خون میں رنگے ہوئے ہیں ۔ اور تم شاید انتظار کر رہی ہو کہ میں مجبوراً لوٹ آؤں گا ۔ نہیں میں اب کبھی نہیں آؤں گا ۔ ہوا اس ویرانے میں سسکتی ہوئی گزر رہی ہے ۔ لوگ چلے گئے ! "

(۴) عورت کی سسکیاں

" تم اس ویرانے میں کیوں بیٹھی ہو ۔ ؟ جاؤ لوٹ جاؤ ۔ مجھے اب ـــــ اس دنیا میں کوئی واپس نہیں لا سکتا ۔

(۵) ہوا کی سائیں سائیں ۔ ویرانے میں تنہا کوئی کتا دور پڑا رو رہا ہے ۔

(۶) ریل کسی اسٹیشن پر رک گئی تھی ۔

اس تصور کو ہم آہنگ کرنے کے لئے چھ صوتی تصاویر یوں لائی گئی ہیں کہ کردار کی ذہنی کشمکش کی، مختلف منزلیں واضح ہو جاتی ہیں اور مجموعی تاثر اس کی بے بسی اور تشنگی کی آئینہ داری کرتا ہے ۔

لیکن عام حالات میں بھی ریڈیو پھر بھی مونتاج کو اتنا مؤثر نہیں بنا پایا ۔ جتنا کہ فلم بلکہ دیکھا جائے تو سوائے فلم کے بر فن اظہار کے میدان میں چند بنیادی کمزوریاں رکھتا ہے ۔

ایسنسٹائن جو پہلے آرٹسٹ اور اسٹیج ڈیزائنر تھا اور پھر عالمی شہرت کا فلم ڈائرکٹر ۔ اس سلسلہ میں لکھتا ہے ۔

بت تراشی محض جسم کو پیش کرتی ہے ۔

مصوری، اجسام کا تعلق فطرت سے دکھاتی ہے ۔

ادب، انسان اور حقیقت کا رشتہ بتاتا ہے ۔

تھیٹر انسانی حرکات داخلی اور خارجی اثرات کے ماتحت دکھاتا ہے ۔

موسیقی داخلی کیفیات کو جذباتی طور پر پیش کرتی ہے ۔

جہاں ان فنون نے اپنے بنیادی بندھنوں کو توڑنے کی کوشش کی ہے ۔ وہاں اظہار میں تفہیم کی کمی ہو گئی ہے ۔ سینما کی

فوقیت یہ ہے کہ وہ ان تمام فنون کی خصوصیات کو یکجا کر کے پیش کرتا ہے۔

ممکن ہے کہ دوسرے فنون کے پرستار ایسبنٹائن سے فوقیت کے معاملے میں اتفاق نہ کریں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ سینما میں اظہار دائرہ وسیع ترین ہے ایسبنٹائن اس اظہار کی موثر بنیاد مونتاج کو ٹھہراتا ہے۔ وہ مانتا ہے کہ فلم میں شاٹ ایک جملہ ہے۔ اور ان جملوں کی ترتیب سے مونتاج بنتا ہے۔ لیکن اس کے نزدیک یہ جملہ بذات خود ایک مونتاج ہے۔ جو تصاویر کے تواتر سے بنتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ تنہا ایک تصویر جس کو فلم کی زبان میں فریم کہتے ہیں۔ اسی مونتاج کی حامل ہے۔ یہ بنیادی مونتاج ہے جو ایک فریم سے شروع ہو کر شاٹ اور شاٹ سے مکمل منظر بن جاتا ہے۔ اس ذرے کی طرح ہے۔ جس میں نیوٹران اور پروٹان برقی مقناطیس سے ایک توازن رکھے ہوئے ہیں۔ ان ذروں سے مل کر جز بنتے ہیں۔ اور ان اشیاء سے مل کر اشیاء بنتی ہیں۔ ذرے کی مشابہت اس ایک فریم کے ساتھ اور بھی زیادہ ہے۔ جس طرح ذرے میں اندرونی طور پر ایک برقی کشمکش ہے۔ اسی طرح ایک فریم کی تصویر میں ڈرامیا کشمکش کے عناصر ملتے ہیں۔ ویسے بنیادی طور پر حرکت زندگی ہے اور ہر حرکت متصادم ہوتی ہے گرد و پیش سے۔ اس لئے ہر ایسے فن کے اجزاء، جو زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایک داخلی تصادم سے بنتے ہیں۔ ہر فن کے بارے میں یہ اندرونی تصادم دکھلانے کی یہاں گنجائش نہیں۔ ہم صرف فلم کے مونتاج کا تجزیہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ فلم کے فریم میں یہ تصادم کئی طرح کا ہو سکتا ہے۔

(۱) سمتوں کا تصادم —— جیسے گاڑی کی لائن پر سے آرپار گذرتی ہوئی سڑک

(۲) سطحوں کا تصادم —— جیسے ایک گڈریا نیچے کھڑا پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھی ہوئی بکری کو دیکھے۔

(۳) جسامتوں کا تصادم —— ایک موٹے اور ایک دُبلے آدمی کا آمنا سامنا۔

(۴) روشنی کا تصادم —— اندھیرے میں چھپی ہوئی گلی اور پاس ہی بقعۂ نور سڑک

(۵) نقطۂ نظر کا تصادم —— کیمرے کے ایک مینار کو یوں دیکھنا کہ وہ گرتا ہوا معلوم ہو۔

(۶) موضوع کا تصادم —— امیر اور فقیر

ایسبنٹائن کے نظریئے کے مطابق مونتاج تصادم کے اس سلسلہ کا نام ہے۔ جو واحد تصویر سے داخلی طور پر شروع ہو اور تصادمات کی ایک زنجیر بناتا ہوا نقطۂ معراج پر ایک بڑے ڈرامائی تصادم کی صورت میں نمودار ہو۔ بالکل ایسے ہی جیسے ذرے کو جب توڑا جائے تو اس سے نکلی ہوئی بجلی کی زد دوسرے ذرّوں کو توڑتی اور یوں تقویت پکڑتی آخر ایک ایٹمی دھماکے میں ختم ہو جاتی ہے۔

ایسبنٹائن کے ہمعصر پڈوکن کا نظریہ یہ تھا کہ شاٹ یا فلمی جملوں کو ایک دوسرے کے بعد یوں مرتب ہونا چاہیئے کہ نتیجہ مقصود عبارت بن جائے اور ان جملوں کا تصادمات کی زنجیر بنانا ضروری نہیں۔ چنانچہ پڈوکن کے نزدیک مونتاج نام ہے "فلمی ٹکڑوں کی اس ترتیب کا جس سے کہانی کی مطلوبہ رفتار حاصل ہو جائے۔" دوسرے لفظوں میں مونتاج ایک تعمیری ایڈیٹنگ ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پڈوکن پھر کیسے فلم میں ڈرامہ کے عناصر پیدا کرتا ہے۔ پڈوکن کی تکنیک دراصل موضوعاتی تھی۔ مثلاً

(۱) تقابل۔ جیسے ایک طرف بھیڑ اور دوسری طرف بھیڑیا۔

(۲) متوازیت۔ دو مختلف مقامات پر دو مختلف کرداروں کی زندگی بیک وقت دکھائی جائے۔ جیسے ایک طرف انارکلی کو زندہ دیوار میں چنا جا رہا ہے۔ اور دوسری طرف اسے بچانے کے لئے شہزادہ سلیم محل کے پہرہ داروں سے لڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

(۳) اشاریت۔ جیسے ایک طرف فوج کے دستے بار بار حملہ کر رہے ہیں۔ اور غنیم کی صفیں قائم ہیں۔ اور دوسری طرف

زور کی آندھی چٹانوں سے اپنا سر پھوڑ رہی ہے۔

(۴) اعادیت - جیسے ایک حرماں نصیب لڑکی کی زندگی کا المیہ دکھانے کے لئے ایک شکستہ آئینہ ہر ایسے واقعہ کے بعد دکھایا جس میں اس لڑکی کے ارمانوں کو ٹھیس پہنچے بالکل ویسے ہی جیسے نظم میں ایک خاص تاثر کے لئے ایک مصرعہ کا تکرار رکھ دیا جاتا ہے۔ مثلاً راشد کی ایک نظم میں "سلیمان سربزانو اور سبا ویراں"

ایسبٹائن اور پڈوکن کے نقطۂ نظر میں فرق محض تصادم مقدار کا تھا - تصادم کی قسم کا نہیں - اس لئے پڈوکن کو آخر ایسبٹائن کا ہم خیال ہونا پڑا - تصادمات کی ایک خاص مقدار اور رفتار سے ڈرامائی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی کیفیت کو مونتاج کہا جائے گا خواہ وہ ادب میں ہو، موسیقی میں ہو، مصوری میں ہو یا فلم میں۔

(شمارہ ۳۵ - ۳۴ ۱۹۵۴ء)

نظم کی زبان

(صفحہ ۵۷۳ سے آگے)

گرہوں کی طلسم بندی بن کے رہ جاتی ہے۔ یہ وہ منزل ہے جب شاعر سماج سے گھبرا کر اس کا حلقہ توڑ دیتا ہے اور اپنی ذات کو کائنات سمجھنے لگتا ہے۔ اردو شاعری کو نئے سرے سے کائنات کے اس حلقے میں داخل ہونا ہے۔ جس میں سات میل گہرا سمندر اور لاکھوں کروڑوں میل دور ستارے شامل ہیں۔ اور جس میں انسان آج ہلاکتِ کلی اور تجارت ابدی کے دوراہے پر کھڑا ہے۔ اسے زبان سے ایک نیا عشق پیدا کرنا ہے۔ تاکہ وہ اس کی ہر ادا کو سمجھ سکے اسے اپنی سرزمین پر اپنی جگہ بنانی ہے۔ اور اسی اپنی سرزمین کے ہر رنگ و آہنگ سے لو لگانا ہے۔ اسے قدما کے تجربات سے فائدہ اٹھانا ہے' اسے میر کے ذہن کی تقلید نہیں کرنا ہے۔ بلکہ میر کو بھی جذب کرنا ہے۔ اسے سیاست، مذہب، جنس کی روح تک پہنچنا ہے اور انسانیت پر وہ اعتقاد اور اپنے مشن پر وہ اعتماد پیدا کرنا ہے۔ جو نشہ بھی ہے، نجات بھی۔ غالب اور اقبال سے ہم بہت کچھ لے چکے۔ میر۔ نظیر، حالی سے ابھی بہت کچھ لے سکتے ہیں اور ہندی شاعری کے اس حصے سے بھی جس کے اسرار میں ہماری تہذیب اور تاریخ کے کتنے ہی جگمگاتے مرقعے پوشیدہ ہیں۔ اس ضرورت کا احساس تو ہے، مگر یہ ابھی عام نہیں ہوا۔ اس لئے ہمیں اپنے گوشۂ عافیت		میدان میں نکلنا چاہیے۔ کھلی ہوا میں کچھ چراغ بجھ جاتے ہیں، مگر کچھ اور نئے جلتے بھی ہیں۔ ہماری زبان اتنی جاندار ہے کہ وہ اب تک جس طرح مہذب رندی کی ترجمانی کرتی رہی ہے' اسی طرح تہذیب کے ہر رقص کی بھی ترجمانی کر سکے گی ـــــ رقص کی طرف میلان شروع ہو گیا ہے۔ اب ہمارا فرض یہ ہے کہ اسے اور آگے بڑھائیں، حتیٰ کہ یہ ہمارا نمائندہ انداز بن جائے۔

شمارہ ۱۸۱ ۱۹۶۶ء)

رفیق غزنوی

ستاروں کی چھاؤں میں

وہ شب وہ چاندنی۔ وہ ستارے چلے گئے!

بائیس اکتوبر ۱۹۴۷ء کو رات کے گیارہ بجے میں بمبئی سے کراچی پہونچا۔ محض دو گھنٹے کا ہوائی سفر۔ لیکن کسے خبر تھی کہ اس قلیل عرصے کے بعد ایک اچھے خاصے "فن کار" کو "بیکار" محض بنا دیا جائے گا!

وقت اور زمانے نے آخر کار اپنی اکتالیس برس کی مسلسل ناکامی اور خجالت کا مجھ سے انتقام لے ہی لیا! اور یہ شدید انتقام اب تک جاری ہے!! شاید عمر بھر جاری رہے!! آثار یقین دلاتے ہیں!!!

آج چار سال کے بعد جب میں اپنی فلمی زندگی کو یہاں سے پلٹ کر دیکھتا ہوں تو مجھے بہت دور ایک وسیع اور گہرے دھندلکے میں سے لاتعداد حسین چہروں کے نازک اور لطیف خدوخال بے شمار حیات پرور واقعات کے مٹے مٹے نقوش اور اپنی پُرکیف زندگی کے دبے دبے رنگین خطوط اُبھرتے نظر آتے ہیں جو بتدریج۔ صاف۔ واضح اور مانوس صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ بمبئی میں ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ۔ یعنی میں نے اس دیارِ رنگ و بو۔ نور و سرور اور شعر و نغمہ میں چودہ برس گزارے! ایک زندگی! حسن۔ شعر۔ نغمے کی زندگی! میری زندگی! ایک فن کار کی زندگی!!

اور اب ۔ ۔ ۔ ۔ فقط ایک رنگین خواب! ایک حسین افسانہ! ایک خوبصورت یاد!

اب میری زندگی سے وہ ملے مراد ہیں　　لایا ہوں چھین کر جو تری صبح و شام سے

آنکھ۔ دل۔ ذہن۔ ذوق۔ سراسر غلط! بالکل بیہودہ!

ہاتھ۔ پاؤں۔ پیٹ۔ محض معدہ — نہایت درست! نہایت ضروری! نہایت اہم!!

شعر۔ نغمہ۔ حُسن۔ بالکل بے کار۔ جاہ و نسب۔ سیاست۔ گوشت۔ (ہر قسم اور ہر نسل کا گوشت) لکڑی۔ لوہا۔ ٹین۔ تیل۔ چاندی۔ سونا قطعی ناگزیر! قطعی کارآمد! قطعی منفعت بخش!!

انسان کام کرتا ہے —— انسان کھاتا ہے —— گوشت بھی کھاتا ہے!

حیوان کام کرتا ہے —— حیوان کھاتا ہے —— گوشت بھی کھاتا ہے!

انسان گاتا ہے —— انسان شعر کہتا ہے —— حُسن شناس بھی ہے!

حیوان نہیں گاتا —— حیوان شعر نہیں کہتا —— حُسن شناس بھی نہیں!

اچھا شعر۔ اچھی آواز۔ اچھی صورت کو سمجھنا۔ پرکھنا۔ ان سے حظ اٹھانا۔ کیف حاصل کرنا مہذب اور متمدن قوموں اور ملکوں کا شعار ہے ان کی خصوصیت رہی ہے اور اب تک ہے۔ یہ وہ امتیازی خصوصیت ہے۔ جس نے ہزاروں برس کی ارتقا نشوونما تعلیم و تربیت۔ سوجھ بوجھ کے بعد انسان کو حیوان سے الگ اور ممیز کیا۔ اُن قوموں۔ اُن ملکوں۔ اُن حکومتوں کے ارباب بست و کشاد سے کون پوچھے۔ جو آج بھی انسان کو از سرِ نو حیوان بنانے پر تلے ہوئے ہیں! جو انسان کو شعر نغمے اور حُسن کی نعمت سے یکسر محروم کر دینا چاہتے ہیں!

اقتصادی دَور۔ سیاسی دَور۔ تعمیری دَور۔ عبوری دَور۔ افادی دَور۔ یعنی روٹی۔ پانی۔ کپڑے۔ مکان۔ دکان۔ روپے پیسے۔ کاروبار کا دور۔ مختصر یہ کہ خالص پیٹ کا دَور۔ محض معدے کا دَور۔ صرف گوشت و پوست کا دَور۔ ان کی نوعیت۔ حیثیت۔ شانِ نزول کی غرض و غایت اور اہمیت چند بلند بانگ۔ مرعوب کن۔ دوراذکار۔ بیکار محض اور خانہ ساز بہانوں سے زیادہ نہیں۔ جو ارادتاً لطیف۔ فنِ لطیف اور فن کار کو کچلنے کے لئے تراشے گئے ہیں۔ سیاسی چالیں ہیں۔ مختلف زمانوں میں استعمال ہوتی رہیں۔ ازلی بخل اور کینگی۔ پیشہ ورانہ رشک۔ بیمار جسد مجرمانہ بد ذوقی۔ فن دشمنی اور حسن ناشناسی کے یہ پست۔ ذلیل۔ رکیک اور انتہائی غیر شریفانہ مظاہرے پہلے بھی ہوتے رہے۔ لیکن فنِ لطیف اور فن کار اس کے باوجود زندہ رہے۔ پھلتے پھولتے رہے۔ پروان چڑھے۔ سر جھومتے رہے۔ آنکھیں بھیگتی رہیں۔ مخمور ہوتی رہیں طبیعتیں مچلتی رہیں۔ شگفتہ ہوتی رہیں۔ دل و دماغ شاداب ہوتے رہے۔ جسم و جان میں شعلے لپکتے رہے۔ دھڑکنیں تیز سے تیز ہوتی رہیں قلب و جگر سیراب ہوتے رہے۔ روح نغمے جذب کرتی رہی۔ زندگی بڑھتی رہی۔ حسین ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ موت بھی خوبصورت ہو گئی ؎

شعر و نغمہ۔ مے دیارِ دل پسند　　　　جنت جز ایں بگو۔ دیگر چہ ہست

بتاشا والا۔ بھاجی والا۔ باٹلی والا۔ گھاس والا۔ گوشت والا۔ سگرٹ والا۔ ماچس والا۔ بیڑی والا۔ گاڑی والا۔ لاکھوں ہی ہیں۔ دنیا بھر کی آسائشیں۔ فراوانیاں۔ فراغتیں مہیا ہیں۔ انھیں ایک روپے کی چیز کو ایک سو روپے تک بیچنے کی اجازت ہے۔ کھلے بندوں لوٹتے ہیں۔ دن دہاڑے ڈاکہ مارتے ہیں۔ اعلانیہ خون چوستے ہیں۔ ان کے پاس لائسنس ہے۔ بلکہ لائسنس مہیا کر دیا گیا ہے۔ ایک کا سَو لیتے ہیں۔ برملا لیتے ہیں۔ کوئی پرسش نہیں۔ کوئی سزا نہیں۔ ہر ایک فنڈ میں بڑی بڑی رقمیں دیتے ہیں۔ خیرات کرتے ہیں۔ تاکہ ایک کا دو سَو لے سکیں! اور عموماً لیتے ہیں!!

شاعر۔ مصوّر۔ موسیقار۔ ادیب۔ فن کار لاکھوں نہیں چاہتا کبھی نہیں چاہا! وہ تو صرف اتنا چاہتا ہے۔ جس سے اُس کے فن کی پرورش۔ اس کی خودداری کی سلامتی اور اُس کے نام و عزت کی حفاظت ہو سکے تاکہ وہ اس خشک۔ بے جان۔ بے نمک اور بد صورت دنیا کو رنگین سے رنگین تر۔ حسین سے حسین تر اور خوشگوار سے خوشگوار ترین بنا سکے۔ اسے اتنی بھی اجازت نہیں! اس کے پاس کوئی لائسنس نہیں۔ اسے کوئی لائسنس نہیں دیا گیا! اس کے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے جاتے ہیں! اس کے دل و دماغ کو مفلوج کر دیا جاتا ہے! اس کے احساس کو چھین لیا جاتا ہے! اُس پر بھوک عائد کر دی جاتی ہے! اُسے نڈھال کر دیا جاتا ہے! اُسے چکنا چور کر دیتے ہیں۔ اور بالآخر اُسے بیکار محض بنا کر موت اور گمنامی کی اتھاہ تاریکیوں میں ڈھکیل دیا جاتا ہے!!

فنِ لطیف احساساتِ لطیفہ سے متعلق ہے۔ احساساتِ لطیفہ ان لوگوں میں پائے جاتے ہیں جن میں شئے لطیف ہو۔ بلوغتِ نظر۔ نفاست طبع۔ زیرکیِ حس۔ لطافتِ جذبات۔ رسائیِ ذہن۔ حسنِ ترتیب اور تناسب اور حسِ جمالیاتی کے حسین امتزاج کا نام شئے لطیف ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ شئے لطیف ہر کس و ناکس کے نصیب میں نہیں ہوتی۔ کم از کم ان گھاس والوں۔ بتاشے والوں یا دیگر اسی نوعیت اور قماش کے "والوں" میں تو ہرگز ہرگز نہیں پائی جاتی!

لیکن گھاس والا پھر بھی خوش ہے بے فکر ہے۔ فارغ البال ہے۔ جانور گھاس کھاتے ہیں۔ اور ہمیشہ کھاتے ہیں! گھاس بکتی ہے۔

ہمیشہ بکتاہے اور بہت بکتاہے۔

بٹاٹا والا بھی خوش ہے! بے فکرہے! فارغ البال ہے! انسان بٹاٹا کھاتے ہیں! اور ہمیشہ کھاتے ہیں! بٹاٹا بکتاہے! ہمیشہ بکتاہے اور بہت بکتاہے۔

فن کار اُداس ہے! فکر مند ہے! بھوکاہے! فن بکتا نہیں! فن کھانے کی چیز نہیں، فن گوشت نہیں، فن آلو نہیں۔ فن گھاس نہیں۔ فن لطیفہ ہے۔

بلوغتِ نظر۔ نفاستِ طبع۔ لطافتِ جذبات۔ حسِ جمالیاتی۔ سب بے معنی! بالکل لغو! قطعی بیکار! تضیعِ اوقات! چند حسین اور دلفریب دھوکے!

پیٹ! ــــ معدہ! ــــ گھاس! ــــ گوشت! ــــ آلو! ــــ دال! ــــ لکڑی! ــــ لوہا! ــــ تیل! ــــ وہی حیوان! ــــ وہی پُرانا انسان! ــــ آج کل کا انسان! ــــ ہمارا انسان!

ہٹائیے اس بیکار بحث کو ــــ آئیے کسی حسین اور لذیں زمانے کے ذکر اور یاد سے اپنی زندگی کی تلخ کامیوں کو کچھ دیر کے لئے بھلا دیں۔ ستاروں کی ٹھنڈی نرم اور گداز چھاؤں میں بیٹھ کر اپنا غم غلط کریں۔ اگر کامیاب ہوگئے تو غنیمت ہے۔ جن کے پاس زندگی کو قابلِ برداشت اور قدرے آسان بنانے کا اب یہی ذریعہ رہ جائے۔ وہ بدبخت بھلا اور کر بھی کیا سکتے ہیں! مگر وقت اور زمانہ کسی کو نہیں بھولتا! کسی کو نہیں چھوڑتا! اس کا انتقام ناگزیر ہے! ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک فن کار یہ بھی کہہ سکے کہ ــ ؏

کل ان کا زمانہ تھا۔ آج اپنا زمانہ ہے ــ خیر۔

ؔ آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں   زلف کی رُخسار کی، باتیں کریں

(شمارہ ۳۵ - ۳۶ سنہ ۱۹۵۲ء)

تلوک چند محروم

(صفحہ ۴۹۵ سے آگے)

تنقیدی مضامین سے استفادہ کیاہے۔

چونکہ ایف اے، بی اے کے امتحانوں میں جو میں نے دورانِ ملازمت پرائیویٹ طور پر پاس کئے، میرا ایک لازمی مضمون فارسی بھی تھا لہٰذا اس زبان کے شعری ادب سے بھی کچھ واقفیت ہوگئی۔ اور چند غزلیں، رباعیاں اور قطعے فارسی میں بھی کہہ چکا ہوں ــ نیز ان ہی امتحانوں کے طفیل انگریزی شعراء مثلاً ورڈزورتھ، کیٹس، شیلے، سروالٹرسکاٹ، پوپ اور شیکسپیر کے جزوی کلام کا مطالعہ بھی کیا۔ اور ان کی کئی نظموں کے اردو نظم میں ترجمے بھی کئے جو میرے مجموعہ ہائے کلام میں شامل ہیں۔ اصغر گونڈوی مرحوم نے شیکسپیر کی نظم MERCY کے ترجمے کو کامیاب قرار دیا۔ اور سر اقبال نے کلامِ محروم حصہ اوّل میں مشمول ترجموں کو پسند فرمایا۔

اب تک میری نظموں کے چھ مجموعے، گنجِ معانی، رباعیات، کاروانِ وطن، نیرنگِ معانی، بہارِ طفلی اور شعلۂ نوا شائع ہو چکے ہیں کلامِ محروم حصہ اوّل، دوئم و سوئم کا کلام بھی ان ہی میں شامل کردیا گیا ہے ــ ایسا کلام جو رسالوں میں شائع ہو چکا ہے لیکن کتابی صورت میں نہیں آیا، خاصی مقدار میں موجود ہے۔

(شمارہ ۱۵۹ - ۱۶۰ سنہ ۱۹۶۲ء)

اسلامی تاریخ و ادب کی بلند پایہ شخصیت

پروفیسر سیّد نواب علی

کی ۳ مشہور و مستند تالیفات

سیرت رسول اللہؐ

سائز ۸/۲۶×۲۰ صفحات ۴۶۰
بہترین گیٹ اپ، قیمت مجلد ۱۲ روپے

سیرت کے قدیم ماخذ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے مستند حالات، مستشرقین یورپ کے حملوں کا مدلل جواب اور اسلام کے بنیادی عقائد پر ایک جامع اور تحقیقی کتاب۔

تاریخ صحف سماوی

سائز ۱۶/۳۶×۲۰ صفحات ۳۶۸
بہترین گیٹ اپ
قیمت مجلد ۵/- روپے

توراۃ، اناجیل اور قرآن مجید کی جمع و ترتیب اور حفاظت کا تاریخی موازنہ، تحریف لفظی و معنوی کی بحث، علمائے یورپ کے قرآن مجید پر اعتراضات اور ان کے مدلل اور مسکت جوابات اور نتائج۔ یہ مستند کتاب کراچی یونیورسٹی اور جامعہ اسلامیہ بہاول پور کے نصاب میں بھی شامل ہے۔

معارف الدین

المعروف بہ سائنس اور اسلام
سائز ۱۶/۳۶×۲۰ صفحات ۲۵۶
بہترین گیٹ اپ
قیمت مجلد ۴/۷۵ روپے

سائنس کی کائنات، سائنس مذہب کی روشنی میں معمائے حیات اور حیات بعد الممات کی بصیرت افروز تحقیق و تشریح اور تمام مشہور مذاہب یعنی مصریوں، ہندیوں، یونانیوں، زرتشتیوں، یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے افکار و عقائد کا تاریخی جائزہ۔

ملنے کا پتہ

مکتبۂ افکار

رابسن روڈ، کراچی

معیار ہو یا مقدار

دونوں قابلِ اعتبار

زیل پاک

میں دوہرا فائدہ

ZEALPAK
BSS 12/1958
112
lbs.
W.P.I.D.C.

زیل پاک سیمنٹ فیکٹری لمیٹڈ

حیدر آباد

794 F

"میں ریپلیبٹڈ بیٹریز کا قائل نہیں ہوں
میں تو صرف گارنٹی شدہ ایکسائڈ بیٹریز
ہی استعمال کرتا ہوں"۔

یہ پشاور کے باشندے گل حمید خان کے الفاظ ہیں جن کے ٹرک کراچی اور پشاور کے درمیان چلتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ریپلیبٹڈ بیٹری پرانی مرمت شدہ بیٹری ہوتی ہے جو بہت کم عرصہ تک چلتی ہے اور اس طرح بار بار بیٹری بدلنے کا خرچ نئی بیٹری سے کہیں زیادہ آتا ہے۔
خان صاحب یہ جانتے ہیں کہ صرف ایکسائڈ کے ڈیلرز کا وسیع جال جو ملک بھر میں پھیلا ہوا ہے فروخت کے بعد سروس بھی مہیا کرتا ہے۔
خان صاحب کو اس کا بھی علم ہے کہ ایکسائڈ دنیا بھر میں بیٹری سازی کا ۷۵ سال سے زیادہ ماہرانہ تجربہ رکھتے ہیں۔
کار ہو یا ٹرک۔ فوری اسٹارٹ، تیز روشنی اور ہر طرح سے قابلِ اعتماد ایکسائڈ بیٹری دنیا بھر میں اپنی مثال آپ ہے!

ایکسائڈ کارکردگی میں دوسری تمام
بیٹریوں سے اعلیٰ اور دیرپا ہے

Exide
HEAVY DUTY

ایکسائڈ
بیٹری

GUARANTEED

EBP-69-10

ASIATIC

زود ہضم، خوش ذائقہ، صحت بخش...

تلو میں پکے ہوئے کھانے ہمیشہ زود ہضم، خوش ذائقہ، صحت بخش
کیونکہ تلو کے پگھلنے کا درجہ حرارت انسانی معدہ کی حرارت کے مطابق
رکھا گیا ہے۔ اس لئے تلو معدہ میں جمتا نہیں اور زود ہضم ہے۔
زود ہضم تلو توانائی کے کیلوریز اور وٹامن اے اور ڈی
سے بھرپور ہے اور جسم کو فاضل توانائی پہنچاتا ہے۔

زود ہضم تلو
کی بدولت
توانا بچے روشن چہرے

تلو
بناسپتی

PRESTIGE TB. 70/2,70

قومی پرچم بردار
پی آئی اے
ملک کی ترقی وعظمت
کا ترجمان!

PIA

BOEING
707C
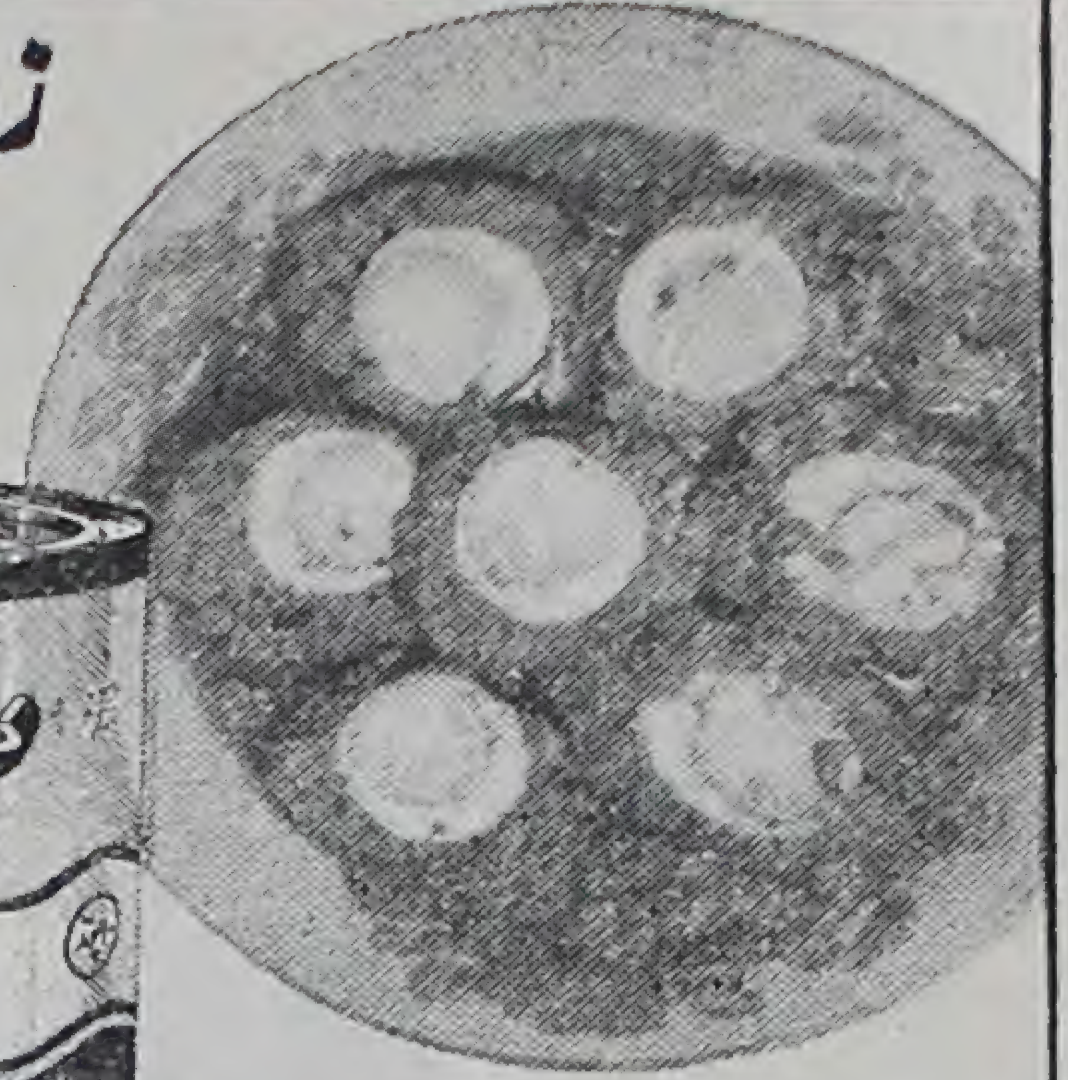
PIA
پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز

SANAULLA
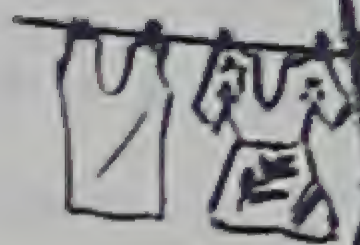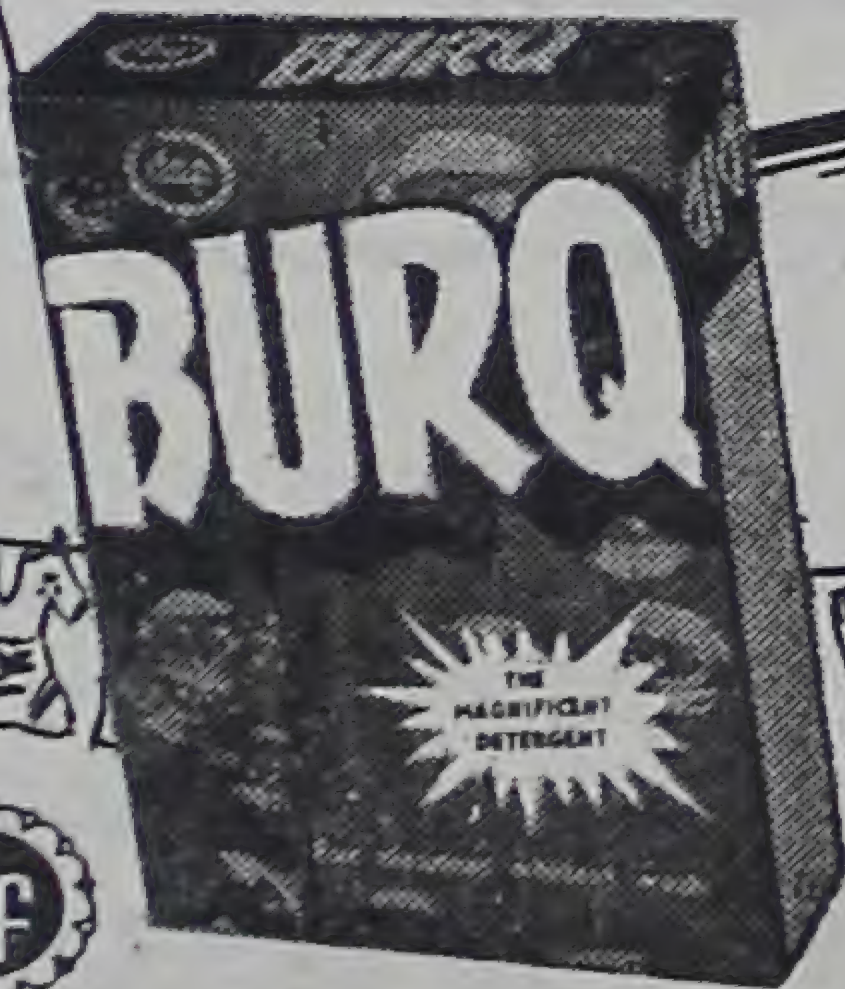
ہو جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

تو **ثناءاللہ** تشریف لایئے پاکستان میں فیشن کی نمائندگی کا فخر ثناءاللہ ہی کو حاصل ہے۔
فیشن کا آغاز ثناءاللہ ہی سے ہوتا ہے، اور پھر یہ رجحان رنگ و بو کی طرح سارے ملک میں پھیل جاتا ہے۔
کپڑوں کے نو بہ نو ڈیزائن - میک اپ کا سامان، دیدہ زیب ساڑھیاں، بہترین مردانہ سوٹنگ -
دلہن کے جہیز اور تحائف کی دلکش اشیا - بچوں کے خوبصورت لباس، لیڈیز ہینڈ بیگ
آپ کو رواں فیشن کی کسی بھی چیز کی ضرورت ہو ثناءاللہ تشریف لایئے -

ثناءاللہ صدر - کراچی - فون :- ۵۱۳۲۲۲

مُنتخب نظمیں

ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے

جوشؔ ملیح آبادی

کِس زباں سے کہہ رہے ہو، آج تم سوداگرو!
دَہر میں انسانیت کے نام کو اُونچا کرو

جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہے بھیڑیا
بھیڑیئے کو مار دو گولی پئے امن و بقا

باغِ انسانی میں چلنے ہی پہ ہے بادِ خزاں
آدمیّت لے رہی ہے ہچکیوں پر ہچکیاں

ہاتھ ہے ہٹلر کا رخشِ خودسری کی باگ پر
تیغ کا پانی چھڑک دو جرمنی کی آگ پر

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری اور یہ ذکر
نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر

جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے؟

ہندیوں کے جسم میں کیا رُوحِ آزادی نہ تھی
سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی؟

اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے؟
کمپنی کا پھر وہ دَورِ مجرمانہ یاد ہے؟

لُوٹتے پھرتے تھے جب تم کارواں در کارواں
سر برہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں

دستکاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم

صنعتِ ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی
موت بھی کیسی تمہارے ہاتھ کی لائی ہوئی

اللہ اللہ کس قدر انصاف کے طالب ہو آج
میر جعفر کی قسم کیا دشمنِ حق تھا سراج؟

کیا اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟
یاد ہے جھانسی کی رانی کا زمانہ یاد ہے؟

ہجرتِ سلطانِ دہلی کا سماں بھی یاد ہے؟
شیر دل ٹیپو کی خونی داستاں بھی یاد ہے؟

تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
کس کے تم لائے تھے سر شاہ ظفر کے سامنے؟

یاد تو ہوگی وہ مٹیا برج کی بھی داستاں؟
اب بھی جس کی خاک سے اُٹھتا ہے رہ رہ کر دھواں

تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بارہا؟
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا

سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظلمِ بے پناہ
آج تک رنگون میں اک قبر ہے جس کی گواہ

ذہن میں ہوگا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی
یاد تو ہوگا تمہیں جلیان والا باغ بھی؟

پوچھ لو اُس سے تمہارا نام کیوں تابندہ ہے؟
"ڈائر" گرگِ دہن آلود اب بھی زندہ ہے!

وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے
اُس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے؟

اہلِ آزادی رہا کرتے تھے کس ہنجار سے
پوچھ لو یہ قید خانوں کے در و دیوار سے

اب بھی ہے محفوظ جن میں طنطنہ سرکار کا
آج بھی گونجی ہوئی ہے جس کے کوڑوں کی صدا!

آج کشتیِ امن کے امواج پہ کھیتے ہو کیوں؟
سخت حیراں ہوں کہ اب تم درسِ حق دیتے ہو کیوں؟

اہلِ قوت دامِ حق میں تو کبھی آتے نہیں
"بینکی" اخلاق کو خطرے میں بھی لاتے نہیں

لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم
ہو نہ ہو اپنے میں اب قوت نہیں پاتے ہو تم

اہلِ حق روشن نظر ہیں اہلِ باطل کور ہیں
یہ تو ہیں اقوال ان قوموں کے جو کمزور ہیں!

آج شاید منزلِ قوت میں تم رہتے نہیں
جس کی لاٹھی اُس کی بھینس اب کس لئے کہتے نہیں؟

کیا کہا "انصاف ہے انساں کا فرضِ اولیں
کیا فساد و ظلم کا اب تم میں کس باقی نہیں؟

دیر سے بیٹھے ہو نخلِ راستی کی چھاؤں میں
کیا خدا نہ کردہ کچھ موچ آ گئی ہے پاؤں میں

گونج ٹاپوں کی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
خیر تو ہے اسپِ تازی کیا شفا خانے میں ہے؟

آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہے　　　　کچھ طبیعت کیا نصیبِ دشمناں ناساز ہے؟
سانس کیا اُکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے　　　　نوعِ انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے
ظلم بھولے، راگنی انصاف کی گانے لگے　　　　لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلّانے لگے؟
مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور وشین　　　　کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسین؟

خیر، اے سوداگرو! اب ہے تو بس اس بات میں　　　　وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی　　　　جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

وقت کا فرمان اپنا رُخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں!

(شمارہ، ۱۲۳-۱۲۲، سنہ ۱۹۶۱ء)

نیا دور

حفیظ جالندھری

نئے دور میں ۔ نشہ اُتر جائے گا شخصی قوت کا
بر سرِ بزمِ عام چلے گا دورِ جامِ اخوت کا
قیدِ بشر کی زنجیریں جمہور کے ہاتھوں ٹوٹیں گی
غلبۂ زر کی تقدیریں مزدور کے ہاتھوں پھوٹیں گی

نئے دور میں ۔۔ محنت سرمایہ گردانی جائے گی
مفت خور کی توند نہ عالی پایہ جانی جائے گی
قدرِ ہنر معیارِ نظر ہی سے پہچانی جائے گی
پیسے پر منقوش کوئی بھی رائے نہ مانی جائے گی

(شمارہ، ۱۴۶-۱۴۵-۱۴۴، سنہ ۱۹۶۳ء)

نثار میں تری گلیوں پہ .....

فیض احمد فیض

نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں   چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے   نظر چُرا کے چلے جسم وجاں بچا کے چلے

ہے اہلِ دل کے لئے اب یہ نظمِ بست وکشاد
کہ سنگ[۱] وخشت مقید ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جو کے لئے   جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی   کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں

مگر گذارنے والوں کے دن گذرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح وشام کرتے ہیں

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے   کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے   کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی

غرض تصورِ شام وسحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار ودر میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق   نہ اُن کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول   نہ اُن کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے

گر آج تجھ سے جُدا ہیں تو کل بہم ہوں گے   یہ رات بھر کی جُدائی تو کوئی بات نہیں

---

[۱] سنگ را بستند و سگاں کشادند (شیخ سعدی)

گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا　　یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

(شمارہ ۱۶۶-۱۶۵-۱۶۴، سنہ ۱۹۶۵ء)

انسان عظیم ہے

(احمد ندیم قاسمی)

اُس نے تجھے عرش سے بُلایا
انسان عظیم ہے خدایا

تو بسترِ کہکشاں پہ لیٹا　　تاروں کو بتا رہا تھا راہیں
اس خاک کے تودۂ رواں پر　　پڑتی ہی نہ تھیں تری نگاہیں
وہ تجھ کو زمیں پہ کھینچ لایا
انسان عظیم ہے خدایا

تو نور ہی نور بن رہا تھا　　وہ خاک ہی خاک چھانتا تھا
آنکھیں تھیں تری جھلک سے محروم　　لیکن تجھے دل سے مانتا تھا
اب چھونے لگا ہے تیرا سایا
انسان عظیم ہے خدایا

تو سنگ ہے اور وہ شرر ہے　　تو آگ ہے اور وہ اُجالا
تو نم ہے، نمو کا پاسباں وہ　　تو دشت ہے، وہ چراغِ لالہ
اُس نے ہی تجھے حسیں بنایا
انسان عظیم ہے خدایا

تو عینِ حیات ہے مگر وہ　　　تزئینِ حیات کر رہا ہے
اس پر ہے غلط فنا کا الزام　　　سامانِ ثبات کر رہا ہے
اب جینے کا ڈھب سمجھ میں آیا
انسان عظیم ہے خدایا

تو وقت ہے، رُوح ہے، بقا ہے　　　وہ حُسن ہے، رنگ ہے، صدا ہے
تو جیسا ازل میں تھا، سواب ہے　　　وہ ایک مسلسل ارتقا ہے
ہر شے کی پلٹ رہا ہے کایا
انسان عظیم ہے خدایا

(— انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کی دوسری سالانہ کانفرنس میں پڑھی گئی)

(شمارہ ۱۴ - سنہ ۱۹۵۲ء)

جشنِ آزادی

اسرار الحق مجاز

بہ صد غرور، بہ صد فخر و نازِ آزادی　　　مچل کے کھل گئی زلفِ درازِ آزادی
مہ و نجوم ہیں نغمہ طرازِ آزادی　　　وطن نے چھیڑا ہے اس طرح سازِ آزادی
زمانہ رقص میں ہے زندگی غزل خواں ہے

ہر اک جبیں پہ ہے اک موجِ نورِ آزادی　　　ہر ایک آنکھ میں کیف و سرورِ آزادی
غلامی خاک بسر ہے حضورِ آزادی　　　ہر ایک قصر ہے اک بام طورِ آزادی
ہر ایک بام پہ اک پرچم زر افشاں ہے

ہر ایک سمت نگارانِ یاسمیں پیکر　　　نکل پڑے ہیں در و بام سے مہ و اختر
وہ سیلِ نور ہے، خیرہ ہے آدمی کی نظر　　　بہ صد غرور و ادا خندہ زن ہے گردوں پر

زمینِ ہند کی جولانگہِ غزالاں ہے

صدا دو انجمِ افلاک رقص فرمائیں — بتانِ کافر و سفاک رقص فرمائیں
شریکِ حلقۂ ادراک رقص فرمائیں — طرب کا وقت ہے بے باک رقص فرمائیں

اب ایسے میں کہ تقاضائے بزمِ رنداں ہے

ہے پاک ابرِ غلامی سے آسمانِ وطن — یہ کام کر گئے آخر بلاکشانِ وطن
ابھی تو خیر سے وہ چند ہو گی شانِ وطن — ابھی تو اور بھی مہکے گا بوستانِ وطن

کہ یہ بہار پیامِ صد بہاراں ہے

یہ انقلاب کا مژدہ ہے انقلاب نہیں — یہ آفتاب کا پرتو ہے آفتاب نہیں
وہ جس کی تاب و توانائی کا جواب نہیں — ابھی وہ سعیٔ جنوں خیز کامیاب نہیں

یہ انتہا نہیں، آغازِ کارِ مرداں ہے

(شمارہ ۲ - ۱، سنہ ۱۹۴۸ء)

مگر عورت کا دل کتنا؟

شاد عارفی

پہلے شہناز کے گھر ہو آؤں — پھر بتاؤں گا تجھے اے ہمدم
رات وہ جال بُنا ہے میں نے — پھنس کے رہ جائے گا آہوئے حرم

باز آتا ہے کہیں عزمِ جواں — پیش دستی سے نہ چوکے غالب
یاد کر برقِ فلاں اور فلاں — اور پھر میں نے جو بدلے قالب

تو نے بی اے نہ کیا پاس اب تک — لڑکیوں پر تری دام اندازی
یہ ترے عزم کے دو رُخ کیسے — کہیں گھامڑ تو کہیں ہے نازی

دوست فطرت بھی تو کوئی شے ہے　　یعنی "رنگین" ہوں ہیں تو "سادہ"
میں نے اک چال چلی تھی لیکن　　عقد پر وہ نہ ہوئی آمادہ!

آپ کو میرا پیام شرعی　　ایک دیوانے کی بڑ تھی گویا
"قاقم وصوف" میں پیوندِ پلاس　　اس جسارت پہ کئی دن رویا

کل تھی معذور "پسندِ خاطر"　　آج مختار ہے، مجبور نہیں
ابھی رستے میں یہ سوچا میں نے　　آپ سب کچھ ہیں پہ مشہور نہیں

ذوق مرحوم کے اسباب نمود　　کوئی تالاب، کوئی پل بے شک
حوض قاضی ہو کہ پیلا تالاب　　یادگاروں کا مخالف ہے فلک

لاٹ، مینار، ابوالہول، ہرم　　ابدیت کا یہ امکان ہی کیا
دے نہ تاریخ گواہی جب تک　　ذکر تھا، آپ پہ احسان ہی کیا

ساتھ ہے اُن کے مری ہمدردی　　جن کو ماحول غلط ملتا ہے
طیش آتا ہے مجھے فطرت پر　　پھول کانٹوں میں اگر کھلتا ہے

اپنے والد کی ہیں اکلوتی آپ　　موت کا نام نہیں ہے گالی
وہ جو اللہ کو پیارے ہو جائیں　　صاف میدان افق تک خالی

مُند گئی آنکھ تو ہر دولت مند　　خاک کے ڈھیر میں تبدیل ہوا
گھاس رہتی نہیں برسات کے بعد　　"حال" ماحول میں تحلیل ہوا

آپ کو بھی نہ بھلا دے دنیا　　گھاس رہتی نہیں برسات کے بعد

نام اولاد سے" کے؟ پشتوں تک"　　اصل او جعل میں فروعات کے بعد

فلم لائن پہ کبھی غور کیا؟　　اس میں شہرت کی وہ رفتار کہ آج
روشنی اپنی سبک سیری پر　　سست رو، پست قدم، سرد مزاج

ابھی جھاڑو پھری شہناز کا نار　　ڈپٹی صاحب نے پڑھا اور روئے
"بمبئی کا کوئی "زچہ خانہ"　　کنواریاں ہیں انھیں اللہ کھوئے

(شمارہ ۵۰-۴۹، سنہ ۱۹۵۵ء)

حلقۂ آغوش

مخدوم محی الدین

جز تیری آنکھوں کے کن آنکھوں نے
لطف کا ہاتھ رکھا، درد کی پیشانی پر
پیار کی آنکھوں سے آنسو پوچھے
نرم یاد،
لمحۂ وصل کی مانند
دل وجاں میں اُترتی ہی چلی جاتی ہیں
ہجر کی شام ہے، ڈھل جائے گی
وصل کا لمحہ گریزاں ہے، پگھل جائے گا
تیرے رخسار کی دھکی ہوئی رنگین شفق اور بھی سرخ ہوئی
تیرے سلگے ہوئے ہونٹوں کے مہکتے شعلے اور بھی تیز ہوئے
کب چھلک جائے نہ جانے تری لبریز وفا آنکھوں سے مہر کی مے

کب نکل آئے ترے پیار کا چاند
توڑ دے حلقۂ زنجیر شب و روز
کہ یہ سلسلۂ کرب و الم ختم تو ہو
اور ہو جائے جنوں آوارہ
تو مرے حلقۂ آغوش میں آ

(شمارہ ۲۰۲ - سنہ ۱۹۶۸ء)

جدائی

سید مطلبی فرید آبادی

بنجارہ دوسرے مذہب کا فرد ہے جو جبر یہ اپنے گھر سے نکالا جا رہا ہے۔ کسان دوسرے مذہب کے ہیں، وہ متحیر ہیں۔ رنگا چار دیہاتی سوانگوں میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو کومن ٹیٹر (Commentator) کی ہوتی ہے۔

رنگا چار

ٹانڈہ چھوڑ چلا بنجارہ　　　کت بستی کر چلی سواری
دیس اُجڑا پردیس کو دھایا　　　لُٹ گئی باغ بہاری
لٹ گئی باغ بہاری سجنو لُٹ گئی باغ بہاری
ٹٹو لٹ گئے ٹانڈ چھن گئے　　　چھن گئی سندر ناری
مات پتا کے ہاڑ بھی چھوڑے　　　چھوٹی بھومی پیاری
چھٹ گئی بھومی پیاری سجنو چھوٹی بھومی پیاری

کسان

مت پردیس کو جا نردوشی　　　کب جانا تیرا چاہیں

کہے نو دھرتی تیری جوتیں　　بھیٹ[2] پہ چھپر چھپائیں

بھیٹ پہ چھپر چھپائیں رے پیارے بھیٹ پہ چھپر چھپائیں

ٹوٹو دیکھیں ٹاٹر ڈھونڈیں　　دوجا تیرا بیاہ رچائیں

گام جو اُجڑا پھر بس جائے　　ایسی راہ چلائیں

ایسی راہ چلائیں رے پیارے ایسی راہ چلائیں

رنگا چمار اور کسان

ہاتھ جوڑ بنجارہ کہوے　　سُن لو دیس بستیا[3]

دیس سے کاڑھن[4] ہارے دوجے　　تم سب اپنے بھیّا"

تم سب اپنے بھیّا رے سجنو تم سب اپنے بھیّا

ناڑ[5] ہلائی بندر بانٹ پر　　وہ ہی اپنے ناؤ کھویّا

جب جمنا میں دھارا پھاٹے　　کس سے کریں دھمیّا[6]!

کس سے کریں دھمیّا رے سجنو کس سے کریں دھمیّا

بوہر[7] سے بھاگے پاکستان سے　　اِت کے بوہرے اُت کو جائیں

جن بجھیا[8] میں بیر ٹکا دیں　　واہی میں آگ لگائیں!

واہی میں آگ لگائیں رے سجنو واہی میں آگ لگائیں

ان کے واڑی سب رجواڑے　　ان کے واڑی پولیس سپاہی

تم تو روکا، وہ میرے کاڑھا　　تم میں سکت نہیں ہے بھائی

رنگا چمار

اتنا کہہ بنجارہ چل دیا　　روتے رہ گئے دیس کسان

---

[1] بے گناہ [2] دیوار [3] اہل وطن [4] نکالنے والے [5] گردن. [6] ہنگامہ [7] سرمایہ دار [8] بستی

اب کے بچھڑے کب ملتے ہیں　　　ہردے میں یہی ارمان
ہردے میں یہی ارمان ہے سجنو ہردے میں یہی ارمان

(اکتوبر سنہ ۱۹۴۸ء)

جوہو کے کنارے

میراجی

اُفق پہ دُور، کشتیاں ہی کشتیاں
کوئی قریب بارِ نور سے عیاں
تو کوئی دور کُہر میں نہاں
ہر ایک جیسے ساکن و خموش و پُرسکوں
ہر ایک بادباں ہے ناتواں
مگر ہر ایک ہے کبھی یہاں کبھی وہاں
سکوں میں ایک جستجوئے نیم جاں
حیاتِ تازہ و شگفتہ کو لئے رواں دواں
اُفق پہ دور کشتیاں جہاں تہاں، عیاں نہاں

قریب شورِ ساحل خمیدہ ہے
ہر ایک موج یوں رمیدہ ہے
کہ جیسے آبدیدہ ہے
کہ دُور افق پہ کشتیاں نہیں ہیں کوئی روح پارہ پارہ غم گزیدہ ہے

کنارِ آب سیپیاں ہی سیپیاں ہیں ایک عکسِ ناتواں

اچانک ایک گھٹا اٹھی
اچانک اُس کے پار آفتاب چھُپ گیا
اچانک ایک پل میں کشتیاں بھی مٹ گئیں
کنارِ آب پر کھلی ہوئی پڑی ہوئی ہیں سیپیاں ہی سیپیاں
جہاں تہاں — یہاں وہاں — عیاں نہاں

(مارچ سنہ ۱۹۴۷ء)

آخری رات

سردار جعفری

کرسیاں، میز، فانوس، رنگین جاموں کی دلکش کھنک
بوتلیں
اپنی لمبی سُبک گردنوں میں چھپائے ہوئے
قہقہے - ہچکیاں
اور شرابوں کی رنگت صراحی کے شیشوں پہ بیٹھی ہوئی
سہمی، سُکڑی ہوئی
خوف کے مارے سمٹی ہوئی
کوریا کا لہو
یانکی[1] افسروں کی نگاہوں پہ چھایا ہوا
نوجوانوں کے سینے پلیٹوں میں رکھے ہوئے
ماؤں کی چھاتیاں تیز کانٹوں کے ناخونوں میں

---

[1] مراد امریکی

ننھے بچوں کے گلرنگ رخسار امریکی چھریوں کے نیچے
اور سی یول کا دل، جگر
نوکِ سنگین پر
بم کے شعلوں میں بھونا ہوا
آنسوؤں کی شراب اور چیخوں کا گیت
یانکی ظالمو، قاتلو، بزدلو!
صبح زندہ رہوگے کہ مر جاؤ گے
آج کی رات ہی آخری رات ہے
آخری رات ہے آخری جام ہے
دیکھو کھڑکی کے باہر ذرا جھانک کر
کوریا کی جواں رات کا جسم بارود کی طرح جلنے لگا
اور فضاؤں میں سی یول کے چھاپہ ماروں کی آواز کی بجلیاں ناچ اٹھیں

(شمارہ ۱۰ - سنہ ۱۹۵۱ء)

خون

پروفیسر شور

میں اک محل میں جو کل صبح باریاب ہوا — نظر نواز قیامت کا انقلاب ہوا
الٹ رہے تھے مہ و سال حادثات کے باب — لگا رہا تھا مگر اک رئیس عطرِ گلاب

مری نگاہ میں وہ خون پھر گیا اک بار — جسے قباؤں میں ملتا ہے خواجگی کا خمار
وطن کا خون، ضمیر و نگاہ کی قیمت — تقدسِ حرم و خانقاہ کی قیمت
جو گھل چکا ہے کھنکتے ہوئے پیالوں میں — چھپا چکا ہے جو ہر رات کو اجالوں میں

وہ خونِ عطرِ قبا بھی ہے اور شراب بھی ہے
نشاطِ روح بھی ہے سُنّت و ثواب بھی ہے

(شمارہ ۱۵ ـ سنہ ۱۹۵۲ء)

قطعات

پروفیسر احتشام انصاری

ابتدا و انتہا

مدفنِ تحقیق راز ابتدا ہے یہ جہاں　　　مرقدِ تفسیرِ سِتر انتہا ہے یہ جہاں
اے فرشتو! عرش سے آؤ زیارت کے لئے　　　دہر کا سب سے مقدس مقبرہ ہے یہ جہاں

تہی دامانی

دردآگیں ناکسی کی بات ہی کچھ اور ہے　　　پُر الم بے مائیگی کی بات ہی کچھ اور ہے
ایک بے پایاں خلا ہے تو بھی گرا ے آسماں　　　میرے دامانِ تہی کی بات ہی کچھ اور ہے

تلاشِ فرصت

خم سرِ تسلیم ہے، اپنا اگر حصہ نہیں　　　انبساطِ ہاؤ ہو میں لطف نا و نوش میں
لیکن اے ظالم فلک! اتنی تو فرصت دے کہ ہم　　　اپنے غم کو پیار کرلیں، بھینچ کر آغوش میں

جفائے چرخ

تیرے قرباں بختِ خفتہ! قوتِ بیدار ہوں　　　تیرے صدقے اے خزاں! جانِ گل و گلزار ہوں
ٹوٹ پڑ اے آسماں! اور چھید لے اپنا جگر　　　خیر تیری دشمنی کی، میں کھنچی تلوار ہوں

(شمارہ ۷۳ ـ سنہ ۱۹۵۷ء)

شمعِ آزادی

روشؔ صدیقی

جہانِ آب و گل، اربابِ جاں کی آزمائش ہے
یہ بُت خانہ ترے حسنِ گماں کی آزمائش ہے

ستاروں پر مدارِ رہبری تھا ظلمتِ شب میں
قریبِ صبح خضرِ کارواں کی آزمائش ہے

سہارا لے لیا ہے زندگی کے فکرِ درماں کا!
سکونِ دردمندانِ جہاں کی آزمائش ہے

حرم نادیدہ، بت خانہ گریزاں، برہمن رہبر!
کسی آوارۂ کوئے بتاں کی آزمائش ہے!

زمانے کا تغافل ہو کہ خود اپنی کم آمیزی
بہر صورت خلوصِ دوستاں کی آزمائش ہے

بہار آتے ہی حسنِ لالہ و گل خود عیاں ہوگا
خزاں جیب تنک ہے خاکِ گلستاں کی آزمائش ہے

بہت میں نے ستم ہائے جہاں کے ناز اٹھائے ہیں
مری آشفتگی سارے جہاں کی آزمائش ہے

تغافل کی حدوں سے بڑھ گیا ہے کوئی دیوانہ
اب ان کے التفاتِ ناگہاں کی آزمائش ہے

غمِ ہستی سکوتِ مرگ سے مانوس کیا ہوتا؟
خداوندا حیاتِ جاوداں کی آزمائش ہے

کٹی ہے زندگی کی رات آنکھوں میں مگر خوش ہوں
یہ بیداری کسی خوابِ گراں کی آزمائش ہے

زمانہ جس کو سمجھا امتحانِ صبرِ مجبوری!
وہی دراصل عزمِ کامراں کی آزمائش ہے

گریزاں ہو رہا ہے دامنِ شب شمعِ لرزاں سے
یقینِ وعدۂ نامہرباں کی آزمائش ہے!

بہت ہی سرگراں ہیں شعلہ ہائے شمعِ آزادی
روشؔ اب دامنِ ہندوستاں کی آزمائش ہے

(فروری سنہ ۱۹۴۹ء)

مختصر افسانے

عبدالحمید عدمؔ

اک موج مچل جائے تو طوفاں بن جائے
اک پھول اگر چاہے گلستاں بن جائے

اک خون کے قطرے میں ہے تاثیر اتنی　　　اک قوم کی تاریخ کا عنواں بن جائے

راہ میں سنگِ میل کے نزدیک　　　اک مسافر ملول بیٹھا ہے
یا سفر کی تھکان کافی ہے!　　　یا خلافِ اصول بیٹھا ہے

شکن نہ ڈال جبیں پر شراب دیتے ہوئے　　　یہ مسکراتی ہوئی چیز مسکرا کے پلا
سرور چیز کی مقدار پر نہیں موقوف　　　شراب کم ہے تو ساقی نظر ملا کے پلا

کون ہے جس نے مے نہیں چکھی　　　کون جھوٹی قسم اٹھاتا ہے!
مے کدے سے جو بچ نکلتا ہے
تیری آنکھوں میں ڈوب جاتا ہے

(شمارہ ۱-۲، سنہ ۱۹۴۸ء)

اجنبی

اختر الایمان

تو ہے کچی کونپل اب تک جس کے لوح میں پیار ہی پیار
اور میں گرمی سردی چکھے ڈالی پر اک تنہا پات
تو سچا موتی، میں ہیرا، بکھرا جو برسوں ہاتھوں ہات
تو دو شا کی پہلی کرن ہے، اور میں جیسے بھیگی رات
تو تاروں کے نور کی دھارا، میں گہرا، نیلا آکاش
میں ہوں جیسے ٹوٹتا نشہ، تو ہے جیسے شاخِ نبات
تو ہے اک ایسی شہنائی جس کی دھن میں ناچے موت
تیری دنیا جیت ہی جیت ہے، میری دنیا، چھوڑ یہ بات

تو ہے ایک پہیلی جس کو جو بوجھے وہ جان سے جائے
تو ہے ایسی مٹی جس سے لاکھوں پھول چڑھیں پروان
آ میں تیرا رنگ بھی چھولوں، چھوڑ یہ بھید اور بھاؤ کی بات
میں نے وہ سرحد چھولی ہے، جہاں امر ہو جائیں پران
اے آنکھوں میں کھپنے والی جانے کون کہاں رہ جائے؟
جیون کی اس دوڑ میں پگلی، ہم دونوں ہیں آج انجان،
لیکن اے سپنوں کی دنیا، تو چاہے تو روگ مٹیں
میں نے دنیا دیکھی ہے تو میری باتیں جھوٹ نہ جان
جیون کی اس دوڑ میں پگلی یاد اگر کچھ رہتا ہے
دو آنسو، اک دبی ہنسی، دو روحوں کی پہلی پہچان

(جون سنہ ۱۹۴۷ء)

جنگ

ظہیر کاشمیری

دھن کے کارن، رن جاگ اٹھا، سرخ بگولے چھائے
پورب، پچھم کے مہاراجے آپس میں ٹکرائے
شور مچا، ہر گنگلا اپنے آپ کو بھینٹ چڑھائے

ترلوچن پر بل کھلائے تیر کمان اٹھائے
بے دھڑکے بیری کے پڑ میں بڑھتا بڑھتا جائے
انگ کٹا کر، گھاؤ کھا کر، ہونٹوں میں مسکائے

ٹخ ٹخ، کڑ کڑ، دھن دھن گوجے، دھرتی کانپی جائے
آگ لپک کر بلوانوں کی چتا بنانے آئے
نیزہ چمکا — اُف ترلوچن — بل کا مان نہ کائے

اچھیا گن آنگن میں بیٹھی اپنا من سلگائے
دھانی دوپٹہ ڈھلکائے، کالی لٹ چھٹکائے
نیر بہائے، امرت رس کی چھاگل چھلکی جائے

جنگل منگل، کوئل بولے، بادل شور مچائے
ایسے میں ساجن ہو سنگ، من کی پینگ بڑھائے
اک چھیڑے، دوجا مسکا کر نینوں کو نیہو ڑائے

دھن کے کارن، رن جاگ اٹھے، گھر کا گھر لٹ جائے
اک بدھوا، اور دوجا بک کر اپنا سیس کٹائے
دھن والا یوں لبتی ڈھا کر راج محل بنوائے

(شمارہ ۲-۱، سنہ ۱۹۵۱ء)

تابِ سخن

جاں نثار اختر

ہند صدیوں کی غلامی سے تو آزاد ہوا　　تم بھی آزاد ہوئے؟ اہلِ وطن سے پوچھو
غنچۂ گل کے چٹکنے کی صدا تو آئی　　پھول بھی کوئی کھلا شاخِ چمن سے پوچھو
آج ذرّات کے سینے میں اندھیرا تو نہیں　　جگمگاتی ہوئی نوخیز کرن سے پوچھو
اب تو ساحل پہ پیاسا نہیں مرتا کوئی　　موجۂ گنگ و لبِ رودِ جمن سے پوچھو

اب تو محفل میں نہیں حکم زباں بندی کا
رنگ خاموشیٔ اربابِ سخن سے پوچھو

آج تو زہر بھرے جام نہ پینا ہوں گے
لذتِ تشنگیٔ کام و دہن سے پوچھو

اب تو جینے کی تمنا میں نہیں مرنا ہے
دربدر لاشۂ بے گور و کفن سے پوچھو

کل کے وعدے کہیں شرمندۂ ایفا تو نہیں
سادگی ہائے بتِ وعدہ شکن سے پوچھو

اب تو دل پر اثر جادوئے افرنگ نہیں
تو طلسمِ نگہِ سحر فگن سے پوچھو

اب تو پیدا نہیں منصورِ بغاوت کوئی
منتظر مرحلۂ دار و رسن سے پوچھو

اب بھی کیا رشک کے قابل نہیں خلدِ کشمیر
گلستانِ ارم و باغ عدن سے پوچھو

اس زمیں پر بھی کسی روز شفق پھوٹے گی
دوستو! خاکِ شہیدانِ وطن سے پوچھو

(ترقی پسند مصنفین کانفرنس بھوپال)

(شمارہ ۳-۱، سنہ ۱۹۴۹ء)

مضمحل خواب

ساحر لدھیانوی

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گذر ہے کہ نہیں
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتا دے مجھ کو
میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں

چار دن کی یہ رفاقت جو رفاقت بھی نہیں
عمر بھر کے لئے آزار ہوئی جاتی ہے
زندگی یوں تو ہمیشہ سے پریشان سی تھی
اب تو ہر سانس گراں بار ہوئی جاتی ہے

میری اُجڑی ہوئی نیندوں کے شبستانوں میں
تو کسی خواب کے پیکر کی طرح آئی ہے
کبھی اپنی سی، کبھی غیر نظر آتی ہے
کبھی اخلاص کی صورت کبھی ہرجائی ہے

پیار پر بس تو نہیں ہے مرا، لیکن پھر بھی　　تو بتا دے کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں
تو نے خود اپنے تبسم سے جگایا ہے جنہیں　　ان تمناؤں کا اظہار کروں یا نہ کروں

تو کسی اور کے دامن کی کلی ہے لیکن　　میری راتیں تری خوشبو سے بسی رہتی ہیں
تو کہیں بھی ہو ترے پھول سے عارض کی قسم　　تری پلکیں میری آنکھوں پر جھکی رہتی ہیں

تیرے ہاتھوں کی حرارت تیرے سانسوں کی مہک　　سرسراتی ہے میرے ذہن میں پہنائی میں
ڈھونڈتی رہتی ہیں تخیل کی باہیں تجھ کو　　سرد راتوں کی سلگتی ہوئی تنہائی میں

تیرا الطاف وکرم ایک حقیقت ہے مگر　　یہ حقیقت بھی حقیقت میں فسانہ ہی نہ ہو
میری مانوس نگاہوں کا یہ محتاط پیام　　دل کے خوں کرنے کا اک اور بہانہ ہی نہ ہو

کون جانے مرے امروز کا فردا کیا ہے　　قربتیں بڑھ کے پشیمان بھی ہو جاتی ہیں
دل کے دامن سے لپٹتی ہوئی رنگیں نظریں　　دیکھتے دیکھتے انجان بھی ہو جاتی ہیں

میری درماندہ جوانی کی تمناؤں کے　　مضمحل خواب کی تعبیر بتا دے مجھ کو
ترے دامن میں گلستاں بھی ہیں ویرانے بھی
میرا حاصل، میری تقدیر بتا دے مجھ کو

(شمارہ، ۲-۱، سنہ ۱۹۵۱ء)

حاکم کے دروازے پر

قتیل شفائی

آبدیدہ مفلسوں کا ایک انبوہِ غفیر　　دیر سے بیٹھا ہے اپنے آنسوؤں کی چھاؤں میں
آرزوؤں کے سنہرے طوق ہیں زیبِ گلو　　حسرتوں کو لوریاں دیتے سلاسل پاؤں میں

یوں بھٹکتی ہے ساعت آہٹوں کے آس پاس
جس طرح پیاسے مُسافر اجنبی صحراؤں میں

زندگی حیراں ہے زیرِ سایۂ دیوارِ غم
دُور تا حدِ نظر کوئی جھروکا بھی نہیں
لاکھ وعدے مل چکے ہیں تشنگانِ دید کو
اس عنایت میں بظاہر کوئی دھوکا بھی نہیں
ایک افسونِ سخاوت چھا گیا ہے چار سُو
جس کی شدّت کو کسی نے بڑھ کے روکا بھی نہیں

کوئی آئے گا، کب آئے گا، کدھر سے آئے گا
ہو رہی ہیں زرد چہروں میں یہی سرگوشیاں
پیٹ کے دوزخ میں ایندھن بن کے فاقے جل گئے
آہ لیکن مصلحت زادوں کی پردہ پوشیاں
دے رہی ہیں آپ ہی اپنے سوالوں کا جواب
آس کے گنبد میں چلاتی ہوئی خاموشیاں

اُف یہ سنّاٹا، یہ افسردہ دلی، یہ بے حسی
جانے کیوں اب تک کسی نے غم کو للکارا نہیں
کیوں ہواؤں میں جھُلاتی ہے تمنّا رُوح کو
یہ تو اک سایہ ہے امیدوں کا گہوارا نہیں
جانے کیوں ان جھلملاتے آنسوؤں کی گود میں
سیکڑوں تارے ہیں لیکن کوئی انگارا نہیں

کپکپاتے ہونٹ آئیں جراَتِ اظہار تک
اب تو خاموشی بھی رُودادِ زمانہ بن گئی
کھُل گئے یُوں آبروپرور بغاوت کے عَلم
مصلحت آپ اپنے تیروں کا نشانہ بن گئی
سُن کے آوازِ شکم حاتم تو بہرہ بن گیا
اور چکراتی زمیں گندم کا دانہ بن گئی

(شمارہ ۱۹، سنہ ۱۹۵۲ء)

فٹ پاتھ پر

کیفی اعظمی

اِن کے آگے اُن کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو تم
قوم کی خاطر بڑی تکلیف فرماتے ہو تم

عہد تو باندھا ہے تم نے عہد گو بودا سہی	ہاتھ میں روٹی نہیں روٹی کا منصوبہ سہی

آفریں کس کس طرح بھوکوں کو بہلاتے ہو تم
اِن کے آگے اُن کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو تم
قوم کی خاطر بڑی تکلیف فرماتے ہو تم

بڑھ کے باپو سے بھی باپو کے ہیں بیچے جانشیں	وہ برت رکھتے تھے تنہا وہ بھی آئے دن نہیں

اور اب ہم سے برت ہر روز رکھواتے ہو تم
اِن کے آگے اُن کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو تم
قوم کی خاطر بڑی تکلیف فرماتے ہو تم

پیاس کی شدت کا یہ عالم کہ جلتی ہے زباں	سانس لیتا ہوں تو اٹھتا ہے کلیجے سے دھواں

اور ابھی تک جام کے نقشے ہی بنواتے ہو تم
اِن کے آگے اُن کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو تم
قوم کی خاطر بڑی تکلیف فرماتے ہو تم

اُٹھ گیا محکومیت کے ساتھ کپڑوں کا رواج	بال کھولے پھر رہی ہے گھر کے اندر گھر کی لاج

اور کہاں چھپ چھپ کے طیاروں پہ منڈلاتے ہو تم
اِن کے آگے اُن کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو تم
قوم کی خاطر بڑی تکلیف فرماتے ہو تم

ہو گئے آزاد جو وہ کیا کریں گے لے کے گھر	چاندنی راتیں بسر ہوتی ہیں اب فٹ پاتھ پر

جھونپڑے پھونکو مکاں کا ذکر کیوں لاتے ہو تم
اِن کے آگے اُن کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو تم
قوم کی خاطر بڑی تکلیف فرماتے ہو تم

(شمارہ ۲۱، سنہ ۱۹۵۲ء)

بڑھوا[1] منگل[2]

وامق جونپوری

فتح و ظفر کا شور اٹھا
صد مرحبا، صد مرحبا
مغرب کا خونی دیوتا
تھک کر بالآخر رہ گیا
صد مرحبا، صد مرحبا
بھولے ہوئے دن عیش کے
پھر سب کو یاد آنے لگے
رنگین نغمے زیست کے
پھر مل کے سب گانے لگے
عشرت کا ساماں ہو گیا
اونچے محل جلنے بجھے تھے
سب میں چراغاں ہو گیا
گنگا میں بھی موج آ گئی
غمگیں دلوں کو بھا گئی
ساحل پہ بجرے لگ گئے
سازِ طرب بجنے لگے

کس درجہ مرغوب و حسیں
ریتی پہ آتش بازیاں
چھُٹنے لگیں چھُٹنے لگیں
یہ آگے پیچھے کشتیاں
سیرِ چراغاں کو رواں
بجنے لگیں شہنائیاں
لٹنے لگیں رعنائیاں

سب کچھ ہے لیکن کس لئے
اس جشن کے سارے مزے
بے کیف لگتے ہیں سبھی
ہر تارِ جاں بے تاب ہے
اور تشنۂ مضراب ہے
بادِ مخالف چل گئی
مسرور دل کو مل گئی

ساحل کی جانب اک نظر

---

[1] یہ نظم جشن فتح کے موقع پر لکھی گئی تھی [2] بڑھوا منگل اس میلے کا نام ہے جو بنارس میں کشتیوں پر لگا کرتا تھا۔ تقریباً پندرہ سال کے بعد یہ میلہ جشنِ فتح کے موقع پر ایک بار پھر منایا گیا۔

اوکم نظر او بے خبر
یہ اجتماعِ بیکراں
یہ خلقتِ پیر و جواں
بھوکے ہیں یا بیمار ہیں
ننگے ہیں یا مردار ہیں
لیکن یہ منکنکا[۱] نہیں
کیا اس جگہ گنگا نہیں
یہ تو دساسومید[۲] ہے
اس میں بھی کوئی بھید ہے
مانجھی وہیں لے چل مجھے
سوگند اس جل کی تجھے
کشتی مری اب موڑ دے
لے جاکے مجھ کو بھی وہیں
اُن سیڑھیوں پر چھوڑ دے
بجنے دے یہ شہنائیاں
لٹنے دے یہ رعنائیاں
یہ مطربہ، یہ روشنی
یہ قمقموں کی چاندنی
جب مانگیں تب مل جائے گی

جب چاہیں تب کھل جائے گی

بیڑا کنارے دیکھ کر
بیرے اشارے دیکھ کر
مجمع یہ کیوں پھٹنے لگا
ہر شخص کیوں ہٹنے لگا
کائی نما حیوان یہ
بھیڑی نما انسان یہ
ڈھیلا گرا اور چھٹ گئے
کوئی بڑھا اور ہٹ گئے

اے ہمدمِ دیرینہ سُن
اے سینۂ بے کینہ سُن
تو نے نہ پہچانا مجھے
کیا جانے کیا جانا مجھے
یہ تیرا جسمِ نازنیں
مجبور رہ کر بھی حسیں
ہے نیم عریاں کس لئے
مجبورِ عصیاں کس لئے
نظروں سے مایوسی عیاں

---

۱ منکنکا اس گھاٹ کا نام ہے جہاں اہلِ ہنود اپنے مُردے جلاتے ہیں۔
۲ دساسومید وہ گھاٹ ہے جہاں اہلِ شہر خوشیاں منانے آتے ہیں۔

چہرے پہ عزبت کے نشاں
کاسہ گدائی کا لیئے
افلاس کا پیالہ لیئے
حلقے پڑے ابرو ترے
گھٹے پڑے بازو ترے
کیا دیکھنے کو آئے تھے
کیا مانگنے کو آئے تھے
سہمے ہوئے سوکھے ہوئے
کیوں لب ترے خاموش ہیں
بھولے ہوئے سمٹے ہوئے
نالے کہاں روپوش ہیں
کچھ میری سن یا خود سنا
کیا سچ بھی کہنا ہے بُرا

کاشی[1] کی ایسی دل نشیں
کتنی مقدس سر زمیں
حجروں میں جس کے قربنا
شیخ و برہمن جاگزیں
مسجد بھی مندر بھی یہاں

اونچے خداؤں کے مکاں
سنتے تھے لیکن آج ہی
یہ بھی حقیقت دیکھ لی
دکھن سے اُتر کی طرف
بہتی ہے گنگا بھی یہیں

جب جشن کا یہ وقت ہے
پھر زندگی کیوں سخت ہے
کہنے کی ساری بات ہے
اس روشنی سے کچھ نہیں
یہ رات پھر بھی رات ہے
دریا کا پانی لال ہے
فطرت کا دل پامال ہے

وہ مطربہ، وہ قمقمے
بجروں سے وہ بجرے سجے
اسّی[2] کو واپس ہو گئے
ننگے جو تھے ننگے رہے
بھوکے جو تھے بھوکے رہے
پھولوں کی چادر کیا کرے

---

[1] کاشی ۔ صرف اسی مقام پر گنگا جنوب سے شمال کی جانب بہی ہے اور یہ گنگا کا الٹا بہنا ہے
[2] اسّی ۔ بنارس کا آخری گھاٹ ہے ۔

نغموں سے دوزخ کیا بھرے
فتح و ظفر کا شور اُٹھا
صد مرحبا، صد مرحبا

(جون سنہ ۱۹۴۸ء)

خودکشی

سلام مچھلی شہری

یوں تو کہنے کو نئے سر سے بہار آئی ہے
پھر بھی قسمت مرے گلشن کی وہی ہے کہ جو تھی
تتلیاں رقص کناں، ساز بہ لب موجِ نسیم
چشمِ نرگس میں ابھی تک وہ نمی ہے کہ جو تھی

واہ کیا بات ہے اے ساحرۂ موسمِ گل!
ہاتھ پھولوں کو لگاؤں تو بدن جل جائے
تو نہ دیکھے تو میں سمجھوں کہ یہی جنت ہے
نظریں اُٹھ جائیں تو یہ سرو و سمن جل جائے

میں نے سوچا تھا کہ آتی ہے بہارِ جاوید
اک نئی بزمِ مسرت کا تو ساماں کر لوں
صبح ہوتے ہی تو کھل جائیں گی تازہ کلیاں!
کیوں نہ پہلے ہی سے گلشن میں چراغاں کر لوں

میں نے اشکوں کو سکھایا کہ تبسم بن جاؤ
داغ ہائے دلِ ویراں میں جلائیں شمعیں
اور میں صبحِ بہاراں کے لئے کیا کرتا!
اور کیا کرتیں مرے شوق کی ٹھنڈی نعشیں

باغباں خوش ہے کہ کلیوں پہ جوانی آئی
عصمتِ جلوہ گہِ گنگ و جمن لوٹیں گے
اور خزاں سوچ رہی ہے کہ نشہ بڑھنے دو
ایک بار اور نئی تازہ چمن لوٹیں گے

کیا کروں سوچ رہا ہوں کہ خود اپنے ہاتھوں
سالہا سال کی تعمیر مٹا ہی ڈالوں
سپنے تعمیر یہ تخریب اگر ٹل نہ سکے!
اپنے محبوب گلستاں کو جلا ہی ڈالوں

یُوں تو کہنے کو نئے سر سے بہار آئی ہے
پھر بھی قسمت مرے گلشن کی وہی ہے کہ جو تھی

(شمارہ ۳-۱، سنہ ۱۹۴۹ء)

دُنیا پاگل خانہ

تنویر نقوی

دنیا پاگل خانہ

ہر کوئی سودائی اس میں　　　ہر کوئی دیوانہ
دنیا پاگل خانہ

پاگل پن کی رام کہانی　　　پیار کا ہر افسانہ
بلبل کا ہر گانا
گل کا اشک بہانا
بھونرے کا منڈلانا

پیار کرے مرجائے چکوری　　　چاند رہے بیگانہ
جان بوجھ کر آگ میں کُودے　　　پاگل ہے پروانہ
دنیا پاگل خانہ

چاندی کی چھن چھن کی لَے پر جن کے گھنگرو باجیں
لوبھ کے بھوکے دولت والے جن کے پاس براجیں
وہ انسان کی مائیں بہنیں
کیوں کرتی ہیں غیرت کا بیوپار
اے انسانو! کیوں لگتے ہیں، روپ رنگ بازار

کیوں یہ مائیں
کیوں یہ بہنیں
بیچ رہی ہیں ، عزت
روپ
جوانی　　دنیا ہے دیوانی
آنکھ نے دیکھا ، دل نے جانا　　دنیا پاگل خانہ
دھوپ کڑکتی
جیٹھ مہینہ
دہقاں ماٹی پر چھڑکے ہے　　اپنا خون پسینہ
چیرے ہے دھرتی کا سینہ
دانے بوئے
دیکھے بھالے　　ماں بن کر پودوں کو پالے
ان پودوں سے
ان کھیتوں سے
جب وہ اپنی محنت کاٹے　　پھل کوئی لے جائے
یہ "ان داتا" بھوکا دہقاں　　ہاتھ اپنے پھیلائے
بھوک بھیک میں پائے
ان جان ، دہقان بچارا
کتنا ہے دیوانہ
دنیا پاگل خانہ

(مارچ ، سنہ ۱۹۴۷ء)

بھوک اور آزادی

(احمد ریاض)

یہ فرمانِ شہی صدیوں سے سنتے آرہے ہیں ہم　　کہ بھوکے رہ کے بھی آزادیٔ ملت کے گُن گاؤ
وطن کی آبرو پر کٹ مرو اے مرگ آشنا ہو　　حسیں محلوں کی خاطر جھونپڑوں پر آگ برساؤ

یہ فرمانِ شہی صدیوں سے سنتے آرہے ہیں ہم　　کہ ہے آزادیٔ دل اک جہانگیری شہنشاہی
شکم کی فکر ہے تخلیقِ آدم کی جواں مرگی　　رضا و ضبط میں پنہاں ہے احساسِ خود آگاہی

یہ فرمانِ شہی صدیوں سے سنتے آرہے ہیں ہم　　کہ شاہِ وقت ظلّ اللہ کی تفسیر ہوتا ہے
رعایا کے لئے ہے حکمِ حاکم، حکمِ ربانی　　ارادہ خواجگی کا ملک کی تقدیر ہوتا ہے

یہ فرمانِ شہی صدیوں سے سنتے آرہے ہیں ہم　　کہ اپنے لاڈلوں کو نذرِ جنگِ سیم و زر کر دو
ردائیں نوچ لو ماؤ، قبائیں پھونک دو بہنو　　نو بیلی دلہنو، اب زہر پی پی کر بسر کر دو

یہ فرمانِ شہی صدیوں سے سنتے آرہے ہیں ہم　　کہ دلکش جنتوں کے رنگ چھڑکو جام چھلکاؤ
بناؤ مرمریں خوابوں کی رنگ آمیز تصویریں　　حسیں تاروں سے کھیلو چاند کے پہلو میں سو جاؤ

یہ فرمانِ شہی صدیوں، بہرصورت سنے ہم نے　　سہی برسوں عتابِ قیصری کی ظلم آرائی
مگر اب زندگی اک غیر مبہم موڑ پر آکر　　بالآخر جادہ و منزل کے زنداں سے نکل آئی

اب انساں پا چکا اپنے مقاصد کی حقیقت کو　　اب انساں اپنا منصب اپنی عظمت کھو نہیں سکتا
غلامی کے سلاسل کاٹ کر نکلے ہیں دیوانے　　اب آزادی کی رہ میں کوئی کانٹے بو نہیں سکتا

اب انساں چند قزاقوں کی بہبودی کے بدلے میں　　بھیانک موت کا سحر آفریں دھوکا نہ کھائے گا

اب انساں خوانِ استبداد کی توقیر کی خاطر رسیلی بھوک کی تقدیس کے نغمے نہ گائے گا

سنبھالو! تاجِ خسروؔ، قصرِ قیصر، تختِ پرویزی بچاؤ! جاہِ کسریٰ، سطوتِ اسکندر و دارا
وہ دیکھو یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو پھوٹا
مشیت کا کلیجہ چیر کر تدبیر کا دھارا

(شمارہ ۲ - اگست ۱۹۵۱ء)

پشیمانی

مسعود اختر جمال

سرد ہے دل کی فضا، ذہن پہ طاری ہے جمود
چشمکِ برق و شرر اب نہیں پیمانوں میں دعوتِ فکر و سخن اب نہیں مے خانوں میں
وہ گدازِ دل و جاں شمع کی فطرت میں نہیں عشق کا سوزِ یقیں اب نہیں پروانوں میں
لے اُڑی اہلِ جنوں کو ہوسِ نام و نمود
سرد ہے دل کی فضا، ذہن پہ طاری ہے جمود

سطوتِ بزمِ جہاں کس کو دکھاؤں آخر
ہم نفس کون ہے، پیغامِ سحر دوں کس کو راہرو کوئی نہیں، اذنِ سفر دوں کس کو
رہ گئے دشت و جبل، گردِ جنوں بیٹھ گئی کارواں گم ہوا، منزل کی خبر دوں کس کو
مژدۂ فتح و ظفر کس کو سناؤں آخر
سطوتِ بزمِ جہاں کس کو دکھاؤں آخر

کیا طوفان تھا اک موج نہ ساحل سے اُٹھی
عرصۂ زیست بھی اک شعلۂ برہم تھا مگر پیکرِ عالمِ نو چشمِ جہنم تھا مگر

رہزنِ ہوش تھی یہ جنگ و جدل کی دنیا　　قحطِ بنگال بھی اک سانحۂ غم تھا مگر
آہ بھی لب پہ نہ آئی، نہ فغاں دل سے اٹھی
کیسا طوفان تھا، اک موج نہ ساحل سے اٹھی

برق سے خوف نہ صیاد سے شکوہ ہے مجھے
اپنی ہی آگ سے جلتا ہے نشیمن اپنا　　اپنی ہی آنچ سے لو دیتا ہے گلشن اپنا
اپنے قدموں ہی سے پامال ہے گھر اپنا جمال　　اپنے ہاتھوں ہی سے اب چاک ہے دامن اپنا
اپنے ذوقِ ستم ایجاد سے شکوہ ہے مجھے
برق سے خوف نہ صیاد سے شکوہ ہے مجھے

آج میں اپنے ہنر سے ہوں پشیماں اے دوست
دور یہ بے ہنری کا ہے بہ اندازِ ہنر　　نہ وہ دل ہے نہ وہ دنیا ہے نہ وہ فکر و نظر
کیا سناؤں گا زمانے کی خبر میں تجھ کو　　سچ تو یہ ہے مجھے ملتی نہیں اپنی بھی خبر
تیری محفل میں ہوں با دیدۂ گریاں اے دوست
آج میں اپنے ہنر سے ہوں پشیماں اے دوست

(اردو کانفرنس لکھنؤ)　　(شمارہ ۲-۱، سنہ ۱۹۴۸ء)

پہلو سے اٹھ کر

مخمور جالندھری

پہلے سے جان نہ پہچان تکلف کی حدود
اک تبسم کے ذرا پھیلتے ہی ٹوٹ گئیں
سرسرانے لگی خوابیدہ رگ و پے میں شراب

اک نظر اٹھی لیے کاغذی پھولوں کی بہار
کاغذی پھول نگاہوں نے ٹٹولیں جیبیں
دوسری اٹھی کسوٹی کے کمالات لیے
جس سے پرکھے گئے سن، جسم، خدوخال ابھار
اک جھجک اور بندھی سیرابیٔ ارماں کی امید
بندھی امید ذرا اور بھی قربت سمٹی
چاندنی رات کا چھٹکا ہوا جادو بولا:
"سوچتے کیا ہو گوارا ہے گوارا کر لو"
فربہ اندام کھسری جیب نے سرگوشی کی:
"شرم اب چھوڑ دو میداں میں اُتارو فن کو
آج کی رات تہی دست ہی گھر جاؤ گی؟"

اُدھر ارماں کہ ضرورت سے زیادہ مل جائے
اِدھر اُمید کسی بات پہ انکار نہ ہو
چاہے اسراف "تنویق" سے تجاوز کر جائیں
زلفیں کھل جائیں بکھر جائیں ذرا شانوں پر
زلفیں کھل جاتی ہیں، شانوں پہ بکھر جاتی ہیں
نرم مرمر سی حقیقت پہ سے پردے اُٹھ جائیں
پردے اٹھ جاتے ہیں تابندگی بڑھ جاتی ہے
یہ سکڑنے کی سمٹنے کی بناوٹ چھوڑو
دیر ہونے کا جو خدشہ ہے تلاطم بن جاؤ
چند ہلکوروں میں ساحل پہ سفینہ ہوگا

چند ہلکوروں میں ساحل پہ سفینہ پہنچا
چیخ اٹھا ماہ جبیں رات کا اُترا چہرہ
"سوچتی کیا ہو اٹھو کوئی بہانہ کر کے
اکتفا کر لو، زیادہ کی توقع چھوڑو
بیسوا ہی تو نہیں ماں بھی ہو دو بچوں کی
خوف اُگلتی ہوئی تنہائی میں ڈرتے ہوں گے
مانا تم ان کے لئے ہی یہ ستم سہتی ہو
لیکن اک روز سہارا بھی تو وہ دیں گے تمہیں"

اور پھر ڈھلتی ہوئی رات کے جوبن نے کہا:
"اُٹھو وہ دیکھ رہی ہوگی تمہاری بیوی
آج تنخواہ کا دن ہے وہ ابھی جاگتی ہے
اُس کے آویزے اب اس ماہ تو بننے سے رہے
اٹھو رستے ہیں بہانہ بھی تو کرنا ہے تلاش"
اٹھے پہلو سے تو دونوں ہی فسردہ اُٹھے!

(شمارہ ۲-۱، سنہ ۱۹۴۸ء)

جمہوری سیلاب

نیاز حیدر

قدم قدم پہ کھلے ہیں بغاوتوں کے علم	بچھی ہوئی ہے ہر اک قصر میں صفِ ماتم
دھماکے گونج رہے ہیں فضاؤں میں پیہم	غمِ حیات پہ طاری ہراس کا عالم
غمِ حیات کی بنیاد ڈھا رہے ہیں ہم

مثالِ سیلِ رواں بڑھتے جا رہے ہیں ہم

مصیبتوں نے بھی دیکھا قریب آ کے ہمیں　　　پرکھ لیا ہے مظالم نے بھی ستا کے ہمیں
فریب دے کے کبھی اور کبھی ڈرا کے ہمیں　　　ستم نے دیکھ لیا خوب آزما کے ہمیں

ستم شعار کو آج آزما رہے ہیں ہم
مثالِ سیلِ رواں بڑھتے جا رہے ہیں ہم

دلوں میں جوش نگاہوں میں ہے غضب کا جلال　　　ہزار آندھیاں ہمراہ سیکڑوں بھونچال
ہیں سب کے سب متبسم کوئی نہیں ہے نڈھال　　　ٹپک رہا ہے جبینوں سے دورِ نو کا جمال

نئی حیات کا پیغام لا رہے ہیں ہم
مثالِ سیلِ رواں بڑھتے جا رہے ہیں ہم

(مئی سنہ ۱۹۴۷ء)

گونج

منیب الرحمٰن

آج انسانوں کی آواز سنی ہے میں نے
فرطِ مستی سے مچلتے ہوئے انسانوں کی
مضطرب
شدتِ جذبات سے گرمائی ہوئی
موجۂ آہنِ سیال کے مانند رواں
چند دیوانوں کی آواز نہیں
خشم آلود
غضب ناک، مہیب

موت کے شانوں پہ لہراتے ہوئے سانپوں
کی زہر آمیز سلگتی پھنکار

آج انسانوں کی آواز سنی ہے میں نے
لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں
چراگاہوں میں
کارخانوں کی سُرا چلتی ہوئی نبضوں میں
شاہراہوں کی پھڑکتی ہوئی شریانوں میں
دہر میں دور تلک پھیلی ہوئی کانوں میں

سینۂ خاک پہ چلتے ہوئے ہل
دیو اندام مشینوں کے چٹختے اعضا
بحرِ ذخّار کو دلتے ہوئے گمبھیر جہاز
رقص
موسیقی
عمارات
کتابیں
اصنام
اَن گنت ہونٹ
ہزاروں آنکھیں
کبھی خاموش
کبھی گرم سخن
آج حق اپنا طلب کرتی ہیں

آج انسانوں کی آواز سنی ہے میں نے
سوویت روس کے انسانوں کی
چین کے
ہند کے انسانوں کی
خطۂ پاک کے انسانوں کی
شرق اور غرب کے انسانوں کی
میرا احساس
مرا دل، مرے دست و بازو
میرا ہر تارِ وجود
اسی آواز میں تحلیل ہوا چاہتا ہے
اے خدایانِ کلیسا و حرم!
اے جفا پیشہ سیاست کے علم بردارو!!
آج للکار کے کہتی ہے زبانِ انساں
زندہ باد امنِ جہاں
تم اس آواز سے تھراتے ہو
اور میں اس کے حسیں دھاگوں سے
اپنے نغمات بُنا کرتا ہوں

(شمارہ ۲-۱، سنہ ۱۹۵۱ء)

دستک کے بعد

حامد عزیز مدنی

اے دوست، یہ دروازہ مقفّل کب تک
اک آہنی چادر میں سمیٹے ہوئے جسم
محفوظ ہے یہ جبر کا ہیکل کب تک

باہر تو ہے آشفتہ سروں کا وہ ہجوم
اک اک ہے رقیبِ غمِ آداب و رسوم

ان کھوکھلے خوابوں کی ہے کب تک میعاد
گہری ہے بہت ہو کہ نیند آ جائے
سونا رہے قانون کا سنگِ بُنیاد

دے گا کوئی ایک آدھ مہذّب دستک
لیکن وہ زمانہ ہے کہ جھپکی جو پلک

اک خواب نظر آئے گا بے لاف و گزاف
کھا جاتے ہیں محلوں کو زمینوں کے شگاف
خود وقت کی زلفیں نہیں پابندِ مباف

پھل سخت کدالوں کے جو پڑ جائیں گے
لوہے کے ہوں ٹانکے تو اُدھڑ جائیں گے

لہ عزیز حامد مدنی

(شمارہ ۲-۱، سنہ ۱۹۵۱ء)

فریب

ظہور نظر

دوستو!
ساتھیو!
رات گہری سہی
رات کالی سہی
رات اندھی سہی
پھر بھی اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم
جستجو کی ٹھٹھرتی ہوئی پیٹھ پر
لاد کر رنج و غم
وادیٔ مرگ کی راہ پر ڈال دیں
لڑکھڑاتی ہوئی زندگی کے قدم

دوستو!
ساتھیو!

اس سے پہلے کہ ہم
لڑکھڑا کر گریں
موت کے تیرہ و تار آغوش میں
اک نظر اپنے ماحول کو دیکھ لو!
ایک پل سوچ لو—!!

سالہا سال کی نیند کے بعد جب
ہم اُٹھے اور باندھا تھا عزمِ سفر
کون منزل تھی اس وقت پیشِ نظر
کیا یہی تھی کہ ہم رات کے سائے میں
ہاتھ میں اجنبی خنجروں کو لیے
آپ اپنے ہی خوں میں نہا جائیں گے
وحشیوں اور سانپوں کی مانند ہم

اپنے ہی بال بچوں کو کھا جائیں گے

دوستو!
ساتھیو!
ایک پل سوچ لو — !!
ہم اُٹھے تھے —
کہ اپنے وطن کی زمیں
اجنبی خاک سے پاک کر دیں گے ہم
ہم چلے تھے —
کہ تاریکیوں کا جگر
شمعِ انوار سے چاک کر دیں گے ہم
ہم بڑھے تھے —
کہ ظلم و تشدد کے کہسار کو پیس کر خاک کر دیں گے ہم

لیکن اے ہم سفر دوستو، ساتھیو!
اپنی ہی سرزمیں ہم کو بھٹکا گئی
اوڑھ کر ایک جھوٹی سحر کی ردا
اجنبی رات ہم سب کو بہکا گئی
ہم فریبِ رہ و رہبراں کھا گئے
ہم کہاں جا رہے تھے کہاں آ گئے

دوستو!
ساتھیو!

زندگی کی طویل اور کٹھن راہ میں
رات گہری سہی
رات کالی سہی
رات اندھی سہی
پھر بھی اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم
بند آنکھیں کیے
سرد آنسو لیے
بے جھجک، بے الم
جستجو کی کھٹکتی ہوئی پیٹھ پر
لاد کر رنج و غم
وادیٔ مرگ کی راہ پر ڈال دیں
لڑکھڑاتی ہوئی زندگی کے قدم

ہم سفر دوستو، ساتھیو، ہمدمو!!
اس سے پہلے کہ ہم
لڑکھڑا کر گریں
موت کے تیرہ و تار آغوش میں
اک نظر اپنے ماحول کو دیکھ لو
ایک پل سوچ لو — !!
ہم کہاں جا رہے تھے —
کہاں آ گئے — !!!

(شمارہ ۳-۱، سنہ ۱۹۴۹ء)

آخری ملاقات

احمد راہی

محو ہو جائے گا یہ عہدِ حسیں — خواب ہو جائیں گی ملاقاتیں
بھول جائیں گی ایک دن ہمدم — تجھ کو میری، مجھے تری باتیں

عہد و پیماں و دل نشیں قسمیں — ایک دھوکا ہے اک سراب ہے یہ
زندگی اک کھلی حقیقت ہے — کون کہتا ہے ایک خواب ہے یہ

جل بجھے ہیں ہزار ہا دامن — ان سلگتے ہوئے چناروں میں
کتنے طوفاں ہیں جانے پوشیدہ — وقت کے تیز و تند دھاروں میں

اک تغیر یہ ہے مدارِ حیات — کسی شے کو یہاں ثبات نہیں
روک لیں سرسراتے لمحوں کو — آہ یہ اپنے بس کی بات نہیں

یاس و اندوہ سوزشِ پیہم — حاصلِ عہدِ دل ستاں ہے یہی
تیرے اور میرے خواب کی تعبیر — ایک عالم کی داستاں ہے یہی

گونج اٹھی ہے دیکھ شہنائی — صبحِ نوخیز مسکراتی ہے
نغمہ و نور کے کنایوں میں — تیری منزل تجھے بلاتی ہے

اپنے ماضی کے ٹوٹے سپنوں سے — آ غمِ آرزو کو بہلائیں
زندگانی کے اس دوراہے پر
مسکراتے ہوئے بچھڑ جائیں

(جون، سنہ ۱۹۴۷ء)

عورت اور شراب

شاد امرتسری

میری بھابی
شام ہوتے ہی چڑھاتی ہے —
کسی تکیے پہ اُجلا سا غلاف
اور تکیے کے پرانے میل کو
دیکھنے والوں کی نظروں سے —
چھپا لیتی ہے جب
اک دھواں اُٹھتا ہے میرے دل کے پاس

اور پھر میں سوچتا ہوں میرا دل
ایک تکیہ ہے کہ جس کو درد و غم کے میل نے
بخش دی ہے ایک عمر لازوال
اور اس تکیے پہ میں
دیکھنے والوں کی نظروں سے چھپانے کے لئے
شام ہوتے ہی چڑھا دیتا ہوں اُجلا سا غلاف
لیکن اس کا میل چھپتا ہی نہیں

(شمارہ ۱۳۷ سنہ ۱۹۶۳ء)

باجی

تیغ الٰہ آبادی

فلک کا ایک تقاضا تھا بنتِ مریم سے
زمیں کی تیرہ نصیبی کہ اک حسین کلی
سلگ سلگ کے رہے اور پلک جھپک نہ سکے
چٹک کے پھول بنے اور پھر مہک نہ سکے

ہر ایک شخص کو محروم آرزو پا کر
ہمارے پست گھروں کے اُداس کمروں میں
ہم اپنی خندہ مقامی پہ ہنستے ڈرتے تھے
کسے خبر کہ تبسّم گناہ ہوتا ہے

تری ہنسی، تری بے باک، بے حجاب ہنسی
بکھرا ہوا ہے نگاہوں میں زندگی کی دھواں
مرے لہو میں دراریں بنا کے اُتری ہے
بس ایک شعلۂ شب تاب میں شرر کیوں ہے

لہ مصطفیٰ زیدی

جو میرے دل میں خلیجیں بنائے بیٹھی ہے — وہ اک شکن ترے ماتھے پہ مختصر کیوں ہے
ابھی ہوئی ہے ستاروں پہ آنسوؤں کی نمی — ترے چراغ کی لو اتنی تیز تر کیوں ہے

نئے شوالے میں جا کر کسی کے تیشے نے — بہت سے بُت تو گرائے بہت سے بُت نہ گرے
بس ایک خندۂ بے باک ہی سے کیا ہوگا — بس ایک جرأتِ ادراک ہی سے کیا ہوگا

وہ اپنی موت وہ اپنے فریب ہی کی سہی — کوئی تڑپ، کوئی حسرت، کوئی مراد تو ہے

تری ہستی سے تو میری شکست ہی بہتر
مری شکست میں تھوڑا سا اعتماد تو ہے

(شمارہ ۲۶-۲۵، سنہ ۱۹۵۳ء)

ہارا ہوا جواری

اشعر ملیح آبادی

سکوتِ نیم شبی زہر بن کے چھایا ہے — مہکتی شام امیدوں کے ساتھ ڈوب گئی
حقیقتوں سے بجھے خود فریبیوں کے دیئے — سنہرے خوابوں پہ چھائی ہوئی ہے تاریکی

ابھرتی آتی ہیں بیتے دنوں کی سب چوٹیں — بہت شدید ہوئی جا رہی ہے تنہائی
رو پہلی سپنوں میں جیون تمام بیت گیا — کوئی امید مگر آج تک نہ بر آئی

میں چاند تاروں کی کرنوں سے جال بنتا رہا — فرازِ کاہکشاں پر جمی رہیں نظریں
مگر جب آنکھ کھلی تو عجیب عالم تھا — نہ چاند تھا نہ ستاروں کی نقرئی کرنیں

میں اپنی نکبت و افلاس سے پریشاں حال — ہزاروں رنگ محل روز و شب بناتا تھا
اور آج جب مرے ماتھے پہ ہے "سند" کا غرور — کھڑا ہوا ہوں وہیں پر جہاں سے اٹھا تھا

وطن کی سیج پہ پھولوں کی آرزو کی تھی　　نئے نظام کے خوابوں میں غرق رہتا تھا
بہت خوشی تھی کہ آزاد ہو گیا ہے وطن　　سحر ہوئی تو ہر اک سمت خون بہتا تھا

بساطِ زیست پہ ہارا ہوا جواری ہوں　　نہ جانے کس لئے باقی ہے دولتِ احساس
جدھر اُٹھاؤ نظر بس نامُرادی ہے
کوئی نہیں ہے جو آکر بندھائے میری آس

(شمارہ ۴ ۔ سنہ ۱۹۵۱ء)

پاکستان آتے ہوئے

ایک تاثر

جگن ناتھ آزاد

ہیں آج رقص میں عہدِ طرب کے مےخانے　　چھلک رہے ہیں نگاہوں سے دل کے پیمانے
جہانِ شوق کا ہر ذرہ پیچ و تاب میں ہے　　یہ کس نے روح کو آواز دی خدا جانے
سنا گئے مری پلکوں پہ آکے اشک رواں　　ہزار تلخ حقائق ہزار افسانے
وطن میں ایک غریب الدیار آتا ہے　　خدا کرے کہ اسے یاں کوئی نہ پہچانے
دیارِ غیر میں اپنوں کی جستجو کیسی
عزیز و خویش و اقارب تمام بیگانے

(شمارہ ۲۸، سنہ ۱۹۵۳ء)

گیت

مقبول حسین احمد پوری

کیسے تم کو پا سکوں گا
ہر طرح مجبور ہوں

جب تمہیں دل میں جگہ دے کر خودی کو بھول کر
آہ بھرتا ہوں تو ہو جاتا ہے دل زیر و زبر
کیسے جی سمجھا سکوں گا
دل سے جب رنجور ہوں

جلوہ آنکھوں میں سماتا ہے تمہارا جب کبھی
آنسوؤں کی راہ بہہ جاتا ہے گویا اپنا جی
آنکھ سے کیوں پا سکوں گا
دیدۂ بے نور ہوں!

خواب کی دنیا میں گر آئے کبھی صورت نظر
آنکھ کھلتے ہی وہ عالم ہوگا یک دم منتشر
فہم میں کیا لا سکوں گا
اس قدر جب دور ہوں

آنکھ کیوں کر دیکھ پائے وہ جمالِ دل نشیں
آہ دل بھی تو حریم ناز کے قابل نہیں
ہر طرح مجبور ہوں!

(جون سنہ ۱۹۴۷ء)

میکدۂ نو

مجید لاہوری

یہی دستورِ کہن ہے ترے مے خانے کا

ایک وہ ہیں کہ جو تلچھٹ سے بھی یکسر محروم　　ایک وہ ہیں کہ جو پینے کی طرح پیتے ہیں
ایک وہ زیست جنہیں حاصلِ صد عمرِ دوام　　ایک وہ ہیں جو نہ جینے کی طرح جیتے ہیں

یہی دستورِ کہن ہے ترے مے خانے کا

گر کوئی رند یہ آئین بدلنا چاہے — تو اسے مست نگاہوں سے سزا دیتا ہے
گیسوؤں میں یوں جکڑتا ہے کہ جکڑا رہ جائے — آتشِ سُرخیٔ عارض میں جلا دیتا ہے
یہی دستورِ کہن ہے ترے مے خانے کا

وقت مے خانے میں لایا ہے بغاوت کا پیام

تشنہ لب جی میں یہی ٹھان کے آج آئے ہیں — سختیاں سہہ کے یہ دستورِ کہن بدلیں گے
موت کی چال بھی اس راہ میں چلنا ہوگی — وہ بہر رنگ یہ فرسودہ چلن بدلیں گے
وقت مے خانے میں لایا ہے بغاوت کا پیام

اب یہ تقسیم کا انداز بدل جائے گا — مے کدہ بدلے گا ساقی کو بدلنا ہوگا
اب اس آئین کو بنیاد جفا ہے جس کی — اپنی بھڑکائی ہوئی آگ میں جلنا ہوگا
وقت مے خانے میں لایا ہے بغاوت کا پیام

اب تو مے خانے میں اک اور ہی دنیا ہوگی

مٹ کے رہ جائے گی وہ تشنہ لبی کی لعنت — سب پہ یکساں مرے ساقی کی عنایت ہوگی
روحِ صد کوثر و تسنیم کھنچی آئے گی — وہی جنت جو فسانہ تھی حقیقت ہوگی
اب تو مے خانے میں اک اور ہی دنیا ہوگی

اب جوانی کے مچلنے کا سماں آئے گا — جوشش پیر قلقل مینا کی صدا آئے گی
رقص کرتا نظر آئے گا فضاؤں میں شباب — زہدِ صد سالہ کی بے طرح قضا آئے گی
اب تو مے خانے میں اک اور ہی دنیا ہوگی

(اکتوبر سنہ ۱۹۴۶ء)

نقشِ ماضی

رفعت سروش

دیکھ یہ صبحِ زمستاں کہر میں لپٹی ہوئی
اوس میں بھیگی ہوئی
ٹھنڈ میں ٹھٹھرے کھڑے ہیں —
اس گلی کے سب مکاں
دھوپ آئی ہے فقط مسجد کے اُس مینار پر

اک شکستہ گھر کا دروازہ کھُلا
ایک لڑکا، ننگے سر اور ننگے پاؤں

گھر سے نکلا ہاتھ بغلوں میں دبائے
اور بستہ اپنے سینے سے لگائے
ملگجی سی ہے دمک اُمید کی
اس کے چہرے پر اُداسی کے بجائے
چل دیا اسکول کو گردن جھکائے

ہے یہی لڑکا امینِ زندگی
ہاں اسی لڑکے کا رفعت نام ہے

(شمارہ ۹۶، سنہ ۱۹۵۹ء)

تموّج

کمال احمد صدّیقی

مری کھڑکی کے شیشے پر
ابھی تک آخری شبنم کا قطرہ تھرتھراتا ہے
اسی شبنم کا قطرہ — جس نے کلیوں کو نمو بخشی
فضائے انجم و مہتاب کی جس میں صباحت ہے
وہی شبنم کا قطرہ تھرتھراتا ہے مری کھڑکی کے شیشے پر!

ستارے ڈوبتے ہی چاندنی بھی ہو گئی مدھم
مگر وہ ایک تارہ اپنی تنہائی سے بے پروا شمالی وادیوں پر ٹمٹماتا ہے!

وجودِ رہبرِ اعظم بھی اشکِ کس مپرسی ہے
نظامِ شب نے جس کو سمِ قاتل جان کر بھی پی لیا اور خودکشی کر لی !!

شبِ مہتاب کی آنکھوں کا اشکِ آخری شاید وہی تنہا ستارہ ہے
مری کھڑکی کے شیشے پر جو شبنم بن کے اب بھی تھرتھراتا ہے !

حقیقت کیا ہے یُوں تو ایک آنسو کی
مگر سورج کی جب ننھی کرن اس سے گذرتی ہے
تو رنگوں میں سنورتی ہے
دھنک بن کر نکھرتی ہے

حقیقت کیا ہے یُوں تو سرد اور بے رنگ آنسو کی
کہ قوسِ قزح کے کچھ رنگ سورج کی کرن کے کچھ عناصر ہیں !!

وہ مشرق کے افق پر سُرخ لہریں تھرتھراتی ہیں
انہیں میں خونِ ماہ و زہرہ و پروین بھی شامل ہے !!!

(شمارہ ۲-۱، سنہ ۱۹۷۸ء)

میرا گھر

کنول پرشاد کنول

میرے گھر کا حال نہ پوچھو		جینا ہے جنجال نہ پوچھو
گھر والے ہی گھر کے دشمن
دو اُنگل دھرتی کے کارن ہے بھائی بھائی میں اَن بَن

کیسا پھیل رہا ہے گھر میں ماتوتا[1] کا کال نہ پوچھو
میرے گھر کا حال نہ پوچھو

ڈاکو اپنا گھر بھرتے ہیں
مستی دیکھو کنگالوں کی آپس میں کٹ کٹ مرتے ہیں
اس مستی کی بھینٹ چڑھے گا گھر کا کتنا مال نہ پوچھو
میرے گھر کا حال نہ پوچھو

راکھ ہوئے کتنے انگارے
میرے سونے سے امبر[2] میں ڈوب گئے کتنے ہی تارے
دم توڑیں گے میرے آنگن میں کتنے ۔ بنگال نہ پوچھو
میرے گھر کا حال نہ پوچھو

جھوٹے کنکر جھوٹے پتھر
مت پوچھو کب تک پوجے جائیں گے میرے گھر کے اندر
کوڑی کوڑی مول بکیں گے کب تک میرے لال نہ پوچھو
میرے گھر کا حال نہ پوچھو

لٹی لاج لہو ٹپکاتی
گھائل ممتا اپنے خوں سے دسوں دشاؤں[3] کو نہلاتی
پران نرلج آنکھوں کے ڈورے کب ہوں گے لال نہ پوچھو
میرے گھر کا حال نہ پوچھو

---

[1] انسانیت　[2] آسمان　[3] سمتیں

اب ارجن کا تیر کہاں ہے
جھیلے اَسّی گھاؤ بدن پر وہ سانگا رندھیر کہاں ہے
کہاں گیا ٹیپو کا بھالا، لکشمی کی کرواں نہ پوچھو
میرے گھر کا حال نہ پوچھو!

سلہ تلوار　　　(مارچ سنہ ۱۹۴۷ء)

شراب خانہ

منظر سلیم

(۱)

شراب خانے میں بیٹھا ہوں سوچنے کے لئے
نہ جانے کتنے خیالوں کا راز داں بن کر
نہ جانے کتنی حدوں سے گذرتا جاتا ہوں

مگر حدوں سے گذر کر فریب کھاتا ہوں
کہ یہ حدیں تو پھر آجائیں گی کہیں نہ کہیں
نظر کی راہ میں دیوارِ آسماں بن کر

فریب کھانا بڑی بات تو نہیں لیکن
یہ چند لمحوں کی دیوانگی ہی کیا کم ہے
یہ چند لمحے جو آتے ہیں میہماں بن کر

(۲)

شراب خانے میں بیٹھا ہوں سوچنے کے لئے
نہ جانے کتنے خیالوں کا راز داں بن کر
نہ جانے کتنے خیالوں سے پوچھتا ہوں میں

یہ درد کیسا ہے یوں جس میں مبتلا ہوں میں
یہ کیسا غم ہے جو دل کو جلائے جاتا ہے
کبھی شرارِ جہنم، کبھی دھواں بن کر!

نہ جانے شام و سحر کے نگار خانے سے
یہ تیر کون مری سمت پھینک دیتا ہے
مرے تڑپتے ہوئے دل کا پاسباں بن کر؟

(۳)

مگر خیال کہاں بولتے ہیں ایسے میں
کہاں سے آئے گی آواز، کون بولے گا؟
بغیر جانے ہوئے راز کون کھولے گا؟

یہ چند لمحے جو آتے ہیں میہماں بن کر
کہیں یہ رُوٹھ نہ جائیں کہ میں اکیلا ہوں
ہر ایک لمحے کی آمد پہ اُٹھ نہ پاؤں گا
شراب ختم ہوئی جا رہی ہے رات آئی
زمانے بھر کی نگاہوں کا بار اُٹھائے ہوئے
یہاں سے اُٹھ کے کہاں اور کیسے جاؤں گا؟

(شمارہ ۲-۱، سنہ ۱۹۴۸ء)

قافلہ

فکر تونسوی

کہاں چلے ہو دوستو!
لہو لہو نگاہ میں غمِ نہاں لیے ہوئے
چھلکتے آنسوؤں میں دردِ بیکراں لیے ہوئے
لبوں پہ ایک تشنگی کہ جیسے کوئی آکے جوئبار سے پلٹ چلے
کہ جیسے اک ستارہ ٹوٹ کر فضائے تیرگی میں ڈوب جائے
کہ جیسے ایک گیت چیخ بن کے تھر تھرائے
میں سوچتا ہوں، تم امنگ بن کے سینۂ زمیں پہ کیوں رہے؟
اگر رہے تو پھوٹ کر شگفتہ پھول کیوں بنے؟
اگر بنے تو کیوں نہ دستِ گُل فروش کی لپک جھپک سے بچ سکے؟
— گلو جیں گلو — فسردگی کی مورتو! کہاں چلے؟
اُٹھا کے زرد لاش اپنے نغمہ ہائے شوق کی
سنبھال کر دلوں میں بے بسی کی چند دھڑکنیں
نکل کے اپنی وادیوں سے ڈھونڈتے ہوئے بہار بے مقام کو
بچھڑ کے اپنے گیت سے، فلک سے اپنے ٹوٹ کر

طلسمِ دستِ گل فروش کے اثر سے بے خبر
کہاں چلے ہو دوستو!

کہاں ملو گے دوستو!
اُفق کی اُس لکیر پر؟
سُنا رہی ہے آسماں کو جو زمیں کی داستاں
کہ ہم نے کیسے اپنی بے بسی کے راز بیچ کر
بنا دیا تھا چند تاجروں کو پاسبان چار سُو
لڑے تھے ہم، چلے تھے ہم، بہی تھیں خوں کی ندّیاں
مگر ـــــ
جب ایک دن کہ اپنے گیت جا رہے تھے چیختے ہوئے
اُٹھے اور ہم نے اپنے رازِ بے بسی کو پا لیا
بڑھے اور اپنی کھیتیوں کے، وادیوں کے راستے کو جا لیا
بچھڑ کے مل گئے افق کی لالہ گوں لکیر پر ـــــ
وہاں ـــــ جہاں یہ زندگی ہے آپ اپنی دھڑکنوں کی پاسباں
وہاں ـــــ جہاں یہ دستِ گُل فروش بھی رسا نہیں
جہاں بہار بے نشاں نہیں
روش روش پہ گھومتی ہے بے خطر
طلسمِ تاج و رنگ و نسل کے اثر سے بے خبر
وہاں ملو گے دوستو!
وہاں ملو گے دوستو!!

(شمارہ ۱-۲، سنہ ۱۹۴۸ء)

۸ر جنوری ۱۹۵۲ء

حمایت علی شاعر

ضعیف ماں ترا فرزند تیرا لختِ جگر　　زمیں کی گود میں خاموش سو گیا ہے آج
جوان دل میں جواں حسرتوں کو دفنائے　　وطن کی خاک کا پیوند ہو گیا ہے آج

کسے دکھاتی ہے تو اپنے دل کی ویرانی　　چمن کا سوزِ دروں گل فروش کیا جانے
یہاں تجارتِ گل ہے بہار کا مقصد　　جو شاخِ گل پہ گذرتی ہے کون پہچانے

بجھا بھی دے کہ یہ اشکوں کے ٹمٹماتے دیئے　　ترے کھنڈر میں چراغاں نہ کر سکیں گے کبھی
تری فغاں ترے نالے فلک شگاف سہی　　کسی خدا کو پشیماں نہ کر سکیں گے کبھی

ترا چٹان سا بیٹا زمیں میں گڑ تو گیا　　ہوئی ہیں کتنوں کی عمریں دراز یہ بھی تو دیکھ
ہر ایک قلب میں ہے سرنگوں بُتِ محمود　　کہاں پہ پہنچا ہے دستِ ایاز یہ بھی تو دیکھ

ضعیف ماں یہ ہے انساں کا خوں جسے پی کر　　یہ "خواجگی" کبھی سرسبز ہو نہیں سکتی
ہزار دل کی سیاہی کو داغِ زہد چھپائے　　نماز خون کے دھبوں کو دھو نہیں سکتی

ہر ایک علم ہے انساں کے ذہن کی تخلیق　　اور علم ذہن سے مستور رہ نہیں سکتا
کچھ اس قدر ہے فزوں تشنگیٔ فکر کہ اب　　کسی تجوری میں محصور رہ نہیں سکتا

ہم اپنے خون سے جلائیں گے راستوں کے چراغ　　اور ان چراغوں سے اک کہکشاں بنائیں گے
جہاں جہاں بھی بہا ہے لہو شہیدوں کا　　وہیں وہیں پہ بنائے حیات ڈالیں گے

لہ پاکستان کی خونی تاریخ جب دن تعلیمی سہولتوں کے مطالبے کے سلسلے میں پرامن طلبہ کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا

یہ قبر، قبر نہیں مکتبِ شعور ہے یہ — یہیں پہ زیست کے نقشے سنورنے والے ہیں
یہ شمع، ہاں اسی شمعِ مزار کی لو سے
ہزار ماہ و خورشید اُبھرنے والے ہیں

(شمارہ ۳۵-۳۴، سنہ ۱۹۵۴ء)

بانو کے نام

احمد فراز

ملوکیت کے محل کی گناہ گار کنیز — وہ جُرم کیا تھا کہ تجھ کو سزائے مرگ ملی
وہ راز کیا تھا کہ تعزیرِ ناروا کے خلاف — تری نگاہ نہ بھڑکی تری زباں نہ ہلی
وہ کون سا تھا گناہِ عظیم جس کے سبب — ہر ایک جبر کو تو سہہ گئی بطیب دلی

یہی سُنا ہے بس اتنا قصور تھا تیرا — کہ تُو نے قصر کے کچھ تلخ بھید جانے تھے
تری نظر نے وہ خلوت کدوں کے داغ گنے — جو خواجگی کو زر و سیم میں چھپانے تھے
تجھے یہ علم نہیں تھا کہ اس خطا کی سزا — ہزار طوق و سلاسل تھے تازیانے تھے

یہ رسم تازہ نہیں ہے اگر تری لغزش — مزاجِ قصر نشیناں کو ناگوار ہوئی
ہمیشہ اُونچے محلات کے بھرم کے لئے — ہر ایک دور میں تزئینِ طوق و دار ہوئی
کبھی چُنی گئی دیوار میں انارکلی — کبھی شکنتلا پتھراؤ کا شکار ہوئی

مگر یہ تخت یہ سلطاں یہ بیگمات، یہ قصر — مؤرخین کی نظروں میں بے گناہ رہے
بفیضِ وقت اگر کوئی راز کُھل بھی گیا — زمانے والے طرفدارِ کج کلاہ رہے
ستم کی آگ میں جلتے رہے عوام مگر
جہاں پناہ ہمیشہ جہاں پناہ رہے

(شمارہ ۲۸، سنہ ۱۹۵۳ء)

آج کی خبریں

فساد زدہ علاقے سے ایک خط

نور بجنوری

سنو گی ریڈیو پر تم جب آج کی خبریں — تو اک مہیب تصور سے کانپ جاؤ گی
اگر خیال کے شہپر ابھی سلامت ہیں — تو اپنے آپ کو میرے قریب پاؤ گی

ہر ایک سمت دھوئیں کے سیاہ مینارے — ہراس و خوف کی مانند بڑھتے جاتے ہیں
ابل ابل کے مکانوں سے آگ کے سوتے — لہو اچھالتے جاتے ہیں چڑھتے جاتے ہیں

ادھر فلک پہ سجائی گئی ہے بزم طرب! — برس رہی ہیں ادھر گولیوں کی بوچھاریں
وہاں چمکتا ہوا چاند شرمگیں تارے — یہاں کٹے ہوئے سر بے نیام تلواریں

تمام رات دعاؤں کی مشعلیں لے کر — خدا کے کھوج میں گھومی صدائے آہ و بکا
چھپا ہوا تھا کہاں عرش و فرش کا والی — سحر قریب ہے اس کا مگر پتہ نہ ملا

کسے خبر تھی سیاست کی مطربہ آخر — اجل کے ساز پہ ایسا بھی گیت گائے گی
ضمیر و ہوش و خرد کی چتائیں سلگیں گی — بھنور میں کشتیٔ انسان ڈوب جائے گی

ستارہ صبح کا دم توڑنے ہی والا ہے — ٹپک رہا ہے اجالا افق کے زخموں سے
فضا میں گونج رہی ہیں ہوا کی سرد آہیں — رواں ہیں اشکِ ندامت فلک کی آنکھوں سے

مجھے یقیں ہے کہ اس دکھ بھری سحر کے بعد — اک اور سرخ دمکتی ہوئی سحر ہوگی
اسی سحر کی حسیں چھاؤں میں مری محبوب! — ہماری ایک ملاقاتِ مختصر ہوگی

(فروری سنہ ۱۹۴۸ء)

بہار

دیوندر ستیارتھی

یہ تو موسم کی بات ہے، پیارے! ایک دن کی نہیں بسنت بہار
مجھ سے گھر دور بھی ہے پاس بھی ہے پھول یادوں کے اگیں کھلے اس بار
پھول نے دل کی بات مانی ہے کھل اٹھی گھر سے دور راہگذار
جل اُٹھے گرم آنسوؤں کے دیئے بج اُٹھے خود ہی دل کے نازک تار
کان میں بانسری نے رس گھولا کس نے بھیجا یہ گیت کا اُپ ہار
اک مہکتی ہوئی ہوا آئی ہنس پڑی یاد جیسے گھر کی نار
کالی زلفوں میں پیلا پھول ہنسا آج آئی بہار، جاگا پیار

یہ تو موسم کی بات ہے پیارے
ایک دن کی نہیں بسنت بہار

(شمارہ، ۱۴۰، سنہ ۱۹۶۰ء)

ہمسائیگی

بلراج کومل

آج اس محفلِ فسردہ میں ایسے غافل ہیں جیسے ان سب نے
رنگِ حسنِ بہار کا سایہ نوچ پھینکا ہو اپنی فطرت کو
غم زدہ ہمدموں کے چہروں پر
ڈھونڈتا پھر رہا ہے تابانی

اہلِ محفل قریب آجاؤ
چند گھڑیاں تو کاٹ لیں مل کر

جانے پہچانے لوگ بیٹھے ہیں شاید اس لمحۂ مصیبت میں
پھر بھی ہمسائیگی کی لذت سے چشمِ نم، داستانِ زخمِ دل

ان سے ہوجائے رونقِ محفل

(شمارہ ۱۸، سنہ ۱۹۵۲ء)

سرِ محضر

افضل پرویز

ظالمو! تم نے آقاؤں کے حکم سے　　ہر طرف ظلم کے جال پھیلائے ہیں
اپنی دو روزہ شاہنشہی کے لئے　　زیر دستوں پہ قہر و غضب ڈھائے ہیں

تم نے روندی ہیں نغموں کی کلیاں کئی　　پھونک ڈالے ہیں شعروں کے کتنے چمن
مُو قلم کے شگوفے قلم کردیئے　　اور لُوٹا ہے افکار کا بانکپن

تم نے پنگھٹ کی رعنائیاں چھین لیں　　تم نے کھیتوں کی شادابیاں لُوٹ لیں
پیار کی حسرتوں پر تو پہرے بٹھائے　　اور جوبن کی مہتابیاں لُوٹ لیں

تم نے عیسیٰ کو سُولی پہ لٹکا دیا　　تم نے انساں کی عظمت کو زخمی کیا
تم نے سُقراط کو زہر پلوا دیا　　تم نے روشن صداقت کو زخمی کیا

جھوٹ کو زندگی بخشنے کے لئے　　تم نے سچّا ئیوں کی زباں کھینچ لی
اپنے سر سے قضا ٹالنے کے لئے　　تم نے بھرپور جسموں سے جاں کھینچ لی

آستیں پر لہو کا یہ ایک ایک داغ　　ایک دن حشر اُٹھائے گا، چلّائے گا
جاگ اُٹھیں گے یہ سب کشتگانِ ستم
آخرش ظلم دنیا سے مٹ جائے گا

(شمارہ ۳۲، سنہ ۱۹۵۳ء)

GOVT. COLLEGE LIBRARY ACC. No. 15227

ظلمات

اختر ہوشیار پوری
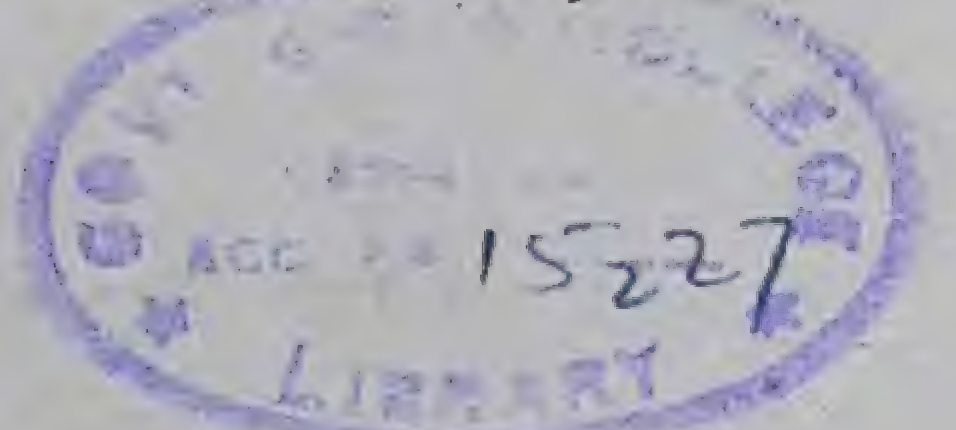
جانے کس سوچ میں ہیں ڈوبی ہوئی
یہ فضائیں، یہ پھیلتے صحرا
جن کے پہلو میں ہیں نہ چشمے نہ پھول
نہ کہیں جھاڑیاں کہ جن کے تلے
بیٹھ کر کوئی راہی سستا لے
چار سو ریت اور ریت ہی ریت
چار سو ظلمتیں کہ جیسے یہاں
روشنی کا کبھی گذر نہ ہوا

روشنی کا کبھی نہ ہوگا گذر!
اور دھندلکوں میں کس نے دیکھا ہے
کسی کونپل کو بار ور ہوتے
آہ! یہ میری بے ثمر اُمّید
جو خزاں میں پلی، خزاں میں بڑھی
جس نے دیکھا کبھی نہ روئے بہار
ایک دن بھی جو مسکرا نہ سکی

(دسمبر سنہ ۱۹۴۷ء)

جھنکار

سیفٹی ایکٹ کے خلاف یوم احتجاج پر

قمر اجنالوی

ایک آواز لرزتی ہے پسِ پردۂ ساز
اپنے لب بستہ مغنی ہیں نوا سے محروم

اور آواز کے سینے میں ہیں فریاد کے گھاؤ
ورنہ جل اُٹھنے کو بیتاب ہے نغموں کا الاؤ

حکم ہے اُن کا ہر اک ظلم سہو چپ بھی رہو
چوٹ کھاؤ بھی تو فریاد نہ ہو لب نہ ہلیں

ایک آنسو بھی دلِ زار کا غمّاز نہ ہو
ساز ٹوٹے بھی تو جھنکار کی آواز نہ ہو

کاٹ دو دشنۂ آئیں سے رگِ پردۂ ساز
سوزنِ حکم سے شاعر کے لبوں کو سی دو

خونِ نغمہ سے مغنّی کی قبائیں بھر دو
بادِ صرصر سے چراغوں کی لوئیں گُل کر دو

کسی بیمار کو تم سے نہیں درماں کی امید　　　تم سے زخموں کا مداوا تو نہیں ہو سکتا
ظلم کے ساتھ یہ دستورِ زباں بندی کیوں　　　یوں علاجِ غمِ فردا تو نہیں ہو سکتا

اب تو ہر زخم کے ہونٹوں سے نوا پھوٹے گی　　　درد سے جرأتِ اظہار بھی پیدا ہو گی
چوٹ شیشے پہ پڑے گی تو صدا ابھرے گی　　　ساز ٹوٹے گا تو جھنکار بھی پیدا ہو گی

(کل پاکستان انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری سالانہ کانفرنس منعقدہ کراچی میں پڑھی گئی)

(شمارہ ۱۵، سنہ ۱۹۵۲ء)

روشنی۔ زندگی

مسلم ضیائی

دوسری جنگ میں امن کے واسطے　　　سرفروشانہ ہم نے بڑھائے قدم
ظالموں، جنگ بازوں کے مغرور سر　　　ہم نے بڑھ کر جھکائے بہ نوکِ قلم

گیت، افسانے، مضمون ہم نے لکھے　　　ان میں کتنی گھن گرج ان میں کتنی روشنی
ہم نے تاریکیوں کو اجالا دیا　　　ہم نے مفلوج سورج کو دی زندگی

ہم نظر ہم قدم آگے بڑھتے رہے　　　مسکراتے رہے، گنگناتے رہے
امن، انسانیت اور انصاف کے　　　ساری دنیا کو نغمے سناتے رہے

تیسری جنگ کے دیوتے آج پھر　　　موت کا ساز چھیڑا ہے چنگھاڑ کر
اور چنگیز و ہٹلر کے لاشے اٹھے　　　اپنی قبروں سے کہنہ کفن پھاڑ کر

اڑ رہے ہیں فضا میں ہوائی جہاز　　　چار جانب ہیں تاریکیاں جنگ کی
ایٹم اور ہائیڈروجن کے بم دیکھ کر　　　فکرِ فردا سے مغموم ہے زندگی

کل جو یورپ میں مصروفِ پیکار تھے　　ایشیا میں وہ تشریف لے آئے ہیں
کرگسوں کی خدائی میں ہر یخ نے　　موت کے نت نئے سانچے بنوائے ہیں

آج اُٹھائے ہیں پھر ہم نے اپنے قلم　　امن کے واسطے، زندگی کے لئے
آج اُٹھائے ہیں پھر ہم نے اپنے قدم　　راہِ تاریک میں روشنی کے لئے

نغمۂ امن میں نے تمہارا پڑھا　　"نعرۂ امن" پڑھنا جو موقع ملے
آج ہم دُور ہیں سیکڑوں کوس پر　　دوسری جنگ میں پاس ہی پاس تھے

آج بھی سب وہی ہے جو اُس وقت تھا　　آج بھی جنگ سے کش مکش ہے وہی
آج بھی سرفروشانہ ہے زندگی　　گر کمی ہے تو بس اک تمہاری کمی

— تم کہ ہو شانتی، روشنی، زندگی

(شمارہ ۵۰-۴۹ - سنہ ۱۹۵۵ء)

چرچل کی چھوری

اودھوکمار

چرچل کی چھوری ہو مورے بھیّا　　لوہو کو اینگر ماتھے پہ بھر کے
چرچل کی چھوری ہو　　تن کے کھڑی آج گوری ہو
نئی دلہنیا بن کے ہو آئی　　چرچل کی چھوری ہو
چرچل کی چھوری ہو　　پہلے ہنسی جے کانیکی جیبری
ماتھے پہ بادر لائی دو دوپٹیا　　دوجے ماؤنٹ نے آنکھن میں گھیری
اسے کہ بٹائی وہیں لٹیا وکھیّا　　تیجے کرپس نے بھالو رکھتی پھیری
دھرتی میں گاڑ دیں داڑھی وچٹیا

۱؎ سینڈور　۲؎ ڈیل

چو بھتے پڑی آگے نہر دکے گرواؔ[1]
صورت بنا بڑی بھوری ہو
چرچل کی چھوری ہو
لائی دہیج میں چیج بڑی بھاری
مہنگی اکال کی بھر لائی تھاری
بھونکھن کے پیٹ کو کاری کٹاری
بڑلاؔ[2] کو سونے کے لائی کنگنوا
دادا پٹیل کو بجوری ہو
چرچل کی چھوری ہو
بولے کسان یہ دلہن بھگائے دیو
ناہی تو یا کو گھونگھٹ ہٹائے دیو

بجریں مجورن کی یا سے ملائے دیو
دیکھیں گے کیسے گریبن کے کھون سے
کھیلے گی ہتھیا ری ہوری ہو
چرچل کی چھوری ہو
کہہ رئے پٹیل نہ کر دچھیڑ کھانی
ابئے ہے نویلی جرا ہون دیو سیانی
ابئے جمیندار راجن پہ دیوانی
ٹھہرو صبر کر دبٹ رہی ہے تم کو
ریشم کی ڈوری ہو
چرچل کی چھوری ہو

(ترقی پسند مصنفین کانفرنس بھوپال)

(شمارہ ۳-۱، سنہ ۱۹۴۹ء)

---

[1] گرو　[2] برلا

نئے انسانوں کا کورس

اختر سعید

تدبیر کی شکلیں بدلی ہیں، تقدیر کے عنواں بدلیں گے
اب عالم عالمِ امکاں ہے، اب عالمِ امکاں بدلیں گے
لیلائے یقیں کے دیوانے اوہام کے زنداں بدلیں گے
اس دور کے انساں بدلے ہیں اس دور کے یزداں بدلیں گے
سینوں میں دبی آہوں کی گھٹن آنکھوں سے رواں اشکوں کی جلن
تقدیر ہیں یہ انساں کی اگر تقدیر کو انساں بدلیں گے

محدود نہ ہونے پائے گی پھولوں کی مہک گلدانوں میں
اب نظمِ گلستاں ہاتھ میں ہے اب نظمِ گلستاں بدلیں گے
ہر سمت فضا میں گونجتی ہے جھنکار ابھی زنجیروں کی
نغموں میں انہی جھنکاروں کی اب اہلِ زنداں بدلیں گے
برسوں سے جنوں کے ہاتھ میں ہیں داماں و گریباں کے ٹکڑے
اندازِ جنوں اب بدلے ہیں داماں و گریباں بدلیں گے
تہذیب کے پردے دھوکے ہیں تعمیر کے ساماں باطل ہیں
تہذیب کے پردے اُلٹیں گے تعمیر کے ساماں بدلیں گے
اب برق نہ سر پر ٹوٹے گی اب قہر نہ گل چیں ڈھائیں گے
ترکیبِ نشیمن بدلیں گے تنظیمِ گلستاں بدلیں گے
بکھریں گے نہ کافر گیسو اب سونے کے دہکتے شانوں پر
اب عشق نے تیور بدلے ہیں اب عشوۂ ترکاں بدلیں گے
سکھلائیں گے حسن خود بیں کو اندازِ نئے دلداری کے
سازِ غمِ جاناں بدلیں گے سوزِ شبِ ہجراں بدلیں گے
اب محملِ لیلےٰ ڈھونڈھ چکے اب منزلِ سلمےٰ دیکھ چکے
صحرائے وفا کے دیوانے اب راہِ بیاباں بدلیں گے
تاریک اُجالے رکھیں گے انساں کو اندھیرے میں کب تک
ہم ماہِ منور بدلیں گے ہم مہرِ درخشاں بدلیں گے
اب زرد خزائیں ختم ہوئیں اب سرخ بہاریں پھولیں گی
اب عالمِ زنداں بدلا ہے اب رسمِ گلستاں بدلیں گے

(ترقی پسند مصنفین کانفرنس بھوپال)

(شمارہ ۳-۱، سنہ ۱۹۴۹ء)

خمارِ دوام

مقصود عمرانی

شمیمِ بادہ فضاؤں میں رسمساتی ہے　　نگارِ شب کی جوانی سنورتی جاتی ہے
خیال گونج رہا ہے کھنکتے ساغر کا　　شرابِ ظرفِ تمنا کو آزماتی ہے
یہ عکسِ بادۂ گلرنگ ہے کہ مشعل ہے　　ردائے شب پہ کرن سی جو پھیل جاتی ہے
کوئی تو پیتا ہے، گردابِ روز و شب کی قسم　　دلِ وجود میں اک شمع جھلملاتی ہے
جو موج اٹھتی ہے ساغر سے رقص فرماتی　　مسافرانِ خرد کا پتہ بتاتی ہے

اُٹھا لے جام کہ تیکھے ہیں وقت کے تیور
کہ آج رات نہ پینا حرام ہے ساقی

جہانِ زر کی پراسرار شاہراہوں پر　　حیات موت کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے
جسے بنایا تھا صدیوں میں زر پرستوں نے　　میں سن رہا ہوں وہ زنجیر کٹتی جاتی ہے
خدا کے نام کی بازی، بساطِ عالم پر　　خرد کی تیز رو آندھی الٹتی جاتی ہے
وہ شمع جو دلِ ییتن میں جھلملائی تھی　　وہ آج سرحدِ برما کو جگمگاتی ہے
یہاں یہ رات گھنی ہے، بہت گھنی لیکن　　وہاں یہ رات سحر بن کے مسکراتی ہے

حیات تیز بہت تیز گام ہے ساقی
کہ آج رات نہ پینا حرام ہے ساقی

یہ ایک میں ہی شکارِ غمِ حیات نہیں　　نظر اٹھا تو سبھی بے شمار آئے ہیں
فنا کی وادی میں پہنچے تھے گلستاں کے لئے　　غموں سے چُور ہیں سینہ فگار آئے ہیں
وہ جن کے قافلے دیر و حرم نے لُوٹے تھے　　وہ بے چراغ، غریب الدیار آئے ہیں
طلسم خانۂ گردوں کی چوٹ کھائے ہوئے　　زمینِ ہند کے پروردگار آئے ہیں
سنا ہے چین میں برسی ہے بادۂ گلرنگ　　شرابِ سرخ کے یہ بادہ خوار آئے ہیں

تری شراب خمارِ دوام ہے ساقی
کہ آج رات نہ پینا حرام ہے ساقی

(انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال میں پڑھی گئی)　　(شمارہ ۳-۱، سنہ ۱۹۴۹ء)

علی عباس حسینی

ACC. No. 15227

ادے ئیہ قابیلی آلے

(پرانی شراب نئی بوتل)

حجری اپنے دوسرے ساتھیوں سے کچھ زیادہ سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ نئی نئی چیزوں کی کھوج میں لگا رہتا تھا۔ وہ بابا کے بنائے ہوئے آلوں میں برابر ترمیم کرتا رہتا۔ گول کو چپٹا، چپٹے کو نوکیلا بنا کر دیکھتا کہ ان سے کون کون سے دوسرے کام لئے جا سکتے ہیں۔

ایک دن اُس نے سوچا سارے آلے پتھر ہی کے کیوں رہیں۔ کوئی آلہ لکڑی کا کیوں نہ بنایا جائے۔ اس کے دماغ میں ایک کاٹھ کی مونگری کا دھندلا سا خاکہ آیا۔ اس نے ایک چوکور چپٹی لکڑی میں ایک نوکیلی لمبی لکڑی پہنانا چاہی۔ اس نے پتھر کے نوکیلے آلے سے چپٹی لکڑی میں بڑی کوششوں سے ایک چھوٹا سا سوراخ کیا۔ مگر لمبی لکڑی اس سوراخ میں نہ جا پاتی تھی۔ اس نے لمبی لکڑی کی نوک سوراخ پر رکھ کر زور زور سے گھمانا شروع کیا۔ وہ پسینے پسینے ہو گیا۔ مگر گھماتا رہا۔ دفعتہً چپٹی لکڑی سے مکڑی کے جال جیسی ایک مہین سی چیز نکلنے لگی۔ حجری نے لمبی لکڑی اور تیزی سے گھمائی۔ مکڑی کا جال کہرے جیسا سیاہی مائل ہو گیا۔ حجری نے کبھی کسی لکڑی کے ٹکڑے سے اس طرح کی چیز نکلتے نہ دیکھی تھی۔ پھر اس نئے کہرے میں ایسی بو تھی کہ اس کا جی متلانے لگا۔ آنکھوں میں بھی مرچیں سی لگیں اور ان سے پانی بہنے لگا۔ وہ ڈر گیا اور آنکھوں سے آنسو پونچھتا اور تھو تھو کرتا بھاگ کر دور کھڑا ہو گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس لکڑی میں کوئی پریت چھپا ہوا ہے۔ وہ کسی بھالو یا بھیڑیئے کی شکل میں نکلنے والا ہی ہے۔ وہ گردن بڑھائے ہوئے بڑے بڑے دیدے نکالے، وہیں سے لکڑی سے ٹکڑوں کو گھورتا رہا — مگر لکڑی کا کہرا ہوا میں غائب ہو گیا، اور وہ پھر جیسی کی تیسی دکھائی دینے لگی۔

حجری سوچنے لگا۔ یہ کیا بات ہے۔ پھر اسے خیال آیا لکڑی میں چھپا پریت باہر نکل کر چلا گیا ہوگا جب ہی وہ اپنے پیٹ سے کچھ نہیں نکالتی۔ وہ ڈرتا، سہمتا، جھجکتا، ٹھٹھکتا، پھر اسی طرف بڑھا۔ اس نے قریب آکر دونوں ٹکڑوں کو پھر غور سے دیکھا، اور ہلکی سی ٹھوکر ماری۔ لمبی لکڑی چپٹی لکڑی سے الگ ہو کر گر گئی۔ اس نے گردن جھکا کر آنکھیں

غور سے دیکھا۔ وہ بے ضرر محسوس ہوئیں۔ اُس نے اب ڈرتے ڈرتے انھیں چھونے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے چپٹی لکڑی کو ایک انگلی سے چھوتے ہی جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ جہاں سے کہرا نکلا تھا وہ حصہ سیاہی مائل بھی تھا اور گرم بھی اُس نے اُسے اٹھا کر اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ اسے سونگھا، پھر جی متلانے لگا۔ پھر ڈر لگنے لگا۔ مگر کھوج لگانے والی خواہش بڑھتی ہی گئی۔ وہ جی کڑا کر کے اکڑوں بیٹھ گیا۔ اور اس نے پروا نہ کی۔ وہ برابر گردن ٹیڑھی کئے لکڑی پر لکڑی رگڑتا ہی چلا گیا۔ دفعتہً دھوئیں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ ایک گرم رَو اس کی انگلیوں میں آ کر لگی۔ ان میں ایک جلن سی پیدا ہوئی۔ اس نے لمبی لکڑی ہاتھ سے چھوڑ دی۔ اور چپٹی میں سے نکلتی ہوئی چمک کو بجھانے کے لئے اس کے پاؤں کے پاس، جو سوکھی پتیاں پڑی تھیں مٹھی بھر اٹھا کر اس پر ڈال دیں۔ اور وہ خود اچھل کر دور کھڑا ہو گیا۔ مگر ان سوکھی پتیوں نے تو اس لال لال چمکتی چیز کو اور بھی بڑھا دیا۔ اب تو ہلکے دھوئیں کے پیچھے ہر طرف لمبی لمبی زبانیں نکالے وہ چیز دوڑنے لگی۔ یہ زبانیں پتیوں ہی کو نہ کھا گئیں بلکہ آس پاس کی سوکھی شاخوں کو بھی چٹخارے لے کر کھانے لگیں۔ اور ہوا کا جو بھی جھونکا ادھر حجری کی طرف آتا، اسے یوں لگتا جیسے وہ بھی جل اُٹھے گا۔

اسی پریشانی میں اُسے یاد آیا کہ اس کے بھائی سنگی نے ایک خاص طرح کے دھوئیں کا ذکر کیا تھا، جو نذر والے پتھر سے نکلتا تھا ——— بابا، سال میں ہر فصل کی پیداوار کا ایک حصہ یا بھیڑوں کے گلے میں سے سب سے اچھا میمنہ اس پتھر پر رکھ دیتے۔ دھوئیں کا ایک حلقہ سا پیدا ہوتا اور اپنے ساتھ ان چیزوں کو اڑا کر لے جاتا۔ مگر کبھی کسی نے اس چیز کا ذکر نہ کیا تھا، جو مینہ کے کوڑے جیسی چمکتی ہوئی ہے اور جو آسمان پر دھاڑنے، چنگھاڑنے کی جگہ زمین پر رینگتی۔ شاخوں پر چڑھتی، لال لال زبان سے پتیوں، گھاسوں، لکڑیوں، پیڑوں کو چٹ کرتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے وہ بھاگا ہوا سنگی کے پاس ان کھیتوں میں گیا، جہاں وہ کھڑا اپنے غلّے کی زرد زرد بالیاں توڑ رہا تھا۔ سنگی، بھائی سے یہ انوکھی روداد سُن کر زیادہ نہ گھبرایا۔ اس نے ایک بار مینہ کے کوڑے کو کالے بادلوں میں سے نکل کر ایک درخت میں لپٹ جاتے دیکھا تھا۔ اس پیڑ سے بھی اسی طرح کی لال لال زبانیں پھوٹ نکلی تھیں، اور اس کی ڈالیوں کو چبانے لگی تھیں۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں بادلوں نے اس سینکڑوں زبان پریت پر اتنے تیر برسا دیئے تھے کہ وہ مردآہیں بھرتا جلد ہی روپوش ہو گیا تھا۔ اس لئے حجری کے ساتھ آتے ہی، سنگی نے ادھر اُدھر نظر ڈالی اور پاس ہی جو چشمہ تھا اس میں سے دونوں چلوؤں میں پانی بھر کر اس لال پریت پر چڑھانا شروع کر دیا۔ پانی جہاں پڑتا پریت، ٹھنڈی سانسیں بھر کر غائب ہو جاتا۔ حجری بھی بھائی کا ساتھ دینے لگا۔ اُس نے دیکھا، اس کی دونوں لکڑیاں اپنی صورت بدل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئی ہیں۔ آس پاس پڑی ہوئی سوکھی پتیوں اور ٹہنیوں کا بھی یہی حال ہے۔ جس چیز پر پانی پڑتا، وہ چھَن چھَن کر کے راکھ ہو جاتی یا لال کی جگہ کالی ہو جاتی۔ اس سلسلے میں اس کی نظر بالشت بھر لمبی ایک چیز پر پڑی جو لال بھبوکا ہو رہی تھی، مگر زبان نکال کر کسی کو کھاتی نہ تھی۔ حجری نے اس پر بھی ڈالنے کی کوشش کی مگر وہ پتھر کے نیچے اس طرح چھپی بیٹھی تھی کہ اس تک پانی نہ پہنچتا تھا۔ حجری نے درخت کے تنے سے لگے ہوئے پتھر والے گُرز کو اٹھا لیا اور زور کر کے اسے چٹان کے نیچے گھسایا اور اس دہتے ہوئے ٹکڑے کے پاس لے گیا۔ پھر اس نے ایک جھٹکا دیا۔ بالشت بھر کا لال ٹکڑا اُچھل کر چٹان پر جا پڑا۔ اور اس کے جسم بھر سے چمکتے سے ریزے اڑے۔ حجری ذرا جھنجھلایا۔ یہ ٹکڑا تو کچھ عجیب حرکتیں کر رہا تھا۔

اس نے اس پر گرز کا ایک بھرپور ہاتھ مارا۔ وہ پھر اچھلا۔ اُس نے پھر چمکتے ریزے اُڑائے اور رقبہ میں پہلے سے کچھ بڑھ گیا۔ جمری اسے غور سے دیکھنے کے لئے پاس ہی اُکڑوں بیٹھ گیا۔ اور اپنے گرز سے اس پر آہستہ آہستہ چوٹیں دینے لگا۔ اُس نے دیکھا ہر چوٹ پر وہ چیز پہلے کی لنسبت کچھ نہ کچھ پھیل جاتی ہے، بڑھ جاتی ہے۔ اس نے ایک پتھر اٹھا کر اس انوکھی چیز کا ایک کونہ دبا لیا اور بقیہ حصے کو گرز سے وہ آہستہ آہستہ پیٹنے لگا۔ وہ چیز برابر بڑھتی پھیلتی پتلی ہوتی چلی گئی۔

سنگی، جو لال پریت کو پانی ڈال ڈال کر وہاں سے بھگا چکا تھا، بھائی کے پاس اس آخری لال ٹکڑے کو دیکھ کر لپکا ہوا آیا۔ اس نے دیکھا مگرمچھ کے بچے کے برابر یہ ٹکڑا جمری کے ہاتھوں کے نیچے دبا ہوا پھڑک رہا ہے، اور ہر بار اس کے ہاتھ پر وار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ گرز پر گرز اس کی پیٹھ پر پڑتے جاتے ہیں، مگر نہ وہ مرتا ہے اور نہ بھاگ جاتا ہے۔ اسے ڈر لگا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ واقعی جمری کو کاٹ کھائے۔ اس نے دوڑ کر چشمے سے اوک بھر پانی لیا، اور اس پر بھی ڈال دیا۔ چھن چھن آواز ہوئی، دھواں اٹھا اور وہ چیز لال کی جگہ کالی ہوگئی۔

سنگی تو پریت بھگا کر چلا گیا، مگر جمری اب بھی بیٹھا سوچتا رہا۔ وہ ہاتھ میں پتھر کے نیچے دبے ہوئے کالے ٹکڑے کو آہستہ آہستہ چوٹیں دیتا رہا۔ مگر اب نہ وہ بڑھا، نہ پھیلا۔ اس نے اسے ہاتھ میں اُٹھا کر دیکھا، اس میں نوک پیدا ہوگئی تھی اور وہ ایک پہلو سے زیادہ چپٹا ہوگیا تھا۔ جمری نے چپٹے حصے کو پانی سے گیلے پتھر پر گھسنا، رگڑنا شروع کیا۔ اس کی سیاہی کم ہوتی گئی، اور اس میں چمک سی پیدا ہوگئی، مگر وہ سُوت بھر بھی نہ بڑھا۔ جمری نے کچھ سوچ کر پہلے جیسے لکڑی کے دو ٹکڑے لئے۔ چپٹی لکڑی میں اس نئے آلے کی نوک سے سوراخ کرنے کی کوشش کی۔ وہ پتھر والے آلے سے زیادہ جلد لکڑی میں گھس گیا۔ جمری ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے مسکرا دیا۔ اس نے سوراخ کے منہ پر نوکیلی لکڑی رکھ کر اسے زور زور سے گھمانا شروع کیا۔ جیسے ہی اس میں سے کہرا نکلا اور چمک پیدا ہوئی، اُس نے اسے سوکھی تپیاں اور لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کھلانا شروع کر دیئے۔ پھر لال لال زبانیں آس پاس کی چیزوں کو کھانے کے لئے نکل پڑیں۔ اُس نے اپنے نئے آلے کو ان پر رکھ کر بہت سی سوکھی تپیاں اور گھاس نوچ کر اس پر ڈال دیں۔ کالا ٹکڑا پھر لال لال ہوگیا۔ جمری نے اُسے گرز سے اُچھال کر چٹان تک پہنچایا، اور پھر اسے پتھر سے دبا کر وہ اسے پیٹنے لگا — وہ بڑھتا گیا، پھیلتا گیا، اور اس کے چپٹے حصے میں دھار سی پیدا ہوگئی۔ مگر لال زبانیں اس تک بڑھتی چلی آرہی تھیں۔ جو ہوا کا جھونکا ادھر سے آتا اسے محسوس ہوتا وہ جھلس جائے گا، بھن جائے گا۔ جمری نے اس پریت کو بھگانے کے لئے بھائی کے طریقے پر عمل کیا۔ اس نے چلوؤں میں پانی بھر بھر کر ان زبانوں پر لا کر چھوڑا۔ یوں اس پریت کو اپنے اوک سے پانی پلانے پر وہ منہ چھپا کر چلا گیا۔ گرمی ٹھنڈک میں بدل گئی۔ اور لال آلہ پھر کلموہا بن گیا۔ اب وہ اس کلموہے کو پھر پتھر پر رگڑنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اس کی کالک دور ہوگئی اور وہ نوک اور دھار کے پاس چھم چھم چمکنے لگا۔ جمری اس کی یہ چمک دمک دیکھ کر خوش ہوگیا۔ وہ اسے ہاتھ میں لے کر گھمانے لگا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ جتنے پودے، لمبی گھاسیں یا پتلے تنے والے درخت بیچ میں آتے وہ سب کٹ کر ڈھیر ہوگئے۔

وہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑا۔ اس نے سارے موجودہ آلوں سے بہتر کاٹنے والا آلہ بنا لیا۔ مگر ساتھ ہی دل میں خیال آیا اسے کسی جان دار پر آزما کر دیکھنا چاہیئے۔ جان دار کے اندر جو پریت چھپا ہوا ہے ممکن ہے وہ انھیں اس صفائی سے کاٹنے

نہ دے۔ اس نے جلدی جلدی اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ تھوڑے فاصلے پر ایک جھاڑی میں ایک بوڑھی لنگڑی بھیڑ کے بال اس طرح پھنس گئے تھے کہ وہ اس سے نکل نہ سکتی تھی اور بڑی بے بسی سے کھڑی "میں! میں!" کر رہی تھی۔ اس کے مالک کا کہیں پتہ نہ تھا۔ البتہ دو چار گدھ ابھی سے منڈلاتے دکھائی دے رہے تھے۔ حجری کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ لپکتا ہوا بھیڑ کے پاس پہنچا۔ اور اس نے اپنے نئے تیغے کا بھرپور ہاتھ اس کی گردن پر مارا۔ سر کٹ کر دھڑ سے دور گر پڑا۔ حجری خوشی سے اچھل پڑا اور اس نے خون بھرے تیغے کو چوم لیا۔ ساتھ ہی خیال آیا لاؤ تیغے کے اس پہلے شکار کو نذر والے پتھر پر چڑھا دیں۔ مفت کی نذر بھی ہو جائے گی اور پتھر سے کیوں کر دھواں نکلتا ہے، یہ منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔ اس نے تیغہ بغل میں دبایا، اور بھیڑ کا سر اور دھڑ دونوں ہاتھوں میں اٹھائے وہ نذر والے پتھر کی طرف چلا۔

راہ میں اُس نے دیکھا کہ اس کا بھائی 'سنگی' بھی اپنے غلّے کی بالیوں کا ایک موٹا سا گٹھا سر پر رکھے چلا آرہا ہے۔ حجری ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بڑے فخر سے سنگی کو اپنے تیغے کا پہلا شکار دکھایا۔ پھر وہ اکڑ کر بولا۔ "آؤ ہم تم دونوں اپنی اپنی نذر چڑھائیں، دیکھیں کس کی قبول ہوتی ہے!"

دونوں نے پتھر کے الگ الگ کونے پر اپنی اپنی نذر رکھ دی۔ سنگی گھٹنے ٹیک کر اور ہاتھ جوڑ کر نذر کے قبول کیے جانے کی دعا مانگنے لگا۔ مگر حجری ہاتھ میں تیغہ لیے اکڑ کر کھڑا رہا۔ دفعتہً جس حصے پر گیہوں کی سنہری سنہری بالیاں رکھی تھیں۔ وہاں سے دھواں نکلنے لگا اور آنکھ جھپکتے ہی اتنا گہرا اور گھنا ہو گیا کہ اس کے اندر کی کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ چند منٹ بعد جب یہ دھواں غائب ہوا تو سنگی کی نذر کا ایک ایک دانہ ساتھ لیتا چلا گیا۔ مگر حجری کی بھیڑ اسی طرح پڑی رہی۔ حجری کی آنکھیں غصے سے چمکنے لگیں۔ اس نے سنگی کو مڑ کر دیکھا، اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری تھے۔ وہ تو لگا ئے تھوڑی دیر بیٹھا جھومتا رہا۔ پھر وہ "شکر! شکر! کہتا "بابا" کی طرح سجدے میں گر پڑا۔

حجری کا غصہ بھڑک اٹھا۔ جی چاہتا تھا سنگی کی نذر قبول کرنے والا سامنے ہوتا تو اس پر وار کر کے دیکھتا کہ وہ بھی کٹتا ہے یا نہیں۔ پھر اس نے سوچا، لاؤ اسی سجدے میں جھکی ہوئی گردن پر تیغے کا وار آزما کر دیکھوں، وہ کٹتی ہے کہ نہیں ——!

اس نے بھائی کی گردن پر تیغے کا بھرپور ہاتھ مار دیا۔ بھیڑ کے سر کی طرح سنگی کا سر بھی دھڑ سے الگ ہو کر دور گر پڑا، اور اس کی لاش خاک و خون میں لتھڑ کر زمین پر پھڑکنے لگی —!

بوڑھے "بابا" کو جب اس سب سے پہلے خونی تجربے کی خبر دی گئی، تو اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر سر سجدے میں جھکا دیا۔

"جو تیری مرضی پیدا کرنے والے!"

پھر اُس نے سجدے سے سر اٹھا کر حجری کو غصے اور نفرت سے دیکھ کر بددُعا دی۔ "آج سے تمھارے قبیلے والا جب بھی کوئی کاٹنے، مارنے والا نیا آلہ ایجاد کرے گا تو وہ اسے اپنے نہتے بھائیوں ہی پر ضرور آزمائے گا!"

(شمارہ ۱۵۲-۱۵۳ سنہ ۶۴ء)

کرشن چندر

مہالکشمی کا پُل

مہالکشمی اسٹیشن کے اس پار لکشمی جی کا ایک مندر ہے۔ اسے لوگ ریس کورس بھی کہتے ہیں۔ اس مندر میں پوجا کرنے والے ہارتے زیادہ ہیں اور جیتتے بہت کم ہیں۔ مہالکشمی اسٹیشن کے اس پار ایک بہت بڑی بدرو ہے جو انسانی جسموں کی غلاظت کو اپنے متعفن پانیوں میں گھولتی ہوئی شہر سے باہر چلی جاتی ہے۔ مندر میں انسان کے دل کی غلاظت دھلتی ہے اور بدرو میں انسان کے جسم کی غلاظت اور ان دونوں کے بیچ میں مہالکشمی کا پل ہے۔ مہالکشمی کے پل کے اوپر بائیں طرف لوہے کے جنگلے پر چھ ساڑیاں لہرا رہی ہیں۔ پل کے اس طرف ہمیشہ اس مقام پر چند ایک ساڑیاں لہراتی رہتی ہیں۔ ساڑیاں کوئی قیمتی نہیں ہیں اور ریلوے لائن بھی کوئی بہت زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ یہ لوگ ہر روز یہاں ان ساڑیوں کو دھوکر سوکھنے کے لئے ڈال دیتے ہیں اور ریلوے لائن کے آر پار جاتے ہوئے لوگ مہالکشمی اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے لوگ گاڑی کی کھڑکی اور دروازوں سے جھانک کر باہر دیکھنے والے لوگ ان ساڑھیوں کو ہوا میں جھولتا ہوا دیکھتے ہیں اور ان کے مختلف رنگ دیکھتے ہیں۔ بھورا۔ گہرا بھورا۔ مٹ میلا نیلا۔ قرمزی بھورا۔ گندہ سرخ کنارا۔ گہرا نیلا اور لال۔ وہ لوگ اکثر انھیں رنگوں کو فضا میں پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں ایک لمحے کے لئے دوسرے لمحے میں گاڑی پل کے نیچے سے گذر جاتی ہے

ان ساڑیوں کے رنگ اب جاذب نظر نہیں رہے۔ کسی زمانہ میں ممکن ہے۔ جب یہ نئی نئی خریدی گئی ہوں انکے رنگ خوب صورت اور چمکتے ہوئے ہوں۔ مگر اب نہیں ہیں۔ متواتر دھوئے جانے سے ان کے رنگوں کی آب و تاب مرچکی ہے اور اب یہ ساڑیاں اپنے پھیکے سیٹھے روزمرہ کے انداز کو لئے بڑی بے دلی سے جنگلے پر پڑی نظر آتی ہیں۔ آپ دن میں انھیں سو بار دیکھئے۔ یہ آپ کو کبھی خوبصورت دکھائی نہ دیں گی نہ ان کا رنگ روپ اچھا ہے۔ نہ ان کا کپڑا۔ یہ بڑی سستی گھٹیا قسم کی ساڑیاں ہیں۔ ہر روز دھلنے سے ان کا کپڑا بھی تار تار ہو رہا ہے۔ ان میں کہیں کہیں روزن بھی نظر آتے ہیں۔ کہیں ادھڑے ہوئے ٹانکے ہیں کہیں بدنما چیلے داغ جو اس قدر پائیدار ہیں کہ دھوئے جانے سے بھی نہیں دھلتے بلکہ اور گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ میں ان ساڑیوں کی زندگیوں کو جانتا ہوں۔ کیونکہ میں ان لوگوں کو جانتا ہوں جو ان ساڑھیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ مہالکشمی کے پل کے قریب ہی بائیں طرف آٹھ نمبر کی چال میں رہتے ہیں۔ یہ چال متوالی نہیں ہے۔ بڑی غریب سی چال ہے۔ میں بھی اسی چال میں رہتا ہوں۔ اس لئے آپ کو ان ساڑیوں اور ان کے پہننے والوں کے متعلق سب کچھ بتا سکتا ہوں۔ ابھی وزیر اعظم کی گاڑی آنے میں بہت دیر ہے۔ آپ انتظار کرتے کرتے اکتا جائیں گے۔ اس لئے اگر آپ ان چھ ساڑیوں کی زندگی کے بارے میں مجھ سے کچھ سن لیں تو وقت آسانی سے کٹ جائے گا۔ ادھر یہ جو بھورے رنگ کی ساڑی لٹک رہی ہے۔ یہ شانتا بائی کی ساڑی ہے۔ اس کے قریب جو ساڑی لٹک رہی ہے وہ بھی آپ کو بھورے رنگ کی دکھائی دیتی ہوگی۔ مگر وہ تو گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ آپ نہیں میں اس کا گہرا بھورا رنگ دیکھ سکتا ہوں۔ کیونکہ میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب اس کا رنگ چمکتا ہوا گہرا بھورا تھا۔ اب اس دوسری ساڑی کا رنگ بھی ویسا ہی بھورا ہے۔ جیسا شانتی بائی کی ساڑی کا۔ اور شاید آپ ان دونوں ساڑھیوں میں بڑی مشکل سے کوئی فرق محسوس کر سکیں۔ میں بھی جب ان کے پہننے

والوں کی زندگیوں کو دیکھتا ہوں تو بہت کم فرق محسوس کرتا ہوں۔ مگر پہلی ساڑی جو بھورے رنگ کی ہے وہ شانتا بائی کی ساڑی ہے اور جو دوسری بھورے رنگ کی ساڑھی ہے اور جس کا بھورا رنگ صرف میری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں وہ جیونا بائی کی ساڑھی ہے۔

شانتا بائی کی زندگی بھی اس کی ساڑی کے رنگ کی طرح بھوری ہے۔ شانتا بائی برتن مانجھنے کا کام کرتی ہے۔ اس کے تین بچے ہیں۔ ایک بڑی لڑکی ہے۔ دو چھوٹے لڑکے ہیں۔ بڑی لڑکی کی عمر چھ سال کی ہوگی سب سے چھوٹا لڑکا دو سال کا ہے۔ شانتا بائی کا خاوند یونین لٹ کے کپڑ گھر میں کام کرتا ہے۔ اسے بہت جلد جانا ہوتا ہے۔ اس لئے شانتا بائی اپنے خاوند کے لئے دوسرے دن کی دوپہر کا کھانا رات ہی کو پکا کر رکھتی ہے۔ کیونکہ صبح اسے خود برتن صاف کرنے کے لئے اور پانی ڈھونے کے لئے دوسرے گھروں میں جانا ہوتا ہے۔ اب وہ ساتھ اپنے چھ برس کی بچی کو بھی لے جاتی ہے اور دوپہر کے قریب چال میں واپس آ جاتی ہے۔ واپس آ کے وہ نہاتی ہے اور اپنی ساڑی دھوتی ہے اور سوکھانے کے لئے پل کے جنگلے پر ڈال دیتی ہے اور پھر ایک بے حد غلیظ اور پرانی دھوتی پہن کر کھانا پکانے لگ جاتی ہے۔ شانتا بائی کے گھر چولہا اسی وقت سلگتا ہے جب دوسروں کے ہاں چولھے ٹھنڈے ہو جائیں یعنی دوپہر کو دو بجے اور رات کو نو بجے۔ ان اوقات کے ادھر اور اُدھر اسے دونوں وقت گھر سے باہر برتن مانجھنے اور پانی ڈھونے کا کام کرنا ہوتا ہے۔ اب تو چھوٹی لڑکی بھی اس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ شانتا بائی برتن صاف کرتی ہے۔ چھوٹی لڑکی برتن دھوتی جاتی ہے۔ دو تین بار ایسا بھی ہوا کہ چھوٹی کے ہاتھ سے چینی کے برتن گر کر ٹوٹ گئے۔ اب میں جب کبھی چھوٹی لڑکی کی آنکھیں سوجی ہوئی اور اس کے گال سرخ دیکھتا ہوں تو سمجھ جاتا ہوں کہ کسی بڑے گھر میں چینی کے برتن ٹوٹے ہیں۔ اس دن شانتا بھی میری نمستے کا جواب نہیں دیتی جلتی بھنتی اور بڑبڑاتی چولہا سلگانے میں مصروف ہو جاتی ہے اور چولھے میں آگ کم اور دھواں زیادہ نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چھوٹا لڑکا جو دو سال کا ہے دھوئیں سے اپنا دم گھٹتا دیکھ کر چیختا ہے تو شانتا بائی اس کے چینی جیسے نازک رخساروں پر زور زور چپتیں لگانے سے باز نہیں آتی اس پر بچہ اور زیادہ چیختا ہے۔ یوں تو یہ دن بھر روتا رہتا ہے کیونکہ اسے دودھ نہیں ملتا ہے اور اسے بھوک لگی رہتی ہے اور دو سال کی عمر ہی میں اسے باجرے کی روٹی کھانا پڑتی ہے اسے اپنی ماں کا دودھ اپنے دوسرے بھائی بہن کی طرح صرف چھ سات ماہ نصیب ہوا وہ بھی بڑی مشکل سے۔ پھر یہ بھی خشک باجری اور ٹھنڈے پانی پر پلنے لگا۔ ہماری چال کے سارے بچے اسی خوراک پر پلتے ہیں۔ وہ دن بھر ننگے رہتے ہیں اور رات کو گدڑی اوڑھ کر سو جاتے ہیں۔ سوتے میں بھی وہ بھوکے رہتے ہیں اور جاگتے میں بھی بھوکے رہتے ہیں اور جب شانتا بائی کے خاوند کی طرح بڑے ہو جاتے ہیں تو دن بھر خشک باجری اور ٹھنڈا پانی پی پی کر کام کرتے جاتے ہیں۔ اور ان کی بھوک بڑھتی جاتی ہے۔ اور ہر وقت معدے کے اندر اور دل کے اندر اور دماغ کے اندر ایک بوجھل سی دھمک محسوس کرتے رہتے ہیں اور جب پگار ملتی ہے تو ان میں سے کئی ایک سیدھے تاڑی خانہ کا رخ کرتے ہیں۔ تاڑی پی کر چند گھنٹوں کے لئے یہ دھمک زائل ہو جاتی ہے۔ لیکن آدمی ہمیشہ تو تاڑی نہیں پی سکتا۔ ایک دن پئے گا، دو دن پئے گا۔ تیسرے دن کی تاڑی کے پیسے کہاں سے لائے گا۔ آخر کھولی کا کرایہ دینا ہے۔ راشن کا خرچہ ہے۔ بھاجی ترکاری ہے۔ تیل اور نمک ہے۔ بجلی اور پانی ہے۔ شانتا بائی کی بھوری ساڑی ہے جو چھٹے ساتویں ماہ تار تار ہو جاتی ہے۔ کبھی سات ماہ سے زیادہ نہیں چلتی۔ یہ مل والے بھی پانچ روپے چار آنے میں کیسی کھدی سی ساڑی دیتے ہیں۔ اس کے کپڑے میں ذرا جان نہیں ہوتی۔ چھٹے ماہ سے جو تار تار ہونا شروع ہوتا ہے تو ساتویں ماہ بڑی مشکل سے سی کے جوڑ کے، گانٹھ کے ٹانکے لگا کے کام دیتی ہے۔ اور پھر وہی پانچ روپے چار آنے خرچ کرنے پڑتے ہیں اور وہی بھورے رنگ کی ساڑھی آ جاتی ہے۔ شانتا کو یہ رنگ بہت پسند ہے۔ اس لئے کہ یہ میلا بہت دیر میں ہوتا ہے۔ اسے گھروں میں جھاڑو دینا ہوتی ہے برتن صاف کرنے ہوتے ہیں۔ تیسری چوتھی منزل تک پانی ڈھونا ہوتا ہے۔ وہ بھورا رنگ نہیں پسند کرے گی تو کیا کھلتے ہوئے شوخ رنگ گلابی بسنتی۔ نارنجی پسند کرے گی۔ نامنہ وہ اتنی بے وقوف نہیں ہے وہ تین بچوں کی ماں ہے۔ لیکن کبھی اس نے یہ شوخ رنگ بھی دیکھے تھے پہنے تھے انھیں اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پیار کیا تھا جب وہ دھارواڑ میں اپنے گاؤں میں تھی۔ جہاں اس نے بادلوں میں شوخ رنگوں والی دھنک دیکھی تھی۔ جہاں میلوں میں اس نے شوخ رنگ ناچتے ہوئے دیکھے تھے۔ جہاں اس کے باپ کے دھان کے کھیت تھے۔ ایسے شوخ ہرے ہرے

رنگ کے کھیت اور آنگن میں بیر کا پیڑ جس کے ڈال ڈال سے وہ بیر توڑ توڑ کے کھایا کرتی تھی ۔ جانے اب بیروں میں وہ مزہ ہی نہیں ہے ۔ وہ شیرینی اور گھلاوٹ ہی نہیں ہے ۔ وہ رنگ وہ چمک دمک کہاں جاکے رہ گئی ۔ وہ سارے رنگ کیوں کمبخت بھورے ہوگئے شانتا بائی کبھی برتن مانجھتے مانجھتے، کھانا پکاتے، اپنی ساڑی دھوتے ۔ اسے پل کے جنگلے پر لاکر ڈالتے ہوئے یہ سوچا کرتی ہے اور اس کی بھوری ساڑی سے پانی کے قطرے آنسوؤں کی طرح ریل کی پٹری پر بہتے جاتے ہیں اور دور سے دیکھنے والے لوگ ایک بھورے رنگ کی بدصورت عورت کو پل کے اوپر جنگلے پر ایک بھوری ساڑی کو پھیلاتے ہوئے دیکھتے ہیں اور بس دوسرے لمحے میں گاڑی پل کے نیچے سے گزر جاتی ہے ۔

جیونا بائی کی ساڑی جو شانتا بائی کی ساڑی کے ساتھ لٹک رہی ہے ۔ گہرے بھورے رنگ کی ہے ۔ بظاہر اس کا رنگ شانتا بائی کی ساڑی سے بھی پھیکا نظر آئے گا ۔ لیکن اگر آپ اسے غور سے دیکھیں تو اس پھیکے پن کے باوجود یہ آپ کو گہرے بھورے رنگ کی نظر آئے گی یہ ساڑی بھی پانچ روپے چار آنے کی ہے اور بڑی ہی بوسیدہ ہے ۔ دو ایک جگہ سے پھٹی ہوئی تھی لیکن اب وہاں پر ٹانکے لگ گئے ہیں ۔ اور اتنی دور سے معلوم بھی نہیں ہوتے ۔ ہاں آپ وہ بڑا ٹکڑا ضرور دیکھ سکتے ہیں جو گہرے نیلے رنگ کا ہے اور اس ساڑی کے بیچ میں جہاں سے یہ ساڑی بہت پھٹ چکی تھی لگایا گیا ہے ۔ یہ ٹکڑا جیونا بائی کی اس سے پہلی ساڑی کا ہے ۔ اور اس دوسری ساڑی کو مضبوط بنانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے ۔ جیونا بائی بیوہ ہے اس لئے وہ ہمیشہ پرانی چیزوں سے نئی چیزوں کو مضبوط بنانے کے ڈھنگ سوچا کرتی ہے ۔ پرانی یادوں سے نئی یادوں کی تلخیوں کو بھول جانے کی کوشش کیا کرتی ہے ۔ جیونا بائی اپنے اس خاوند کے لئے روتی رہتی ہے جس نے ایک دن اسے نشے میں مار مار کر اس کی ایک آنکھ کانی کر ڈالی تھی وہ اس لئے نشے میں تھا کہ وہ اسی روز مل سے نکالا گیا تھا ۔ بڈھا ڈھونڈھو اب مل میں کسی کام کا نہیں رہا تھا ۔ گو وہ بہت تجربے کار تھا ، لیکن اس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہ رہی تھی کہ وہ جوان مزدوروں کا مقابلہ کر سکتا ۔ بلکہ وہ تو اب دن رات کھانسی میں مبتلا رہنے لگا تھا ۔ کپاس کے ننھے ننھے ریشے اس کے پھیپھڑوں میں جاکے ایسے دھنس گئے تھے جیسے چرخیوں اور اینٹوں میں سوت کے چھوٹے چھوٹے مہین تاگے پھنس جاتے ہیں ۔ جب برسات آتی تو یہ ننھے ننھے ریشے اُسے دمے میں مبتلا کر دیتے اور جب برسات نہ ہوتی تو وہ دن بھر اور رات بھر کھانستا ۔ ایک خشک اور مسلسل کھنکھار گھر میں اور کارخانے میں جہاں وہ کام کرتا تھا ، سنائی دیتی رہتی ۔ مل کے مالک نے اس کھانسی کی خطرناک گھنٹی کو سنا اور ڈھونڈو کو مل سے نکال دیا ۔ ڈھونڈو اس کے چھ ماہ بعد مر گیا ۔ جیونا بائی کو اس کے مرنے کا بہت غم ہوا کیا ہوا اگر غصے میں آکے ایک دن اس نے جیونا کی آنکھ نکال لی ۔ تیس سال کی شادی شدہ زندگی ایک لمحے کے غصے پر قربان نہیں کی جا سکتی ۔ اور اس کا غصہ بجا تھا ۔ اگر مل مالک ڈھونڈو کو یوں بے قصور نوکری سے الگ نہ کرتا تو کیا جیونا کی آنکھ نکل سکتی تھی ۔ ڈھونڈو ایسا نہ تھا ۔ اسے اپنی بیکاری کا غم تھا ۔ اپنی ۳۵ سالہ ملازمت سے برطرف ہونے کا رنج تھا اور سب سے بڑا رنج اس بات کا تھا کہ مل مالک نے چلتے وقت اُسے ایک دھیلا بھی تو نہیں دیا ۔ ۳۵ سال پہلے جیسے ڈھونڈو خالی ہاتھ مل میں کام کرنے کے لئے آیا تھا اسی طرح خالی ہاتھ واپس لوٹا اور دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اپنا نمبری کارڈ پیچھے چھوڑ آنے پر اسے ایک دھچکا سا لگا ۔ باہر آکے اسے ایسا معلوم ہوا جیسے ان ۳۵ سالوں میں کسی نے اس کا سارا رنگ ، اس کا سارا خون ، اس کا سارا رس چوس لیا ہو اور اُسے بیکار سمجھ کے باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا ۔ اور ڈھونڈو بڑی حیرت سے مل کے دروازے کو اور اس بڑی چمنی کو دیکھنے لگا جو بالکل اس کے سر پر ایک خوفناک دیو کی طرح آسمان سے لگی کھڑی تھی ۔ یکایک ڈھونڈو نے غم اور غصے سے اپنے ہاتھ ملے ۔ زمین پر زور سے تھوکا اور پھر تاڑی خانے میں چلا گیا ۔

لیکن جیونا کی ایک آنکھ جب بھی نہ جاتی ۔ اگر اس کے پاس علاج کے پیسے ہوتے ۔ وہ آنکھ تو گل گل کر سڑ سڑ کر خیراتی ہسپتالوں میں

ڈاکٹروں، کمپونڈروں اور نرسوں کی بداحتیاطیوں اور گالیوں اور لاپروائیوں کا شکار ہو گئی اور جب جیونا اچھی ہوئی تو ڈھونڈو بیمار پڑ گیا۔ اور ایسا بیمار پڑا کہ پھر بستر سے نہ اٹھ سکا۔ ان دنوں میں جیونا اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ شانتا بائی نے مدد کے طور پر اسے چند گھروں میں برتن مانجنے کا کام دلوا دیا تھا۔ اور گو اب وہ بوڑھی تھی اور مشاقی اور صفائی سے برتنوں کو صاف نہ رکھ سکتی تھی۔ پھر بھی وہ آہستہ آہستہ رینگ رینگ کر اپنے کمزور ہاتھوں میں جھوٹی طاقت کے بودے سہارے پر جیسے تیسے کام کرتی رہی۔ خوبصورت لباس پہننے والی، خوشبودار تیل لگانے والی بیویوں کی گالیاں سنتی رہی۔ اور کام کرتی رہی۔ کیونکہ اُس کا ڈھونڈو بیمار تھا۔ اور اسے اپنے آپ کو اور اپنے خاوند کو زندہ رکھنا تھا۔ لیکن ڈھونڈو زندہ نہ رہا اور اب جیونا بائی اکیلی تھی۔ خیریت اس میں تھی کہ بالکل اکیلی تھی۔ اور اب اُسے صرف اپنا دھندا کرنا تھا۔ شادی کے دس سال بعد اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لیکن جب وہ جوان ہوئی تو کسی بدمعاش کے ساتھ بھاگ گئی۔ اور اس کا آج تک کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر کسی نے بتایا اور پھر بعد میں بہت سے لوگوں نے بتایا کہ جیونا بائی کی بیٹی فارس روڈ پر چمکیلا، بھڑکیلا ریشمی لباس پہنے بیٹھی ہے لیکن جیونا کو یقین نہ آیا۔ اس نے اپنی ساری زندگی پانچ روپے چار آنے کی دھوتی پہنے بسر کر دی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس کی لڑکی بھی ایسا کرے گی۔ وہ ایسا نہیں کرے گی، اس کا اسے کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا وہ کبھی فارس روڈ نہیں گئی کیونکہ اسے اس کا یقین نہ تھا کہ اس کی بیٹی وہاں نہیں ہے۔ بھلا اس کی بیٹی وہاں کیوں جانے لگی۔ یہاں اپنی کھولی میں کیا نہیں تھا۔ پانچ روپے چار آنے والی دھوتی تھی۔ باجرے کی روٹی تھی۔ ٹھنڈا پانی تھا۔ سوکھی عزت تھی۔ اور یہ سب کچھ چھوڑ کے وہ فارس روڈ کیوں جانے لگی۔ اسے تو کوئی بدمعاش اپنی محبت کا سبز باغ دکھا کے لے گیا تھا۔ کیونکہ عورت محبت کے لئے سب کچھ کر گذرتی ہے۔ خود وہ تیس سال پہلے اپنے ڈھونڈو کے لئے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر نہیں چلی آئی تھی۔ جس دن ڈھونڈو مرا اور جب لوگ اس کی لاش کو جلانے کے لئے لے جانے لگے اور جیونا نے اپنی سیندور کی ڈبیا اپنی بیٹی کی انگیا پر انڈیل دی جو اس نے بڑی مدت سے ڈھونڈو کی نظروں سے چھپا کے رکھی تھی۔ عین اسی وقت ایک گدرائے ہوئے جسم کی بھاری عورت بڑا چمکیلا لباس پہنے اُس سے آ کے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور اسے دیکھ کر یکایک جیونا کو یقین آ گیا کہ جیسے اب سب کچھ مر گیا ہے۔ اُس کا پتی۔ اُس کی بیٹی۔ اس کی عزت۔ جیسے وہ زندگی بھر روٹی نہیں غلاظت کھاتی رہی ہے۔ جیسے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ شروع ہی سے کچھ نہیں تھا۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی اس سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ اُسے نہتا، ننگا اور بے عزت کر دیا گیا تھا۔ اور جیونا کو اس ایک لمحے میں احساس ہوا کہ وہ جگہ جہاں اس کا خاوند زندگی بھر کام کرتا رہا اور وہ جگہ جہاں اس کی آنکھ اندھی ہو گئی اور وہ جگہ جہاں اس کی بیٹی اپنی دکان سجا کے بیٹھ گئی ایک بہت بڑا اندھا کارخانہ ہے جس میں کوئی ظالم، جابر ہاتھ انسانی جسموں کو لے کے گنے کا رس نکالنے والی چرخی میں ٹھونستا جا رہا ہے اور دوسرے ہاتھ سے توڑ مروڑ کر دوسری طرف پھینکتا جاتا ہے اور یکایک جیونا اپنی بیٹی کو دھکا دے کے الگ کھڑی ہو گئی اور چیخیں مار مار کر رونے لگی۔

تیسری ساڑی کا رنگ مٹ میلا نیلا ہے یعنی نیلا بھی ہے اور میلا بھی ہے اور مٹیالا بھی ہے۔ کچھ ایسا عجیب سا رنگ ہے جو بار بار دھونے پر بھی نہیں نکھرتا بلکہ اور غلیظ ہوتا جاتا ہے۔ یہ میری بیوی کی ساڑی ہے۔ میں فورٹ میں دھنو بھائی کی فرم میں کلرکی کرتا ہوں، مجھے پینسٹھ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ سیون مل اور بکسریا مل کے مزدوروں کو بھی یہی تنخواہ ملتی ہے۔ اس لئے میں بھی انھیں کے ساتھ آٹھ نمبر کی چال کی ایک کھولی میں رہتا ہوں۔ مگر میں مزدور نہیں ہوں۔ کلرک ہوں۔ میں فورٹ میں نوکر ہوں، میں دسویں پاس ہوں، میں ٹائپ کر سکتا ہوں، میں انگریزی میں عرضی لکھ سکتا ہوں۔ میں اپنے وزیراعظم کی تقریر جلسے میں سن کر سمجھ بھی لیتا ہوں۔ آج تھوڑی دیر میں ان کی گاڑی مہالکشمی پر آئے گی نہیں، وہ ریس کورس نہیں جائیں گے۔ وہ سمندر کے کنارے ایک شاندار تقریر کریں گے۔ اس موقع پر لاکھوں آدمی جمع ہوں گے۔ ان لاکھوں میں میں بھی ایک ہوں گا۔ میری بیوی کو اپنے وزیراعظم کی باتیں سننے کا بہت شوق ہے۔ مگر میں اُسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ کیونکہ ہمارے آٹھ بچے ہیں اور گھر میں ہر وقت پریشانی سی رہتی ہے۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی چیز کم ہو جاتی ہے، راشن تو روز کم پڑ جاتا ہے۔ اب نل میں پانی بھی کم آتا ہے۔ رات

کو سونے کے لئے جگہ بھی کم پڑتی ہے، اور تنخواہ تو اس قدر کم پڑتی ہے کہ مہینہ میں صرف پندرہ دن چلتی ہے، باقی پندرہ دن سود خور پٹھان چلاتا ہے۔ اور وہ بھی کیسے گالیاں بکتے جھکتے، گھسٹ گھسٹ کر کسی سست رفتار مال گاڑی کی طرح یہ زندگی چلتی ہے۔

میرے آٹھ بچے ہیں، مگر یہ اسکول میں نہیں پڑھ سکتے۔ میرے پاس ان کی فیس کے پیسے کبھی نہ ہوں گے۔ پہلے پہل جب میں نے بیاہ کیا تھا اور ساوتری کو اپنے گھر یعنی اس کھولی میں لایا تھا تو میں نے بہت کچھ سوچا تھا۔ ان دنوں ساوتری بھی بڑی اچھی اچھی باتیں سوچا کرتی تھی گوبھی کے نازک نازک ہرے ہرے پتوں کی طرح پیاری پیاری باتیں۔ جب وہ مسکراتی تھی تو سینما کی تصویر کی طرح خوبصورت دکھا کرتی تھی۔ اب وہ مسکراہٹ نہ جانے کہاں چلی گئی ہے۔ اس کی جگہ ایک مستقل تیوری نے لے لی ہے۔ وہ ذرا سی بات پر بچوں کو بے تحاشا پیٹنا شروع کردیتی ہے اور میں تو کچھ بھی کہوں، کیسے بھی کہوں، کتنی ہی لجاجت سے کہوں وہ تو بس مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ پتہ نہیں ساوتری کو کیا ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں دفتر میں سیٹھ کی گالیاں سنتا ہوں۔ گھر پہ بیوی کی گالیاں سنتا ہوں اور ہمیشہ خاموش رہتا ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں، شاید میری بیوی کو ایک نئی ساڑی کی ضرورت ہے۔ شاید اسے صرف ایک نئی ساڑی ہی نہیں، ایک نئے چہرے، ایک نئے گھر، ایک نئے ماحول، ایک نئی زندگی کی ضرورت ہے۔ مگر اب ان باتوں کو سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ اب تو آزادی آ گئی ہے اور ہمارے وزیر اعظم نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اس نسل کو، یعنی ہم لوگوں کو اپنی زندگی میں کوئی آرام نہیں مل سکتا۔ میں نے ساوتری کو اپنے وزیر اعظم کی تقریر جو اخبار میں چھپی تھی سنائی تو وہ اسے سن کر آگ بگولہ ہو گئی، اور اس نے غصہ میں آ کے چولھے کے قریب پڑا ہوا چمٹا میرے سر پہ دے مارا۔ یہ زخم کا نشان جو آپ میرے ماتھے پر دیکھ رہے ہیں، اسی کا نشان ہے۔ ساوتری کی مٹ میلی نیلی ساڑی پر بھی ایسے کئی زخموں کے نشان ہیں۔ مگر آپ انھیں نہیں دیکھ سکیں گے۔ میں دیکھ سکتا ہوں۔ ان میں سے ایک نشان تو اس مونگیا رنگ کی جارجٹ کی ساڑی کا ہے جو اس نے اوپیرا ہاؤس کے نزدیک گنجی مل بھوندو رام پارچہ فروش کی دکان پہ دیکھی تھی۔ ایک نشان اس کھلونے کا ہے جو پچیس روپے کا تھا اور جسے دیکھ کر میرا پہلا بچہ خوشی سے کلکاریاں مارنے لگا تھا۔ لیکن جسے ہم خرید نہ سکے اور جسے نہ پا کر میرا بچہ دن بھر روتا رہا۔ ایک نشان اس تار کا ہے جو ایک دن جبل پور سے آیا تھا۔ جس میں ساوتری کی ماں کی شدید علالت کی خبر تھی۔ ساوتری جبل پور جانا چاہتی تھی۔ لیکن ہزار کوشش کے باوجود بھی مجھے کسی سے روپے ادھار نہ مل سکے تھے اور ساوتری جبلپور نہ جا سکی۔ ایک نشان اس تار کا تھا جس میں اس کی ماں کی موت کا ذکر تھا۔ ایک نشان . . . . مگر میں کس کس نشان کا ذکر کروں ان چلتے چلتے، اگرے گدلے غلیظ داغوں سے ساوتری کی پانچ روپے چار آنے والی ساڑی بھری پڑی ہے، روز — دھونے پر بھی یہ داغ نہیں چھوٹتے۔ اور شاید جب تک یہ زندگی رہے گی یہ داغ یوں ہی رہیں گے، ایک ساڑی سے دوسری ساڑی پر منتقل ہوتے رہیں گے۔

چوتھی ساڑی قرمزی رنگ کی ہے اور قرمزی رنگ میں بھورا رنگ بھی جھلک رہا ہے۔ یوں تو یہ سب مختلف رنگوں کی ساڑیاں ہیں۔ لیکن بھورا رنگ ان سب میں جھلکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان سب کی زندگی ایک ہے، جیسے ان سب کی قیمت ایک ہے۔ جیسے یہ سب زمین سے کبھی اوپر نہیں اٹھیں۔ جیسے انھوں نے کبھی شبنم میں ہنستی ہوئی دھنک، افق پہ چمکتی شفق، بادلوں میں لہراتی ہوئی برق نہیں دیکھی۔ جیسے جوشاندہ بائی کی جوانی ہے، وہ جیونا کا بڑھاپا ہے۔ وہ ساوتری کا ادھیڑ پن ہے۔ جیسے یہ سب ساڑیاں، زندگیاں، ایک رنگ، ایک سطح، ایک تواتر، ایک مسلسل یکسانیت لئے ہوئے ہواؤں میں جھولتی رہتی ہیں۔

یہ قرمزی بھورے رنگ کی ساڑی جھبو بھیّے کی عورت کی ہے۔ اس عورت سے میری بیوی کبھی بات نہیں کرتی، کیونکہ ایک تو اس کے کوئی بچہ وچہ نہیں ہے اور ایسی عورت جس کے کوئی بچہ نہیں ہو بڑی نحس ہوتی ہے۔ وہ جادو ٹونے کر کے دوسروں کے بچوں کو مار ڈالتی ہے اور بدروحوں کو بلا کے اپنے گھر میں بسا لیتی ہے۔ میری بیوی اسے کبھی منہ نہیں لگاتی۔ یہ عورت جھبو بھیا نے خرید کر حاصل کی ہے۔ جھبو بھیا

مراد آباد کا رہنے والا ہے۔ لیکن بچپن ہی سے اپنا دیس چھوڑ کے ادھر چلا آیا۔ وہ مراٹھی اور گجراتی زبان میں بڑے مزے سے گفتگو کر سکتا ہے اسی وجہ سے اسے بہت جلد یہ دار مل کے گٹی کھاتے میں جگہ مل گئی۔ جھبو بھیا کو شروع ہی سے بیاہ کا بہت شوق تھا۔ اُسے بیڑی کا، تاڑی کا کسی چیز کا شوق نہیں تھا۔ شوق تھا تو صرف اس بات کا کہ اس کی شادی جلد سے جلد ہو جائے۔ جب اس کے پاس ستر اسّی روپے اکٹھے ہو گئے تو اس نے اپنے دیس جانے کی ٹھانی تاکہ وہاں اپنی برادری سے کسی کو بیاہ لائے۔ مگر پھر اس نے سوچا ان ستر اسّی روپوں میں کیا ہو گا۔ آنے جانے کا کرایہ بھی بڑی مشکل سے پورا ہو گا۔ چار سال کی محنت کے بعد اس نے یہ رقم جوڑی تھی۔ اس رقم سے وہ مراد آباد جا سکتا تھا، جا کے شادی نہیں کر سکتا تھا، اس لئے جھبو بھیا نے یہیں ایک بدمعاش سے بات چیت کر کے اس عورت کو سو روپے میں خرید لیا۔ اسّی روپے روپے اس نے نقد دیئے۔ بیس روپے ادھار رہے جو اس نے ایک سال کے عرصے میں ادا کر دیئے۔ بعد میں جھبو کو معلوم ہوا کہ یہ عورت بھی مراد آباد کی رہنے والی تھی، دھیرج گاؤں کی اور اس کی برادری ہی کی تھی۔ جھبو بڑا خوش ہوا چلو یہیں بیٹھے بیٹھے سب کام ہو گیا۔ اپنی جات برادری کی، اپنے ضلع کی، اپنے دھرم کی عورت یہیں بیٹھے بٹھلائے سو روپے میں مل گئی۔ اس نے بڑے چاؤ سے اپنا بیاہ رچایا۔ اور پھر اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی لڑیا بہت اچھا گاتی ہے۔ وہ خود بھی اپنی پاٹ دار آواز میں زور سے گانے بلکہ گانے سے زیادہ چلّانے کا شوقین تھا۔ اب تو کھولی میں دن رات ——— گویا کسی نے ریڈیو کھول دیا ہو۔ دن میں کھولی میں لڑیا کام کرتے ہوئے گاتی تھی۔ رات کو جھبو اور لڑیا دونوں گاتے تھے۔ ان کے ہاں کوئی بچہ نہ تھا۔ اس لئے انھوں نے ایک طوطا پال رکھا تھا۔ میاں مٹھو خاوند اور بیوی کو گاتے دیکھ دیکھ کر خود بھی ہمک ہمک کر گانے لگے۔ لڑیا میں ایک اور بات بھی تھی۔ جھبو نہ بیڑی پیتے، نہ سگریٹ، نہ تاڑی، نہ شراب۔ لڑیا بیڑی، سگریٹ تاڑی سب ہی کچھ پیتی تھی۔ کہتی تھی پہلے وہ یہ سب کچھ نہیں جانتی تھی مگر جب سے وہ بدمعاشوں کے پلّے پڑی۔ اسے یہ سب بری باتیں سیکھنا پڑیں اور اب وہ اور سب باتیں تو چھوڑ سکتی ہے مگر بیڑی اور تاڑی نہیں چھوڑ سکتی۔ کئی بار تاڑی پی کر لڑیا نے جھبو پر حملہ کیا۔ اور جھبو نے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اس موقع پر طوطا بہت شور مچاتا تھا اور رات کو دونوں کو گالیاں بکتے دیکھ کر خود بھی پنجرے میں ٹنگا ہوا زور زور سے چلّا کر وہی گالیاں بکتا جو وہ دونوں بکتے تھے۔ ایک بار تو اس کی گالی سن کے جھبو غصے میں آ کے طوطے کو پنجرے سمیت بدرو میں پھینکنے لگا تھا۔ مگر جیونا نے بیچ میں پڑ کر طوطے کو بچا لیا۔ طوطے کو مارنا بڑا پاپ ہے جیونا نے کہا۔ تمہیں پھر برہمنوں کو بلا کر پرائشچت کرنا پڑے گا۔ اور تمہیں پندرہ بیس روپے کھل جائیں گے یہ سوچ کر جھبو نے طوطے کو بدرو میں غرق کر دینے کا خیال ترک کر دیا۔

شروع شروع میں تو جھبو کو ایسی شادی ——— پر چاروں طرف سے گالیاں پڑیں۔ وہ خود بھی لڑیا کو بڑے شبہ کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اور کئی بار اُسے بلا وجہ پیٹا اور خود بھی مل سے غیر حاضر رہ کر اس کی نگرانی کرتا رہا، مگر آہستہ آہستہ لڑیا نے اپنا اعتبار ساری چال میں قائم کر لیا۔ لڑیا کہتی تھی کہ کوئی عورت سچے دل سے بدمعاشوں کے پلّے پڑنا پسند نہیں کرتی۔ وہ تو ایک گھر چاہتی ہے، چاہے وہ چھوٹا ہی سا گھر ہو۔ وہ ایک خاوند چاہتی ہے جو اس کا اپنا ہو، چاہے وہ جھبو بھیا ایسا ہر وقت شور مچانے والا، زبان دراز، گنجی خورا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ایک ننھا بچہ چاہتی ہے چاہے وہ کتنا ہی بدصورت ہی کیوں نہ ہو۔ اور اب لڑیا کے پاس گھر بھی تھا اور جھبو بھی تھا اور اگر بچہ نہیں تھا تو کیا ہوا۔ ہو جائے گا اور اگر نہیں ہوتا تو بھگوان کی مرضی۔ یہ میاں مٹھو ہی اس کا بیٹا بنے گا۔

ایک روز لڑیا اپنے میاں مٹھو کا پنجرا جھلا رہی تھی اور اسے چوری کھلا رہی تھی اور اپنے دن کے سپنوں میں اس ننھے سے بالک کو دیکھ رہی تھی جو فضا میں ہمکتا ہمکتا اس کی آغوش کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا کہ چال میں شور سا بڑھنے لگا اور اس نے دروازے سے جھانک کر دیکھا کہ چند مزدور جھبو کو اٹھائے چلے آ رہے ہیں اور ان کے کپڑے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ لڑیا کا دل دھک سے رہ گیا وہ بھاگتی بھاگتی نیچے گئی اور اس نے بڑی درشتی سے اپنے خاوند کو مزدوروں سے چھین کر اپنے کندھے پر اٹھا لیا۔ اور اپنی کھولی میں لے آئی۔ پوچھنے پر

پتہ چلا کہ جھبو سے گنتی کھاتے کے مینجر نے کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی، اس پر جھبو نے بھی اسے دو ہاتھ جڑ دیئے۔ اس پر بہت واویلا مچا اور مینجر نے اپنے بدمعاشوں کو بلا کر جھبو کی خوب ٹھکائی کی اور اسے مل سے باہر نکال دیا۔ خیریت ہوئی کہ جھبو بچ گیا ورنہ اس کے مرنے میں کوئی کسر نہ تھی۔ لڑیا نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ اس نے اسی روز سے اپنے سر پر ٹوکری اٹھالی اور گلی گلی ترکاری بھاجی بیچنے لگی۔ جیسے وہ زندگی میں یہی دھندا کرتی آئی تھی۔ اس طرح محنت مزدوری کر کے اس نے اپنے جھبو کو اچھا کر لیا۔ جھبو اب بھلا چنگا ہے۔ مگر اب اسے کسی مل میں کام نہیں ملتا۔ وہ دن بھر اپنی کھولی میں کھڑا مہالکشمی کے اسٹیشن کی چاروں طرف بلند و بالا کارخانوں کی چمنیوں کو تکتا رہتا ہے۔ سیمون مل، نیو مل، اولڈ مل، اپولو مل، دھنراج مل۔ لیکن اس کے لئے کسی مل میں جگہ نہیں ہے۔ کیونکہ مزدور کو گالی کھانے کا حق ہے، گالی دینے کا حق نہیں ہے۔ آج کل لڑیا بازاروں اور گلیوں میں آوازیں دے کر بھاجی ترکاری فروخت کرتی ہے اور گھر کا سارا کام کاج بھی کرتی ہے۔ اس نے بیڑی، تاڑی سب چھوڑ دی ہے۔ ہاں اس کی ساڑی، قرمزی بھورے رنگ کی ساڑی جگہ جگہ سے پھٹتی جا رہی ہے۔ تھوڑے دنوں تک اور اگر جھبو کو کام نہ ملا تو لڑیا کو اپنی ساڑی میں پرانی ساڑی کے ٹکڑے جوڑنا پڑیں گے۔ اور اپنے میاں مٹھو کو چوری کھلانا بند کرنا پڑے گا۔

پانچویں ساڑی کا کنارہ گہرا نیلا ہے۔ ساڑی کا رنگ گدلا سرخ ہے۔ لیکن کنارہ گہرا نیلا ہے۔ اور اس نیلے میں اب بھی کہیں کہیں چمک باقی ہے۔ یہ ساڑی دوسری ساڑیوں سے بڑھیا ہے۔ کیونکہ یہ ساڑی پانچ روپے چار آنے کی نہیں ہے۔ اس کا کپڑا، اس کی چمک دمک کچھ کہے دیتی ہے کہ یہ ان سے ذرا مختلف ہے۔ آپ کو دور سے یہ مختلف معلوم نہیں ہوتی ہوگی۔ مگر میں جانتا ہوں کہ یہ ان سے ذرا مختلف ہے۔ اس کا کپڑا بہتر ہے۔ اس کا کنارہ چمکدار ہے۔ اس کی قیمت پونے نو روپے ہے۔ یہ ساڑی منجولا کی ہے۔ یہ ساڑی منجولا کے بیاہ کی ہے۔ منجولا کے بیاہ کو ابھی چھ ماہ بھی نہیں ہوئے ہیں۔ اس کا خاوند گزشتہ ماہ چرخی کے گھومتے ہوئے پٹے کی لپیٹ میں آ کے مارا گیا تھا۔ اور اب سولہ برس کی خوبصورت منجولا بیوہ ہے۔ اس کا دل جوان ہے، اس کا جسم جوان ہے، اس کی امنگیں جوان ہیں۔ لیکن اب وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس کا خاوند مل کے ایک حادثے میں مر گیا ہے۔ وہ پٹہ بڑا ڈھیلا تھا اور گھومتے ہوئے بار بار پھٹپھٹاتا تھا اور کام کرنے والوں کے احتجاج کے باوجود اسے مل مالکوں نے نہیں بدلا تھا۔ کیونکہ کام چل رہا تھا، اور دوسری صورت میں تھوڑی دیر کے لئے کام بند کرنا پڑتا۔ پٹہ کو تبدیل کرنے کے لئے روپیہ بھی خرچ ہوتا تھا۔ مزدور تو کسی وقت بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے روپیہ تھوڑی خرچ ہوتا ہے، لیکن پٹہ تو بڑی قیمتی شے ہے۔

جب منجولا کا خاوند مارا گیا، تو منجولا نے ہرجانے کی درخواست دی۔ جو نامنظور ہوئی۔ کیونکہ منجولا کا خاوند اپنی غفلت سے مرا تھا۔ اس لئے منجولا کو کوئی ہرجانہ نہ ملا اور وہ اپنی وہی نئی دلہن کی ساڑی پہنے رہی جو اس کے خاوند نے پونے نو روپے میں اس کے لئے خرید کی تھی۔ کیونکہ اس کے پاس کوئی دوسری ساڑی نہ تھی جو وہ اپنے خاوند کی موت کے سوگ میں پہن سکتی۔ وہ اپنے خاوند کے مر جانے کے بعد بھی دلہن کا لباس پہننے پر مجبور تھی۔ کیونکہ اس کے پاس کوئی دوسری ساڑی نہ تھی اور جو ساڑی تھی وہ یہی گدلے سرخ رنگ کی پونے نو روپے کی ساڑی جس کا کنارہ گہرا نیلا ہے۔

شاید اب منجولا بھی پانچ روپے چار آنے کی ساڑی پہنے گی۔ اس کا خاوند زندہ رہتا جب بھی وہ دوسری ساڑی پانچ روپے چار آنے کی لاتی۔ اس لحاظ سے اس کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ مگر فرق اتنا ضرور رہا ہے کہ وہ یہ ساڑی آج پہننا چاہتی ہے۔ ایک سفید ساڑی پانچ روپے چار آنے والی جسے پہن کر وہ دلہن نہیں بیوہ معلوم ہو سکے۔ یہ ساڑی اسے دن رات کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے اس ساڑی سے جیسے اس کے مرحوم خاوند کی مضبوط باہیں لپٹی ہیں، جیسے اس کے ہر تار پر اس کے شفاف بوسے مرتسم ہیں، جیسے اس کے تانے بانے میں

اس کے خاوند کی گرم گرم سانسوں کی حدت آمیز غنودگی ہے۔ اس کے سیاہ بالوں والی چھاتی کا سارا پیار دفن ہے۔ جیسے اب یہ ساڑی نہیں ہے۔ اک گہری قبر ہے۔ جس کی ہولناک پہنائیوں کو وہ ہر وقت اپنے جسم کے گرد لپیٹ لینے پر مجبور ہے۔ منجولا زندہ قبر میں گاڑی جا رہی ہے۔

چھٹی ساڑی کا رنگ لال ہے، لیکن اسے یہاں نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اسے پہننے والی مر چکی ہے۔ پھر بھی یہ ساڑی یہاں جنگلے پر بدستور موجود ہے۔ روز کی طرح دھلی دھلائی ہوا میں جھول رہی ہے۔ یہ مائی کی ساڑی ہے جو ہماری چال کے دروازے کے قریب اندر کھلے آنگن میں رہا کرتی تھی۔ مائی کا ایک بیٹا تھا سیتو، وہ اب جیل میں ہے۔ ہاں سیتو کی بیوی اور اس کا لڑکا یہیں نیچے آنگن میں دروازے کے قریب دیوار کے نیچے پڑے رہتے ہیں۔ سیتو اور سیتو کی بیوی اور اس کی لڑکی اور بڑھیا مائی یہ سب لوگ ہماری چال کے بھنگی ہیں۔ ان کے لئے کھولی بھی نہیں ہے اور ان کے لئے اتنا کھانا کپڑا بھی نہیں ملتا۔ جتنا ہم لوگوں کو ملتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ آنگن میں رہتے ہیں، وہیں کھانا پکاتے ہیں، وہیں پڑ کے سو رہتے ہیں۔ یہیں یہ بڑھیا مائی ماری گئی تھی۔ وہ بڑا سوراخ جو آپ اس ساڑی میں دیکھ رہے ہیں۔ پلو کے قریب یہ گولی کا سوراخ ہے۔ یہ کارتوس کی گولی مائی کو بھنگیوں کے ہڑتال کے دنوں میں لگی تھی نہیں، وہ اس ہڑتال میں حصہ نہیں لے رہی تھی وہ بیچاری تو بہت بوڑھی تھی۔ چل پھر بھی نہ سکتی تھی۔ اس ہڑتال میں تو اس کا بیٹا سیتو اور دوسرے بھنگی شامل تھے، یہ لوگ مہنگائی مانگتے تھے اور کھولی کا کرایہ مانگتے تھے یعنی اپنی زندگی کے لئے دو وقت کا روٹی کپڑا، اور سر پر ایک چھت چاہتے تھے۔ اس لئے ان لوگوں نے ہڑتال کی تھی اور جب ہڑتال خلاف قانون قرار دیدی گئی تو ان لوگوں نے جلوس نکالا اور اس جلوس میں مائی کا بیٹا سیتو آگے آگے تھا اور خوب زور شور سے نعرے لگاتا تھا اور پھر جب جلوس بھی خلاف قانون قرار دیا گیا تو گولی چلی اور ہماری چال کے سامنے چلی۔ ہم لوگوں نے تو اپنے دروازے بند کر لئے لیکن گھبراہٹ میں چال کا دروازہ بند کرنا کسی کو یاد نہ رہا اور پھر ہم اپنے بند کمروں میں، ایسا معلوم ہوا کہ گویا گولی ادھر سے ادھر سے چاروں طرف سے چل رہی ہو، تھوڑی دیر کے بعد بالکل سناٹا ہو گیا۔ اور جب ہم لوگوں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا تو جلوس تتر بتر ہو چکا تھا اور ہماری چال کے دروازے کے قریب بڑھیا مری پڑی تھی۔ یہ اسی بڑھیا کی لال ساڑی ہے، جس کا بیٹا سیتو اب جیل میں ہے۔ اسی لال ساڑی کو اب بڑھیا کی بہو پہنتی ہے۔ اس ساڑی کو بڑھیا کے ساتھ جلا دینا چاہیئے تھا، مگر کیا کیا جائے تن ڈھکنا زیادہ ضروری ہے۔ مردوں کی عزت و احترام سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے کہ زندوں کا تن ڈھکا جائے۔ یہ ساڑی جلنے جلانے کے لئے نہیں ہے، تن ڈھکنے کے لئے ہے۔ ہاں کبھی کبھی سیتو کی بیوی اس کے پلو سے اپنے آنسو پونچھ لیتی ہے کیونکہ اس میں پچھلے اسی برسوں کے سارے آنسو اور ساری امنگیں اور ساری فتحیں اور شکستیں جذب ہیں، آنسو پونچھ کر سیتو کی بیوی پھر اسی ہمت سے کام کرنے لگتی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کہیں گولی نہیں چلی، کوئی جیل نہیں گیا۔ بھنگن کی جھاڑو اسی طرح چل رہی ہے۔

ایلو، باتوں باتوں میں وزیر اعظم صاحب کی گاڑی نکل گئی۔ وہ یہاں نہیں ٹھہری۔ میں سمجھتا تھا وہ یہاں ضرور ٹھہرے گی۔ وزیر اعظم صاحب درشن دینے کے لئے گاڑی سے نکل کے تھوڑی دیر کے لئے پلیٹ فارم پر ٹہلیں گے اور شاید ہوا میں جھولتی ہوئی ان چھ ساڑھیوں کو بھی دیکھ لیں گے جو مہالکشمی کے پل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں۔ یہ چھ ساڑیاں جو بہت ہی معمولی عورتوں کی ساڑیاں ہیں ایسی معمولی معمولی عورتیں جن سے ہمارے دیس کے چھوٹے چھوٹے گھر بنتے ہیں، جہاں ایک کونہ میں چولہا سلگتا ہے، ایک کونے میں پانی کا گھڑا رکھا ہے۔ ادھر طاقچے میں شیشہ ہے، کنگھی ہے، سیندور کی ڈبیا ہے، کھاٹ پر ننھا بچہ سو رہا ہے، الگنی پر کپڑے سوکھ رہے ہیں۔ یہ ان چھوٹے چھوٹے لاکھوں کروڑوں گھروں کو بنانے والی عورتوں کی ساڑیاں ہیں جنھیں ہم ہندوستان کہتے ہیں۔ یہ عورتیں جو ہمارے پیارے پیارے بچوں کی مائیں ہیں۔ ہمارے بھولے بھالے بھائیوں کی عزیز بہنیں ہیں۔ ہماری معصوم محبتوں کا گیت ہیں۔ ہماری پانچ ہزار سالہ تہذیب کا سب سے اونچا نشان ہیں۔ وزیر اعظم صاحب، یہ ہوا میں جھولتی ہوئی ساڑیاں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ تم سے کچھ مانگتی ہیں۔ یہ کوئی بہت بڑی قیمتی چیز تم سے نہیں مانگتی ہیں۔ یہ کوئی بڑا ملک کوئی

بڑا عہدہ، کوئی بڑی موٹر کار، کوئی پرمٹ، کوئی ٹھیکہ، کوئی پراپرٹی، یہ ایسی کسی چیز کی تم سے طالب نہیں ہیں۔ یہ تو زندگی کی بہت ہی چھوٹی چھوٹی چیزیں مانگتی ہیں۔ دیکھئے! یہ شانتا بائی کی ساڑی ہے جو اپنے بچپن کی کھوئی ہوئی دھنک تم سے مانگتی ہے۔ یہ جیونا بائی کی ساڑی ہے جو اپنی آنکھ کی روشنی اور اپنی بیٹی کی عزت مانگتی ہے۔ یہ ساوتری کی ساڑی ہے جس کے گیت مرچکے ہیں اور جس کے پاس اپنے بچوں کے لئے اسکول کی فیس نہیں ہے۔ یہ لڑکیاں ہے، جس کا خاوند بیکار ہے اور جس کے کمرے میں ایک طوطا ہے جو دو دن سے بھوکا ہے۔ یہ نئی دلہن کی ساڑی ہے جس کے خاوند کی زندگی چمڑے کے پٹّے سے بھی کم قیمت کی ہے۔ یہ بڑی بھنگن کی لال ساڑی ہے جو ہندوق کی گولی کو پل کی پھال میں تبدیل کردینا چاہتی ہے تاکہ دھرتی سے انسان کا لہو پھول بن کر کھل اٹھے اور گندم کے سنہرے خوشے ہنس کے لہرانے لگے ۔۔۔۔

لیکن وزیر اعظم صاحب کی گاڑی نہیں رکی۔ اور وہ ان چھ ساڑیوں کو نہیں دیکھ سکے اور تقریر کرنے کے لئے چوپاٹی چلے گئے۔ اس لئے اب میں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر کبھی آپ کی گاڑی ادھر سے گذرے تو آپ ان چھ ساڑیوں کو ضرور دیکھئے جو مہالکشمی کے پل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں اور پھر آپ ان رنگا رنگ ریشمی ساڑیوں کو بھی دیکھئے، جنھیں دھوبیوں نے اسی پل کے دائیں طرف سوکھنے کے لئے لٹکا رکھا ہے اور جو ان گھروں سے آئی ہیں جہاں اونچی اونچی چمنیوں والے کارخانوں کے مالک یا اونچی اونچی تنخواہیں پانے والے رہتے ہیں۔ آپ اس پل کے دائیں بائیں دونوں طرف ضرور دیکھئے اور پھر اپنے آپ سے پوچھئے کہ آپ کس طرف جانا چاہتے ہیں۔ دیکھئے! میں آپ سے اشتراکی بننے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں، میں آپ کو حماقتی جنگ کی تلقین بھی نہیں کررہا ہوں میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ مہالکشمی پل کے دائیں طرف ہیں یا بائیں طرف۔

(ترقی پسند مصنفین کانفرنس بھوپال میں پڑھا گیا)

(شمارہ ۳ تا ۱۔ سنہ ۱۹۴۹ء)

آپ کی لائبریری کے لئے

کرشن چندر کی مشہور و مقبول کتابیں

جنہیں مکتبۂ افکار کراچی نے حسن و اہتمام سے شائع کیا ہے

● ایک عورت ہزار دیوانے	(ناول)	۵/- روپے
● سڑک واپس جاتی ہے	"	۶/۷۵ "
● ایک وائلن سمندر کے کنارے	"	۶/- "
● چاندی کا گھاؤ	"	۹/- "
● ایک خوشبو اُڑی اُڑی سی	(۱۶ بہترین افسانے)	۵/۲۵ "

ملنے کا پتہ

مکتبۂ افکار، رابسن روڈ کراچی

راجندر سنگھ بیدی

نورا

ابھی میں نے اپنے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ اوپر تلے تین آوازیں سُنائی دیں ــــــــ

"آج پھر پلیتھن گیر دیا۔ اُلو کہیں کے! .... ارے چولھا ہی سلگا لیا ہوتا .... اور نہیں تو بھوسی ہی نکال لی ہوتی! ــــــــ" اور تینوں آوازیں ایک ہی آدمی کے منہ سے نکلی ہوئی معلوم دیتی تھیں۔ جن کا جواب خاموشی کے سوا اور کچھ بھی سنائی نہ دیا۔ سننے والا یا تو کہنے والے کا دبیل تھا اور نہیں تو وہ کہنے والے کو بالکل جاہل سمجھتا تھا تیسری وجہ خاموشی کی کوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بہر حال میں یہ بات محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ سننے والا ایک فاش غلطی کر رہا ہے۔ خاموشی اور شرافت کی نی زمانہ قدر ہی کیا ہے۔ سوائے اس کے کہ اس کا ناجائز فائدہ اٹھایا جائے۔

یہ آوازیں درمیانی کوٹھری سے آرہی تھیں زمین اور پہلی چھت کے درمیان ایندھن اور فروعات رکھنے کی جو جگہ تھی وہاں میں نے لکڑی کے پشتوں اور چند ٹوٹے ہوئے کواڑوں کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا تھا۔ واللہ اعلم وہ پتھر اور کواڑ ہی بولنے لگے تھے ان دنوں میں کسی خاص مقصد کے پیش نظر پریوں کی کہانیاں پڑھ رہا تھا۔ اور پھر آپ جانتے ہیں کہ دیو پری کے قصے پڑھنے کے بعد کیا کیا دنیائے ممکنات ہے جو آپ کے سامنے کھلتی ہی چلی جاتی ہے۔

پہلی چھت پر ہم کالج کے چند چھوکرے اکٹھے رہتے تھے۔ باقی کے کمبخت یا تو گرینڈ کیبرے کے پیچھے پڑے ہوئے تھے اور یا پھر بین الصوبائی میچ دیکھنے گئے ہوں گے۔ اس وقت اُن میں سے وہاں ایک بھی نہیں تھا میں نے ہمت جمع کی اور قدم آگے بڑھایا۔ روشنی واقعی درمیانی کوٹھری سے آرہی تھی۔ ایک عارضی سا دیا جرمن سلور کی ایک کٹوری میں سرسوں کا تیل اور بتی ڈال کر اور اُسے اُکڑوں رکھ کر جلا دیا گیا تھا۔ جس میں سے ایک کالی لاٹ اُٹھ کر اوپر کی دیوداری تختی کو سیاہ کر رہی تھی۔ کالے کالے پھول تختی کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے اور کچھ دیر کے بعد کٹوری کے اندر یا بتی پر گرتے، بتی مدھم ہو کر ٹمٹمانے لگتی لیکن پھول پھر بتی کا حصہ ہو کر جلنے لگتے۔ قریب ایک شخص چارپائی پر لیٹا ہوا ایک میلے کچیلے جیتھڑے لپیٹے بیچوان کے کش پر کش لگا رہا تھا۔ بڑا پسند تھا اُسے اپنا بیچوان ــــــ ع

ہم کو اپنی گڑگڑی اور پیچواں پرنا رہے

خدا کی قسم! ــــــــ یہ تو اپنا نورا ہی ہے میں نے ایک لمبی سی "او ہو" کے بعد کہا۔ اور اُس کے ساتھ جمان تھا "نورے کا سایہ" اُس کے وجود کا نتیجۂ صریح جس کی مونچھیں متواتر تیل لگانے اور کھینچنے سے اور بڑی ہو گئی تھیں اُس کے غضب اور چادر زنخداں والے سیاہ چہرے پر ایک عجیب لعنت سی برس رہی تھی جیسے خوبانی اور آلو بخارے کے بیجوں سے نکالے ہوئے سستے

بدبودار اور بے حد چکنے تیل نے اور بھی چمکا دیا تھا۔ اور اُس کے سامنے لوزا بیٹھا تھا۔ کھلے کھلے ہاتھ پاؤں، چار چار سیڑھیاں پھلانگنے والا خوبرد اور ڈرپوک جو چند ایک لقمے زہر مار کر رہا تھا۔

جمّاں ایک پیرِ تسمہ پا تھا جو ہر وقت لوزے کی گردن پر سوار رہتا۔ مثلاً اُٹھا تو چولہا سُلگائے تو لوزا آٹے میں سے بھوسی نکالے تو لوزا برتن مانجھے تو وہی اور جو کھنگالے تو وہی ——— میاں جمّاں کبھی بچھائی پر آ بیٹھے اور کچی پکائی کھائے تو وہ کبھی گویا لوزے پر احسان کرے۔ میں اور میرا ساتھی اسنین ان کی قبر تک سے واقف تھے۔ اس سے پہلے یہ برادر تعلیم الفرقان والوں کے پیچھے رہتے تھے جہاں ایک سفلہ بنگالن ہمیشہ اوپر سے گوبھی کے ڈنٹھ، پیاز کے چھلکے، پھلکیاں یا بچا کھچا بھات ان کی منڈیا پر پھینک دیتی تھی اور یہ ہمیشہ موٹی موٹی گالیاں دیا کرتے تھے وہاں کبھی لوزا ویسے ہی جمّاں کا دبیل تھا۔

آخر ایسا کیوں تھا؟ یہ اسنین اور میرے دوسرے ساتھی کئی بار سوچتے۔ لیکن ہمیں آخر دم تک پتہ نہ چل سکا۔ البتہ لوزے کی فطرت کا مطالعہ کرتے وقت ہم اکثر حظ اٹھایا کرتے۔ لوزا سخت جذباتی تھا۔ اُس کے جذبات کا خزینہ کانوں اور آنکھوں کے اس قدر قریب تھا کہ اِدھر کانوں سے بات سُنی اور اُدھر ساون بھادوں کی جھڑی ہے کہ لگ رہی ہے۔ چھم چھم چھپا چھم اور ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ تاوقتیکہ زمین میں کوڑیاں نہ دبائی جائیں یا کوٹھے کی منڈیر پر چیتھڑوں کا بڈھا نہ کھڑا کیا جائے لیں اس کے جذبات کے خزینہ کو ذرا چھیڑنے کی ضرورت تھی۔ یا پھر اس کے ماضی کی راکھ میں چند اور کوئلے تھے جنھیں وہ اکثر موقع بے موقع اُتھلتا پُھتلتا رہتا اور جنھیں سرد کرنے کے لئے وہ آنسوؤں کا سیلاب بہا دیتا۔ ہمیں اس لم دھڑنگے چھ فٹ لمبے منڈھیا میں ہمیشہ کمر کمان کرکے چلنے والے انسان کو رُلا کر مزا آتا تھا ———

میں تین چار سیڑھیاں اُتر کر عین نیم کے چھتے کے مقابل کھڑا ہو گیا اور کہا ——— "ابے لوزے؟"

میاں جمّاں اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا ——— تعظیماً! اور اپنے پیچوان کی نے کو چارپائی کے نیچے پھنسا دیا۔ لوزے نے روٹی کا لقمہ سالن ہی میں رہنے دیا اور ہاتھ ماتھے پر لے جاتے ہوئے بولا "بابو جی" ساہ سلام! (صاحب سلامت)

"سلام!" میں نے جواب دیتے ہوئے کہا "ارے یار تم لوگ بالکل چوروں کی طرح یہاں آ ٹپکے"

"اور کیا دف تھوڑے ہی بجاتے!" جمّاں نے خلاف توقع مسکراتے ہوئے کہا۔ دراصل ہونٹوں، بلکہ مونچھوں کا یہ خوش گوار پھیلاؤ اور ماتھے کے ناگوار شکن مل جل کر ظاہر کرتے تھے کہ اس کی مسکراہٹ میں مسکراہٹ کم اور رشوت زیادہ ہے تاکہ میں اُس کے اُجڈ سے جواب کا بُرا نہ مانوں۔

"شاید میں تمھاری کچھ مدد کر دیتا" میں نے کہا اور درمیانی کوٹھری کے چاروں ابرو سوالیہ نشان بن کر مجھے گھورنے لگے۔ میں نے ان شرمندۂ نطق سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا "مثلاً" میں چودھری کو کہہ کر یہاں سپیدی ہی کروا دیتا اور نہیں تو کرائے میں ہی کچھ رعایت ہو جاتی"

اب یہ بات واقعی قابلِ غور تھی۔ جمّاں اور لوزا سوچنے لگے۔ سادہ لوح لوزا اپنے چہرے سے واقعی ممنون نظر آ رہا تھا، لیکن جمّاں ابھی تک دل میں کہہ رہا تھا ——— "یہ امیر لوگ کتنے چالاک ہوتے ہیں" "یہ مجھے بھی بتا دیا ہوتا" کا انداز اُسی وقت اختیار کرتے ہیں۔ جب کسی کی بیل اپنے آپ منڈھے چڑھ جاتی ہے ———

حقیقت یہ ہے کہ اسنین تو ان لوگوں کا یہاں آنا کبھی بھی برداشت نہ کرتا۔ وہ فلسفے کا طالب علم تھا۔ دماغ کا خبطی تھا بالوں میں تیل کم لگاتا جس کی وجہ سے بال ہمیشہ سیاہ گوش کے کانٹوں کی طرح کھڑے رہتے۔ اور دوسرے کو اتفاقاً چھو جانے سے

اُسے سزا دیتے۔ کچھ اُن کے خشخشے اور گھونگریالے پن سے پتہ چلتا کہ ملکہ سبا کی نسل سے ہیں۔ وہ فلسفہ کا طالب علم ہونے کی وجہ سے دوسروں کے لئے مجسّم شور ہونے اور اپنے لئے مجسّم سکون مانگتے۔ اسنیتن کو بھلا جماں اور نورا کا یہاں آنا کیسے بھاتا۔ لیکن وہ خاموش محض اس خیال سے ہو رہا کہ شاید جماں اور لوزا میرے کوئی عزیز ہیں۔

اکثر نیچے سے گالیوں کی آوازیں، بیچوان کی گڑگڑاہٹ ہونے پیٹ کے خراٹے اور کھنکار کی شاق سنائی دیتی اور اسنین اپنے سلوجزم گنگناتا ہوا پکار اٹھتا۔ وہ لوزے کو پڑ رہی ہیں بے بھاؤ کی اور پھر رہی" سلوجزم"—— کچھ دیر کے بعد —— ارے بچاؤ یار خدا کی قسم مار ڈالے گا بیچارے کو وہ موٹھیل۔ لیکن، افسانہ نگار داؤد اور دہی رفیق کو مجھ سے اس بات میں اتفاق تھا کہ ان لوگوں کے یہاں آنے سے ہماری زندگی میں رومان کی جگہ مسئلہ حیات نے لے لی تھی۔ داؤد سوچتا تھا کہ جنھیں مار پڑتی ہے وہ ہمیشہ مار کھانے کے لائق ہوتے ہیں۔ اسنیتن اور داؤد اس بات پر جھگڑنے لگتے —— اور میری حالت اس جنگ میں ایسی ہوتی جیسے دو بڑے ملکوں کی جنگ میں کسی غیر جانب دار یا بفیر (BUFER) ریاست کی ہو سکتی ہے۔

ایک بات پر ہم چاروں متفق تھے کہ ماں باپ سے دور نظم ونسق سے کوسوں پرے، رات کے ایک ایک بجے جب ہم گلیاں جھانکتے ہانپتے کانپتے اپنے مکان کی طرف آتے تو ہماری سیڑھیاں اُن لوگوں کی وجہ سے آخری تنکا ثابت نہ ہوتیں۔ درمیانی کوٹھری کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہوتا اور دیئے کی روشنی نورِ ہدایت کی طرح ہمیں ہمارے ازلی گھر کی راہ دکھاتی۔ جہاں ہمیشہ دنیائے بازار کے دھول دھپے، گالی گلوچ سردی اور گرمی کے خلاف دوستوں کی محبت، والدہ کے پیار سے بھرا ہوا خط، لحاف اور بجلی کا پنکھا میسر آتے ہیں۔ جماں اور لوزا خدا جانے کوئی مُغ بچے تھے جو ساری رات آتش پرستی کرتے تھے۔ لیکن کچھ بھی ہو ہمیں رات کو سیڑھیوں میں دیئے کی روشنی چاہئے تھی اور اس سلسلے میں ہم مغ پرستی تک کے لئے تیار تھے۔ اور خلاف اس کے لو کروڑ صلواتیں اُس چودھری کو سناتے جو ہمیں سیڑھیوں میں ایک بجلی کا ہنڈا تک لگوا نہیں دیتا تھا۔ خدا جانے میرے کہنے پر چودھری، جماں اور لوزے کی درمیانی کوٹھری میں سپیدی اور کرائے میں تخفیف کیسے کر دیتا۔

ایک دن میں اور اسنیتن رات کے دو بجے گھر لوٹے، ان دنوں شہر میں ایک صنعتی نمائش آئی ہوئی تھی۔ بس اس کی کارنیوال میں ہم "تیر و تفنگ" کا ایک کھیل کھیلتے رہے گھر لوٹے تو نہ صرف نیم چھتے کا دیا جل رہا تھا بلکہ مغ بچے جاگ بھی رہے تھے۔ جرمن سلور کی کٹوری کے عین اوپر دیوداری تختی پر ایک سیاہ سٹیلگ ٹائپ یعنی شبولنگ سا نیچے کی طرف امڈ رہا تھا —— اور لوزا جماں کی ٹانگ دبا رہا تھا —— اسنین کہ ایک اشتراکی بھی تھا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اشتراکی خواہ وہ عملی ہو یا کرسی نشین ذلیل ہونے یا لفظ "ایکسپلائیٹیشن" سے کتنی نفرت کرتے ہیں۔ "تیرا زہر بند ہو جائے۔" اسنین نے آنکھیں نکالتے ہوئے زیر لب کہا۔ "سارا دن بیچارہ روڑی کوٹتے تھک گیا ہوگا۔ پھر گھر کا دھندا کیا ہے، اور اب ہے کہ رات کے دو بجے تک اُس کے پاؤں داب رہا ہے۔"

شاید اسنین بول پڑتا، لیکن جماں نے اُس کے کانوں میں ایک خوش خبری ٹھونس کر بات آئی گئی کر دی۔ اور وہ خوشخبری یہ تھی کہ ڈاکیہ اسنین کا منی آرڈر لے کر آیا تھا۔ اگرچہ اُسے نہ پا کر لوٹ گیا۔ اسنین پیسوں کے متعلق سوچنے لگا۔ اشتراکی کو بھی کسی ذلیل کے بچانے سے جو تسکین ہوتی ہے اُس سے کہیں زیادہ باعثِ راحت اُسے گھر سے آیا ہوا منی آرڈر ہوتا ہے۔

کتنے کا تھا۔ اسنین نے اس اُمید پر سوال کیا کہ شاید مغ بچوں میں سے کسی کو پتہ ہو دراصل ہم دونوں کو اُمید نہ تھی کہ مالیت کے متعلق یہ لوگ جانتے ہوں گے۔ لیکن پچاس کا ہے"........ اور میرپور خیر سے آیا ہے۔ لوزے نے قدرے اونچی آواز سے کہا۔ "واہ رے لوزے!" ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس دیئے "ارے بڑا بدمعاش ہے تو تو۔"

اس کے بعد ہم رات کے سناٹے میں چٹختے جوتوں سے شور مچاتے ہوئے اوپر چلے گئے کمرہ کا دروازہ رفیق اور داؤد نے کھولا تھا۔ اندر گھستے ہوئے اسٹین کے دماغ میں پھر لوزے اور اُس کے پاؤں دابنے کی تصویر گھوم گئی۔ اُس نے اپنی گزی کی قمیص کے بٹن کھولتے اور اُسی گزی کی ٹمائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے کہا —— "میرے بس کی بات ہو تو جماں کو اسی مکان کی کنگنی پر کھڑا کر کے نیچے دھکا دے دوں۔ اور صبح سب سے پہلے اس کی موت پر آنسو بہاتے ہوئے زندگی کی صحیح تصویر پیش کر دوں۔ ہے نا؟ اور دیکھو کمبخت لوزے کو مالیت کس طرح یاد ہے۔ اور یہ بھی جانتا ہے کہ پیسے کہاں سے آئے تھے —— میں نے کہا کون جانے اُسے یہ بھی پتہ ہے کہ کہاں پیسے رکھے جاتے ہیں۔

اسٹین نے اپنے سیاہ گوش سے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ارے یار سچ سچ —— کہیں ہم پر بھی ہاتھ صاف نہ کر جائیں۔" اس کے بعد میں داؤد کے بستر میں گھس گیا۔ میری چارپائی کی پائنتی ٹوٹ گئی تھی اور چارپائی اچھا خاصہ کنواں بن گئی تھی۔ صبح اٹھتے ہی بے تحاشا گالیوں اور مار دھاڑ کی آواز سنائی دی اور پھر دہی —— "ارے تو نے اتنی کنگنی ضائع کر دی ہے، کھچڑی کے لیے تو اتنے سے چاول ہی کافی تھے —— ابے او کتے کے بچے ——"

اسٹین بولا "کبھی اب مجھ سے نہیں رہا جاتا" — داؤد کا نظریہ بدستور رجعت پسندانہ تھا —— جو مار کھانے کے لائق ہوتے ہیں۔ اُنھیں مار ہی پڑنی چاہیے۔ لیکن آج وہ بھی میرے اور اسٹین کے ساتھ متفق ہو رہا تھا کہ بیچارے کے ساتھ صریحاً زیادتی ہو رہی ہے۔ داؤد نے ایک افسانے کو میز پر رکھا اور دوسرا افسانہ چھیڑ دیا۔

"ارے بلاؤ تو اُس لوزے کو" اُس نے مجھے تحکمانہ انداز میں کہا۔

لحاف کا اندرونی حصہ باہر کی برفانی سردی کے مقابلہ میں کم تکلیف دہ تھا لیکن اس تحکمانہ انداز اور لوزے کے پاس جانے کے خیال نے اُس میں وہ گرمی پیدا کر دی کہ میں لحاف کو پھینکے بغیر نہ رہ سکا اور میں نے لوزے کو بُلا یا لوزا منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا لیکن داؤد کے سامنے آکر وہ یوں کھڑا ہو گیا جیسے اردلی اپنے صاحب کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔

داؤد نے بات شروع کی —— "ابے لوزے تمھارے کتنے ہاتھ ہیں؟" داؤد ہمیشہ ایسی بات سے سلسلہ گفتگو شروع کرتا تھا، جس میں حیرت کا عنصر موجود ہو۔ لوزا اس سوال پر قدرے حیران ہوا۔ اُس نے ایک لمحہ کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا جیسے کتا زمین پر بیٹھنے سے پہلے اُسے سونگھ لیتا ہے اور پھر وجدانی طور پر ایک موافق ماحول کی بو پاکر بولا "دو!"

"جماں کے کتنے کان ہیں؟"

"دو —— !"

"تمھاری کتنی آنکھیں ہیں؟"

"دو —— !"

"اور جماں کی؟"

"دو —— !"

"تم کیا کماتے ہو؟"

"یہی بیس ساڑھے بیس روپے کے قریب بنا لیتا ہوں مہینے میں!"

"اور جماں کیا بناتا ہے؟"

"سولہ سترہ روپے۔"

"تو بھاگ جاؤ یہاں سے احمق کہیں کے تمھاری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ مار کھاتے رہو۔ راستے میں پڑے ہوئے پتھروں کی طرح راہ گیروں کی ٹھوکریں کھاؤ ـــــــ جاؤ ـــــــ!"

لوزے نے چادر کو اپنے گرد لپیٹا اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے چلا گیا۔ اسنین نے اور میں نے داؤد کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بلند اور ناشائستہ سا قہقہہ لگایا ـــــــ اسنین بولا داؤد تم بھی عجیب آدمی ہو۔ باتیں کرنے میں بھی تمھارے اپنے افسانے کا یہی انداز ہے۔ ایک نفسیاتی اختتام پر آ کر بس کر دیا۔ ارے لوزے کے سے آدمی کو ہیمرنگ چاہیے ـــــــ ہیمرنگ ـــــــ سمجھے؟ ـــــــ عوام ہیمرنگ چاہتے ہیں۔ بات ان پر واضح اور دوہرا دوہرا کر ٹھونسنی چاہیے۔ اُن کی نفسیات یہی ہے کہ زیادہ نفسیات سے کام نہ لیا جائے۔ صاف کہو بھئی اس طرح کے ہاتھ کان اور کمائی ہوتے ہوئے بھی جماں سے کیوں دب رہے ہو ـــــــ؟

اس پر ایک اور فرمائشی قہقہہ پڑا۔ رفیق ہنستے ہوئے اُس مرغے کی طرح اُچھلا جس کی گردن ایک ہی ضرب میں بدن سے الگ کر دی گئی ہو۔ ہم نے پھر لوزے کو بلایا۔ اور جماں کے خلاف اُس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ لوزے میں ایک حیرت انگیز تبدیلی واقع ہو گئی۔ اُس کے جسم کے پٹھے پھڑکنے لگے چادر میں سے اُس نے اپنے لمبے لمبے بازو نکال لئے۔ اور جماں کے ساتھ لڑائی کا تصور ذہن میں لاتے ہوئے بولا ـــــــ سچ سچ اُس نے مجھے نامرد سمجھ رکھا ہے۔ ایک دفعہ وہ چکری دوں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

اور آج لوزے پر حقیقت کا انکشاف ہونے لگا اور وہ جان سکا کہ اُسے مار پڑ رہی ہے اُس کے منہ کے ایک طرف کف کی ایک نفرت انگیز مگر متبرک۔ تخریبی مگر تعمیری سی تحریر دکھائی دینے لگی۔ اسنین نے بالکل لینن کا سا کام کیا ایک آدمی کے ذہن لاشعور میں یہ احساس بھر دیا کہ اُسے دبایا جا رہا ہے۔

لوزے کے جانے کے بعد رفیق ہمیشہ کی طرح پوچھنے لگا۔ تمھارا کیا خیال ہے۔ پھنسی تو نمودار نہیں ہوگی؟ ڈاکٹر پالی نے کہا تھا کہ تین ہفتے سے چھ ہفتے تک میعاد ہوتی ہے۔ اور اب چوتھا ہفتہ جا رہا ہے اور کوئی نشان نہیں۔ اور میں کل کی نسبت آج کمزور دکھائی نہیں دیتا کیا؟ ـــــــ میں نے رفیق کو دلاسا دیتے ہوئے کہا ـــــــ کبھی پھنسی نہیں ہوگی۔ لیکن وہ کہنے لگا۔ تم صرف میرا جی رکھنے کے لئے کہہ رہے ہو ـــــــ خدا کی قسم کھاؤ ـــــــ" میں نے تنگ آ کر ہمدردی سے عاری اتنی اونچی اور تلخیکی آواز میں قسم کھائی کہ رفیق نے مغموم و مایوس ہو کر اس کا ذکر بند کر دیا ـــــــ لیکن صرف اسی دن کے لئے ـــــــ

بڑے مزے کی بات ہوئی۔ لوزا یہاں تو سیخ پا ہوا۔ لیکن جماں کے پاس گیا تو بولا ـــــــ دیکھو بھیا! یہ بابو لوگ مجھے تمھارے خلاف اُکساتے ہیں کہتے ہیں تم اُس کے وبیل ہو۔ اب بھلا میں کہاں ہوں تمھارا دبیل ـــــــ؟" اور بدستور انٹھائی چولھا صبح کی ٹاپوں کے لئے سلگانے لگا ـــــــ

داؤد کہنے لگا اس میں سارا قصور لینن یا اسنین کا ہے۔ اگر میرا افسانوی طریقہ برتا ہوتا تو بات پھر لوٹ کر اُس کے ذہن میں آتی چوٹیں لگاتی اور بس جاتی۔ اور جہاں جماں کا نام لینے کی بھی ضرورت نہ پڑتی ـــــــ یہ فرق تھا لینن اور گورکی میں ـــــــ اسنین اور داؤد میں ـــــــ رفیق نے پاس آلود نگاہیں اوپر اٹھائیں اور موضوع کو ٹانگ سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے بولا۔ تہذیب حاضر جسم اور روح کی بیماریاں پیدا کرنا جانتی ہے۔ اس کے پاس چھٹکارا ہے۔ لیکن علاج اور تشفی نہیں مریض کے دوسرے سوال کا جواب دینے کا صبر اور حوصلہ بھی نہیں۔ اور یہ آئینہ کہاں تک مددگار ہے۔ دیکھو اس میں مجھے اپنا رنگ زرد دکھائی دیتا ہے۔ میں اسے توڑ ڈالوں گا ـــــــ اور "تھورستھینک" رفیق نے آئینے کو باہر پھینک کر اُس کے ٹکڑے کر دیئے۔

اب ہم جماں سے جھینپنے لگے ۔ لیکن جماں ــــــــ" بٹیا! باہر تو نکل" کے انداز کی سی باتیں کرنے لگا ۔ ہم نے بھی ڈنڑ پیلے ــــ مالش کی، مُگدر اٹھا کر پٹھوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ــــــ لے نکلتے ہیں ۔ کرے جو کرنا ہے ۔ اور جماں مرعوب ہو گیا ۔ لوزے کے متعلق ہم نے سوچا، لوزا جائے جہنم میں ۔ ہمیں اُس سے کیا غرض ؟ داؤد کا نقطۂ نگاہ درست ہے بلکہ اُسے قبض پڑ بس تھوڑی ہیں ــــــ!

ہمیں لوزے کی اس بیماری کے متعلق ابھی تک حیرت تھی ۔ لیکن ہم نے احساسِ کمتری کا سارا سوائے عام نام دے کر کمال بے صبری اور بے حوصلگی سے اپنے ذہن کو فارغ کر دیا ــــــــ ایکا ایکی ایک دن جماں لوزے کو اپنی دوستی اور رفاقت کے قابل نہ سمجھ کر علیحدہ ہو گیا ۔ اُس وقت لوزے نے جماں کی منتیں کیں ــــــ آنسو بہائے ۔ لیکن جماں تھا کہ برابر کہے جا رہا تھا، تم اس قابل نہیں ہو کہ تمھارے ساتھ کوئی رہے ــــــ

داؤد چیخا ۔ اسنین نے نفسیات کی ایک کتاب جلائی اور ہم دونوں نے مل کر ایک بے ربط اور بے سری آواز میں قومی ترانہ "یا رب رہے سلامت فرماں روا ہمارا" گایا ۔ گانے کے بعد رفیق نے کہا کہ دیکھو کبھی سستی ہی جان چھوٹتی ہے ۔ مگر لوزا ہے کہ مانتا ہی نہیں ــــــ ابے لوزے ــــــ پھر آہستہ آواز اور دانت پیس کر ــــ ابے لوزے ــــــــ اور لوزا ہے کہ صدیوں سے غلام چلے آنے والوں کی طرح غلامی ہی میں نجات سمجھنے لگا ہے ۔ اپنے پاؤں کی بیڑی کو ہی اپنا زیور سمجھتا ہے ۔

جماں چلا گیا ۔ اور ایک شخص فرد کا (فاروق) نے جماں کی جگہ لے لی ۔ وائے قسمت! اب لوزا فرو کے کا غلام تھا ۔ لیکن تعجب کی بات تھی کہ ایک دن لوزے نے احتجاج کیا ــــــ بات یوں ہوئی کہ فرو کے نے کسی بات سے دکھی ہو کر لوزے سے کہا ــــــ "جا تیرا خانہ خراب ہو"

لوزے کو کچھ یاد آ گیا ــــ آنسو تھے کہ بے تحاشا امڈ رہے تھے ۔ ایک بات کا اضافہ ہوا ۔ روتے روتے گھگھی بندھ گئی ۔ لوزا بار بار یہی کہتا تھا کہ تو نے مجھے مار لیا ہوتا ــــ پیٹ لیا ہوتا ــــ لیکن یہ الفاظ مجھ سے نہ کہے ہوتے ۔ فرو کے نے لوزے کو دلاسا دیا ــــ لیکن لوزا تھا کہ برابر روئے جا رہا تھا ۔ ہائے تو نے مجھے یہ نہ کہا ہوتا ۔

اُسے منانے کے لیے فرو کا گھر بیٹھ رہا ــــــ اور کیبرج شاپ جہاں وہ کام کیا کرتا تھا نہ گیا ــــــــ ہم نے بھی کالج سے چھٹی کی اور لوزے کو کُریدنے لگے ۔ جب لوزا بولنے کے قابل ہوا تو کہنے لگا ــــــــ" چھوٹے ہوتے میرے ماں باپ مر گئے ــــ بھائی نے پالا پوسا اور جوان کیا "۔

اور لوزا پھر رونے لگا ۔ اُس کی آنکھیں درمیانی کمرے کے ایک پشتے پر جمی ہوئی تھیں ــــ لیکن گردشِ ایام پیچھے کی طرف دوڑ گئی تھی اور لوزا تصور میں اپنے بھائی کے پاس کھڑا تھا ــــ کچھ دیر کے بعد خود ہی لوزے نے بات ختم کرنے کی اُکساہٹ محسوس کی اور بولا " مجھے مرغے پالنے کا بہت شوق تھا تو بڑے بھیا نے مرغ مہیا کیے ــــــ میں انڈا بوسکی کی چھانٹ دار قمیص پسند کرتا تھا تو اُس نے بہت سی ایسی قمیصیں سلا دیں ــ گھر میں بھادج کو زیادہ باجرے کی روٹی پکانے کا حکم ہوتا تھا ــــ کیونکہ وہی روٹی مجھے پسند تھی ــ لیکن میں اُس کے پاس نہ رہا اور بھاگ گیا ــــ ایک آٹے کی مشین پر چھ ماہ گزار کر لوٹ آیا ــــ پھر بھاگا پھر لوٹ آیا ــــ اور آخر میں نے بھائی کو اس حالت میں چھوڑا جب کہ اُس پر فالج گرا تھا ۔ اُس نے "تنگ آکر مجھے بددعا دی جو کہ آج مجھے یاد آ رہی ہے ۔ اُس نے کہا لوزی! ــــــ وہ مجھے ہمیشہ لاڈ سے لوزی ہی کہا کرتا تھا ــــــ یہاں کچھ دیر کے لیے رُکنے کے بعد لوزا بولا ــ" اُس نے کہا لوزی! تو زندگی میں کسی کا سگا نہیں بنا، جا تیرا سگا بھی کوئی نہیں بنے گا "۔

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

قرۃ العین حیدر

پت جھڑ کی آواز

صبح میں گلی کے دروازے میں کھڑی سبزی والے سے گوبھی کی قیمت پر جھگڑ رہی تھی۔ اوپر باورچی خانے میں دال چاول اُبالنے کے لئے چڑھا دیئے تھے۔ ملازم سودا لینے کے لئے بازار جا چکا تھا۔ غسل خانے میں وقار صاحب چینی کی چلمچی کے اوپر لگے ہوئے مدھم آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہوئے گنگنا رہے تھے اور شیو کرتے جاتے تھے۔ میں سبزی والے سے بحث کرنے کے ساتھ ساتھ سوچنے میں مصروف تھی کہ رات کے کھانے کے لئے کیا کیا تیار کیا جائے۔ اتنے میں سامنے ایک کار آن کر رُکی۔ ایک لڑکی نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ اور پھر دروازہ کھول کر باہر اُتر آئی۔ میں پیسے گن رہی تھی اس لئے میں نے اُسے نہ دیکھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھی، اب میں نے سر اٹھا کر اس پر نظر ڈالی۔

"ارے — تم —!" اس نے ہکا بکا ہو کر کہا۔ اور وہیں ٹھٹھک کر رہ گئی۔ ایسا لگا جیسے وہ مدتوں سے مجھے مُردہ تصور کر چکی ہے، اور اب میرا بھوت اس کے سامنے کھڑا ہے۔

اُس کی آنکھوں میں ایک لحظے کے لئے جو دہشت میں نے دیکھی اُس کی یاد نے مجھے باؤلا کر دیا ہے۔ میں تو سوچ سوچ کے دیوانی ہو جاؤں گی۔

یہ لڑکی (اس کا نام تک ذہن میں محفوظ نہیں، اور اس وقت میں نے جھینپ کے مارے اس سے پوچھا بھی نہیں۔ ورنہ وہ کتنا بُرا مانتی) میرے ساتھ دلی کے کوئین میری اسکول میں پڑھتی تھی۔ یہ بیس سال پہلے کی بات ہے۔ میں اس وقت کوئی سترہ سال کی رہی ہوں گی۔ مگر میری صحت اتنی اچھی تھی کہ اپنی عمر سے کہیں بڑی معلوم ہوتی تھی۔ اور میری خوب صورتی کی دھوم مچنی شروع ہو چکی تھی۔ دلی میں قاعدہ تھا کہ لڑکے والیاں اسکول اسکول گھوم کے لڑکیاں پسند کرتی پھرتی تھیں۔ اور جو لڑکی پسند آتی تھی اس کے گھر "رقعہ" بھجوا دیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں مجھے معلوم ہوا کہ اسی لڑکی کی اماں، خالہ وغیرہ نے مجھے پسند کر لیا ہے (اسکول ڈے کے جلسے کے روز دیکھ کر) اور اب وہ مجھے بہو بنانے پر تلی بیٹھی ہیں۔ یہ لوگ نوز جہاں روڈ پر رہتے تھے۔ اور لڑکا حال ہی میں ریزرو بنک آف انڈیا میں ڈیڑھ سو روپے ماہوار کا نوکر ہوا تھا۔ چنانچہ "رقعہ" میرے گھر بھجوایا گیا۔ مگر میری اماں جان میرے لئے بڑے اونچے خواب دیکھ رہی تھیں۔ میرے والدین دلی سے باہر میرٹھ میں رہتے تھے۔ اور ابھی میرے بیاہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ لہٰذا وہ پیغام فی الفور نامنظور کر دیا گیا۔

اس کے بعد اس لڑکی نے کچھ عرصے میرے ساتھ کالج میں بھی پڑھا۔ پھر اس کی شادی ہو گئی اور وہ کالج چھوڑ کر چلی گئی۔ آج اتنے عرصے بعد لاہور کی مال روڈ کے پچھواڑے اس گلی میں میری اس سے مڈ بھیڑ ہوئی۔ میں نے اس سے کہا۔ اوپر آؤ۔ چائے واے پیو۔ پھر اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے لیکن اُس نے کہا کہ میں جلدی میں کسی سسرالی رشتے دار کا مکان تلاش کرتی ہوئی اس گلی میں آنکلی تھی۔ انشاء اللہ پھر کبھی ضرور آؤں گی۔ اس کے بعد وہیں کھڑے کھڑے اُس نے جلدی جلدی نام بنام ساری پرانی دوستوں کے قصے سنائے۔ کون کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے سلیمہ بریگیڈیر فلاں کی بیوی ہے چار بچے ہیں۔ فرخندہ کا میاں فارن سروس میں ہے۔ اس کی بڑی لڑکی لندن میں پڑھ رہی ہے۔ ریحانہ فلاں کالج میں پرنسپل ہے، سعدیہ امریکہ سے ڈھیروں ڈگریاں لے آئی ہے۔ اور کراچی میں کسی اونچی ملازمت پر براجمان ہے۔ کالج کی ہندو ساتھیوں کے حالات سے بھی وہ باخبر تھی۔ پربھا کا میاں انڈین نیوی میں کموڈور ہے۔ وہ بمبئی میں رہتی ہے۔ سرلا آل انڈیا ریڈیو میں اسٹیشن ڈائریکٹر ہے۔ اور جنوبی ہند میں کہیں تعینات ہے۔ کوتیکا بڑی مشہور آرٹسٹ بن چکی ہے اور نئی دلی میں اس کا اسٹوڈیو ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ یہ سب باتیں کر رہی تھیں مگر اس کی آنکھوں کی اس دہشت کو میں نہ بھول سکی۔

اس نے کہا "میں سعدیہ ریحانہ وغیرہ جب بھی کراچی میں اکٹھے ہوتے ہیں تمھیں برابر یاد کرتے ہیں۔"

"واقعی ـــــ؟" میں نے کھوکھلی ہنسی ہنس کر پوچھا۔ مجھے معلوم تھا مجھے کن الفاظ میں یاد کیا جاتا ہوگا۔ چھل پائیاں ارے کیا یہ لوگ میری سہیلیاں تھیں؟ عورتیں دراصل ایک دوسرے کے حق میں چڑیلیں ہوتی ہیں۔ کٹنیاں۔ حرافائیں اسس نے مجھ سے یہ بھی نہیں دریافت کیا کہ میں یہاں نیم تاریک سنسان گلی میں اس کھنڈر ایسے مکان کے شکستہ زینے پر کیا کر رہی ہوں۔ اسے معلوم تھا۔

عورتوں کی انٹیلیجنس سروس اتنی زبردست ہوتی ہے کہ انٹرپول بھی اس کے آگے پانی بھرے۔ اور پھر میرا قصہ تو عالم نشرح ہے۔ میری حیثیت کوئی قابلِ ذکر نہیں کم نام ہستی ہوں اس لئے کسی کو میری پروا نہیں۔ خود مجھے بھی اپنی پروا نہیں۔

میں تنویر فاطمہ ہوں۔ میرے آبا میرٹھ کے رہنے والے تھے معمولی حیثیت کے زمیندار تھے۔ ہمارے یہاں بڑا سخت پردہ کیا جاتا تھا۔ خود میرا میرے چچا زاد، پھوپھی زاد بھائیوں سے پردہ تھا۔ میں بے انتہا لاڈوں کی پلی چہیتی لڑکی تھی۔ جب میں نے اسکول میں بہت سے وظیفے حاصل کر لیے تو میٹرک کرنے کے لیے خاص طور پر میرا داخلہ کوئین میری اسکول میں کرایا گیا۔ انٹر کے لئے میں علی گڑھ بھیج دی گئی۔ علی گڑھ گرلز کالج کا زمانہ میری زندگی کا بہترین دور تھا۔ کیسا خواب آگیں دور تھا۔ میں جذبات پرست نہیں۔ لیکن اب بھی جب کالج کا صحن، روشیں، گھاس کے اونچے پودے، درختوں پر جھکی بارش، نمائش کے میدان میں گھومتے ہوئے کالے برقعوں کے پرے، ہوسٹل کے پتلے پتلے برآمدوں چھوٹے چھوٹے کمروں کی وہ شدید گھریلو فضا۔ بس یاد آتی ہیں تو جی ڈوب سا جاتا ہے۔ ایم۔ ایس۔ سی کے لیے پھر دلی آ گئی۔ یہاں کالج میں میرے ساتھ یہی سب لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ ریحانہ، سعدیہ، پربھا، فلانی ڈھماکی، مجھے لڑکیاں کبھی پسند نہ آئیں مجھے دنیا میں زیادہ تر لوگ پسند نہیں آئے۔ بیشتر لوگ محض تضیع اوقات ہیں۔ میں بہت مغرور تھی۔ حسن ایسی چیز ہے کہ انسان کا دماغ خراب ہوتے دیر نہیں لگتی۔ پھر میں تو بقول شخصے لاکھوں میں ایک تھی۔ شیشے کا ایسا جھلکتا ہوا رنگ، سرخی مائل سنہرے بال۔ بے حد شاندار ڈیل ڈول۔ بنارسی ساڑی پہن لوں تو بالکل کہیں کی مہارانی معلوم ہوتی تھی۔

یہ جنگ کا زمانہ تھا۔ یا شاید جنگ اسی سال ختم ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ بہرحال دلی پر بہار آئی ہوئی تھی

کروڑ پتی کاروباریوں اور حکومت ہند کے اعلیٰ افسروں کی لڑکیاں۔ ہندو، سکھ، مسلمان۔ لمبی لمبی موٹروں میں اڑی اڑی پھرتیں۔ نت نئی پارٹیاں، جلسے، ہنگامے۔ آج اندرپرستھ کالج میں ڈراما ہے، کل میرانڈا ہاؤس میں۔ پرسوں لیڈی اروِن کالج میں کونسرٹ ہے۔ لیڈی ہارڈنگ اور سینٹ اسٹیفنز کالج — جیمسفرڈ کلب، روشن آرا، امپیریل جم خانہ۔ غرض کہ ہر طرف الف لیلیٰ کے باب بکھرے پڑے تھے۔ ہر جگہ نوجوان فوجی افسروں اور سول سروس کے بن بیاہے عہدے داروں کے پرے ڈولتے نظر آتے۔ ایک ہنگامہ تھا۔

پربھا اور سرلا کے ہمراہ ایک روز میں دلجیت کور کے یہاں جو ایک کروڑ پتی سکھ کنٹریکٹر کی لڑکی تھی کنگ ایڈورڈ روڈ کی ایک شاندار کوٹھی میں گارڈن پارٹی کے لئے مدعو تھی۔

یہاں میری ملاقات میجر خوش وقت سنگھ سے ہوئی۔ یہ جھانسی کی طرف کا چوہان راجپوت تھا۔ لمبا تڑنگا کالا بھجنگ، لانبی لانبی اوپر کو مڑی ہوئی نوکیلی مونچھیں، بے حد چمکیلے اور خوبصورت دانت، ہنستا تو بہت اچھا لگتا۔ غالب کا پرستار تھا۔ بات بات پر شعر پڑھتا۔ قہقہے لگاتا اور جھک جھک کر بے حد اخلاق سے سب سے باتیں کرتا۔ اس نے ہم سب کو دوسرے روز سینما چلنے کی دعوت دی۔ سرلا، پربھا وغیرہ ایک بددماغ لڑکیاں تھیں اور خاصی قدامت پسند۔ وہ لڑکوں کے ساتھ باہر گھومنے بالکل نہیں جاتی تھیں۔ خوش وقت سنگھ دلجیت کے بھائی کا دوست تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا جواب دوں کہ اتنے میں سرلا نے چپکے سے کہا "خوش وقت کے ساتھ ہرگز سینما مت جانا۔ سخت لوفر لڑکا ہے۔" میں چپ ہو گئی۔

اس زمانے میں نئی دلی کی دو ایک آوارہ لڑکیوں کے قصے بہت مشہور ہو رہے تھے۔ اور میں سوچ سوچ کر ڈرا کرتی تھی۔ شریف گھرانوں کی لڑکیاں اپنے ماں باپ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کس طرح لوگوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی ہیں۔ ہوسٹل میں ہم اکثر اس قسم کی لڑکیوں کے لئے قیاس آرائی کیا کرتے۔ یہ بڑی عجیب اور پراسرار ہستیاں معلوم ہوتیں۔ حالانکہ دیکھنے میں وہ بھی ہماری طرح ہی کی لڑکیاں تھیں۔ ساریوں اور شلواروں میں ملبوس طرح دار، خوب صورت، پڑھی لکھی۔

"لوگ بدنام کر دیتے ہیں جی۔" سعدیہ دماغ پر بہت زور ڈال کر کہتی۔ "اب ایسا بھی کیا ہے۔"

"دراصل ہماری سوسائٹی اس قابل ہی نہیں ہوئی کہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو ہضم کر سکے۔" سرلا کہتی۔

"ہوتا یہ ہے کہ لڑکیاں احساسِ توازن کھو بیٹھتی ہیں۔" ریحانہ رائے دیتی۔

بہرحال، کسی طرح یقین نہ آتا کہ ہماری جیسی، ہمارے ساتھ ہی کی چند لڑکیاں ایسی ایسی خوف ناک حرکتیں کس طرح کرتی ہیں۔

دوسری شام میں لیباریٹری کی طرف جا رہی تھی کہ نکلسن میموریل کے قریب ایک قرمزی رنگ کی بیبی سی کار آہستہ سے رک گئی۔ اس میں سے خوش وقت سنگھ نے جھانکا اور اندھیرے میں اس کے خوب صورت دانت جھلملائے۔

"اجی حضرت۔ یوں کہئے کہ آپ اپنا اپوائنٹمنٹ بھول گئیں —"

"جی ۔۔ ؟" میں نے ہڑبڑا کر کہا۔

"حضور والا ——— چلئے میرے ساتھ فوراً۔ یہ شام کا وقت لیباریٹری میں گھس کر بیٹھنے کا نہیں ہے۔ اتنا پڑھ کر کیا کیجے گا ؟ ———"

میں نے بالکل غیرارادی طور پر چاروں طرف دیکھا اور کار میں دبک کر بیٹھ گئی۔
ہم نے کناٹ پلیس جا کر ایک انگریزی فلم دیکھی۔
اس کے اگلے روز بھی۔
اس کے بعد ایک ہفتے تک میں نے خوب خوب سیریں اس کے ساتھ کیں۔ وہ میڈینز میں ٹھہرا ہوا تھا۔
اس ہفتے کے آخر تک میں میجر خوش وقت سنگھ کی مسٹرس بن چکی تھی۔
میں لٹریری نہیں ہوں۔ میں نے چینی، جاپانی، روسی، انگریزی یا اردو شاعری کا مطالعہ نہیں کیا۔ ادب پڑھنا میرے نزدیک وقت ضائع کرنا ہے۔ پندرہ برس کی عمر سے سائنس میرا اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ مابعد الطبیعاتی تصورات کیا ہوتے ہیں۔ My stic کشش کے کیا معنی ہیں۔ شاعری اور فلسفے کے لئے نہ میرے پاس فرصت جب تھی نہ اب ہے۔ میں بڑے بڑے مبہم، غیر واضح اور پر اسرار الفاظ بھی استعمال نہیں کر سکتی۔
بہر حال پندرہ روز کے اندر اندر یہ واقعہ بھی کم دبیش کالج میں سب کو معلوم ہو چکا تھا۔ لیکن مجھ میں اپنے اندر ہمیشہ سے بڑی عجیب سی خود اعتمادی تھی۔ میں نے اب پروا نہیں کی۔ پہلے بھی میں لوگوں سے بول چال بہت کم رکھتی تھی مسز لاڈ وغیرہ کا گروہ اب مجھے ایسی نظروں سے دیکھتا گویا میں مریخ سے اتر کر آئی ہوں یا میرے سر پر سینگ ہیں۔ ڈائننگ ہال میں میرے باہر جانے کے بعد گھنٹوں میرے قصے دہرائے جاتے۔ اپنی انٹلیجنس سروس کے ذریعے میرے اور خوش وقت کے بارے میں ان کو پل پل کی خبر رہتی۔ ہم لوگ شام کو کہاں گئے ــــ رات نئی دلی کے کون سے بال روم میں ناچے (خوش وقت معرکے کا ڈانسر تھا۔ اس نے مجھے ناچنا بھی سکھا دیا تھا) خوش وقت نے مجھے کیا کیا تحائف کون کون سی دوکانوں سے خرید کے دیئے۔
خوش وقت سنگھ مجھے مارتا بہت تھا۔ اور مجھ سے اتنی محبت کرتا تھا جو آج تک دنیا میں کسی مرد نے کسی عورت سے نہ کی ہوگی۔
کئی مہینے گذر گئے۔ میرے ایم۔ ایس۔ سی پریویس کے امتحان سر پر آ گئے اور میں پڑھنے میں مصروف ہو گئی امتحانات کے بعد اس نے کہا۔ جانِ من۔ دلربا! چلو کسی خاموش سے پہاڑ پر چلیں۔ سوان۔ ڈلہوزی۔ لینڈاؤن۔ میں چند روز کے لئے میرٹھ گئی اور آپا سے یہ کہہ کر (اماں جان کا جب میں تھرڈ ایر میں تھی تو انتقال ہو گیا تھا) دلی واپس آ گئی کہ فائنل ایر کے لئے بے حد پڑھائی کرنی ہے۔ شمالی ہند کے پہاڑی مقامات پر بہت سے شناساؤں کے ملنے کا امکان تھا اس لئے ہم دور جنوب میں اوٹی چلے گئے۔ وہاں مہینہ بھر رہے۔ خوش وقت کی چھٹی ختم ہو گئی تو دلی واپس آ کر تیار پور کے ایک بنگلے میں ٹک گئے۔
کالج کھلنے سے ایک ہفتہ قبل خوش وقت کی اور میری بڑی زبردست لڑائی ہوئی۔ اس نے مجھے خوب مارا۔ اتنا مارا کہ میرا سارا چہرہ لہولہان ہو گیا، اور میری بانہوں اور پنڈلیوں پر نیل پڑ گئے۔ لڑائی کی وجہ اس کی وہ مردار عیسائی منگیتر تھی جو جانے کہاں سے ٹپک پڑی تھی۔ اور سارے میں میرے خلاف زہر اگلتی پھر رہی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو مجھے کچا چبا جاتی۔ یہ چار سو بیس لڑکی جنگ کے زمانے میں فوج میں تھی اور خوش وقت کو برما کے محاذ پر ملی تھی۔ خوش وقت نے جانے کس طرح اس سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ لیکن مجھ سے ملنے کے بعد اب وہ اس کی انگوٹھی واپس کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔
اس رات تیار پور کے اس سنسان بنگلے میں اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑے اور رو رو کر مجھ سے کہا کہ میں اس سے

بیاہ کرلوں، ورنہ وہ مرجائے گا۔ میں نے کہا ہرگز نہیں۔ قیامت تک نہیں۔ میں اعلیٰ خاندان سیّدزادی، بھلا اس کالے تمباکو کے پنڈے ہندو جاٹ سے بیاہ کرکے خاندان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگاتی۔ میں تو اس حسین وجمیل، کسی بہت اونچے مسلمان گھرانے کے چشم و چراغ کے خواب دیکھ رہی تھی جو ایک روز، دیر یا سویر، بارات لے کر مجھے بیاہنے آئے گا۔ ہمارا آرسی مصحف ہوگا۔ میں سہرے جلوے سے رخصت ہوکر اس کے گھر جاؤں گی۔ بجلی لبنیٰ نندیں دروازے پر دلہیز روک کر اپنے بھائی سے نیگ کے لئے جھگڑیں گی۔ میراثنیں ڈھولک لئے کھڑی ہوں گی۔ کیا کیا کچھ ہوگا۔ میں نے کیا ہندو مسلم شادیوں کا حشر دیکھا نہیں تھا۔ کیتوں نے ترقی پسندی یا جذبۂ عشق کے جوش میں آکر ہندوؤں سے بیاہ رچائے اور سال بھر کے اندر جوتیوں میں دال بٹی۔ بچوں کا جو حشر خراب ہوا وہ الگ۔ نہ ادھر کے رہے۔ نہ اُدھر کے۔ میرے انکار پر خوش وقت نے جوتے لات سے مار مار کر میرا بھرکس نکال دیا۔ اور تیسرے دن اس ڈائن کالی بلا کیتھرین نہرم داس کے ساتھ آگرے چلا گیا جہاں اس نے اس بدذات لڑکی سے سول میرج کرلی۔

جب میں نئی ٹرم کے آغاز پر ہوسٹل پہنچی تو اس حلیے سے کہ میرے سراور چہرے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ابا کو میں نے لکھ بھیجا کہ لیبارٹری میں ایک تجربہ کررہی تھی۔ ایک خطرناک مادہ بھک سے اڑا اور اس سے میرا منہ تھوڑا سا جل گیا۔ اب بالکل ٹھیک ہوں۔ فکر نہ کیجیے۔

لڑکیوں کو تو سارا قصہ پہلے ہی معلوم ہوچکا تھا لہٰذا انھوں نے اخلاقاً میری خیریت بھی نہ پوچھی۔ اتنے بڑے اسکینڈل کے بعد مجھے ہوسٹل میں رہنے کی اجازت نہ دی جاتی۔ مگر ہوسٹل کی وارڈن خوش وقت سنگھ کی بہت دوست تھی۔ اس لئے سب خاموش رہے۔ اس کے علاوہ کسی کے پاس کسی طرح کا ثبوت بھی نہ تھا۔ کالج کی لڑکیوں کو لوگ یوں بھی خواہ مخواہ بدنام کرنے پر تلے رہتے ہیں۔

مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے۔ جیسے کل کی بات ہو۔ صبح کے دس گیارہ بجے ہوں گے۔ ریلوے اسٹیشن سے لڑکیوں کے تانگے آ آکر پھاٹک میں داخل ہورہے تھے۔ ہوسٹل کے لان پر برگد کے درخت کے نیچے لڑکیاں اپنا اپنا اسباب اُتروا کر رکھوا رہی تھیں۔ بڑی سخت چل پوں مچا رکھی تھی۔ جس وقت میں اپنے تانگے سے اُتری وہ میرا ڈھاٹے سے بندھا ہوا سفید چہرہ دیکھ کر ایسی حیرت زدہ ہوئیں جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ میں نے سامان چوکیدار کے سر پر رکھوایا اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ دوپہر کو جب میں کھانے کی میز پر آن کر بیٹھی تو اُن قطاماؤں نے مجھ سے اس اخلاق سے ادھر اُدھر کی باتیں شروع کیں جن سے اچھی طرح یہ ظاہر ہوجائے کہ میرے حادثے کی اصل وجہ جانتی ہیں اور مجھے ندامت سے بچانے کے لئے اس کا تذکرہ ہی نہیں کررہی ہیں۔ ان میں سے ایک نے جو اس چنڈال چوکڑی کی گرو اور ان سب کی اُستاد تھی رات کو کھانے کی میز پر فیصلہ صادر کیا کہ میں نفسیات کی اصطلاح میں (Nymphomaniac) ہوں۔ (مجھے ہیرنا جاسوسوں کے ذریعے یہ اطلاع فوراً اوپر پہنچ گئی جہاں میں اس وقت اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس ٹیبل لیمپ لگائے پڑھائی میں مصروف تھی) اور اس طرح کی باتیں تو اب عام تھیں کہ ایک مچھلی سارے جل کو گندا کرتی ہے۔ اسی لئے تو لڑکیوں کی بے پردگی، آزادی خطرناک اور اعلیٰ تعلیم بدنام ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں اپنی حد تک سونی صدی ان آرا سے متفق تھی۔ میں خود سوچتی تھی کہ بعض اچھی خاصی بھلی چنگی اعلیٰ تعلیم یافتہ

لڑکیاں آوارہ کیوں ہو جاتی ہیں۔ ایک تھیوری تھی کہ وہی لڑکیاں آوارہ ہوتی ہیں جن کا "آئی۔کیو" بہت کم ہوتا ہے۔ ذہین انسان کبھی اپنی تباہی کی طرف جان بوجھ کر قدم نہ اٹھائے گا۔ مگر میں نے تو اچھی خاصی سمجھ دار تیز وطرار لڑکیوں کو لوفری کرتے دیکھا تھا۔ دوسری تھیوری تھی کہ ــــــــ روپے پیسے عیش و آسائش کی زندگی، قیمتی تحائف کا لالچ، رومان کی تلاش، ایڈوینچر کی خواہش، یا محض اکتاہٹ، یا پردے کی قید وبند کے بعد آزادی کی فضا میں داخل ہو کر پرانی اقدار سے بغاوت۔ اس صورت حال کی چند وجوہ ہیں۔ یہ سب باتیں ضرور ہوں گی ورنہ اور کیا وجہ ہوسکتی ہے؟

میں فرسٹ ٹرمنل امتحان سے فارغ ہوئی تھی کہ خوش وقت پھر آن پہنچا۔ اس نے مجھے لیباریٹری فون کیا کہ میں نرولا میں چھ بجے اس سے ملوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ کیتھرین کو اپنے ماں باپ کے یہاں چھوڑ کر سرکاری کام سے دلّی آیا تھا۔ اس مرتبہ ہم ہوائی جہاز سے ایک ہفتے کے لئے بمبئی چلے گئے۔

اس کے بعد اس سے ہر دوسرے تیسرے مہینے ملنا ہوتا رہا۔ ایک سال نکل گیا۔ اب کے سے جب وہ دلّی آیا تو اس نے اپنے ایک جگری دوست کو مجھے لینے کے لئے موٹر لے کر بھیجا۔ کیونکہ وہ لکھنؤ سے لاہور جاتے ہوئے پالم پر چند گھنٹے کے لئے ٹھہرا تھا۔ یہ دوست دلّی کے ایک بہت بڑے مسلمان تاجر کا لڑکا تھا۔ لڑکا تو خیر نہیں کہنا چاہیئے۔ اس وقت بھی وہ چالیس کے پیٹے میں رہا ہوگا۔ بیوی بچوں والا۔ تاڑ کا سا قد۔ بے حد غلط انگریزی بولتا تھا۔ بدقطع۔ بالکل چڑیمار کی شکل۔ ہونّق صفت۔

خوش وقت اب کی مرتبہ دلّی سے گیا تو پھر کبھی واپس نہ آیا۔ کیونکہ اب میں فاروقی کی مسٹریس بن چکی تھی۔

فاروقی کے ساتھ اب میں اس کی "منگیتر" کی حیثیت سے باقاعدہ دلّی کی اونچی سوسائٹی میں شامل ہوگئی۔ مسلمانوں میں تو چار شادیاں جائز ہیں لہٰذا یہ کوئی بہت بڑی بات نہ تھی۔ یعنی مذہب کے نقطۂ نگاہ سے۔ گو وہ اپنی ان پڑھ، ادھیڑ عمر کی، پردے کی بوڑی کی موجودگی میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جو چار آدمیوں میں ڈھنگ سے اٹھ بیٹھ سکے۔ اور پھر دولت مند طبقے میں سب کچھ جائز ہے۔ یہ تو ہماری مڈل کلاس کے قوانین ہیں کہ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ طویل چھٹیوں کے زمانے میں فاروقی نے بھی مجھے خوب سیریں کرائیں۔ کلکتہ، لکھنؤ، اجمیر، کون جگہ تھی جو میں نے اُس کے ساتھ نہ دیکھی۔ اس نے مجھے ہیرے جواہرات کے گہنوں سے لاد دیا۔ ابا کو لکھ بھیجتی تھی کہ یونیورسٹی کے طالب علموں کے ہمراہ ٹور پر جا رہی ہوں۔ یا فلاں جگہ ایک سائنس کانفرنس میں شرکت کے لئے مجھے بلایا گیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے اپنا تعلیمی ریکارڈ اونچا رکھنے کی دھن تھی۔ فائنل امتحان میں میں نے بہت ہی خراب پرچے کئے اور امتحان ختم ہوتے ہی گھر چلی گئی۔

اسی زمانے میں دلّی میں گڑبڑ شروع ہوئی اور فسادات کا بھونچال آگیا۔ فاروقی نے مجھے میرٹھ خط لکھا کہ تم فوراً پاکستان چلی جاؤ۔ میں تم سے وہیں ملوں گا۔ میرا پہلے ہی سے یہ ارادہ تھا۔ ابا بھی بے حد پریشان تھے اور یہی چاہتے تھے کہ ان حالات میں اب میں انڈیا میں نہ رہوں۔ وہاں شریف مسلمان لڑکیوں کی عزتیں مستقل خطرے میں ہیں۔ پاکستان اپنا اسلامی ملک تھا۔ اس کی بات ہی کیا تھی۔ ابا جائداد وغیرہ کی وجہ سے فی الحال ترک وطن نہ کرسکتے تھے۔ میرے بھائی دونوں بہت چھوٹے تھے اور اماں جان کے انتقال کے بعد ابا نے اُن کو میری خالہ کے پاس حیدرآباد دکن بھیج دیا تھا۔

... نکل چکا تھا اور میں تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوئی تھی۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ جب بلووں کا زور زرا کم ہوا۔ تو میں ہوائی جہاز سے لاہور آ گئی۔ فاروق میرے ساتھ آیا۔ اس نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ اپنے کاروبار کی ایک شاخ پاکستان میں قائم کر کے لاہور اس کا ہیڈ آفس رکھے گا۔ مجھے اس کا مالک بنائے گا۔ اور وہیں مجھ سے شادی کرے گا۔ وہ دلّی سے ہجرت نہیں کر رہا تھا۔ کیونکہ اس کے باپ بڑے احراری خیالات کے آدمی تھے۔ پلان یہ بنا کہ وہ ہر دوسرے تیسرے مہینے دلّی سے لاہور آتا رہے گا۔ لاہور میں افراتفری تھی۔ حالانکہ ایک سے ایک اعلیٰ کوٹھی الاٹ ہو سکتی تھی۔ مگر فاروق یہاں کسی کو جانتا نہ تھا۔ بہرحال سنت نگر میں ایک چھوٹا سا مکان میرے نام الاٹ کرا کے اس نے مجھے وہاں چھوڑ دیا۔ اور میری دوسراتھ کے لئے اپنے ایک دور کے رشتے دار کنبے کو میرے پاس ٹھہرا دیا جو مہاجر ہو کے لاہور آئے تھے اور مارے مارے پھر رہے تھے۔

میں زندگی کی اس یک بیک تبدیلی سے اتنی ہکا بکا تھی کہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ کہاں غیر منقسم ہندوستان کی وہ بھرپور دلچسپ رنگا رنگ دنیا، کہاں ۱۹۴۸ء کے لاہور کا وہ تنگ و تاریک مکان۔ غریب الوطنی، اللہ اکبر۔ میں نے کیسے کیسے دل ہلا دینے والے زمانے دیکھے ہیں۔

میں اتنی خالی الذہن ہو چکی تھی کہ میں نے تلاش ملازمت کی بھی کوئی کوشش نہ کی۔ روپے کی طرف سے فکر نہ تھی۔ کیونکہ فاروق میرے نام دس ہزار روپیہ جمع کرا گیا تھا۔ صرف دس ہزار۔ وہ خود کروڑوں کا آدمی تھا۔ مگر اس وقت میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ اب بھی نہیں آتا!

دن گزرتے گئے۔ میں صبح سے شام تک پلنگ پر پڑی فاروق کی رشتے کی خالہ یا نانی جو کچھ بھی وہ بڑی بی تھیں۔ ان سے ان کی ہجرت کے مصائب کی داستان اور ان کی سابقہ امارت کے قصے سنا کرتی اور پان پہ پان کھاتی، یا ان کی میٹرک کی طالب علم بیٹی کو الجبرا جیومیٹری سکھلایا کرتی۔ ان کا بیٹا فاروق کی برائے نام بزنس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔

فاروق سال میں پانچ چھ چکر لگا لیتا۔ اب لاہور کی زندگی رفتہ رفتہ نارمل ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آمد سے میرے دن کچھ رونق کے کٹتے۔ اس کی خالہ بڑے اہتمام سے دلّی کے کھانے اس کے لئے تیار کرتیں۔ میں مال روڈ کے ہیر ڈریسر کے یہاں جا کر اپنے بال سیٹ کرواتی۔ شام کو ہم دونوں جم خانہ کلب چلے جاتے۔ اور وہاں ایک کونے کی میز پہ بیر کے گلاس سامنے رکھے فاروق مجھے دلّی کے واقعات سناتا۔ وہ بے تکان بولے چلا جاتا یا پھر دفعتاً چپ ہو کر کمرے میں آنے والی اجنبی صورتوں کو دیکھتا رہتا۔ اس نے شادی کا کبھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ میں نے بھی اس سے نہیں کہا۔ میں اب اکتا چکی تھی۔ کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب وہ دلّی واپس چلا جاتا تو میں ہر پندرھویں دن اپنی خیریت کا خط اور اُس کے کاروبار کا حال لکھ بھیجتی اور لکھ دیتی کہ اب کی دفعہ آئے تو کناٹ پلیس یا چاندنی چوک کی فلاں دوکان سے فلاں فلاں قسم کی ساریاں لیتا آئے۔ کیونکہ پاکستان میں اچھی ساریاں ناپید ہیں۔

ایک روز میرٹھ سے چچا میاں کا خط آیا کہ ابا کا انتقال ہو گیا۔ ع

جب احمد مرسل نہ رہے کون رہے گا

میں جذبات سے واقف نہیں۔ مگر باپ مجھ پر جان چھڑکتے تھے۔ ان کی موت کا مجھے سخت صدمہ ہوا۔ فاروق

نے مجھے بڑے پیار کے دلاسے بھرے خط لکھے۔ تو ذرا ڈھارس بندھی۔ اس نے لکھا۔ نماز پڑھا کرو۔ بہت برا وقت ہے۔ دنیا پہ کالی آندھی چل رہی ہے۔ سورج ڈیڑھ بلم پر آیا چاہتا ہے۔ پل کا بھروسہ نہیں۔ سارے کاروباریوں کی طرح وہ بھی بڑا سخت مذہبی اور توہم پرست آدمی تھا۔ پابندی سے اجمیر شریف جاتا۔ نجومیوں، رمالوں، پنڈتوں، سیانوں، پیروں، فقیروں اچھے اور برے شگونوں، خوابوں کی تعبیر، غرض کہ ہر چیز کا قائل تھا۔ ایک آدھ مہینہ میں نے نماز بھی پڑھی۔ مگر جب میں سجدے میں جاتی تو دل چاہتا خوب زور زور سے ہنسوں۔

ملک میں سائنس خواتین لیکچراروں کی بڑی زبردست مانگ تھی۔ جب مجھے ایک مقامی کالج والوں نے بے حد مجبور کیا تو میں نے پڑھانا شروع کر دیا۔ حالانکہ ٹیچری کرنے سے مجھے سخت نفرت ہے۔ کچھ عرصے بعد مجھے پنجاب کے ایک دور افتادہ ضلع کے گرلز کالج میں بلا لیا گیا۔ کئی سال تک میں نے وہاں کام کیا۔ مجھ سے میری طالب علم لڑکیاں اکثر پوچھتیں۔ ہائے اللہ مس تنویر۔ آپ اتنی پیاری سی ہیں۔ آپ اپنے کروڑپتی منگیتر سے شادی کیوں نہیں کرتیں؟

اس سوال کا خود میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

یہ نیا ملک تھا۔ نئے لوگ۔ نیا معاشرہ۔ یہاں کسی کو میرے ماضی کا علم نہ تھا۔ کوئی بھی بھلا مانس مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو سکتا تھا۔ دلیکن بھلے مانس، خوش شکل، سیدھے سادھے شریف زادے مجھے پسند ہی نہیں آتے تھے۔ میں کیا کرتی) دلّی کے قصے دلّی میں رہ گئے۔ اور پھر میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ ایک سے ایک حرافہ لڑکیاں اب ایسی پارسا بنی ہوئی ہیں کہ دیکھا ہی کیجیے۔ خود ایڈتھ ہری رام اور راکی خان کی مثال میرے پاس موجود ہے۔

اب فاروقی بھی کبھی کبھی آتا۔ ہم لوگ اس طرح ملتے گویا بیسیوں برس کے پرانے شادی شدہ میاں بیوی ہیں جن کے پاس سارے نئے موضوع ختم ہو چکے ہیں۔ اب سکون اور آرام اور ٹھہراؤ کا وقت ہے۔ فاروقی کی بیٹی کی حال ہی میں دھوم دھام سے شادی ہوئی ہے۔ اس کا لڑکا آکسفورڈ جا چکا ہے۔ بیوی کو مستقل دمہ رہتا ہے۔ فاروقی نے اپنے کاروبار کی شاخیں باہر کے کئی ملکوں میں پھیلا دی ہیں۔ نینی تال میں نیا بنگلہ بنوا رہا ہے۔ فاروقی اپنے خاندان کے قصے، کاروبار کے معاملات مجھے تفصیل سے سنایا کرتا اور میں اس کے لئے پان بناتی رہتی۔

ایک مرتبہ میں چھٹیوں میں، کالج سے لاہور آئی تو فاروقی کے ایک پرانے دوست سید وقار حسین خاں سے میری ملاقات ہوئی۔ یہ بھی اپنے وقت کے اکیلے تھے۔ اور کچھ کم رنڈوے تھے۔ دراز قد، موٹے تازے، سیاہ توا ایسا رنگ۔ عمر میں پینتالیس کے لگ بھگ۔ اچھے خاصے دیوزاد معلوم ہوتے۔ ان کو میں نے پہلی مرتبہ نئی دہلی میں دیکھا تھا۔ جہاں ان کا ڈانسنگ اسکول تھا۔ یہ رام پور کے ایک شریف گھرانے کے اکلوتے فرزند تھے۔ بچپن میں گھر سے بھاگ گئے۔ سرکس، کارنیول اور تھیٹریکل کمپنیوں کے ساتھ ملکوں ملکوں گھومے۔ سنگاپور، ہانگ کانگ، شنگھائی، لندن، جانے کہاں کہاں۔ ان گنت قومیتوں اور نسلوں کی عورتوں سے وقتاً فوقتاً شادیاں رچائیں۔ ان کی موجودہ بیوی ناگپور کے ایک مارواڑی مہاجن کی لڑکی تھی جس کو یہ کلکتے سے اڑا لائے تھے۔ بارہ پندرہ سال قبل میں نے اسے دلّی میں دیکھا تھا۔ سانولی سلونی سی پستہ قد لڑکی تھی۔ اس کی شکل پر عجیب طرح کا الم برستا۔ مگر سنا تھا کہ بڑی پتی ورتا عورت تھی۔ میاں کی بد سلوکیوں سے تنگ آ کر ادھر ادھر بھاگ جاتی۔ لیکن چند روز کے بعد پھر واپس موجود۔ خان صاحب نے کناٹ سرکس کی ایک بلڈنگ کی تیسری منزل پر بال روم ڈانسنگ اور ہندی ناچ سکھانے کا

اسکول کھول رکھا تھا جس میں وہ اور ان کی بیوی دو اینگلو انڈین لڑکیاں گویا اسٹاف میں شامل تھیں۔ جنگ کے زمانے میں اس اسکول پر من برسا۔ اتوار کے روز ان کے یہاں صبح کو "جیم سیشن" ہوا کرتے۔ ایک مرتبہ میں بھی خوش وقت کے ساتھ وہاں گئی تھی۔ سُنا تھا کہ وقار صاحب کی بیوی ایسی مہاستی انسویا کی اوتار ہیں کہ ان کے میاں حکم دیتے ہیں کہ فلاں فلاں لڑکی سے پہناپا گانٹھو اور پھر اسے مجھ سے ملانے کے لئے لے کر آؤ۔ اور وہ نیک بخت ایسا ہی کرتی۔ ایک بار وہ ہمارے ہوسٹل بھی آئی اور چند لڑکیوں کے سر ہوئی کہ اس کے ساتھ بارہ کھمبا روڈ چل کر چاء پئیں۔

تقسیم کے بعد وقار صاحب بقول شخصے لُٹ لٹا کر لاہور آن پہنچے تھے۔ اور مال روڈ کے پچھواڑے ایک فلیٹ الاٹ کروا کے اس میں اپنا اسکول کھول لیا تھا۔ شروع شروع میں کاروبار مندا رہا۔ دلوں پر مردنی چھائی تھی۔ ناچنے گانے کا کسے ہوش تھا۔ اس فلیٹ میں تقسیم سے پہلے آریہ سماجی ہندوؤں کا میوزک اسکول تھا۔ لکڑی کے فرش کا ہال۔ پہلو میں دو چھوٹے کمرے، غسل خانہ اور باورچی خانہ، سامنے لکڑی کی بالکنی اور شکستہ ہلتا ہوا زینہ۔ "ہند ماتا سنگیت مہا ودیالہ" کا بورڈ بالکنی کے جنگلے پہ اب تک ٹیڑھا ٹنگا ہوا تھا۔ اسے اتار کر "وقارز اسکول آف بال روم اینڈ ٹیپ ڈانسنگ" کا بورڈ لگا دیا گیا۔ امریکی فلمی رسالوں سے تراش کر جین کیلی، فریڈ اسٹیر، فرینک سیناٹرا، ڈورس ڈے وغیرہ کی رنگین تصویریں ہال کی بوسیدہ دیواروں پر آویزاں کر دی گئیں اور اسکول چالو ہو گیا۔ ریکارڈوں کا تھوڑا سا ذخیرہ خان صاحب دلّی سے ساتھ لیتے آئے تھے۔ گراموفون اور سیکنڈ ہینڈ فرنیچر فاروق سے روپیہ قرض لے کر انھوں نے یہاں خرید لیا۔ کالج کے من چلے لونڈوں اور نئی دولت مند سوسائٹی کی تازہ تازہ فیشن ایبل بیگمات کو خدا سلامت رکھے۔ دو تین سال میں ان کا کام خوب چمک گیا۔

فاروق کی دوستی کی وجہ سے میرا اور ان کا کچھ بھاوج اور جیٹھ کا سا رشتہ ہو گیا تھا۔ وہ اکثر میری خیر خبر لینے آ جاتے۔ ان کی بی بی گھنٹوں میرے ساتھ پکانے ریندھنے سینے پرونے کی باتیں کیا کرتیں۔ بے چاری مجھ سے بالکل دیورانی والا شفقت کا برتاؤ کرتیں۔ یہ میاں بیوی لاولد تھے۔ بڑا اداس، بے رنگ، بے تُکا سا غیر دلچسپ جوڑا تھا۔ ایسے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں۔

کالج میں نئی امریکہ پلٹ ناک چڑھی پرنسپل سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ اگر وہ سیر تو میں سوا سیر۔ میں خود ابوالحسن تانا شاہ سے کون کم تھی۔ میں نے استعفیٰ کالج کمیٹی کے سر پہ مارا، اور پھر سنت نگر لاہور واپس آ گئی۔ میں پڑھاتے پڑھاتے اکتا چکی تھی، میں کوئی وظیفہ لے کر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے باہر جا سکتی تھی۔ مگر اس ارادے کو بھی کل پر ٹالتی رہی۔ کل امریکنوں کے دفتر جاؤں گی۔ جہاں وہ وظیفے بانٹتے ہیں۔ کل برٹش کونسل جاؤں گی۔ کل ایجوکیشن منسٹری میں اسکالر شپ کی درخواست بھیجوں گی۔

مزید وقت گذر گیا۔ کیا کروں گی، کہیں باہر جا کر۔ کون سے گڑھ جیت لوں گی۔ مجھے جانے کس چیز کا انتظار تھا۔ مجھے معلوم نہیں۔

اس دوران میں ایک روز وقار بھائی میرے پاس حواس باختہ آئے اور کہنے لگے۔ "تمھاری بھابی کے دل میں پھر سودا اٹھا۔ وہ ویزا بنوا کر انڈیا واپس چلی گئیں اور اب کبھی نہ آئیں گی۔"

"یہ کیسے؟ ——" میں نے ذرا بے پروائی سے پوچھا۔ اور ان کے لئے چائے کا پانی اسٹوو پر رکھ دیا۔

" بات یہ ہوئی کہ میں نے انھیں طلاق دے دی ۔ ان کی زبان بہت بڑھ گئی تھی ۔ ہر وقت ٹرٹر ۔ ٹرٹر ۔" پھر انھوں نے سامنے کے کھرّے پلنگ پر بیٹھ کر خالص شوہروں والے انداز میں بیوی کے خلاف شکایات کا ایک دفتر کھول دیا ۔ اور خود کو بے قصور اور حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف رہے ۔

میں بے پروائی سے یہ ساری کتھا سنا کی ۔ زندگی کی ہر بات اس قدر بے رنگ ، غیر اہم ، غیر ضروری اور بے معنی تھی ———

کچھ عرصے بعد وہ میرے یہاں آکر بڑبڑاتے ۔

" نوکروں نے ناک میں دم کر رکھا ہے ۔ کبھی اتنا بھی تم سے نہیں ہوتا کہ آکر ذرا بھائی کے گھر کی حالت ہی درست کر جاؤ ۔ نوکروں کے کان امیٹھو ۔ میں اسکول بھی چلاؤں اور گھر بھی " انھوں نے اس انداز سے شکایتاً کہا گویا ان کے گھر کا انتظام کرنا میرا فرض تھا ۔

چند روز بعد میں اپنا سامان باندھ کر وقار صاحب کے کمروں میں منتقل ہو گئی ۔ اور ناچ سکھانے کے لئے ان کی اسسٹنٹ بھی بن گئی ۔

اس کے مہینے بھر بعد پچھلے اتوار کو وقار صاحب نے ایک مولوی بلوا کر اپنے دو چپڑ کٹوں کی گواہی میں مجھ سے نکاح پڑھوالیا ۔

اب میں دن بھر گھر کے کام میں مصروف رہتی ہوں ۔ میرا حسن و جمال ماضی کی داستانوں میں شامل ہو چکا ہے ۔ مجھے شور و شغب پارٹیاں ہنگامے مطلق پسند نہیں ۔ لیکن گھر میں ہر وقت " چاچا " اور " کلیپسو " اور " راک اینڈ رول " کا شور مچتا رہتا ہے ۔ بہر حال ۔ یہی میرا گھر ہے ۔

میرے پاس اس وقت کئی کالجوں میں کیمسٹری پڑھانے کے آفر ہیں ۔ مگر بھلا خانہ داری کے دھندوں سے کہیں فرصت ملتی ہے ۔ نوکروں کا یہ حال ہے کہ آج رکھو ۔ کل غائب ۔ میں نے زیادہ کی تمنا کبھی نہیں کی ۔ صرف اتنا ہی چاہا ، کہ ایک اوسط درجے کی کوٹھی ہو ۔ سواری کے لئے موٹر ۔ تاکہ آرام سے ہر جگہ آجا سکیں ۔ ہم چشموں میں بے عزتی نہ ہو ۔ چار ملنے والے آئیں تو بٹھانے کے لئے قرینے کا ٹھکانا ہو اور بس !

اس وقت ہماری ڈیڑھ دو ہزار ماہوار کی آمدنی ہے جو دو میاں بیوی کے لئے ضرورت سے کہیں زیادہ ہے ۔ انسان اپنی قسمت پر قانع ہو جائے تو سارے دکھ آپ سے آپ مٹ جاتے ہیں ۔

شادی کر لینے کے بعد لڑکی کے سر کے اوپر چھت سی پڑ جاتی ہے ۔ آج کل کی لڑکیاں جانے کس رو میں بہہ رہی ہیں ۔ کس طرح یہ لوگ ہاتھوں سے نکل جاتی ہیں ۔ جتنا سوچوں عجیب سا لگتا ہے اور حیرت ہوتی ہے ۔

میں نے تو کبھی کسی سے فلرٹ تک نہ کیا ۔ خوش وقت ، فاروقی اور اس پچاس سالہ بدہیئت بدقوارہ شخص کے علاوہ ۔ جو میرا شوہر ہے ، میں کسی چوتھے آدمی سے واقف نہیں ۔ میں شاید بدمعاش تو نہیں تھی ۔ معلوم میں کیا تھی اور کیا ہوں ـــ ریحانہ ، سعدیہ ، پربھا اور یہ لڑکی جس کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر دہشت پیدا ہوئی ، شاید وہ مجھ سے زیادہ اچھی طرح مجھ سے واقف ہوں ۔

(باقی صفحہ ۷۶۸ پر)

خواجہ احمد عبّاس

بمبئی رات کی بانہوں میں

(۱)

بمبئی رات کی سیاہ مخملی بانہوں میں لیٹا ہوا ہنس رہا تھا۔

آسمان سے نیچے اترتے ہوئے ہوائی جہاز کی کھڑکی میں سے ایسا لگتا تھا کہ شہر کی لاکھوں کروڑوں روشنیاں آنکھیں جھپکا رہی ہیں، دانت دکھا رہی ہیں، کھلکھلا کر ہنس رہی ہیں۔

نیچے ایرپورٹ پر ایک بوئنگ (BOEING) اتر رہا تھا جو وقت سے دس منٹ پہلے آگیا تھا۔ کیوں کہ سنگاپور سے اسے موافق سمت میں چلنے والی تیز ہوا ملی تھی) اسی لیے دہلی سے آنے والے وائی کاؤنٹ (VISCOUNT) کو نیچے اترنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اور سوا پنے ساتھ مسافروں کو لیے ہوئے یہ ہوائی جہاز ایک بار شہر کے اوپر پورا چکر لگا چکا تھا اور اب دوسری بار چکر لگا رہا تھا، اور شاید پھر تیسری بار بھی اسے چکر لگانا پڑے۔

ارجن اروڑہ جو "بمبئی ٹائمز" اخبار کے چیف رپورٹر کی حیثیت سے دہلی ریپبلک ڈے پریڈ کی رپورٹ لے کر لوٹ رہا تھا، اپنے برابر بیٹھے ہوئے مسافر کو کھڑکی میں سے بمبئی کی روشنیاں دکھا رہا تھا۔

"وہ دیکھو سمندر میں نیوی کے جہاز کھڑے ہیں۔ گیٹ وے آف انڈیا اور تاج محل ہوٹل کے بالکل سامنے۔ یہ ہے۔ قلابہ جنوب میں بمبئی کا آخری کنارہ۔ یہ ہے میرین ڈرائیو۔ ہمارے شہر کی سب سے خوب صورت سڑک جو میلوں سمندر کے کنارے کنارے چلی گئی ہے۔ اور وہ نیچے روشنیوں کا جھرمٹ جو نظر آرہا ہے وہ چوپاٹی ہے۔ چوپاٹی کا ذکر تو آپ نے ضرور سنا ہوگا......

مگر اس نے دیکھا کہ اس کے برابر میں بیٹھا ہوا مسافر نہ کھڑکی میں سے روشنیاں دیکھ رہا ہے نہ ہی شاید وہ اُس کی بات سن رہا ہے۔ اُس کی آنکھیں بند ہیں اور اپنے ہاتھوں سے سیٹ والی پیٹی کو وہ کس کر پکڑے ہوئے ہے۔

اپنے ہر سفر میں ارجن کو عجیب اور دلچسپ ہستیوں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ مگر ایسا ہم سفر اسے کبھی نہ ملا تھا۔ ابھی پالم سے ہوائی جہاز اڑا بھی نہیں تھا، کہ بوڑھے نے اپنے کوٹ کے اندر کی جیب سے ہزار ہزار کے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر ارجن کو دکھایا اور پوچھا۔

"کیوں جی — بیس ہزار روپے کافی ہوں گے نا؟ — بات یہ ہے کہ میں زندگی میں پہلی بار بمبئی جا رہا ہوں۔ دلّی میں دریبے میں سونے چاندی کے زیوروں کی دکان ہے۔ بمبئی جانے کا سوچا تو کتنی ہی بار مگر دھندے سے کبھی فرصت ہی نہیں ملی پچھلے برس میں نے سارے تیرتھوں کی یاترا تو کرلی ہے — اب جی چاہتا ہے مرنے سے پہلے بس ایک بار بمبئی دیکھ لوں۔ عمر بھر میرے بیٹوں پوتوں نے میری کمائی پر عیش کئے ہیں، جی — میں نے سوچ لیا ہے کہ مہینہ بھر میں بھی بمبئی جی بھر کے عیش کروں گا۔ عمر بھر کی کسر نکالوں گا۔ سُنا ہے جی رات کو بمبئی میں بڑے بڑے تماشے ہوتے ہیں، جی"

اور ان کے خیال سے ہی اس کی بوڑھی مدھم آنکھیں چمک اٹھی تھیں، اور اُس کے سوکھے ہوئے پتلے پتلے ہونٹوں سے رال ٹپکنے لگی تھی — مگر اب اس کی آنکھیں بند تھیں اور شاید متلی کو روکنے کے لئے اس نے اپنے سوکھے پتلے ہونٹ کس کر بند کر رکھے تھے۔

"بے چارہ بوڑھا!" ارجن نے سوچا — "پہلی بار ہوائی جہاز میں بیٹھا ہے نا — ہوائی جہاز نیچے اترتا ہے تو پہلے تجربے کار مسافروں کو بھی پیٹ میں خلا سا محسوس ہوتا ہے اور متلی ہونے لگتی ہے۔ ضرور اس بے چارے کی حالت خراب ہے تب ہی تو چہرہ پیلا پڑگیا ہے"

ارجن تو درجنوں ہوائی سفر کرچکا تھا — اس کو کبھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اُس کے برابر بیٹھے ہوئے مسافر کو کبھی متلی ہونے لگے تو دیکھکر اس کی طبیعت بھی خراب ہونے لگتی تھی۔ اس لئے اس نے اپنے ہم سفر کا پیلا چہرہ دیکھتے ہی فوراً کھڑکی کی طرف منہ موڑ لیا، اور نیچے شہر کی روشنیاں دیکھنے لگا اور گھومتے ہوئے ہوائی جہاز میں سے اسے ایسا لگا کہ وہ خود تو فضا میں معلق اور ساکت ہے مگر دور کہیں نیچے روشنیوں سے جگمگاتا ہوا شہر گھوم رہا ہے —— گھوم رہا ہے۔

"رات!" ارجن نے گھومتے ہوئے شہر کی روشنیوں کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا کہ رات ایک حسین جادوگرنی ہے — ہر شام کو وہ شہر کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتی ہے اور اس پر اپنا ستاروں ٹنکا کامدانی کا سیاہ ریشمی دوپٹہ ڈال دیتی ہے۔ اور پھر صبح ہونے تک شہر کے سارے بھدے خدوخال، شہر کے بدن پر جھولتے ہوئے میلے بدبودار چیتھڑے، شہر کے ہاتھ پاؤں اور چہرے پر خون اور پیپ سے رستے ہوئے زخم اور ناسور —— وہ سب اس جادو کے دوپٹے سے ڈھکے رہتے ہیں۔ ہر بُرائی، ہر بدصورتی، ہر بے انصافی، ہر ظلم پر اندھیرے کا پردہ پڑا رہتا ہے۔ اور رات کی طلسمی بانہوں میں سمٹ کر شہر کے چہرے پر نکھار آجاتا ہے۔ شہر حسین اور جوان اور صحت مند ہوجاتا ہے، روشنی کے لاکھوں دانتوں کی نمائش کرنے کے لئے کھِل کھلاکر ہنس پڑتا ہے۔ مگر پھر صبح ہوتی ہے۔ ایک ایک کرکے روشنیاں بجھتی جاتی ہیں۔ جیسے کسی کے چہرے پر سے کھسیانی ہنسی کے آثار آہستہ آہستہ مٹتے جائیں۔ اور پھر سورج اپنا آتشیں ہاتھ بڑھاتا ہے اور ایک ہی وار میں اس طلسمی چادر کو نوچ لیتا ہے اور شہر کو رات کی نرم بانہوں میں سے گھسیٹ کر

رات کی سفاک روشنی میں ننگا لاکھڑا کر دیتا ہے۔

مگر راد جن نے سوچا، ابھی سویرا ہونے میں دیر ہے۔ اس وقت اول رات ہے اور رات کو بمبئی سے زیادہ خوب صورت شہر دنیا میں کوئی نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کالے مخمل پہ ہیرے جواہرات بکھرے پڑے ہوں۔ مگر نہیں۔ یہ سب تو شاعری ہے۔ (اس نے پھر سوچا) یہ نیچے پھیلا ہوا کالا مخمل نہیں ہے۔ اندھیرا سمندر ہے۔ اور یہ ہیرے جواہرات نہیں ہیں۔ یہ سڑکوں کی، گھروں اور دکانوں کی، ہوٹلوں اور تھیٹروں، کلبوں اور ناچ گھروں، کارخانوں اور فیکٹریوں، چالوں اور جھونپڑیوں کی روشنیاں ہیں "نیون لائٹ" میں لکھے ہوئے موٹروں اور بسکٹوں اور کپڑے کی ملوں اور صابن کی ٹکیوں اور ناچ گانوں سے بھرپور فلموں کے لال نیلے پیلے رنگوں کے اشتہار ہیں۔

ملک کی تقسیم کے بعد سے اس نے پندرہ برس اس شہر میں گزارے تھے اور بمبئی کی رات سے وہ ایسا واقف تھا جیسے مرد اپنی عورت کے جسم کی بوٹی بوٹی سے واقف ہوتا ہے۔ یہ بکھری ہوئی روشنیوں کا جال جو نیچے گھوم رہا تھا ان میں سے ہر روشنی اس کی جانی پہچانی تھی۔ برسوں تک ہر رات کو وہ اخبار کے دفتر میں نائٹ ڈیوٹی کر کے ان روشنیوں کی چھاؤں میں فلورا فاؤنٹن سے بائیکلہ پیدل گیا تھا۔ اپنے پہلے عشق میں پہلی ناکامی کے بعد مہینوں اس نے میرین ڈرائیو کا پتھریلا فٹ پاتھ ناپا تھا، اور اس پر لگی ہوئی روشنیاں گنی تھیں۔ اور جب اوشا سے اس کی نئی نئی محبت ہوئی تھی تو کتنی ہی بار وہ دونوں رات کو چوپاٹی گئے تھے، اور وہاں چاٹ کی دکانوں پر لگے ہوئے گیس کے ہنڈوں کی پیلی روشنی میں انھوں نے دہی بڑے اور گول گپے کھائے تھے۔ اور پھر فالودہ پی کر بنارسی پان والے کی دکان سے مہوبے کے خوشبودار پان بنوائے تھے۔ اور پھر ان پانوں کو چباتے، ہنستے بولتے والکیشور روڈ پر لگی ہوئی روشنیوں کو گنتے ہوئے مالابارہل کی چوٹی تک گئے تھے، تاکہ سڑکوں کے ہنگامے اور شور سے بہت دور اور بہت اوپر ہینگنگ گارڈن کے سامنے پڑی ہوئی کسی بنچ پر بیٹھ کر ایک دوسرے کی دل کی دھڑکنیں سن سکیں۔

مگر اب وقت کے ساتھ مہوبے کے ان پانوں کا مزا کسیلا پڑ چکا تھا۔ اور برسوں سے انھوں نے چوپاٹی پر نہ چٹ پٹی چاٹ کھائی تھی، نہ ٹھنڈا میٹھا فالودہ پیا تھا۔ اور نہ ہی مدتوں سے انھوں نے ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سنی تھیں۔ اب وہ رات بھر اوشا کے خرّاٹے سنتا تھا، اور اوشا اس کو نیند میں دنیا بھر کی سیاست کے بارے میں بڑبڑاتے ہوئے سنتی تھی۔ اور دونوں مل کر رات بھر اپنے تین بچوں کا چھینکنا، کھانسنا اور رونا دھونا سنتے تھے۔

"کیا ہو گیا ہے ہمیں؟ اُس نے سوچا۔ میں اب بھی اوشا سے محبت کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے اوشا بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ پھر اب ہم اکٹھے چوپاٹی پر جا کر چاٹ کیوں نہیں کھاتے، خوشبودار مہوبے کے پان کیوں نہیں بنواتے، مالابارہل پر جا کر رات کے سناٹے میں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں کیوں نہیں سنتے"؟

اور ابھی وہ اپنی زندگی کے اس سب سے اہم سوال کا جواب نہیں سوچ پایا تھا کہ اس نے دیکھا کہ نیچے پھیلے ہوئے شہر نے گھومنا بند کر دیا ہے ۔ اور اب ایرپورٹ کی نیلی، پیلی، لال روشنیاں تیزی سے اوپر کی طرف اُٹھ رہی ہیں اور ایک لمحے کے لئے اسے ایسا لگا کہ ان کا ہوائی جہاز ان روشنیوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔ اور وہ سب بلوّر کی .... کرچوں کی طرح ستارے بن کر اندھیرے آسمان میں بکھر جائیں گے۔

ایک جھٹکے کے ساتھ بریک لگے اور ہوائی جہاز تھرتھراتا ہوا ٹھہر گیا۔

سیٹ کی پیٹی سے اپنے آپ کو آزاد کرتے ہوئے ارجن نے برابر بیٹھے ہوئے مسافر کی طرف مڑ کر کہا —

"لیجئے آ گیا، بمبئی۔ اب ڈٹ کے سیر کیجئے ۔"

مگر اسے کوئی جواب نہ ملا، اور اب اُس نے دیکھا کہ اُس بوڑھے کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں مگر اس کی گردن ایک عجیب اور بھیانک اور بے جان انداز سے ڈھلکی ہوئی ہے ۔

دوسری طرف ان کے برابر کی سیٹ سے ایک پتلی مونچھوں والا نوجوان اپنے ایئر بیگ کو جھلاتا ہوا اٹھا اور اُس نے جُھک کر بوڑھے کو جھنجوڑا —

"اے اُٹھو مسٹر ۔"

اور جب اُسے بھی کوئی جواب نہ ملا تو وہ کچھ گھبرا سا گیا، اور پیچھے ہٹتے ہوئے بولا —

"اولڈ مین از ڈرنک (OLD MAN IS DRUNK) بڈھا پیئلا ہے ۔"

دومنٹ کے بعد ایئرپورٹ کے ڈاکٹر نے (جو ایئر ہوسٹس نے کیپٹن سے کہہ کر بلایا تھا) سرسری سا معائنہ کرتے ہی کہہ دیا کہ بوڑھا ہارٹ فیل ہو کر مر چکا ہے ۔

ارجن نے کہا — "بے چارے کی آخری حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی ۔"

"کیا کہا آپ نے ؟" پولیس انسپکٹر نے اسے مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ۔ "آپ کو ہمارے ساتھ ایئرپورٹ کے تھانے تک چل کر اپنا نام پتہ لکھوانا ہوگا ۔ کیا آپ مرنے والے کے بارے میں کچھ جانتے ہیں ؟"

"جی نہیں ۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ مرنے سے پہلے بمبئی دیکھنا چاہتا تھا ؟"

"بہر حال آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا ۔"

"چلئے —"

جب سب مسافر اُتر چکے تو اسٹریچر پر بوڑھے کی لاش کو اتارا گیا ۔ اس کے بعد ارجن اپنا پورٹ فولیو لئے ہوئے اترا ۔ اور اس کے بعد پولیس انسپکٹر اور ڈاکٹر اور ہوائی جہاز کے دونوں پائلٹ ۔

سانتا کروز ایرپورٹ کی ہزاروں روشنیاں اندھیرے میں اپنی نیلی پیلی لال آنکھیں چمکا رہی تھیں ۔ جیسے بمبئی آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہی ہوں ۔ ان کو دعوتِ نظارہ دے رہی ہوں مگر ارجن نے اسٹریچر کو اندھیرے میں

غائب ہوتے دیکھ کر سوچا)۔۔ وہ بوڑھا جس نے عمر بھر بمبئی دیکھنے کا خواب دیکھا تھا، آج رات کی بانہوں میں ہمیشہ کے لئے سوچکا ہے۔

(۲)

"ٹیکسی!"۔۔۔۔۔۔

"ٹیکسی!"۔۔۔۔۔۔

آوازیں دو بلند ہوئیں مگر سارے ایرپورٹ پر ٹیکسی صرف ایک تھی۔

ارجن کا ہوائی جہاز اترا تھا آٹھ بجے مگر پولیس کے سوال جواب ختم ہوتے ہوتے نو بج گئے۔

اُس نے سوچا تھا۔ دفتر میں نائٹ ڈیوٹی کے لئے جانے سے پہلے ماٹنگا میں اپنے گھر ہوتا جائے گا۔ نہیں تو اوشا پھر شکایت کرے گی اور ہمیشہ کی طرح چلّائے گی۔

"تین دن کے بعد دلّی سے آئے اور ایرپورٹ سے سیدھے دفتر۔ کیا رپورٹ کل نہیں لکھ سکتے تھے؟"

اور پھر اسے سمجھانا پڑے گا کہ اخبار کے کام میں صرف "آج" ہوتی ہے "کل" نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ صرف آج کی خبر، خبر ہے ۔۔۔ اگلے دن وہ مرجاتی ہے۔ سڑجاتی ہے اور سڑی ہوئی مچھلی کی طرح بازار میں اس کا کوئی گاہک نہیں ہوتا ۔۔۔

مگر اب تو یہیں اتنی دیر ہوگئی تھی کہ دس بجے تک دفتر پہنچ بھی گیا تو شاید ہی ایک ڈیڑھ بجے تک اپنی رپورٹ ٹائپ کرپائے۔ اس پر یہ ستم ہوا کہ ایرپورٹ پر ساری ٹیکسیاں غائب۔ اور ایک ملی بھی تو ایک اور مسافر پہلے سے اس پر قبضہ جمانے کو تیار۔۔۔

"آپ کو کہاں جانا ہے؟"

پوچھنے والا داڑھی پتلی مونچھوں والا نوجوان تھا جو ان کے ساتھ ہوائی جہاز میں دہلی سے آیا تھا۔ اور اب دو بھاری سوٹ کیسوں کو ٹیکسی کے پیچھے لدوا رہا تھا۔

"مجھے تو فلورا فاؤنٹن جانا ہے۔" اور "آپ کو؟"

"میں تو ادھر جوہو پر رہتا ہوں۔ ویری نیر ہوٹل جل ترنگ۔ میں اتر جاؤں گا پھر آپ ٹیکسی فورٹ لے جائیے گا"

ارجن کو ایک انجانے آدمی کے ساتھ ساجھے میں ٹیکسی کرنا بالکل اچھا نہیں لگا۔ مگر اس وقت اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ پتلی مونچھوں والا سانولا نوجوان ایک، پیلے چمڑے کا لمبا نوکیلا جوتا پہنے ہوئے تھا۔ اُس کی آسمانی رنگ کی پتلون اتنی پتلی دہری کی تھی کہ بالکل چوڑی دار لگتی تھی۔ اور چمڑے کی ہری جیکٹ کے نیچے وہ گلے میں ایک بے رنگی سلک کا سکارف باندھے ہوئے تھا۔ نہ جانے کیوں ہوائی جہاز میں بھی اس نوجوان کو دیکھ کر ارجن کو ایسا لگا تھا جیسے اپنی پتلی مونچھوں سے لے کر نوکیلے پیلے جوتوں تک اُس میں ہر طرف آڑھی ترچھی 'تیز' چبھنے والی نوکیں ہی نوکیں نکلی ہوئی ہوں۔ ٹیکسی میں اس کے برابر بیٹھتے ہوئے وہ بے اختیار ایک طرف کو دروازے سے بالکل ٹک کر بیٹھ گیا جیسے اسے ڈر ہو کہ پتلی مونچھوں والے کی طرف نکلی ہوئی نوکوں میں سے کوئی اس کو نہ چبھ جائے۔

ٹیکسی روانہ ہوکر ایرپورٹ کے کمپاؤنڈ سے باہر نکلی تو اُس نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ "تم بھی دہلی سے آئے ہونا؟ پھر تمہیں اتنی دیر کیوں لگی؟ دوسرے مسافروں کو گئے تو گھنٹہ بھر ہوگیا ہوگا۔"

"دیل۔یو سی۔" پتلی مونچھوں والے نوجوان نے کہنا شروع کیا۔ پھر وہ رک گیا۔ پھر سوچ کر بولا۔ "یو سی سامان میں میرا ایک سوٹ کیس ادھر اُدھر ہوگیا تھا۔ اُس کی تلاش میں اتنی دیر لگ گئی۔" اور پھر ایک دم قہقہہ مار کر وہ بولا۔ "اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

اور نہ جانے کیوں ارجن کو وہ ہنسی بڑی ہی کھوکھلی اور بلا وجہ لگی۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ سکے، وہ نوجوان اس سے پوچھ رہا تھا۔ "مگر آپ تو بتایئے تھانے میں آپ پر کیا بیتی؟ پولیس والے شریف آدمیوں کو بہت ٹربل (TROUBLE) کرتے ہیں۔ کہیں آپ پر تو اس بڈھے کے مرڈر..... (MURDER—) کا چارج نہیں لگا دیا؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ پولیس والے مجھے جانتے ہیں۔"

"ری یلی! (REALLY!) پولیس والے تم کو بھی ——— آئی مین۔(I MEAN) ——— تم کو جانتے ہیں۔ کبھی اندر جا چکے ہو؟"———

اب جا کر ارجن کی سمجھ میں آیا کہ پتلی مونچھوں والا نوجوان اُس کو کوئی سزا یافتہ مجرم سمجھ رہا تھا۔ ہنس کر اس نے جواب دیا ———

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ مگر میں رپورٹر ہوں ——— اس لئے پولیس والوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے دیر تو اور ہی وجہ سے لگی۔"

"وہ کیا؟" ———

جواب دینے سے پہلے ارجن نے سوچا۔ پھر بولا۔

"کوئی ہرج نہیں۔ بتائے دیتا ہوں۔ کل سویرے تو سب کچھ پیپر میں آنے والا ہی ہے۔ بات یہ ہے کہ بڈھے کے پاس جیب میں تیس ہزار روپے تھے۔"

"تیس ہزار روپے؟" نوجوان نے بے اختیار سیٹی بجاتے ہوئے دہرایا۔ "تیس ہزار روپے تو بہت ہوتے ہیں۔ کیا ہزار ہزار کے نوٹ تھے؟"

"ہاں ہاں ہزار ہزار روپے کے نوٹ ہی تھے۔ جب بڈھے نے مجھے ہوائی جہاز میں دکھائے تھے۔ مگر...."

"مگر....."

"مگر تھانے میں جب میں نے انسپکٹر کو یہ بتایا اور لاش کی تلاشی لی گئی تو وہ روپے جیب میں نہیں نکلے۔ بنڈل کا بنڈل غائب ہوگیا ہے۔"

"اوہ۔ لو اتے!" نوجوان جوش سے بول اٹھا۔ "تیس ہزار روپے؟ ایک بار مجھے اتنا بہت روپیہ مل جاتے تو.... تو.... تو.... مگر وہ "تو — تو —" ہی کہتا رہا۔

جیسے بچے سے کوئی پوچھتا ہے۔ "بیٹا تمھیں ایک روپیہ دیں تو تم اس کا کیا کرو گے؟" ویسے ہی ارجن نے پوچھا
"بلیوں مسٹر، تمھیں وہ تیس ہزار روپے مل جاتے تو تم کیا کرتے؟"

اور جیسے بچہ جواب دیتا ہے۔ "میں چار آنے کا کوکا کولا پیوں گا۔ چار آنے کی چاکلیٹ خریدوں گا۔ آٹھ آنے کی کامکس (COMICS) کی کتاب لوں گا۔" ویسے ہی نوجوان نے جواب دیا۔ "میں...... میں...... دس سوٹ بنواؤں گا اور ہر سوٹ کے ساتھ اسی رنگ کا ایک جوتا۔ اور بیس سلک کی شرٹس سلواؤں گا اور ایک یہ لمبی ریسنگ موٹر خریدوں گا اور ایک رات کو اصلی اسکاچ وہسکی پیوں گا — خوب پیوں گا — پھر ہوٹل جل ترنگ میں ڈنر کھاؤں گا۔ لوسی کا گانا سنوں گا۔ پھر اس سے کہوں گا۔ کم آن، لوسی (COME ON, LOCY) اپنی نئی گاڑی میں تمھیں ڈرائیو کرانے لے چلتا ہوں۔ اور وہ کہے گی......"

وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ٹیکسی جوہو پر سمندر کے کنارے ہوٹل جل ترنگ کے پاس ایک کاٹیج کے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور اتر کر سوٹ کیس اتارتے ہوئے بولا۔

"صاحب ان بکسوں میں کیا آپ نے پتھر بھر رکھے ہیں؟"

"پتھر ہی سمجھو، ڈرائیور۔ مگر تم ان کی فکر نہ کرو۔ تم یہ لو۔" اور یہ کہہ کر اس نے ٹیکسی والے کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ رکھ دیا۔

"صاحب۔ میرے پاس چھٹا نہیں ہے...." ڈرائیور ابھی کہہ ہی رہا تھا کہ نوجوان جلدی سے بڑی شان سے بولا
"کیپ دی چینج" (KEEP THE CHANGE)

پھر وہ ارجن کی طرف مخاطب ہوا۔

"تھینک یو مسٹر......؟"

"ارجن — ارجن اروڑہ — مگر تمھارا نام کیا ہے، مسٹر...."

"میرا نام؟ — میرا نام ہے — مسٹر — مسٹر جوزف — گڈ نائیٹ"

اور یہ کہہ کر وہ بھاری سوٹ کیسوں کو اٹھا ہی رہا تھا کہ اندر سے ایک دُبلی سی سانولی سی سولہ سترہ برس کی لڑکی خوشی سے چلاتی ہوئی آئی۔

"ڈیڈی مائیک آگیا۔ ڈیڈی مائیک آگیا۔"

جب وہ دوڑتی ہوئی موٹر کی روشنی میں قریب آئی تو ارجن نے دیکھا کہ اس لڑکی کی بڑی بڑی آنکھیں ہیں اور ان آنکھوں میں اس نوجوان کے لئے بڑی محبت ہے جس نے اپنا نام جوزف بتایا تھا۔

"روزی۔ یہ کیا بکواس ہے؟ چل اندر۔"

ایک سوٹ کیس نوجوان نے اٹھایا اور دوسرا اس لڑکی نے۔ اگرچہ سوٹ کیس بہت بڑا اور بہت بھاری تھا اور وہ اس بوجھ سے لڑکھڑا رہی تھی۔ اور وہ دونوں اندر چلے گئے۔

"گڈ نائٹ" ارجن نے چلا کر کہا اور پھر ڈرائیور سے۔ "چلو بھائی جلدی کرو مجھے بہت دور جانا ہے۔"

ٹیکسی ہوٹل جل ترنگ کے پاس سے گذر رہی تھی کہ وہاں سے ڈانس بینڈ کی دھن اور ایک پتلی سی نازک سی آواز سنائی دی جو مائیکروفون پر ٹوئسٹ" (TWIST) کا ایک نیا گیت گا رہی تھی۔

"او مائی ڈیر۔
کم ہیر—
کم نیر—
مائی ڈارلنگ....."

اب ڈرائیور نے اس سے کہا— "یہ جوان بڑا دل والا نکلا صاحب۔ اپن کو پورے سات روپیہ ٹپ دے دیا۔ مگر یہ ہے کون؟"

"معلوم نہیں کون ہے— مگر ایک بات معلوم ہوگئی۔ وہ جو بھی ہے اس کا نام جوزف نہیں مائیک ہے!"

(۳)

"ہیلو مائیک"
"ہیلو انکل"
"دلی سے آگئے؟"
"یس انکل"
"سب سامان لے آئے؟"
"یس انکل"
"ایمبیسی میں سب ٹھیک ہیں نا؟"
"ایک دم فرسٹ کلاس انکل"
"راستے میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟"
"نو انکل— ایوری تھنگ نارمل" (EVERY THING NORMAL)
"گڈ— سوٹ کیس کھولو"

مائیک نے سوٹ کیس کھولے۔ اوپر پرانے کپڑے، موزے، جوتے، اور ان کے نیچے وہسکی کی بوتلیں، برانڈی کی بوتلیں، جن کی بوتلیں، شامپین کی بوتلیں۔

انکل ایک پرانی ڈریسنگ گاؤن پہنے ہوئے تھا۔ اور اس کی کھچڑی مونچھیں سگار کے دھوئیں سے پیلی پڑ چکی تھیں اور وہ اب بھی ایک بدبودار سگار پی رہا تھا۔ اور اس کے گہرے سانولے چہرے پر جھریوں کے ساتھ ایک عجیب گہری مایوسی سی چھائی ہوئی تھی۔ مگر ان بوتلوں کو دیکھتے ہی اس کی بلی جیسی چھوٹی چھوٹی دھنسی ہوئی آنکھوں میں چنگاریاں سی بھڑک اٹھیں اور اس کی جھریاں مسکراہٹ کی لکیروں میں تبدیل ہوگئیں۔

"گڈ بائے ۔ ویل ڈن (GOOD BOY, WELL DONE) ۔ یہ لو۔"

"بس تیس روپے؟" مائیک نے نوٹ ہاتھ میں لیتے ہوئے ان کو ایسی حقارت سے دیکھا جیسے وہ تیس پیسے نہ ہوں، تیس نئے پیسے ہوں۔"

"اور کیا چاہیے؟ تیس ہزار؟"

"دینے والے تیس ہزار بھی دے سکتے ہیں، انکل۔" اور سیٹی بجاتے ہوئے اس نے گلے سے مفلر اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا ــــ

"ہُنہہ!" انکل نے مائیک کی طرف ہنکارا اور پھر آواز دی ۔ "روزی!"

"یس ڈیڈی"! کہتی ہوئی وہی دبلی سی سانولی سی سپاٹ سینے والی لڑکی دوڑتی ہوئی آئی ۔ اس کا نام روزی ضرور تھا ۔ مگر وہ ایک ایسا گلاب کا پھول تھی جو کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گیا ہو ۔

"تمھارے لئے چائے بناؤں مائیک؟" اس نے پتلی مونچھوں والے نوجوان سے کہا جو کونے میں لگے ہوئے واش بیسن پر منہ دھو رہا تھا ۔

"نو، تھینک یو روزی ۔ یہ چائے کا وقت نہیں ہے۔" اس نے بے دلی سے جواب دیا، اور روزی کی طرف دیکھا بھی نہیں ــــ

انکل نے پوچھا۔ "روزی چائے کا پانی تیار ہے؟"

"یس، ڈیڈی۔"

"چھلنی میں چھانا ہے نا؟ کوئی پتی تو نہیں رہ گئی؟"

"نو ڈیڈی۔"

"گڈ گرل ۔ اب یہ بوتلیں اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے جاؤ اور سرنج نکال کر رکھو۔"

"یس ڈیڈی۔" مگر روزی کی بڑی بڑی کالی آنکھیں برابر مائیک کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ جواب تولیے سے اپنا چہرہ رگڑ رہا تھا ۔

روزی بوتلیں اٹھا کر دوسرے کمرے میں گئی تو انکل نے کہا۔ "مائیک آج چھ بوتلیں کارمائیکل روڈ پہنچانی ہیں۔ ٹیکسی کر لینا ۔ کرائے کے اوپر پندرہ روپے ملیں گے۔"

"پندرہ روپے؟" مائیک نے حقارت سے دہرایا ۔

"پندرہ روپے کم ہوتے ہیں، بوفول؟" انکل نے چلا کر کہا ۔ "یہاں سے کارمائیکل روڈ تک ٹیکسی میں جانے کے لئے! تیرا باپ دن بھر مچھلی پکڑتا ہے تب چار یا پانچ روپے کماتا ہے ۔ اور بھول گیا جس گیراج میں تو میکانک تھا وہاں تجھے کیا ملتا تھا؟ مہینے پیچھے ایک سو بیس روپے ۔ اور میں تجھے ہر تیسرے دن ہوائی جہاز سے دلّی بھیجتا ہوں۔ ہر بار تیس تیس چالیس چالیس روپے دیتا ہوں ۔ اوپر سے پندرہ بیس روپے کمانے کا چانس دیتا ہوں، اور تو "نو" بولتا ہے؟ میں خود بوتلیں پہنچا آتا مگر ماہم کے ناکے پر پولیس والے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ۔ مجھے دیکھتے ہی ٹیکسی کی تلاشی لیتے ہیں

کم آن ۔ بی اے گڈ بائے!" (COME ON, BE A GOOD BOY)

مگر مائیک پر اس لیکچر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اُس نے انکل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "سوری انکل میں نہیں جا سکتا۔ آئی ہیو اے ڈیٹ ود لوسی" "I HAVE A DATE WITH LOCY"۔

"لوسی! مائی ڈیر بائے اس گولڈ ڈگر کے پیچھے کیوں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے؟ اس کے پیچھے تو کتنے ہی پرنس اور لکھ پتی بزنس مین گھوم رہے ہیں۔ وہ تو تیری طرف دیکھے گی بھی نہیں۔"

"دیکھا جائے گا، انکل، دیکھا جائے گا۔" یہ کہہ کر اس نے قمیص اتار کر وہیں کپڑے بدلنے شروع کر دیئے۔ اور انکل سہنکارتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

سیٹی بجاتے ہوئے مائیک ٹائی کی گرہ باندھ رہا تھا کہ روزی واپس آ گئی۔ اب وہ میلے فراک کے بجائے ایک دُھلا ہوا گلابی پھولوں کی چھینٹ کا فراک پہنے تھی۔ اور اس کے سیدھے کنگھی کئے بالوں میں ایک گلابی ربن لگا ہوا تھا۔

"مائیک۔!"

"یس۔"

"لُک ایٹ می (LOOK AT ME) میں کیسی لگتی ہوں؟"

مائیک نے کوٹ پہنتے ہوئے گھوم کر دیکھا۔ اور کہا۔ "بہت اچھی لگتی ہو، روزی۔ کیوں کہیں جا رہی ہو؟"

"ہیو یو گوٹ اے ڈیٹ؟" (HAVE YOU GOT A DATE?)

"ہاں، مائیک۔ تمھارے ساتھ۔"

"مگر میں تو ہوٹل جل ترنگ جا رہا ہوں۔"

"مجھے بھی لے چلو، مائیک۔ میں تمھارے ساتھ ڈانس کرنا چاہتی ہوں۔ مائیک، پلیز!" اُس کی زبان پر التجا تھی مگر اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں پہلے ہی سے مایوسی کے آنسو تھے۔

"روزی، آئی ایم سوری۔ مجھے لوسی سے ملنا ہے۔"

اور یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

روزی اس کو روکنے کے لئے دروازے تک دوڑی مگر مائیک جا چکا تھا۔ باہر صرف سناٹا تھا اور اندھیرا اور سمندر کی لہروں کا شور جو ایک بے درد ساحل پر اپنا سر پٹک رہی تھیں۔

(۴)

کار مائیکل روڈ پر نئی بنی ہوئی "گلستان" بلڈنگ کی ساتویں منزل پر جمبو پٹیل کی ساری فلیٹ ایر کنڈیشنڈ ہے۔ اس لئے سمندر کی لہروں کا شور اندر نہیں آ سکتا۔ مگر بڑے بڑے شیشوں کی کھڑکیوں میں سے ہر طرف شہر کی روشنیاں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔

"لک، مائی ڈیر (LOOK MY DEAR)"۔ ماڈرن اڈورٹائزرز کے ٹوٹولال کا لانے اس بہانے سے میمی منیر بھائی کے سلیولس بلاؤز سے نکلے ہوئے گداز بازو کو چھوتے ہوئے کہا۔ "اس کھڑکی سے کتنا خوب صورت منظر دکھائی دیتا ہے۔ وہ بائیں ہاتھ کو تو ہے مہالکشمی کا مندر جس کے کلس پر لائٹ لگی ہوئی ہے اور اس سے آگے ہی سمندر سے گھرا ہوا حاجی علی کا مزار ہے . . . . ."

"نیشنل انٹیگریشن! (NATIONAL INTEGRATION —)" ایک آواز ان کے پیچھے سے سُنائی دی۔ چونک کر انھوں نے مڑ کر دیکھا تو گنجا چاچا چُنی لال وہسکی کا گلاس ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ چاچا چنی لال اپنی جوانی کے زمانے میں بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھتا تھا۔ اب وہ اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کی دلالی کرتا ہے۔ مگر اب بھی ہر پارٹی میں وہسکی کے چوتھے پیگ کے بعد وہ خالص "ترقی پسند" انداز میں بات چیت کرنا شروع کر دیتا ہے۔

"قومی یک جہتی کی اس سے اچھی اور روشن مثال کیا ہو سکتی ہے؟" چاچا چنی لال نے وہسکی کا ایک گھونٹ پی کر کہنا شروع کیا۔ "ایک طرف مندر ہے۔ دوسری طرف مسجد ہے۔ مزار ہے۔ اس سے آگے بڑھئے تو مہالکشمی کا مندر یعنی مہالکشمی کا ریس کورس ہے۔ اس کے پیچھے جو روشنیاں آپ کو نظر آ رہی ہیں وہ کپڑے کی ملیں ہیں جو اس وقت رات کو بھی چل رہی ہیں۔ جہاں اتنا نفیس اور مہنگا کپڑا بنا جاتا ہے جسے خود اسے بنانے والے مزدور نہیں خرید سکتے اور ان ملوں کے پیچھے پریل کی وہ چالیں ہیں جہاں اس فلیٹ کے باتھ روم سے بھی چھوٹی چھوٹی کھولیوں میں ان مزدوروں کی بیویاں اپنے شوہروں کا "رات پالی" سے لوٹنے کا انتظار کر رہی ہیں، اور ادھر ریس کورس کی دوسری طرف گندے نالے کے کنارے وہ جھونپڑیاں ہیں جو بیسویں صدی میں ہمیں دنیا کے اس پرانے دور کی یاد دلاتی ہیں جب انسان نے اینٹ پتھر، سیمنٹ، لکڑی اور لوہے کے گھر بنانا نہیں سیکھا تھا۔ مگر یہ سب اس ایر کنڈیشنڈ فلیٹ کے باہر ہے۔ یہاں شیشے کی ان بند کھڑکیوں کے پیچھے نہ مسجد کی اذان سنی جا سکتی ہے نہ مندر کی گھنٹیاں، اور نہ پھولوں سے مہکی ہوئی اس فلیٹ میں اس گندے نالے کی بدبو آ سکتی ہے۔ ہم محفوظ ہیں، مائی ڈیر، بالکل محفوظ! دنیا کی ہر بلا اور بدبو سے محفوظ ہیں۔ آؤ اس سیکیورٹی کے نام سے یہ جام پئیں۔ جلدی پیو۔ کیونکہ ہماری حفاظت محض شیشے کی یہ دیوار رہی ہیں، اور کون جانتا ہے کب دیوانے اپنے پتھروں سے اس کانچ کے قلعے کو توڑ ڈالیں سو ہیراز ٹو یو! (SO, HERE IS TO YOU) . . . . مگر تم لوگ گئے کہاں؟"

اور اب چاچا چنی لال نے دیکھا کہ ٹوٹو اور میمی دونوں موقع پا کر وہاں سے کھسک گئے ہیں اور وہ کھڑکی کے سامنے اکیلا کھڑا اپنا بھاشن دیتا رہا۔

"اچھا تو ہم اکیلے ہی تمھارا جام صحت پیتے ہیں۔"

اور پانچواں پیگ بھی حلق میں انڈیل دیا گیا۔

"سر — !" ایک میٹھی سی سریلی آواز آئی۔ پانچ پیگ وہسکی کے دھند لکے میں سے چاچا چنی لال نے دیکھا کہ ایک غیر ملکی جوان عورت اس کی طرف آ رہی ہے۔

ACC. No. LIBRARY

"کیا میں اپنا تعارف کرا سکتی ہوں؟ میں کیرول اسمتھ ہوں۔ مسز کیرول اسمتھ۔ کل ہی امریکہ سے آئی ہوں؟ مسٹر پٹیل سے میری ملاقات نیویارک میں ہوئی تھی جہاں وہ اپنے نئے ہوٹل کے لئے سامان خریدنے گئے تھے انھوں نے مجھے اس ہاؤس وارمنگ پارٹی میں بلا تو لیا ہے مگر وہ اور مسز پٹیل اتنے مصروف ہیں اور یہاں اتنی بھیڑ ہے کہ ابھی تک کسی سے تعارف نہیں کرایا۔"

چاچا چمنی لال نے اپنے چہرے پر ایک بزرگانہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے جواب دیا۔ "مائی ڈیئر مسز اسمتھ یہ کام میں بڑی خوشی سے کر سکتا ہوں۔ پہلے تو اپنا تعارف کرا دوں ـــ میں ہوں چمنی لال ـــ سب مجھے چاچا چمنی لال کہتے ہیں۔"

"اوہ ہاؤ انٹرسٹنگ! (OH, HOW INTERESTING! ـــ) تو آپ چاچا ڈانس بہت اچھا کرتے ہوں گے؟"

"نو مائی ڈیئر ـــ وہ چاچا نہیں ـــ چاچا ہندوستانی میں انکل کو کہتے ہیں۔ تم بھی مجھے انکل کہہ سکتی ہو۔"

"تھینک یو، انکل اب مجھے بتائیے یہ لوگ جو یہاں جمع ہیں کون کون ہیں؟"

"اوکے، مائی ڈیئر ـــ اپنے میزبان کو تو تم جانتی ہی ہو جمبو کا اصلی نام ہے جشونت ـــ مگر اس کے مٹاپے کی وجہ سے اس کے سب دوست اسے جمبو کہتے ہیں ـــ یہ فلیٹ اس نے ابھی خریدی ہے۔ ڈیڑھ لاکھ کی ـــ جس میں سے پچاس ہزار بلیک کے دیئے گئے ہیں ـــ یہ پارٹی اسی خوشی میں دے رہا ہے۔ اچھا تو جمبو اور اس کی بیوی شمی پٹیل کو تم جانتی ہی ہو ـــ اب وہ لمبا گورا اور تگڑا آدمی جوان سے بات کر رہا ہے وہ لالو مل لگوانی بلڈنگ کنٹریکٹر ہے۔ جس نے یہ بلڈنگ بنوائی ہے۔ اور جس کی جیب میں وہ پچاس ہزار روپے بلیک کی رقم گئی ہے۔ اسی لئے آج اس کے چہرے پر اتنی رونق ہے۔ اس کے ساتھ جو چھوٹے سے قد کی سانولی سی لڑکی شامپین پی رہی ہے وہ نئی نئی نکتر یا ہے جو عورتوں کے ماہوار رسالے "مہارانی" کی اسسٹنٹ ایڈیٹر ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ للوانی نے اس کے لئے بھی ایک فلیٹ بنوائی ہے مگر اس کی قیمت کا حساب کتاب دل ہی دل میں ہو رہا ہے۔ ان کے پیچھے بار کا سہارا لئے جو لوگ کھڑے ہیں ان میں جو سیاہ بالوں والی خوب صورت سی لڑکی ہے وہ ریاست چھوٹا شاہپور کی مہارانی شیلا دیوی ہے۔ جو ایک خوب صورت لڑکی نہیں ہے پینتالیس برس کی خوب صورت بیوہ ہے جس کی بیٹی کی شادی پچھلے برس ہوئی ہے۔ مگر مہارانی ہر تیسرے برس تمھارے ملک امریکہ جاتی ہے۔ اور تمھارے "فیس لفٹنگ" ـــ (FACE LIFTING) کرنے والے ڈاکٹر نہ جانے کیا جادو کرتے ہیں کہ وہ پہلے سے بھی جوان اور خوب صورت ہو کر لوٹ آتی ہے۔ اس سے جو بھورے بالوں والا نوجوان بات کر رہا ہے وہ ایک انگریز فلم ڈائرکٹر ہے جو مہارانی پر بری طرح عاشق ہے اور ہر مہینے شادی "پروپوز" کرتا رہتا ہے۔ اور اس کے برابر میں جو گھونگریالے بالوں والا نوجوان ہے وہ کوئی نوجوان نہیں ہے۔ پچپن برس کا فلم ایکٹر سندر کمار ہے جو میری طرح گنجا ہے اور اس کے گھونگریالے کالے بال اصلی نہیں ہیں نقلی بالوں کی وگ ہے جس میں روز ایک ہیئر ڈریسر پانچ کلپ لگا کر "کرل" (CURL) بناتی ہے اور اس کے برابر میں ۔ ۔ ۔ ۔"

مگر ابھی چاچا چنی لال یہیں تک پہنچے تھے کہ بار کی طرف سے ایک آواز آئی "لیڈیز اینڈ جنٹلمین! وہسکی خلاص اب آپ لوگ رفریجریٹر کا ٹھنڈا پانی پی سکتے ہیں۔"

"شیم! شیم!" (SHAME! SHAME!) چاروں طرف سے آوازیں آئیں اور جمبو پٹیل دوڑتا ہوا بار کی طرف گیا۔ اس کا چہرہ شرم اور غصے اور چھ پیگ وہسکی کے نشے سے لال ہو رہا تھا: "ٹوٹو۔ تم کیا بک رہے ہو؟ میں نے پوری درجن بھر وہسکی کی بوتلوں کا انتظام کیا تھا۔"

"مائی ڈیر جمبو۔ بارہ بوتلیں وہسکی کی ضرور یہاں تھیں۔ دو بوتلیں جن کی، ایک برانڈی کی اور تین بوتلیں شامپین کی بھی تھیں۔ مگر سب ختم ہو گئیں۔ مہمان تم نے زیادہ بلائے۔ اس لئے شراب کم پڑ گئی۔ کوئی بات نہیں، میں اپنے بوٹ لیگر (BOOT LEGGER) کو فون کئے دیتا ہوں...... اس کے ہاں اپنا کریڈٹ کھاتہ چلتا ہے۔"

"ٹوٹو۔ تم میری انسلٹ کرنا چاہتے ہو؟ مگر یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں نے چھ اکسٹرا سکاچ کی بوتلوں کے لئے پہلے سے کہہ رکھا ہے۔ اس نے کہا ہے آج ہی دلّی کے ایوننگ پلین سے اسٹاک آنے والا ہے...."

سندر کمار نے اپنی وگ کے نقلی بالوں کو ایک فلم اسٹاری انداز کا جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ "جمبو ڈارلنگ لگتا ہے۔ تمہارا دلّی کا پلین ذرا لیٹ ہو گیا ہے۔"

مگر ٹینو ٹکم (اس نے کہا۔ "پلین کو کیوں دوش دیتے ہو یار۔ اُسی ایوننگ پلین سے تو دلی سے میں آیا ہوں یہاں اُس پلین میں ایک بڈھا ہارٹ فیل ہو کر مر گیا۔ کہیں وہی تو جمبو کا بوٹ لیگر نہیں تھا؟"

ایک بار پھر سب کو ہنسی کا دورہ پڑا۔

اور اب چاچا چنی لال نے فقرہ کسا۔ "جمبو پیارے۔ وہسکی وِد آؤٹ سوڈا' نہیں تو سوڈا وِد آؤٹ وہسکی ہی پلوا دو۔ پیاس کے مارے دم نکلا جا رہا ہے۔"

اس پر اور بھی زور کا قہقہہ پڑا۔

اور ہر طرف سے جمبو پر بوچھاڑ ہونے لگی۔

"شراب بندی کا نام بہت سنا تھا۔ مگر دیکھی آج ہے۔"

"گورنمنٹ کو چاہئے جمبو کو پروہیبیشن پولیس کا انچارج بنا دے۔"

"پہلے اناج کی راشننگ تھی۔ پھر دودھ کی راشننگ ہوئی۔ اب جمبو نے وہسکی کی راشننگ بھی کر دی۔"

جمبو غصے کے مارے کانپ رہا تھا۔ مگر اسے کوئی جواب نہ بن پڑ رہا تھا آخر کار اس کی بیوی نے کہا۔۔۔ "ڈارلنگ۔ اپنے بوٹ لیگر کو فون تو کرو۔ آخر اتنی دیر کیوں ہوتی؟"

جمبو دوڑ کر فون کے پاس گیا۔ کانپتی ہوئی انگلیوں سے نمبر ملایا۔

"ہیلو.... انکل سوزا.... میں جمبو بول رہا ہوں۔ کہاں ہیں وہ چھ بوتلیں وسکی کی؟.... تمہاری وجہ سے آج میری سخت انسلٹ ہوئی ہے..... تمہارا بھتیجا چلا گیا تو میں کیا کروں؟.... تمھیں خود آنا

چاہیے تھا۔ یا کسی اور کو بھیجئے...... کیا کہا؟...... بوتلیں بھیجی ہیں؟...... اب پہنچتی ہی ہوں گی؟.....
او کے...... تھینک گاڈ —— (THANK GOD)"

اور یہ کہکر اس نے فون رکھا ہی تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی ۔
نوکر سے پہلے جمبو خود وہاں پہنچا۔ دروازہ کھولا تو دیکھا ایک دُبلی سی سوکھی سی سانولی سی سپاٹ سینے کی لڑکی گلابی پھولوں کا فراک پہنے کھڑی ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک کینوس کا بیگ ہے۔

"سر... مسٹر پٹیل کا فلیٹ یہی ہے نا؟ مجھے انکل سوزا... میرا مطلب ہے ڈیڈی نے...."

وہ یہیں تک کہہ پائی تھی کہ جمبو نے اسے تھیلے سمیت اندر گھسیٹ لیا اور گھسیٹتا ہوا ہال میں لے گیا۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ وہسکی آگئی ہے۔ اور انکل سوزا نے خود اپنی بیٹی کے ساتھ بھیجی ہے۔ تھری چیرز فور مس...... مس...... ؟"

"روزی ۔"

" تھری چیرز فور مس روزی ڈی سوزا ۔"

"ہپ ہپ......"

"ہُرّا ۔"

چاچا چینی لال نے روزی کو سر سے پیر تک اپنی نشیلی آنکھوں سے دیکھا، اور پھر بے تکلفی سے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

" روزی — یو آر اے لائف سیور (ROSIE YOU ARE A LIFE SAVAR) تم نے ہماری جان اور جمبو کی عزت بچائی ۔"

اور یہ کہہ کر اُس کو دبوچ کر پیار کر لیا۔

ڈولز چلّایا — جیسے کسی بچے کے ہاتھ میں ایک نیا کھلونا آجائے ——

"چاچا چینی لال وہٹ از اے گڈ آئی ڈیا ۔" (THAT'S A GOOD IDEA)

" سر...... سر...... " روزی ہکلاتی رہی ۔ مگر کسی نے اس کی نہیں سنی۔

ایک طرف وہسکی کی بوتلیں کھلتی رہیں ۔ گلاس بھرے جاتے رہے ۔ سوڈے کے جھاگ اُبھرتے رہے۔ دوسری طرف باری باری ہر شخص روزی کو بے تکلفی سے چومتا رہا ۔ وہ جو گھوڑ دوڑ اور رمی اور فلاشس اور معمولی روزمرہ کی فلرٹیشن (FLIRTATION) سے اکتا گئے تھے ۔ اُن کے لئے یہ ایک نیا کھیل تھا۔

کسی نے کہا: " روزی ڈارلنگ کو بھی وہسکی پلاؤ ۔"

پہلا گلاس کسی نے اسے زبردستی پلا دیا۔ اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کا گلا چاقو سے چیر دیا ہو۔ مگر اگلے لمحے میں اس کے سارے تن بدن میں ایک عجیب گرمی کی لہر دوڑ گئی۔

تیسرا گلاس اس نے مانگ کر پی لیا۔

اس کے بعد وہ گنتی بھول گئی۔

کسی نے ریڈیو گرام پر ریکارڈ لگا دیا تھا۔ اب سب ناچ رہے تھے۔

روزی کو بھی باری باری سب کے ساتھ ناچنا پڑ رہا تھا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ ساری دنیا لٹو کی طرح گھوم رہی تھی۔

ہال کی ساری روشنیاں اب سنگیت کی لہروں پر ناچ رہی تھیں۔

روزی کی رگوں میں خون ناچ رہا تھا۔ گا رہا تھا۔

پھر نہ جانے کب اور کیسے وہ ڈانس فلور پر نہیں تھی ایک بیڈ روم میں تھی۔ اور عین اُس کے سر پر ایک بجلی کا بلب گھوم رہا تھا۔ ناچ رہا تھا۔

پھر وہ گھومتا گھومتا بلب بجھ گیا۔

اب صرف اندھیرا تھا اور رات تھی۔ اور رات کی مضبوط اور سخت باہنیں تھیں۔ جو روزی کے بدن کو لوہے کے ایک شکنجے میں کس رہی تھیں۔

روزی جو اس بے ہوشی میں بھی بڑبڑائے جا رہی تھی۔

"سر...... سر......"

اور ایک وہسکی بھرا ہوا سانس اُس کے ہونٹوں کے قریب آتا جا رہا تھا —— اور قریب —— اور قریب —— یہاں تک کہ اس کا دم گھٹ گیا۔ اور وہ ایک نا قابل برداشت تکلیف کے سمندر میں ڈوب گئی۔ اور اس کے لاشعور سے صرف ایک لفظ نکلا ——

"مائیک —— !"

اور ایر کنڈیشنڈ فلیٹ کے باہر سمندر رات کے سنگ دل ساحل پر اپنا سر پٹختا رہا۔ پٹختا رہا۔

(۵)

سمندر کی لہریں بھی ہوٹل جل ترنگ کے ڈانس بینڈ کی دھن پر ناچ رہی تھیں۔ اوپن ایر ڈانس فلور پر چند نوجوان جوڑے ناچ رہے تھے۔ اور لوگ چاروں طرف لان پر اپنی اپنی میزوں کے گرد بیٹھے چائے دانیوں میں سے وہسکی نکال کر پی رہے تھے۔

باہر ناریل کے پیڑوں کے نیچے ان کی شاندار لمبی چوڑی موٹریں کھڑی تھیں۔

"یہ موٹر کس کی ہے؟" ایک نیچی لمبی لوٹ سیٹر رلینگ کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مائیک نے پوچھا۔

دربان نے کہا۔ "یہ موٹر نواب صاحب جلن پور کی ہے۔"

اور دو منٹ بعد مائیک نواب صاحب جلن پور سے اپنا تعارف کرا رہا تھا۔

"آئی ایم مائیک ڈی سوزا یور ہائی نس (I AM MIKE DE SOUZA YOUR HIGHNESS)"

"بیٹھیے مسٹر ڈی سوزا۔ میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔"

"آپ مجھے اپنی موٹر بیچ سکتے ہیں۔"

"پاگل ہوئے ہو۔ میں اپنی موٹر کیوں بیچنے لگا؟"

"تو مجھے افسوس ہے۔" پھر وہ چلّایا۔ "بوائے ۔۔!" اور جب بیرا بھاگا ہوا آیا۔ "نواب صاحب کا بل لاؤ۔ جلدی۔"

"دیکھو، مسٹر۔ تم کون ہو؟ اور تمھیں میرا بل دینے کی اجازت کس نے دی؟"

"میں آپ کا دوست ہوں، نواب صاحب۔"

اتنے میں بیرا بل لے کر آگیا۔ "ساٹھ روپئے ہوئے ہیں، صاحب۔"

"یہ لو۔" اس سے پہلے کہ نواب صاحب اس کو روک سکتے مائیک نے بٹوے میں سے ہزار کا نوٹ نکالا، اور ٹرے میں پھینک دیا۔

"مگر، سر۔ یہ تو ہزار روپے کا نوٹ ہے۔"

"تو کیا ہوا؟"

"اس کا چینج اس وقت ملنا مشکل ہے، صاحب۔ کوئی چھوٹا نوٹ نہیں ہے؟"

"دیکھتا ہوں۔" اور یہ کہہ کر مائیک نے بے پروائی سے بٹوہ کھولا اور اس میں سے ہزار ہزار کے نوٹوں کا پلندہ نکال کر میز پر ڈال دیا۔

"سوری کوئی چھوٹا نوٹ ہے ہی نہیں۔ مگر کوئی بات نہیں۔ میں چینج کل لے لوں گا۔ نوٹ تم رکھو۔ اچھا تو نواب صاحب، اجازت؟"

"بیٹھو، مسٹر ڈی سوزا۔" اب نواب صاحب کا لہجہ بدل چکا تھا۔ "تم میری موٹر کیوں خریدنا چاہتے ہو؟ اور وہ بھی یہاں اس وقت؟"

"یہ محبت کا معاملہ ہے نواب صاحب۔ شاید آپ نہیں سمجھیں گے۔ مگر موٹر مجھے چاہیے۔ اور اسی وقت ۔۔ بولئے کیا لیں گے آپ؟"

"کبھی بیس ہزار کی تو میں نے لی تھی۔"

"تو لیجئے بیس ہزار۔"

اور اُس نے نوٹ گن کر سامنے رکھ دیئے۔

نواب صاحب نے وہ موٹر سیکنڈ ہینڈ چودہ ہزار کی لی تھی۔ مسکرا کر انھوں نے وہ نوٹ اٹھا لئے۔

"رسید لکھیے کہ موٹر کی پوری قیمت وصول پائی۔"

نواب صاحب نے رسید پر دستخط کر دیئے۔ موٹر کی چابی مائیک کو دے دی۔

"گڈ نائٹ۔ یور ہائی نس۔ تھینک یو۔"

" تھینک یو، مسٹر ڈی سوزا ۔" نواب صاحب نے نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے جواب دیا ۔ " گڈ نائیٹ ۔ "

اور اسی وقت بینڈ کی دھن بدلی ۔ ڈانس فلور خالی ہو گیا ۔ روشنی کا دائرہ لوسی پر پڑا جو مائیکروفون سے ... کھڑی مسکرا رہی تھی ۔ سارا ہوٹل تالیوں کے شور سے گونج اٹھا ۔

انا ونسر نے کہا ۔ " ہوٹل بند ہونے سے پہلے مس لوسی آج کی رات کا اپنا آخری گیت پیش کریں گی ۔"

چاروں طرف سے آوازیں آئیں ۔ " اوہ مائی ڈیر ۔ اوہ مائی ڈوبیر ۔"

لوسی نے مسکرا کر اپنی مخصوص گلوگیر آواز میں گانا شروع کیا ۔ وہ صرف زبان سے ہی نہیں، اپنے کسے ہوئے جسم کے ہر عضو سے گاتی تھی ۔ ہاتھوں کے اشاروں سے، آنکھوں کی جنبش سے، سینے کے اُتار چڑھاؤ سے، کولھوں کے مٹکاؤ سے ۔

اوہ مائی ڈیر ۔	OH, MY DEAR
اوہ مائی ڈیر ۔	OH, MY DEAR
کم ہیر ۔	COME HERE
کم ہیر ۔	COME HERE
اوہ مائی ڈارلنگ "!	OH, MY DARLING

یہ گانا نہیں تھا ۔ ایک اشارہ تھا ۔ ایک دعوت تھی ۔ ایک وعدہ تھا ۔ اور جس ادا سے وہ اسے گاتی تھی سننے والوں اور دیکھنے والوں میں ہر ایک کو یہی محسوس ہوتا تھا کہ یہ گانا اس کے لئے ۔۔ صرف اس کے لئے ۔۔ گایا جا رہا ہے

اور سو جب وہ اپنے ڈریسنگ روم میں پہنچی تو وہاں آدھی درجن پھولوں کے گلدستے اور کارڈ موجود تھے ۔

بڑی شان بے نیازی سے اُس نے کارڈ اٹھا کر پڑھنے شروع کئے ۔

" نواب صاحب جھلن پور ۔"

" مسٹر پھول چند جوہری ۔"

" ٹھاکر سمپورن سنگھ ۔"

" لومن جی کلاک والا ۔"

" مسٹر پیٹر سیمسن ۔"

" مسٹر مائیکل ڈی سوزا ۔"

آخری کارڈ دیکھ کر وہ بگڑ گئی، اور اپنی آیا سے بولی ۔۔

" یہ لوفر پھر آ گیا یہاں ؟ کس نے اجازت دی آنے کی ؟"

" لوسی ڈارلنگ !" اپنی آواز کے ساتھ ہی مائیک کمرے میں گھس آیا ۔ اُس کے ہاتھ میں وسکی کی دو بوتلیں تھیں

" مجھے تمھارے سوا بھلا کس کی اجازت کی ضرورت ہے ؟ میں تو تمھیں تمھارے گھر تک لے جانے کے لئے آیا ہوں ۔ ہوہوے باتیکلہ تک تم اکیلی کیسے جا سکتی ہو ؟

"میں ٹیکسی میں نہیں جاؤں گی ۔ میں آج نواب صاحب جلن پور کے ساتھ جاؤں گی۔"

"تب تو ٹیکسی میں ہی جانا پڑے گا۔"

"کیا مطلب ؟ نواب صاحب کے پاس تو بڑی خوبصورت موٹر ہے۔"

"مطلب یہ کہ موٹر اب نواب صاحب کی نہیں ، میری ہے ۔ آیا۔ جاؤ ۔ سب سے کہہ دو۔ لوسی میم صاحب ڈی سوزا صاحب کے ساتھ جائیں گی ۔ سب لوگ ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے گھر جائیں ۔ اور یہ لو ۔ دو گلاس لاؤ ، اور سوڈے کی چار بوتلیں ــ ۔ ۔ ۔ ۔"

آیا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ــ

"سر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تو ہزار روپے کا نوٹ ہے !"

"تو کیا ہوا ؟ اس وقت تم یہی رکھو ۔ میرے پاس کوئی چھوٹا نوٹ نہیں ہے۔"

"مائیک ڈارلنگ" لوسی نے بڑی میٹھی آواز میں کہا ۔" یہ سب کیا کہہ رہے ہو؟ میرا تو سر گھوم رہا ہے"

جواب میں مائیک نے اس کے گانے کے الفاظ ہی دہرائے ۔

"اوہ مائی ڈیر۔

کم ہیر ۔ ۔ ۔

کم ہیر ۔ ۔ ۔

کم نیر ۔ ۔ ۔ ۔"

(۶)

دو بجے کے قریب ارجن نے اپنی رپورٹیں نیوز ایڈیٹر کو دیں تو پوچھا " کہئے شہر کی کیا خبریں ہیں؟"

نیوز ایڈیٹر نے لوکل نیوز کی رپورٹوں پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا " کوئی خاص خبر نہیں ۔ سچ پوچھو تو بمبئی میں آج کل کوئی سنسنی ہوتی ہی نہیں ۔ ایک تو اس بوڑھے کی موت کی خبر ہے جو ہارٹ فیل ہو کر بلین میں مرگیا ۔ وہ رپورٹ تو تم نے ہی لکھی ہے ۔ سیوری کی جھونپڑیوں میں ایک شکی شوہر نے اپنی بیوی کی ناک کاٹ لی ۔ پریل کے ایک مل میں نائٹ شفٹ میں ایک مزدور کام کرتے کرتے اونگھ گیا ، اور اس کا ہاتھ مشین میں آکر کٹ گیا ۔ اور بس ۔ گورنر کی موجودگی میں مس رجنی بالا کا ڈانس ڈرامہ "شکنتلا" ہوا ۔ وزیر زراعت نے چیمبر آف کامرس کے سالانہ ڈنر میں تقریر کرتے ہوئے اناج کے تاجروں کی قومی خدمات کو سراہا ۔ تاج محل ہوٹل میں پنجراپول کی امداد کے لئے ایک فینسی ڈریس ڈانس ہوا ۔ رات کو بمبئی میں کچھ ہوتا ہی نہیں ۔ بے جان شہر ہے ۔ اے ڈیڈ سٹی" (A DEAD CITY) ــ

(۷)

"ڈیڈ سٹی" روزی نے سوچا ــ" شہر بھی مرگیا ہے ۔ اور میں بھی مرگئی ہوں ۔ یہ سڑکوں کی روشنیاں نہیں ہیں ۔ ان بھوتوں کی چمکتی ہوئی آنکھیں ہیں جو قبرستانوں اور شمشانوں میں منڈلاتے رہتے ہیں ۔ فٹ پاتھ پر چلتے

چلتے اس کو ٹھوکر لگی۔ ٹھٹک کر دیکھا تو وہ سہم گئی۔ میلوں تک لاشوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ مرد، عورتیں، بچے، سب فٹ پاتھ پر پڑے ہوئے تھے۔ بے حرکت بے جان، مُردہ؟ نہ جانے کس جنگ میں یہ مارے گئے تھے کہ آج تک بے گور و کفن آسمان کے نیچے پڑے تھے۔ ڈرتی ڈرتی وہ ان سب لاشوں کے پاس سے گذر کر سڑک کے بیچ میں آ گئی ــــــــ

ایک موٹر آنکھیں چمکاتی ہوئی اس کی طرف آئی اور سَن سے اس کے پاس سے گذر گئی۔ پھر پیچھے سے ایک اور کار ہارن کی آواز کرتی ہوئی آئی اور اس کے اتنے قریب سے گذر گئی کہ روزی کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ ہوا کا جھونکا اس کی روح کو بھی اڑا کر لے گیا۔

مگر اب سامنے سے کیا آ رہا تھا؟ تیز روشنی کی دو لمبی انگلیاں تھیں جو سردی کی رات کی دھند کو چیرتی ہوئی راستہ ٹٹول رہی تھیں۔ نہیں۔ نہیں۔ روزی نے سوچا۔ یہ موٹر کی روشنیاں نہیں ہیں۔ یہ رات کی نورانی بانہیں ہیں جو مجھے اپنی نرم آغوش میں لینے کے لئے آگے بڑھ رہی ہیں۔ ان بانہوں میں ہی میری زندگی ہے۔ میری موت ہے۔ میری نجات ہے۔

اس نے بھی اپنے ہاتھ پھیلا دیئے، اور اس لمحے میں آسمان کے سب چاند اور ستارے آپس میں ٹکرا گئے۔ اور ساری کائنات بلّور کے ان بلّوریں ذرّے بکھر گئے۔

(۸)

"ڈرائیور۔ گاڑی روکو!"

ٹیکسی حاجی علی کے موڑ سے ورلی طرف جا رہی تھی کہ ارجن نے چلا کر اُسے رکوایا۔ بریک لگتے ہی وہ کُودا۔ نہ جانے کیوں اس کو ایک دم یہ محسوس ہو رہا تھا کہ موٹر کے اس حادثے سے خود اس کا بھی کوئی نزدیکی تعلق ہے۔

موٹر کے شیشوں کی کرچیں دور تک سڑک پر پھیلی ہوئی تھیں، اور موٹر خود سڑک چھوڑ کر فٹ پاتھ پر چڑھ گئی تھی۔ اور وہاں ایک بجلی کے کھمبے سے بغل گیر ہو رہی تھی۔ دو پہیے زمین پر تھے اور دو ہوا میں۔ ایک پہیہ اب بھی گھوم رہا تھا۔ اور اس میں سے لتھڑا ہوا خون قطرہ قطرہ کر کے فٹ پاتھ کے پتھروں پر گر رہا تھا۔

پاس ہی ایک پولیس کا سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔

"کیوں حولدار کیا ہوا؟"

"بارہ آدمی مارے گئے صاحب"

"بارہ؟ اتنی چھوٹی سی موٹر میں بارہ آدمی بھرے ہوئے تھے کیا؟"

"نہیں صاحب موٹر میں تو صرف دو تھے۔ ایک صاحب، ایک میم صاحب۔ بڑی خوب صورت میم تھی صاحب، انسپکٹر صاحب بولتے ہیں کسی ہوٹل میں وہ میم گاتی تھی"

ارجن نے کہا۔ "لوسی"

"ہاں صاحب - ایسا ہی نام بولیں تھے - پر وہ صاحب جو تھا نا ایک دم پئیلا تھا - دور سے وسکی کا بھپکا آرہا تھا - صاحب کی پاکٹ میں ہزار ہزار کے آٹھ نوٹ نکلے - کوئی بڑا امیر آدمی ہوگا"۔

ارجن نے کہا "جوزف - اصلی نام مائیکل"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا صاحب ؟"

"حولدار - کبھی کبھی رات اپنے بھید میرے کان میں کھُس پُسا دیتی ہے ——— مگر یہ تو صرف دو ہوئے - اور کون مارا گیا ؟" ———

"ایک تو وہ کرسچین چھوکری تھی، صاحب - سڑک کے بیچوں بیچ چل رہی تھی - وہ موٹر کی جھپیٹ میں آگئی"

"کیسی تھی وہ چھوکری ؟"

"بڑی دبلی سی . . . . . ."

"سانولی سی - بڑی بڑی آنکھوں والی . . . . ."

"ہاں صاحب مشکل سے سولہ سترہ برس کی ہوگی - پر صاحب وہ بھی پئیلی تھی - نہ جانے کہاں سے پی کے اس وقت آرہی تھی - اسی کمبخت کو بچانے کے لئے صاحب نے بریک مارا ہوگا . . . ."

"صاحب نے بریک نہیں لگایا، حولدار - یہی تو زندگی کی ٹریجڈی ہے - مگر باقی لوگ آدمی کون تھے ؟"

"ایک پورا خاندان تھا صاحب جو یہاں فٹ پاتھ پر پڑا سو رہا تھا - ماں - باپ - سات بڑے چھوٹے بچے - کار اُن کو پیستی ہوئی گذر گئی، صاحب - وہ دیکھئے - اب تک ان کا خون پڑا ہے وہاں"

بدھر حولدار نے اشارہ کیا وہاں میونسپلٹی کا ایک آدمی پانی کا نلکہ مار کر فٹ پاتھ کو دھو رہا تھا۔

"کیوں بھائی ؟" ارجن نے پاس جاکر پوچھا "کیا پانی سے یہ خون دُھل جائے گا ؟"

"ہاں، سرکار - خون ہے تو بہت - سو ٹائم لگے گا - پر دھل جائے گا"

"مشکل ہے، میرے دوست - بہت مشکل ہے - یہ خون پانی سے نہیں دھل سکے گا"

ٹیکسی میں بیٹھنے لگا تو ارجن نے دیکھا کہ سمندر اُداس ہے اور لہریں اس سنگین ساحل پر سر پٹخ پٹخ کر ناکام لوٹ رہی ہیں -

(۹)

"اوشا - اٹھو"

"کیا ہوا ؟" ———

"کچھ نہیں - آہستہ بولو - نہیں تو بچے اُٹھ جائیں گے - کچن میں چلو مجھے بھوک لگی ہے"

گیس برانڈے فرائی ہوتے ہوئے چھن من چھن من کر رہے تھے - ارجن نے کہا - "یاد ہے اوشا! شادی کی رات! کہ تم نے مہمانوں کے سامنے شرم کے مارے کچھ نہیں کھایا تھا، اور آدھی رات کو تمہیں بھوک لگی تھی اور ہم نے

انڈے فرائی کر کے کھاتے تھے۔"

"مجھے تو سب کچھ یاد ہے۔"

"اور چوپاٹی پر جو چاٹ کھایا کرتے تھے؟"

اوشا نے مسکرا کر سر ہلایا۔

اور بنارسی پان والے کے مہوبے کے پان؟"

اوشا نے سر ہلا کر کہا۔ "اب تو ان کی خوشبو ہی یاد رہ گئی ہے۔"

"اور مالا بار ہل پر وہ بینچ جہاں ہم بیٹھا کرتے تھے؟"

"اوشا کے گال شرما گئے۔" اب کیوں وہ باتیں یاد دلاتے ہو؟"

"اس لئے کہ کل سے ہم ہر شام کو چوپاٹی کی چاٹ کھایا کریں گے ....."

"اور مہوبے کے پان؟"

"ہاں۔ اور مہوبے کے پان۔ اور پھر مالا بار ہل پر گھومنے جایا کریں گے۔"

"اور تمھارا دفتر کا کام؟"

"وہ بھی ہوتا رہے گا۔ مگر محبت سے بڑھ کر کوئی کام ضروری نہیں ہے۔ اوشا۔"

"یہ پرانا سبق کس نے تمھیں یاد دلایا ہے؟"

"ایک بوڑھے نے جو ساٹھ برس تک بمبئی آنا ملتوی کرتا رہا۔ اور بمبئی پہنچنے سے پانچ منٹ پہلے ہارٹ فیل ہو کر مر گیا۔ اور بمبئی کی رات نہ دیکھ سکا۔ حالانکہ اُس کی جیب میں تیس ہزار روپے تھے۔"

"اور تمھارے پاس کیا ہے؟" اوشا نے مسکرا کر پوچھا۔

"میرے پاس تین روپے ہیں اور . . . ."

"اور ——؟"

"تم ہو! ——"

"پھر؟" ——

"میرے پاس آؤ" ——

"آ گئی" ——

"اور قریب" ——

"تم تو کانپ رہے ہو۔ تمھارا دل بھی زور سے دھڑک رہا ہے۔"

"ہاں، اوشا۔ مجھے رات سے ڈر لگتا ہے۔ مجھے تم اپنی بانہوں میں لے لو۔"

(شمارہ ۱۳۹-۱۴۰ سنہ ۶۳ء)

ابراہیم جلیس

GOVT GIRLS COLLEGE ... ACC. NO. 15221 LIBRARY

آدم خور
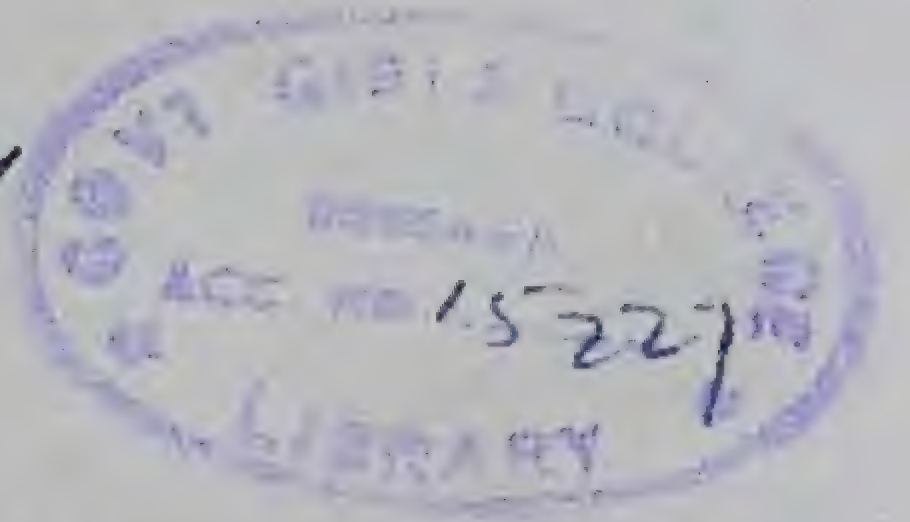
ایک سلیس عام فہم کہانی
۲۰ سال سے زائد عمر کے بچوں کے لئے

کسی زمانہ میں اسی ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ وہ اتنا عادل اور منصف مزاج تھا کہ اس نے کبھی شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پر پانی نہیں پینے دیا تاکہ کہیں پانی پینے کے بہانے شیر بکری کو ہڑپ نہ کر جائے۔ وہ اتنا رعایا پرور تھا کہ اس کی ساری رعایا فلاقے کرتی ننگی رہتی اور بھوکوں مرتی تھی، عام بادشاہوں کی طرح اسے مقبرے اور قبریں بنانے کا بڑا شوق تھا اس کا جمالیاتی ذوق اتنا شستہ تھا کہ اپنی سلطنت کی ساڑھے تین سو خوب صورت پری جمال اور آئینہ رو عورتیں اس کے حرم میں رہتی تھیں، جو ایک ایک دو دو بار شاہی خلوت کی آرائش بنیں اور پھر ہمیشہ کے لئے جوانی کی آگ میں جلنے کے لئے چھوڑ دی گئیں۔ پرانے بادشاہوں کی طرح اسے بھی بڑی اچھی اچھی غذائیں کھانے کا بہت شوق تھا، وہ وقت واحد میں ایک سو آدمیوں کا کھانا کھا جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس کے ہر کھانے پر ایک سو آدمی مر جاتے تھے۔ اپنے آباؤ اجداد کی طرح اس کو بھی ناچ رنگ اور شراب و کباب کا بہت شوق تھا، کباب تو خیر وہ بہت کم کھاتا —— مگر شراب بہت پی جاتا تھا اور اتنی پیتا تھا کہ محل کی ساری عورتوں کے درمیان ننگا ناچا کرتا تھا۔ مگر کسی عورت یا کسی مصاحب یا رعایا میں اتنی مجال نہیں تھی کہ وہ ہنسی تو ہنسی ذراسی مسکراہٹ بھی اپنے ہونٹوں پر لا سکتی۔ کیونکہ وہ بادشاہ تھا۔ یعنی ظل اللہ —— یعنی خدا کا سایہ —— یعنی ....؟

بادشاہ اپنی رعایا کی اس وفاداری سے بہت خوش تھا۔ خوش کیسے نہ ہوتا! جب تک رعایا میں گھٹنے ٹیک کر جھک جانے کی عادت تھی اس وقت تک وہ بادشاہ تھا بادشاہ۔

مگر ایک دن گھٹنے ٹیکی ہوئی رعایا میں سے ایک بوڑھا عالم تن کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور بولا —— نہیں نہیں —— میں بادشاہ کے آگے کیوں اپنے گھٹنے ٹیکوں۔ وہ بھی تو میری طرح ایک انسان ہے۔ اس کے بھی میری طرح ہاتھ پاؤں آنکھ ناک، کان، آنتیں، کہنیاں اور گھٹنے ہیں پھر وہ بادشاہ کیوں اور میں جمال محمد کیوں ہوں —— میں بادشاہ کو

نہیں مانتا۔"

بادشاہ کے مصاحبوں نے جمال محمد عالم کی یہ بات سنی تو دوڑے دوڑے شاہی محل گئے اور سانس روک کر سر جھکا کر عرض کیا: "جہاں پناہ ——— ! جان کی امان پائیں تو عرض کریں"

بادشاہ نے خاص بلغم آلود بادشاہی لہجہ میں فرمایا "حکم ہے"

مصاحبوں نے جمال محمد عالم کی ساری باتیں عرض کر دیں۔ بادشاہ کو بہت غصہ آیا غصہ کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ منہ میں سفید سفید کف آ گیا۔ تھوڑا سا کف اس کی بڑی بڑی مونچھوں پر بھی لگ گیا اور اس نے جانور کی طرح چنگھاڑ کر حکم دیا "جمال محمد کو فوراً پھانسی دے دو۔"

جمال محمد کو اسی شام پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بعد سے رعایا پر بادشاہ کے غصے کی ایسی ہیبت طاری ہو گئی کہ رعایا بادشاہ سے شیطان سے بھی زیادہ ڈرنے لگی۔

پرانے بادشاہوں کی طرح اسے بھی سیر و شکار کا بہت شوق تھا عورتوں اور جانوروں کے شکار میں اس کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بج رہا تھا۔ شکار کے لئے بادشاہ کو ایسی ایسی مصیبتیں اٹھانی پڑتی تھیں کہ بعض بعض اوقات پورا پورا دن مچان پر بیٹھے بیٹھے اس کو جمائیوں کی ڈاک سی لگ جاتی اور تھک کر چور ہو کر وہ افیون کھاتا اور فارسی غزلیں شکار کا ہانکا کرنے والے دیہاتی شکار کو اتنی دیر میں ہانک کر لاتے تھے کہ بادشاہ کو اتنا غصہ آ جاتا کہ اس کا جی چاہتا کہ شکار کے بجائے اپنے ان دیہاتیوں کو گولی کا نشانہ بنا دے۔ لیکن چونکہ وہ دیہاتی بغیر گولیوں ہی کے مرتے جا رہے تھے اور اس کی رعایا بھی، اس لئے بادشاہ اپنے غصے کو دبا لیتا ——— دیہاتی شکار کا ہانکا کر کے شکار کو بالکل اس کے مچان کے قریب لے آتے۔ بلکہ بعض دیہاتی تو شکار کو زخمی بھی کر دیتے تھے تاکہ شکار ادھ موا ہو جائے بلکہ بالکل مر جائے۔ اس کے بعد بادشاہ بندوق اٹھاتا اور ٹھائیں سے شکار کو مار دیتا، شکار اگر ادھ موا ہوتا تو پورا مر جاتا۔ اگر مرا ہوا ہوتا تو دوبارہ مرتا۔

اس کے بعد بادشاہ مچان سے اتر کر نیچے آتا اور شکار کے مردہ جسم پر ایک پاؤں اور بندوق کا کندا ٹیک کر بڑی تمکنت سے کھڑا ہو جاتا ——— شاہی فوٹو گرافر سامنے آ کر جھک کر فرشی سلام بجا لاتا اور ایک دو تصویریں کھینچ لیتا۔ پھر وہ تصویر ملک کے اخباروں میں شائع ہوتی اور ساری دنیا میں غوغا مچ جاتا کہ واہ واہ واہ ———

بادشاہ کے مشغلۂ شکار پر مشہور درباری ادیب رئیس الادبا آغا سر مُز قرمُز نے "تذکرۂ شکار شاہی" کے نام سے ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے۔ اس تصنیف کے باب ہفتم میں صفحہ ۳۶۲ پر آغا سر مُز قرمُز ایک بڑا دلچسپ واقعہ تحریر کرتے ہیں:-

> ایک بار بادشاہ جہاں پناہی کسمنڈو کے جنگلوں میں شکار کے لئے تشریف لے گئے، جنگلی ہاتھی کا شکار مقصود تھا۔ بادشاہ سلامت کے منہ چڑھے مصاحب حضرت شیخ معجونی بندوقیں لئے پہروں چڑھے سے مچان پر متمکن جنگلی ہاتھی کا انتظار کھینچ رہے تھے۔ دوسرے سارے مصاحب اس جنگلی ہاتھی کا ہانکا

کرنے	کرنے جنگلوں میں بھٹک رہے تھے۔ ہاتھی جنگل میں گھومنے کے بجائے اپنی نئی نویلی ہتھنی کے ساتھ مچان سے بہت قریب ایک تالاب میں غسل کر رہا تھا۔ بعد غسل کے وہ ہاتھی ذرا سیر و تفریح کے لئے نکلا تو اچانک اس کی نظر مچان پر پڑی جہاں بادشاہ سلامت اور شیخ معجونی اسی کے منتظر بیٹھے تھے۔ ہاتھی کو بڑا غصہ آیا اور وہ اپنی نئی نویلی ہتھنی پر رعب جمانے کی خاطر حضور بندگان عالی نے بندوق مبارک اٹھائی اور دھاں سے چلادی۔ مگر گولی جیسے مکھی کی طرح بھنبھناتی ہوئی ہاتھی کے کان کے قریب سے گزر گئی۔ ہاتھی کا غصہ بھی ہاتھی ہوگیا، یعنی بہت بڑھ گیا اور وہ اپنے حلق کی ساری رگیں پھلا کر زور سے چنگھاڑا ــــــ اور اپنی سونڈ سے مچان پکڑ لی۔ مچان جھولنے لگا اور لوٹنے کے قریب تھا ادھر بندگان عالی کی بندوق مبارک خالی تھی۔ شیخ معجونی کی بندوق البتہ بھری ہوئی تھی، مگر شیخ معجونی پوچھ رہے تھے:

جہاں پناہ ــــــ حکم ہو تو بندوق چلادوں؟

حضور بندگان عالی ــــــ جان کی امان پاؤں تو گولی ماردوں؟

حضور بندگان عالی کیا حکم دے سکتے تھے۔ کیونکہ حضور بندگان عالی کی پتلون ــــــ خیر اسی اثنا میں ہانکا کرنے والے مصاحب دوڑے دوڑتے آئے اور برچھوں اور بندقوں سے ہاتھی کو مار گرایا۔ اس کے بعد بادشاہ سلامت نے شیخ معجونی کو پھانسی کا حکم دے دیا اور اپنی پتلون دھلوانے کے لئے دریا پر بھیج دی۔

راوی کہتا ہے کہ جب شاہی پتلون دریا پر دھل رہی تھی تو ایک نوجوان طرحدار دھوبن پتلون کو دیکھ کر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ بادشاہ نے اس بدتمیز دھوبن کو بھی پھانسی کے تختہ پر چڑھانے کا حکم عنایت فرمایا۔

اس جنگلی ہاتھی، شیخ معجونی اور طرحدار دھوبن کے شکار کے بعد ریاست کے سارے مشاق شکاریوں نے اپنی اپنی بندوقیں رکھ دیں کہ جب تک بادشاہ سلامت جیسا شکاری موجود ہے ہم میں یہ تاب، یہ سکت، یہ ہمت کہاں ــــــ؟"

بادشاہ سلامت کے شکار کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ عام شکاریوں کی طرح شکاری کتے نہیں پالتے تھے۔ بلکہ شکاری کتوں کا کام وہ اپنے عہدے داروں سے لیا کرتے تھے، جنہیں حضور نے سارے ملک میں پھیلا رکھا تھا۔ یہ شکاری کتے اصلی شکاری کتوں سے زیادہ خوں خوار تھے۔ بڑی بے دردی یعنی چالاکی سے

رعایا کی کمائی اور بہو بیٹیوں کا شکار کرتے تھے۔ غرض کہ بادشاہ کا ملک ملک نہیں تھا بلکہ ایک بہت بڑی شکار گاہ تھا۔
مشہور چینی سفیر فش چاؤ چاؤ اپنے سفرنامے میں تحریر کرتا ہے کہ اس بادشاہ کے زمانے میں فن شکار کو جتنی ترقی ہوئی کسی زمانے میں نہیں ہوئی۔ بادشاہ تو اس فن میں ایسا طاق اور مشاق تھا کہ اکثر اوقات وہ بندوق اور دوسرے ہتھیاروں کے بغیر بھی شکار کھیلا کرتا تھا۔ مثلاً ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک گاؤں کے کسانوں نے خشک سالی کی وجہ سے کھیتوں کا لگان دینے سے انکار کر دیا تو بادشاہ کو بہت غصہ آیا یعنی بادشاہ بہت ہنسا۔ یہ بادشاہ کی خاص عادت تھی، جب اسے غصہ آتا تو وہ زور سے ہنستا تھا اور جب اسے ہنسی آتی تھی تو وہ منہ پھلا لیتا —— آخر کو وہ بادشاہ تھا۔ یعنی ظل اللہ۔ یعنی خدا کا سایہ۔ یعنی......؟

جب بادشاہ کا غصہ تھما یعنی اس کی ہنسی رکی، تو اس نے حکم دیا کہ ان کسانوں کا سارا اناج ضبط کر لیا جائے بادشاہ کے شکاری کتوں نے یعنی عہدہ داروں نے اپنی اپنی دم زور زور سے ہلائی اور پھر سارا اناج اپنی دُم کی جھاڑو سے جھاڑ جھاڑ کر محل مبارک میں پہونچا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس گاؤں کے سارے کسان روٹی روٹی کو ترستے مر گئے جو آدمی کے جینے میں آیا وہ موت کے چنگل سے بچ نہ سکا۔ چھوٹے چھوٹے شیر خوار بچے بلک بلک کر مر گئے۔ نازک نازک عورتیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئیں۔ اس طرح پانچ چھ سو انسان صرف اس لئے مر گئے کہ بادشاہ کو غصہ آگیا تھا۔ بادشاہ کے اس انوکھے غصے کی تصویریں جب ملک کے اخباروں میں چھپیں تو چار دانگ عالم پر بادشاہ کی ہیبت طاری ہوگئی۔

بادشاہ سلامت کے شکار کا سب سے زیادہ پر لطف واقعہ تو وہ ہے —— وہ آدم خور شیر کے شکار کا واقعہ واقعہ یوں ہے کہ جھنڈور کے جنگلوں میں ایک شیر آدم خور ہوگیا تھا اور جنگل کے قریبی گاؤں راج پور کے آدمیوں کو پریشان کرنے لگا تھا اور دس پندرہ آدمی چٹ کر گیا تھا۔

راج پور کے گاؤں کے سب آدمیوں نے چوپال میں بیٹھ کر یہ فیصلہ کیا کہ اس شیر کو مار دینا چاہئے۔ یہ کام گاؤں کے پانچ مشاق شکاریوں کے سپرد کر دیا گیا۔ مگر جب یہ پانچوں نوجوان شکاری بندوقیں برچھے اور تیر کمان لے کر جنگل کی طرف جا رہے تھے تو راستہ میں انہیں سرکاری پیادہ ملا جو شاہی حکم لایا تھا کہ خبردار کوئی اس آدم خور شیر کو نہ مارے —— بادشاہ سلامت خود اس کا شکار کرنے تشریف لا رہے ہیں۔

سارے گاؤں پر اس خبر وحشت اثر سے دہشت پھیل گئی۔ اور پانچوں شکاری اپنے اپنے گھر لوٹ آئے۔
ایک دن گزر گیا بادشاہ سلامت تشریف نہیں لائے۔ مگر ظل الٰہی نے کھیت پر ہل چلاتے ہوئے ایک کسان کو گوشت کر لیا۔

دوسرا دن گزر گیا۔ سواری شاہ نہیں آئی مگر بادشاہ جہاں پناہ ایک ریوڑ ہانکنے والی نوجوان لڑکی کو چیر پھاڑ کر کھا گئے۔

تیسرا دن گزر گیا جہاں پناہ نہیں آئے۔ مگر ڈونگر کے قریب جہاں پناہ نے ایک پردیسی مسافر کو نگل لیا چوتھا دن گزر گیا۔ بندگان عالی کے قدوم میمنت لزوم کے لئے گاؤں بیتاب ہو رہا تھا، مگر بندگان عالی نے

(باقی صفحہ ۷۷۴ پر)

شوکت صدیقی

ابوالہول کا سایہ

انقلابی قوتوں کو جب پوری طرح اُبھرنے کا موقع نہیں ملتا تو وہ زندگی کے لئے زہراب بن جاتی ہیں ——— (لینن)

کرفیو آرڈر کی رات تھی، پت جھڑ کی تیز ہوائیں سسکیاں بھر رہی تھیں اور ویران گلیوں میں کتے رو رہے تھے۔ کیسو، نوا ہوٹل پُراسرار خاموشی میں اونگھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ رقص گاہ کے ہنگامے سرد تھے۔ جام مُنھ اوندھائے پڑے تھے، باورچی خانہ کی چمنی سے اُبھرنے والے دھوئیں کے مرغولوں کا کہیں سُراغ نہیں مل رہا تھا۔ باہر گلی میں کھلنے والی کھڑکی بند پڑی تھی۔ اور تانتیا دیواروں کے گہرے سایوں میں بیٹھا ہوا تھا۔

جب بازاروں کی چہل پہل اُجڑ جاتی اور رات گہری ہو جاتی تو تانتیا اس تنگ سی گلی میں چلا آتا۔ دھوئیں میں اُلجھی ہوئی باورچی خانہ کی پھیکی روشنی کو دیکھتا رہتا اور کھڑکی پر اُبھرنے والے انسانی سایہ کا انتظار کرتا۔ لیکن جب دیر تک کوئی نہ آتا تو وہ جھنجلا کر چلانے لگتا "ابے کیا اپنے باپ کو بھول گئے، سالو! یا انتظاری کب تک ہوگی" اندر باورچی خانہ میں، بیرے ٹھٹھا مار کر ہنستے۔ ادھیڑ خانساماں گردن نکال کر کہتا "ارے مرے کیوں جا رہا ہے۔ کوئی میز تو خالی ہونے دے" تانتیا مطمئن ہونے کے سے انداز میں جھوم کر نعرہ لگاتا "——— واہ کیا بات ہے تیری۔ بھئی جیو مرے راجہ" بوڑھے خانساماں کو راجہ کہلوانے کا ارمان تھا۔ یا پھر کوئی جذبہ ہمدردی۔ یا محض احساس برتری ———! اور یہ ارمان تھا، یا ہمدردی، یا احساس برتری کہ خانساماں کو برابر یہ خیال ستاتا رہتا کہ باہر اندھیرے میں تانتیا بیٹھا ہوا ہے ——— سردی بڑھتی جا رہی ہے۔ اُس کے اُلجھے ہوئے مٹیالے بال اوس میں بھیگتے جا رہے ہیں۔ اُس کی بھوکی آنکھیں کھڑکی کی طرف لگی ہیں ——— وہ ولایتی شراب کی تیز مہک پر جان دیتا ہے اور اُس کی تلخی اُسے مرغوب ہے۔ خانساماں اپنے کام میں اُلجھا رہتا۔ بیرے مستعدی سے آکر آرڈر پر آرڈر سُناتے اور خانساماں کو تانتیا کا خیال ستاتا رہتا۔ رقص گاہ میں قہقہے کھنکتے رہتے۔ ——— آرکسٹرا پر نغمے تھرتھراتے رہتے۔ ——— جام ٹکراتے رہتے۔ پھر کوئی میز خالی ہوتی۔ پھر کوئی بیرا بچی کھچی غذائیں لے کر آتا، بچی ہوئی شراب لے کر آتا۔ اور خانساماں بچی کھچی غذاؤں پر شراب چھڑک دیتا۔ اور کھڑکی پر جا کر کھڑا ہو جاتا۔ تانتیا اس کو دیکھتے ہی جھپٹ پڑتا۔ اور خانساماں اُس کی بے چینی سے لطف اٹھاتے ہوئے کہتا "ابے اس قدر جلدی۔ بٹیا اصلی شراب پڑی ہے۔ یوں تھوڑی ملے گی۔ تانتیا کی گرسنہ آنکھیں جھپکنے لگتیں۔ ہونٹ پھڑ پھڑانے لگتے اور وہ بے تاب ہو کر خوشامد کرنے لگتا "ارے کیوں جلا رہے ہو۔ پیٹ میں آگ لگی ہوئی ہے" اور خانساماں کو جلدی بیروں کے سُنائے ہوئے آرڈر یاد آ جاتے۔ مینیجر کی ڈانٹیں یاد آ جاتیں۔ وہ ٹرے کو تانتیا کے دامن میں اُلٹ دیتا۔ تانتیا خالص فوجی انداز میں اس کو سیلوٹ کرتا۔ مزا لے لے کر ہر چیز کو کھاتا۔

پاس کھڑے کتوں کو دھتکارتا اور خانساماں کو زور زور سے گالیاں دیتا خانساماں بیوقوفوں کی طرح ہنستا رہتا۔ شاید اُسے گالیوں کا بھی ارمان تھا۔

لیکن کھڑکی بند تھی۔ تانتیا چلایا بھی۔ خوشامد بھی کی، گالیاں بھی دیں ـــــ اور بوڑھے خانساماں کو راجہ کہلوانے کا ارمان پیدا ہوا۔ نہ رگِ ہمدردی پھڑکی۔ نہ احساس برتری نے پریشان کیا۔ اور نہ گالیوں پر ہنسی آئی۔ چند گھبرائے ہوئے بیروں کے ساتھ وہ بھی سہما ہوا بیٹھا تھا۔ اور کھڑکی کھل نہ سکی۔ تانتیا نے مایوس ہو کر فرش پر اندھیرے میں ٹٹولنا شروع کر دیا۔ سوکھے ہوئے ٹوسٹ کے کچھ ٹکڑے اُسے مل گئے اور اُس نے منہ میں بھر کر اُن کو چبانا شروع کر دیا۔ باسی مکھن کے کھٹے پن پر اُسے شراب کی تلخی یاد آرہی تھی اور اُس کے نزدیک ہی مریل سا کتا مزے سے ہڈی چچوڑ رہا تھا۔ تانتیا نے جھنجھلا کر اُس کو دیکھا۔ اور جل کر اُس کے ایک لات جمادی۔ یہاں تو بیٹھے ہوئے ترس رہے ہیں اور یہ سالے موج اڑا رہے ہیں ؛ کتا چیختا ہوا بھاگا۔ فلک بوس عمارتوں سے ٹکرا کر اُس کی تیز آواز گونجنے لگی۔ گلی کے نکڑ پر میونسپلٹی کی لالٹین جل رہی تھی۔ اُس کی دھندلی روشنی میں ایک بارگی کئی کانسٹبلوں کے سائے اُبھر آئے۔ کسی نے چیخ کر پوچھا: کون ہے ؟" پھر ٹارچ کی تیز روشنی تانتیا کے جسم پر لہرانے لگی۔ وہ بدحواس ہو کر دوسری سمت بھاگا۔ اور بندوق کی دھڑ دھڑاتی ہوئی آواز گلی کی پُراسرار خاموشی میں شور مچاتی ہوئی اُبھری۔ گولی تانتیا کے پیر کے پاس سے چھلتی ہوئی گزر گئی۔ وہ دیواروں کے اندھیروں میں دبکتا ہوا۔ اس سڑک پر آگیا جو کشادہ بھی تھی اور روشن بھی تھی۔ اور وہ ایک کوٹھی کے باہری ویرانے میں گھس گیا۔ سب دروازے بند تھے۔ کونے والے کمرے کی کھڑکی کھلی رہ گئی تھی۔ وہ اس پر چڑھ کر اندر پھاند گیا اور جھٹ سے کھڑکی بند کر دی۔

اور جب کھڑکھڑاتے ہوئے جوتوں کی بھاری آوازیں دور ہو گئیں ـــ اور باہر سڑک پر سناٹا چھا گیا، تو وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ کمرے میں کسی قدر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اور روشندان سے ہلکی ہلکی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ دیوار کے پاس ایک لمبی سی میز پڑی ہوئی تھی۔ اس پر کچھ کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ کچھ کاغذ پھیلے ہوئے تھے۔ اور سگرٹ کا ایک ٹن بھی نظر آرہا تھا۔ تانتیا اس کو دیکھتے ہی چونک پڑا۔ اور اُسے محسوس ہونے لگا کہ کمرے میں کوئی موجود نہیں۔ گھر میں نہ کوئی آہٹ تھی اور نہ کوئی آواز۔ اور خاموشی بہت گہری تھی۔ اور وہ میز کے پاس چلا گیا۔ سگرٹ کا ٹن اٹھا کر کھولا۔ صرف ایک سگرٹ نکالی اور اُس کو رکھ دیا۔ مگر سگرٹ اُس نے سُلگائی نہیں۔ بلکہ برابر والے کمرہ کا دروازہ کھول کر جھانکنے لگا۔ یہاں بھی کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ اور وہ اس میں چلا گیا۔ اس کمرے میں بھی دھندلی سی روشنی تھی۔ فرش پر پرانے اخبار بکھرے ہوئے تھے۔ دیوار کے پاس دو خالی پلنگ پڑے ہوئے تھے۔ سامنے کھونٹی پر ایک پرانا گاؤن لٹک رہا تھا۔ تانتیا نے اُسے چھو کر دیکھا۔ گاؤن اونی کپڑے کا بنا ہوا تھا۔ اور تانتیا کو سردی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ اُس نے گاؤن کو پہن لیا اور ٹہلتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا، جیسے خواب میں چل رہا ہو۔ اس کمرے میں خوب روشنی ہو رہی تھی۔ اور اُس نے پکارنا شروع کر دیا۔

"ارے کوئی ہے یہاں ـ !!"

"کوئی ہے یہاں ـ ؟"

"کوئی ہے یہاں ؟ ؟"

اور تینوں مرتبہ اُس کی آواز خاموش دیواروں سے ٹکرا کر شکست کھا گئی۔ اور وہ ایک بزم سے صوفہ پر خالی الذہن سا جا کر نیم دراز ہو گیا۔ اس عرصہ میں پہلی بار اُسے محسوس ہوا کہ وہ بہت تھک گیا ہے۔ اس کا جسم سردی سے تھرتھرا رہا ہے۔ اور اُسے

بھوک سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔ اور وہ خوابیدہ نظروں سے آتش دان پر رکھے ہوئے دھات کے یونانی مجسمہ کو دیکھتا رہا۔ پھر ایکا ایکی وہ اٹھ کر آتش دان کے پاس گیا۔ مجسمہ کو اٹھایا اور پھر گھبرا بھی گیا۔ جیسے وہ کوئی آسیبی طاقت تھی جو دھات میں سمٹ کر منجمد ہو گئی تھی۔ اُس نے سہمی ہوئی نظروں سے ہر طرف دیکھا۔ کمرے میں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دیوار کا ہلکا سا سبز رنگ بڑا خوابناک معلوم ہو رہا تھا۔ خاموشی بہت گہری تھی۔ نہ کوئی آہٹ تھی۔ اور نہ کوئی آواز۔ اس کا جسم سردی سے تھر تھرا رہا تھا۔ اُسے آرام کی ضرورت تھی۔ اور وہ ایک دوسرے کمرے میں گھس گیا۔ یہ کمرہ بھی خالی تھا۔ اندھیرا بھی چھایا ہوا تھا۔ باہر کی روشنی کو دروازے پر لٹکتے ہوئے پردے نے روک رکھا تھا۔ تانتیا نے جھنجھلا کر پردے پر ہاتھ مارا۔ اور اُسے نوچ کر فرش پر پھینک دیا۔ روشنی اندر آنے لگی۔ تانتیا مسکرانے لگا۔ اس کمرے میں کوئی پلنگ نہ تھا اور فرش بہت ٹھنڈا تھا۔ دیوار سے لگی ہوئی دو الماریاں کھڑی تھیں اُس نے ایک کو کھولا۔ اندر کچھ میلے کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ اُس نے منہ بگاڑ کر اُن کو بھی باہر پھینک دیا۔ اور الماری کو اطمینان بخش نظروں سے دیکھنے لگا کہ اب اُس کو سردی نہیں لگے گی۔ اب اُس کو آرام مل جائے گا۔ وہ اس میں سو سکے گا۔ اور جیسے یہ الماری اُسی کی ہے۔ یہ کمرہ اُس کا ہے۔ یہ گھر اُس کا ہے۔ اور اُس کا جی چاہا کہ وہ ایک بار پھر سب کمروں میں جائے۔ اُس نے الماری بند کر دی اور اُس میں لگا ہوا آئینہ اُس کے سامنے آ گیا۔ اُس نے اپنا عکس دیکھا۔ اُلجھے ہوئے مٹیالے بال۔ بکھری ہوئی گھنی مونچھیں۔ بے ترتیب سی غلیظ ڈاڑھی۔ اور اس دُھندلے سے چہرے پر چھائی ہوئی وحشت۔ اُس نے خود کو پہچان کر بھی پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اور اُس نے دھات کے یونانی مجسمہ کو کھینچ کر آئینہ پر دے مارا۔ آئینہ جھنجھنا کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اور الماری کے پیچھے سے ایک نو عمر سی لڑکی چیخ کر باہر آ گئی۔

تانتیا نے گھبرا کر پوچھا "کون ہے ری تو؟"

لڑکی سہمی ہوئی بولی "میں ننھو ہوں!"

اور تانتیا کی گھبراہٹ جاتی رہی۔ اُسے خود پر بڑا غصہ آیا کہ وہ اس کمزور سی لڑکی سے اتنا ڈر کیوں گیا۔ اور وہ اُس پر جھنجھلانے لگا "حرامزادی تو یہاں کیا کر رہی تھی" لڑکی اب بھی وحشت زدہ ہو رہی تھی۔

کہنے لگی "میں تو ڈر کر یہاں چھپ گئی تھی"۔

تانتیا نے پوچھا "تو یہاں اکیلی ہی ہے۔ اور کوئی نہیں؟"

اور لڑکی بتانے لگی "ڈاکٹر صاب شام ہی کو چلے گئے۔ میں نے کہا مجھے بھی اپنے ساتھ موٹر میں لیتے چلو۔ پر وہ مجھے کیسے لے جاتے، ہوائی جہاز میں کل دو ہی آدمیوں کی تو جگہ تھی۔" اور یہ کہتے کہتے لڑکی کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت چھا گئی۔ اور وہ کچھ اُداس معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بھی چلے گئے۔ بی بی جی کو بھی لیتے گئے اور بے بی کو بھی لے گئے۔ لڑکی اور اُداس ہو گئی۔

تانتیا نے یونہی غیر ارادی طور پر پوچھ لیا "یہ بے بی کون؟"

لڑکی چہک کر بولی "ان کا ننھا اور کون۔! بہت بھولا بھالا تھا۔ بڑا پیارا سا، بالکل ربڑ کا سا لگتا تھا۔ آؤ تم کو بھی دکھا دوں۔ اور باہر والے کمرے کی طرف مڑ گئی۔ تانتیا خالی الذہن سا اس کے ساتھ ہو لیا۔ اور لڑکی دیوار پر لگی ہوئی ایک خوبصورت سے بچے کی تصویر دکھانے لگی جو سامنے لڑھکتی ہوئی گیند کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر ہنسی تھی اور ہاتھ پھیلے ہوئے تھے لڑکی کہنے لگی "دیکھو کتنا پیارا ہے" اور تانتیا سوچنے لگا کہ بچہ گیند پر لپک رہا ہے۔ اور یہ گیند نہیں ننھو ہے۔ اور ننھو جواب اُس کو نہیں مل سکتی۔ ننھو جواب اُس کے لئے اُداس ہے۔ لیکن بچہ ہنس رہا ہے۔ وہ کیوں اُداس ہو۔ اُس کو کوئی اور ننھو مل جائے گی

اور ایک بارگی اُس نے پاگلوں کی طرح دیوار سے تصویر کھینچی اور فرش پر پٹک دی۔
لڑکی گھبرا کر بولی " یہ کیا کیا تم نے ؟ "
تانتیا ہنسنے لگا :" سالا یہ بھی تو اسی بدمعاش باپ کا بیٹا ہے، جو تجھ کو اس طرح اکیلا چھوڑ کر چلا گیا "
لیکن لڑکی کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ وہ ٹوٹی ہوئی تصویر کو اٹھا کر دیکھنے لگی۔ اور تانتیا غور کرنے لگا کہ واقعی یہ لڑکی بالکل بیوقوف ہے۔ اور اس کا اپنا جسم سردی سے تھر تھرا رہا ہے۔ اور اس کے پیر کے ناسور میں ٹیس ہو رہی ہے ——— اور وہ لڑکی سے کہنے لگا ———
" اے، ذرا سا کڑوا تیل لے آ۔ میں اپنے پیر کے زخم میں لگاؤں گا "
لڑکی اُس کے قریب آگئی۔ " کیا ہوا تمھارے پیر میں "
" ناسور ہو گیا ہے "
لڑکی اُس کے ناسور میں دلچسپی لینے لگی " تو اس کا علاج کیوں نہیں کرواتے "
تانتیا کہنے لگا " بہت تو علاج کروایا۔ ہسپتال میں بھی بھرتی ہو گیا۔ لیکن یہ ڈاکٹر سالے ہوتے ہی بدمعاش ہیں۔ سالوں نے علاج تو کچھ بھی نہیں کیا بلکہ کہنے لگے کہ تم اپنا پیر گھٹنے پر سے کٹوا دو۔ نہیں تو ساری ٹانگ سڑ جائے گی۔ پر میں بھی ایک سیانا نکلا۔ بس جس روز اُنھوں نے آپریشن کا انتظام کیا۔ میں رات ہی کو وارڈ کی کھڑکی پھاند کر بھاگ آیا۔ پھر کسی سالے کے پاس نہیں گیا۔ اپنا تو کڑوے تیل ہی سے کام نکل جاتا ہے "
اور نمّو نے جھٹ سے شلوار چڑھا کر اپنی پنڈلی دکھا دی۔ " دیکھو یہ کتنا بڑا نشان ہے۔ میرا تو اتنا بڑا زخم ڈاکٹر نے اچھا کر دیا "
تانتیا نے نمّو کی سڈول پنڈلی کو دیکھا اور سوچنے لگا کہ اس کا اپنا پیر بڑا گھناؤنا ہے۔ اس پر چیتھڑے لپٹے ہوئے ہیں ناسور سے پانی بہہ رہا ہے۔ اور نمّو کی پنڈلی بڑی خوبصورت ہے۔ اور اس کے چہرے پر کنواریوں کا اچھوتا پن ہے۔ نرمی ہے جوانی سے پھوٹتی ہوئی شادابی ہے۔ اور پھر نمّو، نمّو نہ رہی۔ صرف ایک لڑکی، ایک عورت رہ گئی۔ اور تانتیا سوچتا رہا کہ اس گھر میں سب کچھ اس کا ہے۔ یہ خوبصورت کمرہ بھی، یہ نرم صوفہ بھی۔ یہ لہراتے ہوئے پردے بھی اور یہ نکھری ہوئی سبز دیواریں بھی اور یہ نمّو، صرف ایک لڑکی، ایک عورت۔ اور عورت کو اُس نے کبھی اس قدر قریب محسوس نہیں کیا تھا۔ نمّو نے تانتیا کے چہرے کو دیکھا اس کے چہرے کی وحشت کو دیکھا اور گندی سی آنکھوں کا وہ انداز کہ وہ شرما بھی گئی اور گھبرا بھی گئی۔ تانتیا کی جھنجلاہٹ بڑھتی ہی گئی۔ اُس نے ایک بارگی نمّو کو دبوچ لیا۔ اس کے لباس کو تار تار کر ڈالا۔ پھر تانتیا نے اُس کے رخساروں کو چبا ڈالا۔ اس کے ہونٹوں کو چبا ڈالا اور پھر اُس کی چھاتیوں کو، اس کی گداز باہوں، اور اس کے تمام جسم کو دانتوں سے نوچنا شروع کر دیا۔ نمّو خوف زدہ سی اُس کو دیکھتی رہی۔ پھر چیخنے لگی۔ پھر وہ بیہوش ہو گئی۔
نمّو کا برہنہ جسم فرش پر پڑا رہا۔ اُس کے جسم پر دانتوں کے نشان تھے۔ رخسار نیلے پڑ گئے تھے اور ہونٹوں سے جیتا جیتا خون بہہ رہا تھا۔ وہ بے ہوش پڑی تھی۔ باہر زمستانی ہوائیں سسکیاں بھر رہی تھیں۔ ویران گلیوں میں کتّے رو رہے تھے۔
پھر تانتیا نے نمّو کے برہنہ جسم پر پُرانا گاؤن ڈال دیا اور فرش پر بیٹھ کر سگرٹ سلگانے لگا۔
تانتیا بیٹھا ہوا چُپ چاپ سگرٹ پیتا رہا۔ دھوئیں کے پیچ و خم لہراتے رہے۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی پھر

ایکا ایکی کوٹھی کے پچھلے حصہ پر ملی جلی انسانی آوازوں کا شور ابھرنے لگا۔ لیکن تانتیا اسی طرح اطمینان سے سگرٹ پیتا رہا۔ شور بڑھتا ہی گیا۔ پھر پچھلی دیوار پھاندنے کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ پھر صحن میں قدموں کی آہٹ ابھرنے لگی۔ پھر دروازہ کھول کر وہ اندر آ گئے۔ تانتیا نے اُن کو دیکھا اور خاموش بیٹھا رہا۔ جیسے وہ اُن کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ جیسے وہ اُن کو ہمیشہ سے جانتا تھا ——

پھر ان میں سے کسی نے پوچھا " ابے تو کون ہے ؟ "

تانتیا نے لاپرواہی سے کہہ دیا " تانتیا " اور اُن کی طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ تم نے مجھے پہچانا نہیں پھر انھوں نے جیسے اُس کو پہچان لیا۔ اور وہ ہنسنے لگے۔

پھر انھوں نے نمّو کے متعلق پوچھا " یہ کون ہے ؟ "

" لڑکی ہے "

تانتیا مسکرانے لگا۔ اُس کی مسکراہٹ میں طنز بھی تھا اور بے باکی بھی۔ اور وہ نمّو کے جسم کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ کسی نے گاؤن کو ہٹا دیا اور گھبرا کر بولا۔

" ارے یہ تو بالکل ننگی ہے "

اور سب جھک کر دیکھنے لگے۔

پھر کسی نے کہا " ارے یہ تو مر گئی۔ کیا دیکھ رہے ہو اس کو " ۔ اور وہ سب بکھر کر علٰحدہ ہو گئے۔ نمّو کے جسم پر پھر گاؤن ڈال دیا گیا۔ اور وہ تجسس انگیز نظروں سے ہر طرف دیکھنے لگے۔ پھر کوئی بول اٹھا " ڈاکٹر، سالا، سب کچھ لے گیا۔ اب یہاں کیا دھرا ہے " اور وہ تانتیا کی طرف دیکھنے لگے۔

" ابے تو یہاں کیا کر رہا ہے ۔ سالے کیا تو بھی جل جانا چاہتا ہے "

اور ایک آدمی نے بڑھ کر اُسے دھکا دیدیا " چل بھاگ یہاں سے " تانتیا نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور بڑی بے تکلفی سے کہنے لگا۔

" تو مار کیوں رہے ہو۔ سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے ۔ میں کوئی یہاں بیٹھا رہوں گا " پھر وہ کوٹھی میں سے نکل کر باہر آ گیا۔ سڑک پر آکر تانتیا نے محسوس کیا کہ سڑک وہی ہے۔ جھلملاتی ہوئی روشنیاں وہی ہیں اور سامنے ڈاکٹر کی کوٹھی بھی وہی ہے۔ اور یہ کوٹھی اُس کی نہیں ہو سکتی۔ کمرہ اس کا نہیں ہو سکتا۔ نرم نرم صوفہ اُس کا نہیں ہو سکتا۔ لہراتے ہوئے پردے اُس کے نہیں ہو سکتے۔ وہ صرف تانتیا ہے۔ گاؤن اُس نے نمّو کو اُڑھا دیا تھا، دھات کا یونانی مجسمہ پھینک دیا تھا اور سگرٹ ختم ہو چکی تھی۔ پھر ڈاکٹر کی کوٹھی میں سے دھواں نکل کر پھیلنے لگا۔ شعلے اُبھرنے لگے۔ دروازے جلنے لگے اور لکڑیاں چیخ چیخ کر شور مچانے لگیں۔ پھر کوٹھی میں نمّو کی گھٹی ہوئی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ تانتیا کوٹھی کی طرف پلٹ پڑا۔ نمّو ابھی زندہ تھی۔ اور نمّو ابھی اُس کو چاہیئے بھی تھی۔

تانتیا شعلوں سے اُلجھتا ہوا۔ دھوئیں میں ٹھوکریں کھاتا ہوا، کوٹھی میں گھس گیا۔ پھر نمّو کے پاس چلا گیا۔ اور نمّو اس کو دیکھتے ہی چمٹ گئی۔ اور وہ اُسے لے کر باہر نکلنے لگا۔ اُس کے چاروں طرف گہرا نیلگوں دھواں پھیلا ہوا تھا۔ بھڑکتے ہوئے شعلے اُس پر لپک رہے تھے۔ لکڑیاں چیخ چیخ کر گرتیں تو چنگاریاں دور دور تک بکھر جاتیں۔ اور جب وہ باہر سڑک

آیا تو اُس کا چہرہ بُری طرح جھُلس گیا تھا۔ داڑھی جل کر اور بھیانک ہوگئی تھی۔ نمّو نے آنکھیں کھول کر اُس کو دیکھا۔ اور تانتیا کہانیوں کے آسیبی بھوت کی طرح اس کو بھیانک معلوم ہوا۔ اُس نے سہم کر پھر آنکھیں بند کرلیں۔ اور تانتیا اُس کو لئے ہوئے دیواروں کے کنارے کنارے چلنے لگا۔

تانتیا دیواروں کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ اُس کے چہرے پر جلن ہو رہی تھی۔ اور نمّو بازوؤں سے چمٹی ہوئی تھی پھر ایک پولس کی لاری اُس کے پاس سڑک پر آکر رُک گئی۔ کچھ کانسٹبل اُتر کر نیچے آئے اور اُس کو ٹھہرالیا۔

"یہ کہاں سے آرہا ہے؟"

اور تانتیا نے نمّو کو سامنے کردیا "میں تو اس لڑکی کو بچا کر لا رہا ہوں۔"

اور اُنھوں نے گاؤن کو اٹھا کر دیکھا۔ نمّو کی آنکھیں کھُلی ہوئی تھیں۔ وہ سہمی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اور تانتیا نے جھٹ سے اُن کا ہاتھ ہٹا دیا۔ "اسے اس کو نہ کھولو۔ یہ بالکل ننگی ہے۔" اور وہ ہنسنے لگے۔

"تو سالے اس کو لئے کہاں جا رہا ہے۔"

تانتیا نے تعجب سے کہا۔ "کیوں؟"

وہ اور کھِل کے ہنسنے لگے۔ اُن کی ہنسی بڑی طنز آمیز تھی "ابے" اس کو کھڑا تو کر" اور تانتیا نے نمّو کو فٹ پاتھ پر کھڑا کردیا۔ نمّو بالکل خاموش تھی اور تانتیا بھی۔ کانسٹبل نمّو کو دیکھتے رہے۔ پھر اُنھوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے ایک طرف کردیا۔ یہ ہمارے ساتھ لاری میں جائے گی۔ یہ رفیوجیز کیمپ میں رہے گی" اور وہ نمّو کو اپنے ساتھ لے کر چلنے لگے۔ تانتیا کہتا ہی رہا۔

"یہ میرے پاس رہے گی۔ میں نے اس کو آگ میں سے نکالا ہے۔ اسے میرے پاس رہنا چاہیے۔"

کانسٹبل نمّو کو لے کر لاری میں بیٹھ گئے۔ لاری آگے چل دی۔ تانتیا دور ہوتی ہوئی لاری کو دیکھتا رہا۔ لاری دُور ہوتی گئی۔ نمّو دور ہوتی گئی۔ نمّو جس کا جسم لہراتے ہوئے پردوں کی طرح نرم تھا۔ جس کے چہرے پر کنواریوں کا اچھوتا پن بچا نرمی تھی اور جوانی کی پھوٹتی ہوئی شادابی تھی۔ نمّو صرف ایک لڑکی، ایک عورت، جسے اُس نے اپنے قریب محسوس کیا تھا۔ جسے اُس نے چھو کر دیکھا تھا۔ لاری اندھیروں میں اوجھل ہوگئی۔ پھر اُس نے غصّہ سے فرش پر تھوک دیا۔ اور خود بھی سڑک پر چلنے لگا۔

تانتیا سڑک پر چلتا رہا۔ مگر وہ جاتا بھی کہاں۔ سامنے مکان جل رہے تھے شعلے لہرا رہے تھے۔ اور دردناک انسانی چیخیں اُبھر رہی تھیں۔ وہ آگے نہ گیا اور ایک نیم کشادہ سڑک کی طرف مڑ گیا۔ یہ سڑک ویران بھی تھی اور تاریکی بھی پھیلی ہوئی تھی۔ مگر اس پر بھی وہ زیادہ دور تک نہ چل سکا اور ایک تنگ سے بدرو میں گھُس گیا۔ یہاں اندھیرا بھی تھا اور کیچڑ بھی تھی۔ اور بدبو کا تیز بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ماچس کو جلا کر دیکھا کہ وہ کیچڑ میں کھڑا ہوا ہے۔ اُس کے قریب ہی ایک برہنہ انسانی لاش پڑی ہوئی ہے۔ لاش پھول کر اکڑ گئی تھی۔ زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ آنکھیں پھٹ کر بھیانک ہوگئی تھیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں کہ دیکھو مجھے کس بے دردی سے قتل کردیا گیا۔ میں نے انتقام نہیں لیا۔ مجھے انتقام لینا چاہئے تھا۔ اور وہ وہاں سے ہٹ کر دوسری طرف جہاں زمین ذرا خشک تھی وہ اس پر بیٹھ گیا۔

وہ اندھیرے میں بیٹھا ہوا سوچتا رہا کہ اُس کے چاروں طرف تاریکی ہے، کیچڑ ہے اور پاس ہی ایک لاش سڑ رہی ہے

جس کی زبان باہر نکل آئی ہے۔ اور آنکھیں پھٹ کر بھیانک ہو گئی ہیں۔ باہر تیز ہوائیں سسکیاں بھر رہی ہیں۔ مکان جل رہے ہیں۔ اور دردناک چیخیں اُبھر رہی ہیں ـــــ پھر ایک آدمی گھبرایا ہوا سا بدرو کے سامنے آکر ٹھہر گیا۔ تانتیا اُسے دیکھتا رہا۔ لیکن جب وہ اندر آکر لمبی لمبی سانسیں بھرنے لگا تو تانتیا کہنے لگا۔

"وہاں کیچڑ میں کیوں کھڑے ہو۔ ادھر آجاؤ۔ یہاں زمین صاف ہے۔"

وہ آدمی خوف سے چیخ پڑا "تم کون ہو؟"

تانتیا کو ہنسی آگئی "میں کوئی بھی ہوں کیچڑ میں کھڑا ہونا ہے تو وہیں کھڑے ہو نہیں تو ادھر چلے آؤ۔"

اور وہ آدمی چپ چاپ اُس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ پھر ذرا ہی دیر بعد اُس نے سرگوشی کے سے انداز میں پوچھا:۔

"تم ہندو ہو یا مسلمان؟"

تانتیا بے اختیار ہنس پڑا "میں کوئی بھی ہوں۔ ابے ہندو مسلمان کے بچے پہلے یہ بتا کہ کچھ سگرٹ وگرٹ بھی ہے کہ نہیں؟" ـــــ وہ آدمی ناگواری کے سے انداز میں کہنے لگا "نہیں میرے پاس سگرٹ نہیں ہے۔ نہ جانے کس طرح تو جان بچا کر بھاگا ہوں۔ تمھیں سگرٹ کی پڑی ہے۔"

اور تانتیا اسی طرح ہنستا رہا۔ اس آدمی کی بات سے وہ ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ بے تکلفی سے کہنے لگا "ابے جا بے تو بھی یونہی رہا" مگر وہ آدمی خاموش بیٹھا رہا۔ تانتیا کی اس بے تکی ہنسی پر اُسے جھنجھلاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ لیکن تیز بدبو سے گھبرا کر اس آدمی نے پوچھا "یہاں تو بڑی بو آرہی ہے۔"

تانتیا نے ماچس جلائی اور سڑتی ہوئی لاش کو دکھانے لگا "دیکھو یہ کوئی مرا ہوا آدمی سڑ رہا ہے" اور وہ آدمی خوف زدہ ہو کر تانتیا کے قریب سرک گیا۔ اور سہمی ہوئی آواز میں بولا "ہا! بیچارہ۔"

اور تانتیا اسی طرح بے نیازی سے کہنے لگا "یار دکھ تو مجھ کو بھی ہو رہا ہے۔ پر یہ سرکار بھی سالی بڑی اُلّو کی پٹھی ہے اتنا گوشت سڑ کر بیکار ہی تو چلا گیا۔ یہی پچھلی جنگ کی بات ہے۔ ہم لوگ برما کے جنگلوں میں لڑ رہے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ جاپانیوں نے ہیڈ کوارٹر والی سڑک بمباری میں تباہ کر دی۔ ہم لوگوں کو راشن ملنا بند ہو گیا۔ بس پوچھو نا کہ کیا بیتی۔ ہم لوگوں نے سامان لے جانے والی گاڑیوں کے خچروں کو مار کر کھانا شروع کر دیا۔ پر یار خچر کا گوشت بہت خراب ہوتا ہے سالا ہضم ہی نہیں ہوتا تھا۔ پھر ہوائی جہازوں پر سے ہمیں راشن پھینکا جانے لگا۔ اس میں ہمیں ایسا گوشت ملتا تھا جسے سکھا کر ڈبوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ سچ کہتا ہوں کیا مزے کا گوشت ہوتا تھا۔ اب تمھیں بتاؤ کہ روز جو اتنے بہت سے آدمی بلوے میں مر رہے ہیں۔ دیکھو کتنا گوشت بیکار جا رہا ہے۔ سرکار اسے سکھا کر کیوں نہیں رکھ لیتی۔ کال کے دنوں میں کتنا کام دے گا۔ پھر کال تو یوں بھی پڑ رہا ہے کتنے ہی بھوکوں کا بھلا ہو جائے گا۔ کہو کیسی کہی" اور تانتیا نے اس کی پیٹھ پر زور سے ہاتھ مارا "ابے تو تو بڑا تگڑا معلوم ہوتا ہے تو مرے گا تو بہت سا گوشت نکلے گا۔ اور ڈھیر بھر چربی بھی نکلے گی" اور وہ آدمی وحشت زدہ ہو کر ایک بارگی اُچھل پڑا۔ اُس کی آواز روپوں کی کھنک سے جھنکار اُٹھی۔ تانتیا نے جھٹ سے اُس کی گردن دبوچ لی۔

"ابے تیرے پاس تو بڑی رقم معلوم ہو رہی ہے۔ لا، نکال۔"

وہ آدمی گھٹی ہوئی آواز میں کہنے لگا "میری گردن تو چھوڑ دو" تانتیا نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ کہنے لگا ـــــ

"مجھ ستائے ہوئے کو ستا کر تمھیں کیا ملے گا۔"

تانتیا مسکرا کر بولا "ابے سیدھی سی تو بات ہے۔ رقم ہاتھ لگے گی اور کیا؟" اور وہ اس آدمی کو ڈھکیل کر اس کے سینہ پر چڑھ بیٹھا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے گلا دبا کر بولا "سیدھی طرح نکالتا ہے یا گھونٹ دوں گلا۔" وہ بدحواس ہو کر بتانے لگا۔ "سب کچھ اندر کی جیب میں ہے۔ نکال لو" اور تانتیا نے اُس کی جیبیں ٹٹولیں۔ نوٹ نکالے، چاندی کے روپے نکالے اور ریزگاری تک نکال لی۔

وہ آدمی خوشامد کرنے لگا "میرے پاس کچھ تو چھوڑ دو۔"

تانتیا مطلق نہ پسیجا۔ بڑی بے باکی سے کہنے لگا "ابے جا، بہت دنوں سالے تم نے ٹھاٹھ کئے ہیں۔ کچھ دن یونہی سہی" اور وہ آدمی اُداس سے لہجہ میں اپنی مصیبتیں بیان کرنے لگا "تمہارے دل میں ذرا بھی رحم نہیں۔ میرا گھر جل رہا ہے سب کچھ لُٹ گیا۔ بیوی کو بھی مار ڈالا۔ بچوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اور میری جوان لڑکیوں کو بھگا کر لے گئے۔ اب میرے پاس رہ ہی کیا گیا۔ عزت تھی وہ بھی برباد ہو گئی۔"

تانتیا اس کو مطمئن کرنے کے سے انداز میں کہنے لگا "ابے تو اس میں گھبرانے کی کیا بات۔ تیری لڑکیوں کو کوئی نہ کوئی تو لے ہی جاتا۔ کوئی اور نہ لے گیا۔ وہی لوگ لے گئے۔ اس میں بُرائی کیا ہے؟"

وہ آدمی چُپ ہو گیا۔ اُسے تانتیا سے بڑی نفرت ہو رہی تھی۔ وہ یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ مگر اُسے اپنی جان پیاری تھی۔ اور وہ وہیں بیٹھا رہا۔ تانتیا نے اس کو پھر چھیڑا "ابے چُپ کیوں بیٹھا ہے کچھ باتیں ہی کر۔" اور وہ آدمی جھنجھلا کر کہنے لگا "تم نے آج تک لوگوں کو دُکھ ہی پہنچایا ہے۔ یا کچھ اور بھی کیا ہے۔"

تانتیا تلملا اٹھا۔ جیسے کسی نے اس کا ناسور چھیڑ دیا تھا۔ بگڑ کر کہنے لگا "میں نے کیا کیا ہے۔ ابے میں نے چلچلاتی دھوپ میں سڑکوں پر محنت کی ہے۔ کڑکڑاتی سردیوں میں پہرہ داری کی ہے۔ میں نے فوج میں بھرتی ہو کر گولیاں کھائی ہیں۔ میں نے چوریاں کی ہیں۔ میں نے جیل کاٹی ہے۔ میں نے مار کھائی ہے۔ میں نے گالیاں کھائی ہیں۔" تانتیا تیزی سے کہتے کہتے ایکبارگی اُداس ہو گیا "اور اب میں بھوکوں مرتا ہوں۔ شرابیوں کا بچا کھچا کھانا کھاتا ہوں۔ گوشت کے ایک، ایک ٹکڑے کے لئے کتوں سے لڑتا ہوں۔ اور اس سردی میں سنسان سڑکوں پر ٹھٹھرتا پھرتا ہوں۔ بتاؤ اُستاد تم نے بھی یہ سب کچھ کیا ہے۔ اور نہیں تو تمہاری ایسی کی تیسی" اور تانتیا نے کس کے اُس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ "سالا اُلو کا پٹھا خواہ مخواہ رعب جھاڑتا ہے۔"

وہ آدمی سہما ہوا خاموش بیٹھا رہا۔ مگر تانتیا اس بدرو سے اُکتا چکا تھا۔ اُس آدمی سے اُکتا چکا تھا۔ اس اندھیرے سے اکتا چکا تھا۔ اور وہ بدرو سے نکل کر باہر سڑک پر آ گیا۔ خزاں کی شوریدہ سر ہوائیں سسکیاں بھر رہی تھیں۔ رات اور گہری ہو گئی تھی۔ ویران عمارتوں کی پشت پر گہری زرد چاندنی دم توڑ رہی تھی۔ پت جھڑ کے مارے ہوئے خشک پیڑ تارِ عنکبوت کی طرح اُلجھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اور تانتیا انھیں درختوں کے لرزتے ہوئے سایوں تلے چلنے لگا۔ خشک پتے اُس کے قدموں کے نیچے آسیبی سرگوشیوں کی طرح چرمرا رہے تھے۔ اور اس کی پشت پر اُبھرنے والی دردناک انسانی چیخیں مدھم ہو تی گئیں۔ سنسان سڑک پر اُس کا مہیب سایہ بھوتوں کی طرح جھومتا رہا۔ وہ اسی طرح بلا مقصد چلتا رہا۔۔۔۔ پھر ایک موڑ پر سے کسی نے اُس کو ٹوکا۔

"کون آ رہا ہے؟"۔۔۔۔

تانتیا نے گھبرا کر دیکھا۔۔۔ ایک فوجی سپاہی بندوق سنبھالے ہوئے اُس کی طرف آ رہا تھا۔۔۔ تانتیا پلٹ کر دیوار سے لگ

سایوں میں دیکھنے لگا ۔ وہ چیخ کر بولا " ہے ٹھہر جاؤ! " مگر تانتیا نے اپنی چال اور تیز کر دی ۔ پھر بندوق کی تیز آواز سنسان سڑک پر دھڑکنے لگی ۔ اور گولی تانتیا کی پسلیوں کو توڑتی ہوئی گزر گئی ۔ وہ فرش پر گر پڑا اور سپاہی اُس کے قریب آ کر ٹھہر گیا ۔

تانتیا نے اُس کی طرف دیکھا، پھر کراہتے ہوئے کہنے لگا " جوان تمھارا نشانہ بہت اچھا ہے ۔ کبھی میں بھی اتنا سچا نشانہ مارتا تھا ۔ پر ان چیزوں کی کون قدر کرتا ہے ۔ جنگ ختم ہو گئی اور میرا حال تم دیکھ ہی رہے ہو " اور تانتیا نے اُنگلیوں میں دبے نوٹ، روپے اور ریزگاری، سب کچھ سڑک پر پھینک دیا ۔ سپاہی بندوق کے سہارے جھکا ہوا حیرت سے اُس کو دیکھتا رہا ۔ تانتیا اُس کی بے نیازی پر جھنجھلا اُٹھا ۔ تیزی سے بولا " ابے دیکھ کیا رہا ہے! اس کو اٹھاتا کیوں نہیں ـــ سالے اکڑتا کیوں ہے ۔ کہیں ایک دن تیرا بھی یہی حال نہ ہو ۔ ابے اُس وقت یہ رقم کام آئے گی تو مجھ کو یاد کرے گا " اور سپاہی نے اُس کے ایک لات ماری اور روپیہ اٹھا کر چل دیا اور تانتیا کے زخموں سے خون بہتا رہا ۔ اُس کا جسم سنسان سڑک پر پھڑکتا رہا ۔ زمستانی ہوائیں سسکیاں بھرتی رہیں اور ویران گلیوں میں کتے روتے رہے ۔

یہ کرفیو آرڈر کی رات تھی، فسادات کی رات تھی، تانتیا کی زندگی کی آخری رات تھی ـــــــ لیکن اُس کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں ابھی تک بھوک زندہ تھی ـــــ

(شمارہ ۳ ـــ ۱ سنہ ۴۹ء)

نورا

(صفحہ ۱۷۲ سے آگے)

اُس کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی جس کے بعد نورے نے کہا ۔ " وہ دن اور آج کا دن میرا تو کوئی سگا نہیں بنتا ۔ اور آج فرد کا کہہ رہا ہے ـــــ " جا تیرا خانہ خراب ہو! ـــــ میں اپنے دوست کے لئے کیا نہیں کرتا ـــ کمینے سے کمینہ کام بھی کرتا ہوں ـــــ اور جب میرا کوئی دوست مجھے چھوڑتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ یہ سب بھیّا بلاقی کی بد دعا کا اثر ہے ـــــ! "

رفیق، داؤد، اسینین اور میں چاروں نے یہ بات سُنی ۔ اور دم بخود ہو کر رہ گئے ۔ اسے نورا کہتے ہیں ـــ داؤد بولا اسینین نے گہری سوچ سے سر اٹھایا اور بولا ۔

" اپنی دق سے مرتی ہوئی ماں کی میں نے خدمت کی ـــ اور مرنے سے پہلے اُس نے کہا ـــ جا بچہ! تو زندگی میں بڑا سُکھ پائے گا ـــ " اور اسینین نورے کے ہی انداز میں بولا ـــــ وہ دن اور آج کا دن، جب کوئی پر مسرت لمحہ میری زندگی میں آتا ہے ـــــ میں سمجھتا ہوں کہ یہ میری ماں کی دُعائے خیر کا اثر ہے ـــــ! "

رفیق بولا ـــــ لوگوں کو منہ سے بات نکالتے ہوئے کچھ سوچ لینا چاہیے ـــ تم نہیں جانتے مجھ جیسے یور متھینگ " کے لئے ایک معمولی سا فقرہ کیا معنی رکھتا ہے ـــــ اُس وقت داؤد اور میں خاموش تھے ـــــ شاید ہم بھی اپنے ماضی کی راکھ میں چند سلگتے کوئلوں کو اُتھل پتھل رہے تھے ـــــ

(شمارہ ۲ ـــ ۱ سنہ ۵۱ء)

ہاجرہ مسرور

صندوقچہ

وقت کچھوے کی چال چلتا معلوم ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے ملکہ بیگم نے تھپک تھپک کر بچوں کو سلایا تھا لیکن ان کی ساس کی عشاء کی نماز طول کھینچتی جا رہی تھی اور محمود میاں تو جیسے آج سارے سال کی پڑھائی ختم کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھے تھے حد یہ کہ مسعود میاں ابھی تک اپنی بیکاری کے غم میں مع اپنی امریکی بشرٹ کے غائب تھے اور اسی تاؤ میں ان کی نئی نویلی دلہن اپنے کمرے میں خدا جانے کیا اٹھا دھری کر رہی تھیں۔

"مسعود میاں پر دھونس جمانے کو اپنا جہیز سمیٹ رہی ہوں گی۔ دلہن بیگم ——— خوب ہیں آج کل کی لڑکیاں، سمجھتی ہیں اس طرح میاں قابو میں آجائے گا" ملکہ بیگم نے اپنی سب سے چھوٹی بچی کے منہ سے دودھ نکالتے ہوئے سوچا: "اونھ! یہ سارے ہتھکنڈے بھول جائیں گی بنّو۔ ابھی نئی نئی ہیں۔ اس لئے مسعود میاں جھک مار کر منا لیتے ہوں گے۔ بیچاری جہیز پر اترا رہی ہیں۔ ارے ہم اتنا لاتے تھے کہ گھر بھر گیا تھا۔ اس پر بھی کسی نے ٹھینگے پر نہ مارا ہمیں۔"

مسعود میاں کی دلہن کے انجام کے بارے میں سوچ کر ملکہ بیگم کو ایک گونہ مسرت ہوئی۔ اپنے جلے ہوئے گھر کے ملبے پر بیٹھ کر جلتی ہوئی دنیا کا تماشہ دیکھ کر کلیجے میں ٹھنڈک نہیں پڑتی تو ہوک بھی نہیں اُٹھتی۔

"مگر آج یہ سب سوتے کیوں نہیں؟" ملکہ بیگم نے جماہیوں پر جماہیاں لے کر جھنجھلاہٹ میں سوچا: "سبھوں کے کام ہی کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتے۔ توبہ ——"

چوکی کے گھنٹے نے دس بجاتے ملکہ بیگم نے اپنی جلتی اور بند ہوتی ہوئی آنکھیں چیر کر ہر طرف دیکھا۔ ساس عشاء کی نماز ختم کر کے پاندان کھولے پلنگ پر براجمان تھیں۔ محمود میاں کے سرہانے بجلی کا لیمپ اسی طرح روشنی بکھیر رہا تھا اور وہ اپنی اسکول کی کاپی میں عورتوں کی تصویروں والی کتاب رکھے پڑھے چلے جا رہے تھے۔ دلہن بیگم کا کمرہ بھی ابھی تک روشن تھا۔ خدا جانے ایسی سڑی گرمی میں کمروں کے اندر بیٹھ کر میاں کا انتظار کرنے میں لوگوں کو کیا مزا آتا ہے۔ ارے باہر پلنگ پر پڑ کر انتظار کریں تاکہ انتظار سے تھکیں تو ذرا سو لیں، اور پھر ملکہ بیگم چپکے سے اٹھ کر۔

ملکہ بیگم کی بے تابی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ سوتی اس خیال سے نہ تھیں کہ ایک بار آنکھ لگ گئی تو پھر چاہے ڈھول بجے، دن بھر کی مصروفیت سے ٹوٹا ہوا جسم کروٹ تک نہیں لینے کا۔ پھر تو صاف بات ہے کہ آج کا موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔

" خدا سمجھے مسعود میاں سے ۔ آ ہی نہیں چکتے، اتنی رات گئے نہ معلوم کن دفتروں کی خاک چھان رہے ہیں۔ ہائے کس مزے سے لوگ سوتے ہیں، ایک ہماری قسمت میں چین کی نیند بھی نہیں " انھوں نے گردن گھما کر اپنے شوہر منظور میاں کی طرف دیکھا جو اپنی راج کپور ٹائپ مونچھوں کے نیچے چوڑے چوڑے دانتوں والا منھ کھولے خراٹے لے رہے تھے ۔

چوکی کے گھنٹے نے اب کے گیارہ بجائے ۔ مگر اس سے پہلے ہی مسعود میاں آ چکے تھے اور اپنی دلہن سے کمرے کے اندر ایک معرکہ سر کرنے کے بعد اسے وہیں روتا چھوڑ کر پلنگ پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے ۔ ارے ہاں نہیں تو کون روز روز بیوی کی خوشامدیں کر کے اس کا دماغ بگاڑے ۔ آج یوں ہی سہی ۔

" ارے اب مر بھی چکو لوگو ! خدا سمجھے تمھیں نیند بھی نہیں آتی " ملکہ بیگم کے دل سے ایک دھواں سا اٹھا اور انھوں نے بے چینی میں اپنا سر تکیئے پر رگڑ ڈالا ۔ اس بات پر فوراً ہی ان کی سب سے چھوٹی بچی نے دودھ منھ میں لینے کو کوں کوں شروع کر دی ——

" او محمود روشنی بند کرو ۔ پڑھنا ہے تو اندر جا کر پڑھو، گرمی میں سب کے سر پر روشنی کر رکھی ہے " یہ مسعود میاں نے سگریٹ ختم کر کے دھیمی آواز میں محمود کو ڈانٹا ۔

" ہاں خود تو بیل ہو ہو کر اس عمر میں بی ۔ اے کیا کہ سرکاری نوکری کی عمر نکل گئی اور اب اتنے دن سے بیٹھے بھائی کی روٹیاں توڑ رہے ہو ۔ شرم نہیں آتی چھوٹے بھائی کو پڑھائی سے منع کرتے " ماں نے زندگی میں پہلی مرتبہ مسعود میاں کو کھری کھری سنا دی ورنہ وہ تو ہمیشہ مسعود میاں کو بے قصور ہی ٹھہراتیں ۔ اس جھگڑے سے ملکہ بیگم کا جی خوش سا ہو گیا " انھوں نے سوچا کہ یہ بھی تو کہیں کہ اوپر سے دلہن بھی لا کر بٹھا دی دوسروں کی کمائی کے برتے پر ۔

" اماں جان بس رہنے دیجئے اس وقت ۔ ہاں نہیں تو " مسعود میاں ہنکارے " تجھ سے کہتا ہوں محمود بند کر روشنی ۔ ادھر لا ذرا دیکھوں کیا پڑھ رہا ہے ؟ "

" کیوں دکھاؤں ۔ دیکھو اماں جان یہ بڑے آئے ــ " محمود میاں منمناتے کتابیں سمیٹ لیمپ اٹھا اماں کے کمرے کی طرف بڑھے ۔

" اے ہے لونڈے کو گرمی میں مارے گا ۔ یہیں بیٹھ کر پڑھے گا، نیند نہیں آتی تو نہ سو ــ اس وقت کسی کی نیند کا خیال نہیں آتا جب رات کو بارہ بجے آ کر دروازے بھڑبھڑاتے ہو " اماں جان نے محمود کی حمایت لی ۔ جب سے مسعود کی شادی ہوئی تھی ان کا جی بھر گیا تھا ــ

اسی بک بک میں منظور میاں کے خراٹے ٹوٹ گئے ۔

" کیا شور مچ رہا ہے ، کمبخت رات کو چین سے سونا بھی نہیں ملتا ۔ اور یہ روشنی کیوں ہے ۔ بند کرو ۔ بجلی مفت کی نہیں "

اس فیصلے پر ملکہ بیگم کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا ۔ اور سب ہی ٹھنڈے پڑ گئے ۔ صرف اماں جان نے پاندان بند کر کے دو تین زور دار آہیں بھریں ۔

اب ملکہ بیگم کو اپنی آنکھوں پر نیند پتھروں کی طرح رکھی معلوم ہو رہی تھی ۔ لیکن وہ سو کیسے جاتیں ؟ جلدی جلدی پلکیں جھپکا کر وہ ان پتھروں کو ڈھکیلنے کی کوشش کرتی رہیں ۔

صحن میں اندھیرا ہو گیا۔ خاموشی ہو گئی۔ لیکن دلہن بیگم کے کمرے میں ابھی روشنی باقی تھی۔ پھر آہستہ سے ان کے کمرے کی چٹخنی چڑھنے کی آواز آئی اور پھر مکمل اندھیرا چھا گیا۔

اندھیرے آسمان پر ستاروں کی چمک بڑھ گئی۔ کہکشاں نے اپنی راہ موڑ دی ساڑھے بارہ تو بج گئے ہوں گے۔ ملکہ بیگم نے حساب لگایا، سب سو گئے۔ اماں جان کے پھسپھسے خراٹے سنائی دے رہے ہیں مسعود میاں اور محمود میاں کی گہری گہری سانسوں تک کی آواز آ رہی ہے۔ سب سو گئے۔ بس اب موقع ہے، اب وقت ہے۔ ملکہ بیگم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اس موقع پر ہمیشہ ان کا دل یوں ہی دھڑکتا۔ لاکھ جی کو بہلا دے دو ہزار تاویلیں کرو مگر دنیا جس چیز کو گناہ کہہ دے گناہ بن جاتی ہے۔ اور پھر گناہ کھل جائے تو ——— ملکہ بیگم کا جسم ہمیشہ کی طرح اس خیال سے آج بھی شل ہو گیا۔

چارپائی پر زور دیئے بغیر وہ ہوئے ہوئے اٹھنے لگیں۔ پھر بھی ایک بار چول چرچرا گئی۔ اور وہ تیزی سے دوبارہ لیٹ گئیں۔

"اللہ میری توبہ ——!" ایک ستارہ ٹوٹ کر نشیب کی طرف لپکا اور ملکہ بیگم کے دل میں بدشگونی نے اپنے پنجے گاڑ دیئے۔ بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ یہ ستارے نہیں ٹوٹتے، یہ تو فرشتے شیطان کو آسمان کی طرف آتا دیکھ کر اپنا گرز چلاتے ہیں۔

ملکہ بیگم کی قوت ایک بار جواب دے گئی۔ "یا اللہ معاف کر دے تو منصف ہے تو تو دلوں کا بھید جانتا ہے۔ تو وہ بے انصافی بھی دیکھتا ہے جو میرے ساتھ روا ہے۔ اللہ چیونٹی بھی پاؤں تلے دبائی جاتی ہے تو کاٹتی ہے —— بس تو ہی میرے گناہ بخشنے والا ہے ——" اور ملکہ بیگم کی نیند بھری آنکھوں میں گرم گرم آنسو چھلک آئے۔ یہ سارے خیالات سنگ ریزوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر انھیں اپنے آپ پر گرتے محسوس ہو رہے تھے۔ ذرا دیر کے لئے وہ دبی ہوئی سی پڑی رہیں۔ اس موقع پر انھیں اکثر انہی کیفیات سے سامنا کرنا پڑتا۔ اور جب یہ پُرعذاب کیفیات ان پر طاری ہوتیں تو وہ سمجھتیں کہ ان کے گناہ کا کفارہ ادا ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ملکہ بیگم بھوت کی طرح اندھیرے گھپ کمرے میں ڈوب گئیں۔ وہ اپنے کمرے کے اندھیرے کو پہچانتی تھیں دھیمے مگر نپے تلے قدموں سے وہ اس جگہ تک گئیں، جہاں وہ کنجی رکھتی تھیں —— کنجی پہلے ان کے میاں چرا کر رکھتے تھے۔ ایک دن یہ ان کے ہاتھ لگ گئی (میاں بے چارے اس دن اپنی کنجی ڈھونڈ ڈھونڈ کر رہ گئے، تھک کر انھوں نے تالے کی دوسری کنجی بنوالی تھی) اور اب وہ اس کنجی کو ایسی جگہ چھپا کر رکھتی تھیں کہ کسی کا خیال بھی وہاں نہ پہنچ سکے۔

لیکن آج جب ملکہ بیگم کا ہاتھ اس جگہ پہنچا تو کنجی لے کر نہ پلٹا۔ ملکہ بیگم اندھیرے میں سٹول پر سے گرتے گرتے بچیں۔ انھوں نے اپنی چیخ روکنے کے لئے اپنا کانپتا ہوا خالی ہاتھ کاٹ کھایا۔ انھیں ایک دم یوں معلوم ہوا جیسے ان کے گرد اونچی اونچی سیاہ دیواریں اٹھتی جا رہی ہیں، اور اب وہ قیدی ہیں؛ بے بس قیدی، وہ گم صم سی پکے فرش پر بیٹھ گئیں۔ مگر انھیں یوں لگا جیسے تیز بھنور پر بیٹھی گھوم رہی ہوں، ڈوبی جا رہی ہوں۔

اندھیرے کمرے میں مچھر گنگنا گنگنا کر ان پر جھپٹتے، چیونٹیاں کپڑوں تلے رینگتیں اور کاٹتیں، لیکن انھیں تو جیسے اپنا ہوش ہی نہیں تھا۔ چوکی پر کتنی بار گھنٹے بج گئے انھیں اس کی بھی خبر نہ ہوئی۔ ان سے ان کی جنتوں کی کنجی چھینی گئی تھی اور اب انھیں سب کچھ بیکار معلوم ہو رہا تھا۔ بھلے ہی مچھر خون چوس لیں، چیونٹیاں بوٹیاں توڑ کرے جائیں۔ پسینے میں ناک تک غرق ہو جائیں۔ کیا رکھا ہے اب اس زندگی میں کیسے ارمانوں سے انھوں نے سخت اور مایوس کن زندگی کی دیواروں کو کھرچ کر ایک سرنگ نکالی تھی اور وہ اس سرنگ میں ناک مُوال کر۔ لپنے آپ کو کتنا آزاد، کتنا خوش پاتی تھیں۔ لیکن آج وہ سرنگ بھی نہ جانے کن ظالم ہاتھوں ڈھے گئی۔ اتنے

بڑے حادثے نے ملکہ بیگم کو سُن کر دیا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہی تھیں۔ دماغ پتھر کے ٹکڑے کی طرح بے حس تھا، اور دل وہ تو بس جاڑ کے اندھیرے مینٹل پیس پر رکھی ہوئی گھڑی کی طرح ٹک ٹک کر رہا تھا۔ یا ہو سکتا ہے صرف گھڑی ہی ٹک ٹک کر رہی ہو۔ ملکہ بیگم اس وقت سوچنے اور فیصلہ کرنے کی حد سے باہر تھیں۔ انھیں یہ تک خیال نہ آیا اگر باہر کسی کی آنکھ کھلی تو انھیں غائب دیکھ کر لوگ کیا سوچیں گے۔

لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی سے سفید ہوتے ہوئے آسمان کی روشنی کمرے کے اندھیرے کو ہلکا کرنے لگی۔ آنگن میں ملکہ بیگم کی سب سے چھوٹی بچی نے دودھ ٹٹولنے میں ناکام ہو کر ایک لمحے کو کچھ چیں چاں کی اور پھر ٹھنڈی ہواؤں میں غٹ ہو گئی۔ رات بھر کی گہری نیند کے بعد منظور میاں کا جسم جاگا اور انھوں نے ساتھ کی چارپائی ٹٹولی اور پھر ایک دم آنکھیں کھول دیں۔

"ارے جان ۔" انھوں نے ملکہ بیگم کو کمرے میں چپ چاپ زمین پر بیٹھے دیکھ کر کہا۔ اور ملکہ بیگم کو احساس ہوا کہ ان کے کولھوں کا گوشت بیٹھے بیٹھے سن ہو چکا ہے۔ اور صبح ہو رہی ہے۔ مگر وہ چپ رہیں۔

"یہاں میرا انتظار ہو رہا ہے۔ جگا لیا ہوتا مجھے۔ گرمیوں میں عجیب مصیبت ہوتی ہے، تم سے بات تک کرنے کا موقع نہیں ملتا۔" اور پھر انھوں نے کمرے کے ایک کونے میں تھوک کر ملکہ بیگم کو چوتھی کی دلہن کی طرح اٹھا کر اونچی سی شیشوں والی "مال غنیمت کی مسہری" پر ڈال دیا۔

ملکہ بیگم ایک اذیت ناک ضبط سے چھٹکارا پا کر آن کی آن میں ہچکیوں اور سسکیوں کے طوفان میں بہہ گئیں۔

اب میاں بے چارے پہلے تو مجرم بنے کھڑے رہے، پھر ایک دم بپھر گئے۔ "آخر کچھ بولو بھی تمھیں ہو کیا گیا؟"

مگر ملکہ بیگم کچھ نہ بولیں۔ بس روئے چلی گئیں۔ رات بھر کی امڈی ہوئی گھٹا ٹوٹ ٹوٹ کر برسے گئی۔ گھر میں سب جاگ اٹھے۔ ملکہ بیگم کے کمرے سے رونے کی آواز بڑی صاف آ رہی تھی۔ مگر جب اندر میاں بیوی دونوں ہوں تو اور کون وہاں قدم رکھے۔

"میاں بیوی کی کوئی بات ہو گی، ملکہ بیگم کی تو فیل مچانے کی عادت نہ تھی۔ مسعود کی دلہن کے رنگ ڈھنگ وہ بھی سیکھ رہی ہیں کہتے ہیں خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔" وضو کے لئے لوٹا سنبھالتے ہوئے ماں نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے محمود میاں سے کہا جو بستر پر بیٹھے سر کھجا کر نیند کا خمار اتار رہے تھے۔

"یہ عورتیں واللہ فیلی کرنے میں نمبر اول۔" مسعود میاں نے اپنی دلہن کے بند کمرے کی طرف دیکھ کر سوچا اور پھر نل سے کھڑے ہی کھڑے منہ دھونے لگے۔

وقت بے حد اذیت سے گزر رہا تھا۔ ملکہ بیگم کا کمرہ پراسرار بنتا جا رہا تھا۔ منظور میاں منہ پھلائے نکلے۔ منہ دھویا اور پھر کمرے میں جانے لگے۔ ان سے کسی کو کوئی سوال کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

"ارے اماں جان اسکول کا وقت ہو گیا، ناشتہ دیجئے۔" محمود میاں سب سے پہلے باورچی خانے میں گھسے۔

ارے منحوس ٹھہر تو، پہلے بڑا بھائی تو دو لقمے منہ میں ڈال لے بہو۔ سویرے سویرے جی ہلکان رہا ہے۔ میرا لال۔ اس کے دوکان جانے کا وقت ہو رہا ہے۔ اللہ میری توبہ آگ لگے اس زندگی کو۔" اماں نے دانت کٹکٹا کٹکٹا کر کہا، توے سے اڑی ہوئی چھینٹ نے انھیں اور بھی چراغ پا کر دیا۔ انگوٹھا جل کر رہ گیا تھا۔

مگر محمود میاں نے ناشتے کے لئے بیتابی سے انتظار کرتے ہوئے دیکھا کہ بڑے بھائی حسب معمول سیاہ صندوقچہ

میں لئے باہر نکل گئے۔ ابھی آٹھ بھی نہ بجے تھے۔ اور پھر بغیر ناشتہ کئے۔

"ارے منظور۔ اے ناشتہ تو کرلو، تمھاری دوکان پر کون نصیبوں جلا صبح صبح اپنا کفن خریدنے آرہا ہے جو اتنی جلدی نہار منہ چل دیئے۔" اماں جان چلائیں۔

مگر منظور میاں نہ پلٹے وہ کافی تاؤ میں تھے۔ بگڑنے کی بات تو تھی ہی۔ گھنٹہ بھر سے بیوی سے یوں چپکوں پہکوں رونے کی وجہ پوچھ رہے تھے، مگر وہاں کوئی جواب نہ تھا۔

ملکہ بیگم کے رونے سسکنے کی آواز بدستور آرہی تھی۔ مسعود میاں کی دلہن بھی اپنی خفگی بھول کر کمرے سے نکلیں اور سیدھی ملکہ بیگم کے کمرے کی طرف چلیں۔ ان کے پیچھے اماں جان بھی پراٹھا ڈلیا میں پٹک کر بھاگیں۔

"اے جب سے سُن سُن کر کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔ منظور کے ہوتے کمرے میں آتے شرم آتی تھی۔ اب تک کلیجے پر سل رکھے بیٹھی تھی۔ بتاؤ تو ملکہ بیگم آخر ہوا کیا؟" اماں جان نے جلدی جلدی پوچھا۔

پھر مسعود میاں بھی اندر آگئے۔ ان کے پیچھے محمود میاں اور پھر ملکہ بیگم کے تینوں بچے۔ باہر صحن میں سب سے چھوٹی حلق پھاڑ پھاڑ کر رونے لگی۔ مگر ملکہ بیگم سب کی موجودگی میں بھی اس طرح گھٹنوں پر اپنا پھولا سوجا منہ رکھے روتی رہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے اُس وقت روتی تھیں جب ان کا پہلا بچہ مرا تھا۔

"کیا بات ہے بھابھی؟ منظور بھائی نے کچھ کہا؟" مسعود میاں نے سینہ سپر ہو کر پوچھا۔

وہی آنسو!————

"کہیں درد ورد تو نہیں بھابی؟" مسعود کی دلہن نے مسہری پر بیٹھ کر لپٹتے ہوئے سوال کیا۔

وہی سسکیاں!————

"اللہ سمجھے جس نے میری بچی کا دل دکھایا ہو۔ ارے یہ بہو نہیں میری بیٹی کی طرح ہے۔ اسی سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہے کیا ہوا میری بچی مجھے بتادے۔" اماں جان نے گلے لگا کر رندھی ہوئی آواز میں پوچھنا چاہا۔

بچے بھی تنگ آکر رونے لگے۔ پوتوں پوتیوں کو اس طرح روتے دیکھ کر بے چاری بڑھیا بھی پھوٹ پڑیں۔

"کیا ہوگیا، کسی کی سنتی ہی نہیں۔ بچے بے چارے بھوکے پیاسے رو رہے ہیں۔" انھوں نے اپنے سفید دوپٹے سے آنسو پونچھے اور ناک سرخ کئے اپنے پوتے پوتیوں کو سمیٹ کر باہر نکل گئیں۔

مسعود کی دلہن دوڑ کر بے بسی کے عالم میں سب سے چھوٹی بچی کو ہمدردی کا آخری حربہ سمجھ کر اٹھا لائیں۔ لیکن وہ بالشت کی جان اتنا تڑپی، اتنا بلکی کہ بے چاری دلہن نے گھبرا کر اسے ملکہ بیگم کی گود میں ٹھونس دیا۔ ننھی نے دودھ کی خوشبو سونگھی تو کوں کوں کر کے جمپر پر ہاتھ اور منہ مارنا شروع کردیئے۔ اچانک ملکہ بیگم کے آنسو اپنے دوپٹے سے پونچھ دیئے۔ اور پھر ملکہ بیگم کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ آیا۔

ناشتہ مسعود میاں خود لائے۔ مگر ملکہ بیگم نے ادھر آنکھ بھی نہ اٹھائی۔ دوپہر بھی فاقہ گیا، شام بھی ایک کھیل اُڑ کر منہ میں گئی وہ تمام دن مسہری پر گم صم بیٹھی سوکھی ہچکیاں لیتی رہی۔ رات کو نیند بھی بڑی بھیانک آئی۔ معلوم ہوتا جیسے خواب میں پلنگ سے گر پڑی ہیں۔ سینے میں دل ڈاکو کی طرح دھم سے کودتا اور آنکھ کھل جاتی۔ کبھی لگتا اپنے کان پور والے گھر میں چھوٹی سی ہیں۔ ابا پیسہ دو گنڈیریاں لیں گے — وہ ابا سے ٹھنک ٹھنک کر کہہ رہی ہیں اور ابا پیسہ نہیں دیتے کیونکہ لڑکی ذات کی چٹورے پن کی

عادت پڑنے کا خدشہ ہے۔ پھر گھر میں ایسے اوپر کے چھٹے مٹھے آتے ہی رہتے۔ پھر انھیں کسی طرح ایک پیسہ مل جاتا ہے۔ اپنے پچھواڑے کے کھنڈر بنا ٹیلے سے اتر کر وہ گلی میں بیٹھنے والے گنڈیری والے کی طرف بھاگتی ہیں۔ اور پھر پھسل جاتی ہیں۔ نیچے۔ نیچے ایک غار ہیں۔ وہ چارپائی پر خوف سے اُچھل پڑتیں اور پھر ان پر غنودگی طاری ہونے لگتی۔ پھر خواب، اور خواب جانے کہاں کہاں کے اُٹنگ بے تک سلسلے ملتے جاتے۔ وہ دیکھتیں کہ ان کی دور کی رشتے کی پھوپی برات لے کر آتی ہیں۔ دو دن دروازے پر روشن چوکی بیٹھی۔ شہنائیوں کی آواز سے سارا محلہ گونج گیا۔ پھر وہ خواب ہی میں نہ جانے کتنی صدیوں تک گھونگٹ تلے ماتھے پر جڑاؤ جھومر لٹکائے چاندی کی گھونگرلیوں والے چھلے دسوں انگلیوں میں پہنے بیٹھی پھوپی اماں (جنھیں اب وہ اماں جان کہتیں) کے اصرار پر پلاؤ زردوں کے ترلوالے اڑاتی رہیں۔ پھر آندھی سی چلی۔ دسترخوان اڑ گیا۔ دھائیں دھائیں بادلوں کی گرج کی طرح گولیاں چلیں اور اُن کے سسر کی سفید داڑھی خون میں لال ہو گئی۔ رو رو کر وہ دیوانی ہو گئیں۔ پھر نہ جانے خواب میں کہاں نکل گئیں کوئی اجنبی سا دیس کوئی گھٹا گھٹا سا گھر۔ دسترخوان بچھا پر روکھی سوکھی پر بھونوں کے اتنے پنجے بڑھے کہ اُن کا منھ خالی رہ گیا۔ ایک دم خالی۔ بھوک سے اُن کے پیٹ میں درد ہونے لگا۔ اور پھر عجیب بات ہے کہ بچوں پر بچے اُن کا بھوکا پیٹ پھاڑ پھاڑ کر باہر آنے لگے۔ ایک قطار کھڑی ہو گئی۔ پیٹ میں درد بڑھتا گیا۔ اور وہ چیخیں مارنے لگیں۔

"ملکہ! ملکہ! جاگو کیا خواب دیکھ رہی ہو" منظور میاں نے نیند سے اٹھ کر انھیں جھنجوڑ ڈالا۔

"کیا ہوا خواب میں ڈر گئیں" اماں جان نے اُن کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کچھ نہیں" ملکہ بیگم نے چکراتا ہوا سر پکڑ کر جواب دیا۔ ستارے پھیکے پڑ رہے تھے سویرا ہونے والا تھا۔ اور ملکہ بیگم کو خواب سے جاگ کر محسوس ہوا کہ انھیں شدید بھوک لگ رہی ہے۔

سویرے ملکہ بیگم نے تھوڑے سے اصرار پر ڈٹ کر ناشتہ کر لیا اور جب پیٹ بھر گیا تو پھر اچانک انھیں اپنی جنتِ گم گشتہ یاد آ گئی لوہے کا ایک ٹکڑا جو ایک تالے کی کنجی کی شکل میں ڈھل گیا تھا — اور وہ لوہے کا ٹکڑا اب انھیں کبھی نہیں مل سکتا تھا۔

ملکہ بیگم نے دوپہر کی گرم تنہائی میں پھر رونا بلکنا شروع کر دیا مسعود کی دلہن اور اماں جان نے بہت بہت پوچھا، مگر وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ وہ کیسے کہتیں کہ میں اپنے گناہ کا راستہ مسدود ہونے پر سوگ منا رہی ہوں۔ اور یہ نہ کہہ سکنے کی بے بسی انھیں اور بھی رُلا رہی تھی۔ آخر ہار کر ساس غریب روتی بین کرتی اپنی کوٹھی میں جا پڑیں۔

ارے آج کو خدا بخشے وہ شہید مرے سر کا تاج ہوتا تو کیوں میری یہ وقعتیں ہوتیں۔ کوئی میری نہیں سنتا۔ سمجھتے ہیں موئی سڑن بک بک کر رہی ہے۔ آج کو منظور کھلا رہے ہیں اپنے بھائیوں کو تو ماں بچنی سے سیدھے منہ بات تک کرنا گوارا نہیں۔ کل میں ناشتے کو بلاتی رہی منہ پھیرے نکل گئے۔ مسعود ہیں وہ الگ ہر وقت تیوری چڑھاتے ہیں۔ ارے میں کسی کی جوتیاں کھانے والی نہیں۔ دو نوالے کھاتی ہوں تو نوکروں کی طرح سارا گھر سنبھالتی ہوں۔ مجھ پر کسی کا کوئی احسان نہیں۔ میں اپنے ہاتھ پیروں کا صدقہ کھاتی ہوں۔ ہاں اب تو سب نوچ لیا۔ مجھ سے اب کوئی کیوں پوچھے کہ اماں مرتی ہو یا جیتی ہو" بھری دوپہر میں اماں جان چلاتی رہیں۔

اور ملکہ بیگم کے آنسو یہ سب سُن سُن کر اور بھی شدت سے بہنے لگے۔ آخر وہ دو دن کے سوگ کے بعد پہلی دفعہ ہچکیاں لیتی کہنے لگیں "خدا گواہ ہے دلہن! میں نے اپنا چھلا چھلا انھیں دے دیا کہ دکان میں لگا دیں ماس پر بھی انھوں نے میری بات نہ پوچھی۔ روٹی کے علاوہ بھی بچوں کو کچھ چاہیے، انھیں ذرا خیال نہ آیا۔ میں نے صبر کیا، کیا اماں کبھی انھیں نہیں سمجھا سکتی تھیں — میں نے تو اتنا

کر کے بھی احسان نہیں جتایا۔ مگر اماں نے اپنے سونے کے کڑے کیا دے دیئے کہ بیٹھی گنا رہی ہیں۔ میرا کیا ہوا کوئی نہیں گنتا۔ کوئی نہیں پوچھتا — اب ایسے میں اگر مجھ سے کوئی گناہ ثواب ہو جائے تو — تو سب —!" ملکہ بیگم کو یک لخت اپنی بے بسی کا احساس ہوا اور انھوں نے اپنے گھٹنوں پر سر ٹکا لیا۔

"بھابی یہ حال دیکھ دیکھ کر میں تو اپنے جی میں چور بنی رہتی ہوں۔ تمھارے دیور بھی نوکری کی پوری طرح کوشش نہیں کرتے۔ مجھے شادی سے پہلے معلوم ہوتا کہ ایسی جگہ قسمت پھوٹ رہی ہے تو کچھ کھا لیتی۔"

مسعود کی نئی دلہن کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ اور اس دن آنکھوں کا یہ پانی آنکھوں ہی آنکھوں میں پھیلتا چلا گیا۔ محمود میاں نے اسکول سے آ کر کھانا مانگا۔ اماں جان نے ڈوب مرنے کا مشورہ دیا کہ ایسی بے عزتی کے کھانے سے بہتر ہے آدمی سڑک کی دھول پھانک لے۔ محمود میاں بھوکے تھے۔ بھوک میں رونا ذرا جلدی آتا ہے۔ سو وہ اچھے خاصے بڑے ہونے کے باوجود بھوں بھوں رونے لگے۔

مسعود میاں جو ابھی اپنی دلہن کے ساتھ کھانے بیٹھے ہی تھے۔ اماں جان کی باتوں کے اصل رخ کو سمجھ گئے۔ نوالہ چھوڑ کر اٹھ گئے اور اپنے کمرے میں جا پڑے۔

اب ڈھنگ کی نوکری نہیں ملتی تو کیا کریں؟ آدھی زندگی تو اس امید میں بسر ہو گئی کہ بی۔ اے کرلیں تو پھر گھر کے سارے دلدر دور کر دیں گے۔ سب کے احسانات یوں چٹکی بجاتے میں اتار دیں گے۔ پر نوکری اپنی جیب میں تو رکھی نہیں ہے کہ نکالی اور کرلی۔ مسعود میاں مارے کھسیاہٹ کے اپنی اکلوتی بشرٹ کی استری کا خیال کئے بغیر آنکھوں کے آنسو چھپانے کو پلنگ پر اوندھے گئے۔

اس دن سارا گھر اوندھ گیا۔ بچے گلی میں دھواں اڑاتے رہے۔ بڑوں میں کسی نے کچھ نہ کھایا۔ صرف منظور میاں کی دوکان کا نوکر کھانا لینے آیا تو کھانا بھیج دیا گیا۔ شام کو بھی اماں جان نے چولھا نہ جلایا۔ صبح کا ہی کھانا جوں کا توں پڑا تھا۔ ملکہ بیگم اپنے کمرے میں پڑی پڑی اپنے آپ کو اس اداسی اور کشیدگی کا ذمہ دار سمجھنے لگیں۔ لیکن رات کو جب منظور میاں بغل میں سیاہ صندوقچہ دبائے گھر لوٹے اور چولھا اوندھا دیکھا تو صورتِ حال سمجھ کر ایک دم بولا کر چیخنے لگے۔

"سب کے دکھوں کا ٹھیکہ دار میں ہوں میری بوٹیاں نوچ لو۔ میں یہاں سے منہ کالا کر جاؤں تو سب کے دماغ درست ہو جائیں گے۔ دونوں وقت روٹی مل جاتی ہے نا اس لئے سارے لڑائی جھگڑے سوجھتے ہیں۔ ابھی دن بھر چار گز کپڑا بیچنے کے لئے دوکان پر سارا دن بیٹھنا پڑے تو —" منظور میاں کو مارے غصے کے اچھو لگ گیا۔ اور وہ نیم بے ہوش سے ہو کر پلنگ پر گر پڑے۔ اور دوسرے ہی لمحے سب ایک دم ہوش میں آ گئے۔ کوئی دوڑ کر پانی لایا، کسی نے پنکھا جھلا اور جب انھوں نے آنکھیں کھولیں تو سب نے خدا کا شکر ادا کیا۔

اس رات سبھوں نے اکٹھا بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اور کھانے کے بعد بڑی دیر تک بڑے اچھے موڈ میں غپ شپ ہوتی رہی۔ ملکہ بیگم کے دل پر گہرا صدمہ تھا مگر پھر بھی انسان غم بھول ہی جاتا ہے۔ ان کا پہلا بچہ مرا تھا تو کیا وہ مر گئی تھیں —؟ مسعود میاں کے کئی لطیفوں پر وہ بھی آواز سے ہنس پڑیں۔ ایک زمانے کے بعد یہ خوش گوار رات آئی تھی۔

باتوں سے تھک کر سب سے پہلے منظور میاں کے خراٹے بلند ہونے لگے اور پھر روشنی گل کر دی گئی۔ آہستہ آہستہ سب سو گئے۔ ملکہ بیگم نے حسبِ معمول سب کے سو جانے کا انتظار کیا اور جب سب کے سو جانے کا یقین ہو گیا تو چند لمبی

لمبی ٹھنڈی سانسیں لے کر آنکھیں موند لیں ۔ جب راتیں انھیں پراسرار سرگوشیوں میں جاگتے رہنے کی تلقین کرتی تھیں تو انھیں نیند کتنی پیاری معلوم ہوتی تھی ۔ مگر آج جب رات قبر کی طرح سونی اور خاموش تھی تو نیند ان کی آنکھوں سے دور تھی ۔ کتنی اجاڑ مُردہ سی رات ہے ۔ ملکہ بیگم نے بڑے دکھ سے محسوس کیا اور جانے کب تک یوں ہی بےحس وحرکت اس احساس تلے دبی پڑی ہیں ۔ دور کہیں کوئی کتا بڑی منحوس آواز میں روئے چلا جا رہا تھا ۔

اور جب بہت رات گئے ایک کتا ان کے دروازے پر آکر منحوس آواز میں رویا تو منظور میاں کی آنکھ کُھل گئی ۔ اچانک انھیں اپنے کمرے سے کچھ مدھم آوازیں سُنائی دیں ۔

جیسے کوئی رو رہا ہو اور کہہ رہا ہو، میرا حصہ دو اس میں سے میرا حصہ ۔

منظور میاں کے غنودہ ذہن پر چڑیلوں بھوتوں کا تصور ابھرا ۔ لیکن جب انھوں نے اپنی بیوی کی چارپائی کی طرف دیکھا تو اچانک اُٹھ کھڑے ہوئے ۔

کمرے میں کوئی چیز کسی چیز سے ٹکرا کر زور سے گری ۔ سارے گھر والے جاگ پڑے اور منظور میاں کے کمرے میں روشنی دیکھ کر خوف سے ادھر ہی بھاگے ۔

اور پھر سب سناٹے میں آگئے ۔

ملکہ بیگم جو ننگے سر ننگے پاؤں کھڑی تھیں، ان کی روتی ہوئی آنکھیں خوف سے پھٹ گئی تھیں ۔ اور اماں جان کی بند مٹھی تھرتھرا رہی تھی ۔

"ملکہ! اماں! یہاں کیا ہو رہا ہے؟" منظور نے حیران ہو کر دونوں سے پوچھا ۔ ملکہ بیگم ساکت کھڑی زمین پر گرے ہوئے صندوقچے کو گھور رہی تھیں اور اماں جان کی تھرتھراتی ہوئی مٹھی بے جان ہو کر کھل رہی تھی ۔

مٹھی بڑے آسیبی انداز سے کھل گئی ۔ منظور میاں کے سیاہ صندوقچے پر کوئی چیز ٹھن سی بجی ۔ سب نے دیکھا یہ ایک چھوٹی سی اور لوہے کی ایک کنجی ۔

ارے خدا کی شان ہے ۔ اپنوں پر ہی ڈاکے پڑتے ہیں ۔ جبھی تو میں کہوں کہ چار چھ آنے روز روز حساب میں کم کیوں ہوتے ہیں ۔ ؟" منظور میاں نے انتہائی دکھ میں اپنے سر کے بال دونوں ہاتھوں سے نوچ لئے ۔

(شمارہ ۳۴-۳۵ سنہ ۵۴ء)

عصرِ حاضر کے نمائندہ شاعر
فارغ بخاری کا دوسرا شعری مجموعہ
شیشے کے پیرہن
(زیرِ طبع)

قدرت اللہ شہاب

سرودِ رفتہ

سسہرام کا شہر کئی لحاظ سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے ایک تو یہاں شیر شاہ سوری کا مقبرہ ہے، دوسرے یہاں آغا جانی کا بازار ہے اور تیسرے اسی شہر میں ایک بار رانو کی موٹر کار کے دو ٹائر پنکچر ہو گئے تھے۔

جس طرح ہندوستان کی تاریخ شیر شاہ کے بغیر ادھوری رہ جاتی ہے اسی طرح رانو کی کار کے پنکچروں کے بغیر سسہرام کا شہر بھی اپنی تاریخی عظمت کھو بیٹھتا ہے۔ آغا جانی کے بازار کا قصہ یوں ہے کہ کسی زمانے میں اس مقام پر ایک قصبہ آباد تھا۔ یہاں کے سردار کا لقب آغا تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی جسے لوگ جانی کہتے تھے۔ غالباً جانی اس کا نام نہ تھا بلکہ اس لفظ کی دل فریب شان محبوبیت سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ بے حد خوبصورت اور چھبیلی لڑکی تھی جس پر بہت سے لوگ دل و جان سے فریفتہ تھے ان میں سے ایک فرید خاں بھی تھا۔ فرید خاں خواب دیکھنے کا شوقین تھا۔ خوبصورت خواب، بھیانک خواب، جنگ و جدال کے خواب، ہندوستان کی بادشاہت کے خواب، جانی کے خواب، جانی کی آنکھوں، جانی کے بالوں، جانی کی مسکراہٹوں کے دل فریب سپنے اور جب اس کے خوابوں کی تعبیر نکلی اور فرید خاں نے شیر شاہ بن کر ہندوستان کی بادشاہت کا تاج پہنا تو ایک تیز رفتار قاصد یہ پیغام لایا کہ "جانی! میرا انتظار کرنا۔ میں بہت جلد اپنی ملکۂ عالم کے حضور میں آرہا ہوں۔" شیر شاہ بادشاہت کرتا رہا اور جانی انتظار، انجام کار شیر شاہ پر ایک سنگلاخ تاریخی مقبرہ تعمیر ہو گیا، اور جانی کے نام پر جانی کے بازار کی بنیاد پڑی جہاں ہر روز اس شہیدِ وفا کی یاد میں بیسیوں جانیاں بن سنور کر، سولہ سنگار کر کے سو سو کینڈل پاور کے برقی قمقموں کے عین نیچے کرسیاں بچھا کر ——— خیر یہ تو ایک دوسری کہانی ہے۔ یہاں پر قصہ تو رانو کی موٹر کار کا تھا جسے پنکچر بھی ہونا تھا تو سسہرام میں، اب اگر وہ شیر شاہ کے مزار پر چلی جاتی، تو شاید وہاں پر سوئی ہوئی خاک کی چٹکی میں ایک لمحہ کے لئے آگ سی بھڑک اٹھتی۔ اور اگر وہ جانی کے بازار کی طرف جا نکلتی تو ——— خیر یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ وہ شیر شاہ کے مقبرے یا جانی کے بازار کی طرف جانے کے بجائے کچہریوں کی طرف چلی آئی۔

اس وقت عدالت میں چوری کا ایک معمولی سا مقدمہ زیر سماعت تھا۔ پنڈت کیسری ناتھ پانڈے بڑے جوش و خروش سے ایک گواہ پر جرح فرما رہے تھے، وہ مقامی عدالتوں کے سب سے زیادہ خرانٹ اور کہنہ مشق وکیل تھے، جب وہ گواہ سے کوئی مفید مطلب بات کہلوا لیتے تھے تو بصد ادب و احترام جھک کر چرب زبانی سے فرماتے تھے "عالی جناب عدالت اس فقرے کو نوٹ

کرے"۔ لیکن ان کی ایک بھینگی آنکھ جو مدعی، مدعا علیہ، گواہ اور مجسٹریٹ کو ایک ہی ترچھے زاویئے سے دیکھنے کی عادی تھی۔ پکار پکار کر کہتی تھی کہ "ارے او مجسٹریٹ کے بچے" اس فقرے کو یاد رکھنا! —

گواہ کی جرح پورے طور پر ختم بھی نہ ہوتی تھی کہ عدالت نے اچانک مقدمے کی سماعت کو اگلی پیشی تک ملتوی کر دیا، پنڈت کیسری ناتھ پانڈے نے لاکھ کہا کہ "حضور، ابھی صفائی کے دو گواہ اور بھی موجود ہیں — عالی جناب وہ بڑی مشکل سے کلکتہ سے بلائے گئے ہیں۔ سرکار والا — وہ آج رات کی گاڑی سے واپس جانے پر مصر ہیں ———" ان کی بھینگی آنکھ نے بھی اپنی مخصوص زبان میں بہت سے اُلٹے سیدھے واسطے لیکن عدالت کا فیصلہ اٹل تھا۔ ابھی ابھی عدالت نے ملاحظہ فرمایا تھا کہ اس کی سرزمین پر سرخ سینڈلوں والے دو خوبصورت اور نازک پاؤں یوں محوِ خرام تھے، جیسے کسی ستار پر حنائی انگلیاں مدھر مدھر سر میں درباری کا الاپ بجا رہی ہوں۔ کچہری کے احاطے میں اچانک ایک مدہوش سی شمیم بس گئی تھی، اور سفید جارجٹ پر بڑے بڑے گلابی پھولوں والی ایک ساڑھی نے ساری فضا کو گلنار کر دیا تھا۔ چاروں طرف ایک سناٹا سا چھا گیا۔ عدالت اپنے نئے ماحول میں سرشار سی ہو گئی، عبدالوہاب پیش کار کچھ عرصہ کے لئے پان کی پیک نگلنا بھول گیا اور اس کے چند قطرے سامنے پڑے ہوئے فائلوں کے پلندے پر ٹپک گئے جو اُس نے نظر بچا کر اپنے کُرتے کے دامن سے پونچھ ڈالے پنڈت کیسری ناتھ پانڈے نے بھی اپنی آنکھ کا زاویہ بدلا، اور اس دھڑکتی ہوئی خاموشی میں ساری دنیا نے سُنا کہ ایک موسیقار آواز ایک اردلی سے پوچھ رہی ہے۔ "کیا یہاں کسی کے پاس موٹر کار ہے"

یوں تو سہسرام کے مقدمہ بازوں، وکیلوں، مجسٹریٹوں، کلرکوں اور چپراسیوں کو اکثر یہ خیال آیا ہو گا کہ دنیا میں موٹر کار کا نہ ہونا ایک ناقابلِ عفو جرم اور ناقابلِ تلافی گناہ ہے۔ اس جنس نایاب کے فقدان نے کچہری کے احاطے میں حیرانی اور پریشانی کا ماحول پیدا کر دیا اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ ایک زبردست احساس بے مائیگی سے آب آب ہونے لگا۔

"ہائے عجیب جنگلی شہر ہے یہ ارے بھئی، اگر موٹر نہیں تو پنکچر لگانے کا سامان تو ہو گا کسی کے پاس؟ ٹائر رینچ — جیک ربڑ — سلوشن وغیرہ وغیرہ!" — رانو بات تو اردلی سے کر رہی تھی لیکن ہر شخص یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ خاص اسی سے مخاطب ہے! اور ان کے پشیمان چہرے زبانِ حال سے فریاد کر رہے تھے کہ جانِ جاں! یہ ایک موٹر ہی ہمارے بس کا روگ نہیں ورنہ تو چاہے تو ہم آسمان سے تارے نوچ لائیں۔ چاند اتار کر تیرے پاؤں پر رکھ دیں۔ کالی گھٹاؤں کو تیرے گیسوؤں سے لڑا دیں۔ شیر شاہ سوری کا مقبرہ تیری ٹھوکر میں لا بچھائیں، جانی کا بازار تیرے آگے پیچھے بسا دیں — لیکن اے جان! یہ موٹر کار کا جوتا ہمارے منہ پر نا مار— ہم روسیاہ ———

رانو جلدی میں تھی — اس لئے وہ اپنے آگے پیچھے دائیں بائیں بلبلاتے ہوئے، کسمساتے ہوئے فریادی چہروں کی آواز نہ سُن سکی، اور نہ ہی اس نے حسرت و یاس شرمندگی اور بے بسی کا وہ امتزاج دیکھا جو الیشر داس سائیکل ڈیلر کے منہ پر گرم گرم تارکول کی طرح تہ بہ تہ بچھا جا رہا تھا۔ وہ دن بھر درجنوں مقدمہ بازوں، منشیوں اور مختاروں کے سائیکلوں کے پنکچر درست کیا کرتا تھا۔ لیکن اے وائے کہ زندگی، عزیز کے اس انمول لمحے اس کا سارا کمال بے کار اور بے سود تھا۔ اگر خالی ربڑ کی بات ہوتی تو خیر وہ تو اپنی کھال تک کھینچ لیتا۔ لیکن اس کے پاس نہ کوئی بڑا رینچ تھا اور نہ ہی جیک۔ چنانچہ اب وہ اپنی "ماڈرن سائیکل ورکشاپ" کے سامنے ایک بے یار و مددگار۔ اپاہج کی طرح کھڑا تھا جس طرح اس کا مال و متاع

اس کے عین سامنے لٹا جا رہا ہو۔ اور وہ انگلی تک نہ ہلا سکے۔

سہسرام کا ذرہ ذرہ پکارنے لگا کہ ہمیں سہسرام کہتے ہیں پہلے ہمارا نام شہسرام تھا، بادشاہوں کے آرام فرمانے کی جگہ، وہ دیکھو سامنے جو ایک سنگلاخ عمارت نظر آ رہی ہے وہ ایک مقبرہ ہے۔ ایک بادشاہ کا مقبرہ۔ ہماری آغوش میں آج بھی ایک جلیل القدر تاجدار محو استراحت ہے۔ لیکن یہ ناقدرشناس لوگ پھر بھی ہمیں سہسرام ہی کہے جاتے ہیں، جاہل کہیں کے! دیکھو تو سہی تمھاری کار کے پنکچر تک نہیں جوڑ سکتے۔

"کیا یہاں پر رات گذارنے کے لئے کوئی ہوٹل ہے؟"

ارے ہوٹل؟ کچہری کے احاطے میں جتنے دل دھڑک رہے تھے وہ دامن پھیلا پھیلا کر فریاد کرنے لگے کہ میری جان! یہ تڑپتے ہوئے سینے تمھارے ہی منتظر تھے، آؤ گھڑی دو گھڑی کے لئے ان ویرانوں کو آباد کرتی جاؤ۔ اگر یہ لاجواب ساعت بیت گئی تو پھر کبھی واپس نہ آسکے گی، اب تم قسمت سے یہاں آ گئی ہو تو اپنا نور پھیلاتی جاؤ۔ تمھارے نور میں تو کوئی کمی نہ ہوگی۔ لیکن یہ زندگیاں غیر فانی ہو جائیں گی جس طرح کہ اب جانی کے قصے گائے جاتے ہیں۔

کوئی ہوٹل نہیں، کوئی ڈاک بنگلہ نہیں۔ ہائے یہ بھی کیا مجبوری ہے، اس نگوڑی کار کو بھی اسی جنگل میں پنکچر ہونا تھا۔ پھر ایک بھی نہیں۔ بیک وقت دو ٹائر پنکچر ہو گئے ہیں، شاید ایک ٹیوب بالکل پھٹ گئی ہو اب اس اجاڑ بیابان میں نئی ٹیوب کہاں ملے گی بھلا؟ دن بھی ڈھلتا جا رہا ہے۔ ابھی کلکتہ کوئی ڈیڑھ سو میل دور رہ گا۔ آج رات تک وہ کسی طرح بھی کلکتہ نہ پہنچ سکے گی اور زندگی کی ایک انمول ساعت ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ آج آزادی کی پہلی رات تھی، رات کے عین بارہ بجے جب آزادی کی دیوی آکاش سے اتر کر دھرتی پر آئے گی تو اس وقت کلکتہ کے گرینڈ ہوٹل کا آرکسٹرا اپنے پورے جوبن کے ساتھ بجے گا اور بال روم میں عطر اور لونڈر۔ وہسکی اور شیمپین کے غبار میں لپٹے ہوئے خوبصورت اور رقصندہ اجسام بڑے شوق سے اس کا استقبال کریں گے۔ اگر رانو نے یہ زرین موقعہ کھو دیا تو نہ جانے اُسے یہ جشن دوبارہ منانے کے لئے کتنے سو کتنے ہزار برس انتظار کرنا پڑے گا — قریب تھا کہ احساس شکست اور مایوسی کے عالم میں رانو کی غزالی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگیں کہ یکایک سب ڈویژن کے نظم و نسق کی مشین حرکت میں آ گئی، اور مجسٹریٹ صاحب نے عدالت سے نکل کر صورتِ حالات پر ایسی کامیابی سے قابو پا لیا۔ جس طرح وہ محرم اور دسہرہ کے موقع پر ہندو مسلم فسادات پر قابو پانے کے عادی تھے۔

چنانچہ جس وقت کلکتہ کے گرینڈ ہوٹل میں بال روم کا آرکسٹرا اپنی ابتدائی دُھن شروع کر رہا تھا اس وقت، رانو شہر سہسرام میں سب ڈویژنل مجسٹریٹ کے چھوٹے سے تاریک بنگلے کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی جن رم اور برانڈی کی آمیزش سے تیز تیز، عنابی کاک ٹیل بنانے میں مشغول تھی، اس مہمانِ عزیز کی آمد پر صدیوں سے سویا ہوا بنگلہ انگڑائی سی لے کر بیدار ہو گیا۔ اس کی اونگھتی ہوئی بے جان گلی کوچوں میں آزادی کا نفوذ دیکھنے کے لئے شیر شاہ کے مقبرے کی چھت پر جا کر بیٹھے تو باہر فضا میں بھی ایک عجیب سماوی آرکسٹرا بج رہا تھا — گھڑی کی سوئی بارہ بجے سے کچھ سیکنڈ ادھر دھیمے دھیمے لرز رہی تھی، جیسے کسی حسینہ کے ہونٹ انکار اور اقرار کے مابین ہوتے ہوئے تھرتھرا رہے ہوں۔ شیر شاہ سوری کے مقبرے کے گرد جو تالاب ہے اس کی سیڑھیوں پر بہت سے بچے انار، مہتابیاں، چھچھوندر اور پٹاخے جمع کر رہے

تھے اور انھیں تالاب کے چاروں طرف اس خوبی اور کوشش سے سجا رہے تھے جس طرح آج شام رانو نے آئینے کے سامنے بیٹھ کر اپنی پیچیدہ زلفوں کو آراستہ کیا تھا۔ بچوں میں بڑا جوش تھا وہ خوشی سے چیختے تھے ادھر اُدھر بھاگتے تھے اور ایک دوسرے سے لپٹ کر عجیب عجیب مہمل گانے گاتے تھے ۔۔۔ اُف! ایک بچہ پھسل کر دھڑام سے سنگلاخ سیڑھی پر گر پڑا۔ اس کے ہاتھ کا اناز تڑاخ سے پھٹ گیا۔ اس کا چہرا گرم گرم دھویں کے غبار میں لپٹ گیا۔ اس کی آنکھیں جھلس کر مند گئیں، اب وہ اپنی آنکھوں سے اس دیوی کی شانِ نزول نہ دیکھ سکے گا، جس کا استقبال کرنے کے لئے اس نے اپنی توتلی زبان سے انقلاب زندہ باد کے نعرے لگانا سیکھے تھے۔ آسمان پر ایک تارا ٹوٹا اور دور تک ایک خطِ نور کھینچتا ہوا غائب ہو گیا، جامی کے بازار میں طبلے پر زور کی تھاپ پڑی۔ گھنگھرو ناچے۔ شیر شاہ کے مقبرے کی چھت پر ایک شمع فروزاں بھڑکی، آزادی کی دیوی سوا نیزے پر اُتر آئی تھی اور اس کی چھما چھم کے درمیان ایک نازک سی، مہین سی، مترنم سی آواز نے پوچھا۔ "چاکلیٹ سر؟"

میں نے گھبرا کر آنکھ کھولی تو ہلکے نیلے فراک والی ایئر ہوسٹس۔ بسکٹوں، چاکلیٹوں اور چوسنے والی مٹھائیوں کی ٹرے لئے سیٹ پر جھکی ہوئی تھی، اس کے احمریں بالوں کی ایک لٹ ٹرے پر بے پروائی سے لہرا رہی تھی اور اس سے یاسمین کے سینٹ کی بڑی دل فریب خوشبو آ رہی تھی۔

کے۔ ایل۔ ایم کا طیارہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر اپنے چار انجنوں کی پوری طاقت کے ساتھ پرواز کر رہا تھا، راوی گذر چکی تھی اور اس کے رومان بھی، اب ہم دریائے سندھ کے اوپر پرواز کر رہے تھے جس پر فقط سکھر براج تعمیر ہو سکتے ہیں۔ گنگا اور جمنا، سون اور ہگلی کے مرغزار بہت دور پیچھے رہ گئے تھے۔ وہاں صنم خانوں میں رانو ازل تک راج کرے گی مہرام کا شہر بھی ابد تک آباد رہے گا۔ لیکن آزادی کی پہلی اور مقدس رات اب شاید کبھی واپس نہ آئے گی۔

(شمارہ ۔۔۔ ۷ ۔ ۱۹۵۰ء)

پٹ جھڑ کی آواز

(صفحہ ۷۲۲ سے آگے)

اب خوش وقت کو یاد کرنے کا فائدہ؟ وقت گذر چکا۔ جانے اب تک وہ بریگیڈیر میجر جنرل بن چکا ہو آسام کی سرحد پر چینیوں کے خلاف مورچہ لگائے بیٹھا ہو۔ یا ہندوستان کی کسی ہری بھری خوبصورت چھاؤنی کے میس میں بیٹھا مونچھوں پر تاؤ دے رہا ہو۔ اور مسکراتا ہو۔ شاید وہ کب کا کشمیر کے محاذ پر مارا جا چکا ہو۔ کیا معلوم؟

اندھیری راتوں میں آنکھیں کھولے چپ چاپ پڑی رہتی ہوں۔ سائنس نے مجھے عالمِ موجودات کے بہت سے رازوں سے واقف کر دیا ہے۔ میں نے کیمسٹری پر ان گنت کتابیں پڑھی ہیں۔ پہروں سوچا ہے۔ پر مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ اندھیری راتوں میں مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔

خوش وقت سنگھ۔ خوش وقت سنگھ۔ تمھیں اب مجھ سے مطلب؟

(شمارہ ۹۹ ۔ سنہ ۵۹ء)

بلونت سنگھ

رکھوالا

اسے پھر بازار بھیجا جا رہا تھا۔ پہلی بار تو خیر دن کے اجالے میں بھیجا گیا تھا اور خوف کا کوئی سوال نہ تھا لیکن اس وقت تو آفتاب کب کا غروب ہو چکا تھا اور چاروں طرف گہرا اندھیرا چھا گیا تھا لیکن وہ بھلا باپ کی حکم عدولی کیونکر کر سکتا تھا۔ ان کا تو خیال تھا کہ پندرہ سولہ سال کے لڑکے کو گھر کا کام کاج ضرور کرنا چاہیے۔

حاجی صاحب نہ جانے کہاں سے آ ٹپکے۔ اس کے باپ کے گہرے دوست تھے اور ہفتہ میں ایک دو بار گپ لڑانے کے لئے ضرور آ جایا کرتے۔ انھیں چائے پینے کا بڑا چسکا تھا اور لطف یہ کہ ایک دو پیالیوں سے انھیں سکون نہ ملتا۔ بس چلے تو چائے کا پورا گھڑا پی جائیں۔ ہنس کر کہا کرتے۔ ایک پیالی سے تو میری مونچھیں بھی گیلی نہیں ہوتیں۔ باپ کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے اور کھانے کھلانے کے معاملے میں ذرا بھی نہ ہچکچاتے۔ آتے ہی چائے کی فرمائش جھاڑ دیتے آج جب انھوں نے چائے کی فرمائش کی تو پتہ چلا کہ گھر میں چائے کی پتی ختم ہو گئی ہے وہ بھلا چپ رہنے والے تھے فوراً ہی بولے" تو کیا ہوا چائے کی پتی تو ہمارا بیٹا پپو لے آئے گا۔"

گھر والے اسے پیار سے پپو ہی کہتے تھے۔ والد صاحب نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔" ہاں بیٹا۔ کچھ کیک پیسٹری بھی لیتے آنا۔"

مجبوراً پپو میاں تھیلی تلاش کرنے لگے۔ تھیلی نہ ملی تو پتیلی کی ڈھکچی لے کر برآمدے میں آ کھڑے ہوئے۔ بیچارہ۔ کیسے آرام سے آگ کے قریب بیٹھا وہ اپنی ممی اور بہن سے گپ ہانک رہا تھا۔ حال ہی میں بہن کی شادی ہوئی تھی۔ ایک بار دولہن بن کر وہ گھر سے گئی تو پپو نے سمجھا کہ اب وہ کبھی واپس نہ آئے گی لیکن چند دنوں بعد ہی وہ پہلے سے زیادہ سرخ و سفید ہو کر چھم چھم کرتی یوں واپس آ گئی جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ پہلے ہی کی مانند اب بھی بلا کی شریر تھی اپنے سسرال والوں کی دلچسپ حرکتوں کا تذکرہ کر کے خود بھی ہنس رہی تھی اور دوسروں کو بھی ہنسا رہی تھی۔ باتیں کرتے ہوئے اس کی باچھیں کھلی رہتیں گویا کوئی حیرت انگیز شعبدہ بازی کا کرتب دیکھ کر آ رہی ہو۔ اوہو۔ کتنی مزیدار باتیں کر رہی تھی بہن۔ اس حاجی کے بچے کو بھی اسی وقت آ کر مرنا تھا اور آتا ہی حرامزادے نوکر کی نانی کو بھی دنیا سے سدھارنا تھا۔ کمبخت چھٹی لے کر چل دیا۔ چھٹی لینے کی خاطر وہ کئی بار پہلے بھی اپنی نانی کو مار چکا تھا۔

پپو صرف کام کرنے سے ہی نہیں بچنا چاہتا تھا در اصل اسے اندھیرے میں ڈر لگتا تھا۔ دو سال قبل جب وہ لوگ شہر میں بسا کرتے تھے تو اسے ایسے موقعوں پر کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوا کرتی تھی۔ گلی کے ایک نکڑ پر لیمن سوڈے والے کی دوکان تھی اور دوسرے پر حلوائی کی۔ ایک جانب پنواڑی کی دوکان تھی تو دوسری جانب پکوڑیاں بیچنے والے کی۔ ہر چیز آسانی سے مل جایا کرتی تھی۔ نہ جانے والد صاحب کو کیا سوجھی کہ شہر سے بارہ پتھر باہر اس بنگلہ میں آ بسے۔

حاجی صاحب کوچ میں دھنسے ہوئے چائے اور کیک کے حسین تصورات میں ڈوبے ہوئے قہقہے پر قہقہے لگا رہے تھے۔ بچو نے اپنا تمام غصہ کوشت کے کاروں پر اتارا اور انہیں بڑی بے رحمی سے مروڑ کر اپنے سینے کو ڈھانپ لیا۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی اور جسم میں سوئیاں کر دینے والی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ صرف کرسچین کالج کے وسیع کھیل کے میدان کے ایک سرے پر چھوٹی سی عمارت زیر تعمیر تھی۔ ادھر ادھر بے ترتیبی سے اگی ہوئی جھاڑیاں بھیگی اور اداس چاندنی میں بڑی بھیانک نظر آ رہی تھیں۔

اس نے مفلر سر اور گردن کے گرد کچھ اس طرح سے لپیٹ لیا کہ جب اس نے برآمدے میں رکھے ہوئے ہیٹ لٹکانے والے اسٹینڈ میں لگے ہوئے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا تو یوں معلوم ہوا جیسے کوئی نقاب پوش ڈاکو جھانک رہا ہو۔ شکل سے تو پہلے ہی وہ ڈاکو نظر آ رہا ہو لیکن خوف سے اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

بہرحال وہ باہر چل پڑا۔

ایک مختصر سی پگڈنڈی باغ سے ہو کر گذرتی تھی جس کے دوسرے سرے پر رات کی رانی کے پودے لگے ہوئے تھے جس کے ننھے ننھے سفید پھول چاندنی میں چمک رہے تھے اور ان کی خوشبو فضا میں بسی ہوئی تھی۔ اس نے سنا تھا کہ رات کی رانی کی خوشبو سے مست ہو کر سانپ اس کے سایہ تلے کنڈلی مارے بیٹھے رہتے ہیں۔ نہ جانے یہ بات کہاں تک درست تھی لیکن جب وہ رات کی رانی کے پودوں کے قریب سے گذرا تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس طرف دیکھتا رہا۔ کالج کے میدان میں اسے دو آدمی دوڑتے ہوئے نظر آئے تو اس نے محسوس کیا کہ یہ دونوں اس کا گلا دبانے کے لئے آ رہے ہیں۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کھلے میدان میں کوئی جائے پناہ نظر نہ آئی اور اس نے اندازہ لگایا کہ اگر وہ پوری قوت سے چیخے پھر بھی اس کی آواز گھر تک نہ پہنچ سکے گی۔ اس نے سوچا کہ آج اس کی جان کی خیر نہیں۔ جب وہ دونوں آدمی اس کے قریب آ گئے تو اس نے محسوس کیا اب وہ اس پر جھپٹنے والے ہیں اور اس کا کلیجہ اچھل کر حلق میں آ پھنسا لیکن وہ دونوں اس کے قریب سے گذر کر دوڑتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ تب اس نے سوچا کہ یقیناً یہ دونوں کالج کے طالب علم ہوں گے جو دوڑنے کی مشق کر رہے ہوں گے۔

ان کے چلے جانے کے بعد اسے قدرے اطمینان ہوا۔ چلتے چلتے وہ مندر کے قریب والے گھنے برگد کے درخت کے نیچے سے پھرتی سے نکل گیا۔ وہیں قریب میں ایک مکان زیر تعمیر تھا جس کی دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں لیکن چھت ابھی نہیں ڈالی گئی تھی۔ یہ جگہ اسے بڑی ڈراؤنی معلوم ہوئی۔ جب دور سے پیسٹری والے کی دوکان کی روشنی نظر آنے لگی تو اس کی جان میں جان آئی۔

پیسٹری کی دوکان کے باہر ایک شرابی کھڑا ہوا نشے کی حالت میں اول فول بک رہا تھا اور چند بے فکرے اسے اپنے حلقے میں لئے گالیاں بکنے پر اکسا رہے تھے اور مزے لے لے کر بک جھک کر رہا تھا۔ اس کے منہ سے متواتر جھاگ بہہ رہا تھا۔ پچو کو شرابیوں سے بہت ڈر لگتا تھا لہٰذا وہ دوکان کے قریب پہنچتے ہی لپک کر دوکان کے اندر گھس گیا۔ اسے تمام منگوائی ہوئی چیزیں اسی دوکان سے مل گئیں اور وہ قیمت ادا کر کے دوکان سے باہر آیا تو تاریکی میں واپس جانے کی فکر پھر دامن گیر ہو گئی۔ اسی دوران میں بابو دیوی چند دوکان پر آئے۔ وہ بھاری بھرکم جسم اور رعب دار چہرہ کے مالک تھے اور وہ بھی اس کے باپ کے دوستوں میں ایک تھے۔ اس نے سلام کیا تو انھوں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر بابو دیوی چند بھی اس کے باپ سے ملنے جا رہے ہوں تو کتنا اچھا ہو وہ بھی ان کے ساتھ گھر واپس چلا جائے گا۔ اسی خیال سے وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا لیکن جب اس نے دیکھا کہ بابو دیوی چند دوکاندار سے باتوں میں مشغول ہو گیا تو اسے بڑی ناامیدی ہوئی۔ ادھر اسے اپنے باپ کا بھی خوف تھا کہ دیر ہو جانے کی وجہ سے اس پر خفا ہو رہے ہوں گے۔ مجبوراً وہ آہستہ آہستہ گھر کی جانب چل پڑا۔ وہ جس قدر بازار سے دور ہوتا گیا بازار کے شور و غل کی آواز مدھم پڑتی

دفعتاً مندر کی دیوار کی ـــــــ سائیں سائیں کرتا ہوا اندر
گئی اور ایک بار پھر وہی ادھورا مکان ۔ درختوں کے سیاہ سائے ۔ سائیں سائیں کرتا ہوا اندر سے ڈر کر تیزی سے آگے
سمت سے ایک سادھو نکلا اور بھیانک آواز میں بولا "بھگوان کے لئے کچھ دیدو" وہ سادھو کی گھناؤنی شکل سے ڈر کر تیزی سے آگے
بڑھ گیا۔ پھر وہی سنسان اور وسیع میدان، لیکن اب وہ کالج کے لڑکے اپنی دوڑ کی مشق ختم کر چکے تھے۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ وہ گھناؤنی
شکل والا سادھو اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ خشک پتیوں پر کسی کے پیر کی آہٹ صاف سنائی دے رہی تھی ـــــــ کاش کالج
کے وہ تندرست و توانا لڑکے دوڑتے ہوئے نظر آجاتے ـــــــ یقیناً سادھو اس کا پیچھا کر رہا ہے ـــــــ اور وہ
گھبرا کر دوڑنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ سادھو اس کا گلا دبانے کے لئے اس کے پیچھے دوڑ رہا ہے ـــــــ لیکن اس نے پیچھے
مڑ کر نہیں دیکھا۔ کون جانے سادھو کے روپ میں کوئی بھوت ہو! اس نے سن رکھا تھا کہ اگر بھوت انسانی آواز میں پکارے بھی تو
پلٹ کر نہیں دیکھنا چاہئے۔ سرپٹ دوڑتے ہوئے جب وہ رات کی رانی کے پودوں کے قریب پہونچا تو اسے کچھ تسلی ہوئی۔ وہ تیزی
سے برآمدے سے گزرتا ہوا ہانپتا کانپتا سیدھا باورچی خانے میں داخل ہوا اور ماں کے سامنے ٹوکری رکھ کر بولا ـــــــ یہ رہیں آپ کی
تمام چیزیں لیکن اب ہم رات کے وقت کبھی بازار نہیں جائیں گے۔"

"کیوں خیر تو ہے" ماں نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

وہ صحیح بات گول کر گیا۔ "خیر کیا۔ ہمیں پڑھنا بھی تو ہوتا ہے۔ دیکھئے نا ساڑھے آٹھ بج گئے اور ہم نے کچھ نہیں پڑھا۔ اتنا
وقت ضائع ہو گیا۔"

پڑھنے کا نام سنکر ماں کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں "اچھا بھئی اب نہیں بھیجیں گے بازار۔ جاؤ پڑھو"

پڑھنے کی بات تو یوں ہی اس کے منہ سے نکل گئی تھی۔ بہن اب بھی اپنی لچھے دار باتیں سنا رہی تھی لیکن اب اس کا وہاں ٹھہرنا
دشوار تھا لہٰذا چائے اور پیسٹری باپ کے پاس پہنچا کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا اور چارپائی پر لیٹ کر رضائی اپنے پیروں پر ڈال لی
الجبرا کی کتاب کھول کر قریب پڑی ہوئی میز پر رکھ دی اور تکیہ کے نیچے سے جاسوسی ناول نکال کر پڑھنے لگا۔ اس کی نظریں کتاب پر جمی
تھیں۔ لیکن کان باورچی خانہ کی سمت لگے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیا باتیں ہو رہی ہیں کہ بہن کی ہنسی رکتی ہی نہیں۔ اب اسے اپنی بیوقوفی کا احساس
ہوا۔ پڑھنے کا بہانہ کر کے وہ پچھتانے لگا۔ کیا بہن تمام مزیدار کہانیاں آج سنا ڈالے گی؟

اس نے ناول کی دلچسپیوں میں کھو جانے کی کوشش کی کہ دفعتاً ایک نئی ہنسی کی آواز باورچی خانے کی جانب سے بلند ہوئی اور اس
کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

یہ نئی ہنسی کی آواز پنی کے علاوہ اور کس کی ہو سکتی ہے۔ اس کی عمر دس سال سے زیادہ نہ تھی لیکن وہ بڑی باتونی تھی۔ حاجی صاحب
کی بھاری بھرکم ڈکاروں کی آواز کو چیرتی ہوئی پنی کی دلچسپ ہنسی کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

شہر سے دور اس سنسان بنگلے میں منتقل ہونے سے پپّو کو ایک ہی فائدہ ہوا تھا کہ پنی سے ملاقات ہو گئی تھی۔ دو سال سے
وہ دونوں ساتھ ساتھ کھیلتے تھے۔ پنی لالہ جیون رام کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ جب وہ مٹک کر، ہونٹ بھینچ کر معصومیت سے
باتیں کرتی تو پپّو کو بڑی پیاری معلوم ہوتی۔ دو چار باتیں کرنے کے بعد وہ تھوک یوں نگلتی تھی گویا گلاب جامن کھا رہی ہو۔ ان دونوں
کے گھرانے کا آپس میں بڑا میل جول تھا۔ خاص کر پپّو اور پنی میں بڑی گہری دوستی تھی۔ یوں تو پپّو کو پنی شروع سے ہی
بھلی لگتی تھی لیکن جب سے پپّو نے فلمیں دیکھنی شروع کی تھیں اس وقت سے اسے پنی بہت اچھی لگنے لگی تھی۔ اسے دیکھ کر
اس کے ننھے سے دل پر کچھ عجیب سی کیفیت چھانے لگتی۔ دل زور سے دھڑکنے لگتا۔ تمام جسم سلگتا سا محسوس ہوتا اور سانس

سینے میں نہ سماتی !!

پنّی ہنس ہنس کر باورچی خانے میں باتیں کر رہی تھی ۔ وہ جانتا تھا کہ کچھ دیر کے بعد وہ اس کے پاس فوراً آئے گی ۔ پہلے بھی جب کبھی وہ اپنی ماں کے ساتھ اس کے گھر آتی تو سب کو چھوڑ چھاڑ کر اس کے پاس آجاتی یا اکثر خود اسے اپنے گھر لے جاتی جہاں وہ دونوں طرح طرح کے کھیلوں میں مشغول ہو جاتے ۔

دفعتاً پنّی کی آوازیں آنی بند ہو گئیں اور وہ سمجھ گیا کہ اب وہ باورچی خانہ سے نکل کر سیدھی اس کے پاس آئے گی ۔ اس نے فوراً جاسوسی ناول کو تکیے کے نیچے چھپا دیا اور میز قریب کھینچ کر اور انگلیوں میں پنسل دبا کر بڑی سنجیدہ صورت بنا کر بیٹھ گیا ۔ وہ جانتا تھا کہ چند ہی لمحوں بعد ایک دبلا پتلا نرم ہاتھ اس کی میز پر آ ٹکے گا اس ہاتھ کے تصور سے ہی اس کے جسم میں ایک نامعلوم سی سنسناہٹ دوڑ گئی ——— وہ آکر کھڑی رہے گی لیکن وہ آنکھ اٹھا کر اس کی جانب دیکھے گا بھی نہیں ۔ اس کی اس بے رخی سے پنّی کی خودداری کو ٹھیس لگے گی اور ٹھنک کر کہے گی ——— " میں آئی ہوں "

" تو میں کیا کروں " وہ جواب دے گا ۔

وہ ہونٹ بھینچ کر چلائے گی " نظریں اٹھا کر میری جانب تو دیکھو "

وہ جواب دے گا " دیکھتی نہیں کہ میں پڑھ رہا ہوں "

تب پنّی خفا ہو کر دروازے کی اوٹ میں اس کی جانب پشت کر کے کھڑی ہو جائے گی ۔ لیکن وہ خاموش بیٹھا رہے گا ۔ پنّی غصہ سے بے قابو ہو کر اپنے تیز ناخونوں سے دیوار کا پلاسٹر کریدنے لگے گی ——— پہلے ہی شریر نے دیوار کے پلاسٹر کا کافی حصّہ کرید ڈالا ہے ۔ تب وہ منع کرے گا ۔ لیکن وہ باز نہ آئے گی ۔ آخر اسے سزا دینے کے لئے وہ اٹھ کر اس کی جانب جھپٹے گا اور وہ چیخ کر ہنستی ہوئی اس کے آگے آگے دوڑے گی ۔ ایک چارپائی سے دوسری پر ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں ۔ سارے گھر میں گویا زلزلہ آجائے گا اور پھر کچھ دیر کے بعد ان کی صلح ہو جائے گی ۔

بہت دیر ہو گئی لیکن پنّی ابھی تک اس کے کمرے میں نہیں پہنچی ۔ اس نے کنکھیوں سے دروازے کی جانب دیکھا لیکن وہاں کوئی نظر نہ آیا ۔ اس نے سوچا شریر کمرے کے باہر دیوار کی اوٹ میں چھپی ہو گی ۔ دبے پاؤں چل کر دروازے کے باہر جھانکا لیکن کوئی نظر نہ آیا ۔ باورچی خانے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی ۔ اس نے سوچا کہ غالباً ماں بہن کسی دوسرے کمرے میں چلی گئی ہیں اور پنّی وہیں خاموش بیٹھی ہو گی ——— لیکن جب وہ پہنچا تو اس نے دیکھا کہ باورچی خانے میں ماں ۔ بہن اور بوڑھی نوکرانی تو ہے لیکن پنّی نہیں ہے ۔ اسے پریشان دیکھ کر ماں نے پوچھا " کیا بات ہے بیٹے ؟ "

" جی ۔ ۔ جی کچھ نہیں " اس نے گھبرا کر ہکلاتے ہوئے کہا " مجھے نیند آرہی ہے دودھ گرم ہو گیا ہو تو دے دیجئے " ۔

ماں نے دودھ کی پتیلی چولہے پر رکھ دی اور وہ آہستہ سے کھسک کر اپنے کمرے کی جانب بڑھا ۔ اسے حاجی صاحب اور اپنے باپ کے قہقہے زہر معلوم ہو رہے تھے ۔ وہ عجیب الجھن میں تھا ۔ آخر اس سے ملے بغیر پنّی کیوں چلی گئی جب مایوس ہو کر وہ اپنے کمرے کی جانب مڑا تو اسے برآمدے میں لٹکی ہوئی چلمن ہلتی ہوئی نظر آئی ۔ اس کی ناامیدی خوشی میں تبدیل ہو گئی ۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھا اور ایک جھٹکے سے چلمن کو اوپر اٹھا دیا ۔ پنّی وہاں بھی نہ تھی ۔ برآمدہ خالی پڑا تھا ۔

اس نے کوٹ کا کالر اٹھایا اور آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا برآمدے کے دوسرے سرے پر پہنچ گیا ۔ سامنے رات کی رانی کے پودے ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہے تھے ۔ ہر طرف اس کے پھولوں کی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی ۔ اسے پنّی پر سخت غصہ آیا لیکن رفتہ رفتہ اس کا دل

بھر آیا ـــــــ کاش وہ اس سے ملے بغیر نہ جاتی ـــــــ نہ جانے کیوں آج اس کی طبیعت بے حد اداس اور بے چین تھی ـــــــ پتی کے ساتھ بیٹھ کر اس سے باتیں کر کے اسے یقیناً سکون ملتا ـــــــ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سیر کو نکل جاتے ـــــــ وہ سامنے کھیل کے میدان کے سرے پر جو مکان زیر تعمیر ہے ممکن ہے پتی اس میں چھپی ہوئی ہو ـــــــ لیکن اسے اپنے اس خیال پر خود ہی ہنسی آگئی ـــــــ وہ دبلی پتلی نازک بدن لڑکی جو خفیف سی آہٹ پر خرگوش کی مانند چونک پڑتی ہے بھلا وہ ایسے سنسان مقام پر کیونکر چھپ سکتی ہے ـــــــ اور وہ اکثر یہ بھی کہا کرتی تھی کہ اس زیر تعمیر مکان کے برآمدے میں بھوت ناچا کرتے ہیں ـــــــ اگر آج بھی وہ یہی کہتی تو وہ جی بھر کر اس کا مذاق اڑاتا اور کہتا ـــــــ چل اس برآمدے میں، ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ وہاں کون سا بھتنا چھپا ہوا ہے ـــــــ اس پر وہ سہم کر کہتی ـــــــ نا بابا! مجھے ڈر لگتا ہے ـــــــ اور یہ کہہ کر وہ اپنا نرم اور ملائم ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیتی!

اپنے ہاتھ میں پتی کا ہاتھ آنے کے تصور سے ہی اس کے جذبات میں طوفان آگیا۔ جسم میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی ـــــــ اور پھر جیسے تصور میں ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر پتی کی پتلی کمر اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لی اور پتی نے ڈر کر اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا ـــــــ! جامن کی لچکیلی شاخ کی مانند بل کھاتی ہوئی کمر ـــــــ! اتنے نرم و نازک ہاتھ ـــــــ ایسا سبک جسم اور اتنی نازک پتلی انگلیاں ـــــــ گویا بیچاری کے جسم میں جان ہی نہیں ہے! تنہا ہو تو یہی جان بھی نکل جائے ـــــــ لیکن اس کے بازوؤں کا سہارا لئے ہوئے وہ اس سنسان برآمدے کی دو تین سیڑھیاں بھی چڑھ جاتی اور پھر دفعتاً ٹھٹک کر رک جاتی ـــــــ اور وہ اسے اپنے قریب کھینچ کر کہتا ـــــــ ارے تم تو پگلی ہو چھی چھی ـ ادھر دیکھو اس تاریک گوشے میں کچھ بھی تو نہیں ـ کوئی بھوت پریت نہیں ـ کوئی چڑیل نہیں ـــــــ ڈرپوک کہیں کی؟ بھلا ڈرنے کی کیا بات ہے؟ ـــــــ اور پھر میں جو تمہارے ساتھ ہوں ـــــــ!!

(شمارہ ۹۳-۹۲ ۱۹۵۹ء)

آدم خور

(صفحہ ۷۴۷ سے آگے)

ایک چرواہے لڑکے کو نوالہ بنالیا۔

گاؤں والے پریشان ہوگئے کہ اب کیا کیا جائے۔ شیر کے ظلم یا بادشاہ کے انتظار کی ایک حد ہوتی ہے ـــــــ یا حد ہوتی ہی نہیں ـــــــ نہیں نہیں ایسے کام نہیں چلے گا۔ ایسی کی تیسی۔ یہ کہہ کر مادھو کسان کا نوجوان لڑکا شامو چوری سے بندوق لے کر چھپتا چھپاتا جنگل کی طرف چلا ـــــــ ابھی وہ پٹواری کے کھیت تک بھی نہ پہونچا تھا کہ اسے ایک طرف ڈونگر میں شیر کے چنگھاڑنے کی آواز آئی دوسری طرف سے بادشاہ سلامت کی سواری مبارک آتی نظر آئی۔ اب شامو پریشان ہوگیا کہ وہ کس کو مارے۔؟ دونوں میں سے کون سا شیر زیادہ خونخوار ہے ـــــــ؟

جب سواری جہاں پناہی بہت قریب آگئی تو مرتا کیا نہ کرتا شامو نے بندوق کی نال حضور پرنور کی طرف اٹھادی۔ ابھی اس کا ہاتھ لبلبی تک بھی پہونچا نہ تھا کہ بادشاہ کے شکاری کتے جھپٹے اور......

اور پھر بادشاہ شامو کی تکا بوٹی نوچتا رہا اور ادھر ڈونگر میں شیر بے چارا بھوک کے مارے چنگھاڑتا ہی رہ گیا۔

(شمارہ ۲-۱، سنہ ۱۹۴۸ء)

اردو کا منفرد علمی ادبی اور تہذیبی

ماہنامہ

افکار

گذشتہ ۲۵ سال سے پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ افکار کی عام اور خاص اشاعتیں ملک بھر کی یونیورسٹیوں، کالجوں، اسکولوں اور لائبریریوں میں محفوظ رکھی جاتی ہیں۔ سال بھر میں افکار دو ہزار کے لگ بھگ صفحات پر مشتمل تخلیقی، تعمیری اور فکری ادب پیش کرتا ہے۔ سالانہ ممبروں کو خاص اشاعتیں رعایتی قیمت میں پیش کی جاتی ہیں۔ باشعور اور تعلیم یافتہ گھرانوں میں گھر کا ہر فرد افکار ذوق و شوق سے پڑھتا ہے۔ افکار محکمۂ تعلیم کراچی، لاہور، پشاور، راولپنڈی، کوئٹہ اور جنرل ہیڈکوارٹر آرمی ایجوکیشن سے منظور شدہ ہے۔ افکار کا جوش نمبر کراچی یونیورسٹی کے بی اے آنرز اور ایم اے کے نصاب میں شامل ہے۔ اور فیض نمبر، حفیظ نمبر اعلیٰ درجات میں حوالے کا کام دیتے ہیں۔ اردو کے علاوہ دنیا کی کسی زبان میں زندہ و باکمال شخصیتوں پر اتنے عظیم و منفرد، جامع و مستند نمبر اس سے پہلے کبھی شائع نہیں ہوئے۔

نئے سالانہ ممبر، جوبلی نمبر رعایتی قیمت پر حاصل کر سکتے ہیں

—★ آج ہی سالانہ ممبری کے لئے لکھئے ★—

زرِ سالانہ (معمولی ڈاک سے) بارہ روپے۔ رجسٹری سے: اٹھارہ روپے
مشرقی پاکستان میں (ہوائی ڈاک سے) پندرہ روپے۔ رجسٹری سے: اکیس روپے

مکتبۂ افکار

رابسن روڈ، کراچی

صادق الخیری

بنتِ قمر

اب کے موسم بہار کس تابانی سے آیا ہے! ہر جگہ سبزہ، ہر طرف پھول، ہر سمت تازگی، گویا کائنات کو حیاتِ نو ملی ہے۔ لیکن یہ ہریالی اور یہ شادابی جاوداں نہیں۔ ایک دن اسے نذرِ خزاں ہونا ہے۔ زندگی کی بہار بھی عارضی ہے۔ ہماری خوشیاں کبھی زوال آمادہ ہیں۔ مگر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ——— گلشنِ حیات میں دائمی بہار کیوں نہیں آتی؟ ——— ایسی بہار جو خزاں کو جنم نہ دے، جس کے بطن سے افسردگی پیدا نہ ہو!۔

میرا دل چاہتا ہے کہ والد کی طرح جنھیں میں چھٹپن سے ڈیڈی کہتی ہوں اپنے اہم واقعات باقاعدہ تحریر کیا کروں۔ وہ کہتے ہیں اس سے جی بہلتا ہے اور جو بات زبان پر برملا نہیں آسکتی۔ وہ نوکِ قلم پر پوشیدہ طور پر آکر دل کی پھانس نکال دیتی ہے، لیکن وہ اپنی ڈائری کسی کو نہیں دکھاتے، مجھ تک کو نہیں، بلکہ ایک دفعہ میں نے ضد کی تو وہ کچھ خاموش سے ہو گئے، اور اس کے بعد پھر کبھی مجھے اصرار کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ کہتے ہیں ڈائری صرف اپنی ذات کے لئے ہوتی ہے، یہ ایک ایسی آپ بیتی ہے جسے کسی غیر کو پڑھنے کا حق نہیں ——— ڈیڈی یہ بھی کہتے ہیں کہ دوسرے کی ڈائری پڑھنا، لکھنے والے پر ظلم ہے، یہ تو دل کی کتاب ہے اور دل کا حال سوائے خدا کے کسی اور کو جاننا زیب نہیں دیتا ——— آج میں نے ڈائری لکھنے کا ارادہ کر لیا ہے، اس یقین کے ساتھ کہ جو کچھ اس میں لکھا کروں گی۔ اُسے کوئی دوسرا نہیں پڑھے گا۔

۱۳ر مارچ ———

یہ ڈائری نہ جانے کب شروع ہوتی، لیکن شام کو ایک عجیب بات ہو گئی، یونیورسٹی کی طالبات لان کے ایک کونے میں جمع تھیں۔ گفتگو کا موضوع بار بار بدل رہا تھا، اور بات میں بات نکلتی تھی، ہم سب ہنس بول رہے تھے، چہلیں ہو رہی تھیں، کبھی سلمیٰ، کبھی عابدہ اور کبھی احمدی کو نقلِ محفل بنایا جا رہا تھا کہ ناموں کا ذکر چل نکلا، عابدہ ایک دفعہ ہی مجھ پر ڈھل گئی، کہنے لگی "چلو میرا نام تو ماں باپ نے، غلط رکھا، مگر تم بتاؤ، یہ بنتِ قمر کیا ہوا؟ قدسیہ نے میری طرف سے جواب دیا" ان کا نام تو بالکل ٹھیک ہے شکل جو چاندسی پائی ہے، چشمِ بددور، ذرا پیچھے ہٹ کے دیکھو، ماہ پارا ہے یا نہیں؟ یہ قد موزوں، یہ ستھرے بال، یہ میدہ شہاب رنگ، یہ ماہتاب سا چہرہ۔ . . . ؟ مگر میں چُپ ہو گئی، دماغ میں بے شمار افکار بہ یک وقت تیزی سے گردش کرنے لگے، میں ایک بات اچھی طرح نہیں

سوچ پاتی کہ دوسری سطح ذہن پر اُبھر آتی تھی...... میں اُن سے نہ کہہ سکی کہ ہاں میرا نام بنتِ قمر ہے، میں قمرالزماں کی بیٹی ہوں۔ ڈیڈی نے یہ نام اس لئے تجویز کیا کہ وہ مجھے صرف اپنے وجود کا حصّہ سمجھتے ہیں، وہ مجھے سرتا پا اپنا ہی عکس تصور کرتے ہیں ـــ وہ یہ بھول جانا چاہتے ہیں کہ میری رگوں میں ایسی عورت کا بھی خون دَوڑ تا ہے، جس نے دوسرے مرد کی خاطر، اُن سے بے وفائی کی ـــ یہ عورت میری فرنگی ماں تھی جس نے میرے بڑے چچا کو اپنی زندگی کا ساتھی چُنا اور میری ماں ہوتے ہوئے بھی بڑے ابا کی ہوگئی، ڈیڈی نے اس سانحہ کو بہادر انسان کی طرح انگیزا اور اس کے بعد ان کی تمام توجہات، ساری شفقتیں مجھ پر مرکوز ہوگئیں، میں نے جب سے ہوش سنبھالا، یہی دیکھا کہ وہ زیادہ تر وقت میری تربیت اور نگرانی پر صرف کرتے ہیں، میرا بچپن اور لڑکپن، اُن ہی کی آغوش میں پروان چڑھا ہے، وہی میرے باپ اور وہی میری ماں ہیں۔ وہ مجھے اتنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے میرا نام بھی اپنے نام پر رکھا ہے ــــ لیکن یہ گھر کے لوگ مجھے کیوں نہیں بتاتے کہ ممی نے کیوں بے وفائی کی؟ کیوں انھوں نے ڈیڈی جیسے نیک دل اور اپنی کھیلتی مالتی بچّی کو چھوڑکر دوسرے آدمی کا گھر بسایا؟

جب وہ ڈیڈی سے علیحدہ ہوئیں تو میں بہت چھوٹی تھی، جدائی کے وقت کیا ہوا ہوگا، یہ مجھے خبر نہیں بلکہ جب ان کا انتقال ہوا تو میں سِنِ شعور کو پہنچ گئی تھی، شاید اس لئے کہ میں الگ رہنے کی عادی تھی، مجھے ان کی موت کا کوئی صدمہ نہیں ہوا، لیکن ڈیڈی رنج سے نڈھال ہوگئے، مجھے یاد ہے جس روز اُن کے مرنے کی خبر آئی ـــ وہ میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ بہت دیر تک یونہی دیکھا کئے حتیٰ کہ مجھے رونا آگیا، میں اٹھ کر اُن کے پاس چلی گئی اور انھوں نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔

ہمارا بھرا پُرا گھر ہے۔ کنبہ وسیع اور آسودہ حال ہے جب تک ڈیڈی نے مجھے سختی سے منع نہیں کیا، میں رشتے داروں سے اکثر ممی کے متعلق پوچھتی تھی، مگر صرف اتنا معلوم ہوا کہ ڈیڈی کی یہ شادی بھی غلط انتخاب کا نتیجہ تھی، پہلی شادی اس لئے ناکام رہی کہ وہ ان کی مرضی کے خلاف والدین نے کی تھی، ڈیڈی کو پہلی بیوی ایک آنکھ نہ بھائی اور انھوں نے ولایت سے آکر اُسے طلاق دیدی، ولایت میں اُنھوں نے ممی سے شادی کی اور وہ چند سال بعد انھیں چھوڑ کر بڑے ابا کے پاس چلی گئیں، تو گویا دونوں شادیوں میں انھوں نے ٹھوکر کھائی۔ دوسری ٹھوکر بڑی تکلیف دہ ثابت ہوئی، اس لئے انھوں نے پھر شادی نہیں کی ـــــ لیکن شادی میں ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا میاں بیوی کا غلط انتخاب زندگی کو اس قدر برباد کردیتا ہے؟

۱۸ مئی ـــــــ

صہیب حسن سے میری نسبت ہوئی ہے مجھے وقتاً فوقتاً خط لکھتے ہیں۔ ان خطوط کو پڑھ کر مجھے افسوس ہوتا ہے، پہلے وہ اپنی برتری جتاتے تھے، مگر میرے ٹوکنے پر انھوں نے تھوڑے عرصے کے لئے اپنا رویّہ بدل لیا۔ لیکن جب سے وہ بی اے۔ ایس امتحان میں شریک ہوئے ہیں، انھوں نے پھر شیخی بگھارنی شروع کردی ہے ان کے خیالات میں چھچھورپن ہے اور ان کی نظر میں عورت کی کوئی قدر و منزلت نہیں معلوم ہوتی، دس پندرہ دن ہوئے میں نے اُنھیں پھر لکھا کہ آپ یہ نہ بھولئے، عورت بھی انسان ہے اور شریف انسان عزتِ نفس کو ہر چیز پر ترجیح دیتا ہے بس اس بات نے جیسے شتابہ چھوڑ دیا۔ چنانچہ اب کے جو خط آیا ہے اُس میں وہ بدتمیزی پر اُتر آئے ہیں۔

اور مجھے بار بار یاد دلاتے ہیں کہ میں عنقریب اُن کی بیوی بننے والی ہوں، اس لئے مجھے ایسی کوئی بات نہیں لکھنی چاہئیے جو اُن کی شان میں گستاخی ہو، انھوں نے میرے اس خیال کا بھی مضحکہ اڑایا ہے کہ میں ایم۔ اے میں پولٹیکل سائنس لوں گی اور تاکید کی ہے کہ میں اب مزید تعلیم کا سودا اپنے دماغ سے نکال دوں، آخر میں انھوں نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں بے حجابی اور بے باکی یکسر ترک کر دوں اور شریفوں کی سی خو بو پیدا کروں تاکہ جب اُن کے نکاح میں داخل ہوں تو ہر لحاظ سے اُن کے لائق بن جاؤں ——— اس خط کو پڑھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میرا دامن پکڑ کر گھسیٹا ہے، جی میں آئی اس خط کے پُرزے پُرزے کر دوں اور اُنھیں لکھ بھیجوں کہ آئندہ آپ مجھے کوئی خط نہ لکھیئے، لیکن اس سے ان کا کیا بگڑتا؟ میں غصے سے کھڑی کھڑی کانپتی رہی اور جب تک میں نے اس کا جواب نہیں لکھ لیا مجھے قطعی تسلی نہیں ہوئی۔

۴ر جون ———

میرا خط پڑھ کر حمید آپے سے باہر ہو گیا ہے۔ اس دفعہ اس نے خط میں ایسی باتیں لکھی ہیں جن کی مجھے کبھی توقع نہ تھی۔ کیا وہ اس قدر گرا ہوا ہے، جو اس نے مجھے ممی کا طعنہ دیا ہے؟ اُس نے لکھا ہے "اتنا مغرور رہنا اچھا نہیں، ایسی بدزبان نہ ہو جاؤ کہ مجھے یہ شبہ ہونے لگے کہ تم اپنی فرنگن ماں کے نقشِ قدم پر چلوگی" یہ اُس نے خط نہیں لکھا، میرے دل پر گھونسہ مارا ہے، شادی کے بعد تو وہ میری چھاتی پر چڑھ بیٹھے گا، اٹھتے بیٹھتے ممی کے طعنے دے کر مجھے کچوکے دیا کرے گا، میری حالت کو کیا ہو گیا ہے۔ رونا چاہتی ہوں تو آنسو نہیں نکلتے، چیخنا چاہتی ہوں تو فریاد حلق میں اٹک جاتی ہے، ضبط کرتی ہوں تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ ڈیڈی، اے ڈیڈی! کیا آپ مجھے اس مردودے سے بیاہ دیں گے؟ اس خفاش سے، جو ابھی سے مجھے پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے؟ کیا یہ شریف آدمی ہے؟ کیا یہ کبھی مجھے رفیقۂ حیات سمجھے گا؟

۱۴ر اگست ———

آج جشنِ پاکستان ہے۔ چاروں طرف خوشیاں ناچ رہی ہیں، میری قوم کو آج کے دن آزادی ملی تھی اور میں بھی آج آزاد ہوئی ہوں ——— شب و روز سوچتے سوچتے، آخر صبح میں نے ڈیڈی کو حمید کے خطوط دکھائیے میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، اور پیشتر اس سے کہ میں کچھ کہتی، ڈیڈی نے نہایت شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "میں یہ منگنی ابھی توڑے دیتا ہوں"۔

آزادی کتنی بیش بہا شے ہے اسے میرا دل سمجھتا ہے، سچ کہتی ہوں، کل مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ کسی نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر مجھے کال کوٹھری میں ڈھکیل دیا ہے، میری راتیں اندھیری ہوتی جا رہی ہیں، اور اب افقِ حیات پر صبحِ آزادی کا پرچم کبھی لہراتا ہوا نہیں دیکھوں گی، مگر ڈیڈی، پیارے ڈیڈی نے میری قسمت کی بلائیں کاٹ ڈالی ہیں، انھوں نے غلامی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے پر ضرب کاری لگا کر، چراغِ نور پاش نصب کیا ہے ہاں اب وہ سیاہی میری زندگی کے مطلع سے ہمیشہ کے لئے چھٹ گئی ہے، میرے سامنے آزادی کا سورج لبِ بام جگمگا رہا ہے۔ آج ۱۴ر اگست ہے۔

۲۳ر اکتوبر ———

یہ سارا ہفتہ بڑا لطیف و پُرکیف گذرا، صبح وشام سیر و تفریح، دن رات خوش کُن باتیں، میری عم زاد بہن کے شوہر جنھیں میں بھائی صاحب کہتی ہوں، جب کراچی آتے ہیں تو گویا عید آجاتی ہے۔ وہ بڑے ہنس مُکھ اور خوش مزاج ہیں کوئی بتیس چالیس سال عمر ہوگی، مگر صحت مند اور جامہ زیب ایسے ہیں کہ بالکل نوجوان لگتے ہیں۔ طبیعت ایسی شگفتہ پائی ہے کہ ہر وقت کنول کا کھلا ہوا پھول معلوم ہوتے ہیں سُست آدمی سے اُنھیں چڑ ہے ــــ خود اس قدر چُست و چالاک ہیں کہ جوانی کا سراپا کہئے، ان کی زندگی رواں دواں ہے، ان کی گفتگو نغمہ ریز آبشار ہے، جمود سے انھیں وحشت ہوتی ہے، ان دنوں انھوں نے ہمیں خوب سیر کرائی، چچازاد اور پھوپی زاد بہنیں، بھائی، بھاوجیں اور کنبے کے دولھا، وہ سب کو اپنے ساتھ لے کر گئے، کبھی کلفٹن کے ساحل پر، کبھی ملیر کے باغوں میں، کبھی ہم سنیڈزپٹ کی لہروں میں گھنٹوں کھیلتے رہے۔ کبھی ہم نے ہاکس بے کی دل کش شاموں کا لطف اٹھایا، جس دن ہم گھر سے نہیں نکلے تو ہم نے سینما دیکھا، ہندوستانی فلم بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں، ان میں بے حیائی رچتی جارہی ہے۔ جسے دیکھ کر بعض دفعہ تو سینہ دھڑکنے لگتا ہے۔

اب کے میں نے ایک نئی بات محسوس کی، بہنوں، بھاوجوں یا بھائیوں میں اگر کوئی مجھ سے لڑتا جھگڑتا ہے تو بھائی صاحب فوراً میری حمایت کرتے ہیں، انھوں نے کئی مرتبہ کہا ــــ "کبھی بنتِ قمر پھول ہے۔ اسے کوئی دکھ نہ پہنچایا کرو، ورنہ یہ کمھلا جائے گی، اور ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگے "اب کے تم مجھے بہت یاد آؤ گی!" بھائی صاحب مجھے بے حد چاہتے ہیں، ان کے پیار میں خلوص اور بزرگی میں حمایت و حفاظت ہے ــــ لیکن اُن کی گھریلو زندگی کیوں تابناک نہیں؟ ــــ آپا نہ جانے کیسی بیوی ہیں! دل کی اتنی پیاری، پر زبان کی ایسی کڑوی، ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتی ہیں اور بھائی صاحب ہر دفعہ مُسکرا کر ٹال دینے کی کوشش کرتے ہیں ــــ ان میں بڑا صبر و ضبط ہے ــــ لیکن آپا ان کے سامنے اتنی چڑچڑی کیوں ہو جاتی ہیں؟ ــــ کیوں صرف انہی سے بدمزاجی کرتی ہیں ــــ؟ باقی سب کے ساتھ باتیں کرتی ہیں تو گویا منھ سے پھول جھڑتے ہیں، باجی سے اُن کی بڑی دوستی ہے۔ دونوں پُرانی سہیلیاں بھنیلیاں ہیں وہ اُن سے رازدارانہ دوپہر کو باتیں کررہی تھیں ــــ میں نے چُپکے چُپکے سُنا، کہ بھائی صاحب کو خوبصورت عورتیں بڑی پسند ہیں اس لئے وہ ان پر آنکس رکھتی ہیں۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں کہا کہ بھائی صاحب آوارہ ہیں بدچلن ہیں۔

خدا معلوم، یہ میاں بیوی کا تعلق کیسا ہے؟ ــــ چاہے دونوں میں اچھی نبھتی ہو، لیکن اندر سے ٹٹولا جائے تو یہ اس سے نالاں، وہ اس سے شاکی، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہاں میرے پھوپی زاد بھائی ہیں، امانت مرزا وہ اپنی بیوی کو خوب چاہتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ اپنی محبت کا اظہار اتنی شدومد سے کرتے ہیں کہ عجیب سا لگتا ہے، مگر کسی کو اس سے کیا۔ وہ خود تو اپنی بیوی کے پرستار ہیں اور اُن کی بیوی اُن پر جان چھڑکتی ہیں، دراصل امانت بھائی مولوی طبیعت کے ہیں، نماز کبھی قضا نہیں کرتے اور سارے شرعی احکام کی باقاعدہ تعمیل کرتے ہیں، اگرچہ ابھی ادھیڑ عمر کے ہوں گے مگر ان کا حلیہ دن بہ دن اسلامی ہوتا چلا جاتا ہے، ماتھے پر سجدوں کا نشان، بھرواں ڈاڑھی، کتری ہوئی لبیں اور کثیر الاولاد، یعنی اللہ میاں کی ساری برکتیں انھیں میسر ہیں۔ پچھلی دفعہ جب ہم سیر کو گئے تو میں ایک دن سمندر میں اُتر کر پانی سے خوب کھیلی تھی، سب ہی ہنسنے بولنے میں

مشغول تھے۔ میں نے ایکا ایکی جو نظر اٹھائی تو امانت بھائی میری پنڈلیوں کو جو پائینچے سمٹنے سے کھُل گئی تھیں، بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کچھ خیال نہ کیا۔ پھر بھی میں محسوس کرتی ہوں کہ ان کی نظریں مجھ پر اکثر جمی رہتی ہیں ۔ آخر وہ مجھے یوں کیوں دیکھنے لگے ہیں ـــــ مگر نہیں، یہ میرا واہمہ ہوگا۔ وہ بیاہتا ہیں ۔ اور اپنی بیوی پر فدا ہیں۔

۱۲ر جنوری ـــــ

اس دوران میں میری کئی نسبتیں آئیں مگر ڈیڈی نے میرے لئے جو رشتہ پسند کیا ہے وہ سب سے اچھا ہوگا۔ ایک دن پھوپھی چھوٹی چچی سے کہہ رہی تھیں "خدا کرے قمر کے سہرے کے پھول جلدی کھلیں، بھائی بڑے متفکر رہتے ہیں ۔" لیکن ایسی جلدی کی کیا ضرورت ہے؟ ماں باپ کیوں چاہتے ہیں کہ بیٹی جلدی ان کے گھر سے چلی جائے، اور میرے ڈیڈی تو مجھ کو اتنا چاہتے ہیں کیا وہ مجھے اپنے سے علیحدہ کرکے رنجیدہ نہیں ہوں گے، اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ میں اپنے دولھا کے پاس چلی جاؤں گی تو وہاں ہمیشہ مسرور و شاداں رہوں گی۔

۱۶ر فروری ـــــ

اس وقت میں بڑی مشکل سے، اپنے کو سنبھالے ہوئے یہ سطریں لکھ رہی ہوں، پرسوں . . . میری زندگی میں ایسا طوفان آیا۔ جس نے میرے ہوش و حواس مختل کر دیئے ہیں، رات کو میں حسب معمول بے فکری کی نیند پڑی سو رہی تھی کہ . . . . ہائے میں کیسے لکھوں، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے جسم پر کوئی بے تابی سے ہاتھ پھیر رہا ہے۔ خوف سے میری زبان گنگ ہوگئی، سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں، لیکن میں کشمکش کرتی رہی اور وہ جلتا ہوا ہاتھ، کبھی میری باہوں، کبھی کمر اور کبھی پنڈلیوں کی طرف بڑھتا رہا۔ ذرا دیر میں میری ہمت واپس آئی تو میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا ـــــ یہ دہکتا ہوا ہاتھ بھبکتا ہوا چہرہ ـــــ بھائی امانت مرزا کا تھا۔ مولوی امانت کا، اور وہ دم بہ دم مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کے لئے مچلے جا رہا تھا۔ میں نے پوری طاقت سے چیخنے کی کوشش کی، مگر کسی نے فوراً میرے کان میں کہا "ایسا نہ کرنا ایسا نہ کرنا، تم بدنام ہو جاؤ گی ـــــ تم عورت ہو!" میرا دماغ ماؤف ہوگیا، میری قوت فیصلہ جواب دے گئی اور مجھے بے حس و حرکت پاکر اس عفریت نے مجھے ننگا کرنا چاہا، تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ "چھوڑ دے، ظالم مجھے چھوڑ دے۔ میں تیری بہن ہوں، دیکھ برابر کے کمرے میں تیری بیوی جاگ جائے گی . . . . . . خدا کے لئے میرے جسم کو ہاتھ نہ لگا، میری شادی ہونے والی ہے، میرے کنوار پنے کو بے داغ رہنے دے، میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں" ـــــ لیکن یہ سب باتیں میری زبان سے نہیں نکلیں اور وہ شیطان اپنی مکروہ صورت، میرے چہرے کے قریب سے قریب تر لانے کی کوشش کرتا رہا ـــــ پھر دفعتاً میرے کانوں نے سُنا کہ میری زبان میں گویائی آگئی ہے اور میری روح چیخ چیخ کر فریاد کر رہی ہے ـــــ "ڈیڈی!" ـــــ

اس کی گرفت یک لخت ڈھیلی پڑ گئی اور اس کے گہرے گہرے سانس بھاری ہوتے گئے، میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور میں دم بخود بستر پر پڑی دیکھتی رہی کہ وہ چوروں کی طرح، دبے پاؤں، رُکتا رُکتا میرے کمرے سے باہر نکل گیا ـــــ

۱۰ر فروری ——————

میں کئی دن سے اپنے کمرے میں الگ تھلگ پڑی ہوں، غصّے، حیرت اور رنج نے مجھے شل کر دیا ہے۔ جی میں طرح طرح کی باتیں آتی ہیں۔ سوچتی ہوں کہ جا کر ڈیڈی یا پھوپھی سے کہہ دوں، پھر خیال آتا ہے۔ اس کا نتیجہ بہت بُرا ہوگا۔ نہ جانے ڈیڈی کیا کر گذریں، اور خود امانت کی بیوی کا کیا حال ہوگا جو اس مغالطے میں مبتلا ہے کہ میرا شوہر میرا عاشق ہے — یہ بات کھُل گئی تو صرف انہی کی نہیں، سارے خاندان کی خوشیاں تباہ ہو جائیں گی، گھر کے کسی فرد پر کسی کو بھروسہ نہیں رہے گا۔ اندیشہ ہائے دور دراز مجھے کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں، کم حوصلگی اور مصلحتوں نے میرے لبوں پر مہر خاموشی لگا دی ہے، لیکن میں امانت کو ہرگز معاف نہیں کروں گی، اُس نے میری عصمت کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے۔

۱۵ر فروری ——————

وقت تیزی سے پرواز کر رہا ہے، آج سو کر اٹھی تو دل کا بوجھ قدرے ہلکا تھا، ڈیڈی نے کہا "تمھاری طبیعت کئی دن سے سُست ہے، تم میرا کہا کیوں نہیں مانتیں؟ آج ڈاکٹر کو ضرور بلوا لو" اُن کا کہنا بھی ٹھیک تھا۔ اگر یونہی منہ لپیٹے لیٹی رہتی تو ان کو ناحق پریشانی ہوتی، چنانچہ میں نے روزانہ کا معمول شروع کر دیا ہے۔

سہ پہر کو کالج سے واپس آئی تو بیچ کے کمرے میں وہ صاحب ایمان، امانت جا نماز پر کھڑا تھا، میرے پاؤں بلا ارادہ رُک گئے، اور اُس نے متانیت توڑ کر میری طرف دیکھا، میری آنکھوں سے شعلے برسنے لگے اور میں تیزی سے اُس کے پاس پہنچی، تو اُس نے چھوٹتے ہی کہا "میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، بہت دن سے دل کے ارمان دل میں دبے ہیں ——" میں غصّے سے بے قابو ہو گئی۔ "فریبی! شادی شدہ ہو کر. . . . " میری زبان نے آگے ساتھ نہ دیا اور وہ شکل کا مولوی چرب زبانی سے بولا — "تم راضی ہو جاؤ، تو میں فیروزہ کو چھوڑ دوں گا، اور ——" یہ تو حد ہو گئی — مجھے ایک دھکا سا لگا، اور میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا — "تو کمینہ ہے" —— اتنے میں بھابی فیروزہ کی دور سے مسرور لہجے میں آواز آئی — "دیکھنا تم جو میرے لئے آج چکن لائے ہو، وہ واقعی لاجواب ہے"۔

میرا خیال خود بخود بھابی فیروزہ کی طرف چلا گیا، جو صحن میں بیٹھی چھپا چھپ چکن کا کرتہ سی رہی تھیں لیکن اُنھیں نہیں معلوم تھا کہ میری محبت کا دم بھرنے والا شوہر ایک دوسری عورت کی خاطر، چاہے جس وقت مجھے لات مار کر گھر سے باہر نکال دے گا — اس تصوّر نے میرے غصّے کو فرد کر دیا اور میں نے حسرت سے اس ملعون کی طرف دیکھا، جو میری خشمناکی اور بیوی کے ڈر سے، مصلّے پر بیٹھے بیٹھے رکوع میں چلا گیا تھا۔

۲۸ر فروری

وہ جو پنج وقتہ نمازی، پرہیزگار، مولوی امانت ہے، اس کی بزرگی کا بُت زمین پر اوندھے منہ گر پڑا ہے، پہلے میں اس کا جس قدر احترام کرتی تھی اب اتنا ہی اس کو ذلیل سمجھتی ہوں، عمر کے تفاوت اور اُس کے مذہبی ڈھکوسلے کے سبب پہلے مجھ پر اس کا بڑا رعب تھا اب میں نڈر ہو گئی ہوں اور اُسے بڑی حقارت و نفرت سے دیکھتی ہوں، وہ میری نظروں کو پہچانتا ہے لیکن کچھ نہیں کہتا، احتجاج تک نہیں کرتا۔

۱۴ر اپریل ــــــــــ

کوئٹے سے بھائی صاحب کا خط آیا ہے، ڈیڈی کو اور مجھے بلایا ہے، لکھا ہے یہاں موسم بڑا دلکش ہے، یہاں کی آب و ہوا آپ کے لئے مفید ہوگی، ڈیڈی نے مجھ سے پوچھا۔ "تم چلوگی"؟ میں نے کہا۔ "شوق سے چلوں گی"۔ بھائی صاحب مجھے اکثر یاد آتے ہیں، اور آپا کو دیکھے ہوئے بھی بہت دن ہو گئے ہیں۔

۱۵ر مئی ــــــــــ

سنگ زارِ بلوچستان کا دور دور تک پھیلا ہوا بے آب و گیاہ علاقہ بڑا بے رونق ہے، راستے میں خشک چٹانیں بدصورت ٹیلے اور بے ہنگم پہاڑیاں دیکھ کر مجھے کوفت ہوئی، مگر جب ہم کوئٹہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس لحیم شحیم بھونڈے اور بھدّے جسم کے اندر بھی ایک دل ہے، نازک شاداب اور حسین، یہ ایک ایسا نخلستان ہے جہاں شیریں پانی کے چشمے بہتے ہیں جہاں درختوں کی چھاؤں ٹھنڈی ہوتی ہے، جہاں ساری فضا پُرسکون اور خیال افروز ہے۔

کوئٹہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا شہر ہے، جہاں امیر بہت زیادہ آسودہ حال اور غریب بہت زیادہ فلاکت زدہ ہے، یہاں کانیں ہیں، منڈیاں ہیں، تجارت ہے، یہاں مزدوری ہے، چاکری ہے مفلسی ہے سیلانیوں کے لئے عیش ہیں، پھلوں اور گوشت کی فراوانی ہے۔ بلوچیوں کے لئے جفاکشی ہے، محرومی ہے اور آمدنی کی نایابی اتنی کہ وہ بمشکل روٹی کو پانی میں بھگو کر کھاتے ہیں، لیکن خدا نے انھیں غیرت سے مالا مال کیا ہے شکستہ پائی اور بوسیدہ حالی کے باوجود، وہ تندرست و توانا ہیں ان میں خون کی کمی نہیں، انھیں طاقت کی دوا نہیں چاہیے۔ انھیں قدم قدم پر احتیاطوں کی ضرورت نہیں، وہ جو یہاں روپیہ کمانے آئے ہیں، مزے سے اپنی خواب گاہوں میں آرام کرتے ہیں، یہ جو بلوچ زادے ہیں مہمانوں کے بھیس میں آنے والوں کی خاطر، خون پسینہ ایک کرکے اپنے گھر کی دولت ان کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں اور خود الگ کھڑے ہو جاتے ہیں کہ لے جاؤ، یہ سیم و زر تمہارا ہے۔ اس پر تمہارا ہی حق ہے، تم اتنی دور سے چل کر جو اسے لینے آئے ہو! دولت مند ٹھٹھے لگاتا ہے اور غریب بلوچی آسمان کی طرف منھ اٹھاکر دیکھنے لگتا ہے کہ کب تک یہ جہالت کا اندھیرا چھایا رہے گا؟ کب علم کی روشنی یہاں تک پھیلے گی؟ کب خدا ہمیں احساس اور اہلیت دے گا کہ ہم اپنی دولت سے خود متمتع ہوں؟

۲۰ر مئی ــــــــــ

یہاں کئی قدرتی سیرگاہیں ہیں جہاں انسان بازاروں کی گہما گہمی اور ٹریفک کے ہنگاموں سے محفوظ ہو کر اپنے تفکرات بھول جاتا ہے، مجھے یہ خاموش مقامات ہمیشہ یاد رہیں گے خصوصًا برورّی جہاں ہم لوگ کل پک نک کے لئے گئے تھے، یہ شہر سے چند میل کے فاصلے پر ایک عمدہ تفریح گاہ ہے، جہاں چٹانیں اور پہاڑیاں اس طرح آگے پیچھے اور دائیں بائیں کھڑی ہیں گویا انھیں کسی خاص مقصد سے ترتیب دیا گیا ہے ہمارا مختصر سا قافلہ جس میں بھائی صاحب، ڈیڈی، آپا، بچّے اور ملازم شامل تھے، برورّی کے دامن میں چوٹی کی طرف خراماں خراماں آگے بڑھتا جاتا اور ہمارا راستہ کبھی کشادہ، کبھی تنگ اور کبھی پھر وسیع ہو جاتا تھا دائیں جانب ایک لمبی پختہ نالی تھی جس میں چشمے کا شفاف پانی اٹھلاتا، ناچتا، گاتا ہوا تیزی سے بہہ رہا تھا،

ہم اُس آبِ رواں کا مخرج نہ دیکھ سکے۔ جو کہیں بلندی پر پہاڑوں میں چھپا ہوگا، لیکن وہ ہم سے بے خبر اپنی منزل کی طرف مصروفِ سفر تھا، جو بہت دور نیچے آبادی میں تھی، چلتے چلتے بچے تھک جاتے تو کسی کی گود میں آجاتے، آپا کچھ تھک سی گئی تھیں، ڈیڈی بیٹھنے کی جگہ تلاش کر رہے تھے اور بھائی صاحب حسب معمول لطیفے سُنا سنا کر ہمیں اور آگے بڑھنے پر اُکسا رہے تھے اتنے میں ایک بڑا سا میدان آیا جس کے ایک جانب اونچی اونچی پہاڑیوں، کے دو سلسلے حبش کے وفادار غلاموں کی طرح کھڑے پہرہ دے رہے تھے، معلوم نہیں ان کے درمیان راستہ قدرتی تھا یا قرنوں پیشتر انسانی ہاتھوں نے پتھر کے سینے کو چیر کر اسے بنایا تھا۔ کیا خبر غیر متمدن ہندوستان کو فتح کرنے والے جاں باز سینکڑوں سال پہلے اسی راہ پر گامزن ہوئے ہوں اور اس وقت ان کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سے یہ سارا سلسلہ کوہ گونج اٹھا ہو، جب ہم اس درے سے گذر کر باہر آئے تو آپا کی ہمت نے جواب دے دیا اور ڈیڈی نے ایک اونچی سی جگہ کی طرف اشارہ کر کے اعلان کیا کہ یہیں ہمارا ڈیرہ جمے گا، دن بھر سب لوگ گھومتے پھرتے رہے، بچے روتے کھیلتے رہے، آپا کھانا کھلا کر فارغ ہوئیں تو پکوان لے کر بیٹھ گئیں اور ڈیڈی کتب بینی میں مشغول ہو گئے، میرا دل اس ماحول سے کسی طرح نہیں بھرتا تھا، دور دور تک ہو آنے کے باوجود میری طبیعت یہی چاہتی تھی کہ ابھی اور چلوں ابھی اور دوڑوں، بھاگوں، سب تھک کر ستانے بیٹھ گئے، مگر بھائی صاحب نے میرا برابر ساتھ دیا، بلکہ جب میں نے ڈیڈی سے کہا کہ بس سامنے والی پہاڑی کے اوپر اور ہو آؤں، تو اس وقت بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری، چنانچہ، جب ہم منزل، منزل چوٹی پر پہنچے تو میرا سانس پھول گیا، بھائی صاحب بھی ہانپنے لگے تھے اس لئے ہم ایک کالی سی عمودی چٹان کی اوٹ میں تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ گئے۔ میلوں پرے نشیب میں کوئٹہ کی چھوٹی سی آبادی سبزے میں گھری ہوئی نظر آرہی تھی، جگہ جگہ پھلوں کے باغات کھڑے لہلہا رہے تھے، دور دراز سے آنے والی ہوا اپنے دوش پر جنگلی پھولوں کی خوشبو اور بلوچستان کی خنکی لئے آرہی تھی، ڈھلتے ہوئے سورج کی روشنی میں، دور نزدیک ایک طلسم سا بندھا تھا اور اس میں گم ہو کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اسی جگہ کے لئے پیدا ہوئی ہوں، یہ چٹانیں، یہ بلندیاں، یہ خاموشی، یہ پُر سکون مقام، کتنا امن ہے یہاں! کتنی آزادی ہے اس ماحول میں! اور جب میں اپنے خواب سے چونکی تو آپ ہی آپ میرا سر بھائی صاحب کے شانے پر آگیا، وہ بڑی ملائمت سے بولے "کس گہری سوچ میں ہو، واپس نہیں چلو گی؟" میں نے جواب دیا "ذرا اور ٹھہر جایئے میرا دل یہاں سے جانے کو نہیں چاہتا" —— پھر ہم دونوں قدرت کی بوقلمونیوں اور زندگی کے اُجلے رُخوں پر باتیں کرنے لگے، ایسی باتیں جن میں شیرینی اور خلوص تھا، ہمدردی اور ہم خیالی تھی اور جب سورج ارغوانی ہونے لگا تھا تو بھائی صاحب نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا، ان کے کندھے پر سر رکھ کر، ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر ان کے اتنے قریب بیٹھ کر مجھے بڑی راحت ہوئی۔ افسوس یہ وقت کتنی جلدی گذر گیا۔

۱۵ / جون ——

آپا کو اللہ نے ایک اور چاند سا بیٹا دیا ہے —" بالکل چینی کا ہوا لگتا ہے —— مسکراتا ہے تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے، ہمکتا ہے تو جی چاہتا ہے سینے سے چمٹا لوں —— بھائی صاحب کے سب بچے پیارے ہیں مگر یہ سب سے بڑھ گیا، اس کے خدوخال بھائی صاحب کے سے ہیں اس کی آنکھوں میں ان کی جھلک ہے،

مجھے ننھے بچے اچھے نہیں لگتے، وہ کلبلاتے ہیں تو مجھے پھریریاں سی آتی ہیں۔ مگر بھائی صاحب کا یہ منّا مجھے بہت ہی اچھا لگتا ہے آپ ہی آپ مجھے اس پر پیار آتا ہے، پرسوں ہم لوگ واپس جا رہے ہیں، روانگی کے خیال سے میں افسردہ ہو گئی ہوں، کاش یہ ممکن ہوتا کہ میں اپنے ساتھ لے جا سکتی۔

۳رجولائی ـــــــــ

۱۶ر تاریخ کو میری شادی ہے جوں جوں دن قریب آتا جاتا ہے، شوق اور وحشت بڑھتی جاتی ہے۔ خدا جانے ایوب کس مزاج کے آدمی ہیں ان کے خیالات کیسے ہیں، ان کے رجحانات کیا ہیں اور ہم دونوں کی کیسی نبھے گی؟ ـــ صبح میں نے ان کی تصویر بھی دیکھی، بڑے وجیہہ معلوم ہوتے ہیں۔ طبیعت بھلی ہو گی، میں کوشش کروں گی کہ ہم جلد ایک دوسرے سے واقف ہو جائیں۔ اگر دونوں ایک دوسرے کا احترام ملحوظ رکھیں۔ تو ہمارا مستقبل ضرور خوش آئند ہو گا۔ لیکن سب ایسا کیوں نہیں کرتے؟ اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتی ہوں۔ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر شادیاں ناکام ہیں، میاں بیوی کے جذبات و احساسات میں ہم آہنگی نہیں، وہ درگذر چشم پوشی اور فراخ دلی کو اپنی عادت نہیں بناتے۔

یکم ستمبر ـــــــــ

الٰہی یہ کیا ہو گیا؟ شادی کے نام سے مجھ پر یہ کیسا ستم ٹوٹا ہے؟ ایوب میں تو سرے سے آدمیت ہی نہیں، وہ تو انسان کا نقلی چہرہ لگا کر، مجھے بیاہنے آیا تھا۔ وہ سرتا پا ـ حیوان ہے ـــــ اور عورت کو صرف عیش و عشرت کا ذریعہ سمجھتا ہے شروع میں تو میں ہکّا بکّا رہ گئی اور سوچتی رہی کہ مرد اور عورت کا یہ رشتہ آخر بنا کیوں ہے؟ عورت کو پا کر، مرد کیوں بلندئ خیال اور پاکیزگئ نفس سے محروم ہو جاتا ہے؟ ـ کیوں تنہائی میں، وہ اشرف المخلوقات نہیں رہتا؟ لیکن سب مرد تو ایسے نہ ہوتے ہوں گے، یہ ایوب ہی ہے جو صرف میرے جسم کی لذت چاہتا ہے۔ وہ میرے دل میں کبھی نہیں اُترتا، میں اس سے بات کرتی ہوں، تو کوئی اثر نہیں لیتا، اُسے صرف میرا حسن چاہیئے حسن، اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ جب کچھ عرصے بعد میں بھی دوسری عورتوں کی طرح بھدّی اور بے ڈول ہو جاؤں گی۔ تو وہ مجھ سے بیزار ہو جائے گا، مجھے مجبور و مقہور چھوڑ دے گا۔

ایوب ریچھ کی طرح ہے، اس کے سینے پیٹھ، ہاتھوں بلکہ سارے جسم پر اس قدر بال ہیں کہ دیکھ کر کراہیت ہوتی ہے، وہ جب اپنے ہاتھ میری طرف بڑھاتا ہے تو میرے بدن پر سینکڑوں چھپکلیاں رینگ جاتی ہیں اور میرا جی چاہتا ہے کہ کمرے سے نکل بھاگوں اور کہیں روپوش ہو جاؤں، لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ میں ہنوز اپنی سسرال میں قید ہوں، میری سہیلیاں بھی یہاں نہیں، جو میرے دل کا حال سن سکیں۔ جن سے میں پوچھ سکوں "سچ بتاؤ، کیا بیوی اسی کو کہتے ہیں؟"

۲ر اکتوبر ـــــــــ

میں نے کنوارپنے میں شادی کے جو محل بنائے تھے وہ ڈھے گئے ہیں، ایوب جنگلی اوباش ہے۔ اُسے مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں، وہ مجھ سے یوں پیش آتا ہے، جیسے میں اس کی رفیقہ حیات نہیں، بس ایک عورت ہوں، اس کے دل میں بہت سی عورتیں ہیں، اور جب کسی عورت کا خیال، جسے وہ نہیں پا سکا، اسے دیوانہ

کر دیتا ہے تو اس کا بدلہ مجھ سے اُتارتا ہے۔ کبھی گھسیٹ کر مجھے اپنے سے چمٹا لیتا ہے۔ کبھی میں مزاحمت کرتی ہوں تو اول نول بک کر دھکا دیدیتا ہے، کل میرے بڑی چوٹ لگی اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں خیالات میں کھو گئی اور ہوتے ہوتے مجھے بھائی صاحب اور آپا یاد آ گئے۔ تو میں نے کہا "آپا، بھائی صاحب کو کچھ نہ کہا کرو۔ تم نے مرد نہیں دیکھے!!"

۲ر اکتوبر ــــــــــ

میں بڑی مشکل سے میکے آئی ہوں، یہ میرا اپنا گھر تھا مگر آج یہ مجھے بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ قدم قدم پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں کوئی غیر ہوں، مہمانوں کی طرح میری خاطریں ہوتی ہیں اور بار بار مجھے یاد دلایا جاتا ہے کہ میں بہت جلد اپنے گھر واپس چلی جاؤں گی۔ ڈیڈی بھی جو میرے آنے سے بے حد خوش ہیں، موقع دیکھ کر یہی نصیحت کرتے ہیں کہ میرا اصلی گھر میرے شوہر کی دہلیز ہے اور مجھے تمام عمر وہیں رہنا ہوگا جیسے رخصت کے وقت انھوں نے مجھے سمجھایا تھا۔ــ وہ باتوں باتوں میں اب بھی یہی دُہراتے ہیں کہ جس شخص سے ایک دفعہ دامن بندھ جائے، ساری زندگی اسی کی ہو کر گذار دینی چاہیے، یہی شرافت کا تقاضا اور نسوانیت کا فرض ہے۔ مگر وہ مجھے یہ سبق کیوں دیتے ہیں؟ جی میں آتا ہے، اُن سے کہدوں "ڈیڈی! میں بڑی تکلیف میں مبتلا ہوں، میرے اور ایوب کے درمیان کوئی ذہنی ہم آہنگی اور مفاہمت نہیں۔ . . . نہیں نہیں یہ میں کبھی نہیں کروں گی، اُن کو اگر شبہ بھی ہو جائے تو ان کا دل ٹوٹ جائے گا، اور کیا خبر، طیش میں آ کر وہ میری ماں کا طعنہ دیدیں، کہ میرے خون میں شوہر پرستی کا جذبہ اور شرافت مفقود ہے، اس لئے مجھے اپنے کردار پر شرافت کی مہندی لگانی پڑے گی، ایوب میری اہانت کرے گا، اور میں اسے سر آنکھوں پر بٹھاؤں گی، وہ مجھے جلائے گا اور میں مُسکراتی رہوں گی۔

۲۵ر اکتوبر ــــــــــ

کل رات گئے تار آیا کہ ہارٹ فیل ہو جانے سے، ایوب کا انتقال ہو گیا، تھوڑی دیر میں وہاں جانے کے لئے سوار ہو رہی ہوں، دنیا کی رسوم کے مطابق مجھے سوگ کا پیراہن پہننا پڑے گا، لیکن دراصل میں رنجیدہ نہیں ہوں، اس کے یوں اچانک مر جانے کا افسوس ضرور ہے۔

میں عدت پوری کر کے واپس آ گئی ہوں۔ ڈیڈی ایوب کی موت سے بے حد متاثر ہوئے ہیں ان کے دل پر دہلا کہ بیٹھ گیا ہے کہتے ہیں یہ میرے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تمھاری بیوگی دیکھنے کے لئے زندہ رہوں گا۔ ان کو یہ غم کھائے جاتا ہے کہ میرا گھر پھر بسا دیں، مگر میں اب شادی نہیں کروں گی ــــــــ میرا دل پک گیا ہے۔

امانت مرزا جو اس عرصے میں اور زیادہ عابد و متقی بن گئے تھے پھر میری طرف گھور گھور کر دیکھنے لگے ہیں، ان کو گانے کا بھی شوق ہو گیا ہے اور وقتاً فوقتاً ہجر و فراق کے اشعار آپ ہی آپ گنگناتے رہتے ہیں، مگر میں جانتی ہوں کہ یہ عشقیہ کلام کس لئے ہے؟

۵ر مارچ ــــــــــ

کوئٹہ سے خط آیا ہے کہ بھائی صاحب سخت علیل ہیں، معمولی سی بیماری نے خطرناک صورت اختیار

کرلی ہے، ان کی گھبراہٹ اور کم خوابی نے آپا کو پریشان کر دیا ہے، یہ خبر پڑھ کر میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ خدا کرے وہ جلد اچھے ہو جائیں، اُن کی آئی کسی اور کو آجائے، ان کی بجائے امانت مرجائے، میں مرجاؤں۔

اگر خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو کیا ہو گا، اس تصوّر سے ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا جاتا ہے میں کسی ایسی دنیا میں چلی جاتی ہوں، جہاں اچانک خزاں آگئی ہے، جہاں ہر طرف حسرت اور اداسی چھائی ہوئی ہے، جہاں گل بوٹے نہیں کھلتے، — جہاں سبزہ نہیں لہلہاتا، یہ کیسی فضا طاری ہو رہی ہے؟ ایک بھائی صاحب کے نہ ہونے سے، کس نے زندگی کی آرائش نوچ لی ہے، کس نے اس چمن کا سہاگ لوٹ لیا ہے؟ —— کیوں ایک، صرف ایک شخص کے چلے جانے سے آبشاروں کے نغمے ٹوٹ گئے ہیں، خوشیوں کی تابندگی مٹ گئی ہے، — زندگی کا بانکپن غروب ہو گیا ہے؟ —— میں ڈیڈی کے ساتھ کوئٹہ جا رہی ہوں —— کل صبح سے پہلے کوئی گاڑی نہیں جاتی —— ساری پہاڑ سی رات باقی ہے —— ایک ایک پل گذارنا عذاب معلوم ہو رہا ہے۔ ابھی گیارہ ہی بجے ہیں — اتنی دیر سے یہی بج رہا ہے، سوئیاں کیوں تیزی سے نہیں چلتیں، یہ سیاہ شب کیوں جلدی دم نہیں توڑتی؟ ——

صبح ہوتے ہی ہم سوار ہو جائیں گے۔ خدا کرے گاڑی کہیں لیٹ نہ ہو، پرسوں دوپہر تک کوئٹہ پہنچ جائیں گے اور میں سیدھی بھائی صاحب کے پاس چلی جاؤں گی، فوراً ان کے سرہانے بیٹھ کر ان کا سر اپنی گود میں لے لوں گی اور آہستہ آہستہ سہلاؤں گی، اُن سے باتیں کروں گی، برّوری کی پہاڑیوں پر جو ہم نے شام گذاری تھی وہ انھیں یاد دلاؤں گی اُنھیں سکون آجائے گا، اُنھیں ضرور نیند آجائے گی . . . . . لیکن لیکن، کوئی میری راہ میں حائل ہو رہا ہے، کہتا ہے ایسا نہیں ہو سکتا، میں ان سے سب کے سامنے گھُل مل کر باتیں نہیں کر سکتی، ان کے پاس یوں آزادانہ نہیں بیٹھ سکتی، کوئی میرا دل پکڑ کر بھینچتا ہے، میرے اٹھتے قدم کو روکتا ہے —— یہ ناصح ٹھیک کہتا ہے۔ یہ میرا نادیدہ ہادی مجھے عرصہ سے سمجھا رہا تھا، مگر میں نے اس کی بات کبھی نہیں مانی، میں یہی کہتی رہی، "تو جھوٹا ہے، تو مجھے نہیں سمجھا، میرے دل میں چور نہیں ہے۔ میں بھائی صاحب کو آپا سے چھیننا نہیں چاہتی" اور وہ مجھے یہ جواب دیتا "تم بے شک سچ کہتی ہو اور میں تمھیں جانتا ہوں، مگر دنیا نہیں جانتی، اسے تمھاری باتوں پر اعتبار نہیں آئے گا۔ تم جس حد کو توڑ کر آگے جانا چاہتی ہو، وہ بہت سنگین اور بلند ہے، اس سے ٹکراؤ گی تو پاش پاش ہو جاؤ گی" پہلے میں نے اس کا کہا نہ مانا، لیکن ابھی ابھی اس نے یہ بات بھی کہی ہے۔ "صرف تم ہی برباد نہیں ہوگی اس کی لپیٹ میں دوسرے بھی آجائیں گے، تمھاری آپا، ان کا ننھا منّا گھرانا تمھارے بھائی صاحب!!"

یہ میرے دل نے بھرپور وار کیا ہے، جس سے میں پسپا ہو گئی ہوں، مجھ میں بغاوت کی بھی ہمت نہیں رہی میں کوئٹہ جاؤں گی تو دور ہی دور سے اُنھیں دیکھوں گی، آنکھیں روئیں گی تو آنچل کی اوٹ میں انھیں بہلاؤں گی — مجھے اپنی قسمت معلوم ہو گئی ہے، میرے لئے موسم خزاں آگیا ہے، میں اب چراغ کشتہ کی مانند خاموش ہو جاؤں گی۔

(شمارہ ۱۲ — ۱۱ — ۵۲ ۶)

تسنیم سلیم چھتاری

کاش

جتنی نئی لڑکیاں بڑھتیں اتنی ہی ان کی نئی نئی حرکتیں بڑھنے لگتیں اور اسی مناسبت سے اس کے نت نئے نام رکھے جاتے۔ سب اپنے اپنے تجربہ کے مطابق مختلف ناموں سے پکارتیں۔

شبلا کہتی ۔ "ڈھیٹ"

تو ـــ سرلا کہتی "ضدی"۔

صفیہ کہتی ۔ "بدتمیز"

تو رضیہ کہتی "خبطی"

اسی طرح بہت سے نام "بے شرم" "آوارہ" "سنگ دل" اور تو اور آپا بھی تو اسے "ہرجائی" کہتی تھی ۔

اور میرا ـــ میرا دل بھی چاہتا کہ میں اُسے کچھ کہہ کر پکاروں، کوئی ایسی بات جو بالکل ہی چپک جائے ۔ مثلاً "گرگٹ"۔ یہ میرا ذاتی تجربہ نہیں لیکن نہ تو وہ شروع سے آخر تک یکساں ہی رہا ۔ مگر یوں کہئے رنگ یہ تھا، پلک موندتے کچھ کا کچھ ہو جاتا جیسے کہ سچ مچ کا گرگٹ !

وہ ایک طرف سے لے کے سب ہی سے محبت کرتا تھا، بس اگر نفرت تھی تو میرے دم سے ! ۔ نفرت ہی سمجھو جب ہنس کے بولنا تو درکنار، مجھ سے بات کرنا ہی گوارا نہ تھا ـــ ممکن ہے اس کی یہ وجہ ہو کہ میں سب سے چھوٹی تھی ! ـــ کم ازکم اس سے تو بہت ہی چھوٹی تھی ـــ شاید اسی لئے میں اپنی مرضی کے مطابق اسے گرگٹ کہہ کر نہ پکار سکی ۔ اور مجھے اس کا بہت دکھ تھا۔

اس کا اصل نام زیدی تھا ۔ اس کے نوکر نے مجھے یہ نام بتایا ورنہ یہاں تو سب اپنا اپنا راگ الاپتی تھیں ـــ بلا سے اس کے اماں باوا نے کچھ نام رکھا ہو ۔ میں پہلے کی بات نہیں کہہ سکتی ۔ البتہ جب سے یہاں آئی تھی اس کو اسی طرح پریوں کے بیچ میں راجہ اندر بنے دیکھا ـــ سب اس کے اشارے پر ناچتی تھیں، سارے ناچ ـــ وہ بھی جو پریاں سات برقعے اوڑھ کر ناچتی ہیں اور وہ بھی جن میں کپڑوں کی بندش ہی نہیں لگائی جاتی۔

ہمارے فلیٹ کے برابر جولا لہ جی رہتے تھے ان کی دو بیویاں تھیں اور صبح شام ہی نہیں ساری ساری رات وہاں شہنائیاں بجتیں اور پکے راگ سُر تال کی پوری واقفیت کے ساتھ گائے جاتے ـــ جب دونوں للائنوں میں سے کوئی ایک گنگری لیتی تو

"جھنن جھنو ابا ہے" یا "جا میں تو سے نہ بولوں" کے بجائے کچھ ایسے جملے کانوں میں پڑتے کہ میرے خیال میں وہ زبان ہندوستان کی حدود میں تو ہرگز رائج نہیں ہے۔ اماں کانوں پر ہاتھ دھر کر کہتیں "اے خدا کی پھٹکار ہو ـــ کیسی کیسی گالیاں بکتی ہیں، کیڑے پڑیں ان کی زبان میں"

اور میں ہمہ تن گوش ہو جاتی کہ پوری نہ سہی کوئی آدھی پاؤ گالی ہی میری سمجھ میں آجائے، مجھے پتہ تو چلے کہ ان گالیوں کی کیا نوعیت ہوتی ہے جن کو سن کر اماں کانوں میں انگلیاں ٹھونستی ہیں اور آبا توبہ استغفار کرنے لگتے ہیں۔ مگر آپا ـــ منہ موڑ کر مزے سے مسکراتی جیسے اُس نے ایک ایک گالی کو وضاحت کے ساتھ سُن اور سمجھ لیا ہے: ـــ

گالیاں مجھے بھی بہت سی یاد تھیں حالانکہ استعمال کا کبھی موقعہ نہ ملا۔ مگر صرف محل سے بھی واقف تھی نانی اماں کے یہاں سارا بچپن گذرا۔ آس پاس کے گھروں میں پڑوسنیں لڑتی رہتی تھیں اور خود نانی اماں کی دونوں نوکرانیاں دن رات جٹی رہتیں میں مولوی صاحب کا دیا ہوا سبق کم اور یہ گالیاں زیادہ حفظ کر لیتی تھی۔

مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ جو گالیاں مرد بکتے ہیں۔ وہ بالکل مختلف ہوتی ہیں اور بسا اوقات جب ایک ایک فقرے میں کئی کئی گالیاں جوڑ دی جائیں تو لڑائی منظوم ہو جاتی ہے۔ وہ بھی کوئی گالیاں ہوئیں جو مجھے بالکل ایسی لگتیں جیسے کہ حالی کی نظم پڑھی جا رہی ہو۔

اے ماؤ بہنو بیٹیو ـــــــــ

دیر تک سوچتی کہ آپس کے جھگڑے سے ماں بیٹی اور بہن کا کیا تعلق! اور ایسا کہ جہاں تذکرہ آیا مخالف کی آنکھوں میں خون اُترا۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ نانی اماں کے پاس رہ کر جو مجھے گالیوں پر مجبور ہونا پڑا۔ وہ ایک حد تک عام فہم تھیں ان میں خصم، یار اور دھگڑے کا ذکر آتا، مگر باپ، بھائی اور بیٹے کا نہیں۔ یہاں آنے کے بعد جب لالہ جی کی دونوں دلہیاں لڑتیں اور میں سنتی تو بس سنتی ہی رہ جاتی ـــ کیا مجال جو بات کی تہہ تک پہنچنا ایک طرف سطح پر ہی قدم پڑا ہو۔

ایک دن آپا سے پوچھا کہ "آخر یہ دونوں عورتیں ہر وقت کیوں لڑتی رہتی ہیں"

وہ بولی ـ "دونوں سوکنیں ہیں نا!"

میں نے کہا: "تو پھر اس میں جھگڑے کی کیا بات ہے!"

ہری پاس بیٹھی تھی بولی "جب ایک مرد کی دو عورتیں ہوں گی تو کیسے نہ لڑیں گی"

اس دن سے میں سوچنے لگی یہ جو یہاں ایک مرد کی سات عورتیں ہیں، یہ آپس میں کیوں نہیں لڑتیں ـــ لالہ جی کے گھر تو یہ کیفیت تھی کہ اُنھوں نے ایک بیوی کو نظر اٹھا کر دیکھا تو دوسری نے اپنا سر پیٹ لیا، سر کے بال کھسوٹ لئے اور غدر مچ گیا۔ بر خلاف اس کے یہاں وہ گرگٹ سب کے سامنے کسی ایک پہ واری قربان ہونے لگتا تو باقی چھ مزے سے مسکراتی رہتیں۔ آپس میں زیدی کا ذکر کر کے ایک دوسرے کو چھیڑتیں، میں ہر دم جلتی رہتی۔ کسی اور پہ تو بس نہ تھا، مگر جی چاہتا کہ آپا کی شکایت تو ضرور ہی اماں اور آبا سے کر دوں اور بتا دوں کہ صفیہ کے گھر کا دُھنا، بُننا سیکھنے نہیں جاتیں بلکہ سب مل کر زیدی کے پچھواڑے جو باغ ہے اس میں طرح طرح کے ناٹک کھیلتی ہیں اور مجھ سے کہہ دیتی ہیں کہ "تو جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش ـــ ایک طرف جا کے بیٹھ"

میری چودہ برس کی عمر تو گھٹ کر آٹھ دن رہ گئی اور یہ سب جوان کہلاتی ہیں تو کچھ نہیں ــــ آخو کیوں؟
جوئی سے مجھے اس معاملہ میں شکوہ نہ تھا، وہ مجھے کیا خود کو بھی بچہ ہی سمجھتی تھی۔ کیسی ٹھنک ٹھنک کر بات کرتی اور مٹک مٹک کر چلتی تھی، توبہ!

زیدی یہاں کئی سال سے رہتا ہے، مجھے آئے مشکل سے سال بھر ہوا ہوگا اور سب بھی پہلے سے موجود تھیں اس لئے شروع میں مجھے اپنے اجنبی ہونے کی زیادہ تکلیف نہ ہوئی مگر مجھ سے دو چار مہینہ بعد نگہت کے ابا ہی آکر رہنے لگے تو میں نے دیکھا کہ نگہت بہت جلدی مقبول ہوگئی اور سب کی جوڑ دار بن بیٹھی۔ میں سوچتی کہ شاید میری بھی کچھ پوچھ گچھ ہو، بلا سے اپنے ساتھ بیڈمنٹن نہ کھلائیں محض "شٹل کوک" اٹھانے کا کام ہی سپرد کر دیں، مجھ سے بات نہ کریں۔ باتیں سننے سے تو نہ روکیں۔ پر ایک نہ چلی، میں یوں ہی کڑھتی رہ گئی اور جوئی پہنچی تو اس نے سب کا رنگ پھیکا کر دیا ــــ ہائے رے جوئی، مر کر سات جنم لوں تو بھی اس آفت کی پرکالہ کو نہ بھولوں۔ کہیں ٹائپسٹ کا کام کرتی تھی، کمبخت کے مردوں جیسے کٹے ہوئے بال تھے جنھیں مہینہ میں ایک دفعہ ہیر ڈریسر کے یہاں جا کر گھنگرالے کرالاتی تو قسم ہے خدا کی، دور سے بھیڑ کا بچہ لگتی تھی ــــ ہنستی تو ایسے لگتا جیسے سوڈے کی متعدد بوتلیں ایک ساتھ کھلیں اور گیس نکل پڑے۔ بجنسہٖ یہی آواز ہوتی تھی۔ نیلے نیلے ہونٹوں پر لپ اسٹک تھوپ لیتی تو سرخ کے بجائے عنابی رنگ چڑھتا تھا ــــ پھر اس کا لباس!! مہنگائی کے زمانہ میں بھی اس کو دقت نہ تھی۔ اجاڑ مارا، فراک، جو مختصر ہوتے ہوئے بلاؤز، جیسا باقی رہ گیا تھا۔ بس رانوں سے چار انگل نیچا ہوگا ــــ آستینوں کا جھگڑا ہی مٹ گیا تھا۔ مونڈھوں میں رنگ برنگی لیس لگی ہوئی اور گلا اتنا کھلا ہوا کہ ــــ بے ساختہ میراجی گالیاں دے دینے کو چاہتا ــــ پھر اس کی بلا کو شرم نہیں ــــ زیدی پر اپنا ایسا حق سمجھتی جیسے وہ گرگٹ اس کی پیٹ سے نکلی اولاد ہے۔

آوارہ کہیں کا ــــ میں نے کہا تھا کہ آج شام کو سینما چلیں گے پر ــــ ہونہہ ــــ ہونہہ ــــ جا میں نہیں بولتی ــــ آوارہ ہے نا آخر ــــ کہہ دیا تھا کہ تجھ پر سیدھی مانگ نہیں کھلتی ــــ مگر پھر نکالی ــــ اور دیکھو دیکھو ــــ اسے آوارہ ــــ میں کہتی ہوں اب یہ پیلی ٹائی باندھی تو اچھا نہ ہوگا۔

جیسے اٹھلا اٹھلا کر وہ بات کرتی تھی ایک آگ لگ جاتی اور گرگٹ بے شرم کو دیکھو کہ وہ سب کی بات پر راضی، سب سے بے تکلف ــــ خیر میں چھوٹی تھی اس لئے میری پوچھ گچھ نہ ہوتی مگر میں نے چھوٹوں سے شرماتے کسی کو نہ سنا تھا ــــ زیدی کی یہ حالت کہ میں ڈھیٹ بن کر پہنچ جاؤں تو بس سرخ ہو جائے گا، سنبھل بیٹھے گا اور جو کوئی غیر ضروری طریقے پر پاس بیٹھی ہوتی اسے دھکا مار کر الگ بٹھا دیتا۔

ــــــــ اور ــــــــ بس قیامت آجاتی "پھر آئی تو یہاں ــــ چل یہاں سے ــــ اور کوئی کام نہیں ــــ جاؤ ورنہ اچھا نہ ہوگا ــــ اب چلتی ہو کہ ــــ

میری مداخلت پر آپا سمیت سب آگ بگولا ہو جاتیں اور مجھے فوراً نکال دیا جاتا۔ گاؤں میں نانی اماں کا گھر خوب کھلا ہوا تھا۔ دھما چوکڑی مچانے کو بڑے بڑے آنگن اور کچے پھل توڑنے کو تنا ور درخت! شروع سے وہاں رہ کر میری ٹانگیں نکل آئیں اور جب سے کلکتے آئی تو ہر دم ایسا لگتا جیسے کوئی چھاتی پر چڑھ کے دم گھونٹ رہا ہو۔ چھوٹے چھوٹے

کروں اور خطرناک سیڑھیوں والی یہ عظیم الشان بلڈنگ مجھے کھانے کو دوڑتی تھی ۔۔ چپ چاپ بیٹھ کر من مانے کھیل کھیلنے کا ذرا بھی موقع نہ تھا ۔ تین کمرے اور ان میں یہ کیفیت کہ اماں بیک وقت ہمہ جا موجود! اول تو ایک کمرے میں آپا کا راج تھا ۔ جہاں سینکڑوں قسم کے پاوڈر اور کریم بکھرے رہتے اور اُنھوں نے کہدیا تھا کہ اگر میرے کمرے میں قدم رکھا تو اللہ قسم ٹانگیں توڑ دوں گی اور کھال اُدھیڑ ڈالوں گی ۔" باقی دو کمروں میں اماں چین نہ لینے دیتیں ۔" یہ کام کرو، وہ کام کرو ۔۔۔ پان بنا دے، قمیص میں بٹن ٹانک دے ۔" یہ نہیں تو ایک اور خواہ مخواہ کی بات " اری نصیبوں جلی دو پٹہ کہاں پھینک دیا ۔ غضب خدا کا جوان ہونے آئی مگر اپنا ہوش نہیں ۔۔۔ پلّا مار کے اوڑھ کمبخت ۔۔ بے حیا، بے شرم ۔" اماں تو مجھے عورت سمجھنے میں پس وپیش نہ کرتیں اور آپا کو لڑکی سمجھنا بھی ناگوار تھا ۔ بچہ ہوں بالکل ۔۔ اور ستم یہ کہ اماں کے سامنے وہ بھی ایکٹنگ کرتیں! محض مجھے بُرا بھلا کہنے کی خاطر ۔

"دو پٹے سے تو اس کا دم نکلتا ہے ۔۔ پھانسی کا پھندا پڑ جاتا ہے ۔۔ جب دیکھو سانڈ کی طرح منہ اٹھائے پھرتی ہے ۔۔ " رتی بھر لحاظ نہیں ۔۔"

یا اللہ آسمان کس کے سہارے قائم ہے؟

دن تو جوں توں ان فضیحتوں میں گزر جاتا تھا، بس جہاں شام ہوئی، میری شامت آگئی ۔۔ آپا تو بن سنور کر سگھڑاپا سیکھنے چل دیتی اور ابا دفتر سے آکے ساری تھکن مجھ پر اتارتے ۔۔ اُگالدان اور پاندان کے علاوہ حقّہ بھی طرح طرح کی آوازیں نکالتا ۔ میری جان پہ بن جاتی ۔۔ بالکنی میں جاکر کھڑی ہوتی تو علیحدہ سر چکرا جاتا ۔ ٹرام کی کھڑکھڑاہٹ، موٹروں کے ہارن ۔۔ لیجیو، چلیو، پکڑ لو کی قیامت خیز آوازیں ۔ امریکن فوجی اور لپی پُتی عورتیں ۔۔ کچھ دن تو میرا جی خوب لگ گیا تھا، دن بھر کھڑی ساڑھیوں کے رنگ، فروکس کی کاٹ اور قمیصوں کے ڈزائن دیکھتی رہتی اور پھر ایسی اکتائی کہ یہ مناظر زہر ہوگئے ۔۔ کانوں میں آپ سے آپ ڈھولک سی بجتی رہتی اور آنکھوں کے سامنے رنگ برنگی تیتریاں ناچتیں ۔۔ سانس رُکنے لگتا اور آنسو نکل پڑتے ۔ کیسی مہمل زندگی ہے ۔

سب سے بڑھ کر ذلت کا یہ احساس گھن کی طرح کھائے جارہا تھا کہ جب زیدی سب سے بولتا ہے تو مجھ میں کیا عیب ہے جو میری طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں ۔۔ ہونہہ، جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش، جیسے واقعی ۔۔۔ اور یہ سچی بات ہوتی تو صبر بھی تھا ۔ کپڑوں میں لپٹی ننھی گڑیا کی طرح پلنگ پر پڑی رہتی، نہ کوئی حکم چلتا اور نہ ڈانٹ پلاتا، بس وقت پر دودھ پی لیا اور اطمینان سے نرم نرم لحاف اور گدوں میں لیٹے رہے، سارے گھر کا لاڈ دلار علیحدہ ۔۔ اب خدا کا ایسا قہر ہے کہ بچی بن کر ذرا اٹھلا جاؤں تو لعنتوں کا طوق جانے کہاں سے گلے میں آپڑتا ہے ۔

" تیرا جنازہ نکلے منحوس، تجھ پر بجلیاں ٹوٹیں ۔۔ تو نے فرنگنوں کو بھی مات کر دیا ۔۔ گریبان کھلا ہوا اور دوپٹہ ندارد ۔۔ ہائے اس جوان جہان کو اپنے آپ کا ہوش نہیں، اسے موت آجائے تو اچھا ہے ۔" اور میری سب سے بڑی یہی خواہش ہوتی کہ اللہ کسی کی آئی مجھے دیدے، میرا اس مصیبت سے چھٹکارا ہو ۔ اماں کو میرا تو اکیلے میں بھی دوپٹہ اتار کے بیٹھنا گوارا نہیں اور ابا کے سامنے سر کھجلائے تو بھی دنیا بھر کے گالی کوسنے بے وقت دیتی ہیں ۔ پھر آپا کی ذرا فکر نہیں کرتیں، اُن کے یہ ٹھاٹ ہیں کہ وہاں اُس مردوئے زیدی کے سامنے سب مل کر آنکھ مچولی اور دنیا بھر کے کھیل

کھیلتی ہیں تو شلوار گھٹنوں تک چڑھ جاتی ہے اور دو پٹے پھُر پھُر ٹنگ جاتے ہیں۔

ہائے کیسا اندر ہی اندر دل تڑپتا کہ ایک دن اماں کا ہاتھ پکڑ کے سب کے گھر کھلا نگتی ہوئی لے جاؤں اور دور سے دکھا دوں کہ یہاں کیسی کیسی گلکاریاں ہو رہی ہیں مگر کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ اب ایمان سے کہیے کہ خاندان بھر کی ناک ہیں کاٹوں گی یا آپا نے جڑ سے ہی صاف کر کے رکھ دی ہے۔

مگر انجام سے دل ڈرتا کہیں میں ایسی حرکت کروں تو شرط ہے کہ آپا مجھے زہر ہی نہ کھلا دیں۔ اور بدلہ لینے کی خاطر چپ چاپ ہی بالکنی سے دھکا دے کر ساری عمر کا حصہ چکا دیں۔ پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر۔ ذرا ایسی جگہ کہ جہاں روپیہ پیسہ کیا ہنڈیا ڈوئی بھی آپا کے اختیار میں ہے۔ کوڑی کوڑی سے ترسانا معمولی بات ہے۔ کیا عجب جو بھوکا ہی مار دیں۔ اور زہر کے خیال سے تو بہت ہی کلیجہ کانپتا۔ ادھر کسی چیز میں ڈال کر کھلا دیا، اُدھر چٹ پٹ ختم! آپا پہ تو کوئی حشر تک شبہ نہ کرے گا اور ہماری جان یونہی صدقے خیرات میں جائے گی۔ اب تو سنا ہے ایسے زہر چل نکلے ہیں کہ پوسٹ مارٹم میں بھی پتہ نہیں لگتا، کیا پتہ ان کے پاس ایسا ہی زہر ہو!۔ ہے تو ضرور۔ اُس دن جوئی کہہ رہی تھی۔ جانے کس بات پہ۔ میں نے تو بس اتنا ہی سُنا ہے کہ "ہم زہر کھا کے مر جائیں گے۔ ہم سے یہ برداشت نہ ہوگا۔"

تو ان کے نزدیک زہر کا استعمال کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا۔ نا بابا جیسی گزر رہی ہے بھلی ہے میں کیوں جان جوکھم میں ڈالوں، کبھی تو اللہ چپ کی داد دے گا۔

اپنے دل کو ہزار طرح کی تسلیاں دیتی مگر آپا کی بے انصافی کا داغ نہ مٹتا۔ ان کا کیا بگڑتا ہے اگر مجھ کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا کریں، میں کون سا ان کی قسمت کا کھاتی ہوں جو مجھ سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ سرلا اور شیلا بھی بہنیں ہیں، صفیہ اور رضیہ بھی ماں جائی ہیں مگر کیسی ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ ہر بات میں ایک ہی صلاح مشورہ، ہماری بڑی بہن ہیں کہ ہم کو پھوٹی آنکھ نہیں دیکھ سکتیں! اللہ نے مقدر ہی خراب بنایا ہے، زیدی بھی تو سائے سے جلتا ہے، میری صورت دیکھی اور کھیل کو د چھوڑ سگرٹ کے لمبے لمبے کش لگانے لگا اور ذرا دیر سب کی دھمکیوں کے باوجود کھڑی رہوں تو وہ خود بھی وہاں سے اُٹھ کر چلا جائے گا۔ "اب نہیں کھیلتے۔ سر میں درد ہے۔" خدائے پاک نے میری شکل کیسی بنائی ہے کہ نظر پڑتے ہی زیدی کے سر میں درد ہو جاتا ہے۔ میں گھنٹوں ٹوٹے ہوئے شیشے میں اپنی صورت تکتی رہتی۔ مجھ کو تو کوئی عیب نہیں لگتا، ہزار میں اچھی ہوں۔ بہت کچھ آپا کی جھلک مارتی ہے۔ پلکیں انھیں کی طرح سے مڑی مڑی ہیں، رنگ اُن سے کچھ پھیکا ہے۔ مگر نانی کہتی تھیں کہ مجھ میں نمک بہت ہے اور ہونٹ کیسے اچھے ہیں بھرے بھرے۔ کاش میں لپ سٹک لگا سکتی۔ میرے بالوں میں گھونگر نہیں، مگر میں دوکان پر جا کر ڈلوا سکتی ہوں۔ جوئی سے تو لاکھ درجہ اچھی لگوں گی، بس جیسے نگہت کے بال ہیں۔ جب کنگھی کر کے کھلے بال چھوڑ دیتی ہے تو ایسی سیڑھیاں سی بن جاتی ہیں اونچی نیچی چمکدار اور ماتھے پر چھلّے چھلّے سے۔ جیسے شروع تاریخوں کے چاند۔ صفیہ کے منہ پر چیچک کے داغ ہیں اور میرا منہ بالکل صاف ہے۔ پھر بھی میں صفیہ کے مقابلے میں نہیں بیٹھ سکتی۔ جوئی تو میری جوتی کے برابر بھی نہیں، کہاں اس کی سرکنڈہ جیسی بانہیں اور کہاں میرے سڈول بازو۔ اگر آپا ایک دن مجھے پاؤڈر

لپ اسٹک اور طرح طرح کی کریمیں لگانے دیں، پھر میں دکھا دوں کہ کون میرے سامنے بچ سکتا ہے۔ خیر بناؤ سنگھار کے بغیر بھی ایسی صورت تو ہرگز نہیں کہ دیکھتے ہی سر میں درد ہو جائے۔

کاش مجھے ایک دن تنہائی میں زیدی سے بات کرنے کا موقعہ مل جائے تو میں اس سے پوچھوں کہ آخر تم مجھ سے نفرت کیوں کرتے ہو، مگر تنہائی کیا۔ مجھے تو سب کے سامنے سلام تک کرنے کی توفیق نہ تھی۔ اُس کمبخت کی نظریں ہی زمین میں گڑ جاتیں۔

ایک دن ایسے ہی کسی بات پر اماں اور ابا میں جھک جھک ہو گئی۔ ابا اُٹھ کر کسی دوست کے یہاں چل دیئے اور اماں نے بگڑ کر آپ ہی آپ کہنا شروع کیا "بس اب یہاں میرا گذارہ نہیں ہوگا۔ میرے اماں باوا جیتے ہیں۔ وہیں جا کے رہوں گی اور مزدوری کر کے اپنا اور اپنی بچیوں کا پیٹ پالوں گی"

پھر مجھ سے کہنے لگیں کہ "جا زہرہ کو بلا کے لا — اپنا سامان باندھیں" اور میں ایک ایک قدم میں چار چار سیڑھیاں پھلانگتی خوشی خوشی لپکی کہ اس کلکتہ کی مصیبت سے پیچھا چھوٹے گا، نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری، یہاں سے گئے تو سمجھ لیجیے سارے دُکھ چھوٹے، ممکن ہے کہ آپا بھی سچ مچ کی آپا بن جائیں۔

مجھے معلوم تھا کہ آپا اس وقت کہاں ہوں گی، لہٰذا سیدھی پچھواڑے کی گلی سے گزر کے اور ٹوٹی ہوئی اینٹوں کی دیوار پھلانگ کے باغ میں کود ی، مگر وہاں تو خاک اُڑ رہی تھی اور کسی کا بھی پتہ نہ تھا، میں حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ "یا اللہ آج سب کے سب کہاں مر گئے — کیا آج زیدی دفتر سے لوٹ کر ہی نہیں آیا اور آپا سچ مچ ہی صفیہ کے یہاں سوئی دھاگہ لئے بیٹھی ہے — میں نے مزید اطمینان کے لئے ایک ایک پیڑ کے پیچھے اور ایک ایک جھاڑی کی اوٹ میں تلاشی لی مگر کسی کا پتہ نہ ملا آخر میں تھک کر پھر دیوار کے پاس کھڑی ہو گئی — یہاں پہنچ کر عمارت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے زیدی کا کوارٹر سب سے آخری تھا اور اکلوتا، اوپر کی منزل خالی پڑی تھی، اس لئے ملک کو یہاں خوب آزادی مل گئی تھی اور فی الحال کسی کے دخل کا امکان نہ تھا۔ اس لئے کہ اوپر کی منزل شکستہ ہو گئی تھی اور مالک مکان نے گرانی کے باعث اس پر چھت ڈلوانے کا ارادہ بھی ترک کر دیا تھا۔ ادھر پچھواڑے کی طرف زیدی کے کمرے کی ایک کھڑکی اور ایک دروازہ کھلتا تھا میں نے خواہ مخواہ بے خیالی میں دیوار کا ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا لیا اور کھڑکی کا نشانہ لگایا — شیشہ تو بچ گیا مگر کھنا کا زور دار تھا ——

"کون ہے سالا —— بدمعاش ——"

میں جلدی سے ایک پیڑ کی آڑ میں ہو گئی اور زیدی نے چق اٹھا کر برآمدے میں قدم رکھا۔ "شیشہ ٹوٹ ہی گیا ہوتا۔ —— سالے، کمینے، سوّر کے بچے، کمبخت ——"

وہ رومال سے اپنے ہونٹوں اور گالوں پر پھیلی ہوئی لپ سٹک کو رگڑ رگڑ کر چھڑاتے ہوئے بڑبڑایا اور جب کمرے میں لوٹ گیا تو میں نے متعدد قہقہوں کی آواز سنی۔

"اچھا تو اس کمرے میں میٹنگ ہو رہی ہے" میں دیوار سے واپس پھلانگی تو مارے غصہ کے برا حال تھا اب بھی اماں سے جا کر نہ کہدوں تو میرا نام بدل دینا بلکہ میں بُلا کر لاؤں گی اور اُن کو اپنی آنکھوں سے صاحبزادی کے ڈھنگ

دکھادوں گی —

شکایت کرنے کا پورا تہیہ کرکے میں اپنے فلیٹ میں واپس پہنچی تو کیا دیکھتی ہوں کہ آبا بجائے کسی دوست کے یہاں جانے کے اِدھر اُدھر سے گھوم گھام کر لوٹ آئے ہیں اور بیٹھے ہوئے آماں کی خوشامد کر رہے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ اب کچھ کہنے سننے کا موقعہ نہ تھا خون کے گھونٹ پی کر بالکنی میں ٹک گئی جہاں " رس گلہ" جیسے متعدد بنگالی اِدھر سے اُدھر لڑھک رہے تھے اور برابر کے گھر سے لالائن اپنے مخصوص انداز میں لالہ جی کو مرنے کی دھمکی دیتی سنائی دے رہی تھی ۔

میں سوچنے لگی کہ آپا اتنی بڑی ہوگئی ہے کم سے کم بیس سال کی پھر بھی آبا اُس کی شادی نہیں کر دیتے ۔ یہ بھی نہیں کہ پڑھتی لکھتی ہو بس صبح سے لے کر چار بجے شام تک میری جان کو روتی ہے اور چار بجے سے لے کر آٹھ بجے تک — سات بجے تک تو ضرور ہی کبڈیاں کھیلتی ہے — نانی آماں کہتی تھیں کہ جہاں لڑکی پندرہ سولہ سال کی ہو جائے اُسے پرائی کردو پھر گھر پر بٹھانا حرام ہے — اور جن لڑکیوں کی زیادہ عمر میں شادی ہوتی ہے اُن کے منہ پر ذرا نور نہیں آتا اور پہنتی اُوڑھتی بُری لگتی ہیں ، نانی آماں سنا رہی تھیں کہ جب اُن کی شادی ہوئی تو بارھواں سال لگا تھا اور بیس سال کی عمر میں پانچ بچوں کی ماں ہوگئی تھیں — اور یہاں آپا! بچے تو کیا بیاہ بھی نہیں — منگنی بھی نہیں — کیا بڑھاپے میں دُلہن بنیں گی۔ وہاں گاؤں میں ایک دن نانی آماں بتول کی دادی سے کہہ رہی تھیں کہ " جہاں عورت بیسی سو کھیسی " یعنی جہاں عورت بیس سال کی ہوئی بس پھر جوانی ڈھلنا شروع ہو جاتی ہے ۔ پھر اس پر نہ مہندی چڑھتی ہے ، نہ مسّی کھلتی ہے ۔ یہ سب تو اٹھتی عمر کی باتیں ہیں ۔ اب آج کل دیکھو کتنی عمر میں لڑکیوں کا بیاہ کرتے ہیں ۔ چار دن بیاہ کو ہوئے اور ساس کی بھی ساس لگنے لگیں ، نہ وہ کپڑوں کی پھبن ، نہ وہ چہرے میں کچیا پن —

نانی آماں کا کہنا ٹھیک ہے تو آپا کیا خاک بیاہ کے وقت اچھی لگے گی ۔ زیور کپڑا کچھ نہیں جچے گا — صاف بات یہ کہ آپا کو اس کا ارمان بھی نہ ہوگا ۔ اس نے بیاہ سے پہلے ہی سب طرح کا اوڑھ پہن لیا اور دل کے حوصلے نکال لئے ورنہ کہیں کنواریاں عطر لگاتی ہیں ، خیر پاؤڈر کریم کو تو نانی آماں جانتی بھی نہیں ، مگر یہ عالم ہے کہ کیا مجال جوان کے سامنے محلہ کی کوئی بن بیاہی لڑکی کانوں میں پھول پہن لے یا پاؤں میں مہندی لگالے ، عطر تو خیر عطر ہے ، خوشبو کا تیل لگانا بھی عیب سمجھتی ہیں ۔ ہائے وہ آپا کو دیکھیں تو سر پیٹ کے رہ جائیں ۔ ہم کو تو عید بقرا عید پان کھانے کی اجازت نہ ملتی تھی اور آپا کو میں نے زیدی کے ساتھ سگریٹ پیتے دیکھا ہے ۔

خیر مجھے ان کے طرز عمل کا سدھار نہیں کرنا وہ چاہے جو کریں اور چاہے جس طرح رہیں مگر مجھے حقارت کی نظر سے کیوں دیکھتی ہیں — وہ شکلاً اچھی ہیں تو میں بھی بُری نہیں ۔ وہ جوان ہیں تو میں جوان ہوتی جا رہی ہوں وہ اگر جدید فیشن کی پرستار ہیں تو میں نے اُن سے چھ سال بعد جنم لیا ہے لہٰذا اُن سے زیادہ فیشن ایبل رہنا بھی زیب دیتا ہے ۔ ہاں انگریزی مجھ کو نہیں آتی تو آپا نے ہی کون سا بی ۔ اے کا امتحان دیا ہے ، چار سال کلکتہ میں رہ کر تھوڑی بہت انگریزی سیکھ گئی ہیں ۔ سو تھوڑے دن بعد مجھ کو بھی آجائے گی ۔ اگر تنہا وہی زیدی کی دوست ہوتیں اور زیدی محض اُن پہ کرم فرما ہوتا تو مجھے شکوہ نہ رہتا ، مگر جب یہاں کا دستور یہی ہے کہ ڈربے کی ساری مرغیوں کا سہاگ ایک ہی مرغ کے دم سے قائم رہے تو میں کہاں کی اچھوت ہوں ! سات میں ایک کا اضافہ کرکے آٹھ سہی ۔ بس مجھے تسلی رہے گی کہ کہاں بھی میں بھی انسانوں میں

شمار ہوں، ایمان داری سے دیکھا جائے تو کھیل کود کی عمر میری ہے نہ کہ ان سب کی! خیر مجھے تو اپنی ہتک بھی گوارا ہے کہ ہاں صاحب ان کے برابر نہیں بھاگ سکتی مجھے آنکھ مچولی میں شریک نہ کریں بس اتنی شرکت رہے کہ چور کی آنکھیں میچا کروں۔

سچ مچ — کاش کہیں اس کی اجازت ہی مل جائے تو جب زیدی چور بنے اور میں اُس کی آنکھیں میچوں تو دونوں اُنگلیاں ٹٹول کر اس کے دیدے ہی پھوڑ دوں، کم بخت میری صورت سے گھِن کھاتا ہے اور اُس نے سب کو لے کر خلاف کیا اگر مجھ کو دیکھ کر اس کی جان پر نہ بن جایا کرے تو کاہے کو مجھے وہاں سے نکالا جائے۔

مجھے یہاں کوئی سہیلی نصیب نہیں جس سے بیٹھ کر دل کی بات کہوں، کوئی ایسا کھیل نہیں جس سے دل بہلا لوں، گاؤں سے بہت سی گڑیاں ساتھ لائی تھی تو اُس دن ذرا سی زبان چلانے پر آپا نے سب کی سب لے کے چولھے میں جھونک دیں۔ بس بیٹھی پان بنایا کروں یا بٹن ٹانکا کروں۔ اماں کا یہی ظلم کم نہ تھا، اکثر بڑے دسنوں سے ہولے ہولے باتیں کرتی ہوتیں جس میں بیاہ شادی، بچے پیدا ہونے، کبھی کا ذکر ہوتا۔ اور میں ہی کسی کونے میں منہ دیئے پڑی ہوتی تو گالیاں شروع ہو جاتیں "اے اللہ بچائے، اولاد ہے یا منکر نکیر، کیا مجال جو گھڑی بھر کو پلّا چھوڑ دیں۔ سب طرح کی باتیں سنتی ہیں۔ ابھی سے کانوں میں رس پڑے گا— بھلا پوچھو جننے، مرنے کی باتوں سے تمھیں کیا کسی وقت علیحدہ بھی ہو بیٹھو— اس سے وہ بے چاری زہرہ بھلی اپنی ساتھ کی لڑکیوں میں بیٹھی رہتی ہے۔ پھر اس کو تو ابھی سے نانی۔ دادی بننے کا چاؤ ہے، اگر تو بھی زہرہ کے پاس جا بیٹھے گی تو کیا بجلی گر جائے گی!"

"اب ان سے کون کہے کہ میرا وہاں دخل دینا یا مسجد میں کتے کا گھسنا یکساں ہے، خیر حکم حاکم بندہ مجبور اوّل صفیہ کے گھر جاتی تو اُن کی اماں کہتیں۔

"تمھاری آپا اور صفیہ، رضیہ دونوں سرلا کے گھر ہیں" سرلا کے گھر جاتی تو اُن کی ماتا جی کہتیں۔ "تینوں آئی تھیں پھر سرلا اور شیلا کونے کے نگہت کے یہاں چلی گئی ہیں"۔ اور نگہت کی امی بتاتیں "سب کی سب جوئی کے پاس بیٹھی ہوں گی"

جوئی کے بعد معاملہ صاف تھا۔ زیدی کا پچھواڑا یا راجہ اندر کا اکھاڑا!

میں بھی ضد کر کے وہیں پہنچتی اور پہنچتے ہی لے دے شروع ہو جاتی۔

"خیر تو ہے تم کیسے آئیں؟" آپا پوچھتیں۔

"ویسے ہی" میں ڈھٹائی سے کہہ دیتی۔

"لو یہ بھی ایک ہی رہی کوئی کام نہیں ہے اور؟ بھلا جوئی کو اس سوال کا کیا حق تھا۔ "اماں نے بھیجا ہے" میرے پاس بہانہ موجود تھا۔ "کیوں ہماری اتالیق بنا کے؟" جب نگہت ایسا سوال کرتی تو اُس کے گھنگرالے بال ناگ سے زہریلے اور نفرت خیز لگتے۔

"مجھے کیا معلوم کیوں بھیجا ہے" میں اڑ کے رہ جاتی۔

"نہیں معلوم تو واپس جاؤ—"

"کیوں زبردستی ہے؟" میں بیٹھ جاتی تو زیدی اُٹھ کھڑا ہوتا۔

GOVT GIRLS COLLEGE ACC NO 15227

"خیر چھوڑو — اب کل سہی — میرا سر بھی آج بھاری ہے"
اس کے بعد جو مجھ پر گزرتی وہ اللہ بہتر جانتا ہے۔
تو ایسا ہی کوئی دن تھا جو اماں نے مجھے دھتکار دیا اور میں سب گھروں کے چکر لگا کے باغ میں پہنچی تو عجیب منظر دیکھا —
سب کی سب زیدی پر لدی پڑی تھیں اور جیسے سبک سبک کر رو رہی ہوں، واللہ اعلم رو رہی تھیں۔ یا یہ کوئی نئی طرز کا کھیل تھا، میں تو حیران کھڑی دیکھتی رہ گئی۔
زیدی بیچ میں گھرا ہوا تھا اس نے بمشکل سر نکالا تو مجھے دیکھ لیا اور جھٹ سے سب کو پٹخ کر کھڑا ہو گیا اب جو اوروں نے بھی پلٹ کر مجھے دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ تو واقعی ساری کی ساری رو رہی تھیں — لال لال آنکھیں اور پھولی پھولی ناکیں — میں دیکھ کے گھبرا گئی۔
"کیا ہوا آپا — یہ کیا کر رہی ہو؟"
"تمھارا کفن سی رہی ہوں"
لو یہ ہمدردی کا اچھا نتیجہ نکلا میں جل کے خاک ہی تو ہو گئی۔
"کیوں بولو کیا کام ہے؟"
"آپ کو اماں بلا رہی ہیں" — میں تو ڈھونڈتی ڈھونڈتی چلی آئی" میں نے ڈر کر جھوٹ بولا۔
"تم چلو میں آتی ہوں"
اور میں وہاں سے لوٹی تو اس جھوٹ کا انجام سوچنا شروع کیا، ایک تو یو نہی جانے کس بات پر آپا ٹسوے بہا ہی تھیں اور اب اس دھوکے کی بات پر تو مار ہی ڈالیں گی۔ اوّل سوچا کہ اماں سے مدد لوں اور ان سے کہہ دوں کہ میں آپا کو آپ کے نام سے بلا لاتی ہوں، آپ کوئی کام بتا دیجئے گا، مگر اس میں — گل دیگر شگفت، کا اندیشہ تھا، اماں نے تو ڈانٹ کر مجھ کو دفع کیا تھا اب کہیں گی کہ مُردار خود بھی لوٹی اور زہرہ کو بھی اٹھا لائی کھڑی۔ پہلے سوچ رہی تھی کہ آپا کے پیروں کی آہٹ سنائی دی اور میں لپک کر انہی کے کمرے میں گھس گئی وہ باہر اماں سے طلبی کی وجہ پوچھ رہی تھیں۔
پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے پکارتی ہوئی ادھر ہی آ رہی ہیں! آؤ دیکھا نہ تاؤ جلدی سے پلنگ کے نیچے لیٹ گئی کہ تھوڑی دیر کو جان بچ جائے گی۔
آپا آ کر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی پلنگ پر بیٹھ گئیں۔
"ڈھائی گھڑی کا ہیضہ آئے اللہ کرے"
میں سمجھ گئی کہ یہ قصیدہ میری شان میں ہے مگر جواب کا موقعہ نہ تھا، دس پندرہ منٹ مجھے سانس روکے پلنگ کے نیچے پڑے گذر گئے پھر کھٹ پٹ کی آواز آئی اور میں نے جوئی کی سوکھی ہوئی سانولی پنڈلیاں اور اونچی ایڑی کے جوتے اندر آتے دیکھے۔
"صبر کرو میری جان" خدا جانے جوئی نے آپا جان کو صبر کی تلقین کیوں کی۔

" اور کیا کر سکتے ہیں " آپا جان نے سرد آہ بھری۔
پھر تھوڑی دیر بعد آپا جان نے کہا " وہ ارادہ ہے نا جوئی، تو ایک گروپ ٹھیک رہے گا یا سب کی علیحدہ علیحدہ۔
جوئی نے کہا " نہیں بھئی، گروپ نہیں سب کی علیحدہ ہو تو بات ہے ـــــ جس کا جو پوز زیدی کو پسند ہے
اس طرح ـــــ مثلاً میرا اُس کو غصہ کرنے کا انداز بہت پسند ہے تو میں اس طرح ـــــ اور تم ـــــ تمھیں کس طرح پسند کرتا ہے؟
" میرا " میرا سر جھکا کر مسکرانا ـــ آپا نے مری ہوئی آواز میں کہا۔
" تو بس تم سر جھکا کر مسکرانا "
" مگر جوئی اس طرح پیسے بہت خرچ آئیں گے "
" اونہہ تم پیسوں کی پرواکرتی ہو ـــ گھر کا سارا خرچ تمھارے پاس رہتا ہے، آخر پندرہ بیس روپے گول کرنے سے
کسی کو کیا پتہ چلے گا ـــ میرے پاس بھی پچھلے مہینہ کی تنخواہ میں سے روپے بچے پڑے ہیں، اسی طرح سب نکال لیں گے۔
غریب کو آخری تحفہ دینا ہے۔ پھر وہ کہاں، ہم کہاں ـــ " جوئی کی آواز بھرّا گئی۔
" اُف زیدی چلا جائے گا تو ہماری کیا حالت ہوگی۔؟"
" بے موت مرجائیں گے " جوئی نے جواب دیا۔
" کیا اچانک مصیبت آئی " آپا نے سسکی لی۔
" اسے خود بھی ایکا ایکی تبدیلی ہو جانے کا گمان نہ تھا " جوئی نے کراہ کر کہا۔
اب میں سمجھی کہ سارا غم اس بات کا ہے، زیدی کا تبادلہ ہو گیا اور وہ منحوس یہاں سے جا رہا ہے ـــ اور یہ پیسوں
کا کیا قصہ ہے ـــ کہیں ان لوگوں نے چپ چاپ تصویریں کھچوانے کا ارادہ تو نہیں کر لیا۔ چلو اچھا ہے یہاں چھپے تو ایک
راز معلوم کر لیا، اب آپا جان مجھ پہ رعب جمالیں تو جانوں، اُلٹا اُن کو دھمکاؤں گی۔
" اچھا تو پھر کل صبح ـــــ میری سال گرہ کی دعوت کے بہانے سے "
" پھر دیکھو جوئی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو" آپا نے سرگوشی کی۔
" کسے پتہ چلے گا ـــــ میرے یہاں کا نام لے کر آؤ گی نا " جوئی نے کہا۔
" پھر بھی کہیں ثریا کہہ بیٹھے امی کے سامنے کہ ہم بھی جوئی کے یہاں جائیں گے "
" تو ایسے موقعہ پر عقلمندی سے کام لینا ـــ تم ہر دم ثریا کو دباتی رہتی ہو، اگر اسے شبہ ہو جائے اور وہ بات
کھول دے۔
" توبہ قیامت آجائے گی " آپا نے لرزتی آواز میں کہا
" تو ایسے موقع پر عقلمندی سے کام لینا۔ سمجھیں "
" ظاہر ہے معاملہ ہی ایسا ہے " آپا نے جواب دیا اور میرا دل چاہا کہ فوراً ہی پلنگ کے نیچے سے نکل پڑوں اور کہدوں
کہ میں نے ساری باتیں سن لی ہیں مگر ـــ جوئی چلی گئی تو آپا بھی اماں کی آواز پہ کمرے سے نکلیں اور کچھ دیر بعد میں بھی اطمینان
اور شان سے باہر نکل آئی۔ جب آپا سے تنہائی میں مقابلہ ہوا تو اس سے قبل کہ وہ شام والی حرکت پہ کچھ کہیں ـــــ

میں نے سوال کیا۔

"آپا کل آپ تصویر کھنچوانے جائیے گا؟"

"ایں ——— نہیں تو ——— تم سے کس نے کہا؟" آپا کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

"میں نے خود سنا ——— جب آپ جوئی سے باتیں کر رہی تھیں۔"

"جب میں جوئی سے باتیں کر رہی تھی ——— مگر تم نے کیسے سُن لیا؟"

"میں برابر کے کمرے میں بیٹھی تھی ——— آپ دونوں کی آواز آرہی تھی!"

"اوہ ——— مگر دیکھو ثریا ——— ابّا یا امّاں نہ سن لیں ——— میں تمھارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

"اطمینان رکھیے میں کسی سے نہ کہوں گی ——— مگر ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟" ——— آپا نے چونک کر پوچھا۔

"میری تصویر بھی کھنچوائیے" ——— مجھے اس سے بہتر موقعہ کیا ملتا۔

"کیوں؟ تم کیا کرو گی ——— دگنے پیسے خرچ ہوں گے۔"

"رہنے دیجئے ہم ابّا سے کہہ کر کھنچوائیں گے۔"

"نہیں نہیں تم ابّا سے کچھ نہ کہنا ——— کل تمھاری تصویر بھی کھنچوا دوں گی۔"

اور دوسرے دن جب وہ جوئی کے یہاں کا نام لے کر چلیں تو با دلِ ناخواستہ مجھے بھی ساتھ لے لیا ——— فوٹوگرافر کے یہاں جا کر سب نے عجیب عجیب سے منہ بنا کے تصویر اُتروائی۔ سب سے آخر میں میرا نمبر آیا ——— جب چلنے لگے تو جوئی نے فوٹوگرافر سے پوچھا کہ "کب تک تصاویر دو گے"۔ اُس نے کہا "پرسوں پروف دکھا دوں گا۔"

جوئی کہنے لگی "واہ پرسوں شام کو تو ہمیں اصل کاپی چاہیے۔"

اس نے صاف کہدیا کہ "اتنی جلدی تیار نہیں کروں گا۔"

آخر میں طے ہوا کہ پروف دکھانے کی ضرورت نہیں۔ بس جیسی بھی آئیں پرسوں مل جانی چاہئیں، سو تیسرے دن جوئی جا کر تصویریں لے آئی۔ آپا نے چھپانے کی تاکید کرتے ہوئے میری تصویر میرے حوالے کی جو خاصی اچھی آئی تھی، بہت ہی غم زدہ سا چہرہ یہی میں چاہتی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ سب کی تصویریں زبیدی کی نذر ہوں گی ——— اور دفعتاً میرے دماغ میں ایک خیال آیا۔ میں بھی اپنی تصویر زبیدی کو دوں گی ——— اگر وہ ایسی لڑکیوں کی تصویر رکھ سکتا ہے جن سے اُس نے محبت کی تو ایک ایسی لڑکی کی تصویر بھی ہی جس سے وہ بلا وجہ نفرت کرتا تھا ——— شدید نفرت ——— ہر چند کہ اُس کی بلا سبب نفرت میرے لئے ہمیشہ دُکھ کا باعث رہی اور کبھی کبھی میں نے بھی اپنے دل میں اس کے لئے بے تعلقی اور بے گانگی کا جذبہ پایا مگر آج ——— میں نے محسوس کیا کہ مجھے اس کے جانے کا رنج ہے۔ جیسے میری زندگی میں بھی کوئی خلا پیدا ہو جائے گا اور میری نگاہیں بھی اسے ڈھونڈتی رہ جائیں گی۔

میں اسے یہ تصویر بھی دوں گی اور اس سے پوچھوں گی کہ آخر تم مجھے کیوں ناپسند کرتے ہو کل صبح تو وہ چلا ہی جائے گا۔

تصویریں آتے ہی آپا نے اپنی تصویر پر جلدی جلدی قلم سے کچھ لکھا اور پھر جوئی کے ساتھ چلی گئی ——— میں دیر تک

سوچتی رہی کہ اپنی تصویر پہ کچھ لکھوں یا نہ لکھوں — پھر ایک شعر یاد آیا جو آبا جان کی البم میں ان کے کسی دوست کی تصویر پہ لکھا ہوا تھا، میں نے جلدی جلدی شعر کو تصویر پر نقل کیا ہے

نقش فطرت کے مصور ترے ہاتھوں کے نثار
یاس کی سب رنگتیں بھر دیں مری تصویر میں

اور منتظر بیٹھ گئی کہ کب وہاں سے آپا وغیرہ واپس ہوں اور کب میں جاؤں۔ جو آپی نے نوکری سے مہینہ بھر کی چھٹی لے لی تھی اور اسی ٹرین سے گھر جا رہی تھی، جس سے زبیدی کو جانا تھا۔ جب آپا واپس آئیں تو میں چپ چاپ اپنی تصویر اٹھا کر چل دی اور طویل راستہ طے کرکے آہستگی سے زبیدی کے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ میز پر پھیلی ہوئی متعدد تصویروں کو ناقدانہ نظر سے دیکھ رہا تھا — آہٹ پاکر بغیر گردن موڑے ہوئے کہا

"کون ہے؟" —

"میں ہوں" — میری آواز کانپ گئی

"کون ثریا؟" — وہ چونک کر پلٹا "کیوں خیر تو ہے؟"

"ہاں" میں نے ہمت کرکے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "آپ کل جا رہے ہیں نا؟"

"ہاں ہاں تو پھر — ؟" اس نے حیرت سے میرا سراپا جائزہ لیا۔

"تو پھر — یہ — یہ —" میں نے تصویر آگے بڑھائی۔

"یہ کیا — تمھاری تصویر — اسے کیوں لائی ہو؟"

"آپ کو دینے" —

"مجھے دینے!؟ — نہیں نہیں ثریا میں یہ تصویر نہیں لوں گا"

"آپ مجھ سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟" میرا دل بھر آیا۔

"میں تم سے نفرت؟ — خدا کے لئے ایسی بات نہ کہو"

"پھر آپ میری تصویر کیوں نہیں لیتے — حالانکہ آپ نے سب کی تصویریں . . . ."

"ہاں اس لئے کہ میں ان سب سے نفرت کرتا ہوں، میری نگاہ میں ان کی کوئی وقعت نہیں — اور تم — میں تم سے محبت کرتا ہوں، ثریا میں تمھاری عزت کرتا ہوں۔ اسی لئے میں نے تمھیں آج تک اپنا کھیل نہیں بنایا — سمجھیں؟"

"آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں" — مجھ پر دیوانگی طاری ہونے لگی۔

"ہاں ثریا محبت انتہائی محبت — تم سے اور صرف تم سے — اسی لئے تو میں نے آج تک — اچھا اب تم یہاں سے جاؤ — جاؤ ثریا —"

اس کا آپ سے آپ سانس چڑھنے لگا اور اس نے مجھے زبردستی باہر دھکیل کر اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ تصویر میرے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی اور میں نے دیوار کا سہارا لے کر سوچا۔ کاش اُسے مجھ سے بھی نفرت ہوتی — کاش —

(مئی ۳۶ سنہ)

ریاض رؤفی

بوڑھا برگد

اجنبی! — آؤ — آؤ — کس ملک کے باسی ہو؟ — کہاں سے آئے ہو؟ — بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو! بہت پریشان نظر آتے ہو — آؤ — آؤ ——

مگر آج میں تمھیں کس منہ سے کہوں کہ اے مسافر! آؤ اور میرے سائے میں آرام کرو — صدیوں سے میرے لب پر یہی الفاظ رہے ہیں — جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ انہی الفاظ کی تکرار کرتا رہا ہوں — شاید میرا مقصد حیات یہی ہے کہ تھکے ماندے مسافروں کو اپنے دامن میں پناہ دوں — ان کی ساری تھکن دور کردوں اپنی تر و تازہ ہوا سے ان کی روح میں ایک نئی تڑپ پیدا کردوں کہ وہ تازہ دم ہو کر اپنی منزل کی تلاش میں چل کھڑے ہوں۔ اپنے پتوں کی ہلکی ہلکی تھاپ سے ان کی روح میں گرمیٔ حیات پیدا کردوں کہ وہ افسردہ دل از سرِ نو کشمکش حیات میں حصہ لینے کے قابل ہو جائیں — مگر اے اجنبی مسافر — آج میں شرمندہ ہوں — سخت شرمندہ ہوں — میں اپنے صحیح احساسات کا تم پر اظہار بھی تو نہیں کرسکتا اور کیا کہوں؟ —— کس طرح کہوں؟ —— رنگ رخ دیکھ لو، اور ساری کیفیت روزِ روشن کی طرح تم پر صاف ہو جائے گی۔

پردیسی مسافر! تم جانتے ہو کہ ہماری نسل بہت پرانی ہے — تمام دنیا میں پائی جاتی ہے — میری شاخیں تمام روئے زمین کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہیں۔ میری آنکھیں حیاتِ انسانی کی تاریخ کے تمام مدارج کو دیکھ چکی ہیں۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا مسافر! کہ میری پرستش کی جاتی تھی — لوگ مارے عقیدت کے میرے آگے جھک جاتے تھے — پیٹ کے بل لیٹ جاتے تھے، مجھ پر قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں — لوگ مجھ سے اپنی مرادیں مانگتے تھے — کنواریاں میرے تقدس کے گیت گاتی تھیں۔ میرے آگے رقص کرتی تھیں —— "بوڑھے برگد کی قسم" — ان اطراف میں بہت مقدس سمجھی جاتی تھی اور میرا نام لے کر لوگ عہد و پیمان کرتے تھے۔

آہ! اور وہ دن بھی مجھے اب تک نہیں بھولے ہیں اجنبی! جب کرشن میری سب سے اونچی ڈالی پر بیٹھ کر بنسری بجاتا تھا — اور گوپیاں میری بالیوں میں جھولا جھولا کرتی تھیں — اور اجنبی ان بانہوں نے گوتم کو سہارا دیا ہے — میرے زیر سایہ کنفیوشس کی آنکھیں نورِ عرفانی سے منور ہوئیں — بڑے بڑے پیغمبروں، مفکروں اور اللہ والوں کو میں نے صرف راحت ہی نہیں پہنچائی بلکہ میرے گوشۂ عافیت میں انھوں نے حقیقت کی تلاش و جستجو کے لئے سب سے

پرسکون فضا پائی۔ ہر قسم کے لوگ مجھ سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں ـــــ اجنبی! ـــــ مجھے ہر طرح کے انسانوں کا خیر مقدم کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے فاتحوں کی فوج میرے آغوش میں ڈیرے ڈال چکی ہے چوروں اور لٹیروں نے بھی مجھے اپنا مسکن بنایا ہے ـــــ لیکن مسافر ـــــ تم سے کیسے کہوں کہ جو اُفتاد مجھ پر آج کل پڑی ہے۔ نہ میں نے اس سے پہلے دیکھی تھی، نہ سُنی تھی۔

یہ خزاں کا موسم نہیں ہے اجنبی! اور مجھ پر تو سدا بہار ہی رہتی ہے۔ مگر تم دیکھ لو کہ میں سوکھا جا رہا ہوں۔ میرے پتے پیلے ہو کر جھڑ چکے ہیں، جیسے مجھے یرقان یا تپ دق ہو گیا ہو۔ میری ٹہنیاں خشک ہو ہو کر گر رہی ہیں۔ جیسے مجھے جذام ہو گیا ہو۔ میری بالیاں سوکھ سوکھ کر لوٹتی جا رہی ہیں، جیسے مجھ پر فالج گر گیا ہو ـــــ سایہ بھی تو اب نہیں رہا میری آغوش میں ـــــ اور ایک زمانہ وہ بھی تھا اجنبی! کہ پوری فوج میرے نیچے چھاؤنی ڈال دیتی تھی ـــــ اور آج میں تم سے شرمندہ ہوں ـــــ تمھیں آرام نہیں پہنچا سکتا۔ تمھاری خاطر ایک پتّہ کا سایہ بھی مہیا نہیں کر سکتا۔ مسافر میں کس قدر شرمندہ ہوں ـــــ میں اپنے صحیح احساسات کا اظہار بھی تو نہیں کر سکتا۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے، جب یاد آتی ہے کہ ان آنکھوں نے اس زمانہ میں کیا کیا دیکھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد آتا ہے اجنبی! کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں کرشن نے جب اپنی مُرلی کے مدھ بھرے رسیلے گیت سنائے تھے تو ساری فضا مدہوش ہو کر رقص کرنے لگی تھی ـــــ یہی وہ جگہ ہے جہاں گوتم نے اخلاقیات و روحانیات کا درس دیا تھا ـــ یہاں اسی جگہ، میرے تنے سے پیٹھ لگائے، چشتی نے وحدانیت کا وعظ سُنایا تھا ـــ یہ وہی جگہ ہے جہاں سے نانک کے نغمۂ حق کی گونج اٹھ کر ساری فضا پر چھا گئی تھی۔

سیکڑوں برس کی عمر ہے میری اجنبی! میں نے سینکڑوں انقلاب دیکھے ہیں۔ ان آنکھوں نے انسانی تہذیب و تمدن کے تمام مدارج کا بغور مطالعہ کیا ہے، بہت سی قوموں کو بنتے اور بہت سوں کو بگڑتے دیکھا ہے۔ بہت سے اور خوبصورت شہروں کو تباہ و برباد ہوتے اور بہت سے کھنڈرات کو رشکِ گلستاں بنتے دیکھا ہے۔ یہ اطراف کی کھیتیاں گھوڑوں کی ٹاپوں سے کئی مرتبہ پامال ہوئیں اور پھر لہلہانے لگیں ـــ مگر وہ دل خراش نظارے جو یہ آنکھیں آج کل دیکھ رہی ہیں کتنے ہیبت ناک ہیں ـــ ان سے جبینِ تہذیب پر پسینہ آ جاتا ہے۔ تمدن خون کے آنسو رو رہا ہے۔ اور روحِ ارتقا پر غشی طاری ہو جاتی ہے۔ کیا تم بھی سنو گے یہ داستان؟ سننا چاہتے ہو اجنبی! ـــــ کہ مجھ پر کیا بیتی؟ ـــــ سنو!

اسی جگہ جہاں تم اس وقت بیٹھے ہو اور جہاں ایک زمانے میں لوگ بر بنائے تقدس پیٹ کے بل لیٹ جایا کرتے تھے ـــ چند دن گذرے رات کے وقت ایک نوجوان مصیبت زدہ عورت اور اُس کے شیر خوار بچے نے پناہ لی تھی۔ علی الصبح ـــ جب کہ مسجدوں میں نغمۂ توحید گونجتا ہے ـــ اور مندروں میں ناقوس بجتے ہیں کہ لوگ اپنے معبود حقیقی کے آستاں پر سرِ نیاز خم کر دیں۔ ایک شخص آیا، اس نے کمبل اُلٹ کر سوئی ہوئی، خوف و ہراس سے سمٹی ہوئی عورت کو بیدار کیا۔ عورت نے جب اُسے دیکھا تو مارے خوف کے چیخنے لگی، مرد اُس پر جنگلی درندے کی طرح ٹوٹ پڑا۔ اور اس کا کمبل کھینچ کر اُس کے منہ پر لپیٹنے لگا۔ بچہ دہشت زدہ ہو کر زور زور سے رونے لگا۔ تو اس نے ـــــ

سمجھتے ہو اجنبی کیا کیا؟ — اُس نے بچے کا ایک پیر پکڑ کر زور سے گھمایا اور اس کا سر میرے تنے پر اسی جگہ دے مارا جہاں کبھی عقیدت مند انسانوں نے بوسہ دیا تھا۔ جہاں گوتم، چشتی اور نانک نے پیٹھ لگائی تھی — اور اس طرح اس مرد نے اپنی شہوانیت کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو سرد کرنے کے لئے ایک پُرسکون فضا پیدا کرلی۔

اور سنو گے میری روداد اجنبی! — سنو! ایک روز تقریباً ۵ بجے بہت سے مرد جو تعداد میں تقریباً تیس چالیس ہوں گے کچھ عورتوں کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے یہاں آئے وہ سب مادر زاد ننگی تھیں، گود کے بچوں سے لے کر پچاس برس کی بوڑھیا تک — انھوں نے چھوٹے چھوٹے بچوں اور بچیوں کو جن کی عمر یں ۸ برس سے کم تھیں اپنے نیزوں اور تلواروں پر اُچھالنا شروع کیا۔ جیسے وہ کوئی دلچسپ کھیل کھیل رہے ہوں۔ یہ کھیل ان لوخیز جانوں کی ماؤں بہنوں کے سامنے ہوتا رہا۔ جب اس کھیل سے طبیعت اکتا گئی تو انھوں نے ان عورتوں کے ساتھ جس میں ۸ برس کی بچی سے لے کر پچاس برس کی بوڑھیا بھی شامل تھی کھیلنا شروع کر دیا۔ وہ اس جذباتی کھیل میں پہل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے جھگڑتے تھے! اپنی باری کے لئے لڑتے تھے — مسافر! یہ وہی جگہ ہے جہاں کرشن کے سرمدی نغموں سے مست ہو کر گوپیاں رقص کیا کرتی تھیں — آہ میرے اجنبی دوست! انھوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ جب وہ اپنی خوش فعلیوں سے تھک گئے تو انھوں نے ان نیم مردہ عورتوں کی چھاتیاں کاٹ لیں —— اور پھر بھی تسکین نہ ہوئی تو تلواروں، نیزوں اور خنجروں سے ان کے جسم پر متواتر کچو کے لگاتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ جوش میں مذہبی اور قومی نعرے لگاتے جاتے تھے۔

سیکڑوں مکان جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔ سیکڑوں بچے یتیم ہو گئے۔ ماؤں کی گود خالی ہو گئی۔ سہاگنیں بیوہ ہو گئیں اور چند ہی دنوں میں سیکڑوں کم عمر کنواریوں کے جام دوشیزگی چکنا چور ہو گئے۔ کرشن اور گوتم کے تمدن کے چہرے پر کالک مل دی گئی۔ نانک اور چشتی کی تہذیب کی آبرو لوٹ لی گئی۔

اجنبی! ایک اور رات ایک چھوٹا سا قافلہ میرے زیر سایہ پناہ گزیں ہوا۔ یہ قافلہ ایک بوڑھے کے کنبہ پر مشتمل تھا۔ بوڑھیا، دو جوان لڑکے، ایک کم عمر لڑکا، ایک جوان لڑکی، بوڑھے کی دونوں بہویں جن کی گود میں ننھے ننھے بچے تھے۔ بڑا لڑکا ایک تین برس کے بچے کو گود میں اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ لوگ جانے کس قدر مصائب اٹھا کر، کتنی تکلیفیں برداشت کر کے، گھر بار، مال و اسباب لُٹا کر میرے آغوش میں پناہ لینے آئے تھے۔ لیکن صبح دشمنوں نے اُنھیں گھیر لیا۔ پہلے مردوں کو میرے تنے سے کس کر باندھ دیا۔ پھر انھوں نے ماں باپ کے سامنے ہی بچوں کو تکا بوٹی کرنا شروع کیا۔ اور اسی پر بس نہیں کیا —— اجنبی! — بلکہ باپ۔ بیٹوں، بھائیوں کے سامنے ان کی بہوؤں، بیٹیوں اور بیویوں کی عصمت دری کرنے لگے ——

آہ، مسافر! کتنا حیا سوز تھا وہ منظر! — انسانیت ایڑیاں رگڑ رہی تھی — اور حیوانیت شرم سے منہ چھپا رہی تھی۔ عورتیں چیخ رہی تھیں — مرد چاہتے تھے کہ آنکھیں بند کر کے اس روح فرسا، جگر خراش نظارے سے چھٹکارا حاصل کریں مگر ایک ایک ظالم برچھی لئے ان کے قریب کھڑا تھا۔ جب وہ آنکھیں بند کرتے تھے تو وہ برچھی سے انھیں کچو کا دیتا تھا۔

کئی دنوں تک یہی حال رہا مسافر! — یہ آنکھیں کئی دنوں تک یہی خونیں نظارے دیکھتی رہیں۔ ایک قوم دوسری قوم سے انتقام کی خاطر بہیمیت کی عمیق ترین گہرائیوں میں اتر چکا تھا۔ مذہب و اخلاق، تہذیب و تمدن کی وہ اقدار جو حیات انسانی کے ارتقا نے سیکڑوں برس میں ہزاروں شہدا کے خون کی قربانی دے کر قائم کی تھیں، تباہ و برباد ہو چکی

تھیں - بربریت اور درندگی کا دور دورہ تھا - انسان بھول چکا تھا کہ وہ بھی انسان ہے - اور اُسے بربریت کے دور سے نکلے ہوئے سیکڑوں برس گزر چکے ہیں --- اور یہ وہ سرزمین ہے جس نے دنیا کو تہذیب و تمدن، مذہب و اخلاق، علم و حکمت کا درس دیا ہے - ان ہی کی نسل نے اپنی کوکھ سے ایسی ہستیوں کو جنم دیا ہے جو اخلاق و مذہب - زہد و تقوٰی کی جبینِ پر روشن ستارے کی طرح ہمیشہ جگمگاتی رہیں گی - اس خاک کی گود سے وہ شہدا پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اپنی قربانیوں سے ملک کی بدلتی ہوئی تقدیر پر اپنی مہریں ثبت کردی ہیں --- مگر اس دیس کے باسی سب کچھ بھولے ہوئے تھے - ساری اخلاقی اقدار کا جنازہ نکل چکا تھا - گاندھی - جناح - جواہر لال کا کوئی پُرسان حال نہ تھا - ٹیگور کے مترانے گیتوں کا رس خشک ہو چکا تھا - اقبالؔ کی وطنیت و قومیت کے نغمے سرد پڑ چکے تھے - اجنتا کی نقاشی اور ایلورا کی سنگ تراشی پر سیاہی بکھر چکی تھی -

یہی حال رہا - اجنبی! --- کئی دنوں تک یہی حال رہا --- اور پھر اس سڑک پر جس سے تم اب گذرو گے جو پورب کو پچھم سے ملاتی ہے - پناہ گزینوں کے قافلوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی --- مشرق کے لوٹے ہوئے مصیبت زدہ انسانوں کے "قافلے مغرب کی طرف کوچ کر رہے تھے - اور مغرب کے تباہ حال مشرق کی طرف جا رہے تھے -

ان قافلوں پر بھی بار بار حملے ہوتے تھے - جس کا پلّہ بھاری ہوتا وہ اپنے مخالفوں کو کاٹ چھانٹ کر رکھ دیتا تمام مال و اسباب لوٹ لیا جاتا - جوان عورتوں کو اپنے ساتھ مالِ غنیمت کے طور پر لے جاتے --- پھر ان قافلوں کی حفاظت کے لئے فوجی دستے آنے لگے مگر حملہ آور بھی ہتھیاروں سے مسلح تھے - انھیں ہتھیار ملک و قوم کے دشمنوں نے تباہی و بربادی پھیلانے کے لیے عنایت کئے تھے --- فوجی دستوں کی شمولیت کے باوجود قافلوں پر حملے جاری رہے - اور کبھی کبھی تو فوجی دستے خود تماشائی بن کر یہ خونی ڈرامہ دیکھنے لگتے تھے - اور کبھی وہ لوٹ مار قتل و غارت گری میں ہاتھ بٹانے لگتے تھے --- اکثر ایسا ہی ہوا کہ جب دو مخالف سمتوں سے آنے والے قافلوں کا سامنا ہوگیا تو وہ انتقام کے جوش میں اپنی تمام تکالیف و مصائب کو بھول کر ایک دوسرے پر حملہ آور ہو گئے -

کئی دنوں تک یہی حال رہا مسافر! قافلے لٹتے رہے --- مال و اسباب لٹتا رہا - عصمتیں لٹتی رہیں --- اور یہ آگ و خون کی اندھی ہولی کھیلی جاتی رہی -

ان قافلوں کا حال بھی سن لو - بڑا عبرت ناک منظر تھا ان کا مسافر! تم ابھی اس لمبی سڑک سے گذرو گے جو مشرق کو مغرب سے ملاتی ہے - تمھیں اس سڑک پر جگہ جگہ انسانی خون کے چھینٹے نظر آئیں گے - تم کنارے پر لگتے درخت بھی نہ پاؤ گے جتنی انسانوں کی سڑی گلی لاشیں نظر آئیں گی -

ان قافلوں میں جو مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی طرف کوچ کر رہے تھے، سیکڑوں انسان شامل ہوتے تھے --- بوڑھے، جوان، عورتیں، لڑکیاں، ننھے ننھے بچے، ہر عمر اور ہر قسم کے لوگ، بیمار اور لاغر، کھانستے ہوئے اور لڑکھڑاتے ہوئے انسان، سر جھکائے ہوئے اپنے سروں پر بوجھ اٹھائے ہوئے اس طرح گذر رہے تھے جیسے بھیڑوں کا گلہ گذر رہا ہو، کچھ اپنی گاڑیاں بھی اپنے ساتھ لئے جا رہے تھے کہ سفر میں تکلیف نہ ہو - یہاں کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہ تھا - ماں کی ممتا - باپ کا پیار - میاں بیوی کی محبت، انسانی ہمدردی --- اور انسانی تہذیب کی برسوں کی جدوجہد

کے بعد تعمیر کی ہوئی تمام اخلاقی اقدار فنا ہو چکی تھیں ۔ والدین کے لئے اولاد مصیبت تھی ۔ اور اولاد کے لئے بوڑھے ماں باپ وبالِ جان ۔ اگر کوئی لڑکھڑا کر گرتا تو لوگ بغیر لاش کی طرف دیکھے ہوئے گذر جاتے تھے، کوئی یہ بتانے کو تیار نہ تھا کہ یہ مردہ کون تھا ۔ کس کا عزیز تھا ۔ والدین بچوں کو راستے میں چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے تھے ۔ اور پھر کوئی یہ نہ بتاتا تھا کہ یہ بچہ کس کا ہے ۔ فوجی دستے کچھ لاشوں کو تو سپرد خاک کرتے تھے اور بہت سی لاشیں سڑکوں پر پڑی چیل کوؤں کی خوراک بنتی تھیں ۔ اگر کبھی فوجی دستے کسی غریب لڑکھڑاتے ہوئے بوڑھے پر ترس کھا کر اسے کسی کی گاڑی میں سوار کر دیتے تھے تو وہ اسے فوجی دستے کے ادھر اُدھر ہوتے ہی اپنی گاڑی سے نیچے اُتار دیتا تھا ۔

اجنبی تم تھک تو نہیں گئے اس داستان سے ؟ ایسے ایک نہیں سیکڑوں واقعات ہیں جن کا ان آنکھوں نے مشاہدہ کیا ہے، ان آنکھوں نے انسانیت کی بنیادوں کو متزلزل اور ارتقا کے سرمایہ کو لٹتے دیکھا ہے ۔

اجنبی ! اب تم اس سڑک سے گذرو گے، تم اس خاک کے ذرہ ذرہ کو انسانی خون سے لتھڑا ہوا پاؤ گے، جگہ جگہ تمھیں انسانی لاشوں کے ڈھانچے نظر آئیں گے ۔ سڑی گلی لاشوں کو چیل کوے نوچتے ہوئے دکھائی دیں گے ۔ ویران اور برباد کھیت نظر آئیں گے ۔ جہاں کبھی ہری بھری فصلیں پیدا ہوتی تھیں ۔ تباہ و برباد، اجڑے ہوئے دیہات دکھائی دیں گے جس کی فضا سے جلے ہوئے انسانی گوشت کی بو آئے گی ۔ تمھیں ایسے گندم کے کھیت بھی نظر آئیں گے جہاں گیہوں کی بالیاں اپنے بوجھ سے خمیدہ ہو رہی ہوں گی اور کوئی ان کا کاٹنے والا نہ ہوگا ۔ جانور فصل کو تباہ کر رہے ہوں گے ــــ اے مسافر ــــ ! تم ان دردناک مناظر کو دیکھتے ہوئے گذر جانا ــــ مگر دل شکستہ نہ ہونا ــــ مایوس اور بد دل نہ ہونا ــــ کیونکہ تم مجھے دیکھو ! ــــ مجھ پر کون سی افتاد نہیں پڑی ؟ کونسی قیامت نہیں ٹوٹی ؟ کیا نہیں دیکھا ان آنکھوں نے ؟ ــــ میری حالت دیکھو خشک ہو چکا ہوں ۔ تمام پتے جھڑ چکے ہیں ۔ ٹہنیاں مرجھا چکی ہیں، ڈالیاں سوکھ رہی ہیں ــــ گر میں مایوس نہیں ہوں ــــ بد دل نہیں ہوں ۔ اور اس لئے تم سے کہتا ہوں کہ دل گرفتہ نہ ہو ۔ اور اپنی منزل کی طرف تیزی سے بڑھتے چلے جاؤ ۔ آج انسان انسانیت کا منکر ہے ۔ وہ حیوانیت و بربریت کے دامن میں پناہ لے کر اپنی فطرت سے نبرد آزما ہے ۔ یہ بہیمیت ہے، یہ درندگی ہے ۔ جو آج اس کے سر پر مسلط، ایک تلخ شراب کی بدمستی ہے ۔ جو دیرپا نہیں ۔ مستقل نہیں ۔ یہ عارضی نشہ جلد ہی اتر جائے گا ۔ اور انسان انسانیت کی آغوش میں پناہ لینے کے لئے مضطرب ہوگا ۔ وہ اپنے افعال پر نادم ہوگا اپنی نازیبا حرکات پر خود ہی لعنت بھیجے گا ۔ شرمندہ ہوگا ۔ اور پھر ان طاقتوں کے خلاف جنگ آزما ہوگا ۔ جو انسانی دماغ پر وقتاً فوقتاً بہیمیت کا نشہ طاری کر دیتی ہیں، وہ دن دور نہیں مسافر ! جب خزاں کا دور حکومت جو تم میری ہستی پر چھایا ہوا دیکھتے ہو دور ہو جائے گا ۔ یہ اندھیرا جو دنیا کے وسیع خطے کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے چھٹ جائے گا ۔ صبح صادق اب آیا ہی چاہتی ہے مسافر ! ۔ جب انسان بیدار ہوگا اور علم و حکمت کا علم بلند کئے ہوئے دشمن انسانیت کو کچلتے ہوئے اپنی منزل مقصود کی طرف آگے بڑھے گا ۔ اٹھو ! مسافر اٹھو ! اور اس وسیع سڑک پر سرگرم سفر ہو جاؤ جو مشرق و مغرب کو ملاتی ہے ۔ ارضِ بسیط کے گوشہ گوشہ کو بیدار کرو ۔ انھیں پیغام عمل دو ۔ انھیں بتاؤ کہ آج کتاب ہستی کا شیرازہ بکھر چکا ہے اس مقدس تسبیح کا دانہ دانہ منتشر ہو چکا ہے ۔ انسان کبوتروں کی طرح چھوٹے چھوٹے خانوں میں حیوانیت و درندگی کی زندگی بسر کر رہا ہے وہ اپنی منزل کو بھول چکا ہے ۔ وہ بھول چکا ہے کہ اس کا مقصد حیات عالمگیر محبت اور عالمگیر اخوت ہے ۔ اٹھو ! مسافر اٹھو ! اور اپنی منزل پر گامزن ہو جاؤ ۔ دیکھنا ۔ اوشا دیوی " سنہرا تاج لئے تمھاری پیشوائی کو آرہی ہے ــــــــــــ (مئی ۱۹۴۸ء)

صدیقہ بیگم

ملہار ہے یا دیپک

آج نہ جانے کتنے دنوں کے بعد اس کے چہرے پر تفکر کے آثار نظر آرہے تھے ورنہ عام طور پر تو اس کا چہرہ بالکل سادہ اور بے معنی سا رہتا! جس پر اداسی کی ایک ہلکی سی تہہ ضرور ہوتی۔۔ مگر یہ اُداسی تو اس کے چہرے کا ایک حصّہ بن چکی تھی، اس لیے اس میں کوئی معنی نکالنا بھی زیادہ مناسب نہ تھا، یا پھر یوں سمجھیے کہ یہ اداسی اس کی دوسری عادت سی بن گئی تھی مگر آج تو اس کے چہرے پر تفکر کے گہرے آثار نظر آرہے تھے۔ جیسے ساری دنیا کی فکر اس کی آنکھوں میں سما گئی تھی، اُس کے ہونٹوں پر ذرا بھی تو مسکراہٹ نہ تھی بلکہ ان گھنی پلکوں میں کوئی گہری فکر جھانک رہی تھی وہ نہ جانے کہاں تھی کس دنیا میں تھی، آنگن میں منّی کے کھیلنے کا شور، کبھی کبھی اس کے دماغ میں تالیاں سی بجا کر خاموش ہو جاتا۔ کھڑکی سے آنے والی گرم گرم ہوا اس کے کھلے ہوئے بالوں کو اس کے مُنہ پر بکھیر دیتی لیکن وہ دونوں ہاتھوں سے جھٹک کر ان کو پیچھے ڈال دیتی مگر یہ ہوا اُس کے خیالات کو منتشر نہ کر سکی۔ بظاہر اُس کی آنکھیں گلدان کے تازہ پھولوں پر جمی ہوئی تھیں مگر وہ رنگ و بو کی اس دنیا سے بہت دور تھی۔ گلدان کے یہ تازہ پھول اس کی آنکھوں میں شگفتگی نہ پیدا کر سکے۔ وہ خیالات کے پروں پر اُڑتی چلی جا رہی تھی جیسے یہ سب کچھ کوئی سہانا خواب ہو، ہاں خواب ہی تو تھا جیسے یہ خواب پھر حقیقت بھی بن سکتا ہے، اُس کے کان تاروں کی جھنجھناہٹ کو ترس گئے تھے، وہ تار جو آخری بار جھنجھنائے پھر جیسے یکبارگی سب ٹوٹ گئے۔ پھر ساز ہی کیا رہ گیا۔ لکڑی کا ایک جھنجھنا مگر وہ سوچ رہی تھی کاش اس لکڑی کے جھنجھنے ہی سے کوئی نغمہ پھوٹ پڑتا اور کان لگانے پر ہلکی سی جھنجھناہٹ ہی سنائی دیتی، کتنا اچھا ہے میری منّی کا جھنجھنا جس میں کوئی تار نہیں محض کنکر ہے مگر کیسا بجتا ہے جیسے بین کے سروں پر کوئی سانپ لہرا رہا ہے۔

پھر یہ نغماتی خاکے دھندلے ہو ہو کر ہوا کی لہروں پر غائب ہو رہے تھے مگر رضیہ اُن کے پیچھے دوڑ رہی تھی وہ ان لہروں کو پکڑنا چاہتی تھی مگر ہوا کی یہ لہریں کہیں ہاتھ آتی ہیں، نعیم بھی تو ان لہروں کی طرح آیا اور غائب ہو گیا۔ مگر رضیہ دیکھتی رہی !!

"امّی! میرا جھنجھنا دیکھو!" منّی نے اپنا جھنجھنا اُس کے منہ میں ٹھونس دیا۔

"دیکھ تو رہی ہوں یہ" اس نے بغیر دیکھے ہوئے جواب دیا۔

"امی وہ با ہر دردی میں سپاہی جا رہا ہے"۔ منی نے اس کو متوجہ کرنے کے لئے دوسری بات کہی۔

"جانے دو" اس نے دور آسمان کے خلا میں نظریں جماتے ہوئے جواب دیا۔

"امی! ہمارے ابا کہاں ہیں؟"

اور اب تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اس کی منی نے اسے بالوں سے گھسیٹ کر وہاں سے ہٹا دیا اور خواب و خیال کی دنیا سے بیدار کر کے حقیقت کی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا۔

"بیٹی! وہ آئیں گے لڑائی لڑنے گئے ہیں ـــــ بڑے دشمن سے لڑائی جیت کر آئیں گے"۔ اس نے کہنے کو تو یہ بات کہہ دی مگر اس قطرے کو کیسے روکتی جو اس کی دونوں پلکوں سے دبانے کے باوجود نکل ہی آیا۔ مگر منی اس قطرے کو کیا سمجھتی وہ ایک قطرہ ہی تو تھا اور پھر اسے فکر تو جب ہوتی جب اس کا باپ واپس نہ آتا، مگر وہ تو لڑائی جیت کر آئے گا۔

رضیہ نے دوپٹے کے پلو سے اسے یونچھ ہی تو ڈالا جیسے اسے گرنے سے بچا لیا ہو اور پھر وہ آسمان کے بے رنگ خلا میں دیکھنے لگی ـــــ ذرا سی دیر میں فہیم جیسے اس کے سامنے مسکراتا ہوا چلا آیا۔

"رضیہ! ـــــ میری رضیہ!!" جیسے اس کے آگے وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا اور رضیہ شرما گئی اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا وہاں کوئی بھی تو نہ تھا ـــــ اس کی منی، اپنی کپڑے کی سفید چڑیا لئے کھڑی تھی ـــــ اور وہاں کوئی بھی نہ تھا، وہ خیالات کے سمندر میں پھر سے غوطے لگانے لگی ـــــ ماضی کے ٹوٹتے ہوئے سپنوں کو جوڑنے لگی، بکھرے ہوئے حال کو جیسے سمیٹ رہی ہو، اور مستقبل کی کلیوں کی طرف ہاتھ بڑھاتی چلی جا رہی ہو۔ مگر وہ کلیاں تو جیسے اس کے ہاتھ سے چھوٹی جا رہی تھیں اور وہ سوچنے لگی کہ مستقبل اس کی گرفت سے باہر تھا ـــــ وہ خیالات کے پروں کے سہارے اڑ رہی تھی اور ہوا کے دوش پر سراج کے تار جھنجھنا رہے تھے۔ اس نے اس طرح آنکھ کھولی جیسے ابھی سو کر اٹھی ہو، اس نے اپنی آنکھیں ملیں اور ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی بڑا بوجھ اس کے سر سے اتر گیا ہو، فہیم اس کے سامنے اکڑتا ہوا مسکراتا چلا آ رہا تھا، کتنا صحت مند جسم ہے اس کے شوہر کا، کشادہ سینہ اور بھرا بھرا جسم ـــــ رضیہ نے منی کو ایک دم سے گود میں اٹھا ہی تو لیا اور خوب بھینچ کر پیار کیا، اس کے جی میں تو آیا کہ منی سے کہہ دے کہ "دیکھ تیرا ابا وہ سامنے بیٹھا ہے"۔ مگر وہ تو نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

کتنا گانے کا شوق تھا میرے فہیم کو ـــــ کچھ خاکے اس کے ذہن کے سامنے سے گزر رہے تھے جیسے پچھلے ماہ و سال رقص کرتے چلے جا رہے تھے۔

جھوم جھوم بدریا جھک آئی
اب کیسی گھنگھور گھٹا کاری چھائی

رضیہ کو اس وقت کتنی ہنسی آئی تھی۔ مئی جون کی گرمی تھی، لو کی لپٹیں تھیں، جو بدن کو جھلسائے دے رہی تھیں، اور آپ گا رہے تھے، جھوم جھوم بدریا جھک آئی، معلوم نہیں گرمی کی اس تیز دھوپ میں بدریا کہاں چھپی تھی جو برس ہی تو پڑے گی ـــــ بڑے نان سینس ہی تو ہیں ـــــ رضیہ جھٹ اٹھ کر فہیم کے پاس پہنچ گئی تھی۔ فہیم جھوم جھوم کر گا رہا تھا جیسے وہی بدریا ہے جو جھوم جھوم کر برس ہی تو پڑے گی۔

"کیا دیپک گا رہے ہو؟" رضیہ نے فہیم کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اور اسی لمحے اس کا دوپٹہ ڈھلک گیا

مگر نہیم تو اپنی دھن میں مست تھا، بادل اس کے اوپر دندنا رہے تھے اور رضیہ کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی مگر اس لمحہ کی چمک نے اس کی آنکھوں کو زیر کر دیا مگر پھر وہ آواز سنسناتی ہوئی اس کے جسم میں پہونچ گئی اس نے اپنی رگوں میں اینٹھن سی محسوس کی، نہ جانے یہ گانے کی تاثیر تھی یا اس کے بول تھے جو اس کے سینے میں اترتے چلے گئے۔

بجری کی چمک ، بادل کی گرج

اب منہ منہ یوں چلت پُروائی

فہیم نے انترا اٹھایا، اور اب تو جیسے کان ہی پھٹ گئے، سوائے فہیم کے گانے کے اور کچھ سنائی بھی تو نہیں دے رہا تھا۔ اور پھر وہ جھوم جھوم کر اُس کے سم پہ آ کر رک گیا۔

"یہ تو سچ مچ دیپک تھا دیپک" رضیہ بولی۔

"یہ دیپک تھا!!" فہیم کے ماتھے پر کتنی ہی لکیریں پڑ گئیں ——— "جاہل کہیں کی یہ ملہار ——— برساتی راگ تی تالا———"

"تو یہ کوئی برسات ہے؟"

"برسات نہ سہی، پر ساگ تو برساتی ہے، کیا موسم کے ساتھ راگ بھی بدل جاتے ہیں؟"

"مگر یہ تو بے وقت کی راگنی ہوگی، اتنی سخت دھوپ، لو گرمی اور آپ گا رہے ہیں" جھوم جھوم بدریا جھک آئی، اس گانے سے تو اور بھی آگ برسنے لگی؟

"اچھا سہاگ گاؤں؟" تمہیں تو بس سہاگ ہی پسند آئے گا، سچ کہتا ہوں رلا دوں گا، کیا کوئی مرثیہ گائے گا جو میں سہاگ گاؤں گا———"

"تو پھر میں کیا کروں" رضیہ چڑھ سی گئی۔

"کرتی کیا! تیری شادی میں گاؤں گا اور ایسا گاؤں تا کر ساری محفل سسکیاں لینے لگے گی اور تو تو بس دھاڑیں مارے گی ———"

"اور آپ نہیں روئیں گے جیسے؟"

"میں کیوں روتا روئے میری بلا، میں تو خوش ہوں گا اور گاؤں گا جھوم جھوم کر——— "لکھیا بابل نخیر چھوٹ ہی جائے؟"

مگر وہ تو انگلیوں میں دوپٹہ مروڑ رہی تھی اور بات کی بات میں دوسرے لمحے اس کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ٹپک ہی پڑے۔ فہیم چونک پڑا۔

"رضیہ———" اس نے ٹھوڑی میں ہاتھ لگا کر منہ اوپر اٹھانے کی کوشش کی مگر اس نے سر اور نیچے گرا دیا——— رضیہ——— اب وہ ہیرا ج کو ایک طرف رکھ کر رضیہ کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ رضیہ کیوں رونے لگی۔ وہ یہ بھی تو نہ سمجھ سکا، اس کے مذاق سے تو نہیں بُرا مان گئی مگر وہ مذاق تو ہمیشہ ہی کرتا ہے اور رضیہ کبھی اس کے مذاق سے چڑھتی بھی نہ تھی———

"رضیہ——— اچھا ہے خوب رو لے، یہ گالوں کی سرخی تو ڈھل جائے گی——— اچھی نہیں لگتی مجھے یہ سُرخی؟"

"کیسی سرخی ——" وہ کھسیانی سی ہوگئی۔

"یہ گالوں کی سرخی"۔ اور فہیم اس کے گالوں پر اپنی انگلی پھیرنے لگا —— "ارے یہ کیسی سرخی ہے۔ جو چھوٹتی ہی نہیں"۔

"یہ سرخی کب ہے —— میں سرخی نہیں لگاتی"۔

"اچھا تو یہ تمہارا رنگ ہی ایسا ہے، میں تو سمجھا تھا کہ سرخی لگاتی ہو، اچھا ہی ہوا ورنہ اس روز تو میرا ارادہ تھا کہ پانی میں کپڑا تر کرکے پونچھ ہی تو ڈالوں اس سرخی کو"۔ پھر وہ شرارت سے مسکرایا۔

مگر وہ تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملہار کے برساتی راگ جھوم جھوم کر اس کے ارد گرد منڈلا رہے ہیں۔

"نہیں بتاؤ گی رضیہ —— شادی کی بات پر ناراض ہوگئیں اچھا جاؤ وعدہ کرتے ہیں، آج سے شادی کی بات نہیں کریں گے۔ بس اب چپ ہو جاؤ نہیں تو بلاتا ہوں اماں کو" فہیم نے دوسری چال چلی اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوگیا۔

"رضیہ بیٹی جا —— کباب تل لے، اماں بی جوتے کے لیترے گھسیٹتی ہوئی دروازے تک آئیں اور پھر واپس چلی گئیں۔

رضیہ خاموشی سے اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چل دی اور اس وقت وہ اٹھنے کا بہانا بھی تلاش کر رہی تھی وہ فہیم کے سامنے بیٹھنا بھی تو نہ چاہتی تھی اس کا دل آپ ہی آپ بیٹھا جا رہا تھا وہ سوچ رہی تھی کہ کاش اس کو موقع ملتا اور وہ کھل کر رو بھی سکتی۔ نہ جانے اسے رونے سے کیوں شرم آنے لگی تھی، اور پھر جب اماں بی کا یہ عالم کہ جب کوئی رخصت ہوتا تو خوب ہی روتیں اور خاص کر جب فہیم جاتا تو پھر کچھ نہ پوچھو ان کی کیا حالت ہوتی —— لیکن رضیہ کی تو عجیب کیفیت ہوتی، پہلے تو وہ اِدھر اُدھر کے کاموں میں لگ جاتی اور جب فہیم چلا جاتا تو وہ کوٹھری میں پہنچ کر کوئی کتاب اٹھا لیتی اور پھر اس کی آڑ میں خوب ہی تو جی کھول کر روتی، مگر ذراسی آہٹ ہوئی اور اس نے جلدی جلدی آنکھیں پونچھیں اور اس کتاب کے حروف پھیلے پھیلے سے اس کی آنکھوں کے سامنے رینگنے لگتے، کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا؟ مگر پھر وہ اُلجھ سی جاتی، آخر اس رونے میں کیا برائی ہے۔ اماں جی بھی روتی ہیں اور رضو کا بھائی جب جاتا ہے تو وہ کیا روتی ہے اس کا بھائی جاتے ہوئے اس کو پیار کرتا ہے مگر اس پیار سے وہ کبھی بہلا نہیں سکتا، وہ تو اور بھی دھاڑیں مار مار کر روتی ہے، مگر نہ جانے کیوں وہ رضو کی طرح کھل کر نہ رو سکتی، اور فہیم تو اس سے چلتے وقت بھی نہ پوچھتا تھا وہ تو بس کوٹ کاندھے پر ڈال چل دیتا، جیسے پرندہ اڑنے کے لئے پر تولے بیٹھا ہو، موقع ملا اور پھر سے —— بچاری دادی اماں کو تو اٹھتے اٹھتے ہی پانچ منٹ لگ جاتے —— کیسا بے حس ہے، دوسروں کے جذبات کا تو خیال ہی نہیں کرتا۔ مگر وہ خط کیسے مزے کے لکھتا۔

"میری رضیہ یہاں بالکل جی نہیں لگتا، سب یاد آتے ہیں، بچوں کا کھیل کود —— اماں کا غصہ اور بچی کی باتیں، یہ سب ہی تو آنکھوں کے سامنے پھرتی ہیں"۔

"اور میری کوئی بات بھی یاد نہیں آتی" —— رضیہ جھنجھلا کر رہ جاتی، اور وہ خط پڑھ کر تکئے کے نیچے چھپا کر رکھ دیتی جیسے کوئی بڑے راز کی چیز ہی تو ہے مگر اس کے خیالات کا سلسلہ نہ ٹوٹتا اور وہ سوچتی ہی چلی جاتی —— آخر میرے نام خط لکھنے کی ضرورت ہی کون سی تھی جو میں یاد نہیں آتی۔

اور وہ تہیہ بھی کر لیتی کہ ان کو اب خط نہ لکھے گی مگر پھر نہ جانے کیوں ایسا نہ کر سکتی۔ نہ جانے اس کے دماغ میں آندھیاں

اسی یوں چلنے لگیں جیسے وہ کسی طوفان میں بہی چلی جا رہی ہو، کتنے سنسان ہیں یہ میدان، جس میں پیپل کے پتوں کی اداس اداس کھڑکھڑاہٹ کے سوا کچھ بھی سنائی نہیں دیتا ——— اور وہ بھی کتنی مجبور ہے جو اس اداسی پر قابو نہیں پا سکتی ——— پھر اس کو فہیم پر غصہ آیا، کتنے بے حس ہیں، جن کو موسیقی کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا کوئی آواز ان کے کان تک نہیں پہنچ پاتی ——— مگر موسیقی سے تو اُسے بھی محبت ہے، پیلو کی تانوں پر وہ کس بُری طرح سر دُھنتی ہے، لیکن فہیم نہ جانے کہاں ہوگا، کس سنسان بستی میں، جہاں نہ اب موسیقی کا گزر ہوگا، نہ ملہار کے برساتی راگوں کی پہنچ اور نہ جانے وہ ہو یا نہ ہو۔

لیکن فہیم چلا گیا۔ شادی کے ایک مہینے بعد ہی چلا گیا، اور سارے گیت و نغمے اپنے ساتھ لیتا گیا، رضیہ کچھ بھی نہ کہہ سکی، اور وقت یوں ہی اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتا چلا گیا مگر وہ کیسے روکتی اور اب تو جیسے اس کی آنکھیں پتھرا گئی ہوں۔ وہ اگر سب کے سامنے بھی روتی تو اسے کون روک سکتا تھا، وہ کسی سے شرما بھی نہیں رہی تھی، اس کا جی چاہا کہ فہیم لے آ کر پچھلے دنوں کی طرح ملہار راگ ہی سناتا مگر اس وقت تو دیپک کے بول اس کے دماغ میں گونج رہے تھے اور سارا جسم جھلس رہا تھا اور آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ تھا جسے وہ ملہار کے نام ہی پر نچھاور کر دیتی۔

"رضیہ! میں جلد آؤں گا، جیسے ہی نوکری ملی میں فوراً آؤں گا، میں اس بچے کے لئے جا رہا ہوں جو ابھی دنیا میں نہیں آیا، میں چاہتا ہوں کہ وہ تو آرام سے رہ سکے۔ آخر ہمیں اپنے لئے نہیں تو اس کے لئے نوکری کرنی ہی ہے۔"

اس کی آنکھ میں آنسو آ گئے اور فہیم اُن بوندوں کو دیکھتا ہوا چلا گیا، نوکری کی تلاش میں، اپنے ہونے والے بچے کے لئے نئی زندگی کی سہولتیں اور آسائشیں خریدنے، خود جد و جہد کر کے اس کے لئے سکون حاصل کرنے۔

پھر کچھ دنوں بعد وہ فوجی لباس میں آیا، اس میں بلا کی پھرتی آ گئی تھی جیسے کسی نے اس کے بدن میں بجلیاں بھر دی ہوں رضیہ چونک ہی تو پڑی۔

"یہ خاکی وردی ہے کیسی؟"

"اب میں فوجی ہو گیا ہوں، یہ دیکھو میرے بازو" اور رضیہ چونک پڑی اس لئے کہ ان بازوؤں میں تارے لرز رہے تھے ——— "یہ کیسے تارے ہیں؟" وہ گھبرا گئی تھی ایک لمحے کے لئے تو اُسے محسوس ہوا جیسے وہ کوئی اجنبی تھا، وہ کوئی غیر تھا اور جیسے رضیہ نے آج سے پہلے اُسے دیکھا بھی نہ تھا ——— مگر دوسرے ہی لمحے وہ اُسے اپنا فہیم ہی معلوم ہوا اور اس کی آنکھوں میں چمک دوڑ گئی۔

"کیا فوج میں بھرتی ہو گئے؟" اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے زمین پر کوئی جھنکار پیدا ہوئی۔ اور وہ اس سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

امی نے اس کی بلائیں لیں، دن دونی رات چوگنی ترقی کی دعائیں دیں اور پھر سات سمندر پار اس کی حفاظت کے لئے امام ضامن کو سونپ دیا۔

پھر وہ چلا گیا اور کچھ دنوں کے بعد خبر آئی کہ وہ لڑائی کے میدان میں پہنچ گیا ہے۔

رضیہ ایک خوبصورت سی بچی کی ماں بھی ہو گئی تھی اور اب رضیہ ہی نہیں انتظار کر رہی تھی بلکہ ایک معصوم بچی بھی اس انتظار میں شریک تھی۔

"امی! بتاؤ وہ ابا کب آئیں گے؟" منی اس کے پیروں میں لپٹ رہی تھی اور اس کے خیالوں کے سلسلے کو توڑ رہی تھی۔

(باقی صفحہ ۸۲۷ پر)

انور عظیم

میں زندہ ہوں

GOVT GIRLS COLLEGE
ACC. NO 15227
LIBRARY

میں مر چکا ہوں ــــــ
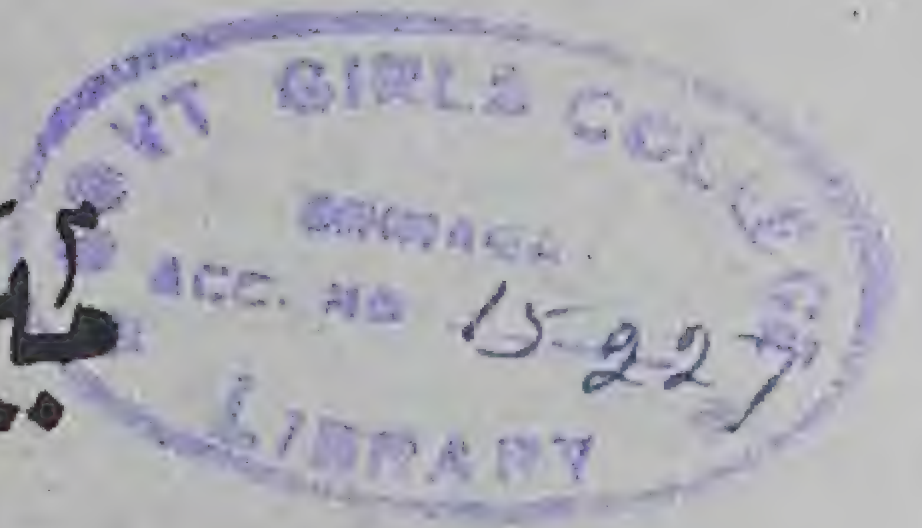
کون کہتا ہے، میں مر گیا ہوں۔ میں زندہ ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرے جسم سے گولیاں گزری ہیں ــــ یہ ٹھیک ہے کہ دشمنوں کی نظر میں مر چکا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ پوسٹ مارٹم کے بعد میرا جسم ہگلی کے حوالہ کر دیا گیا ہے۔ پھر بھی میں زندہ ہوں، مجھے کون مار سکتا ہے ــــ میں ماضی کا ورثہ ہوں۔ میں مستقبل کی روشنی ہوں۔ میں فضا میں بلند ہوں۔ وکٹوریہ میموریل کے گنبدوں سے بلند، ناریل اور جامن کے درختوں سے بلند ــــ میں یہاں سے دور تک دیکھ سکتا ہوں۔ قطب اور تاج کو دیکھ سکتا ہوں ــــ گنگا اور جمنا کا سنگم کتنا خوبصورت معلوم ہوتا ہے ــــ ہیر رانجھا کی محبت کینچلی پہنے گنگا اور جمنا میں چاندی کے تار کی طرح چمک رہی ہے ــــ یہ چمک پنجاب سے اُبھری ہے اور ساری فضا میں پھیل گئی ہے، ساری زندگی میں گھُل گئی ہے ــــ میرے تجربات کا خزانہ کتنا بھاری ہے۔ میں اس خزانہ کو لٹانا چاہتا ہوں۔ میں حاتم طائی ہوں ــــ میں اسے لٹانا چاہتا ہوں۔ ان فنی تجربات کو جو ایک کبھی نہ مرنے والے آبشار کی طرح موج زن ہیں۔ ــــ میں دیکھ رہا ہوں ــــ صاف دیکھ رہا ہوں۔

میرا پتلا دُبلا جسم ــــ زرد، پتلا دُبلا، پیارا پیارا بدن، پانی کی موجوں میں پیچ و تاب کھاتا ہوا اپنے سفر کے اس دہانے پر پہنچ گیا ہے، جہاں سے خلیج بنگال کا چوڑا چکلا سینہ اژدہا کی طرح دکھائی دے رہا ہے ــــ میں اس جسم کو پہچانتا ہوں ــــ کس تیزی سے یہ جسم سمندر کی طرف بہتا جا رہا ہے، اور ننھے پھُلا کر لپکنے والا نیلا سمندر کتنا مطمئن دکھائی دیتا ہے۔ جیسے اس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ ہو۔

میں اس جسم کو پہچانتا ہوں۔ کیوں ــــ میں نہ پہچانوں تو اور کون پہچانے گا۔ میں اسی جسم میں اٹھارہ سال سال تک سانس لیتا رہا ہوں ــــ دھان کی طرح زرد اور گیہوں کی بالیوں کی طرح خوبصورت جسم سنہرے دیس میں پلتا رہا ــــ اور اب یہ اپنا سفر طے کر کے خلیج بنگال کی طرف تیزی سے دوڑا جا رہا ہے۔ میں اسے کیسے بھولوں گا۔ یہ جسم تیزی سے اپنے نقوش کھوتا جا رہا ہے۔ یہ بدن بدلتا جا رہا ہے۔ خود مجھے پہچاننے میں دقت ہو رہی ہے۔ خوبصورت زرد گال پانی میں بہتے بہتے سڑنے لگے ہیں۔ آم کے گودے کی طرح۔ آنکھوں کی قبر میں پانی چھوٹی چھوٹی چاندی کی مچھلیوں کی طرح جھلملا اٹھتا ہے۔ اور اب بھی مچھلیاں تلووں کا گوشت چاٹ رہی ہیں۔ مچھلیوں کے ننھے ننھے منہ سے چھوٹے ہوئے گوشت کے

ریزے موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے موجوں کے جھاگ میں کھو جاتے ہیں۔ سینے پر بال چپکے ہوئے ہیں۔ گردن کی ہڈی کے اور سینے کے درمیان دو گولیوں نے اپنے خونخوار سفر کا نشان چھوڑ دیا ہے۔ کتنا جنون تھا ان گولیوں کی جھپٹ میں اس کا اندازہ ان کالے نشانوں سے ملتا ہے جو ان زخموں کے ارد گرد ہالے کی طرح گھیرا ڈالے ہوئے ہیں۔ گولیاں اپنا سفر کر چکی ہیں اور یہ نشان گردِ کارواں کی طرح پیچھے رہ گیا ہے ـــــ میں اس جسم سے کتنی محبت کرتا ہوں، بہت پہلے ـــــ میرے گاؤں میں ـــــ میرے مکان کے پاس ایک مہوے کا درخت تھا۔ اس پر چڑیوں نے گھونسلہ بنایا تھا۔ ایک روز مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے اس میں آگ لگا دی۔ اور پھر میں نے دیکھا۔ چڑیوں کے معصوم اور مظلوم جوڑے نے وہ چاؤں چاؤں مچائی تھی کہ ہر طرف ایک گونج سی دوڑ گئی۔ اس وقت جب میں اس جسم سے باہر نکل آیا ہوں، ـــــ تو میری آنکھیں ڈبڈبا آئی ہیں، ـــــ لیکن اس وقت تو چڑیوں کی مصیبت دیکھ کر میں خوشی میں جھوم اٹھا تھا ـــــ میں نے اچھل اچھل کر ہنسنا شروع کر دیا تھا ـــ ہنسی کے مارے میری آنکھیں موند گئی تھیں ـــ ورنہ میں نے چڑیوں کی ان ننھی سرخ آنکھوں میں آنسوؤں کی وہ اذیت ناک چمک دیکھی ہوتی کہ آج میں اپنی تکلیف کو ماند محسوس کرتا۔

میں اس مٹتے ہوئے، مرتے ہوئے، مچھلیوں کا شکار بنتے ہوئے، خلیج بنگال میں گرتے ہوئے، گولیاں کھا کر داغ لے پھرنے والے جسم کی کہانی جانتا ہوں۔

مہندر بہار کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا تھا ـــــ یہ اس جسم کا نام تھا جو کلکتہ کی سڑک پر گولیاں کھا کر شہید ہوا۔ اور اب جو خلیج بنگال کی ہانپتی ہوئی، سانس روکتی ہوئی موجوں میں کھو رہا ہے، ان ہی وحشی، تیز اور گنگناتی ہوئی اور جھاگ تھوکتی ہوئی موجوں میں، جن میں ٹیگور کے گیتوں کا، ان کے مدھم سروں کا خواب ناک ابھار بھی سو گیا ہے ـــــ لیکن اس جسم کے اندر ایک اور مہندر تھا، جو شہر مہندر کے جسم سے زندہ نکل گیا ہے ـــــ وہ ہر انسان میں مشترک ہے ـــــ اور وہ ہر انسان کے جسم سے زندہ نکل جاتا ہے۔ موت اُسے چھو نہیں سکتی　　مجھے موت چھو نہیں سکی۔ مہندر کی کہانی گویا میری اپنی کہانی ہے۔

ہاں تو وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوا تھا ـــ وہ بہت شریر تھا۔ ذہین اور شریر ـــــ جب وہ چھوٹا سا تھا اُس کے باپ نے ایک روز پاس بلا کر خوب چمکارا ـــــ صبح کا وقت تھا۔ ٹھنڈی ہوا کاٹ رہی تھی۔ اُس کے مکان کے سامنے کھلیان لگا ہوا تھا۔ دھان کی دماہی ہو رہی تھی۔ اور اُس کا باپ سامنے بنگلے میں بیٹھا جماہی پر جماہی لے رہا تھا۔ اُس کی مونچھیں پھڑک رہی تھیں۔ چلم سے چنگاریاں اڑ اڑ کر اس کے چندلے ماتھے کی طرف جا رہی تھیں۔ اُس کا چندلا ماتھا سوکھے ہوئے کدو کی طرح چمک رہا تھا جس پر تیل کی مالش کر دی گئی ہو۔ چلم سے دھوئیں کا ایک تار آہستہ آہستہ اوپر کی طرف اُٹھ رہا تھا۔ جو اوپر جا کر پھیل جاتا اور پھر کہرے کے ایک پگھلتے ہوئے دھبے میں تبدیل ہو جاتا۔ مہندر اپنے باپ کی چمکارے سے بے پرواہ دھوئیں کے اس تار کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کا باپ ہنس رہا تھا۔ اُس کا باپ کھینچ کر اسے سینے سے لگانا چاہتا تھا۔ اور وہ ہمک کر دھوئیں کے تار کی طرف چاؤ سے لپک رہا تھا۔ اس کھینچ تان میں مہندر کا ہاتھ چھوٹ گیا اور چلم سے ٹکرا کر وہ زمین پر گر گیا۔ اُس کا گال جھلس گیا۔ اور سامنے کھڑے ہوئے کمیا نے اُسے اٹھانے میں جو ذرا دیر کی تو اُس کے باپ نے اپنے جوتے کی ساری گرد اس کے ننگے جسم پر جھاڑ دی ـــــ اس کی سونے کی انگوٹھی سے اس کمیا کا ماتھا چھل گیا اور خون کی ایک گرم لکیر پھوٹ کر ناک کے کنارے بہہ کر نیچے اُتر آئی۔

وہ اپنے باپ کی مونچھوں کا دشمن تھا۔ جب اس کی مونچھیں پھڑکتیں اور اپنے آسامیوں اور کمیوں پر خفا ہوتا رہتا

اور اس کے سفید دانتوں سے ایک وحشی چمک نکلتی ہوتی تو وہ اچھل کر اس کی مونچھوں کو نوچنے لگتا ——— اس کا باپ اسے گود میں اٹھا کر سینے سے چمٹا لیتا اور کمیوں کی جان بچ جاتی اور وہ منٹو منٹو دعائیں دیتے سرکار کی برق باریوں سے دور ہو جاتے۔

پارٹ شالہ اور مڈل اسکول کی پڑھائی ختم کر کے وہ شہر چلا گیا۔ شہر میں اس نے خوب خوب شرارتیں کیں۔ وہ اپنے ساتھیوں میں کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ کسی نے ذرا تاؤ دکھایا اور اسے آگیا تاؤ۔ پھر مہندر کی کئے بازیاں تو دسویں جماعت تک پہنچنے سے پہلے ایک خاص وقار اور دھونس قائم کر چکی تھیں ———

اسکول میں ایک دن ایسا حادثہ ہوا، جس نے اس کے دماغ کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ ایک ماسٹر نے آوارگی کی انتہا کر دی تھی۔ وہ ہاسٹل کا انچارج بھی تھا۔ رات کو وہ کسی نہ کسی عورت کو لے آتا اور صبح کے جھٹ پٹے میں اسے رخصت کر دیتا۔ مہندر کو اس کی کارگزاریاں معلوم تھیں۔ جب اس کے پاس کوئی نہ ہوتا تو وہ اس کے بارے میں سوچا کرتا۔ اور اپنے اندر والے مہندر، یعنی مجھ سے اس مسئلے پر ——— باتیں کیا کرتا۔

"اس سالے ماسٹر کو ضرور ٹھیک کرنا چاہیے۔ کلاس میں تو وہ دوان پنڈت کی طرح جنگھاڑے گا، ہندو مت کی برائیاں کرے گا۔ مسلمانوں کو اور نگ زیب کی اولاد کہے گا ——— لیکن برہمن کی اولاد ——— مہترانیاں کہاں کی دیودا سیاں ہیں۔ ہت ———"

اور تب میں اسے بہت پیار سے دیکھا کرتا تھا۔ کتنا پیار آتا تھا مجھے اس کے بھولے چہرے پر۔ پھٹی پھٹی آنکھیں جن میں شبنمی نرمی ہر وقت کانپتی رہتی تھی۔ ہونٹوں کا بھنچا ہوا غم اس کی اداس مسکراہٹوں کو اور کبھی غم انگیز بنا دیتا تھا۔ پیشانی پر ایک بڑا سا تل پسینے میں بھیگا رہتا۔ اور اس کی مسیں کتنی بھلی لگتی تھیں۔ اس کے کان جل اٹھتے۔ اور ماسٹر کو ٹھیک کرنے کے منصوبے باندھتا رہتا جیسے ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ اس کے سامنے آگیا ہو۔

آخر ایک روز ماسٹر کی شامت آ ہی گئی۔ ہاسٹل کے لڑکوں نے مہندر کی رہنمائی میں مہترانی کے ساتھ دوان ماسٹر کو پکڑ لیا خوب پٹیا ماسٹر صاحب کو۔ جلوس نکال دیا، ہاسٹل میں۔ بارہ بجے رات کو اچھا خاصہ جیکلس ہو گیا۔ اور ماسٹر صاحب گوتم بدھ کی مورت کی طرح چپ ——— کالو تو بدن میں لہو نہیں ——— لیکن یہ معاملہ ہیڈ ماسٹر نے دبا دیا۔ وہ اس کا رشتہ دار تھا۔ پتنگ لڑی مگر کٹی نہیں۔

ایک روز اسی ماسٹر نے شیواجی اور اورنگ زیب کی لڑائی کا ذکر کرتے ہوئے ہندو مسلم سیاست کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

"ماسٹر صاحب ——— شیواجی اور اورنگ زیب کی لڑائی مذہب کی لڑائی نہیں تھی بلکہ گدی کی لڑائی تھی"۔ بس بھونچال آگیا۔ ماسٹر صاحب ایک دم آگ بگولا ہو گئے۔ ان کی آنکھیں الو کی آنکھوں کی طرح ناچنے لگیں۔ جیسے آتش بازیوں کی دوکان پر دیا سلائی جلا کر پھینک دی گئی ہو۔ ہیڈ ماسٹر نے اس ہتھیلی پر بید سے سانپ کا سیاہ نشان بنا دیا۔ اور وہ نشان چلتے ہوئے تیر کی طرح اس کی ہتھیلی میں گڑ رہا تھا۔ میں اس روز اندر ہی اندر بہت بپھرا تھا۔ اور اس روز سے میں نے مہندر کو بغاوت کا راستہ دکھانا شروع کر دیا　　میں اس پہ اثر انداز ہونے لگا،　　چھانے لگا۔

پھر رفیق سے اس کی دوستی بڑھنے لگی۔ رفیق اس کا ہم جماعت تھا۔ وہ ایک پتلا دبلا لڑکا تھا۔ اس کے بال گھونگھر یالے تھے۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ اس کا چہرہ کافی لانبا تھا۔ ناک نکلی ہوئی اور پیشانی دھنسی ہوئی ——— وہ ہمیشہ مسکراتا رہتا تھا۔ یا کم از کم مسکراتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے اندر ٹارچ کے بلب کی طرح کوئی چیز جلتی ہوتی ——— دور ہوتی ہوئی اور قریب آتی ہوئی روشنی سی۔ مار کھانے کے دوسرے دن رفیق اپنی آنکھوں کے بلب کو جھپکاتا ہوا اس کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا۔

"تمھیں ہیڈ ماسٹر کے سامنے جھکنا نہیں چاہیئے تھا۔ تم نے ہاتھ کیوں بڑھایا۔ تمھارا قصور کیا تھا۔ تم آدمی ہو یا بیل"
اور میں نے دیکھا تھا رفیق کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ مہندر اس کی آنکھوں کو گھورتا رہا۔ اُس نے کچھ نہ کہا۔ اس کے کانوں میں صرف ایک بھاری فیصلہ کن آواز گونج رہی تھی۔ آدمی ہو یا بیل۔ ٹھیک ہے ـــــــ یہ فیصلہ کرنا ہوگا ہیں آدمی بن کر رہوں گا یا بیل بن کر ـــ ایک طرف رفیق اپنی آنکھوں کی چمک کے ساتھ کھڑا مُسکرا رہا تھا۔ دوسری طرف اس کا باپ تھا۔ جنگلہ تھا۔ سامنے کھلیان تھا۔ کانپتے منھ بسورتے، ہنسی سے بے نیاز کیئے تھے ـــــ اور بیل جن کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا اور جو دو ماہی کر رہے تھے ـــــ!

دونوں کی دوستی بڑھنے لگی۔ یہ سب میں اس لئے کہہ رہا ہوں تاکہ مہندر کی کہانی سب لوگوں کو معلوم ہو جائے پھر کوئی اس کی کہانی سنانے نہیں آئے گا۔ انٹرنس کا امتحان دینے تک مہندر سنجیدہ قسم کا سوچنے والا ایک نوجوان بن گیا تھا۔ وہ اپنے نچلے لب کے ایک کونے کو دانتوں سے نوچتا رہتا۔ کبھی کبھی خون کا ایک قطرہ نکل کر چمکنے لگا۔ لیکن وہ ہونٹ چبانا نہ چھوڑتا ـــــــ

شام کے وقت رفیق مہندر کے کمرے میں پہنچا۔ اسے ہاسٹل سے نکال دیا گیا تھا۔ اور وہ بھارت ٹاکیز کے پاس ایک کمرہ لے کر رہنے لگا تھا۔ مہندر امتحان دے کر اپنے گاؤں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ بھارت ٹاکیز سے فلمی گانوں کی آوازیں آرہی تھیں عشقیہ گانے۔ مہندر۔ ان گانوں سے بہت چڑتا تھا۔ اس نے اپنے سیاہ جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سینما کی طرف دیکھا۔

"کیا مہندر آج ہی چلے جاؤ گے ـــــــ؟"

"نہیں یار، ـــــ صبح چلا جاؤں گا۔ سب پیسے کتابوں پر ختم ہو گئے"

"کون سی کتابیں ـــــ"

"وہی ـــــــ"

رفیق مسکرایا اور مہندر کو دیکھنے لگا۔ جیسے وہ اس کی روح میں اُترنا چاہتا ہو۔

"چلو ـــــ آج چھ سات آنے پیسے مل گئے ہیں چائے پئیں گے ـــــ"

باسدیو کی دوکان سے چائے کی سوندھی سوندھی خوشبو حال سے نمتی ہوئی معلوم ہوتی تھی ـــ دماغ اس جال میں پھنس کر ایک کیف سا محسوس کرنے لگتا تھا۔ باسدیو کے یہاں دودھ میں خاص بات ہوتی تھی۔ محض چائے کی وجہ سے ہزاروں روپیوں کا مالک ہو گیا تھا۔ وہ بالکل جاہل تھا مگر اُس کے پاس کار تھی۔ اس کے پاس سونے کی زنجیر تھی۔ اُس کے پاس چہرے کی سیاہی تھی اس پر اطمینان کی چمک تھی۔ اس کے گلے میں سونے کی زنجیر جھینگر کے گلے میں پیلے ریشم کے دھاگے کی طرح چمکتی رہتی تھی۔ اس کی توند اُس کی رانوں پر رکھی رہتی اور وہ اُسے اپنے ہاتھوں سے سہلاتا رہتا۔ جیسے روٹھے ہوئے بچے کو مٹھائی کے وعدے پر منا رہا ہو۔

"ان جاؤ بھی مان جاؤ۔ لیمن جوس دوں گا ـــــــ"

"تو تم کالج میں ضرور نام لکھاؤ گے ـــــــ"

"ہاں ـــــ" مہندر نے آنکھیں اوپر نہیں اُٹھائیں۔

رفیق مسکرانے لگا۔

"اور تم ـــــ" مہندر نے پوچھا۔

"میں ـــــ" چائے کے گھونٹ کو شراب کی طرح حلق کے پار اُتارتے ہوئے وہ مسکرانے لگا۔" میں اَب نہیں پڑھوں گا۔ ـــــ مجھے اس سے بھی ضروری کام کرنا ہے۔ میرے ابا کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے۔ کلرک سے امید ہی کیا رکھتے ہو۔ رشوت سے کتنا کام چلے۔ پھر بہن کی شادی۔" وہ یکایک سنجیدہ ہوگیا۔" میں دوسرا کام کروں گا" ـــــ

وہ مسکرانے لگا۔ مہندر کے ہونٹ بھی پھیل گئے۔ آنکھوں کا پھیلا ؤ چمک اٹھا اور گالوں پر بھنور سا بن گیا۔

رفیق نے ایک اور گھونٹ حلق کے پار کیا۔ اور دھیمی آواز میں کہنے لگا۔" آج میں تم سے بہت ہی ضروری بات کہنا چاہتا ہوں ـــــ میں تو اب اپنی پارٹی کو پورا وقت دوں گا۔ یہی میری زندگی ہے ـــــ سمجھے" وہ کھڑا ہوگیا۔ ایک آدمی اُس کی گفتگو کو بہت غور سے سُن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سیاہی تھی اور اس میں ایک ہولناک چھچھوراپن تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ چُپ۔ دونوں کا دل بھرا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ رفیق کو کچھ کہنا تھا۔ مہندر کو کچھ سُننا تھا۔ دونوں ندی کے کنارے جا کر بیٹھ گئے۔ پُل پر سے بگھیاں، رکشے، بیل گاڑیاں، ٹرکس اور ٹیکسی گاڑیاں گذر رہی تھیں۔

ندی کا پانی آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ پانی کے نیچے بالو چمکتا ہوا نظر آرہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پتھر خاموش پڑے ہوئے تھے اور بہتے ہوئے پانی کی سطح پر بلوریں رگوں کی طرح صاف شفاف نشانات ابھر رہے تھے۔ سورج درختوں کے جھنڈ کے پار سُرخ کرنوں کے جال کو تھکے ہوئے مچھیرے کی طرح سمیٹ رہا تھا۔

رفیق نے اپنا گلا صاف کیا۔ جیسے کچھ گائے گا۔ اور اس کی آواز ندی کے نرم رو بہاؤ میں ڈوب گئی۔ اور پھر وہ بولنے لگا" تم کافی ترقی کر گئے ہو مہندر۔ تمہیں اس کام کو جاری رکھنا ہے ـــــ کتے اور بکری کی زندگی کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔"

وہ رُکا ـــــ دونوں کی آنکھیں کاٹن مل کی چمنی سے اٹھتے ہوئے دھوئیں پر جم گئیں۔ پُل پر سے بگھیاں، رکشے، بیل گاڑیاں اسی طرح گذر رہی تھیں۔ دھندلکے میں وہ سب ایک سایہ کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ ـــــ "تمہیں اپنی زندگی کو اس گندگی سے نکالنا ہے بلکہ ـــــ"

"میں سمجھتا ہوں ـــــ میں سمجھتا ہوں ـــــ" اور اس کی آنکھوں میں اس کے باپ کی مونچھیں اُبھر آئیں۔ کانپتے ہوئے لرزتے ہوئے، کہار، کمیرے ـــــ کالے کالے اجسام۔ خاموش: آنکھیں روشنی سے بے نیاز اور ہونٹ جو مسکراہٹ کی ایک ادھ کرن سے فاضل کچھ نہ حاصل کر پاتے ـــــ" میں سمجھتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں" وہ چُپ ہوگیا۔

رفیق ڈوبتے ہوئے سورج سے پھوٹتی ہوئی سُرخ شعاعوں کو دیکھتا رہا ـــــ ہر طرف سناٹا تھا۔ دو تین دھوبی اور دھوبنیں گدھوں پر کپڑوں کا موٹے لاد کر چلی جا رہی تھیں۔ سر پر بڑی بڑی گانٹھیں رکھے۔ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں معلوم ہوتا تھا کہ دھوبیوں اور دھوبنوں کا سر ہوا سے پھول گیا ہے۔ اس نے بچپنے میں سوچا تھا بڑے بڑے لوگوں کا سر بہت بڑا ہوتا ہوگا۔ بالکل اسی طرح ـــــ

رفیق اور مہندر کھڑے ہوگئے۔ مہندر نے رات کا کھانا رفیق کے ساتھ کھایا۔ اُسے بار بار اپنی حماقت کا خیال آتا رہا اور وہ خود بخود مسکرا پڑا۔ دونوں ساتھ ہی سینما گئے۔ سیکنڈ شو کے بعد رات بہت گہری ہوگئی تھی۔ دونوں آخری موڑ پر پاسری لوکی دوکان کے پاس اپنے اپنے کمرے اور گھر کی طرف مڑ گئے۔ دونوں خاموش تھے اور دونوں کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

جب وہ امتحان پاس کر گیا تو اُس کے باپ نے گلے سے لگا کر کہا" اب تمہیں میں کلکتہ بھیج دوں گا سائنس پڑھ کر انجنیر بن جائے گا میرا بیٹا ـــــ" اس کا باپ مونچھ سمیت اپنے قہقہے کو چبانے لگا۔ مہندر کو اُس کا باپ عجیب معلوم ہوا۔

اُس نے پوری چھٹی کتابوں کے پڑھنے میں بِتا دی تھی　　ان میں سے کچھ کتابیں اُسے رفیق سے ملی تھیں ــــ اور کچھ اُس نے خود پیپلز بک شاپ سے خریدی تھیں۔

ایک روز وہ پھلواری میں بیر اور شریفہ کے درخت کے نیچے بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ اُس کا باپ آکر اُس کے کندھوں پر جھک گیا۔ وہ دیر تک کتاب پر جھکا رہا۔ اُس کی مونچھیں مہندر کے کان میں گدگدی پیدا کر رہی تھیں۔ اُس نے اُس کے ہاتھ سے کتاب لے لی۔ اور واپس کرتے ہوئے کہنے لگا "کیا لکھا ہے اس کتاب میں۔ اس میں وہی نشان ہے جسے لے کر سالے کسانوں نے پاگلوں کی طرح چیخنا شروع کر دیا ہے" اس کے گلے میں بلغم اٹکتا ہوا معلوم ہوا۔ مہندر مسکرایا اور وہ بلغم تھوکتا ہوا چلا گیا۔

باپ کے ساتھ مہندر کھانے پر بیٹھا ہوا تھا۔

"اب تو آزادی مل ہی گئی۔ ۱۵ اگست کو کتنے دن رہ گئے ہیں۔ گاندھی جی اور نہرو جی نے کمال کر دیا ــ"

"ہاں ہندوستان کو آزادی مل گئی۔ لیکن یہ لوگ بٹوارے پر کیسے راضی ہو گئے بابو جی ـ" "انگریزوں نے یہی بھلا سمجھا تو ٹھیک ہے۔ پھر یہ مسلمان ــ" اس کی آنکھوں میں نفرت کا شعلہ چمک اٹھا "جائیں سالے سب اب پاکستان۔"

"دیش کا بٹوارہ بھائی بھائی کو لڑائے گا ــــ" اس کی آنکھوں میں رفیق کا سانولا مسکراتا ہوا چہرہ کھل اُٹھا۔ وہ ہاتھ دھو کر اٹھ گیا۔ اس کا باپ حیرت سے منہ کھولے اسے کمرے سے باہر جاتا ہوا دیکھتا رہا جیسے اُس نے کسی کنواری لڑکی کو کسی غیر مرد کی آغوش میں دیکھ لیا ہو ــــــ

گرمی کی تعطیل کے بعد مہندر کے کلکتہ جانے کا دن آگیا۔ رات کا وقت تھا۔ پیٹرومیکس کی تیز روشنی سنہرے تھان کی طرح دور تک کھلتی چلی گئی تھی۔ صبح ہی اس کی روانگی تھی۔ غریبوں کو کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ کہار، مہتر، کوتری ــــ سب گدھوں کی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف بیل بندھے ہوئے تھے۔ اور مچھروں کا گیت ان کے کانوں پر چھاپہ مار رہا تھا۔ عورتیں تھیں بچے تھے، مرد تھے ــ ہیپے ہیپے مرد، ننگے ننگے بچے، اور ایک دوسرے میں دھنسی ہوئی عورتیں۔ آنچل سے آدھا منہ چھپائے، اور مردوں کے دانت نکلے ہوئے تھے، ان کی پیشانیاں سکڑی ہوئی تھیں ــــ وہ سب کے سب نیم برہنہ تھے۔

"سرکار میرے لکھنوا کو اب کے بیاہ رہے ہیں ـ" ایک بوڑھے کہار نے کہا۔ مہندر وہیں پر سے گذر رہا تھا۔

"لکھنا ہی پر کیا ہے۔ تیرا سسرا ابھی تو سرکار ہی کا کیا ہوگا۔ بیاہ کا روپیہ مل چکا ہے ـ"

"ہوں ــــ" گدھوں نے سر ہلایا جیسے نئی لاش پر جشن ہو رہا ہے۔

"ہوں ــــ"

مہندر کو معلوم ہوا کہ روشنیاں گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کود پڑی ہیں۔ اور وہ سوچنے لگا۔ ان لوگوں کی زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ بارہ سال، تیرہ سال کا لڑکا، چالیس پچاس روپے کے خرچ پر بیاہ دیا جاتا ہے اور پھر جنم جنم کے لئے، وہ کیا ہو جاتا ہے۔ زندگی بھر کا غلام ــــ گالیاں، تھپڑ، تھوک ــــ لرزش، بھوک اور بیماری، جنم جنم کے لئے؟ ــــ

اس کا جی چاہا کہ ابھی صبح ہو جائے اور وہ گاؤں چھوڑ دے۔ اس کا باپ کسانوں کے خون پر جی رہا تھا۔ مہندر کو محسوس ہوا، کہ اس کی رگوں میں وہی خون دوڑ رہا تھا ــــ ایک بار رفیق نے اُس سے کہا تھا۔ "تمہارے بزرگ لوگ ہمیشہ انقلاب دشمنی کا کام کرتے ہیں" اور اُس کا اعتماد خود اپنی ذات پر سے اُٹھنے لگا۔

صبح ہو رہی تھی ــ اس کی ماں رو رہی تھی ــ اُس کا باپ مسکرا رہا تھا۔ اُس کے دانت جھلک رہے تھے ـ اور

مونچھیں ٹڈے بیتے ہوئے دل کی طرح پھڑک رہی تھیں۔ جب اُس نے موٹر سے جھانک کر دیکھا تو اُس کا گاؤں گرد و غبار میں چھپ گیا تھا۔ اس کا دل ہلکا ہونے لگا۔ بھاگتے ہوئے درخت، گھومتے ہوئے دھان کے کھیت، کھجور، تاڑ، بڑ۔ سب ناچتے ہوئے معلوم ہوئے۔ ماضی کی طرف الٹے پاؤں لوٹتے ہوئے، اندھا دھند، الٹے پاؤں، افتاں وخیزاں ——— اور ایک بے ارادہ مسکراہٹ اُس کے لبوں کے نیچے گدگدی کرنے لگی۔ اور اس کی آنکھوں کا حلقہ ٹھنڈی سانس لیتا ہوا معلوم ہونے لگا۔

چرواہے مویشیوں کو ہانکتے ہوئے ٹانڑ کی طرف جا رہے تھے۔ اور اس کی لاری اسٹیشن کی طرف بھاگ رہی تھی اپنے پیچھے درختوں، مویشیوں، کسانوں اور دیہاتی گیتوں کا دھواں چھوڑتی ہوئی ——— گرد و غبار کا ایک خیمہ سا اٹھاتی ہوئی۔

کلکتہ کتنا وسیع تھا۔ کتنا گہرا، ناچتا ہوا، دوڑتا ہوا کلکتہ۔ اس میں چیخوں کا ہجوم تھا، خاموشیوں کا ذخیرہ تھا۔ اس میں بے باکی بھی تھی اور گھٹن بھی۔ عجیب شہر تھا۔ اجنبیت کا سلسلہ صرف ایک ہفتہ تک رہا۔ کلکتہ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اجنبیوں سے بہت جلد گھل مل جاتا ہے۔ ہر نیا آدمی ایک ہیجانی اجنبیت ضرور محسوس کرتا ہے۔ لیکن بہت جلد اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک عظیم اور وسیع شہر کا جگر گوشہ ہے۔ نئے لوگ اسے جانے پہچانے معلوم ہونے لگے۔ نئی باتیں اُسے اچھی معلوم ہونے لگیں۔ ٹرام، بسیں، ہری ہری، گھن گرج، مخملیں کاریں، اور ان کی دوڑ بھاگ ——— اور تب اسے اپنی زندگی میں تحریک کا احساس ہوا۔ ہر طرف عمل، سرگرمی، بے چینی، تلاش، کچھ پانے، کچھ جیتنے، کچھ جھپٹنے کا سماں دکھائی دیتا۔ اس کا کمرہ ایک گلی میں تھا۔ اسی کمرے میں بیٹھ کر اس نے ایک خط لکھا۔ رفیق کو زندگی میں پہلی بار خط لکھنے میں اسے بہت مزہ آیا۔ اُس نے بہت سی باتیں لکھیں۔ اپنے داخلہ کی باتیں، رفیق کی دی ہوئی کتابوں کی باتیں جن پر نہیا اور ہتوڑے کا نشان بنا ہوا تھا، اور جسے دیکھ کر اس کے باپ نے کسانوں کی خدمت میں ایک عدد گالی پیش کی تھی۔ اس نے کلکتہ میں ایک ایسی میٹنگ بھی دیکھی تھی جس میں رفیق کے رفیقوں کو دیکھ کر اس کا دل خود بخود جذبات سے بھر گیا تھا۔ منومنٹ کا میدان ——— سر جوڑے ہوئے، نعرہ زن، تالیاں پیٹتے ہوئے مزدور۔ اُس کے گاؤں کے کسانوں میں یہ بات کہاں تھی۔ اُس نے آخر میں لکھا تھا۔

"تم نے مجھے اپنے برگ کی نمداریوں سے ایسا چوکنا کر دیا ہے کہ میں اپنے آپ سے جد و جہد کرتا رہتا ہوں۔ میرے دماغ میں جو اُلجھنیں ہیں اُن کی وجہ یہ ہے۔ میری گردن میں ایک روایتی زنجیر ہے جس کا ایک سرا میرے پتا کے ہاتھ میں ہے۔"

رفیق نے اسے تسکین دیتے ہوئے لکھا تھا ——— ٹھیک کہتے ہو۔ تم اپنی زنجیر توڑ دو۔ اپنے شعور کا سہارا لو۔ تمہارے پتا کی گردن میں جو زنجیر ہے وہ اس سماج کے ساتھ ہی ختم ہوگی۔ لیکن تم اپنی جاگرتی سے زندگی کو سمجھ کر اس زنجیر کو توڑ سکتے ہو۔ تم کلکتہ میں ہو۔ تم چاہو تو بہت کچھ سیکھ سکتے ہو کلکتہ سے۔"

زنجیر ٹوٹ سکتی ہے یا نہیں۔ وہ اس وقت فیصلہ نہ کر سکا۔ البتہ گردن کو سہلانے میں اسے ایک خاص سکون ملا۔ جیسے زنجیر اس کی گردن سے اتر گئی ہو۔ پھر اس کے بعد رفیق کا کوئی خط نہیں آیا۔ وہ نہ جانے کبھی کلکتہ میں کھو گیا۔ ہندو مسلم فساد پھر شدت اختیار کر گیا تھا۔ روز کچھ نہ کچھ واقعات ہو جاتے تھے۔ خود اس کی گلی کے پاس گڑ گڑاتے، چھرا بھونکنے، قہقہے لگانے اور خون کی پچکاری چھوڑنے کا ڈرامہ کھیلا گیا تھا۔ اس کا دم بعض وقت گھٹنے لگتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ وہ چائے میں پاؤ روٹی کا ٹکڑا بھگو کر کھا رہا تھا۔ ایک چیخ اس کے کانوں میں گونجی، اتنی ہولناک چیخ اس نے کبھی نہیں سنی تھی۔ اُس کے ہاتھ سے پاؤ روٹی کا ٹکڑا گر گیا۔ اور وہ جھپٹ کر باہر نکلا۔ گلی کے اختتام پر لوگوں نے ایک لاش اُچھال دی، اور وہ لاش خون میں لتھڑی اوپر نیچے ہوئی اور نالے میں غرق ہو گئی۔ ایک بھیانک قہقہہ جھپکا ڈرا کی طرح

پھنکارتا ہوا اڑا اور دھندلاتی ہوئی فضا میں تیر گیا۔ تیزاب کی پھواریں برساتا ہوا۔

وہ اس روز رات بھر رفیق کے بارے میں سوچتا رہا۔ رفیق بہار میں تھا۔ جہاں خود اُس کے باپ جیسے لوگ فرقہ پرستی پھیلا رہے تھے۔ وہ جانتا تھا وہ بھی اس خون آشام سازش میں کسانوں کی تحریک کو ڈبو دینا چاہتے تھے۔ اور اس کا دل کبھی کبھی دھک سے ہو جاتا۔ کہیں رفیق ــــ؟ اور اسے معلوم ہوا کہ ایک اور لاش فضا میں بلند ہوئی اور نالے میں چھلانگ لگ گئی۔ اور ایک چمگادڑ اڑا اور اُس کے کانوں کو چاٹتا ہوا نکل گیا۔ اور اس کے باپ کی مونچھیں، چمکتے ہوئے دانت، گہری اور گہری ہوتی ہوئی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ناچ گئیں۔ ناچتے ناچتے ٹھہر گئیں۔ برف کے ٹکڑوں کی طرح۔ ٹھنڈی اور نرم۔

گلی کے اختتام پر ایک درزی کی دوکان تھی۔ دو تین چائے کی دوکانیں تھیں۔ مٹھائی کی، پھلوں کی، صابن کی اور پاؤ روٹی والی دوکان تو اس کے کمرے کے سامنے ہی تھی اور وہیں پر ایک نئی چائے کی دوکان تھی جس میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت بیٹھا کرتی تھی۔ اس کی چائے وہیں سے آیا کرتی۔

کلکتہ میں چائے زندگی کا جزو بن جاتی ہے۔ مہندر بھی چائے کا بری طرح عادی ہو گیا تھا۔ دن بھر میں کئی کئی پیالیاں چائے پیتا اور پھر بھی اس کی تسکین نہ ہوتی۔ کالج جاتا تو بہت بچ کر جاتا۔ اس لئے کہ تیزاب، بم اور چھرے کا خطرہ تو ہر وقت سایہ بنا رہتا تھا۔

جس مکان کے ایک کمرے میں وہ رہتا تھا، اسی میں بہت سے کمرے کرائے پر لگے ہوئے تھے۔ ایک اندر کا اندھیرا سا حصہ تھا جس میں ایک کرانی بابو رہتے تھے، ان کا ایک جوان بھائی تھا۔ اس کا نام سنبل تھا۔ وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ پتلا۔ حد درجہ گھُلا ہوا انسان۔ اس کی مونچھ پنسل کی لکیر معلوم ہوتی تھی۔ اور اس کا سانولا رنگ زرد ہوتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

باہر کے کمرے والے جتنے کرایہ دار تھے، ان کے لئے مکان کے پچھواڑے میں ایک پانی کا نل تھا۔ وہیں پر ایک پاخانہ تھا جہاں صبح کے وقت راشن کی دوکان کا منظر نظر آتا تھا۔ لوگ اپنا برتن، چائے کی کیتلی، لنگی، دھوتی، گنجی وغیرہ بھی وہیں دھوتے تھے۔ اور ایک بڑے نالے میں سڑا ہوا گدلا پانی بہتا رہتا اور اس میں پتے، پیاز، آم، نارنگی اور دوسرے پھلوں کے چھلکے ٹرام کی طرح رینگتے رہتے۔ اور بہتا ہوا صابن کا پھین ان رکاوٹوں میں پھنس کر پہاڑ کی طرح آہستہ آہستہ اٹھنے لگتا ــــ جیسے دودھ کی دیگچی میں اُبال آ گیا ہو۔

مہندر وہاں پر نہانے میں بڑی شرم اور جھجک محسوس کرتا تھا۔ اس لئے کہ پس چلمن بہت سی آنکھیں انگاروں کی طرح چمکتی نظر آتی تھیں۔ اور جو کبھی کبھی ایک قہقہے میں اُبل کر اُسے چکرا دیتی تھیں۔ اُس کے ہاتھ سے صابن کی ٹکیہ پھسل جاتی اور دوہرا قہقہہ اسے چاروں طرف سے گھیر لیتا۔

ایک روز جب وہ نہانے کے لئے گیا تو اُس نے اُسی سُرمئی رنگ کے سنبل کو دیکھا جو اسی مکان میں رہتا تھا۔ وہ ایک تولیہ لپیٹے نہا رہا تھا۔ پس چلمن چند انگارے سلگ رہے تھے۔

"آپ کس کالج میں پڑھتے ہیں ــــ"، نہاتے ہوئے اُس نے بات شروع کی۔ اور پھر دونوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ اُس کی پسلیاں بھاگتے ہوئے پانی میں کانپ رہی تھیں، پتنگ کے کانپ کی طرح۔

چھٹی کے وقت دونوں ایک دوسرے سے باتیں کیا کرتے۔ وہ مہندر کے کمرے میں چلا آتا۔ سامنے والی دوکان سے چائے آتی۔ سنبل کے گالوں کی ہڈیاں نکلی پڑتی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کچھ نہ کچھ چبا ضرور رہا ہے۔

وہ چائے میں لیموں ڈال کر پیتا تھا۔ جب مہندر کو زکام ہوا تو اس نے یہی علاج اسے بھی بتایا۔
"اس سے سردی بھاگ جاتی ہے ــــــ دو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ــــــ"
"اچھا ــــــ" اور اس نے اپنے زکام کو دو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھگانا شروع کر دیا۔ دونوں میں بات چیت کے دوران میں شاعری آتی، ادب آتا، ہندو مسلم فساد، اور آخر میں تو زیادہ تر ماؤنٹ بیٹن پر بحث ہونے لگی، انگریزوں کی سازش پر، قومی رہبروں کی غداری پر ــــــ اور مہندر سنیل میں انتہائی دلچسپی لینے لگا۔ اُسے معلوم ہوتا کہ سنیل رفیق کا دوسرا ایڈیشن ہے ــــــ
سنیل ٹھہر ٹھہر کر اپنی رائے دیا کرتا۔ مہندر کو محسوس ہوتا کہ کوئی بہت ہی وزنی انسان اس کے سامنے بات چیت کر رہا ہے۔ کبھی کبھی وہ بات چیت کے دوران میں بالکل رازدارانہ لہجہ اختیار کر لیتا۔ کالج اور اسکول کے لڑکوں نے فیصلہ کیا تھا کہ کلکتہ میں امن کو واپس لائیں گے۔ ان کا جلوس بھی نکلنے لگا تھا۔ مہندر ان جلوسوں میں نہیں جاتا تھا، لیکن سنیل ان جلوسوں میں ضرور جاتا اور ان کے کامیاب اثر کا قصہ روز آکر سناتا۔ لیکن جب گلی کے اختتام پر کوئی چیخ سنائی دیتی تو معلوم ہوتا کہ سنیل نے جو کچھ کہا تھا محض جھوٹ تھا۔
پھر آزادی آئی ــــــ کلکتہ بیچ کر دولھا بن گیا ــــــ اور اتحاد کا وہ نظارہ سامنے آیا کہ مہندر کا انگ انگ ناچ اٹھا۔ کالج اور اسکول کے لڑکوں کی قربانیاں اور محنت ٹھکانے لگی۔
کئی بار مہندر گھر گیا۔ اور واپس آیا۔ آزادی کے بعد گاندھی جی کے قتل نے ایک تڑپ پیدا کر دی تھی سنیل کہتا "یہ نفرت، یہ بے ایمانی اُسی وقت ختم ہوگی جب یہاں لیڈروں کا راج ختم ہو ــــــ دو چور آپس میں مال تقسیم کریں اور اسے آزادی کا نام دیں ــــــ یہ بھی خوب رہا ــــــ" اس کی آنکھیں جل اُٹھتیں۔
"لیڈروں کا راج ــــــ" مہندر دانتوں میں پنسل دباتے ہوئے پوچھتا۔
"ہاں ــــــ" وہ یقین کے ساتھ فیصلہ کن انداز میں کہتا۔
"لیکن یہ راج کیسے ختم ہوگا ــــــ؟"
"ہو جائے گا ــــــ جنتا کی بھوک اپنا راستہ جانتی ہے" سنیل کی آنکھیں سلگ اُٹھتیں اور اُس کی پیشانی پر شکنیں اُبھر آتیں۔ جب کلکتہ میں کالا قانون لاگو ہوا تو مہندر نے سنیل سے پوچھا "ایسا کیوں ہوا ــــــ کانگریسی سرکار جنتا کے اندولن سے ڈرتی کیوں ہے ــــــ" اسے رفیق کا خیال آگیا جو خود اس کے گاؤں میں اس کے باپ کے خلاف کسانوں میں کام کرتے ہوئے گرفتار ہو کر جیل میں سڑ رہا تھا۔
"مان لو تم چور ہو، اندھیری رات ہے، اور تم ایک مکان میں چوری کے لئے گھس گئے ہو ــــــ کیا تم چاہو گے کہ مکان والے جاگ اٹھیں ــــــ اور اگر وہ جاگ جائیں تو کیا تم اپنے چھرے سے ــــــ ان کو ــــــ" وہ اتنا کہہ کر مسکرایا اور چُپ ہو گیا۔
مہندر اُس کا منہ تکتا رہا۔ پھر اُس نے چائے منگوائی۔ اس میں لیموں کا عرق نچوڑا اور پینے لگا۔ اس کے بعد کلکتہ میں مہندر کا ایسا جی لگا، ایسا جی لگا کہ پھر اپنے گاؤں واپس نہ گیا۔ اپنے باپ سے بہانہ کرتا رہا۔ اور چھٹیاں گزرتی رہیں۔ اور اس کے باپ کی ساری چیخ پکار مفت میں ضائع ہوتی رہی۔ کسی رشتہ دار نے کلکتہ سے واپس جا کر شکایت

کر دی تھی کہ مہندر غنڈوں اور لونڈوں کی صحبت میں رہتا ہے ——— :

گرمی کی شام تھی ———

کالج سے آکر اس نے فوراً دم لیا تھا۔ سامنے والے چھجے پر ایک نازک جوان لڑکی اپنے سیاہ پھیلے ہوئے بال سکھا رہی تھی۔ سفید ساری اور پیازی بلاؤز میں اس کا بدن ایک ترشے ہوئے مرمریں مجسمے کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ مہندر اُسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ بنگالیوں کے بال کس قدر سیاہ اور گھنے ہوتے ہیں۔ وہ اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ سنیل اس کے کمرے میں داخل ہوا۔

"مہندر کہیں باہر نہیں چلوگے ———"

مہندر تیار ہو گیا۔ دونوں ٹرام میں بیٹھ کر چورنگی پہنچے۔ چورنگی میں بھیڑ تھی۔ دھرم تلہ سے میٹرو کی طرف جانے والا موڑ تو اور بھی کھچا کھچ تھا۔ میوہ کی دکانیں بھنبھنا رہی تھیں، پینٹ پہنے، دھوتی پہنے، پاجامہ پہنے۔ لوگ پان چباتے، رنگ تھوکتے، سگریٹ پھونکتے، سگار چوستے ہوئے لوگ ریل پیل ہو رہے تھے۔ ٹرام کی پٹریاں چمک رہی تھیں، اور سورج کی روشنی آہستہ آہستہ زرد ہوتی جا رہی تھی۔

اس بھیڑ میں نرم و نازک، پگھلتی ہوئی، اُبھرتی ہوئی، گنگناتی ہوئی، شرماتی ہوئی، دعوتیں دیتی ہوئی عورتیں ——— ہر طرح کی عورتیں موجود تھیں ——— اور جب وہ چورنگی کی بھیڑ میں داخل ہوتی تھیں تو ان کا جسم بہت سے انجانے جسموں کو چھوتا ہوا، اُن میں آگ کی لہر دوڑاتا ہوا، ان کی سہمی ہوئی محرومیوں پر پھبتی کستا ہوا آگے بڑھ جاتا تھا۔ اور بہت سی ہیجانی آنکھیں مسکرانے کے باوجود اپنے اندر لپکتی ہوئی ناآسودگی کی لو چھپانے میں ناکام معلوم ہوتی تھیں۔

شام ہو گئی۔ میدان کی طرف سے فٹ بال کے کھلاڑی رنگ برنگی جرسیوں میں، چیونگ گم چوستے، قہقہہ لگاتے اور اپنے بالوں کو جھٹکتے پسینہ میں نہائے چلے آرہے تھے۔

روشنیاں جگمگا اٹھیں۔ سڑکیں اندھیرے میں ڈوب گئیں، لیکن ان پر مرکری سے نکلتی ہوئی چاندنی ایک خوابناک حسن کا عکس بننے لگی تھی۔ ہزاروں بلب اپنی سنہری آنکھیں لئے چھپے دبکے نظر آتے۔ سنیل نے مہندر کو فریسکو میں بٹھایا ——— چائے پی اور پھر میدان کی طرف نکل آیا۔ وہ لکڑی کی ریلنگ پر بیٹھ گیا۔ موٹروں کا تار ٹوٹتا ہی نہ تھا۔ اندھیرے میں بھک بھک جلتی ہوئی موٹروں کی آنکھیں جگنوؤں کی طرح ایک بہاؤ میں بندھی چلی جا رہی تھیں۔ قریب آتی ہوئی۔ دور جاتی ہوئی۔ کافی دیر تک بیٹھنے کے بعد وہ دونوں وہاں سے اُٹھے۔ دونوں چُپ تھے۔ جدھر سنیل جا رہا تھا مہندر اُسی طرف چل رہا تھا۔

چینی پاڑا میں ایک گلی سے ہوتا ہوا سنیل مہندر کے ساتھ ایک بہت ہی ذلیل ہوٹل میں تیزی سے داخل ہوا۔ چائے منگائی اور دونوں پینے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک چھوکرا کونے سے اٹھا۔ اُس کے ہاتھ میں پیاز اور چھری تھی وہ اب تک ایک بوڑھے مزدور سے بات چیت کر رہا تھا۔ اور پیاز تراش رہا تھا۔

وہ سنیل کے پاس آیا۔ اُس نے چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں دے دیا ——— اور خود سیٹی بجاتا ہوا، کنگھی مارتا ہوا اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

"کیوں بے تیری ماں مر ہی گئی آخر ———؟"

"مر نہیں جاتی تو کیا کرتی ——— دوا ملی نہیں، دوا تو دوا، کھانا بھی نہیں ملا ———" دوسرے جوان سے میلے کچیلے مزدور نے کہا ——— "اور کھانا کہاں سے ملتا مجھے کام دیتا ہی نہیں کوئی ——— مر گئی ٹھیک ہی ہوا ———"

رات گئے سنیل اور مہندرا اپنے کمرے میں پہنچے۔ تھوڑی دیر کے بعد سنیل اپنے بغل میں کاغذ کا پلندہ دبائے مہندر کے کمرے میں داخل ہوا۔ کاغذ کے ایک پڑے میں آٹا تھا۔

"اسٹو جلاؤ ـــــ" سنیل نے کہا۔

"کتنی چائے پیوگے آج ــــ"

"چائے، ــــ میں تمھیں پی جاؤں گا ــــ سمجھے، چلو جلدی کرو ــــ"

اسٹو جل گیا ــ سرخ، زرد، سفید آگ کی زبانیں پھول کی پنکھڑیوں کی طرح تڑپنے لگیں۔ سنیل نے چھوٹے سے پیالے میں آٹا ڈالا، اُسے پانی میں گھولا اور اسٹو پر رکھ دیا۔

"دیکھا میں کتنی شان دار چائے تیار کر رہا ہوں "

مہندر چُپ چاپ اُسے گھورتا رہا۔ اسٹو گنگنا رہا تھا۔ اور سامنے والے اونچے مکان میں روشنی جل رہی تھی۔ دریچے کا ریشمیں پردہ آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ اور جب پردہ اُڑتا تو اُس کے پیچھے ایک خوبصورت سامرمریں مجسمہ کالی سی میز پر کتاب کے سامنے ساکت دکھائی پڑتا۔

لئی بن کر تیار ہو گئی۔ اس میں سے بُلبلا اٹھ رہا تھا۔ بھاپ سے بُلبلا ٹوٹ جاتا ــــ!

سنیل سگریٹ کا آخری کش لے کر اٹھا۔ کاغذ کا بلندہ اٹھایا۔ لئی کا پیالہ کاغذ میں لپیٹ کر مہندر سے پکڑوا یا اور اُسے لے کر باہر نکل گیا۔ سب سے پہلے گلی کے اختتام پر پان کی دُکان کے پاس رُکا اپنی جانگھ پر رکھ کر اس نے جلدی جلدی کاغذ پر لئی لگائی۔ اور پھر اسے دیوار پر چپکا دیا۔ مہندر سانس روکے چُپ چاپ دیکھتا رہا۔

اسی طرح گھوم گھوم کر ایک گھنٹے تک اُس نے کئی جگہ کاغذ دیواروں پر چپکایا۔ اور پھر کمرے کی طرف لوٹ آیا۔

مہندر کے لئے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ اُسے ایک نامعلوم خطرے کا احساس ضرور ہو رہا تھا۔ اُس کی رگیں سَن سَن کر رہی تھیں۔ لیکن سنیل اسے بہت قریب معلوم ہو رہا تھا۔ سنیل نے اس پر کتنا بھروسہ کیا تھا۔ اُسے ایک قوت کا احساس ہونے لگا۔

سنیل واپس لوٹا۔ مہندر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سنیل پھر اس کے کمرے میں واپس آیا۔ وہ ایک چھوٹے سے کاغذ پر مہین مہین کچھ لکھتا رہا۔ اور مہندر سویا بنا رہا۔ جب وہ آنکھیں کھولتا اور باہر کی طرف دیکھتا تو سامنے والے مکان میں وہی دریچہ ایک زرنگار رسنہرے پردے کی طرح اس کی آنکھوں میں چمک جاتا۔ جس کے پیچھے ایک خوابناک حُسن ہر وقت نیند میں نہایا ہوا نظر آتا۔ خود اس کے کمرے میں سنیل کسی گہرے خیال میں کھویا ہوا قلم چلا رہا تھا۔ جیسے زردوزی کا کام کر رہا ہو۔ اس کی بھویں سُکڑ گئی تھیں۔ ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ اور کنپٹیوں کی ہڈیاں اُبھر گئی تھیں۔ اور وہ ہمیشہ کی طرح منہ میں کچھ چباتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

صبح ہونے سے دو گھنٹہ قبل سنیل کرسی پر ہی سو گیا۔ اس کا سر ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ مہندر کو رات بھر نیند نہ آئی معلوم ہوتا تھا کہ دیوار پر چپکے ہوئے کاغذ اس کا نام لے کر پکار رہے تھے۔ اور وہ پکار اُس کی آنکھوں، اُس کے حلق، اُس کے پھیپھڑوں میں گھُسی جا رہی تھی۔

صبح ہوتے ہی وہ اٹھا۔ سنیل اسی طرح سویا ہوا تھا۔ وہ باہر نکل کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سامنے چائے کی دوکان میں موٹے موٹے گوشت والی ادھیڑ عمر عورت آپ ہی آپ کچھ بول رہی تھی۔ چولھے سے دھواں اٹھ رہا تھا اور اُس کے پیچھے دیوار پر ایک بوڑھے کی رنگین تصویر دھندلی نظر آ رہی تھی ــــ "چائے پیو، بہت دن جیو ــــ"

سامنے مکان کے چھجے میں دھوپ بھیگے ہوئے پٹی کوٹ، سیاہ بلاؤز اور نیلی، انگوری ساڑھیوں سے کھیل رہی تھی۔ اس کا مربھاری بھاری

لگ رہا تھا۔ وہ سڑک پر نکل گیا۔ پاؤ روٹی کی دوکان پر اُس نے روٹی خریدی، مکھن خریدا، پیسہ دینے میں اُس نے جان بوجھ کر دیر کی۔

کاغذ دیوار سے چمٹا ہوا تھا جیسے ماں کی چھاتی سے دودھ پیتا بچہ۔

"بھوک لگی ہے ——— روٹی دو ———"

جیل میں بند کر دو

"گرانی ہے ——— مہنگائی بھتہ دو ———"

گولی مار دو۔

"ننگے ہیں ——— کپڑا دو ———"

لاٹھی چارج ———

"جنتا کی سرکار ——— زندہ باد"

چلو مزے اڑاؤ۔

راہ گیر رُکتے، پوسٹر کو پڑھتے اور آگے بڑھ جاتے ان میں سے کچھ ہنستے، کچھ خاموش سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ جاتے، کچھ زور سے قہقہہ لگاتے اور دہراتے ——— اونہہ ——— جنتا سرکار ——— زندہ باد۔ ہا ہا ہا ——— مزا اڑاؤ بھئی مزا اڑاؤ ———"

"یہ سرکار ——— گولی مار دو ———" دوسرا کہتا اور اُس کی آنکھیں غصّہ سے لال ہو جاتیں۔

مہندر کا سر جل اٹھا۔ نیند کا سارا اثر دور ہو گیا۔

"جنتا کی سرکار ——— میرا بیٹا جیل میں سڑ رہا ہے ———"

"قصور ——— اپرادھ ——— ؟"

"ہڑتال کی تھی ——— پیٹ نہیں بھرتا تھا ——— اور کیا ———"

"میں نوکری سے نکال دیا گیا ——— کیوں پوچھو ——— پوچھو ———"

"میں نہیں پوچھوں گا ———" اُس کے ساتھی نے کہا۔

"ریلوے میں مجور زیادہ ہو گئے ہیں ——— میں فالتو تھا، نکال دیا گیا اور کیا ———" اور وہ اپنی داڑھی کو نوچنے لگا جیسے وہ فالتو باتوں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

اس کی مونچھیں اس کے باپ سے ملتی جلتی تھیں ——— لیکن اُس کی آنکھوں میں وہ چمک نہیں تھی۔ اور بدن پر برف وش سفید کھدر کا کرتا نہیں تھا۔ البتہ مسکراہٹ زیادہ شدید اور معنی خیز تھی۔ جھپٹتی ہوئی عقاب نما۔

اور اس کے سر کا درد ختم ہو گیا۔ آنکھوں کی جلن غائب ہو گئی۔ اور وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ سنیل کو اُس نے جگایا اُس کی آنکھیں سُرخ تھیں اُس کے ماتھے پر نیپل کے دباؤ سے نشان پڑ گیا تھا۔

دونوں نے ساتھ ہی ناشتہ کیا۔ سنیل نے مہندر سے ایسی بہت سی باتیں کہیں جن کی وجہ سے رفیق کی یاد اس کے دماغ میں تازہ ہو گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پیار سے دیکھا ——— !

جاڑا ہلکا ہلکا پڑ رہا تھا۔ اور مہندر روز رات کو کاغذ اور لئی لے کر اکیلا ہی پوسٹر بنایا کرتا تھا۔ پان والے، کھچڑی فروش، سوڈا واٹر والے، دہی بڑے اور کابلی چنے والے، بھکاری اور رکشے والے، سب سے اس کی جان پہچان ہو گئی تھی، بعض مرتبہ تو ان میں سے

بعض اس کی مدد بھی کرتے ۔ اور وہ اپنی مسکراہٹ سے ان کا شکریہ ادا کرتا ۔

جب دن کے وقت وہ باہر نکلتا ۔ اور لوگوں کو، مزدوروں کو، ٹرام میں کام کرنے والے، بجلی کے کارخانے میں کام کرنے والے۔ مزدوروں کو شہد کی مکھیوں کی طرح اپنے سامنے لگے ہوئے پوسٹروں کو پڑھتا ہوا دیکھتا تو اس کا سینہ اچھلنے لگتا، حلق میں گرمی سی محسوس ہوتی اور آنکھیں جھلملا جاتیں۔

مہندر کے بال اکثر الجھے ہی رہنے لگے ۔ وہ ہر وقت کچھ سوچتا رہتا، لکھتا رہتا، بحث کرتا رہتا ۔ اسے کلکتہ میں ایک نئی زندگی کی آہٹ مل رہی تھی ۔ اس کا اعتماد بہت بڑھ گیا تھا ۔ اس کی باتوں، اس کی مسکراہٹوں، اُس کی آنکھوں کی تابانی، ہر چیز سے ایک خود اعتمادی جھلکتی تھی ۔

وہ کام کرتے کرتے تھک جاتا ۔ کالے قانون کا بھوت اس کو منھ چڑاتا ۔ لیکن وہ اپنا کام کرتا جاتا ۔ اُسے بہت سے ساتھیوں سے ملنا پڑتا ۔ پوسٹر لگانا پڑتا ۔ اخبار پر پابندیاں لگتیں ۔ اور وہ سب چیزیں پوسٹر میں لکھکر دیواروں پر چپکا دیتا ۔ وہ اکیلا نہیں تھا ۔ اس کے سینکڑوں ساتھی اسی طرح کام کر رہے تھے ۔

اس کے پیچھے پولس والوں کے بوٹ کی آہٹ ہوتی ۔ رابری والے، سگریٹ اور پان والے، ٹرام والے۔ سب اس کے اِرد گرد ایک گھیرا سا ڈال لیتے ۔ کالج کے لڑکے اس کے کان میں کچھ کہتے اور وہ مسکرا پڑتا ۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ہنس پڑتے ۔

اس کے باپ نے روپیہ بھیجنا بند کر دیا ۔ اُس نے ٹیوشن کر لیا ۔ اور اپنا کام کرتا رہا ۔ اب اسے کوئی طاقت پکڑ نہیں سکتی تھی ۔ مزدوروں پر شہر میں لاٹھی برسی تھی ۔ پولس والوں کا چہرہ اُس کی آنکھوں میں ناچ رہا تھا ۔ اسے ہلکا ہلکا بخار تھا ۔ اس کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا تھا ۔ بادامی آس کی آنکھوں کا پھیلاؤ کم ہوتا جا رہا تھا ۔ اس نے کمرہ کھولا ۔ اس میں اسے رفیق کا خط ملا ۔ وہ مظفر پور جیل میں تھا ۔ کارڈ پر لکھا ہوا تھا ۔ " پاسڈ ۔ جیل سپرنٹنڈنٹ " رفیق کے اس خط نے اس میں ایک نئی روح پھونک دی ۔ وہ ناچ اٹھا ۔ اس کے جسم میں گرم گرم خون کا دوران بہت تیز ہو گیا تھا ۔

میں نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا ۔ " آج تمھیں بہت سا کام کرنا ہے ۔ کل انڈونیشیا ڈے ہے ۔ ہمیں پوسٹر لکھنا ہے ۔ سرکار حملہ کرے گی، کون ٹھکانہ تم مارے جاؤ ۔ تمھیں اپنا کام ختم کر لینا ہے ۔" اس نے چائے منگائی ۔ سنیل ٹرام والوں کی ہڑتال کے سلسلے میں گرفتار ہو چکا تھا ۔ رفیق اور سنیل ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اس کی زندگی میں نشانِ راہ کی طرح چمک رہے تھے ۔

اس کے کمرے کا بلب فیوز ہو گیا تھا ۔ اس نے اُس نے سامنے کی دوکان سے ایک موم بتی لی ۔ اور کام کرنے لگا ۔ پوسٹر لکھنے کی خاص مہارت اسے ہو گئی تھی ۔ سامنے والی اونچی عمارت میں دریچہ ایک سنہرے ورق کی طرح جگمگا رہا تھا ۔ ریشمیں پردہ ایک طرف سرک گیا تھا ۔ اور اس کے پیچھے ایک مرمریں مجسمہ اونگھ رہا تھا ۔

رات کے سناٹے میں اُس نے پوسٹر لکھنا شروع کیا ۔ اُس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور اُس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور وہ اس کپکپاہٹ پر فتح پانے کے لئے دانت چبا رہا تھا جب اس نے 'شمیٹری' کے گیٹ پر پوسٹر چپکایا تو دربان نے پوچھا ۔ "کون ہے ۔۔۔۔؟" مہندر نے کھانس کر اُسے خاموش کر دیا ۔

جب سب پوسٹر لگ گئے تو اُس نے اطمینان کی سانس لی ۔ اُس کے پیر ٹوٹ کر گرتے ہوئے محسوس ہوئے ۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے راستہ پر چلا جا رہا تھا ۔ ٹرام کی پٹریاں دور چمک رہی تھیں ۔ کبھی کبھی ایک کار گذر جاتی ۔

اس کے پیچھے بوٹ کی آواز سُنائی دی ۔ اُس کا دل دھک سے ہو گیا ۔ اُس کے قدم تیز ہونے لگے ۔ وہ ایک گلی میں

مڑ گیا۔ اور اسے محسوس ہوا کہ بوٹ کی چاپ اس سے قریب ہوتی جا رہی ہے۔ وہ سکتے کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔ بوٹ کی آواز کہیں سنائی نہ دی۔ وہ اپنے کمرے میں آکر درخت سے ٹوٹے ہوئے آم کی طرح گر گیا۔ اور دیر تک چمکتی ہوئی زرین، شعلہ فشاں کھڑکی کو گھورتا رہا جس کے پیچھے ایک لچکیلا مرمریں مجسمہ اونگھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اسے نیند آگئی۔ کب صبح ہوئی اسے پتہ بھی نہ چلا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ آنکھیں بوجھل ہو گئی تھیں۔ ماتھے پر نیلی رگیں چمک رہی تھیں، کان کی لوئیں سلگ رہی تھیں ـــــ تکیہ اس کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ اور سرخ روشنائی دوات سے باہر آکر خون کی طرح زمین پر پھیل گئی تھی۔

بارہ بجے اس کی نیند ٹوٹی۔ اسے معلوم ہوا کہ کوئی پہلوان اس پر سوار ہے۔ دھوپ چمک رہی تھی۔ اور سامنے مکان پر وہی حسین لڑکی آرام کرسی پر لیٹی بال میں تیل سکھا رہی تھی۔ اس کی گود میں اخبار پڑا ہوا تھا۔ اور اس کے پاس ایک کالا سا بنگالی لڑکا نیکر پہنے ہاتھ میں ایک گلاس پانی لئے کھڑا تھا۔ سامنے میز پہ آئینہ رکھا ہوا تھا۔ جو اپنا عکس پھول کے گملے کی طرف پھینک رہا تھا۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

رات کے لکھے ہوئے پوسٹر اس کی آنکھوں میں چبھنے لگے۔

"انڈونیشیا زندہ باد ـــــ انقلاب زندہ باد ـــــ ۱۴۴۔ اٹھاؤ۔ کالا قانون مردہ باد" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ اس کے سوکھے ہوئے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ دو پیالی چائے پی۔ جیکٹ پہنے وہ اپنی منزل کی طرف چلا جا رہا تھا۔

دور ہی سے اس کو جلوس نظر آیا۔ اس کے پیر کانپ رہے تھے۔ اور گردن کے پاس گرم تیل دوڑتا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ خوفناک طور پر سرخ، جیسے شرابی کی آنکھیں جو کسی کا خون کر کے آ رہا ہو۔

اس کے کانوں میں صرف زندہ باد کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اس کا دل اچھلنے لگا۔ ہر چیز اسے زندہ باد پکارتی ہوئی معلوم ہوئی ـــ

جلوس میں کھڑے نوجوان غصے میں تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک آہنی عزم تھا۔ وہ آگے چلا گیا۔ گورکھوں کی رائفلیں چھاتی سے لگی انسانوں کے اس سمندر کی طرف گھور رہی تھیں۔ جو ایک دھماکے کے ساتھ ساری دھرتی پر پھیل جانے کا عزم رکھتا تھا۔ سنگینیں خوف زدہ معلوم ہوتی تھیں۔ گورکھے موت کی بارش کرنے والی مشین کی طرح بے جان کھڑے تھے۔ نعروں کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔

مہندر کے پیروں کی کپکپی اور دماغ کی سنسناہٹ دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ہونٹ دانتوں کے نیچے دب گئے تھے۔ آنکھیں پھیل گئی تھیں جن کی گہرائی سے سرخ لو جھانک رہی تھی۔ تمام چھجوں سے عورتیں، بچے اور مرد جھانک رہے تھے۔ کچھ کالے مزدور بھی جلوس میں سمٹ آئے تھے۔ مہندر کا سر فضا میں اوپر اٹھتا ہوا معلوم ہوا، اور اسے محسوس ہوا کہ ایک سمندر اس کی روح میں جھاگ پھینک رہا ہے ـــــ!

ڈنگ ڈانگ ـــــ تڑاخ، تڑاخ ـــ گرد دھواں تڑاخ ـــ کچھ لوگ کنارے ہو گئے کوٹھوں سے چیخیں نکل پڑیں، بچے رونے لگے۔ برقی چوٹ سی لگی، اور پھر جلوس سمٹ گیا، آگے بڑھنے لگا۔ مہندر نے ایک گرتے ہوئے ساتھی کا جھنڈا پکڑ لیا۔

ڈونگ ڈانگ ـــــ تڑاخ، تڑاخ ـــ

ان لوگوں کو کچل دو ـــــ یہ غنڈے ہیں، دیش ودروہی ہیں۔ دیش بھگتو! انھیں کچل دو، روند ڈالو۔ ست اور اہنسا کی گولیوں سے انھیں مار ڈالو۔ چیخیں، آوازیں، آنسو ـــــ دوڑو ـــ بھاگو بھاگو ـــــ انسان مر رہے ہیں، لڑکے مر رہے ہیں ـــ جوان

مر رہے ہیں، پھول مر رہے ہیں، کلیاں مر رہی ہیں ـــــ دوڑو، بھاگو، دوڑو ـــــ گولیاں جھپٹ رہی ہیں، گوشت ہے، اور چیل ہے، گِدھ، گِتے ـــــ ہڈیاں ہیں ـــــ

ڈنگ ڈانگ ـــــ تڑاخ تڑاخ ـــــ

طوفان بپھر رہا ہے۔

"زندہ باد ـــــ"

یہ کیسا طوفان ہے۔ گورکھے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں، ان کی رائفلیں بھونک رہی ہیں ـــــ بھاگو، بھاگو ـــــ دوڑو، دوڑو سنگینیں چھین لو، بندوقیں چھین لو ـــــ یہ غدار ہیں ـــــ انھیں ست اور اہنسا کی گولیوں سے چھلنی کردو ـــــ انسانوں کے اس طوفان کو دبا دو ـــــ یہ آزاد دیش ہے ـــــ مرنے والے مکار ہیں، چور ہیں ـــــ کون کہتا ہے وہ انسان کے بیٹے ہیں ـــــ کون کہتا ہے وہ پھول ہیں ـــــ ان کو گرد و غبار اور خون میں پڑا رہنے دو ـــــ

تڑاخ، تڑاخ ـــــ ڈنگ ڈانگ ـــــ!

ہم ایک طوفان ہیں، ہم انسان کی عظمت اور آزادی کے بیٹے ہیں، ہم مزدور، کسان اور کلرک کے بیٹے ہیں، یہ طوفان نہیں رکے گا ـــــ یہ طوفان بڑھے گا۔ ان بے جان دیواروں کو توڑتا ہوا۔ طوفان آگے چلا جائے گا۔

اور میں اب بھی دیکھ رہا ہوں ـــــ سنگینوں اور گولیوں سے چھدی ہوئی لاشوں کو ـــــ میرے کانوں میں اب بھی چیخیں اور کراہیں جھپٹ رہی ہیں۔

یہ لاش، وہ لاش ـــــ اور وہ لاش جس میں اٹھارہ سال تک پناہ گزیں رہا۔ لیکن اگر اور کوئی نہیں تو کم از کم میں جانتا ہوں، مہندر مرا نہیں ہے ـــــ میں جو زندہ ہوں۔ گولیاں جسم کو چھید سکتی ہیں۔ مجھے نہیں مار سکتیں۔

میں نہیں مر سکتا ـــــ میں ان کی تاریخ ہوں۔ میں ایک قندیل ہوں۔ میں ان کی روح ہوں۔ میں ایک قوت ہوں، قوت جو زمانہ اور وقت کی تاریخ ـــــ بدلتی ہوئی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ میں صدیوں کی دیواریں پھاند گیا ہوں۔ میں ہزاروں بار موت اور خون کے دریاؤں سے زندہ نکل آیا ہوں۔ میں مہندر سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے ہر زمانہ میں مہندر سے محبت کی ہے اور میری محبت کبھی نہیں مر سکتی ـــــ یہ مستقبل کے سینہ میں بھی فروزاں رہے گی۔ یہ پوسٹروں، گولیوں کی گونج، جلوسوں کے طوفان میں بھی زندہ رہے گی ـــــ

زمین پر امڈتے ہوئے طوفانو! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اس لئے کہ میں نے ہر زمانہ میں تم سے محبت کی ہے ـــــ لو یہ گولیاں مہندر کا سینہ توڑ کر بھاگ جانا چاہتی تھیں ـــــ میں نے انھیں پکڑ لیا ہے۔ یہ مہندر کے لہو میں نہا کر پھر جل اٹھی ہیں اور یہ شہید مہندر کی امانت ہیں ـــــ لو تم ان گولیوں کو اس وقت تک اپنی مٹھی میں بند رکھو، جب تک تم پر حملہ کرنے والے دشمنوں اور تمھارا یہ راستہ روک کر کھڑی ہونے والی خاکی دیواروں کے سینہ میں گولیاں دوبارہ نہ ٹھنڈی ہو جائیں ـــــ ہاں اُس وقت تک تم ان گولیوں کو اپنی مٹھی میں بند رکھو ـــــ! میں مطمئن ہوں، میں انسان کی تاریخ ہوں، میں امر جیوتی ہوں اور میں دیکھ رہا ہوں ـــــ شہید مہندر کی لاش اپنی منزل کی طرف دوڑ رہی ہے اور میں دیکھ رہا ہوں ـــــ شہید مہندر کے خون میں نہائی ہوئی گولیاں اپنے شکار کی طرف جھپٹ رہی ہیں ـــــ

(شمارہ ـــ ۳ ـــ ۱ ـــ سنہ ۴۹ء)

امرتا پریتم

زندگی کا باقی...

آج سویرے چائے کا پیالہ پی کر میں نے جب اخبار کو کھولا تو پہلے صفحے پر فیز برو کوسے کی تصویر تھی جنھوں نے ہاؤس آف کامنز میں نسلی امتیاز مٹانے کے لئے ایک بل پیش کیا تھا۔

نسلی امتیاز بھی ایک عجیب مسئلہ ہے۔ انسان کی کھلی آنکھوں سے دیکھیں تو کتنا بے بنیاد دکھائی دیتا ہے کتنا مضحکہ خیز، لیکن بند آنکھوں سے انسان ہی نے اس مسئلہ کو اس بری طرح سے الجھا کر گانٹھیں ڈال دی ہیں کہ صدیاں بیت گئی ہیں پر اس کی کوئی گانٹھ کھلتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ بدھ اور عیسیٰ کے ہاتھ بھی تھک گئے۔ اس گانٹھ کو سلجھاتے ہوئے ایک نور، کہتے ہوئے گورونانک نے تمام زندگی گذار دی، گاندھی نے اسی گانٹھ کو کھولنے کے لئے اپنا پورا زور لگا دیا۔ اور دنیا بھر کے مصنفوں نے اپنے قلم کی پوری جولانیاں ختم کر دیں ـــــــ لیکن یہ گانٹھ آج بھی اسی طرح مضبوطی سے قائم ہے۔ آج بھی کسی ممبر پارلیمنٹ کو اس کے لئے بل پیش کرنا پڑتا ہے ـ اور مجھے یاد آیا اس موضوع پر فرانس نے سب سے خوبصورت فلم تیار کی ہے۔

آج دوپہر مجھے فرصت تھی۔ فرانسیسی فلم سے میرا خیال اچک کر کوئی اچھی سی فلم دیکھنے کی طرف گھوم گیا۔ میں نے اخبار کا صفحہ پلٹا، کتنی ہی فلموں کے نام پڑھتے ہوئے پلازہ میں چلنے والی فلم، دی گفٹ آف لو، کے نام پر جا کر میرا دھیان اٹک گیا۔ سوچ رہی تھی کہ اگر میں تین بجے یہ فلم دیکھوں تو وہاں سے چھ بجے سیدھی اپنے دفتر پہنچ سکتی ہوں۔ آج گرمی زیادہ نہ تھی، تین بجے جانا کوئی زیادہ مشکل نہ تھا۔ اور پھر میری نگاہ سامنے کے صفحے پر پڑی۔ سامنے کے صفحے کا تیسرا کالم ـــــــ لکھا تھا " شریمتی چیتنا کماری کی وفات " میں نے جلدی سے وہ خبر پڑھی۔

احمد آباد کے مشہور سیٹھ شری دیوی دت کی بیوی چیتنا کماری کل رات لگ بھگ دو بجے فوت ہوگئیں۔ شریمتی چیتنا کماری ایک لمبے عرصے سے ہائی بلڈ پریشر کے مرض میں مبتلا تھیں۔ پرسوں جب اُن کی حالت تشویش ناک صورت اختیار کر گئی تو انھوں نے اپنی آخری خواہش ظاہر کی کہ انھیں بمبئی کے " سی گرین " ہوٹل میں لے جایا جائے۔ کمرہ نمبر ۹ میں۔ کل سویرے شریمتی چیتنا کو کار میں احمد آباد سے بمبئی لایا گیا۔ اگرچہ بمبئی میں ان کی اپنی کوٹھی موجود تھی۔ لیکن ان کی خواہش کے

مطابق انھیں "سی گرین" کے کمرہ نمبر ۹ میں ٹھیرایا گیا۔ شہر کے مشہور ڈاکٹر اُن کی خدمت میں موجود رہے۔ رات دو بجے شریمتی چیتنا نے آخری سانس لیا۔

اور آگے اخبار والوں نے لکھا تھا۔

"شریمتی چیتنا نے سماجی اور سیاسی کاموں میں ہمیشہ اہم حصہ لیا۔ کانگریس کی جدو جہد کے وقت کانگریس کے چوٹی کے لیڈران سے امداد لیتے رہے۔ احمد آباد میں مزدوروں کی سب سے بڑی ہڑتال کے وقت مہاتما گاندھی نے شریمتی چیتنا کی مدد سے مل مالکوں سے مزدوروں کی شرائط تسلیم کروائی تھیں اور ہڑتال کھلوائی تھی۔ گاندھی جی کے زور دینے پر اور مزدوروں کی خوشی کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک مل کا نام رکھا گیا تھا " چیتنا کلا تھ مل "، کانگریس کو کئی مرتبہ اہم امداد پہنچا کر شریمتی چیتنا نے ایک نام کما لیا تھا۔"

"چیتنا تو چلی گئی ـــــ" میری آنکھیں اشک بار ہو گئیں اور من جیسے زور زور سے اس کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گیا۔ "معلوم نہیں تو نے زندگی میں کیا کمایا، کیا کچھ گنوایا، پر جو کچھ باقی بچا اسے صرف تو ہی جانتی تھی، اور کوئی نہیں جانتا تھا، بے چارے اخبار والے . . . . ."

اپریل کا پچھلا مہینہ میرے سامنے آکر رُک گیا۔ میں بارہ روز کی چھٹی لے کر بمبئی گئی تھی۔ کوئی کام نہیں تھا۔ صرف یہ چاہتی تھی کہ بارہ روز اپنے آپ کے ساتھ اور سمندر کے ساتھ گذاروں۔ اس لئے میں نے وہاں اپنے آنے کی کسی کو خبر تک نہ کی تھی۔ سمندر کے کنارے " سی گرین " میں ایک کمرہ لے لیا تھا۔ کمرے کے کسی بھی کونے میں بیٹھے ہوئے مجھے سمندر دکھائی دیتا تھا۔ اور میرے وہاں پہنچنے کے پانچویں روز کی بات ہے ـــــ ایک رات ہوٹل کے ڈائننگ روم میں کھانا کھانے کے بعد جب میں اپنے کمرے میں جانے کے لئے لفٹ کے نزدیک پہنچی تو ہوٹل کے مینجر نے مجھے آکر بتایا کہ باہر ڈرائنگ روم میں کوئی عورت مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔

"مجھ سے؟" میں حیران تھی "میرے آنے کی کسی کو اطلاع نہ تھی، مجھ سے ملنے کوئی کیسے آسکتا ہے۔" میں ڈرائنگ روم میں گئی۔ وہاں ایک دل کش سی عورت بیٹھی تھی، لیکن مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اس سے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا۔

"آپ کا نام امرتا پریتم ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"جی ـــــ!"

"بڑی امید سے کر یہاں بیٹھی آپ کا انتظار کر رہی تھی۔"

وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھی، اور اس کے بزرگانہ چہرے پر ایک ایسا نور اور کشش تھی، ایک ایسی جاذبیت تھی کہ اس کی عزت و احترام کرنے کو طبیعت چاہتی۔ میں نے کہا "آئیے، میرے کمرے میں آجائیے!"

دوسری منزل پر میرا کمرہ تھا۔ جب میں نے اسے کرسی پیش کی تو اُس نے کہا "یہ تو میری بڑی خود غرضی آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں کچھ نہ کہتی، چپ چاپ واپس چلی جاتی، لیکن آپ کو اپنی ضرورت بتا دینا مجھے مشکل

نہیں محسوس ہوا۔"

"حکم!"

"میں احمد آباد رہتی ہوں۔ جب کبھی میرا سب جگہ سے دل اُچاٹ ہو جاتا ہے تو میں ایک دو روز کے لئے یہاں آجاتی ہوں۔ یہاں بمبئی میں میری اپنی کوٹھی بھی ہے۔ لیکن وہاں بھی میرا دل نہیں لگتا۔ میں دو چار مہینوں بعد یہاں آجاتی ہوں۔ اسی کمرے میں رہتی ہوں۔ نو نمبر میں۔ پھر جیسے جی سنبھل جاتا ہے اور میں دو دن ٹھہر کر واپس چلی جاتی ہوں۔ آنے سے قبل ہوٹل والوں کو تار دے دیتی ہوں۔ وہ میرے لئے یہ کمرہ خالی رکھتے ہیں۔ اس دفعہ معلوم نہیں کیسے ہوا کہ انھیں میرا تار نہیں مل سکا۔ میں جب یہاں پہنچی تو معلوم ہوا کہ کمرہ خالی نہیں ہے۔ بہت پریشان تھی۔ ہوٹل کے رجسٹر میں آپ کا نام پڑھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میں اس نام سے واقف ہوں۔ میں سوچنے لگی اور پھر مجھے یاد آیا کہ دھرم یگ میں آپ کا ناول 'اشو' میں نے پڑھا تھا۔ وہ مصنف کا پتہ بھی چھاپتے ہیں، یہاں رجسٹر میں بھی آپ کا پتہ درج تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ آپ وہی ہیں جنھوں نے 'اشو' لکھا تھا — جو دل اشو کے درد کو پہچان سکتا ہے، وہ میرے درد کو بھی سمجھ سکے گا —"

"نہایت معمولی سی بات ہے، آپ چاہتی ہیں میں کمرہ تبدیل کرلوں۔ مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں۔ میں ابھی مینجر سے دریافت کرتی ہوں۔ کئی کمرے خالی ہوں گے —"

میں نے گھنٹی کا بٹن دبایا اور بیرا جا کر مینجر کو بلا لایا۔

"آپ اسی خاص کمرے میں رہنا چاہتی ہیں۔ مجھے کمرہ تبدیل کرنے میں کوئی اعتراض نہیں"۔ میں نے کہا۔

"جی ہاں! — آپ ہمیشہ اسی ہوٹل میں قیام فرماتی ہیں "اسی کمرے میں"۔ اس دفعہ ہمیں ان کا تار نہیں مل سکا۔ ہم آپ سے بھی کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ پھر انھوں نے فرمایا کہ وہ خود آپ سے ریکوسٹ کر کے دیکھ لیتی ہیں"۔ مینجر نے جواب دیا۔

"کوئی بھی کمرہ ہو۔ صاف ستھرا۔ صرف ایک بات ہے۔ اگر اسی طرح سمندر کی جانب ہو سکے تو —" میں نے کہا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا "سمندر کی طرف کمرے کا رُخ نہ بھی ہو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ انھیں یہ کمرہ دیدیجئے"۔

"پانچویں منزل پر ایسا ہی کمرہ ہے۔ پچیس نمبر۔ بلکہ اس سے بھی خوب صورت ہے۔ اسی کی طرح سمندر کی جانب۔ میں بیرے کو بھیجتا ہوں کہ وہ آپ کا سامان اوپر پہنچا دے۔"

"معاف کیجئے گا —" اس عورت کے چہرے پر جذبات سے اور بھی نکھار آگیا۔ اور وہ پہلے سے بھی کہیں حسین دکھائی دینے لگی —

"پانچویں منزل پر...... میں تو آسمان کے اور بھی نزدیک ہو جاؤں گی۔ سمندر بھی اسی طرح میری کھڑکی کے سامنے بہتا رہے گا —" میں ہنس دی اور الماری میں بکھرے ہوئے کپڑوں کو سوٹ کیس میں رکھنے لگی۔

"اشو کی کہانی آپ نے کیسے لکھی تھی؟" اس نے مجھ سے پوچھا —

"آپ نے پوری پڑھی تھی؟ —"

"ہاں — اور میں پڑھ کر بہت روئی تھی۔"

"لوگ کہتے ہیں 'اشو' ایسے کردار اس دنیا میں بالکل نہیں ہوتے۔ اتنے باحوصلہ اور دل نثار کرنے والے..."

"بالکل غلط ہے، جنھوں نے کبھی کسی پر دل نثار نہ کیا ہو انھیں اس قسم کے لوگ کیسے دکھائی دے سکتے ہیں۔"

..... مجھے تو اپنے دل میں بھی ایک آنسو زندۂ جاوید محسوس ہوئی تھی۔"

"آپ کے دل کی دولت بھی کم دکھائی نہیں دیتی، مجھے پہلی ہی نظر میں آپ کا چہرہ بڑا اچھا لگا تھا.....!"

"قدرداں ہی قیمت بڑھا دیتے ہیں، ورنہ اس قسم کے چہرے تو کئی خاک میں مل جاتے ہیں۔"

"نہیں، آپ کا چہرہ ہی بڑا امیر ہے، زندگی کی دولت سے بھرپور۔"

"زندگی کی دولت......" اس عورت کے چہرے پر ایک اور چمک اُبھری، اور وہ پل بھر رک کر کہنے لگی ــ "زندگی میں پایا بھی بہت کچھ ہے، کھویا بھی بہت کچھ ہے، لیکن جو کچھ باقی بچا ہے..... میں نے کبھی کسی کو اس 'باقی' کی بات نہیں بتائی ــ لیکن آج مجھے لگتا ہے کہ مجھ سے یہ بات کہی جائے گی.....!"

"مجھے ایک اور آنسو مل جائے گی۔"

"اور یہ بات بھی کسی آنسو لکھنے والے ہی کو بتائی جاسکتی ہے ــ"

"آپ اپنا کمرہ ٹھیک کر لیجئے ــ میں بھی اپنی چیزیں اپنے کمرے میں رکھ آتی ہوں۔"

"پھر آپ میرے کمرے میں آجایئے گا؟ ــ میں خود ہی آجاتی لیکن وہ بات میں اسی کمرے میں کہہ سکتی ہوں ــ"

اور جب میں اپنی چیزیں اپنے نئے کمرے میں رکھ کر تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد اس کے کمرے میں پہنچی تو وہ اپنا سامان ترتیب سے رکھ چکی تھی ــ ہم نے کافی منگوائی اور پھر کمرہ اندر سے بند کر کے سمندر کے کنارے کی جانب بنے ہوئے برآمدے میں کرسیاں بچھائیں ــ گلاب کے پھولوں کا ایک نہایت دل فریب گلدستہ اس نے میز پر سجایا ہوا تھا ــ

"میرا نام 'چیتنا' ہے۔"

"چیتنا ــ!"

"کان پور میں پیدا ہوئی، احمد آباد میں بیاہی گئی ــ مل والوں کے ہاں بچپن کی منزلیں طے کی تھیں ــ مل والوں کے ہاں جوانی بتادی۔"

"چاندی کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہونا شاید اسی کو کہتے ہوں گے۔"

چیتنا ہنس دی، اور کہنے لگی ــ "یہ چمچ چاندی کا ہو چاہے سونے کا ــ لیکن جب تک اس میں شہد کی بوند نہ ہو بھوک نہیں مٹے گی ــ میں چھوٹی ہی تھی، ملوں والے باپ کی کوٹھی کے قریب ہی ایک تنگ و تاریک سا گھر تھا ــ کانگریس کی ستیہ گرہ کے دوران اس گھر کا باپ جیلوں میں بند رہا ــ اور اس گھر کا بیٹا ایک معمولی سے اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد چھوٹی سی نوکری کرنے لگا ــ یگ راج اُس کا نام تھا ــ میں جب بھی اُسے دیکھا کرتی تھی مجھ میں جیسے شہد سرایت کر جاتا تھا ــ لیکن ہم مل والوں کے گھر میں اس تنگ و تاریک گھر کے افراد کا ذکر لب پر نہیں لایا جاسکتا تھا ــ جب میں بیاہی گئی، مجھے محسوس ہوا، چاندی کے چمچ تو کئی تھے، لیکن زندگی کا کٹورا خالی تھا ــ بڑی اچھی اچھی کتابیں پڑھیں، نہایت اچھے لوگوں سے ملاقات ہوئی ــ دل کی خلیج کو پُر کرنے کے لئے جہاں تک ہو سکا لوگوں کی ضروریات پوری کرتی رہی ــ

ایک بار میرے خاوند کی مل میں مزدوروں نے ہڑتال کی ــ میں نے اپنی تمام ہمدردی مزدوروں کی پٹتی ہوئی

جھولی میں ڈال دی۔ میری ہمدردی بھی زمین پر بکھر کر رہ گئی۔ کیونکہ اُن غریبوں کی جھولیاں پھٹی ہوئی تھیں۔ بھوک اور بیماری بڑھتی جارہی تھی۔ اُن کی قسمت ٹوٹتی جارہی تھی۔ میں نے گاندھی جی کا سہارا لیا، انھیں اپنے شہر بلایا۔ کچھ مطالبات منوائے گئے۔ اور ہڑتال واپس لے لی گئی۔ اسی طرح سے اور بھی موقعے آئے۔ جو بھی سُکھ میں کسی کو بانٹ سکتی تھی، بانٹتی رہی، اور اس کی خوشی اپنے میں سموتی رہی۔ لیکن معلوم نہیں یہ کیسی خلیج تھی میرے دل میں، کسی دولت سے کچھ نہیں بن پاتا تھا۔

کانگریس کے ایک اجلاس میں میں نے مُگ راج کو شعر پڑھتے ہوئے سُنا۔ نہ جانے اس کی موجودگی کیسی تھی۔ ایک خوشبو گویا تیرتی ہوئی میری جانب آئی اور میرے دل کی ویرانی میں پھیلنے لگی۔ میں نے چند منٹ اس سے باتیں کیں۔ میرے نزدیک کھڑے ہوئے اُس کا سانس مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ مجھے لگا اُس کے سانسوں کی خوشبو ایک ندی کی طرح بہہ رہی تھی، اور اس کی تیز روانی میں میرے پیر اکھڑ گئے تھے — میں نے خود کو سنبھالا دیا اور گھر آگئی۔

دوسرے دن میں نے کتنی مرتبہ ٹیلی فون کا ڈائل گھمایا اور کتنی مرتبہ اپنا ہاتھ روک لیا۔ لیکن ایک بار ہاتھ نہ رُکا۔ اور میں نے کانگریس کے دفتر میں فون کر کے مُگ راج کو بُلایا۔ وہ جب میرے فون پر میرے جواب میں بولا…"

چیتنا خاموش ہوگئی۔ دیر تک وہ چپ رہی۔ میں صرف اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے رہی۔ لیکن اس کی خموشی کو نہ توڑا۔ پھر چیتنا نے اپنی خموشی کو خود ہی توڑا۔ اور کہنے لگی۔

"کتنی عجیب بات ہے۔ جب اُس کی آواز آئی، مجھے یوں لگا جیسے اُس کے سانس کا لمس مجھے محسوس ہو رہا ہے! میں کانپ اٹھی۔ بھلا فون میں کسی کا سانس کیسے آ سکتا ہے۔ اور سانس کی خوشبو کیسے آ سکتی ہے — مُگ راج نے بتایا، اُسے واپس دلّی جانا ہے۔ صرف سوچ رہا ہے کہ ایک دن کے لیے بمبئی جائے کہ نہ جائے۔ اس کا کچھ کام وہاں رُکا ہوا تھا۔ بمبئی میں ہماری کوٹھی زیرِ تعمیر تھی، اور اُس کے اگلے روز مجھے اس کوٹھی کی نگرانی کے لیے بمبئی جانا تھا۔ میں نے اُس سے کہا کہ اگر میں بمبئی میں اُس کا کام کروا سکوں تو مجھے نہایت خوشی ہوگی —"

چیتنا کے الفاظ پھر جیسے اس کے لبوں پر رُک گئے، اور وہ سانس لے کر، سنبھل کر کہنے لگی۔

"اگلے روز وہ میرے ساتھ بمبئی آیا۔ پہلے میں ہمیشہ اپنی ایک سہیلی کے گھر ٹھیرا کرتی تھی، لیکن اس دن میں اس کے گھر نہ جا سکی۔ میں یہاں ٹھیری، اسی کمرے میں۔ ساتھ والا کمرہ میں نے اس کے لئے لے لیا۔"

چیتنا نے کہانی کی گانٹھ سلجھالی تھی۔ اب چیتنا نے سُرخ رو ہو کر ایک گہرا سانس لیا۔

"یہی کمرہ تھا۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے اُس سے کہا کہ اگر اسے نیند نہ آئی ہو تو وہ کچھ دیر میرے کمرے میں رُک کر مجھے اپنے اشعار سُنائے۔ اسی طرح اس برآمدے میں اُس نے کرسیاں بچھائیں۔ رات کے دو بجے تک وہ میرے قریب بیٹھا رہا۔ میز پر اسی طرح گلاب کے پھول رکھے ہوئے تھے۔ شعر سُناتے ہوئے وہ ایک سگریٹ سے دوسری سگریٹ سلگا لیتا تھا ——— امرتیا……"

"ہاں چیتنا!"

"اگر اعتراض نہ ہو……"

"کیا؟"

"میں ایک سگریٹ سلگا لوں؟"

"سگریٹ؟—"

"میں سگریٹ نہیں پیتی، لیکن جب کبھی اس کمرے میں آتی ہوں۔ مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اس کمرے میں موجود ہے — اسی طرح اگر گلاب کے پھول مل سکیں تو میں یہاں پھول رکھتی ہوں — اسی طرح سگریٹ سلگا کر ہاتھ میں پکڑ لیتی ہوں۔ پھر مجھے اس کی موجودگی اور بھی قریب تر محسوس ہوتی ہے —"

"بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے —"

چیتنا نے ایک سگریٹ سلگایا، اور اس کے بعد اسے لبوں سے نہیں لگایا، بلکہ انگلیوں میں پکڑ کر کہنے لگی۔

"اس کے سانسوں میں سے ایک خوشبو ابھرتی رہی، تیرتی رہی، اور مجھے محسوس ہوتا رہا — مجھے اپنے دل کی ویرانی کو پُر کرنے کے لئے جو کچھ پانا تھا میں نے پا لیا ہے —— زندگی کا سوال سبھی حل کرتے ہیں، میں نے بھی حل کیا ہے۔ اس سوال میں بہت کچھ جمع ہوتا رہا، بہت کچھ کم ہوتا رہا —— لیکن آج جب کہ اس بات کو بیس برس گزر گئے ہیں، اور میں زندگی کا سوال حل کر چکی ہوں تو یوں لگتا ہے کہ اس سوال میں جو کچھ باقی بچا ہے وہ اس کے سانسوں کی خوشبو ہے!"

"چیتنا!" —— میرے دل میں چیتنا کے لئے جذبات نے بہت کچھ انگڑائیاں لیں لیکن میں ایک بار اس کا نام لینے کے سوا اس سے اور کچھ نہ کہہ سکی۔ لیکن نہ جانے میرا دل اس ایک لفظ میں کس قدر کھو کر رہ گیا تھا۔

چیتنا نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سگریٹ کی طرح سُلگ کر کہا —— "چند ماہ کے وقفے کے بعد میں اس کمرے میں آتی ہوں — ۹ نمبر میں — نہ عمر اس میں سدِّ راہ ثابت ہوئی ہے اور نہ کوئی اور چیز رکاوٹ پیدا کر سکی ہے۔ اس کمرے میں رات بھر مجھے اس کے سانسوں کی خوشبو آتی ہے۔"

اس کے بعد پھر چیتنا کو میری موجودگی کا احساس نہ رہا۔ گلاب کے پھولوں کی خوشبو بھی شاید دور ہوتی چلی گئی، اور چیتنا کی انگلیوں میں پکڑے ہوئے سگریٹ کا دھواں بھی شاید دور چلا گیا۔ چیتنا کی آنکھوں میں جو نشہ اور مستی ابھر آئی — وہ اس کے تصور کے پھولوں میں سے ابھرتی ہوئی خوشبو کا طلسم تھا جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ——

میں کرسی سے اٹھی، صرف ایک بار دھیرے سے کہا۔

"چیتنا ——!"

چیتنا نے میری طرف دیکھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں میرے لئے کوئی پہچان نہ تھی۔ اس کے ہونٹوں کے انداز سے مجھے یوں لگا جیسے کہہ رہی ہو —

"یگ راج! ——"

میں نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر آ گئی۔ باہر سے دروازہ بند کر دینے سے وہ خود بخود اندر کی طرف سے بند ہو جاتا تھا۔ اس لئے چیتنا ہر طرح سے محفوظ تھی۔ میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔

یہ اپریل کی بات ہے۔ آج مئی کی بائیس تاریخ کو جب میں نے اخبار کے صفحے پلٹے ہیں، اس میں لکھا ہے۔
"شریمتی چیتنا...... آخری خواہش...... سی گرین.... کمرہ نمبر ۹..... رات کو دو بجے!...."
چیتنا کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی ہے ـــــــ زندگی کا سوال سبھی حل کرتے ہیں۔ میں نے بھی حل کیا ہے۔ اس سوال میں بہت کچھ جمع ہوتا رہا۔ بہت کچھ کم ہوتا رہا۔ لیکن آج جب بیس برس گذر گئے ہیں۔ اور زندگی کا سوال حل کر چکی ہوں، تو یوں لگتا ہے کہ اس سوال میں جو کچھ باقی بچا ہے وہ اس کے سانسوں کی خوشبو ہے!"

موت کی خبر والے صفحے سے میرا دھیان اخبار کے اس طرف والے صفحے پر آکر رکا۔ پلازہ میں چلنے والی فلم کا نام "دی گفٹ آف لو" طنز سے بھر گیا۔

ابھی ہوا کا ایک جھونکا آیا ہے اور اخبار کا پہلا صفحہ پھر نظروں کے سامنے آگیا ہے۔ سامنے مسٹر فیز بروکوے کی تصویر ہے جنھوں نے ہاؤس آف کامنز میں نسلی امتیاز مٹانے کے لئے ایک بل پیش کیا ہے اور چیتنا کی موت کے باعث میری آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو کہہ رہے ہیں ـــــــ

"نسلی امتیاز ـــــ دلوں کی کس آئین گاہ میں کوئی بل پیش کرے گا ـــــ ایک چیتنا نہیں ہزاروں چیتنائیں زندگی کے سوالات حل کر رہی ہیں ـــــ کچھ جمع ہوتا ہے، کچھ کم ہوتا ہے اور جب وہ تمام عمر بتا کر اس سوال کا باقی نکالتی ہیں، تو ایک آگ ان کے سانس میں سلگتی رہ جاتی ہے۔"ـــــ

(شمارہ ۹۷ سنہ ۵۹ء)

مکتبہ "اربابِ قلم" کی حیات افروز مطبوعات

اربابِ قلم (۱)
ملک کے مشہور اہل قلم کی ۲۷ تحریروں سے مزین۔ قیمت: ۲ روپے

مثنوی سیر کراچی
شبنم رومانی کی مقبولِ عام تصنیف
قیمت: ۲ روپے

اربابِ قلم (۲)
۵ مقالے، ۶ افسانے، ۲۷ رباعیاں، ۷ نظمیں
۵۰ غزلیں، ۴ تبصرے اور ۱۴ ادیبوں کی تصاویر
قیمت: ۵ روپے

رزم و بزم
میجر جلیل احمد کا حسین شعری مجموعہ۔ قیمت ۵/-

مکتبہ "اربابِ قلم"
۲۰۷، گڈھیالی بلڈنگ، صدر، کراچی

شکیلہ اختر

آشا

بدحواس دوڑتی ہوئی جب وہ چلتی ٹرین کے پائیدان پر باہر والے راڈ کو پکڑ کر جھولنے لگی، اور زنانے ڈبے کی عورتوں کے ساتھ میں نے بھی باہر پلیٹ فارم پر ساں ہاں کا شور سن کر پاہر پائیدان پر سامنے لٹکی ہوئی لڑکی کو اندر کھینچ لیا، تب بھی اس کا یہی حال تھا ایسے ہی سوکھے مارے اڑتے ہوئے بال، بدرنگ سا بلوز، ٹلی ڈلی اونچی نیچی اڑسی ہوئی ساڑی، جس کے کنارے پر گرد اور مٹی کے گوٹ لگے ہوئے تھے۔ گھسا پٹا میلا سا ہوائی چپل پہنے وہ ایک معمولی سا کپڑے کا بیگ تھامے لمبی لمبی سانس کھینچتی دھم سے میرے پاس آکر سیٹ پر بیٹھ گئی اس کے چہرے کی سیاہی گھبراہٹ اور خوف سے دمک اٹھی تھی، اور رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں پسینے کی تری سے اور بھی نمایاں لگ رہی تھیں اس کی جلدی جلدی جھپکنے والی آنکھوں سے اس کی دلی پریشانی اور اداسی کا صاف اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے کمپارٹمنٹ پر ایک جھجکتی ہوئی نظر ڈالی اور معافی مانگنے والے انداز اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں بڑی شرمندہ ہوں۔ کیا کروں! ابھی ابھی میری ماں کی سیریس بیماری کا تار آگیا تھا ——— میں پل پر سے دوڑتی ہوئی تو اتری تھی مگر پھر بھی گاڑی چل چکی تھی۔"

ایسی اجاڑ صورت اور پریشان حال لڑکی سے پہلے پہل میری ملاقات ریل پر ہوئی تھی۔ اپنی پریشانیوں کے باوجود بہت جلدی ہم لوگوں سے گھل مل گئی تھی۔ مگر ہماری ہمدردنگاہ کے ہوتے ہوئے بھی اس کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو ہمیشہ اس کی یاد دلا سکتی۔

زندگی کے ہر موڑ پر ویسے تو حسین خوبصورت، کامینی، بھدّی، بدصورت اور بھیانک شکلیں نگاہوں سے گذرتی رہتی ہیں مگر اس سیاہ رنگ اور ابھری ہوئی ہڈیوں والی صورت میں اس کے چمکتے ہوئے ہموار سفید دانتوں میں بڑی کشش تھی۔ اس کے لہجے میں افسردگی اور بیچارگی کے ساتھ بڑی اپنائیت کے بول تھے۔ اتنے اچھے بول کہ جب میں اپنا سفر ختم کرکے ٹرین سے اترنے لگی تو اس کے بڑھے ہوئے سیاہ پرخلوص ہاتھ کو تھام کر مجھے اس سے یہ وعدہ لینا پڑا کہ اپنی ماں کے اچھے ہو جانے کے بعد واپسی پر وہ ضرور میرے گھر آئے گی ——— میں نے اپنے گھر کا پتہ اور نشان اس کو اچھی طرح سے سمجھا دیا تھا۔

فون کی گھنٹی بجتی رہی مت بھر اسی طرح سے ٹرنک ٹرنک کرکے وہ بجتی رہتی تھی میں نے اکتا کر جب ریسیور اٹھایا تو آواز پہچان نہ سکی۔

"دیدی ——— میں ہوں! میں آشا بول رہی ہوں۔ ابھی آپ کے اسٹیشن ہی کے ایک گھر سے بول رہی ہوں" ———

آشا؟ ـــــ اس نام کی کسی لڑکی کی کوئی یاد میری نگاہوں میں نہ جھلکی ـــــ ادھر وہ بڑے پیار سے کہے جارہی تھی۔

"دیدی ـــــ میں آپ کے گھر آرہی ہوں، آپ ابھی گھر پر رہیں گی نا ـــــ!"

جانے یہ کون سی آشا کہاں سے ٹپک پڑی تھی۔ میں نے ریسیور رکھ کر بہت سوچا، کہ یہ آشا کون ہوسکتی ہے مگر اس نام پر سے کوئی پردہ اٹھتا ہوا نظر نہ آیا۔

"یہ آشا جو بھی ہو اب تو اس کو دیکھ کر ہی پتہ چلے گا"۔ میں نے اپنے آپ کو آنے والی گھڑیوں کے سپرد کردیا۔

کھڑکھڑاتا ہوا رکشا جب پورسیٹو میں آکر کھڑا ہوا اور کئی دنوں کے پہنے ہوئے مسلے مسلائے میلے کپڑے پہنے ایک کالی سی روکھے بالوں والی لڑکی اتر کر مجھ سے بے اختیار چمٹ گئی۔ تب میں نے جانا کہ یہ آشا وہی ریل والی لڑکی تھی۔

آج اس کی کالی رنگت میں خوشیوں کی مہک پھوٹ رہی تھی۔ اور سفید پرکشش دانتوں کی قطار بار بار ہنسنے میں جھلک پڑتی تھی۔

آشا نے بڑے پیار اور حیرت سے میرے گھر کو دیکھا۔

"ارے دیدی ـــــ! تیرے تو بڑے ٹھاٹ ہیں میں تو ٹرین میں تجھے اپنے جیسی سمجھتی تھی، یہی چھوٹے سے گھر اور رکشے پر چلنے والی!"

اس کی اس سادہ سی باتوں کو سن کر میں ہنس پڑی۔ "تو اگر تمہیں میرے گھر کا پتہ ہوتا تو پھر تم مجھ سے ملنے نہ آتیں؟" میں نے اس کی پھیلی ہوئی آنکھوں کو تکتے ہوئے کہا۔

وہ ہنسی۔

آتی کیوں نہیں ـــــ ضرور آتی ـــــ مگر ذرا کچھ ٹھاٹ باٹ سے کپڑے ویڑے بدل کر آتی ـــــ مگر دیدی! مجھے یہ سب بڑے کھڑاگ لگتے ہیں، جس دن ذرا اُجلے صاف ستھرے کپڑے پہنتی ہوں۔ ہائے بندھا بندھا سا جی لگتا ہے۔ جب کہیں پھیل کر بیٹھ ہی نہیں سکتی۔ تو پھر جینے میں بھلا خاک مزا ملے گا"!

وہ بڑے پیار اور خلوص سے کئی دنوں تک میرے پاس ٹھہری، گھر کے احاطے اور پھولوں کے کنج میں وہ میرے ساتھ ساتھ رہتی۔ لیکن جب سے وہ آئی تھی میرے ننھے ننھے بچے آشا کے ڈر کے مارے مجھ سے دور دور رہنے لگے تھے۔ آشا بڑے شوق سے ان کو پیار کرنے جاتی، ان کو بھاگتے ہوئے پکڑنے کی کوشش کرتی، مگر بچے اس کی کالی اور جاڑ صورت سے اتنے خوفزدہ تھے کہ اس کو دیکھتے ہی چیخیں مار کر بھاگ جاتے اس وقت میں کٹ کر رہ جاتی۔ اور یہی دعا کرتی کہ بے چاری آشا بچوں کے خوف کی وجہ نہ سمجھے۔

آشا بڑے شوق اور محبت سے اپنے جیجا جی سے ملتی، مسکرا مسکرا کر ہنستی اور مذاق کرتی ان کو پھولوں سے مارتی اور پھر اس امید میں رہتی کہ اس کے جیجا جی بھی اسی للک اور پیار سے اس کو اپنی سالی بنائیں، میں آشا کے اس پیار اور سادگی کو دیکھ کر سوچنے لگتی تھی، مجھے اس طرح کھل کر ہنستے مسکراتے اور اپنی تمناؤں کا اظہار کرتے دیکھ کر محسوس ہوتا کہ یہ بیچاری لڑکی جیسے مدتوں سے پیاسی ہے، اپنا پن اور محبت کی بھوکی ہے۔ نہیں تو پھر یہ چند ہی دنوں میں ہمیں اپنا نہ سمجھ بیٹھتی مگر اس کے جیجا جی ـــــ اور اس کے جیجا جی مجھے چپکے سے کہتے کہ "تم نے میری سزا کے لئے یہ لڑکی کہاں سے حاصل کی ہے ـــــ!

وہ اپنے آپ سے بڑی بے پروا تھی۔ بہت بدشوق سے اگر کبھی استری کئے ہوئے کپڑے پہن بھی لئے تو وہ زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتی۔ اس کے بیگ کے اندر کچھ تھا بھی نہیں، دو جوڑے معمولی کپڑوں کے تھے ایک ٹوٹی سی کنگھی تھی اور چند موٹی موٹی کتابیں میرے سنگار میز کے پاس سے وہ اس طرح گزر جاتی جیسے زندگی کے لئے وہ ایک بیکار سی چیز تھی۔ اس کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ وہ کپڑوں سے صرف جسم کو ڈھانک لینا ہی جانتی ہے۔ اڑسی ہوئی بے ہنگم ساری کے کناروں میں ہمیشہ مٹی پٹی رہتی تھی ——— اس کو اپنا ہوش ہی نہ رہتا تھا۔ اس کے سر کے بال روکھے بے رونق سے ہر گھڑی اس کے چہرے پر لوٹتے رہتے تھے۔

جس پیار و محبت سے آشا میرے پاس ٹھیری تھی اسی خلوص سے جانے کے وقت اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔

"دیدی ——— تمہارے انہی ہاتھوں نے مجھے ریل پر مرنے سے بچایا تھا ——— تو پھر اب یہ ہاتھ مجھے ہمیشہ یاد رکھیں گے نا؟"

جاتے جاتے جب اس نے مجھ کو اپنا پتہ لکھ کر دیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ تو فورتھ ایئر میڈیکل کالج کی اسٹوڈنٹ تھی" ——— اور میں سوچتی رہ گئی تھی کہ ایسی اللہ کی ماری صورت والی یہ لڑکی اب ڈاکٹر ہو جائے گی! ——— اور مجھے اس خیال سے بڑی خوشی محسوس ہونے لگتی تھی کہ وہ اپنی بدصورتی کے باوجود ایک اہم شخصیت بن جائے گی، مگر اس کے کسی انداز سے ابھی تک اس میں آنے والی بڑائی کا احساس نہ ہوتا تھا۔

آشا جب چلی گئی تو سارے گھر پر ایک اداسی سی چھا گئی تھی، کیونکہ وہ مہمان ہوتے ہوئے بھی گھر کے ہر حصے میں چلتی پھرتی رہتی تھی۔ میز پر وہ اپنے سامنے کھانا لگواتی ——— باورچی خانے میں دوڑ دوڑ کر جاتی اور وقت بے وقت اپنے ہاتھوں سے چائے بنا بنا کر لے آتی۔ جب سے وہ میرے پاس آ کر ٹھیری تھی مجھے آپا کہنے لگی تھی ——— اور چھوٹی بہن کے ناطے ہر کام اپنے ہاتھ سے کرنا اس کو بڑا اچھا لگتا تھا۔

مہینوں بیت گئے۔ ان دیکھی ہوئی فلم کی طرح آشا کی یاد بھی میرے ذہن میں دھندلی سی باقی رہ گئی تھی۔

سردیوں کے دن تھے گھر سے میرے بھائی اور بہن اور کچھ اور لوگ آ گئے تھے ——— گھر کے اندر کی رونق سے جب طبیعت اکتا گئی تو پکنک، آؤٹنگ اور شکار کا پروگرام بنا، ریسٹ ہاؤسز اور سرکٹ ہاؤس ریزرو کرا لئے گئے، پک اپ، جیپ اور کاروں پر بستروں، بکسوں اور کھانے پینے کے سامانوں سے لدے لدائے ہم سب لوگ گھر سے چل گئے، بچوں کی ٹولیاں بڑی خوش تھیں۔ اور ان کی تعداد پورے سولہ تھی۔ اسٹیشن ویگن کی لمبی لمبی دونوں سیٹیں بچوں سے بھر گئیں۔ تب آیا، اور ملازموں کو بستروں کے ڈھیر پر بٹھانا پڑا۔ چالیس میل کا لمبا راستہ۔ آٹھ بچوں نے پہلے تو انگلش پوئٹری کو خالص انگریزی دھنوں میں گایا، پھر اردو گانوں کا مقابلہ شروع ہوا اور جب ہار جیت کے بغیر ختم ہو گیا تو پھر سب مل کر ایک ساتھ کورس میں فلمی گانے گانے لگے، ایسی ہی دوڑ دھوپ میں میرے سب سے چھوٹے بچے کو ٹھنڈ لگ گئی۔ اور میں بڑی پریشانی کے عالم میں سب کو چھوڑ چھاڑ کر بیمار بچے کو لئے اپنے سب سے بڑے شہر راج گڑھ کے میڈیکل کالج ہوسپٹل کے ایک کیبن میں داخل ہو گئی ——— سارا مزا بچے کی اس بیماری نے کرکرا کر دیا تھا۔ کہاں تو سانبھر اور ہرنوں کا شکار کھیلا جا رہا تھا۔ اور اب میں کہاں ہاسپٹل میں ایسی بدحواس پڑی تھی ——— بچے کی بیماری اور تکلیف اتنی بڑھ گئی تھی کہ دل کو ذرا سکون نہ ملتا تھا۔ اور کبھی کبھی تو راتیں جاگ کر گزارنی پڑتی تھیں

دم بھر کے لئے میری آنکھیں جھپکی تھیں کہ مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے مجھے اچھی طرح کمبل سے ڈھانک دیا ہے۔ کمبل کی گرمی سے آرام پا کر بخار میں کرسی پر کتنی دیر تک سوتی رہی۔ جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ آشا بچے پر جھکی ہوئی اس کو دوا پلا رہی تھی میں بے اختیار

بول پڑی۔

"ارے آشا تم ہو ۔۔۔۔ یہ تم کہاں سے آگئیں ۔۔۔۔؟"

آشا نے بڑی شکوہ بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"آپا تم نے مجھے خبر تک نہ کی۔ وہ تو میں ابھی اس وارڈ سے گزر رہی تھی کہ تمہاری آپا پر نظر پڑ گئی۔ اگر تم مجھے بلا لیتیں تو مجھے کتنی خوشی ہوتی آپا۔"

"اور تم جو یہ بن بلائے چلی آئیں مجھے کتنا اچھا لگ رہا ہے"! میں نے آشا کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔ اور پھر آشا بڑی محبت سے میری خدمت میں لگ گئی۔

آشا جب کبھی سفید ایپرن پہنے ہوئے ڈاکٹر لڑکیوں کی ٹولی میں ہوتی تو وہ دور ہی سے اپنے الجھے اور بے رونق بالوں سے پہچان لی جاتی تھی کالج کے اندر اس کے ڈھنگ ذرا نہ بدلے تھے۔ ویسے ہی تنگی پھیکی سی ساری پہنے وہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں نظر آتی تھی۔ کبھی کبھی دوپہر کو اپنی ڈیوٹی ختم کر کے وہ آجاتی تھی۔ اور روزانہ رات کو وہ بڑی پابندی سے میرے پاس آجاتی اور ساری رات بچے کی دیکھ بھال خود سے کرتی اور اس کا سارا کام اپنے ذمہ لے لیتی تھی۔

وہ اتنی بے تکلف اور بے پروا تھی کہ اس کے ساتھ رکھ رکھاؤ کرنے سے اس کو تکلیف ہوتی اور وہ قاعدے اور تہذیب کے پھندے میں پھنسنے سے بری طرح گھبرایا کرتی تھی۔ بچے کی حالت جب تک پریشان کن تھی آشا کو کھانے پینے تک کا ہوش نہ تھا۔ بچہ جب خطرے سے باہر ہوگیا۔ تب آشا کے چہرے پر ہنسی آنے لگی تھی۔

میری چھوٹی بہن بچے کی بیماری کی خبر سن کر ہوسٹل میں آگئی تھی، آشا جب اس سے ملی تو خوشی سے جھوم اٹھی اور اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے سارے وارڈ دکھاتی پھرتی۔ پھر میرے پاس واپس آکر اپنی بے کیف آنکھوں میں شراب بھر کر میری چھوٹی بہن سے کہتی۔

"دیکھ لگی۔ ہاں! آپا سے کچھ نہ کہنا"۔۔۔۔ اور اپنے سیاہ لبوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتی پھر آپ ہی آپ کھلکھلا کر ہنس پڑتی ۔۔۔۔ "آپا، یہ ہونگی ہے نا، بس اسے میڈیکل میں ڈال دے۔ پھر آپ ہی ٹھیک ہوجائے گی۔ بڑا گھن لگتا ہے اسے"

جب کبھی آشا ہنسنے لگتی تو میں بڑے شوق سے اس کے چمکیلے دانت کو دیکھتی ہوئی سوچا کرتی کہ اگر فطرت اس غریب کو سفید ہموار سے دانت بھی نہ بخش دیتی تو اس کے پاس کیا رہ جاتا ۔۔۔۔؟

آشا کی صورت جیسی بھی تھی، لیکن پیچھے سے جاتے ہوئے دیکھنے میں اس کا قد بڑا اچھا لگتا تھا۔ اس کی صورت اور رنگ کا کوئی سایہ اس کی پشت پر پڑتا ہوا نظر نہ آتا، نکلتا ہوا قد، اور بھرا ہوا جسم، بس دو چیزیں ایسی تھیں جو اس کی شخصیت کو ابھار دیتی تھیں۔ جب کبھی مجھے آشا کی پُرخلوص خدمت اور محبت پر بے اختیار پیار آجاتا تو میرا جی یہی چاہتا کہ وہ صرف ہنستی رہے تاکہ میری آنکھیں اس کے سفید سچے موتی جیسے دانتوں کو دیکھتی رہیں، یا پھر واپس جاتے ہوئے میں اس کو دیکھ کر یہ سوچوں کہ "آشا کتنی پیاری ۔۔۔۔ کتنی ٹوٹ کر محبت کرنے والی دولت ہے"!

لیکن آشا کی صورت جب میری نگاہوں کے سامنے ہوتی اور وہ اپنی آنکھوں کو جلدی جلدی جھپکا کر مجھ سے باتیں کرتی رہتی تو مجھے اس پر بے حد رحم آجاتا تھا۔ ایسا رحم، جیسے اندھے فقیروں کو دیکھ کر خود بخود دل کے اندر ایک ابال کی صورت میں پیدا ہوجاتا ہے۔

برآمدے میں اپنے ساتھ لائی ہوئی بدرنگ سی چیک کی چادر پر لیٹی پیٹی آشا جب کبھی مجھ سے قریب ہو جاتی اور میں اس کی سانس کو اپنے چہرے سے ٹکراتا ہوا محسوس کرنے لگتی تب ایسا لگتا تھا کہ آپ ہی آپ آشا پگھلی جا رہی ہے۔

آپلیـــ میں نے گھر کا سکھ کبھی نہ دیکھا۔ بچپن میں شاید ماں باپ نے مجھے دور رکھا تھا۔ جب بھی میری پہلی یاد جاگتی ہے تو مجھے کونونٹ کا وہی حصہ یاد آتا ہے جہاں غریب بچے بلو رنگ کے لمبے لمبے کپڑے پہنے ہوئے پڑھنے جاتے ہیں۔ اب بھی اس اسکول کی مدر سپیریر مجھے بہت پیار کرتی ہیں۔ جس رات آپ کے بچے کو بہت تیز بخار تھا اور ہوسپٹل میں کہیں برف نہ ملا تھا تو میں اتنی رات کو سیدھی کونونٹ چلی گئی تھی۔ بے چاری مدر نے خود سے اٹھ کر اپنی فریج ہی سے مجھ کو برف نکال کر دیا تھا۔

"اتنی بارش اور آندھی میں تم وہاں چلی گئی تھیں ـــــ؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کوئی بات نہیں آپا، رکشے پر تو گئی تھی ـــــ!"

آشا کے خلوص میں اتنی سپردگی تھی جیسے یہ لڑکی برسوں سے اپنی راہ کی تلاش میں بھٹک رہی ہو ـــــ مگر جس کے سامنے نہ تو راستہ ہی تھا اور نہ کوئی منزل۔

اور اب ریل کے پائیدان پر جھولتی ہوئی لڑکی کو جس ہاتھ نے وقتی طور پر ایک سہارا دے کر خطرے سے بچایا تھا، اسی ہاتھ کو آشا اپنا سب کچھ سمجھنے لگی تھی۔ مگر یہ سہارے ایسے تو نہ تھے جو زندگی کی بنیاد بنتے اور اس پر تمناؤں کی تعمیر ہو سکتی۔

جب کبھی میرے کیبن میں ڈاکٹر لڑکے اور ڈاکٹر لڑکیاں آجاتیں اور اگر کہیں اس وقت وہ بے ڈھنگی چال سے چلتی ہوئی آجاتی تو اس کا چہرہ اداس ہو جاتا۔ وہ دبی دبی سی کنارے کھڑی رہتی۔ اور ان ڈاکٹروں کی ہنسی اور قہقہوں کے درمیان مجھ کو اجنبی نگاہوں سے تکتی رہتی ایسی حالت میں اسے دیکھ کر، مجھے اس پر بڑا ترس آجاتا تھا ـــــ شاید اس کو اپنی کم مائیگی کا احساس تھا، یا دوسری ڈاکٹر لڑکیوں کے سامنے اپنی بدصورتی اور بے ڈھنگے کپڑوں کی کھٹک اس کو ستانے لگتی تھی۔

مگر جب وہ اکیلی ہوتی تو ہمیشہ کی طرح بے پروا اور اپنے حال میں مست رہتی۔ کوئی پرچھائیں تک اس کی نگاہ میں تیرتی نظر نہ آتی تھی !!

بنگی کو آشا کے بڑھتے ہوئے خلوص کے ساتھ بے ہنگم باتوں اس کے اوٹ پٹانگ کپڑوں اور اس کی ربود حالت سے بڑی شکایت تھی۔

"کس بے وقوف نے اس گندی لڑکی کو میڈیکل کالج میں بھیج دیا ہے سیائے یہ کس ڈھنگ سے رہتی ہے؟" اور بنگی پھر مجھ پر ناراض ہونے لگتی۔

اپنی پہیلی دوست کو کبھی گت سے رہنا بھی نہیں سکھا تیں؛ کٹ کے رہ جاتی ہوں اسے دیکھ کر، ساری کے کناروں میں نہ جانے کہاں سے اتنے اتنے کیچڑ لگا کر آتی ہے۔ اور اس کے ساتھ شوق ہے کہ میرے ہی ساتھ لگ کر بیٹھے گی، میرے ہی بستر پر لیٹے گی ہونہہ، جانے آپا یہ کباڑ کہاں سے اٹھا کر لائی ہیں میرے لئے ـــــ اللہ قسم ـــــ اس کا بلوز تو ایسا مہکتا ہے جیسے مرے ہوئے چوہے، کم سے کم اس کے سر میں کبھی تیل ہی ڈال دیں آپ۔ یہ بھی کوئی محبت ہے کہ اسے اس حال میں دیکھتی ہوں۔ اور کسی کرم کی بناتی بھی نہیں ـــــ" بنگی پھر آپ ہی آپ ہنس پڑتی ـــــ اور اس پر یہ خیال ہے کہ اسی کالج کے دو دو لڑکے اس سے محبت کرتے ہیں۔ اندھے ہوں گے وہ جبھی تو سجھائی نہیں دیتا۔ پہلی بار بنگی کی یہ باتیں سن کر میں چونک پڑی۔

بچاری آشا ـــــ اپنے کو بہلانے کی خاطر اس نے یہ کھلونے خود ہی گھڑے ہوں گے ـــــ اور کھلونوں میں کون نہیں

کھلنا۔ اندھے لنگڑے لولے سب ہی کے لئے جذبات ہوتے ہیں اور بچارے کھلونے ان کی اپنی زبان ہی کہاں ہوتی ہے جو اس طرح سے کھیلنے والوں کے ہاتھ جھٹک دیا کریں۔

ایک رات آشا ذرا دیر سے آئی ـــــ وہ آتے ہی بچے پر جھکی اور اسے سوتا ہوا دیکھ کر برآمدے کی زمین پر اپنی چادر بچھا کر چپکے سے لیٹ گئی ـــــ شاید اس نے ہمیں سوتا ہوا سمجھ لیا تھا۔ کمرے کے اندر لائٹ جلتی ہوئی رہ گئی تھی اس کی روشنی میں میں نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو مجھے بڑا افسوس ہوا ـــــ شاید وہ اس لئے سست تھی کہ یہاں کسی کو اس کا انتظار نہیں تھا۔ تم جان بوجھ کر اپنے بستر پر اس کے آنے سے پہلے اس طرح پھیل کر سو جاتی تھی کہ آشا کی محبت سے محفوظ رہ سکے۔ میرا جی نہ ملتا۔ صرف میری خاطر وہ اپنے کاموں اور اپنی ڈیوٹی سے تھک کر آتی اور ایک پالتو کتے کی طرح میری چوکھٹ سے لگ کر اتنے پیار سے سو جاتی تھی۔

میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا "آج بڑی چپ چاپ سی ہو آشا ـــــ!"

اتنا سنتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گئی "کبھی کبھی میں اپنے آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں آپا ـــــ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے دیکھوں۔ اب تک میں نے اپنی زندگی میں جھانک کر دیکھا ہے تو یہی نظر آیا ہے کہ میرا باپ ایک غریب آدمی ہے اس کی تین لڑکیاں بیاہی جا چکی ہیں اور اس کی دوسری بیوی بے حد غصہ کرنے والی عورت ہے میرے باپ کو اپنی غریبی دور کرنے کے لئے ایک بیٹے کی بہت تمنا تھی۔ بھگوان نے جب بیٹا نہ دیا تو وہ بے چارے اپنا پیٹ کاٹ کر مجھ ہی کو ڈاکٹری پڑھا رہے ہیں، لیکن ماں میری پڑھائی سے بہت ناراض ہے، کبھی کبھی تو وہ مجھ کو دیکھنا تک پسند نہیں کرتی۔ لیکن مجھ کو اس سے محبت ہے کیونکہ وہ میری دوسری ماں ہے اور میرے باپ کی بیوی۔ مگر آپا۔ جب میں اپنا بچپنا یاد کرتی ہوں تو کوئی گھر اور اپنا بنایا ہوا کوئی گھروندا مجھے کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ہر طرف مسٹر اور مدر اور اسکول کے احاطے کے سوا اور کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد جیسے اندھیرے میں باپو کی صورت ابھرتی ہے ـــــ جو کبھی کبھی تھوڑی سی مٹھائی لے کر مجھ سے ملنے کو آ جاتے تھے ـــــ اور بہت دنوں کے بعد جن کو میں اپنا باپ سمجھنے لگی تھی۔ یہ سب کیا تھا آپا؟ ـــــ کیا ماں کے مرنے کے بعد مجھے غریب بچوں کے اسکول میں ڈال دیا گیا تھا ـــــ!"

آشا بڑے دکھ سے اپنے گذرے ہوئے دنوں کو یاد کرتی اور ایسا لگتا تھا کہ اپنی زندگی پر پڑا ہوا کوئی مرمریں پردہ اٹھانے کو اس کا جی بے چین ہے۔

میں نے اس کے الجھے ہوئے بالوں کو تھپک کر تسکین دی "پگلی پچھلی باتوں کو چھوڑ اب آنے والی گھڑیوں میں مجھے یہ بتا کہ اپنے دونوں ڈاکٹروں میں سے کس کو چاہتی ہے؟"

"ارے آپا ـــــ" کہہ کر اس نے ہلکی ہلکی آتی ہوئی روشنی میں شرما کر اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا تھا۔

"اب میں ماروں گی اس ننھی کی بچی کو ـــــ" وہ ہنس کر بولی۔

اس کے چہرے پر آتا ہوا رنگ اندھیرے میں اگرچہ میں دیکھ نہ سکی تھی مگر اس کی آواز میں ایک اور مہک کا صاف پتہ چل رہا تھا ـــــ اور اب آشا کا موڈ بدل چکا تھا۔

"اچھا اب مجھے بتاؤ کہ یہ قصہ کیا ہے؟"

آشا پہلے تو نئی دلہنوں کی طرح شرمائی شرمائی سی چپ رہی۔ پھر اس کی آنکھیں ٹمٹمانے لگیں اور اس کی آواز میں رسیلے پن کا احساس ابھرنے لگا۔

"میرا ایک کلاس فیلو ہے وجے، میں کلاس میں جہاں بھی بیٹھوں گی وہ مجھ کو ہی دیکھتا رہے گا ـــــ اتنی ساری خوبصورت

لڑکیوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ جب کتاب مانگے گا تو مجھ ہی سے مانگے گا۔ میں بھلا ایک معمولی، سیدھی سادھی سی لڑکی۔ کون سی بات ہے مجھ میں۔ پر نہ جانے کیوں اس نے کئی بار راستے میں چلتے چلتے مجھ سے کہا ہے کہ آشا جی مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ مگر آیا آج تک اس کی کوئی بات نہیں سنی۔ بڑے مزے میں اس کے پاس سے گزر جاتی ہوں اور وہ بیچارہ نروس سا ہو جاتا ہے۔ ایک اور فائنل ایئر کا لڑکا ہے۔ موہن بری طرح سے میرے پیچھے پڑا ہوا ہے، دو ایک بار تو اس نے کاغذ کی بتیاں بنا بنا کر میری طرف پھینکی ہیں۔ ایک دن مجھے ایک لڑکی نے بتایا کہ موہن تم سے پیار کرتا ہے، مجھے یہ سنکر بڑا غصہ آیا، اگر اسے پریم کرنا ہے تو ڈھنگ سے کرے یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ پریم پتر لکھ کر کاغذ کی گولیاں بنائیں اور میری طرف پھینک دیا؟ —— جہاں کسی لڑکی کو دیکھا اور راستے میں کھڑے لمبی لمبی سانسیں لے رہے ہیں —— میں نے ایک بار بڑی کڑی نگاہ سے دیکھ کر پوچھا —— موہن جی —— کیا بات ہے، کچھ کہنا چاہتے ہیں آپ مجھ سے —— بس میری تو اتنی سی بات سنکر وہ گھبرا گیا —— پھر سنا کہ ساری رات وہ روتا رہا" —— آشا لیٹی لیٹی اٹھ کر بیٹھ گئی —— "میں نے پرسوں نگی کو دکھا دیا تھا" —— "موہن کی ڈیوٹی اسی طرف کے وارڈ میں ہے" —— نگی کہنے لگی —— "یہ تو چمار لگتا ہے، تم دجے سے شادی کرنا" —— آشا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور میں یہ سوچنے لگی کہ یہ کیسی لڑکی ہے جو محبت کے اس احساس پر بھی اپنی طرف کوئی دھیان نہیں دیتی۔ بھلا اس بے ڈھنگے پن میں دجے اور موہن کو اس کی کون سی کوملتا اور من موہنی ادا بھا گئی تھی، جب میں نے اس کی زبان سے اس کی محبت کے قصے سنے تھے اس کو عجیب غریب لڑکی سمجھنے لگی تھی۔ انسان بھی کیسی کیسی فطرت لے کر آتا ہے۔ کسی کو برفی اچھی نہیں لگتی اور وہ گڑ کی مکھی پھیکتے ہوئے بتاشوں پر جان دینے لگتا ہے۔ شاید اگر ایسی باتیں انسانوں میں نہ ہوتیں تو بے چارے ان گڑ کے بتاشوں اور ہماری آشا کا کیا حشر ہوتا ——؟

ادھر نگی کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا کہ آشا کے بلوز کی سلائی جو جگہ جگہ سے ادھڑی رہتی ہے تو وہی پھٹا بلاؤز پہن کر اس سے کالج کیسے جایا جاتا ہے، آخر وہ اپنے کو کیا سمجھتی ہے! —— پتھر؟ —— باریک دیوار —— ؟ دوسری ددسری نگی اور میری دوسری رشتہ دار لڑکیوں کو یہ تھی کہ آشا بار بار انھیں ہوسٹل میں لے جا کر اتنے کھانے کیوں کھلاتی رہتی ہے؟ ڈھیر سی سبزیوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ خود سے انڈوں کے آملیٹ بنا کر لے آتی اور زبردستی کر کر کے کھلاتی اور نگی کا کہنا تھا کہ انہی پیسوں سے اگر وہ اپنا بلوز بنا لیتی تو کتنا اچھا ہوتا ——!

اتنے دنوں تک ہوسپٹل میں رہ کر جب میں گھر واپس جانے لگی تو آشا بڑی اداس ہو گئی —— ہوسپٹل کی آخری رات وہ بہت دیر تک جاگ کر گنگناتی رہی تھی۔

آشا جب افسردہ ہو جاتی تو اس کے چہرے کا رنگ اور بھی سیاہ پڑ جاتا تھا۔ اور ہنسے بغیر سفید چمکیلے دانتوں کی خوبصورتی کی جو ایک ہلکی سی کرن دمک اٹھتی تھی اس کا کہیں پتہ نہ ملتا تھا —— اس وقت ملی دلی ساری اور بکھرے ہوئے بالوں کے پھکے سے جوڑے میں کوئی اس کو کبھی ایک ڈاکٹر لڑکی سمجھ بھی نہ سکتا تھا۔

میں اپنے بچے کو تندرست لے کر خوشی خوشی کیبن سے نکل کر جب احاطے میں کھڑی ہوئی موٹر پر بیٹھنے لگی تو آشا موٹر کا گیٹ کھول کر بچے پر جھکی ہوئی اسے جب چومنے لگی تو اس کی آنکھوں میں ٹھیرے ہوئے سارے آنسو ایک ہی بار جھر جھرا کر بچے کے چہرے پر اور اس کی فراک پر گر پڑے، موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے جو سلکن فراک پر جذب ہوئے بغیر بچے موتیوں کی طرح ٹک رہے تھے۔

میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور بے اختیار میرا جی چاہا کہ اس کی سونی کلائی کو چوم لوں، پھر میں جھجک کر رہ گئی۔ میرے پیار کی

گرمی شاید اس کو اور بھی بے چین بنا دیتی۔ میں نے اس کے بھیگے ہوئے گال کو ہلکے سے چھوا، گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی، اس نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ الوداع کے لئے اٹھائے اور اپنی آنسوؤں بھری آنکھیں مجھ سے چھپاتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی، گاڑی جب احاطے کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی تو میں نے پلٹ کر آشا کو دیکھا۔ چپ سی کھڑی بڑی حسرت سے گاڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آشا کے پیار بھرے خط آتے رہے۔ دیوالی، عید اور کرسمس پر وہ رنگین اور مسرت بھرے کارڈ بھیجتی رہی۔ پورا ایک سال میں اس کی طرف سے مطمئن رہی، کبھی میں اس کو چھٹیوں میں اپنے پاس بلاتی اور کبھی وہ اپنی پڑھائی کی مشغولیت پیش کرکے مجھ کو بہانے بنا کر ہوسپٹل آنے کو لکھتی۔

پھر مجھے کسی سے یہ خبر ملی کہ فائنل ایر میں وہ بے حد پریشان ہے پڑھائی کے ساتھ اس آخری سال میں اس کے ساتھ کئی طرح کے خرچ بھی نکل آئے تھے۔ پھر ایک بار یہ معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہو کر اسٹوڈنٹ کیبن میں پڑی ہوئی ہے۔ ان ہی چکروں میں اس کا خط بہت کم آنے لگا تھا۔ اور آہستہ آہستہ پھر اس کا خط آنا یکدم سے بند ہو گیا۔ اس کو کئی خط لکھے؛ مگر کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے سمجھا کہ آخری سال کی پڑھائی بڑی جان لیوا ہوتی ہے جب اس کا امتحان ختم ہو جائے گا تو خود ہی مجھے خط لکھے گی۔ اس کے بعد میں اس کے امتحان اور اس کے رزلٹ کا انتظار کرنا بھی بھول گئی۔ کبھی کبھار ہوسپٹل کا نام سن کر آشا کی اک یاد آجاتی تھی!

پھر مہینوں اور سال بیت گئے۔ آشا کی کوئی خبر نہ ملی اور اتنے عرصہ میں آشا کو ضرور ڈھونڈ نکالتی۔ آشا کا خلوص اس کی محبت اور اس کا پیار جب مجھے یاد آجاتا تو بے اختیار اس سے ملنے کو جی چاہتا تھا۔ اس کے الجھے ہوئے بالوں کو ڈھنگ سے سنوارنے کی خواہش ہوتی، اور پھر مجھے ایک پچھتاوا سا ہونے لگتا کہ اس اجڑی اجڑی سی ویران لڑکی کی اندھیری زندگی میں میں نے خوشیوں کے چراغ جلانے کی کبھی کوشش کیوں نہ کی۔ رفتہ رفتہ آشا کا ایک دھندلا سا سایہ یاد بن کر رہ گیا۔

آخر میری تمنا اتنے دنوں کے بعد پوری ہوئی اور ہم لوگ تبدیل ہو کر راج گڑھ کے اس شہر میں آگئے جہاں کبھی آشا تھی۔ گھر کی الجھنوں سے جب کہیں فرصت ملی تو میں نے ہوسپٹل میں فون کرکے آشا کا پتہ پوچھا۔۔۔۔۔ مگر کوئی خبر نہ ملی۔ کئی ملنے جلنے والوں سے بھی تلاش کرایا، ایک بار خود بھی ہوسپٹل گئی مگر ہر بار یہی خبر ملتی رہی کہ تھوڑے دنوں تک فیملی وارڈ میں ہاؤس سرجن رہ کر وہ کہیں باہر پریکٹس کرنے چلی گئی ہے۔ اب میں اس کو کہاں ڈھونڈھتی۔ اس کے گھر کا پتہ مجھ کو معلوم نہ تھا۔۔۔۔ جب کبھی میں کسی ڈاکٹر لڑکی کو دیکھتی تو مجھے آشا ضرور یاد آجاتی تھی۔ اس طرف چند دنوں سے دو بڑی پیاری صورت والی ڈاکٹر لڑکیاں میرے گھر آنے لگی تھیں۔ ان کو امریکہ جانے کے لئے کسی گورنمنٹ آفیسر کی مدد سے سرٹیفکٹ اور پاسپورٹ حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ وہ لڑکیاں دبی دبی شرمائی مگر شگفتہ سی آتیں۔ ان کے خوبصورت کپڑوں، نئے نئے اسٹائل کے جوڑوں اور خوبصورت چپلوں کو دیکھ کر میں بڑے درد کے ساتھ آشا کو یاد کرتی آخر ایک دن میں نے ان ڈاکٹر لڑکیوں سے آشا کا تذکرہ کیا، جاتنی بے تحاشہ محبت کرنے والی اور بڑی غریب سی لڑکی تھی۔

موہنی نے اپنی بڑی بڑی مدہ ماتی آنکھوں کو اوپر اٹھا کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں اسے جانتی ہوں وہ ہماری سینئر بیچ میں تھی، بچاری کے پاس پیسے نہ ہوتے، جب بھی دوست لڑکیوں کو ہوسٹل لا لا کر کھانے کھلاتی اور کئی دنوں تک خود بھوکی رہ کر میس کے فاضل پیسے پورے کرتی تھی۔

دوسری لڑکی نرلیش بیچ میں بول اٹھی۔۔۔۔۔۔ "بڑی عجیب سی لڑکی تھی، آشا بھی۔ کوئی اس کو دیکھ کر کبھی ڈاکٹر نہیں

سمجھتا تھا، کتنی دفعہ خود اس کے مریض اس کو ڈانٹ دیا کرتے تھے۔ مگر وہ ذرا بھی برا نہ مانتی۔ ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتی" نرگس ذرا رکی " بیچاری آشا تو فائنل ایر میں بڑے دکھ سہے تھے، اس کے پاس میڈیکل کی پوری کتابیں بھی نہ تھیں۔ ادھر ادھر سے مانگ کر پڑھ لیا کرتی۔ اسی لئے فرسٹ اگزام میں وہ ایک سبجکٹ میں فیل ہو گئی تھی۔ پھر چھ مہینے کے امتحان میں نکل آئی۔ ان دنوں اس کو پیسوں کی بڑی کمی ہو گئی تھی۔ میس کے روپے تک بچاری بڑی مشکلوں سے ادا کرتی اس زمانے میں اس کے گھر سے بھی بہت کم پیسے آنے لگے تھے۔ اور اس پر سے کسی نے یہ الٹی سیدھی باتیں اسے سمجھا دی تھیں کہ اب تک جس گھر کو اپنا گھر سمجھتی آ رہی تھی وہ اس کا اپنا نہیں تھا۔ وہ دراصل وہ کونونٹ میں پلنے والی یتیم بچی تھی جس کو ایک بہت ہی معمولی حیثیت کے آدمی نے اس لئے لے لیا تھا کر پڑھا لکھا کر اس سے بیٹے کی کمی پوری کرے گا۔ اور شاید کوئی کھٹک اس کے دل میں پہلے ہی سے تھی، اسی لئے اس نے بہت جلد ہی ان ساری باتوں پر یقین کر لیا تھا۔ اور جب اچانک اس نے اپنے آپ کو اس دنیا میں بے سہارا اور تنہا محسوس کیا تو وہ اپنے آپ سے بیزار رہنے لگی اور ہر کسی سے ملنا جلنا تک چھوڑ بیٹھی تھی۔"

موہنی کہنے لگی ۔۔۔ "آشا کالج کے دنوں میں ہمیشہ بے گت رہی جیسے اس کو اپنے سر پیر کا بھی ہوش نہ رہتا تھا وہ اپنے کالج کے اندر اور باہر سارے لڑکوں کے درمیان ایسی بے پروائی سے چلتی پھرتی رہتی جیسے اس کی بدصورتی نے اس کو سارے مردوں سے نڈر بنا دیا تھا۔ اپنے آپ کو ایک لڑکی سمجھتے ہوئے کبھی اس میں کسی طرح کی جھجک پیدا نہیں ہوئی۔ آخیر دنوں میں اس کی ایک عجیب حالت ہو گئی تھی جیسے اس کو ہسٹریا سا ہو گیا ہو۔ ہر تھوڑے تھوڑے دنوں پر وہ اسٹاف کیبن میں داخل ہو جاتی۔ کبھی اس کے پیروں میں درد کی تڑتڑاہٹ ہونے لگتی کبھی گردن اور پیٹھ میں اینٹھن سی ہونے لگتی۔ اور پھر وہ اس کے بعد بدحواس ہو کر ہوسپٹل میں داخل ہو جاتی۔ کسی ڈاکٹر کو اس کے مرض کا پتہ نہ چلا۔ مگر ہوسٹل اور اس کی ساتھی ڈاکٹر لڑکیاں کہنے لگی تھیں کہ آشا کے پاس جب کھانے کے پیسے نہیں ہوتے تب وہ بیماری کا بہانہ کر کے مفت کھانے کھانے کی خاطر ہوسپٹل میں داخل ہو جاتی ہے۔ پھر نہ جانے آشا کہاں چلی گئی"۔ اور ان ساری باتوں کو سن کر میری آنکھوں سے اچانک آنسوؤں کے چند قطرے بے اختیار ٹپک پڑے۔

(شمارہ ۱۵۹-۱۶۰ ۱۹۶۷ء)

اردو کے مایۂ ناز طنز نگار

مشتاق احمد یوسفی

کے نئے مضامین کا ایک اور عہد آفریں مجموعہ

خاکم بدہن

فوٹو آفسٹ طباعت ۔ مثالی گیٹ اپ

قیمت : ۹ روپے

اپنے شہر کے ہر بک اسٹال سے طلب کیجئے

عزیز اثری

پیار بیوپار

اُلجھے اُلجھے رومانوں میں بھٹک بھٹک کر جب میرے پاؤں شل اور روح زخمی ہو جاتی تو میں اپنے کمرے میں آکر بستر پر گر جاتا میری آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے یوں اُبلنے لگتے جیسے یہ میری نڈھال اور تشنہ روح کو نہلا دھلا کر نئے حادثاتی رومانوں سے اُلجھانے کے لئے تازہ دم کر رہے ہوں۔ میں تازہ دم ہو کر پھر اندھا دھند رومانوں کی تلاش میں بھٹکنے لگتا۔ اسی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اس کی محبت بجلی کی طرح لہرائی۔ میں نے اُس جلتی تڑپتی ہوئی برق کو دونوں بازوؤں میں جکڑ کر سینے سے لگا لیا اور میں تباہ ہو گیا۔"

"تباہ ہو گئے؟"۔ میں نے اپنے شاعر دوست کی پریشان نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر چونک کر کہا۔

"ہاں میں تباہ ہو گیا میرے دوست! اور میری سرگزشت میری تباہی کی مکمل داستان ہے سنو گے؟"

"اچھا سُن لوں گا" میں نے کہا ——"لیکن اس کے لئے معاوضہ کیا دو گے؟"

"معاوضہ؟ —— میرے دوست کے شدید سردی کے باعث سوکھے ہوئے ہونٹ مسکراہٹ کے لئے پھیل گئے "معاوضہ تو تم دو گے کہ تمھیں ایک افسانے کے لئے ڈھیر سا مواد دے رہا ہوں" میں نے اپنے چسٹر کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا نیا پیکٹ نکال کر میز پر رکھ دیا ——

"کم بخت آج پھر کوئٹے کی ہوا چلنے لگی ہے" اُس نے اپنے نیلے میلے سے کوٹ کا کالر ہاتھوں سے اوپر اٹھا کر گردن کے گرد لپیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور میرے قریب پڑی ہوئی خالی کرسی کو گھسیٹ کر —— اس پر اپنی دونوں ٹانگیں پھیلا دیں۔ ہونٹوں میں سے سگریٹ نکال کر دائیں ہاتھ کی مٹھی میں لے لیا اور اپنے مخصوص انداز میں زور سے کش لے کر میری طرف یوں دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو —— کہانی کہنے اور سننے کا ماحول تو میں نے پیدا کر دیا ہے اب تم سننے کے لئے تیار ہو؟"

میں نے کہا —— "چلو اب کہہ بھی ڈالو مجھے اور کام بھی کرنے ہیں"

"ہوں" —— اُس نے مُنہ سے دُھواں اُچھالتے ہوئے یوں کہا جیسے ایک طویل آہ کو سینے میں دبا لیا ہو۔ اُس نے اور بھی بآرام ہونے کے لئے کرسی کے ساتھ ٹیک لگا لیا اور بائیں ہاتھ کی اُنگلیوں سے اپنی نئی نئی چھوٹی مونچھوں کو چھیڑ کر کہنے لگا:۔

"نہ جانے بچپن ہی سے یہ خیال اُس کے دل میں کیوں بٹھا دیا گیا تھا کہ جوان ہونے پر وہ مجھ سے بیاہی جائیگی میری والدہ نے میرے دل میں بھی یہ خیال جاگزیں کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی لیکن مجھے اس خیال سے بُری گھن سی آتی —— میری عمر اُس وقت اُنیس بیس سال کی تھی اور میں اس سے چھ برس بڑا تھا اُس کی شکل و صورت مجھے جچتی نہیں تھی اُسے میرے تاثرات اور خیالات کا نہ علم تھا نہ احساس لیکن جب کبھی چچا کے ہاں جاتا تو وہ اپنی کوٹھی کے باغیچے میں لگے ہوئے

شہتوت کے درخت پر چڑھ جاتی اور میرے لئے پکے پکے شہتوت توڑ کر اپنی پلیٹ میں ڈال کر میرے سامنے رکھ دیتی لیکن جب کھاتا کھاکر بس کر دیتا تو وہ چچی سے بڑے مفکرانہ انداز میں کہتی ۔ "امی! ان سے کہئے اتنا کم نہ کھایا کریں ان کی صحت ٹھیک نہیں رہے گی" میں جب ایک دو روز وہاں رہنے کے بعد رخصت ہونے کے لئے تیار ہو رہا ہوتا تو وہ مجھے اکیلا دیکھ کر میرے پاس آکر کہتی "آپ آج جا رہے ہیں آج نہ جایئے۔ کل چلے جایئے گا"۔ میں بے حد پریشان ہو جاتا میرا جی چاہتا کہ اُسے اُس کے بارے میں اپنے خیالات سمجھاؤں اور اُس غلط فہمی کو جو اُس کے سارے رگ و پے میں رچی جا رہی تھی دور کرنے کی کوشش کروں۔ لیکن پھر میں یہ سوچ کر کہ مبادا اُس کے معصوم دل کو ٹھیس پہنچے، اپنے خیال سے باز رہتا ۔ میں اُس کے الفاظ، جذبات پر دل ہی دل میں کڑھتا، ندامت محسوس کرتا ہوا اُس کی منتوں کی پرواہ کئے بغیر اُس کے گھر سے نکل آتا۔

میں اس وقت ریلوے میں ملازم تھا اور تین چار سال کے بعد اپنے چچا کی لاڈلی کے پلے بندھ جانے کے خوف سے بہت پریشان تھا ۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح اس شادی سے نجات حاصل کروں۔ دو سال اسی پریشانی میں گزر گئے۔ اس دوران میں میں اپنی گمراہ آوارگی میں گہرا دھنستا گیا ۔ میں پلیٹ فارم پر کھڑی اور سٹیشن پر رینگتی ہوئی گاڑیوں، مسافر خانوں، شہر کے گرلز سکولوں اور گلی محلوں میں نئے نویلے رومانوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ میں اس آوارہ زندگی میں اس حد تک پھنس گیا کہ مجھے اپنے چاروں طرف دلدل نظر آنے لگی میری جوانی نے اپنی ہنگامہ خیزیوں کے تجسس کا لبادہ اس طرح تار تار کر لیا کہ نیچے سے میری روح کے زخم صاف نظر آنے لگے میری روح نے اس دلدل، اس اندھیرے میں بھٹک بھٹک کر اپنی تشنگی کو اور شدید کر لیا ۔ اُس کا ایک ایک زخم منہ کھول کر العطش العطش پکارنے لگا ۔ ایک ایسے ہی دن جب میں شہر کے ایک محلے میں پھرتے رہنے کے بعد ناکامی لئے ہوئے اپنے کوارٹر میں واپس آکر بستر پر گر گیا تو میرے تھکے ٹوٹے ہوئے جسم نے میری روح کو تھپکنے کے لئے آنسوؤں کے ہار پیش کر دیئے ۔ میری روح اُن کھلونوں کی حقیقت سے پہلے ہی واقف تھی ۔ اُس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا ۔ میری آنکھیں اسے منانے پر جانے کے لئے برابر آنسوؤں کے موتی نچھاور کرتی رہیں اور ان آنسوؤں میں، نہ جانے میرے چچا کی بیٹی کی صورت کس طرح سے نکھر گئی ۔ میں نے چونک کر پہلو بدلا اور اس صورت کو بھول جانے، کچل دینے کے لئے آنسوؤں کو جلدی سے پونچھ دیا لیکن آنسوؤں نے جاتے جاتے اس صورت کو میرے ذہن کی سطح پر نقش کر دیا اور خود مٹ گئے۔

گزشتہ دو سال میں مَیں صرف دو بار لاہور چچا کے ہاں گیا تھا کیونکہ میرے والدین اور دوسرے گھر والے چچا کے ہاں آئے ہوئے تھے ۔ دونوں بار وہ اُسی طرح میرے گرد گھومتی، مجھے دیکھ کر مسکراتی، میری والدہ اور بہنوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے میری طرف دیکھتے رہنے کی کوشش کرتی رہی ۔ گزشتہ بار وہاں سے ہو کر ابھی مجھے تھوڑے ہی دن گزرے تھے ۔ اس دفعہ اُسے دیکھ کر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ بڑی تیزی سے جوان ہو کر میرے سامنے آنے پر تلی ہوئی ہے وہ بڑی ہونے میں بہت جلد بازی سے کام لے رہی ہے اور اس وقت میرے تھرتھراتے ہوئے آنسوؤں نے اپنی قربانی دے کر اسی تصویر کو میرے ذہن پر نقش کر دیا تھا ۔ اب وہ نوجوانی کی منزل میں تھی ۔ اُس کے جسم کا پتلا پن ختم ہو رہا تھا ۔ اُس کے بال لمبے چمک دار ہونے لگے تھے اُس کی پیشانی دمکنے لگی تھی اُس کے رخسار گداز ہو رہے تھے ۔ اور ان میں سرخی دوڑنے لگی تھی اُس کے ہونٹوں میں رس اُبھرنے لگا تھا ۔ اس کے سینے میں جیسے محبت کی دھڑکنیں کھنچ آئی تھیں ۔ اُس کے ایک ایک عضو ایک ایک انداز میں پیار کی مٹھاس رچ رہی تھی اور وہ جوانی کا معصوم شاہکار معلوم ہونے لگی تھی ۔ اُس کے سراپے کی اس تصویر کو جیسے میری ٹھوکریں کھاتی ہوئی روح نے ایک انمول خزانہ سمجھ کر سینے سے لگا لیا ۔ مجھے اپنے دل و ذہن اپنے جذبات پر ایک ایسی گھٹن سی طاری ہوتی ہوئی محسوس ہوئی جیسے شدید گرمی کے

دلوں میں بہت زور کی بارش ہونے سے کچھ دیر پہلے ہوتی ہے۔ چند لمحے مجھ پر صبر آزما گھڑیاں چھا گئیں پھر میرے سارے تھکے ہوئے اور جھلتے ہوئے جسم میں جیسے ٹھنڈک کا ایک لطیف ریلا سرایت کرنے لگا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچ ناچ گئی۔"

میرے دوست نے مٹھی میں لئے ہوئے سگریٹ کا اتنا لمبا کش لیا کہ مجھے گمان ہوا جیسے وہ ایک ہی دفعہ تمام سگریٹ کی روح کھینچ لے گا لیکن اُس نے جلدی ہی منہ سے دھواں خارج کر کے کہنا شروع کیا۔ "پھر فسادات شروع ہو گئے۔ میرے دادا کی کافی بڑی جائداد ضلع گورداسپور کے ایک قصبے دینا نگر میں تھی، لیکن میرے والد میرے بڑے بھائی کی پیدائش کے بعد دادا کے گھر سے ناراض ہو کر ایسے نکلے کہ دوبارہ قصبہ کا رخ نہیں کیا۔ میرے دادا کی وفات کے بعد بھی والد جائداد کا اپنا حصّہ لینے نہیں گئے اور پوری جائداد میرے چچا کے ہاتھ آ گئی۔ دوسری جنگ عظیم سے کچھ سال پہلے میرے چچا تمام جائداد فروخت کر کے لاہور آ گئے۔ یہاں کاروبار شروع کر دیا۔ اُنھوں نے جنگ کے زمانہ میں کپڑے اور دوسری اشیا کا اسٹاک کر کے انھیں مہنگے داموں بیچ کر خوب روپیہ کمایا اور ایکسپورٹ امپورٹ کا کام شروع کر دیا۔ میرے والد نے چھوڑی ہوئی جائداد کا چچا کے سامنے کبھی ذکر تک نہ کیا۔ اسی لئے ہمارے اور اُن کے تعلقات ہمیشہ اچھے رہے۔ میرے والد نے اپنی ملازمت کے دوران میں کچھ پیسہ بچا کر اور میری ماں کے زیورات فروخت کر کے امرتسر میں ایک مکان بنا لیا تھا میرے بڑے بھائی کو فوج میں اور مجھے ریلوے میں ملازم کرا دیا تھا۔ اور خود پوسٹ ماسٹری سے ریٹائر ہونے کے بعد امرتسر میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ فسادات کے دوران میں وہ لاہور چچا کے ہاں آ گئے۔ لیکن میرے والد کو یہ تک گوارا نہیں تھا انھوں نے دن رات مارا مارا پھرنے کے بعد شہر کی ایک تنگ گلی میں ایک مکان جس کی کھڑکیاں اور ایک کمرے کی چھت جلی ہوئی تھی ڈھونڈ لیا۔ میں جب رخصت لے کر لاہور پہنچا تو میرا بڑا بھائی بھی راولپنڈی سے وہاں آیا ہوا تھا۔ اس دفعہ جب میں چچا کے ہاں گیا تو وہ ابھی ابھی اسکول سے پڑھ کر آئی تھی اور کھانا کھانے کے لئے بیٹھی ہی تھی مجھے دیکھ کر وہ اتنا خوش ہوئی کہ کھانا تک بھول گئی۔ میں ڈرائنگ روم میں آ کر اُس کے ننھے بھائی کو جب پیار کرنے لگا تو وہ دروازے کے پاس کھڑی ہو کر اُسے کہنے لگی۔ "ننھے! ادھر میرے پاس آ جاؤ، ہم ان کے ساتھ نہیں بولتے ہم کتنی بار ان کی منتیں کرتے ہیں لیکن یہ ہر بار چلے جاتے ہیں اور ایک ایک سال تک دکھائی نہیں دیتے۔" ننھے کے گرد پھیلے ہوئے میرے دونوں ہاتھ جیسے شل ہو گئے۔ مجھے آج زندگی میں پہلی بار ندامت اور دُکھ کا احساس ہو رہا تھا ننھا اب میری نیلی ٹائی سے کھیلنے لگا۔ "بھائی جان! یہ ٹائی ہمارے گلے میں ڈال دو۔" میں نے ٹائی اتار کر اُس کے گلے میں باندھ دی اور ریڈیو کا سوئچ گھما کر اُسے بند کر دیا۔ وہ خوش ہو کر ٹائی کو دونوں ہاتھوں میں لئے ہوئے بہن کی طرف بڑھا۔ وہ بڑھ کر ننھے کے گلے سے ٹائی کھولنے لگی۔ میں ایک دو لمحوں تک خاموش اور ساکت رہا پھر اٹھا اور ننھے پر جھک کر اُسے بچانا چاہا۔ نزہت کے دونوں ہاتھ ننھے کے گلے کے گرد تھے۔ میں نے اُس کا دایاں ہاتھ آہستہ سے پکڑ لیا۔ اُس کا دوسرا ہاتھ خود بخود ہٹ گیا میں نے اُس کی طرف دیکھا اُس کے چہرے پر حیا اس طرح لہرا گئی کہ اُس کے کانوں کی لویں تک دہکنے لگیں۔ میں نے اُس کا گداز ہاتھ چھوڑ دیا اور ننھے سے کہا "بھئی ذرا پانی تو لے آنا۔" ننھے کی بجائے وہ باہر سے جا کر پانی کا گلاس لے آئی۔ میں نے گلاس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ "ہاں میں جانتی ہوں آپ میرے ہاتھ سے پانی پینا پسند نہیں کرتے۔" میری روح کو جیسے کسی نے زور سے مروڑ ڈالا۔ میں نے سوکھے ہوئے حلق میں سے تھوک بمشکل نگلتے ہوئے کہا۔ "نہیں یہ بات نہیں میں دراصل۔ ۔ ۔ ۔" مجھے حیرت ہوئی کہ میرا لمبی لمبی نظمیں غزلیں لکھنے والا حاضر جواب ذہن اب کہاں چلا گیا تھا۔ میں جو لڑکیوں کے سامنے بڑے دل کش جملے بولنے اور سہانی ایکٹنگ میں مشاق تھا اب دو چار جملے بھی زبان سے نہیں نکال سکتا تھا۔ اس سولہ سترہ سالہ لڑکی کے سامنے میری جرأتیں کیوں سلب ہو گئی تھیں۔ وہ ابھی تک پانی کا گلاس ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔ میں نے گلاس لے کر تپائی پر رکھ دیا اور اُس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اُس کی نظریں تپائی پر گڑی ہوئی تھیں اور اُس کے

سارے جسم میں لرزشیں رقص کر رہی تھیں میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔
آپ کے دل میں جو کچھ ہے آپ اُس کے لئے کوشش کیجئے۔ میرے والدین مجھے کسی اور جگہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اُس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ میں نے اُس کے ہاتھ چھوڑ کر گھبرا کر کہا ــــــ "میں کس بات کے لئے کوشش کروں؟" ـــــ اور فوراً ہی میری سمجھ میں بات آگئی ــ "میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا نزہت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"
"میرے والدین ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" وہ اپنے گلابی سے دوپٹے کے دامن کو ہاتھ سے مڑوڑتے ہوئے کہنے لگی ــ "کسی اور جگہ رشتہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، آپ تائی جی (میری والدہ) سے کہیں ۔ ۔ ۔ ۔ " "باجی امی آگئی ہیں ــ"
ننھا گلے میں پڑی ہوئی ٹائی کو ہاتھ میں سنبھال کر باہر لپکا' وہ بھی باہر چلی گئی۔
تین روز کے بعد میں بے حد اُداس ہو کر گوجرانوالے آ گیا۔ اب میری زندگی میں جیسے ایک عظیم انقلاب آگیا تھا مجھے اتنی جلدی اور اتنی بڑی تبدیلی پر خود حیرت ہونے لگی ـ میری آوارگی ـــ ادھر اُدھر بھٹکنا یکسر بند ہو گیا۔ مجھے ان حرکتوں سے نفرت ہو گئی ـ میرے دل و ذہن میری روح پر نزہت کی محبت نے پَر پھیلا دیئے ـ مجھے اپنے ہر خیال ہر جذبے میں نزہت بستی اپنے خون کی گردشوں سانس کے اُتار چڑھاؤ تک میں رچتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ میں اپنے گذشتہ تمام رویے پر نادم اور پشیمان تھا اور اب اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے' سوتے جاگتے میں اُس کی یاد میں کھویا رہتا۔
گذشتہ کئی ماہ سے میرے برخلاف ایک ریلوے افسر کے ساتھ بدسلوکی کا کیس چل رہا تھا رشوت لینے کی ایک شکایت بھی ہو چکی تھی اور آخر مجھے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ مجھے پہلے تو ملازمت کے چھن جانے کا بہت افسوس ہوا کیونکہ ہمارے گھریلو حالات اچھے نہیں تھے ـ ہماری تھوڑی بہت پونجی میری بہن اور بڑے بھائی کی شادیوں کے لئے تیار کئے ہوئے کپڑے اور دیگر سامان سب آزادی کی نذر ہو چکا تھا ـ لیکن مجھے اُمید تھی کہ لاہور جا کر مجھے ملازمت مل جائے گی اور اس خیال سے بے حد خوشی بھی ہوئی کہ اب میں لاہور جا کر رہوں گا۔ اب میں نزہت کے اور بھی قریب ہو جاؤں گا۔
پھر اُس نے میٹرک پاس کر لیا پھر میرے بڑے بھائی کی شادی آ گئی ـ میرے والد کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا سوائے چچا کے اور کوئی قریبی رشتہ دار بھی نہ تھا۔ اس لئے والد نے چچا سے قرض لے کر بھائی کی شادی رچا دی۔ اس موقع پر نزہت اور اُس کے بھائی کو دس روز کے لئے ہمارے ہاں رہنے کی اجازت مل گئی ـ ہماری محبت انہی دلوں ایک ایک پہر نہیں ایک ایک گھڑی ایک ایک پل میں بڑھتی جوان ہوتی گئی ـ ایک روز جب میری والدہ نے میری شادی کا قصہ چھیڑا تو میں نے صاف کہدیا کہ میں نزہت کے علاوہ کسی اور سے کبھی شادی نہیں کروں گا"
والدہ نے مجھے الگ لے جا کر سمجھایا ــ "پہلے اور بات تھی بیٹا! لیکن اب ہم تمھارے چچا کے مقروض ہیں پھر ہم جس حالت میں ہیں اس حالت میں تمھارا چچا کبھی رضا مند نہیں ہو گا اور تمھارے والد کبھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ اس حالت میں تمھارے چچا سے اس رشتے کے لئے کہیں" لیکن میں اپنی بات پر جما ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں کہیں نہ کہیں ملازمت کر لوں گا۔ اور پھر چچا رضا مند ہو جائیں گے ـ میں نے یہی بات والدہ سے بھی کہی۔
والدہ نے بھائی کی شادی کے بعد جب میری چچی سے اشارے اشارے میں رشتہ کا تذکرہ کیا تو اُس نے اشارے اشارے میں اس سے انکار کر دیا ـ میرے دل و ذہن پر کھولتا ہوا تیزاب پڑ گیا۔ میرا جی چاہا کہ اپنا غصہ اُتارنے کے لئے چچی کو زور زور سے جھنجوڑ ڈالوں ـ لیکن پھر میرے غصہ کی جگہ مایوسی اور اُداسی نے لے لی ـ نزہت کمرے سے نکل کر شاید رونے

کے لیے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

نزہت نے اپنے رقعے میں چچی کو بہت کوسا اور شدید رنج کا اظہار کیا تھا لیکن یہ بھی لکھا تھا کہ میں اپنی والدہ اور والد پر زور دے کر چچا کو راضی کرنے کی کوشش کروں۔ ہم دونوں کو اُمید تھی کہ چچا ضرور مان جائیں گے۔ میرے بھائی کی شادی کے تین دن بعد جب نزہت واپس جانے لگی تو ہم دونوں بے حد اُداس ہو گئے۔ وہ آج صبح ہی سے بہت گھبرائی ہوئی اور پریشان تھی۔ جب وہ اپنے برقعے میں آنسو چھپاتے ہوئے چلی گئی تو مجھے ممّا گھر کی ساری فضا اُجڑی اُجڑی دکھائی دینے لگی۔ جیسے میری تمام دلچسپی، خوشیاں اور میری ساری کائنات چلی گئی تھی۔ میں اپنے سینے میں آہوں کو دبانے اور آنکھوں میں آنسوؤں کو خشک کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اپنے عزم کا والدہ کے سامنے کئی بار اظہار کیا۔ وہ میرے خیالات سے بے حد پریشان تھیں۔ انھوں نے میرے والد پر ہر طرح سے زور دیا۔ آخر میرے والد اپنی خود داری اور اپنی ساری زندگی کے احساسات کی قیمت پر میری والدہ کو ساتھ لے کر چچا کے ہاں گئے۔

انھوں نے واپس آکر بتایا کہ چچا نے کہا ہے کہ اگر میں لاہور سے کسی اور جگہ جاکر کوئی معقول ملازمت کر لوں تو وہ رضا مند ہو جائیں گے۔ جس دن مجھے روانہ ہونا تھا اس صبح کو نزہت چچی کے ہمراہ ہمارے ہاں آئی۔ اُس نے ایک لمبا چوڑا رقعہ میرے ہاتھ میں تھمایا۔ اُس میں میرے والدین کے ساتھ چچا کی بات چیت لکھی ہوئی تھی اور بہت خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اس رقعے میں اس نے کئی شعر بھی میری شان میں نقل کیے ہوئے تھے۔ اُس نے لکھا تھا کہ میں بہت جلدی لاہور سے روانہ ہو کر ملازمت ڈھونڈلوں تاکہ میرے بیکار رہنے کے باعث کہیں چچا کی نیت بدل نہ جائے۔ رقعے میں اُس نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ مجھے اپنی محبت کی نشانی کے طور پر ایک تحفہ دینا چاہتی ہے۔ میں اوپر کمرے میں جاکر بیٹھ گیا اور اُس کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ موقعہ پاکر آئی۔ اُس کے معصوم چہرے پر غم اور اُداسی کی تحریر بڑی نمایاں تھی۔ اُس کے ہاتھ میں اُس کا سیاہ پرس بھی تھا اسے جلدی سے کھول کر اُس نے ایک خوبصورت سونے کی ڈبیہ نکالی اور میری طرف بڑھادی۔ میں اُس کے ملول اور غم زدہ چہرے اور ڈبیا کو دیکھ کر جیسے گھبرا سا گیا ——— "اس کی کیا ضرورت تھی میں ..... " میں نے کہنا شروع کیا۔ لیکن اُس کے چہرے پر دُکھ کے سائے اور بھی تیرہ ہوتے دیکھ کر میں رُک گیا۔ اُس کا نچلا پتلا ہونٹ اس طرح سے ڈھلک گیا جیسے وہ ابھی بچوں کی طرح زور زور سے رونے لگے گی۔

"میں تو اپنی ہر چیز آپ ہی کی سمجھتی ہوں لیکن آپ ...... " اُس کی آواز ڈوب گئی اور اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ میں نے چارپائی سے اُٹھ کر اُسے سینے سے لگا لیا اور اپنے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی بے حد کوشش کرتے ہوئے اپنے ہاتھ سے اُس کے آنسو پونچھ دیئے۔ اُس نے کہا:-

"اسے آپ اپنے پاس رکھ لیں۔ یہ مجھے ابا نے میٹرک پاس کرنے پر انعام کے طور پر دی تھی۔ یہ سونے کی ڈبیہ بہت حقیر تحفہ ہے آپ کے لیے۔ لیکن میرا دل میری روح سب کچھ آپ کا ہے"

اسی وقت اُس کا چھوٹا بھائی اُسے پکارتا ہوا سیڑھیوں میں آرہا تھا۔ میں اُس سے الگ ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور وہ ڈبیہ کو میرے ہاتھ میں دے کر جلدی سے نیچے اُتر گئی۔ شام کو میں گاڑی میں سوار ہو کر یہاں آگیا"

میرا دوست رُک گیا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے بھاگتی ہوئی گاڑی کو ویکیوم لگا کر کھڑا کر دیا ہو۔ وہ دو تین لمحے خاموش رہا شاید میرے کسی جملے کا انتظار کر رہا تھا تاکہ وہ آگے بڑھنے کے لیے تازہ دم ہو سکے۔ لیکن اُس کی آپ بیتی کے واقعات

اسس مقام پر پہنچ چکے تھے کہ میں کوئی فقرہ کہنے کی کوشش نہیں کر سکا۔ اُس نے کچھ دیر پہلے اپنے سگریٹ کو جسے وہ داستان سنانے کی محویت میں پوری طرح نہیں پی سکا تھا پھینک دیا تھا۔ اُس کی مٹھی اب خالی تھی۔ میں نے اُس کی طرف سگریٹ بڑھایا۔ لیکن اُس نے سگریٹ نہیں لیا۔ میں نے جب سگریٹ سلگا لیا تو وہ کہنے لگا۔

"یہاں آکر خوش قسمتی سے مجھے بہت جلد کیپرڈ فرم میں ملازمت مل گئی۔ میں نے فوراً اپنے والد اور چچا کو خط لکھے چچا کے تین خط بھی آئے جس میں اُس نے مجھے لکھا تھا کہ میں اپنی خیریت اور حالات سے اسے ضرور مطلع کرتا رہوں۔ مجھے ان خطوں سے بڑی مسرت ہوتی اور میں اپنے والد کے اُس خط کا انتظار کرنے لگا جس میں میری زندگی بھر کی مسرتیں میری جھولی میں ڈال دینے کی خوشخبری سنائی جانے والی تھی۔ مجھے لاہور سے یہاں آئے گیارہ ماہ ہو چکے تھے اس اثنا میں چچا کے خط آنے بند ہو گئے۔ انہی دنوں مجھے گھر سے ایک خط ملا۔ لیکن یہ میرے والد کا نہیں میری چھوٹی بہن کا لکھا ہوا تھا جس میں اُس نے مختصر طور پر بتایا تھا کہ نزہت کی شادی اگلے ماہ لاہور کے ایک اسسٹنٹ کسٹوڈین کے ساتھ ہو رہی ہے۔ اس خط نے میرے مستقبل کے تمام سنہرے خواب میری خوشیوں کے ایک ایک رنگ محل کو زمین پر پٹک کر چکنا چور کر دیا۔ میری زندگی کی ہر چھوٹی بڑی خوشی کو بے دردی سے کچل ڈالا گیا۔ میری بہن نے اپنے خط میں نزہت کی دُکھ بھری حالتِ زار بھی بیان کی تھی ۔۔۔ اُس معصوم کی اُمنگوں، آرزوؤں اور زندگی کو موت کے حوالے کر دینے کی کتنی ہولناک کتنی ذلیل سازش تھی۔

میں ٹرنک سے اپنی محبوبہ کی نشانی وہ ڈبیہ نکال کر اُسے پاگلوں کی طرح چومنے اسے سینے اور آنکھوں سے لگانے لگا۔ حتّٰی کہ میں نے اپنے آنسوؤں سے اسے دھو ڈالا۔ لیکن میرے آنسو پھر بھی نہ تھمے۔ میرے ذہن میں جیسے صدموں کی ہولناک گڑگڑاہٹ میری آنکھوں میں مسلسل آنسوؤں کی کہر اور میرے جسم میں دکھوں کی ناقابلِ برداشت لرزشوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ تم اُس وقت تک یہاں نہیں آئے تھے، لیکن میرے باقی تمام دوستوں کو میرے اس ہولناک حادثے میری ذہنی اور روحانی بیچارگی کا علم ہے۔ میرے ساتھ کمرے میں رہنے والے کلرک ساتھی میرے سب دوست مجھے تسلّی دینے کی کوشش کرتے۔ لیکن یہ غیر متوقع اور بھیانک صدمہ میری برداشت سے باہر تھا۔ میں نے چار روز تک ایک لمحے کے لئے بھی باہر قدم نہیں رکھا۔ میرے ساتھ رہنے والے ہی دفتر جانے سے پہلے اور لوٹ کر مجھے زبردستی کچھ کھلا دیتے۔ زندگی میں میری تمام دلچسپی جیسے ختم ہو چکی تھی۔ میں نے ملازمت چھوڑ دی۔ میں نے دوستوں سے ملنا جلنا بھی ترک کر دیا۔ اس دوران میں میں نے گھر کوئی خط نہیں لکھا۔ میری بہنوں کے خطوط آتے رہے جس میں میرے خط نہ لکھنے کا گلہ، میرے والد اور چچا کے ساتھ تعلقات منقطع ہونے چچا کے لاہور میں ایک فیکٹری الاٹ کرانے کار وغیرہ خریدنے کا بھی لکھا ہوتا۔ لیکن میں ان خطوں کو دیکھتے ہی پرزے پرزے کر دیتا۔ مجھے ان خطوں کی آمد بھی قطعًا گوارا نہیں تھی۔ میرے لئے ان میں کوئی دلچسپی، کوئی خوشی نہ رہی تھی۔ میری زندگی کا تمام رس میری ایک ایک آرزو، اُمید اور خوشی کا خون نچوڑ لیا گیا تھا۔ اب میرے لئے سب کچھ لغو اور فضول اور زائد تھا میں مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا۔"

میرے دوست نے خاموش ہو کر اس طرح لمبا سانس لیا جیسے دور سے آنے والا کوئی تھکا ہارا مسافر کسی جگہ ستانے کے لئے رُک گیا ہو۔ میں نے اُس پر نظریں ڈال دیں اُس کی آنکھیں بالکونی کی طرف والے بند دروازے کو بے مقصد گھور رہی تھیں۔ اُس کا چہرہ جو غم واندوہ کی تصویر بنا ہوا تھا اب زیادہ رحم طلب اور معصوم نظر آرہا تھا۔ اُس کے گھونگریالے بالوں کو دیکھ کر بے اختیار دل چاہتا کہ ان پر ہاتھ پھیر کر اُس سے آہستہ سے کہا جائے ۔۔۔ اچھا اس دُکھ بھری داستان کو چھوڑو

اور اپنی کوئی "تازہ غزل سُناؤ"۔ لیکن میں اس سے یہ نہ کہہ سکا پھر میں نے سوچا کہ اُسے کہوں ـــــ "دوست! تمھاری یہ کہانی کوئی نئی یا انوکھی نہیں یہ ہمارے ایسے ہزاروں نوجوانوں کی مشترکہ داستان ہے"۔ لیکن میں اُس سے یہ بھی نہ کہہ سکا کیونکہ میں اُس کی حساس طبیعت سے بخوبی واقف تھا وہ اس قدر حساس تھا کہ عرصے سے بیکار رہنے کے باوجود وہ کسی دوست سے مالی مدد حاصل کرنے سے گھبراتا تھا۔ میں جب سے یہاں آیا تھا اُس کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ رہا تھا میں کئی بار اُسے اپنے ساتھ لے آتا اور اُس کی مدد کے لئے زبردستی کچھ پیسے دے دیتا تھا۔

اس وقت اُسے سامنے کرسی پر ٹانگیں پھیلائے اور دروازے کو گھورتے ہوئے دیکھکر تسلی دینے اُس کا غم دور کرنے کا جذبہ میرے دل میں شدت اختیار کرنے لگا۔ وہ اپنے نیلے میلے کوٹ میں کرسی کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اب سردی کی شدت کے باعث کرسی پر پھیلائی ہوئی ٹانگوں کو سکیڑنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔

میں نے آہستہ سے کہا ـــــ "چائے پیوگے؟"

"نہیں" ـــــ اُس نے اُسی طرح دروازے کو گھورتے ہوئے جواب دیا اور اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں کو ٹٹولنے لگا ـــــ میں اُس کے موڈ سے بخوبی آشنا تھا۔ اس لئے میں نے اُٹھ کر بالکونی کا دروازہ کھولا ہوٹل کے ملازم سے چائے لانے کو کہا اور دروازہ بند کرکے دوبارہ اندر آگیا۔ دروازہ کھولنے سے کوئٹے کی ہوا کا شدید جھونکا کمرے میں گھس آیا تھا اس سے بچنے کے لئے اُس نے ٹانگیں اُٹھا کر اپنی کرسی کے نیچے کرلیں اور اپنے دونوں بازوؤں کو سینے پر جوڑ لیا۔ میں نے اپنی کرسی پر بیٹھ کر اس بوجھل مایوس کن فضا کے طلسم کو توڑنے کی کوشش میں کچھ سوچ کر کہا۔

"اچھا میرے دوست! تو پھر تم مکمل طور پر تباہ ہوگئے؟"

"ہاں ـــــ" اس نے اپنی مونچھوں سے ہاتھ ہٹا کر سگریٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:

ہوٹل کا ملازم چائے رکھ کر چلا گیا تو میں نے کہا ـــــ "تو تم نے وہ عظیم ترین شاعرانہ حرکت نہ کی جس کا نام خودکشی ہے؟"

"خودکشی ـــــ میں نے یہ کوشش بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" وہ کہنے لگا لیکن میں نے فقرہ مکمل کرنے سے پہلے کہا:

"یاد رکھو اگر تم نے کبھی خودکشی کرنے کی کوشش کی تو میں تمھیں جان سے مارڈالوں گا"۔ وہ مسکرادیا اور ہاتھ میں لئے ہوئے سگریٹ کو جسے اُس نے ابھی تک نہیں سُلگایا تھا میز پر رکھ کر چائے کی پیالی اُٹھالی۔

دوسری بات تم یہ یاد رکھو کہ تمھارے مجھ سے کوئی مدد قبول کرنے سے گھبرانے، جھجکنے سے مجھے بے حد دُکھ ہوتا ہے ـــــ سمجھے!

"ہوں" ـــــ اُس نے ایک ثانیے کے لئے میری آنکھوں میں دیکھا اور نگاہیں ہٹا کر سر کو یوں ہلایا جیسے کسی غم انگیز خیالوں کو ذہن سے جھٹک رہا ہو پھر میری طرف دیکھ کر آہستہ سے بولا:

"تمھیں میری کہانی میں کوئی نئی بات نہیں ملی ہوگی۔ میں جانتا ہوں یہ ہمارے ملک کے بیشتر نوجوانوں کی سرگزشت ہے۔ میں اب خودکشی کا قائل نہیں رہا۔ میں اب ان حالات کے خلاف لڑنا چاہتا ہوں جو ایسی ہولناک کہانیوں کو جنم دے کر انسانوں کی روحوں کو چھلنی کردیتے ہیں"۔ اُس نے سگریٹ اٹھا کر اسے سُلگایا اور مٹھی میں لے کر اپنے مخصوص انداز میں کش لے کر مسکرادیا۔ پھر کہنے لگا۔

"لیکن تم تو ناحق بور ہوئے ہو تمھیں افسانے کے لئے کوئی مواد نہیں ملا ہوگا"۔

" لیکن اس کے باوجود میں تمھاری معاوضے والی شرط پوری کرنے کے لئے تیار ہوں " میں نے یہ کہتے ہوئے ڈرتے ڈرتے اپنی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا ــــ کوٹے کی ہوا ڈرائی کلین کئے ہوئے کوٹ سے زیادہ چھیڑ خانی نہیں کرتی - میرے پاس زیادہ پیسے نہیں ہیں - لیکن پرسوں یکم کو تنخواہ مل جائے گی پرسوں تم آ جانا؟ اور میں نے اپنی کرسی پر جھک کر اس کے نیلے کوٹ کی جیب میں نوٹ ڈالتے ہوئے کہا ۔

" یہ مفت میں تمھیں نہیں دے رہا ہوں، تمھارے پاس پیسے آتے ہی کوڑی کوڑی وصول کروں گا - ہاں "

ــــ (۲) ــــ

یکم کو وہ دن بھر نہیں آیا اگلے روز بھی میں اس کا انتظار کرتا رہا شام کو اس کی رہائش گاہ پر گیا وہ وہاں موجود نہیں تھا اس کے ساتھ رہنے والوں نے بتایا کہ وہ صبح سے گیا ہوا ہے ابھی واپس نہیں آیا - میں وہاں سے لوٹ آیا - اگلے دن صبح کے وقت میں اخبار دیکھ رہا تھا تو وہ آ گیا - میں نے خفگی کا اظہار کرنے کے لئے اس سے بات نہیں کی اور اخبار پر جھکا رہا - وہ میرے قریب ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا ــــ " ارے بھئی تمھارے رعب سے کوٹے کی ہوا تو اس سے اگلے روز ہی چل بسی تھی میں نے اسی لئے کوٹ نہیں دھلایا اس کی بجائے میں نے سوچا کہ دس روپے تو ہیں ہی چلو دو چار روز عیش کر لو "

میں نے اخبار میز پر رکھ کر اس کے میلے نیلے کوٹ پر نظر ڈالی - اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا - گولڈ فلیک سگریٹوں کا پیکٹ نکال کر میری گود میں پھینک دیا ــــ " لو سگریٹ پیو دوست ! اور اگر مجھ سے کوئی خفگی ہو تو اسے ان سگریٹوں کا کش لے کر کھالنس دو "

میں چپ چاپ اس کی طرف دیکھنے لگا - اس کی آنکھوں کے گرد اور نیچے سیاہ حاشئے اور گلابی سی سوجن چڑھی ہوئی تھی جیسے وہ رات کو بہت دیر تک جاگتا اور روتا رہا ہو وہ اس وقت مسکرا مسکرا کر اپنی چھوٹی مونچھوں پر جو اس کے ہونٹوں کے کونوں پر شیو نہ بنانے کے باعث بے طرح بکھری ہوئی تھیں ہاتھ پھیر رہا تھا - میں نے کہا :

" غموں کے ہجوم میں تمھیں مسکرانے کا فن تو خوب آتا ہے - لیکن تمھاری آنکھیں . . . . . "

وہ ہنسنے لگا، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرے انداز سے میری بات کو ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کر رہا ہے پھر اس کی مونچھوں پر تیرتا ہوا ہاتھ اس کی گود میں دوسرے ہاتھ کے ساتھ آ ملا اور وہ دونوں کو اس طرح دبانے لگا جیسے اپنے ذہن پر چھائے ہوئے کسی بوجھ کو اتارنے کی سعی کر رہا ہو - وہ پھر ہنسا اور اپنی کرسی پر جھک کر اور میری آنکھوں میں دیکھ کر کہنے لگا -

" دراصل میں تمھیں آج ایک تکلیف دینے آیا ہوں ــ تمھارا اندازہ درست ہے ــــ میں رات کو بہت دیر تک روتا رہا ہوں ــ لیکن آج میرے رونے کی شدید اور آخری قسط ہے - میں اپنے غموں کی جھولی میں اور زیادہ آنسو ڈال کر انھیں سر پر چڑھائے رکھنا نہیں چاہتا ــــ " یہ کہہ کر اس نے کوٹ کی دائیں جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک خوبصورت ڈبیا نکال کر میرے سامنے میز پر پڑے ہوئے اخبار کے پاس رکھ دی ــــ " میں تمھیں آج یہ تکلیف دینے آیا ہوں کہ تم میرے ساتھ بازار چلو اور اسے بیچ آئیں "

" بیچ آئیں ــــ ؟ " میں نے کہا اس سونے کی ڈبیہ کو دیکھ کر میرے ذہن میں اس کی تمام سرگذشت پھرنے لگی -

میں نے حیرت اور قدرے رنج کے جذبات کے ساتھ اُس کی طرف دیکھا۔ لیکن اُس کی نظریں سامنے بالکونی میں سے ہو کر باہر خلا میں معلق تھیں۔

"اسے مت بیچو ــــ یہ تمھاری محبوبہ کی ......"

اس کا کیا فائدہ ہے ــــــ؟" وہ میری بات کاٹ کر کہنے لگا ــــ "اب اس کا کوئی فائدہ نہیں میں اب اس کی جان لیوا یاد سے بھی نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ پھر میں ہر روز دوستوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتا۔ گذشتہ بیکاری کے اڑھائی ماہ میں تنو روپے کے قریب مجھ پر قرض ہو چکا ہے۔ میں آئے دن قرضہ لینے کی پریشانی اور ندامت نہیں اٹھا سکتا۔

میں ڈبیہ کو اٹھا کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی بناوٹ، تراشں، خراش بے حد خوبصورت تھی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ ڈھکنے میں اندر کی طرف اور نیچے بھی نیلی مخمل چڑھی ہوئی تھی اور اس میں سے ہلکی سی خوشبو آرہی تھی۔

" چلو اٹھو" وہ کہنے لگا ــــــ "میں نے کئی لوگوں سے آج شام تک اُن کے قرض ادا کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ مجھے کئی ضرورت کی چیزیں بھی آج خریدنی ہیں ــــ" یہ کہہ کر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں پھر اُس کی طرف دیکھنے لگا اُس کی آنکھوں میں شدید اضطراب تڑپ رہا تھا۔ ناچار میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

" میں آج تمھاری دعوت بھی کرنے والا ہوں ــــ" وہ میری طرف دیکھ کر اور میرا بازو پکڑ کر اُسے دباتے ہوئے کہنے لگا اور مسکرا دیا۔ ہم بس میں بیٹھ گئے، تو اُس نے وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لے کر اپنے ہوا سے اُڑتے ہوئے گھونگریالے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"بھلا اس کا کتنا وزن ہوگا، تمھارے خیال میں کتنے روپے مل جائیں گے ؟"

میں نے جیب سے ڈبیا نکال کر اسے کھولا اور کہا ــــــ "صحیح وزن تو سُنار ہی بتائے گا وہ اس کی مخمل نکال کر اسے شاید پگھلائے گا بھی پھر اس کے دام بتائے گا"

وہ کہنے لگا ــ" اس کی مخمل نکال کر ہاتھ پر رکھ کر اندازہ تو کرو"۔ میں نے مخمل نکال دی اور اندازہ کر کے بتایا کہ شاید ڈھائی تین تولے کے قریب وزن ہوگا ــ پھر وہ اس کی قیمت کے متعلق باتیں کرنے لگا اور وہ تمام چیزیں گننے لگا جنھیں وہ آج اسے فروخت کرنے کے بعد خریدے گا۔ اُس نے اپنے ذمے تمام قرض کا زبانی ہی زبانی حساب لگایا پھر اپنے تمام حساب اور پروگرام وغیرہ پر خوش ہو کر مسکراتا رہا۔

ہم بس سے اُتر کر بازار کا کچھ فاصلہ طے کرتے ہوئے سُناروں کی دوکانوں کی طرف جانے لگے۔ میں نے ایک چائے کی دوکان کے سامنے رُک کر کہا ــ آؤ تھوڑی سی چائے پی لیں "

" واپس آکر پئیں گے ــ" وہ بولا ـ ابھی واپس آجائیں گے پہلے اس کام سے فارغ ہو جائیں۔ پھر مزے سے آکر چائے پئیں گے ــ" مجھے اس وقت کچھ بھوک بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں ایک مٹھائی والے کی دوکان پر رُکنا چاہتا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"ارے بھائی اتنی جلدی کیا ہے اتنے دن تم مجھ پر خرچ کرتے رہے ہو آج مجھے بھی اپنی حسرت پوری کر لینے دو ۔ بہت پیسے ہو جائیں گے ــ چلو" اُس نے ایک اور سگریٹ سلگا لیا اور لمبے لمبے کش لے کر میرے پہلو میں یوں خاموش ہو کر چلنے لگا جیسے دل ہی دل میں کئی منصوبے بنا تا کئی پروگرام طے کرتا جا رہا تھا ــــــ

ہم سناروں کی دوکانوں پر پہنچ گئے۔ میں نے ایک دوکان پر رک کر ڈبیا ایک سنار کی طرف بڑھائی ۔ اُس نے اُسے غور سے دیکھا۔ پھر ایک کسوٹی پر ایک سلائی سے تیزاب لگا کر اس پر ڈبیا کا کنارہ رگڑ دیا۔ میں نے کسوٹی پر ایک سبز سا نشان پڑتے دیکھا جو آہستہ سے معدوم ہو گیا۔ اُس نے دوسری بار تیزاب لگا کر ڈبیا کو اس پر رگڑا۔ پھر تیسری بار ـــــ ہوں یہ سونا ہے؟" ـــــ سنار نے میری طرف دیکھ کر سوال کیا ـــ میں دل ہی دل میں اُس پر نفرت اور غصہ برساتا ہوا ڈبیہ لے کر دوسری دوکان پر گیا۔ اس دوکان دار نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر کہا: "اسے آپ بیچنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں ـــــ" میں نے پُر امید لہجے میں جواب دیا۔ اُس نے بھی دو بار ڈبیا کو رگڑا پھر واپس کر دیا ـــ "یہ تو نقلی سونا ہے سیٹھ! لیکن اسے بڑے ماہر آدمی نے تیار کرایا ہے . . . . . ."

ہم اور کئی دوکانوں پر گھوم گئے۔ ایک سنار نے کہا ـــ یہ بڑی خوبصورت چیز ہے اسے آپ کیوں بیچ رہے ہیں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو روپے آپ کو مل جائیں گے" ـــــ

میں نے ڈبیا کو چپ چاپ اپنی جیب میں جہاں اس کی مخمل پہلے سے پڑی ہوئی تھی ڈال لیا اور اپنے دوست کی طرف دیکھا۔ اُس کی نظریں نہ جانے کہاں تھیں اُس کا چہرہ اس طرح سے زرد اور چھوٹا سا ہو گیا تھا جیسے اُس کے جسم میں سے کسی نے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا ہو، اُس کے قدم جتنی تیزی سے ان دوکانوں کی طرف بڑھے تھے اب اُتنی ہی سُستی سے اٹھ رہے تھے۔ میں خود بہت پریشان اور دُکھی ہو گیا تھا اور میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے دوست کو کس طرح تسلّی دوں۔ میں اُسے بازو سے پکڑ کر سونے چاندی کی دوکانوں سے دور نکل آیا اور ایک چائے کی دوکان میں اُسے لے کر داخل ہو گیا۔

میں نے ایک دو لمحوں تک اُس کی طرف دیکھا اُس کا چہرہ مایوسی غم اور پریشانی کی ہولناک تصویر بنا ہوا تھا میں نے منہ پھیر کر چائے کی پیالی اُٹھائی۔ کچھ وقفے کے بعد وہ آہستہ سے کہنے لگا۔

" میں نے بیکار تمھارا اتنا وقت ضائع کیا تم بھی کہو گے کہ کیسے احمق سے واسطہ پڑا ہے۔ واقعی یہ میری حماقت تھی۔ مجھے یہ خیال نہیں رہا کہ یہ تحفہ میرے چچا نے اپنی لاڈلی بیٹی کو پیش کیا تھا"

میں نے اُس کے چہرے پر جہاں کئی شکنیں پڑی ہوئی تھیں نظر ڈالی، وہ بھاپ اُڑاتی ہوئی چائے کی پیالی پر نظریں گاڑے بڑبڑا رہا تھا ـــــ اور میں یہ بھول گیا تھا کہ میرا چچا شفیق باپ ہونے کے علاوہ ایک بڑا سوداگر بھی ہے"

اُس نے خاموش ہو کر جلتی ہوئی چائے کی پیالی اپنے ہونٹوں سے لگا لی اور میں اس بوجھل اور ہولناک موڈ سے اُس کا پیچھا چھڑانے کے لئے کوئی بات سوچنے لگا۔

(شمارہ ـــ ۳ ـــ سنہ ۱۹۵۱ء)

نوجوان نسل کا نمائندہ

افکار

ایک تحریک ہے جریدہ نہیں
فکر و فن کا نگار خانہ ہے
(منیر احمد)

GOVT GIRLS COLLEGE
LIBRARY
ACC. NO 15227
Library

اختر جمال

سُرمگیں آنکھیں نِگراں نِگراں

میں انھیں بغیر دیکھے ہی مرعوب ہوگئی تھی ۔ اتنے بڑے شاعر کی بیوی، اور اتنے بڑے شاعر کی بہن!! لیکن جب میں نے انھیں دیکھا تو ان کی شخصیت کو سب سے بڑا پایا ۔ میں اور شاہدہ دونوں ان کے لئے سب سے زیادہ بے چین تھے ۔ صبح کالج جاتے ہی میں نے پرنسپل سے جاکر پوچھا کہ ہماری اردو کی نئی پروفیسر کب تک آرہی ہیں؛ انھوں نے کہا "شاید آج وہ کلاسز لیں گی" یہ سن کر میں بے تحاشہ دوڑی اور لڑکیوں کو جاکر یہ خوش خبری سنائی، لڑکوں کو اُن کے آنے کی اس لئے زیادہ خوشی تھی کہ کالج کے مردانے اسٹاف میں ایک عورت کا اور اضافہ ہوجائے گا۔

میں اور شاہدہ گیلری میں کھڑی ہوکر انتظار کر رہے تھے اور کالج کے بڑے پھاٹک کی طرف دیکھ رہے تھے کہ کب وہ آتی ہیں ۔ سائیکلوں اور پیدل لڑکوں کے غول کے غول آتے رہے مگر وہ نہ آئیں ۔ شاہدہ دل برداشتہ ہونے لگی، انگلش کا پیریڈ بھی شروع ہوگیا، اور ہمیں کلاس میں جانا پڑا ۔ کلاس شروع ہوا ہی تھا کہ میڑن زرد رنگ کے برقعے میں دھیرے دھیرے آئی ۔ مجھے اشارے سے بلایا میں بھی دھیرے دھیرے پنجوں کے بل اٹھ کر گئی تاکہ پردے کے پیچھے سے لیکچرار کو میرے جانے کی آہٹ نہ محسوس ہو ۔ "وہ آگئیں" میں نے شاہدہ کو اشارہ کیا ۔ وہ بھد بھد کرکے بھاگی اور ہم دونوں بے اختیار اس سمت دوڑے جہاں وہ کھڑی تھیں ۔

ان کے چہرے پر بڑی ہی میٹھی سی مسکراہٹ تھی ۔ ایک بالکل سادہ سی سفید ساری باندھے تھیں ۔ ہم انھیں کامن روم میں لے گئے ۔ "آپ کون سے ایر میں ہیں" انھوں نے پوچھا ۔ میں نے ہنس کر کہا "جی ہم لوگ تو فرسٹ ایئر فول ہیں" وہ بھی ہنسنے لگیں ۔ ہم نے بہت سی باتیں کیں، اتنی سنجیدہ شائستہ اور خلیق پروفیسر پاکر ہم بہت خوش تھے، شاہدہ کو نہ جانے کیا سوجھی کہنے لگی "بھائی صاحب (ان کے شوہر) کے اشعار پڑھ پڑھ کر میں نے اپنے ذہن میں آپ کی تصویر بنا لی تھی ۔

"تب تو آپ کو بڑی مایوسی ہوئی ہوگی"

"نہیں ــ تو" شاہدہ ہکلانے لگی، آپا کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ تھی وہ کچھ دیر کے لئے چپ سی ہوگئیں ۔ پھر ہم لوگوں سے کورس وغیرہ کے متعلق معلومات کرنے لگیں کہ پہلے پروفیسر نے کہاں تک پڑھایا ہے ۔ میں نے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا، شاہدہ نے انھیں کورس بتایا انھوں نے مجھ سے پوچھا "تو کیا آپ نے بھی آج سے ہی آنا شروع کیا ہے؟ میں نے کہا ــ "نہیں دراصل بات یہ ہے کہ میں کبھی اردو کی کلاسز اٹینڈ نہیں کیا کرتی تھی، اگر پڑھانے والا اچھا نہ ہو تو مجھ سے پڑھا نہیں جاتا

اور کوفت ہوتی ہے "

وہ مسکرائیں اور میں نے سوچا مجھے مولوی صاحب کے متعلق ایسی بات نہیں کہنی چاہئے تھی۔

جب سے آپا نے پڑھانا شروع کیا تھا میں برابر اردو کلاس اٹینڈ کرنے لگی تھی، ہم سب ان کی زبان میں ایک جادو سا محسوس کرتے۔ ان کی سیاہ آنکھوں کی گہرائیوں میں ہمیں معلومات کا دریا بہتا محسوس ہوتا، ڈل سے ڈل چیز، مثلاً "شریف زادہ" کو بھی ان کی سلجھی ہوئی دلچسپ اور پیاری تنقید نے انتہائی حسین بنا دیا تھا، حالانکہ اس سے قبل جب مولوی صاحب شریف زادہ پڑھاتے تو سب پر نیند کا غلبہ شروع ہو جاتا کوئی اپنا ناشتہ دان کھول کر کھانا کھانے لگتی کوئی باقاعدہ دو کرسیاں ملا کر سو جاتی۔ مولوی صاحب کی بڑی بڑی سیاہ چمکدار آنکھیں جن میں کاجل کی لکیریں ان کی گھنی گھنی سیاہ مونچھوں کی طرح خوفناک معلوم ہوتی تھیں پردے کے پیچھے سے سب کچھ تاڑ لیتیں کہ کیا معاملہ ہے وہ ڈانٹ ڈپٹ کر کے سب کو شریف زادے کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے اور میں بدحواس ہو کر کلاس سے بھاگ جاتی اور تالاب کے ہنستے ہوئے کنول کے پھولوں کی پناہ ڈھونڈھتی۔

مگر اب تو دن بدن اردو کے پیریڈ سے شدید محبت ہوتی جا رہی تھی، بلکہ اگر آپا نہ پڑھاتیں تو شاید مجھے اردو کے قدیم ادب سے خصوصاً قدیم شاعری سے کبھی لگاؤ نہ ہوتا، قدیم شاعری کو میں بکواس اور دردسر کہتی مجھے اس میں کیچڑ ہی کیچڑ نظر آتی اور میں سوچتی کتنی نسلیں اس کیچڑ میں کھسلتی جا رہی ہیں۔ اس دفتر کو جلا دینا چاہیئے سستے اور گندے عامیانہ جذبات کوٹھوں پر رہنے والیوں کے اردگرد شاعری کا سارا محور گھومتا ہے، وطن، آزادی، عوام وغیرہ کے متعلق تو کچھ ملتا ہی نہیں، اور میں سر پکڑ کر سوچتی کہ قدیم شاعروں کے بجائے اگر کورس میں جعفری، کیفی، مجاز، جاں نثار اور فیض کی چیزیں ہوتیں تو یہ کتاب کیا چیز ہوتی اور پھر ٹھنڈا سانس بھر کر نفرت سے کتاب کا ورق الٹنے لگتی۔ مگر آپا اپنی تنقید سے ان مرجھاتے ہوئے پھولوں کا شبنم سے منہ دھلاتیں تو وہ اشعار کچھ ایسے نرم، نازک، حسین، بےساختہ اور نہ جانے کیا کیا لگنے لگتے، اور مجھے احساس ہوتا کہ میر اور غالب بہت عظیم ہیں، داغ کے داغوں کو وہ اور نمایاں کر دیتیں۔

آپا کو میر بہت پسند تھے آپا کا شعر پڑھنے کا انداز ایسا نرم نرم میٹھا میٹھا اور جادو بھرا تھا کہ عجیب سی مدہوش کن کیفیت طاری ہو جاتی، ان کا تحت اللفظ پڑھنا بھی ترنم سے زیادہ شیریں محسوس ہوتا تھا، بہت سے اشعار زبانی سناتیں اگر کبھی تنقید کے لئے کسی شاعر کے ایسے شعر کا حوالہ دینا ہوتا جس سے اس کی کمزوریوں کا اظہار ہو تو وہ مثال کے لئے شعر نہیں سناتیں اور ہنس کر کہتیں "بھئی میرا دماغ کوڑا کرکٹ قبول نہیں کرتا مجھے وہی چیز یاد رہتی ہے جو مجھے پسند ہوتی ہے "

آپا کے آنے سے کالج کی دنیا میں لڑکیوں کے لئے بہار سی آگئی تھی، ایک بہت بڑا سہارا ——! اس سے پیشتر ہم لوگوں کا کسی بھی چیز کے لئے دل چاہتا تو میٹرن سے کہتے، میٹرن انتہائی سہمی ہوئی عورت تھی وہ کبھی ہمارا جائز مطالبہ بھی پرنسپل تک نہ پہنچاتی، ہم خود بھاگ دوڑ کر کے اگر کبھی کوئی پروگرام بناتے تو وہ فوراً رد ہو جاتا۔ ہر چیز ہمارے لئے نامناسب تھی۔

لڑکوں کے ساتھ مشترکہ تعلیم اور پھر وہ بھی پردے کے ساتھ عجیب مصیبت تھی کالج کیا تھا اچھا خاصا قفس تھا۔ جس میں کالج کی ساری مرغیوں کو ایک ڈربہ میں ایک کے اوپر ایک بھر کر آکسیجن کے لئے ذرا سی جالی لگا دی گئی تھی۔ ایسے خوفناک ماحول میں آپا ہمارے لئے کیا تھیں یہ کوئی ہمارے دل سے پوچھے۔ ان کے آنے سے ہماری سوئی ہوئی امنگیں جاگ پڑیں اور وہ تمام آرزوئیں جو گھٹ گھٹ کر مر چکی تھیں۔ ازسرِ نو زندہ ہو کر پوری ہونے لگیں، ڈرامے، فیچر، ڈانس، گانے، مشاعرے، قوالیاں، مڈ بیٹ ہم نے کوئی چیز نہیں چھوڑی، ہر بات پوری ہو جاتی، سیر و تفریح کے لئے بھی اجازت مل جاتی،

آپا نے قفس کو اپنے دم سے گلستان بنا دیا تھا۔
میری ایک عجیب سی عادت ہے۔ بڑی بے تکی سی اور مجھے ہمیشہ اس پر آپ ہی آپ غصہ بھی آتا ہے۔ جب بھی کوئی بات کرتا ہے، میں اس کی بات سننے سے زیادہ اسے محسوس کرنا شروع کر دیتی ہوں۔ آپا کو دیکھنے کے بعد میں نے شاہدہ سے کہا "دیکھا تم نے آپا کو ان کی آنکھوں کی گہرائیوں میں یہ زردی سی کیوں ملی ہے۔ یہ کیا چاہتی ہیں، انھیں کیا نہیں ملتا ——!
ایسا لگتا ہے جیسے انھوں نے انتہائی محبت کی ہے مگر خود انھیں محبت نہیں ملی۔"
شاہدہ کہنے لگی۔ "رہنے دے اپنی افسانہ نگاری" مگر میں ایسے ہی خیالوں میں دیر تک گم رہی۔
آپا کا جسم دبلا پتلا اور قد کافی لمبا تھا، چال بڑی پروقار تھی، رنگ سانولا تھا، آنکھیں سیاہ تھیں اور ان کے گرد حلقے سے تھے، کنپٹیوں پر چھوٹے چھوٹے سیاہ نشانات تھے۔ پتلی سی ستواں ناک تھی، ماتھے پر ہلکی ہلکی سی سلوٹیں تھیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ ان کی فطرت میں قربانی اور ایثار کی کتنی زبردست صلاحیت ہے۔
مجھے ایک عجیب سی کشش دن بدن ان کے قریب کر رہی تھی وہ بھی مجھے اور شاہدہ کو سب سے زیادہ چاہتی تھیں ہم جب بھی کوئی چیز لکھتے اور آپا اسے پسند کرتیں تو دل باغ باغ ہو جاتا۔ کس قدر دل بڑھاتی تھیں لکھنے کی عجیب سی امنگ پیدا ہو جاتی تھی پڑھنے میں عجیب سا کیف محسوس ہوتا تھا۔
ایک مرتبہ آپا سخت علیل ہو گئیں ان کے شوہر جنھیں ہم سب لڑکیاں بھائی صاحب کہا کرتی تھیں، ان کی بیماری کے دوران میں ہماری کلاس لینے لگے۔ مگر ہم سب کلاس میں آپا کو یاد کیا کرتے۔ بھائی صاحب آنکھیں بند کئے عجیب بے خودی کے عالم میں اشعار پڑھاتے، وہ خود شاعر تھے۔ اس لئے اشعار میں اتنے کھو جاتے کہ ہمیں سمجھا نہ پاتے، آپا کی سی وہ بات کہاں! — لڑکیوں نے آپا کے تندرست ہونے کا میلاد شریف مانا اور جب وہ اچھی ہو گئیں تو سب کو عید کی سی خوشی ہوئی ——
جب سیکنڈ ایئر کو فیرویل پارٹی دی گئی تو ہم نے سیکنڈ ایئر کی لڑکیوں اور پروفیسرز کو COMPLIMENTS دیئے۔ آپا کو دیا گیا تھا "سرمگیں آنکھیں نگراں نگراں" نگراں کا لفظ دو بار خاص رعایت سے رکھا گیا تھا۔ ایک نگرانی تو اپنے شوہر کی اور دوسری بار نگراں کا لفظ لڑکیوں کی نگرانی کے لئے آیا تھا وہ "سرمگیں آنکھیں نگراں نگراں" سن کر مسکرائیں اور بہت محظوظ ہوئیں۔ اس کے بعد ہم نے ایک مشاعرہ کیا جس میں لڑکیاں کسی نہ کسی شاعر کے روپ میں سامنے آئیں، میں نے بھائی صاحب کا کلام پڑھا اور خواہ مخواہ شرارت سوجھی، ان کے اشعار آپا کی طرف دیکھ دیکھ کر بڑے انداز سے پڑھے، آپا اس وقت جھینپی جھینپی سی ہنستی رہیں۔
جب میں گھر جانے کے لئے کپڑے وغیرہ رکھنے لگی تو اچانک آپا آگئیں، تم نے تو سچ مچ کمال کر ڈالا، ہوبہو نقل اتاری
میں نے کہا آپا آپ خفا تو نہیں ہوئیں، میں نے وہ اشعار آپ کو مخاطب کر کے نہیں پڑھے تھے بلکہ میں آپ کا REACTION دیکھنا چاہتی تھی اس لئے پڑھتے ہوئے آپ کی جانب دیکھ رہی تھی۔
تو آخر آپ کو یہ خوش نہی کیوں ہے کہ شاعر کی مخاطب اس کی بیوی ہی ہوتی ہے — ان کے چہرے پر درد بھری سی مسکراہٹ تھی، مجھے چوٹ سی لگی، اپنی شرارت پر افسوس ہوا واقعی اسٹیج پر بیٹھ کر باقاعدہ انسان کی طرف دیکھ دیکھ کر پڑھنے کی کیا تک تھی۔ مگر اور سب نے اس حرکت کو بہت پسند کیا۔

آپا مجھے اکثر یہ نصیحت کیا کرتیں "تم سیاست کے بجائے پڑھائی کو مقدم سمجھو، ورنہ بہت پچھتاؤ گی، پارٹی کے لئے بھی تم اسی وقت زیادہ مفید ثابت ہوسکو گی جب اپنے پیروں پر کھڑی ہو کر اپنے مقصد کے لئے کچھ کرو گی، اس وقت تم زیادہ اچھی طرح اور آسانی سے کام کرسکو گی" آج ان کی یہ نصیحت مجھے کس قدر یاد آتی ہے، مگر اس زمانے میں مجھے آپا کی یہ نصیحت بڑی کڑوی لگتی اور میں کچھ بُرا سا مان جاتی، میں چاہتی تھی کہ آپا میری سیاسی ACTIVITIES کو بھی اسی طرح پسند کریں جس طرح میری لکھی ہوئی چیزوں کو پسند کرتی ہیں، مگر آپا نے یہ کبھی نہ کیا بلکہ ہمیشہ یہی کہا۔" یہ جوش و خروش جو تم تقریروں میں دکھاتی ہو کاش پڑھنے میں دکھاؤ، امتحان کے دن قریب آگئے ہیں" اور میں جل بھُن کر خاک ہوجاتی۔ اس لمحہ آپا مجھے موقع پرست اور بزدل لگنے لگتیں۔

خیالات کے اعتبار سے وہ ترقی پسند تھیں مگر باوجود اس کے وہ خدا پرست بھی تھیں، مذہب کو کمزور بنانے والی توہم پرستیوں اور مہمل عقیدوں سے ضرور انھیں نفرت تھی۔ مگر خدا کی ذات پر انھیں پورا یقین تھا۔ ایک دن کالج کی لاری میں مذہبی بحث چھڑ گئی۔ ساری لڑکیاں ایک طرف اور میں اکیلی ـــــ میں شرارتاً کچھ لڑکیوں کو خفا کرنے کے لئے اور بھی جوش و خروش سے بحث کر رہی تھی۔ میں نے آپا کی طرف دیکھا، مگر انھوں نے بھی میرا ساتھ نہ دیا۔ میں نے کہا اچھا آپا آپ ہی بتائیے نا ـــــ ہم دعا اسی لئے تو مانگتے ہیں کہ ہمیں کسی کام کے پورا ہونے کا قطعی یقین نہیں ہوتا، تھوڑا شک ضرور ہوتا ہے۔ اگر یقین و اعتماد ہو تو دعا مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔

آپا نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی پھر مسکرا کر بولیں" جہاں تک کارل مارکس اور لینن کے معاشی فلسفہ کا تعلق ہے وہ مجھے پسند ہے مگر میں اس سے آگے اور کچھ سوچنا پسند نہیں کرتی "میں یہ سوچ کر چپ ہوگئی کہ شاید میری باتوں سے آپا کی دل شکنی ہوئی ہے۔ پھر میں نے ان کے سامنے مذہبی بحث سے ہمیشہ گریز کیا۔

اکثر کلاس میں ایسا ہوتا کہ وہ کسی کتاب کی ریڈنگ کرا رہی ہوتیں اور جب میرا نمبر آتا تو میں جیسے خواب سے چونک پڑتی۔ جھینپ کر پوچھتی "کونسا صفحہ ہے" وہ ایک پیار بھری ڈانٹ پلا کر کہتیں "آپ کتاب کو نہیں بلکہ مجھے پڑھا کرتی ہیں" میں گھبرا کر ان کی طرف دیکھتی، جیسے کسی نے دل کا چور پکڑ لیا ہو اور پھر جھینپ کر پڑھنے لگ جاتی۔ ہر جبین نے ایک دفعہ آپا اور بھائی صاحب کے متعلق بہت سی باتیں سنائیں وہ آپا کی قریبی رشتہ دار تھی اس نے بتایا کہ بھائی صاحب کو ان کی ایک رشتہ دار لڑکی سے محبت تھی، وہ کس قدر اسے چاہتے تھے اور پھر بہت سے قصے، سب نے بڑی دلچسپی سے اس کی باتوں کو سُنا۔ مگر جانے کیوں مجھے آپا کا وہ جملہ یاد آگیا "آپ کو آخر یہ خوش فہمی کیوں ہے کہ شاعر کی مخاطب اُس کی بیوی ہی ہوتی ہے" اور پھر ان کی درد بھری مسکراہٹ میری نظر میں گھوم گئی، اور میں نے محسوس کیا کہ آپا کی ہنسی میں آنسوؤں کا گداز کیوں ہے؟ آپا خاموش، متین اور انتہا سے زیادہ حساس اور خود دار تھیں، اُن کے سینے میں ایک ایسی عورت کا دل تھا جو سراپا محبت ہوتی ہے اور قدرتی طور پر ویسی ہی محبت چاہتی بھی ہے، ایک مرتبہ کامن روم میں بیٹھ کر میں آپا سے اکنامکس پڑھ رہی تھی۔ اکنامکس لڑکیوں میں صرف میں نے ہی لی تھی، اور پرنسپل لڑکوں کے ساتھ کلاس اٹینڈ کرنا پسند نہ کرتے تھے اس لئے آپا ہی مجھے اکنامکس پڑھایا کرتی تھیں۔ پڑھانے کے بعد وہ دیر تک باتیں کرتیں۔ وہ ایک پروفیسر صاحب کی نظم کا تذکرہ کرنے لگیں، کہنے لگیں بے حد اچھی ہے بڑا تاثر ہے۔ میں نے نہ جانے کیا سوچ کر پوچھا "کیوں آپا ایک بار جب دل ٹوٹ جاتے تو کیا پھر نہیں جڑ سکتا؟" انھوں نے غور سے میری آنکھوں کو دیکھا پھر کہنے لگیں "ٹوٹی ہوئی چیز جڑ تو جاتی ہے۔ مگر بال تو نہیں جاتا" میں چپ ہوگئی

میں نے ان سے پھر اور کچھ نہیں پوچھا، مگر نہ جانے کتنے دن تک ان کا یہ جملہ میرے کانوں میں گونجتا رہا میں کچھ بھی کرنے بیٹھتی کچھ بھی پڑھتی کوئی میرے کانوں میں کہتا "ٹوٹی ہوئی چیز جڑ تو جاتی ہے مگر بال تو رہ ہی جاتا ہے" اور میری آنکھوں میں بار بار نہ جانے کیوں آنسو سے آتے آتے رہ جاتے۔

یوم اگست پر کالج میں بڑی دھوم دھام سے یوم آزادی منانے کی تیاریاں ہوئیں۔ کالج یونین کی سکریٹری ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی حصہ لینا تھا، میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یونین کے بجٹ میں سے اس تقریب کے لئے ایک پائی بھی نہیں دینے دوں گی، جب پرنسپل کے کمرے سے باہر نکلی تو مجھے سیڑھیوں پر ہی آپا مل گئیں۔ کہنے لگیں "یوم آزادی پر کیا بھاگی بھاگی پھر رہی ہے۔ تجھے اتنا بھی احساس نہیں کہ تیرا شوہر سامنے ہی کی پہاڑی پر نظر بند ہے" میری آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔ مگر میں نے انھیں پی کر کہا "آپا آپ کو کیا پتہ کہ میں کیا کرنے والی ہوں، آپ کو کیا پتہ کہ میرے دل میں کیسی آگ سلگ رہی ہے۔ اور میں اگر تقریر کروں گی تو کیا کہوں گی" انھوں نے مجھے سینے سے لگا لیا، بڑے پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگیں "تو آزاد ہے جو دل چاہے کر سکتی ہے۔ مگر میں نوکر ہوں، تجھے کیا پتہ میرے دل کی کیا حالت ہے۔ کیا دل چاہتا ہے اور اپنی مجبوری پر کس قدر غصہ آتا ہے" وہ بے حد اداس تھیں۔

پھر مجھے تقریر کی اجازت نہیں ملی۔ میں احتجاجاً ہال سے چلی گئی، میرے کسی ساتھی نے میرا ساتھ نہ دیا، پرنسپل کے آنے سے سب اور بھی خوف زدہ تھے، آپا کو اس بات کا بھی بہت دکھ ہوا، وہ ایک لڑکی کے متعلق کہنے لگیں "دیکھو کس قدر ترقی پسندوں کی اماں بنتی ہے۔ مگر اتنی ہمت نہ ہوئی" اس روز پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ آپا کتنی غمگین اپنی سیٹ پر بیٹھی رہیں۔ اگر وہ نوکر نہ ہوتیں اور مجبور نہ ہوتیں تو ضرور میرے ساتھ ہال سے نکل آتیں۔

میں نے تھرڈ ایر میں داخلہ لینا چاہا مگر یوم اگست پر گڑبڑ پھیلانے اور کالج میں کمیونزم پھیلانے کا الزام لگا کر مجھے داخلہ نہیں دیا گیا۔ آپا کو میرے داخلہ نہ ملنے کا بڑا دکھ ہوا وہ بڑی دیر تک پیار بھری تسلیاں دیتی رہیں، داخلہ نہ ہونے کی وجہ سے میں نے کالج جانا چھوڑ دیا تھا۔ مگر جب کبھی کالج میں کوئی خاص بات ہوتی، آپا مجھے ضرور بلواتیں اور میں کبھی کبھی چلی جاتی۔ ایک مرتبہ کالج میں ورائٹی شو تھا۔ بچوں کا ایک چھوٹا سا فیچر بھی تھا، آپا کا بڑا بچہ اس میں پارٹ کر رہا تھا، اسے آپا نے ترنگے کی جے سکھانے کی بے حد کوشش کی مگر وہ ہمیشہ اسٹیج پر جا کر لال جھنڈے کی جے ہی کہتا۔ وہ اس کی اس حرکت پر جھنجھلا گئیں، کہنے لگیں "اس کو نہ رکھوں، اگر اس نے کمشنر کے سامنے یہ حرکت کر ڈالی تو کیا ہوگا؟

میں نے ہنس کر کہا "آپا اس پر اپنے آبا کی تعلیمات کا زیادہ اثر ہے، آپ اسے موقع پرست کیوں بنانا چاہتی ہیں" آپا نے میرا کاندھا ہلا کر کہا "شاید تو مجھے بھی موقع پرست سمجھتی ہے؟" اپنے شوہر کے متعلق کہنے لگیں "وہ استعفیٰ دے کر چلے گئے۔ میں بھی چلی جاؤں۔ کیا میں اُن کے جانے کے بعد یہاں خوش اور مطمئن ہوں؟ مگر ان بچوں کا کیا ہوگا ۔۔۔؟ اور پھر کبھی میں وہ خود کتنے پریشان ہیں۔ فلمی گیت لکھتے ہیں مگر وقت پر کبھی روپیہ نہیں ملتا، بچوں کی تعلیم و تربیت یہ سب چیزیں ہیں۔ میں بھی ہواؤں میں اڑنے لگوں تو کیا ہو؟ تجھے کیا پتہ ضمیر کے خلاف کام کرنے میں کتنی اذیت ہوتی ہے۔ مگر مجبوراً سب کچھ کر رہی ہوں" مجھے اس وقت ان سے بے حد ہمدردی پیدا ہوئی، میں نے محسوس کیا کہ درحقیقت وہ کتنی عجیب و غریب ذہنی پریشانی اور کشمکش میں مبتلا ہیں ان کی روح میں اذیت جیسے زہر گھول رہی ہو، وہ سب کچھ کر سکتی ہیں۔ مگر اپنی اس مجبوری سے جنگ نہیں کر سکتیں اس لئے کہ انھیں اپنے شوہر اور بچوں سے انتہائی محبت ہے۔ جنھیں وہ پریشانی و مصیبت میں نہیں دیکھ سکتیں۔

کچھ عرصہ بعد مجھے پھر تلنگانہ فنڈ کے سلسلے میں کالج جانا پڑا وہ مجھے دیکھ کر میرے ارادے بھانپ گئیں کہنے لگیں۔
"سب کچھ ٹھیک ہے مگر تو تو آگ لگا کر چلی جائے گی، سب سمجھیں گے یہی رہ گئی ہے اور یہی سب کچھ کروا رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "نہیں آپا آپ پر کوئی شبہ نہیں کر سکتا، میں سب کچھ اعلانیہ کروں گی، چھپا کر کام نہیں کروں گی۔" سمجھانے لگیں کہ "تم لڑکیوں کے گھر پر انفرادی طور پر جا کر کام کرو۔ کالج میں مناسب نہیں ہے۔ میں تانگہ منگوا دوں۔ گھر چلی جاؤ ورنہ پرنسپل کو خبر ہو جائے گی۔"

میں نے کہا: "نہیں آپا یہ کیسے ممکن ہے، یہاں میں آسانی سے کام کر سکوں گی۔" اور دیکھتے ہی دیکھتے میں نے دونوں کا پیاں چندوں سے پُر کر ڈالیں، دوسرے دن پھر اور کاپیاں لے کر پہنچی، کالج میں قدم رکھتے ہی پرنسپل نے بلوایا، ساری لڑکیوں کو اپنے آفس میں جمع کیا اور اُن کے سامنے مجھے خوب بُرا بھلا کہا۔ میری حمایت میں کسی سے ایک لفظ بھی نہ بولا گیا، وہ سب سر جھکائے کھڑی رہیں، انھیں ممانعت کردی گئی کہ تلنگانہ فنڈ میں کوئی ایک پیسہ بھی نہ دے۔ اور مجھے حکم دیا گیا کہ میں آئندہ سے کبھی کالج کے احاطہ میں قدم نہ رکھوں۔

چند لڑکیوں نے مجھ سے کہا کہ آپا نے تمھاری رپورٹ کی تھی، مگر میں نے کہا "آپا یہ کبھی نہیں کر سکتیں۔ میں قیامت تک یقین نہیں کر سکتی۔" اس وقت میرے دل و دماغ میں ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا۔ میں نے کالج پر ایک آخری نظر ڈالی، شان دار عمارت، خوبصورت باغ، تالاب، کنول کے پھول اور پہاڑیاں ۔۔ میں نے سوچا اب میں یہ سب کچھ کبھی نہ دیکھ سکوں گی، اس کالج سے میری زندگی کی کتنی ہی دل کش اور پیاری یادیں وابستہ ہیں۔ مگر پھر میں نے سوچا میں ایک دن اس میں ضرور داخل ہوں گی۔ کالج کی عمارت پر ہمیشہ ترنگا نہیں لہرائے گا ــــ میں جانے لگی اسی وقت آپا میرے پاس آئیں، انھوں نے بات کی تو ان کی آواز گلوگیر ہو گئی اور مجھے اُن کے شدید غم کا اندازہ ہوا بولیں "کاش میں تجھے اپنا دل چیر کر اس وقت دکھا سکتی کہ کس طرح میں اس جگر رہی ہوں، میں کتنی مجبور ہوں ــــ!" وہ نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں اور میں خاموشی سے سن رہی تھی۔ پھر میں کالج سے آگئی اور کبھی کالج نہیں گئی، میرا دل چاہتا تھا کہ کاش آپا نے میرا ساتھ دیا ہوتا۔ مگر پھر مجھے ان کی مجبوریوں کا خیال آگیا۔ کیونکہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کس طرح اور کس دل سے اپنے آپ کو خاموش رکھے ہیں اور ایسا کرنے میں انھیں کتنی سخت تکلیف اٹھانا پڑ رہی ہے۔

مجھے اس کے بعد ایک عرصہ تک آپا کو دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا۔ جب میں پاکستان آنے لگی تو آپا نے میری بہن سے کہلوایا کہ میں بیمار ہوں ــــ تمھیں دیکھنے کو بے حد دل چاہتا ہے مجھ سے ضرور مل جاؤ، مجھ سے رہا نہ گیا۔ میرا خود بھی انھیں دیکھنے کو دل ترس رہا تھا، ایک دن شام کو میں ان کے پاس گئی وہ بہت ہی خوش ہوئیں۔ میں نے بھائی صاحب کے متعلق پوچھا۔ کہنے لگیں۔ "وہ بمبئی میں ہیں اور سخت پریشان ہیں تجھے میری حالت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا "آپ یہاں بلا لیجیے" اس زمانے میں ترقی پسند مصنفین کے سب ممبروں کے نام وارنٹ تھے، کہنے لگیں "دل چاہ رہا ہے تجھے خوب پیٹوں، تو نے ایسی بات منھ سے کیوں نکالی۔" وہ روہانسی سی ہو گئیں، اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ انھیں بھائی صاحب سے کتنی شدید محبت ہے وہ انھیں تکلیف میں دیکھ ہی نہیں سکتی تھیں۔

پھر وہ اپنے بچوں کی باتیں کرنے لگیں "یہ اپنے ابا کو بہت یاد کرتا ہے شکل بھی ویسی ہی ہے اور بال بھی ویسے ہی بنواتا ہے، اسی انداز میں کہتا ہے، جناب میرے ابّا اتنے مشہور شاعر ہیں کہ وہ جب ریل سے اترتے ہیں تو لوگ اکٹھے

ہو جاتے ہیں، ان کے دونوں بچے انتہائی ذہین ہیں۔ پھر انھوں نے بہت اچھی سی چائے پلائی، پکوڑے اور گلگلے پکوائے۔ بڑی محبت اور پیار بھرے اصرار سے ہر چیز کھلاتی رہیں۔ پھر جب ہم باہر کمرے میں آکر بیٹھے اور سامنے سنٹرل جیل کی پہاڑی نظر آئی تو کہنے لگیں۔" تجھے کیا پتہ تیرا شوہر جب جیل میں تھا تو یہ گھر ہم دونوں کے لئے کس قدر عذاب جان بن گیا تھا سامنے نظر پڑتے ہی طبیعت پریشان ہو جاتی تھی" پھر دھیرے سے بولیں۔" تو میرے بارے میں کیا سوچتی ہے، بر جبیں میرے پاس تھی ذرا اس سے پوچھنا کہ جس روز تجھے کالج سے نکالا ہے وہ رات میں نے گھر آکر کتنی اذیت سے گذاری ہے پل بھر کو بھی نہیں سوئی، مگر میں کتنی مجبور ہوں یہ تو بھی جانتی ہے۔" ان کی آنکھیں نم سی ہو گئیں۔ مجھے بھی ان کی باتوں کی سچائی میں شک نہ تھا۔ وہ پھر کہنے لگیں۔" ذرا میرا ہاتھ پکڑ کر دیکھ" میں نے ان کی کلائی اپنے ہاتھ میں لی، میں کانپ گئی۔ "آپا کیا ہو گیا ہے آپ کو ——؟ آپ کے ہاتھ میں نہ نرمی ہے، نہ گرمی، کسی چیز کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ جیسے زندگی ہی نہ ہو، درخت کی ٹہنی کی طرح سخت" وہ مسکرا کر بولیں۔" دیکھ لیا تو نے میری کیا حالت ہے دو مہینے کی چھٹی لے کر لکھنؤ گئی تھی، علاج کرا کر آئی ہوں۔ ڈاکٹر نے اب بھی آرام کی تاکید کی ہے۔ لیکن اگر آرام سے لیٹ جاؤں تو ان بچوں کا کیا ہوگا۔"

مجھے آپا کے حالات سن کر بڑا دکھ ہوا، وہ پھر کہنے لگیں" اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ یہ پاکستان جاتے ہی گرفتار نہیں کئے جائیں گے تو میں چلی گئی ہوتی" آپا کی صحت کو اتنا زیادہ خراب پا کر مجھے بہت رنج ہوا، میں سوچنے لگی کہ آپا اپنے شوہر اور بچوں کی محبت سے مجبور ہو کر اپنے ضمیر سے جنگ کر رہی ہیں۔ بہت مجبور ہو کر، ان کا دل کس قدر پریشان اور بے چین ہے۔ کتنی خوفناک اذیت میں مبتلا ہیں، کہیں آپا ہار نہ جائیں۔ وہ زیادہ عرصہ تک اس حالت میں نہیں رہ سکتیں، ان کا شعور بیدار ہے اور ضمیر پاک ہے، ان کا ضمیر اور شعور اب زیادہ عرصہ تک یہ سب برداشت نہ کر سکے گا۔

اور وہی ہوا، آپا یہ کھیل زیادہ عرصہ تک جاری نہ رکھ سکیں، ان کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ پھر بیمار ہو گئیں اور اب اس دنیا سے جہاں انسانوں کو مجبور ہو کر اپنی آزادی قربان کرنا پڑتی ہے، اپنے ضمیر کے خلاف چلنا پڑتا ہے روٹھ کر ہمیشہ کے لئے چلی گئیں۔ میں سوچتی ہوں کاش آپا اپنے شوہر کے ساتھ خود بھی استعفیٰ دے کر چلی جاتیں، اپنے بچوں اور شوہر کو مصیبتوں کا شکار دیکھ سکتیں، خواہ انھیں فاقے ہی کرنے پڑتے، ممکن ہے وہ اس حالت میں اتنی جلدی دنیا سے خفا نہ ہو جاتیں۔

جن لوگوں کا ضمیر مردہ ہو وہ سب کچھ کر کے عیش کر سکتے ہیں لیکن جن کا ضمیر پاک اور بے لوث ہو اور جو قدم قدم پر ان کی رہنمائی کرتا ہو وہ ضمیر کے خلاف اگر مجبوراً چلنا بھی چاہیں تو ہار جاتے ہیں۔ آپا کے ساتھ بھی یہی ہوا اور بچوں کی محبت، شوہر کی محبت، ضمیر کا خون اور منتشر زندگی کی تکلیف دہ کشمکش نے ان کے جسم کو گھن لگا دیا۔

جب میں نے ان کی موت کی خبر سنی تو وہ مجھے یہ کہتی ہوئی نظر آئیں" تجھے کیا پتہ میں اپنے شوہر کے استعفیٰ دے کر چلے جانے کے بعد یہاں کس طرح ہوں۔ ضمیر کے خلاف کام کرنے میں کتنی بڑی تکلیف ہوتی ہے تو اندازہ نہیں کر سکتی"۔ اور سچ مچ وہ اس تکلیف کو نہ سہہ سکیں، ان کا ضمیر جیت گیا اور وہ ہار گئیں۔

آپا کا دل بہت بڑا تھا بے حد خوبصورت اور بے لوث۔ مگر وہ کتنا غم زدہ اور کس قدر دکھی تھا، کیسی عجیب سی روحانی اور ذہنی کوفت کا انھیں سامنا کرنا پڑتا تھا، اس کا دوسروں کو بہت کم احساس ہو پاتا تھا، وہ اس بے ربط زندگی سے ہرگز مطمئن نہیں تھیں۔ جب ان کے شوہر ان کے ساتھ تھے اور وہ دونوں ملازم تھے اور آرام سے تھے تب بھی آپا کی آنکھوں میں ایک طرح

کی بے نام اداسی اور ویرانی تھی اور جب وہ تنہا رہ گئیں تو یہ اداسی اور ویرانی اور بڑھ گئی ـــــ بڑھتی گئی۔

آپا بہت بہادر تھیں انھوں نے چپکے چپکے اَن گنت دکھ سہے، انھوں نے اپنی محبت سے کسی کے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑ دیا۔ مگر جب انھیں یہ خیال آتا ہوگا کہ بال نہیں جا سکتا تو ان کے دل پر کیسی چوٹ لگتی ہوگی اور وہ دل ہی دل میں کس قدر گھٹتی اور کڑھتی ہوں گی ـــــ! ان میں بلا کی قوت برداشت تھی اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ بے حد حساس بھی تھیں پھر وہ یہ سب کیسے سہتی ہوں گی؟ ان کا جسم روز بروز سوکھتا گیا رنگ سیاہ ہوتا گیا آنکھیں اندر دھنستی گئیں۔ وہ اس تصویر سے دن بدن بالکل برعکس ہوتی گئیں۔ جو شاہدہ نے بھائی صاحب کے اشعار پڑھ کے اپنے ذہن میں بنائی تھی۔

میں جانے کیوں اکثر سوچتی ہوں کہ کاش وہ تصویر جو شاہدہ نے اپنے تصور میں بنائی تھی آپا ہی کی تصویر ہوتی اور آپا کوئی بال نہ دیکھتیں کوئی جذباتی چوٹ نہ سہتیں تو شاید وہ دن بدن تر و تازہ ہوتی جاتیں، ان کا گندمی رنگ شاید کچھ اور نکھر آتا، ان کا دل اور زیادہ مضبوط ہو جاتا اور اپنی مجبوری سے جنگ کرنے کی ان میں ہمت آ جاتی انھیں اپنے دل کے اندر بہت سی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ کاش انھیں ایک ہی لڑائی لڑنا ہوتی۔

ساری زندگی انھوں نے مسکرا کر اپنے جذبات کا خون پیا، آپا کو شراب سے سخت نفرت تھی مگر شراب اُن کے بھائی اور شوہر کی زندگی کا لازمی جزو بن گئی تھی۔ بھائی صاحب باہر بیٹھ کر شراب منگواتے اور اندر سے آپا بڑے اہتمام کے ساتھ ساری چیزیں قرینے سے لگا کر باہر بھیجتیں۔ بھائی صاحب کی محبت سے مجبور ہو کر وہ ساقی گری بھی کرتی تھیں۔

جس زمانے میں کل ہند ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہو رہی تھی آپا بے حد مصروف تھیں وہ سارے دن ہم لوگوں کے ساتھ چندہ اکٹھا کرتیں سب سے زیادہ کام اس زمانے میں انھوں نے ہی کیا تھا اور سب سے زیادہ چندہ بھی انھوں نے ہی جمع کیا تھا۔ دن بھر تھکن کے بعد انھیں رات کو بھی جاگنا پڑتا تھا اور اس سے ان کے کمزور جسم پر بہت ہی برا اثر پڑا تھا۔ بھائی صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ کبھی فلیش کھیلنے بیٹھتے تو صبح کے چار بجا دیتے، آپا ساری رات جاگ کر چائے اور دوسری چیزوں کا اہتمام کرتیں۔ حالانکہ آپا کی صحت دیکھتے ہوئے یہ ان پر ظلم تھا۔

آپا کی موت پر بھائی صاحب نے ایک نظم لکھی ہے وہ پڑھ کر میرے دل میں آرزو ہوئی کہ کاش آپا یہ نظم پڑھ سکتیں، اور بھائی صاحب کے ان گہرے جذبات کو جان سکتیں، اگر ایسا ہوتا تو شاید وہ کچھ دن اور جی جاتیں ـــ!

میں نے انھیں چند دن ہوئے خواب میں دیکھا، میں ان سے اس نظم کا تذکرہ کر رہی ہوں وہ ہنس کر اپنے اسی محبت بھرے انداز میں کہہ رہی ہیں :ـــــــ

"اچھا ـــــ سچ؟ اور سارے دن میرے سامنے اُن کا چہرہ پھرتا رہا اور وہ سوالیہ سا "سچ ـــ؟"

آپا کی شخصیت غیر معمولی تھی، جس نے اُنھیں ایک بار بھی دیکھا ہے وہ انھیں نہیں بھول سکتا ـــ یہ آپا کی ہی ہمت تھی کہ وہ چپ چاپ، اتنے بہت سے غموں کو سمیٹے رہیں اور مسکراتی رہیں۔ ہر عورت کا دل اتنا وسیع نہیں ہو سکتا۔ میدان سیاست میں مصیبت اور آلام اٹھانا آسان ہے مگر جذبات کا خون مسکرا کر پینا اور پیتے رہنا بہت مشکل ہے۔ جب کبھی میں کوئی بوجھ محسوس کرتی ہوں تو سوچتی ہوں جون آف آرک بننا آسان ہے مگر آپا بننا بہت مشکل ہے۔

(شمارہ ۲۴ ـ ۲۳ ـ ۲۲ ـــــ سنہ ۵۳ء)

ذکی انور

جب تاریکی دور ہوئی

" یہ بھی عجیب قسم کا کرفیو ہے، مستقل لعنت ہی تو ہے۔ سو فی صدی بے بسی۔ میں للتا کو دیکھ نہیں سکتا، وہ مجھے دیکھ نہیں سکتی۔ نہ میں برآمدے میں جاسکتا ہوں اور نہ وہ باہر چھت پر آسکتی ہے بس صبح سے دس بجے تک کمرے میں بند رہوں۔ دس بجے جب وہ کالج چلی جائے تو دڑبے سے نکلوں۔ اُس وقت سے چار بجے تک اِدھر اُدھر گھوم سکتا ہوں، شہر جاسکتا ہوں۔ مگر کالج روڈ سے نہیں اور نہ ڈان اسٹریٹ سے۔ چار بجے سے پھر دڑبے کے اندر۔ کھڑکیاں بند، اور کھڑکیوں پر نیلے رنگ کا جو پردہ ہے، سرکنے نہ پائے۔ رات کے وقت بھی باہر جانے کی اجازت نہیں۔ اگر سگریٹ کی خواہش ہوئی۔ ضرورتوں کا بہانہ کیا۔ جلدی جلدی دو تین کش لگائے، اور پھر بھائی جان کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر کسی کتاب پر جھک گیا۔ اُف کیا مصیبت ہے قسم اُس ذات پاک کی دنیا میں جہنم "

سوچتے سوچتے اُس کا دماغ بوکھلانے لگا۔ کمرے کی تمام کھڑکیاں اُس نے جکڑ رکھی تھیں۔ کمرہ بالکل اندھیرا تھا —— بس سگریٹ کا دھواں، تاریکی اور اُلجھے ہوئے خیالات۔ اُس کا دم جیسے گھٹ رہا تھا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ تمام کھڑکیاں ایک ایک کرکے کھول دے۔ اور چلا چلا کر کہے —— "ہم کرفیو آرڈر نہیں مانتے۔ ہم تمھارا قانون نہیں مانتے، ہم عدول حکمی کریں گے، ہم بغاوت کریں گے۔" —— اور پھر اس زندگی اور موت میں فرق ہی کیا ہے؟ اندھیری قبر تو ہے یہ، نہ ہوا نہ روشنی —— اور اُس نے سوچا کہ اگر میں نے ثواب کے کام کئے ہوتے تو آج باغ رضواں سے میرے لئے ہوا ضرور سپلائی ہوتی۔ مگر میں نے گناہ ہی کیا تھا۔ للتا سے ملنا تھا بس یہی نا۔ ہم میں ناجائز تعلقات تو تھے نہیں۔ مگر کمرہ قبر ہی بنا رہا۔ اور وہ مُردہ، کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ البتہ اُس کے دماغ میں ایک آواز گونجنے لگی —— "تیرا رب کون ہے اور تیرا دین کیا ہے؟" —— میرا رب؟ وہ چونکا اور سوچنے لگا۔ میرا رب کون ہو سکتا ہے۔ محکوموں کا رب؟ کوئی بھی تو نہیں ہوتا —— کوئی نہیں، اور دین؟ میں نے کسی مذہب کے آدمی سے دشمنی نہیں کی —— پھر میرا دین کیا ہو سکتا ہے؟ کچھ نہیں کوئی مذہب نہیں۔ مگر وہ آواز پھر گونجی جیسے اُس کے ذہن پر وہ آواز چھائی ہوئی تھی —— "ہاں —— میں انسانیت کا پیرو ہوں، میں انسان ہوں، بس اس سے آگے کچھ نہیں —— میں دنیاوی خدا کو نہیں مانتا۔ اُس خدا کو نہیں جو بلوا کراتا ہے۔ فساد کراتا ہے —— میرا خدا، میرا خدا میرا اصلی معبود ہے —" اور آواز بند ہو گئی، پھر وہی قبر کی سی تاریکی ——

ہاں ہمیں بغاوت کرنا ہی ہوگی، آخر ہم اس طرح قبر میں کب تک پڑے رہیں گے؟" مگر دوسرے ہی لمحہ اُس کے دماغ نے

پلٹا کھایا ۔ نہیں، نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ۔ خواہ میرے گوشت پوست قبر میں پڑے پڑے مٹی کیوں نہ بن جائیں، مگر میں ایسا ہرگز نہیں کر سکوں گا ۔ بھابی جان مجھے کتنا پیار کرتے ہیں ۔ اور آج اُسے یہ احساس ہوا کہ اقبالؔ نے سراسر غلط کہا تھا ۔ اُس نے زہر اُگلا تھا ۔ اُس نے آقاؤں اور خادموں کے درمیان نفاق کی ایک دیوار کھڑی کر دی تھی ۔ اُس نے کتنے ہی محکوموں کو حاکموں سے سرکش کر دیا تھا ۔ ہُنہ ــــ اس رزق سے موت اچھی، جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی ــــ واہ جی کیا فرمایا ہے آپ نے سبحان اللہ قربان جایئے ــــ چھی چھی ــــ کتنی غلط ترتیب ہے ــــــــــ کیسی غلط تعلیم دی گئی ہے ــــ اور وہ شاعروں کے متعلق سوچنے لگا ۔ یہ جتنے مشہور شاعر ہیں سب کے سب نواسی قسم کی بے کار باتیں کیا کرتے ہیں ۔ جیسے اور کوئی موضوع ہی تو نہیں ملتا ۔ ہندوستان کا ترانہ لکھیں، آزادی کا گانا لکھیں، کتنے اچھے اچھے ترانے ہیں ۔ مگر انھیں جیسے کچھ سوجھتا ہی نہیں ۔ ایک صاحب رزق کو ٹھکرانے کی تعلیم دے کر مر گئے ۔ دوسرے چلانے لگے ہندو مسلم ایک ہیں ؎

کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار کا

ــــ جی ہاں ہندو مسلم ایک ہیں! کیا مہمل سی بات کہی ہے ظالم نے ۔ اور نام دس گز کا ــــ شاعر انقلاب، وقت کا پیام جو . . . . اور کیا کیا ہیں ــــ لیکن معمولی سی بات معلوم نہیں کہ ہندو مسلم ایک ہیں یا دو ــــ کیا جواب ہے اس بکواس کا ــــ ہندو مسلم ایک ہیں ــــ واہ جی واہ جی کہاں سے دو آئے ۔ ہندو مندر میں عبادت کرتا ہے ۔ مسلمان مسجد میں، ہندو گائے کو اماں جان کہتا ہے اور مسلمان اُسے ذبح کر کے کھا جاتا ہے ۔ ہندو کا خدا اور مسلمانوں کا خدا اور ــــ ہندو کا بھگوان اذان کی آواز سُن کر اپنی اماں جان کی پیٹھ پر سوار ہوتا ہے اور سرپٹ دوڑتا ہے بھاگ جاتا ہے ۔ اور مسلمان کا خدا گھنٹے کی آواز سے نفرت کرتا ہے ۔ اور یہ موجودہ شاعر لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ اگر یہ دونوں ایک ہوتے تو پھر آئے دن، اسلام زندہ کرنے اور بھگوان کو خوش کرنے کی ضرورت ہی کیوں ہوتی ؟ دنگا، فساد، ــــ مگر کچھ بھی ہو یہ دنگا فساد ہے بڑے کام کی چیز ۔ قوم جنگ جو بنتی ہے ۔ اپنی اپنی دھاک جمانے کا موقع ملتا ہے ۔ اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہوتی ہے کہ آبادی کا ایک حصّہ تو کم ہوتا ہے ۔ ویسے ہی تو ملک میں ضرورت کی تمام چیزیں نایاب ہیں ۔ آج انڈونیشیا سے گھوڑے کے دانت جیسے بڑے بڑے مکئی آ رہے ہیں ۔ تو کل برما سے چاول، کہیں سے کپڑا بھیک مانگا جا رہا ہے تو کہیں سے کچھ اور ۔ اگر خدا اور بھگوان اپنے اپنے چیلوں کو چھوڑ کر بھاگنے نہ لگ جائیں، دھرم اور مذہب، سنکٹ اور خطرے میں نہ پڑ جائے اور ہندو مسلمان بہ آواز بلند نعرہ لگا کر خدا اور بھگوان کو واپس نہ بلانے لگ جائیں ــــ او جانے والے بالموا ــــ لوٹ کے آ لوٹ کے آ، اور جواب ملتا ہے ــــ جا میں نا تیرا بالموا ــــ بے وفا، بے وفا ــــ بے وفاؤ دنگا کرو، فساد کرو، ہمیں پھر سے زندہ کرو ورنہ ہم واپس نہیں آتے ــــ بولو بجے رنگ بلی کی جے ــــ نعرۂ تکبیر اللہ اکبر ــــ یہ مرا، یہ مارا، وہ شہید، وہ سُرگ باش ــــ ایک دو دس ــــ سو ہزار پانچ سو ــــ پھر کرفیو آرڈر ــــ مگر کیا ہوا! اچھا ہی تو ہوا ۔ اگر یہ مرا نہ کریں اور اگر بھابی جان جیسی کروڑوں عورتیں دنیا میں موجود رہیں جب تو ہندوستان کا اللہ ہی حافظ ہے چاول سونگھنے تک کو بھی نہیں ملے ۔ آج کو تو اتنی بات ہے ۔ رہے نام بلیک مارکیٹ کا ۔ کچھ نہ کچھ مل تو جاتا ہے ۔ لیکن اگر آبادی نہیں گھٹے، اور ہر سال کروڑوں بھابی جان جیسی عورتیں سالانہ نمبر شائع کرتی رہیں جب تو قحط عظیم آ جائے ــــ"

اور اُس نے سوچا ــــ یہ بھابی جان بھی عجیب مصیبت ہیں ۔ ہر سال ایک نیا اجرا کبھی ناغہ ہی نہیں ہوتا ۔ جیسے دیپک

کا سال گرہ نمبر ہی تو ہے ۔ لیکن " دیپک "؟ ـــ دیپک ہے بھی بہت مشہور رسالہ ـــ جنگ کے زمانے میں ادبِ لطیف کی ضخامت کم ہو گئی ' ہمایوں دُبلا ہو گیا ـــ حکومت نے کاغذ میں بہت تخفیف کردی ۔ اور بے چارے چمنستان نے تو جل بھن کر کہا چند روز اور میری جان فقط چند ہی روز ـــ لیکن یہ چند روز تو ختم بھی ہو گئے ۔ اور " میری جان " رخصت بھی ہو گئی ـــ تو پھر کیا ہوا ـــ سویرا بند ـــ ادبِ لطیف بند ـــ نقوش بند ـــ بند بند بند ' اچھا ہوا حکومت نے بند کر دیئے ' بہت خوب ہوا ' یہ بے کار بے کار پرچے ۔ بس وہی مرغی کی ایک ٹانگ ـــ غریب ' امیر ' مزدور ' کسان ' سرمایہ دار ۔ اور دوسری طرف " دیپک " ـــ " بھارت ورت " ـــ " کوشان " ـــ " فلم سائڈ " ـــ کیا مجال جو ان پرچوں کا بال بھی بیکا ہوا ہو ۔ جنگ کے زمانے میں بھی برابر نئے نئے نمبر نکلتے ہی رہے ہے ـــ عید نمبر ' ہولی نمبر ' ایکٹرس نمبر ' افسانہ نمبر ' اور ایسا ہو بھی کیوں نہیں ' آخر قحط کے زمانے میں بڑے بڑے لوگوں پر بھی قحط کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا ۔ عید منائی جا رہی تھی ' ہولی منائی جا رہی تھی ' بسنت ' شب برات ' دیوالی سب ہی کچھ تو تھا ۔ تھوڑے ہی وہ کنگال تھے ۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا ' موج اڑاتے تھے اڑاتے رہے ۔ یہ اور بات ہے کہ قحط زدہ عورتوں پر انھیں رحم آنے لگا تھا ۔ اور اکثر ردّی ' ساری دینے کے لئے نوکر سے انھیں بلوا لیا کرتے تھے " ـــ

کرفیو آڈر ـــ فساد ـــ للتا ـــ دیپک ـــ ادبِ لطیف ...... اُسے اپنے خیالات کے بے ہنگم بہاؤ پر ہنسی آ گئی ۔ کیا حماقت ہے ۔

" کھٹ کھٹ کھٹ ـــ ڈاک ساب " ـــ

اُس نے کھڑکی کھول دی ۔ ڈاکیے نے چند خطوط ' ایک اخبار اور دو تین معمولی معمولی ' قحط زدہ بھوکوں جیسے رسالے اُس کے حوالے کر دیئے ۔ جن کی ہئیت میں جنگ ختم ہو جانے ' میری جان کے دفع ہو جانے اور اپنی آزاد حکومت ہو جانے کے باوجود کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی ۔ وہی معمولی سا سرورق ' وہی رف کاغذ اور اُسے محسوس ہوا کہ کنگال اب تک اپنی دھنسی دھنسی آنکھیں اور مکروہ جسم لئے رینگتے پھر رہے ہیں ۔ اور اُسے بھائی جان پر قدرے غصّہ بھی آیا ـــ آخر وہ ایسے ایسے پرچے پڑھتے ہی کیوں ہیں؟ نہ صورت نہ شکل ' کہیں لے کر گھوما جائے تو اپنی بے عزتی ـــ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ چھوٹا منہ بڑی بات ۔ اگر کنگالیوں کے دل اندر بیٹھ کر دیکھیے تو آپ کو احساس ہوگا کہ " بابو " کہہ کر عاجزی کے ساتھ ہاتھ بڑھا دینے والا حقیر بھکاری اپنے دل میں " بابوؤں " کے خلاف عجیب عجیب باتیں سوچا کرتا ہے ۔ جیسے " بابو " کو کچا ہی تو نگل جائے گا ۔ ٹھیک یہی حالت ہے ان خستہ حال رسالوں کی ' پڑھیے تو بس ہنسی آئے گی ـــ یہ آزادی ' " آزادی " لفظ کی توہین ہے ـــ کون آزاد ہوا ' کس کے ماتھے سے غلامی کی سیاہی چھوٹی ـــ ہمیں سرمایہ داروں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے کی ضرورت ہے ـــ خوش حالی کی زندگی ہمارا پیدائشی حق ہے ۔ وغیرہ ـــ بھئی واہ گز بھر کی زبان ہے بکے جاؤ ' اور اگر حکومت پرچہ ضبط کرلے ' ضمانت طلب کرے تو نانی یاد آ جائے ۔

یہ بھی کوئی رسالہ ہوا ؟ شریف آدمیوں کے پڑھنے کا ـــ کیا پتہ ہے حکومت پڑھنے والے کو بھی پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت ٹھیل دے ۔ پرچے تو ہیں ' " دیپک " " کوشیان " ' بھارت ورت " فلم سائڈ ـــ سبحان اللہ ' سبحان اللہ ـــ اور یہ پرچے ؟ کتنا پست ذوق ہے ' نہ سرورق پر کسی حسین ایکٹرس کی تصویر ' نہ اندر عشاق کے خطوط ' ہماری ڈاک ' سوال جواب ـــ نسیم کب تک چلے گی بیگم پارہ کا کون سا مہینہ ہے میں مٹھائی بھیجوں گا ' ان ایکٹرسوں کو ان کے سینے کے لحاظ سے نمبر دیجیے ۔ وغیرہ اور پھر فلموں پر عمیق تبصرہ ' مدلل بحثیں ـــ

مگر یہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ نہ ثریا بانو کی معیاری نظمیں اور افسانے نہ کوئی اور ہی پڑھنے کا کالم۔ اُس نے بے دلی سے اُنھیں پٹک دیا۔ مگر ایک پرچے کو ابھی اُس نے نہیں کھولا تھا۔ وہ اب تک میز پر لپٹا ہوا پڑا تھا۔ اُس نے پیکٹ اٹھالیا۔ جھٹ سے اُسے کھولا۔ نظام بمبئی ـــ سرورق پر تصویر تو تھی مگر ملاحظہ فرمایئے دو بھکاریوں کی۔ اُسے ہنسی ـــ آنے لگی، جیسے ہندوستان میں بھکاری عنقا ہی تو ہیں کہ جناب ایڈیٹر صاحب مدظلہ' العالی نے اُن کی تصویر چھاپ کر شیر مار لیا۔ بھکاری ـــ بھکاری تو ہندوستان کی خاص پیداوار ہے۔ جیسے مکئی، جوار، باجرا، چاول، ہاتھی، سونا، چاندی، چیڑ، خہ گڑھ، کوئلہ، لوہا، ابرک، کلرک، لیڈر، مزدور، فلم ایکٹرس، فلمی رسالے، وغیرہ ویسے ہی تو بھکاری بھی یہاں کی خاص پیداوار ہے۔ بلکہ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اگر دنیا کا ۹/۷ لوہا اور ۹/۱۰ کوئلہ پیدا ہوتا ہے تو ۹۹/۱۰۰ بھکاری بھی۔ پھر کیا کمال ہو گیا کہ سرورق پر دو بھکاریوں کی تصویر چھاپ دی گئی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کوئی ایکٹرس بے چارے ایڈیٹر صاحب کو " To The Editor Nizam, With the best Compliment of .... " لکھ کر اپنی تصویر، نہ بھیجتی ہوگی۔ خیر سے ـــ دوسرے سرورق پر نرگس کی تصویر تھی۔ لیکن کیا خاک؟ کوئی خاص بات نہیں نہ تو سینے کے اُبھار کی نمائش نہ لبوں پر مسکراہٹ اور نہ ہی تصویر کے نیچے کوئی شعر آخر امی نرگس کی تصویر دوسرے رسالوں میں بھی تو چھپ چکی ہے۔ کتنے اچھے طریقے سے، الڑھکے الڑھکے ڈھنگ سے۔

وہ جلدی جلدی ورق الٹنے لگا۔ اندر وہی مہمل بکواس جس سے اُسے سخت نفرت تھی ـــ کیا ہے جناب؟ تو ـ "یہ کشمیر ہے" اور اُس نے سوچا کہ اب آگے لکھا ہے گا ـــ یہ کشمیر ہے، اب آپ کشمیری میں خبریں سنیں گے۔ اس وقت شام کے ساڑھے پانچ بجے ہیں تمام کشمیر پر سرخ شفق چھا جانے کو ہے۔ چنار کے لال لال درخت . . . .

" اُف،، وہ بھرا نے آپ پر ہنسا، " میرا دماغ خراب ہو جائے گا کیا؟" اور پھر ورق الٹنے لگا۔ اُس نے سر ہی تو پیٹ لیا۔ کیا کاغذ کی بربادی ہے۔ کیسی واہیات واہیات چیزیں ہیں ـــ " پاکستان اور ہندوستان کا منظر" ـــ کیا بچوں کی سی بات ہے ـــ پاکستان اور ہندوستان کا منظر دکھانے کے لئے ابھی تک اُن کو اتنا بڑا آرٹیکل لکھنا ہی پڑا ـــ بس اتنی سی تو حقیقت ہے کہ پاکستان بھی بن گیا۔ ہندوستان بھی اور ان دونوں کے مجموعہ سے وہ اپنا پہلا ہندوستان " پاکھنڈستان " بن گیا اتنی آسان بات کے لئے اتنا بڑا آرٹیکل ـــ ے دے کر اگر کوئی چیز ملی تو " رنگ ترنگ " وہ بھی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ آخر دوسرے رسالوں کے بھی تو مزاحیہ کالم ہوتے ہیں۔ ـــ نینا ایک انگیہ ہے جو بار بار ڈھلنے پر بھی نہ پھٹے ـــ بیگم پارہ ایک گیند ہے جو ہوا بھرے بغیر اچھل سکتی ہے ـــ شمیم کیا ہے ـــ نسیم کیا ہے؟ وغیرہ ـــ"

"اچھا صاحب آگے چلئے ـــ تو " بحث و تنقید " چھوڑیئے بھی تو کیا ہے؟ ــ" نظام فن کاروں کی نظر میں " ـــ بھئی واہ جیسا آپ کا فن، ویسے آپ کے فن کار، اور ویسی ہی اُن کی نظر بے سر پاؤں کے افسانے، اور لغو نظمیں، کھانا کھانے کے بعد پڑھو اور اُلٹی نہ ہو جائے تو جو سزا لیڈر کی، ارے توبہ جو سزا چور کی سو میری، لاش، خون، پیپ، واہ ری شاعری ـــ جیسے میدانِ جنگ ہی تو ہے۔ بندوق، گولی، یا نہیں تو پھر، فقیروں کی ٹولی ـــ بھوک، افلاس، تباہی ـــ نہیں تو پھر ہنڈال ـــ مزدور، کسان، انقلاب اور لال جھنڈا ـــ نہ حسن، نہ عشق، نہ پتلی کمر، نہ ہجر کی راتیں، نہ وصال کی آدھی رات ـــ کیا شاعری ہو گئی ـــ خوب خوب ـــ"

یکایک اُسے نظام کی تاریخ نظر آ گئی ۹ دسمبر ۱۹۴۷ء، اور اس کا جی چاہا کہ زور سے نعرہ لگائے شوکت تھانوی زندہ باد۔

دنیا کا سب سے بڑا نجومی زندہ باد۔ لیکن پھر اُس نے سوچا ذرا پیکٹ پر کی مہر تو دیکھوں —— ۱۲ر دسمبر ۱۹۴۲ء تو گویا ۱۲ر دسمبر ۱۹۴۲ء کو وہ پرچہ بمبئی سے روانہ ہو چکا ہے۔ اور آج ۲ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کو ملتا ہے۔ حالانکہ اب نظام ہجرت کرکے پاکستان بھی جا چکا ہے اُسے محکمۂ ڈاک پر ہنسی آنے لگی، پھر اُس نے سوچا جانے دو، سودیشی ہی ڈاک تو ٹھہری۔ اور اُس نے پرچہ کو بند کرکے میز پر رکھ دیا۔ آخر پڑھنا ہی کیا؟ اُس نے صرف اُس کی سیاحی کی مدت حساب لگا کر نکال لی —— ایک سال تو بیتنے 'دو روز' "چلو کبھی بھی ملتا مجھے اس سے غرض ہی کیا ہے "۔

کمرہ بالکل تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ اُس نے سگرٹ سلگایا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ کھڑکی کھول لے۔ مگر ہمت نہ ہو رہی تھی اُس نے سوچا تھا کہ بس ایک ہی دفعہ شام کے وقت کمرے سے باہر نکلے گا۔ گو یہ بات بھی بھائی جان کے کرفیو کی خلاف حکمی تھی۔ مگر وہ للتا سے تھوڑا ہی ملے گا؛ لیکن سر دست تو کھڑکی کھولنا مصیبت تھی۔ شاید وہ باہر ٹہل رہی ہو۔ اور اگر دروازہ کھولے اور وہ چھت پر ہو جب بھی مصیبت۔ للتا پر بھی پروفیسر صاحب نے کرفیو لگایا تھا۔ مگر زیادہ سختی نہ تھی۔ اس لیے عین ممکن تھا کہ دروازہ یا کھڑکی کھولے اور وہ نظر آ ہی جائے۔

کمرے میں سگرٹ کا دھواں پھیل گیا تھا۔ اور اُس کے دماغ میں جیسے کہر سا چھایا ہوا تھا۔ کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ کرے تو کیا کرے؟ وہ غیر ارادی طور پر دروازے کی طرف بڑھا۔ اور پھر رُک گیا —— "اگر اب کے بھائی جان سن بس گے کہ میں نے پھر للتا کو دیکھا جب تو گالیاں ہی کھانی پڑیں گی۔ گولیاں کھا کے تو خیر آدمی کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ چلو ہمیشہ کے ڈر سے نجات ملی۔ مگر بھائی جان کی وہ تلخ تلخ گالیاں —— خدا کی پناہ 'اُٹھتے بیٹھتے'۔ اور اُس نے سوچا واقعی عدول حکمی بہت بڑا گناہ ہے۔

اور وہ کوچ پر گر پڑا۔ سگرٹ کا دھواں عجیب عجیب شکلیں بناتا اور پھر بکھر جاتا —— "ہندو، مسلمان، لیگ، کانگریس، دنگا فساد پھر کچھ بھی نہیں۔ انسان کوئی بھی نہیں —— اور یہ دھواں بھی نئی نئی شکلیں بنا کر غائب ہو جاتا ہے یہ تو منجمد نہیں ہوتا۔ کاش یہ منجمد ہو سکتا۔

وہ سوچتے سوچتے رُک گیا۔ للتا شاید اپنے برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ اُس کی موسیقی بھری آواز کی خفیف سی لہر اُس کے کمرے کے اندر بھی آ رہی تھی۔ وہ اپنا مشہور اور پسندیدہ شعر گا رہی تھی ۔

اُٹھ سرخ سویرا ہوتا ہے

فطرت کا عَلَم لہراتا ہے

اُس کا دماغ جیسے بڑی تیزی سے گھومنے لگا —— "دنیا ایک محور پر گھومتی ہے 'بچو! محور ایک فرضی کھونٹی ہے"۔ اُسے اسکول میں آج سے بہت دن پہلے، بڑی بڑی مونچھوں والے ماسٹر صاحب نے بتایا تھا۔ اُس کا دماغ بھی تو ایک محور ہی پر گھوم رہا تھا۔ بالکل فرضی کھونٹی پر' بھائی جان نے فرض ہی تو کر لیا تھا کہ وہ للتا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن چونکہ اُن دونوں کے مذہب جدا جدا ہیں۔ اس لئے اگر وہ للتا کو پا نہیں سکا تو اُسے دق ہو جائے گی۔ اور اسی شک کی بنا پر اُن پر کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔ جیسے للتا دق کا کیڑا ہی تو تھی۔ کھڑکی یا دروازہ کھلا نہیں کہ اُس کے پھیپھڑے کے اندر سما یا وہ کیڑا۔

اب کمرہ بالکل اندھیرا ہو گیا تھا۔ اُس نے روشنی کا بٹن دبا دیا۔ کمرہ جگمگا گیا —— اور دھواں غائب —— شاید ہندو مسلمان سب کے سب مر گئے۔ صرف روشنی رہ گئی۔ مگر دھواں غائب کہاں ہو گیا؟ کھڑکیاں اور دروازے بھی تو بند ہیں۔ اُسے خود اپنے

اور پر غصّہ آرہا تھا۔ آخر اُس نے بند کیا ہی کیوں ؟ یہ بھی کوئی زندگی میں زندگی ہے۔ اور اُسے محسوس ہوا کہ کوئی زور زور سے چلّا رہا ہے ـــــ اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی' جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی ـــــ اور اُس نے دل میں کہا ـــــ "خوب چلّاؤ اور زور سے چلّاؤ جی چاہو تو مائیکروفون پر چلّاؤ مگر میں دروازہ نہیں کھول سکتا۔ میں کھڑکی نہیں کھول سکتا اور نہ باہر جا سکتا ـــ ایک تو بھائی جان کے حکم کے خلاف ـــ دوسرے میں خود ِللتا سے نفرت کرتا ہوں میں اُس کی صورت دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ بے وقوف لڑکی، کہتی ہے۔ بی اے کرنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کی ہول ٹائم ورکر بنے گی' اور مزا تو یہ ہے کہ مجھے بھی دعوت دیتی ہے۔ واہ ری لڑکی جیسے میں گھر سے فالتو ہی تو ہوں۔ یا میرا بھی سر ہی تو پھر گیا ہے۔" اُسے للتا کی بات یاد کرکے اُس پر غصّہ آرہا تھا۔ ہنہ ـــ "میرا یہ آخری اور اٹل فیصلہ ہے سنسار کی کوئی شکتی مجھے روک نہیں سکتی ـــ" پڑھی لکھی ہوتے بھی حد سے زیادہ احمق جانور ـــ

اب بالکل شام ہوگئی تھی۔ بند بند اُس کی طبیعت بہت اُکتا گئی تھی۔ اُس نے گھڑی کو دیکھا۔ ارے توبہ ابھی تو چھ ہی تو بجے تھے۔ اُس نے سوچا ابھی تو وہ ضرور ٹہل رہی ہوگی۔ آسمان پر شفق پھولی ہوگی اور شفق سے اُسے کتنا پیار ہے۔ اُس کی تمام نظموں میں شفق کا تذکرہ ہوتا تھا۔ اور اُس کی ایک نظم "پھولی شفق ہے سہانی" بہت مقبول ہوئی تھی۔

کمرے میں مچھر بھن بھنانے لگے۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سب کے سب پکار پکار کر کہہ رہے ہوں۔ "کرفیو آرڈر ـــ چوبیس گھنٹے کا کرفیو آرڈر ـــ" "یا اللہ یہ کرفیو آخر ختم بھی ہوگا ؟ اچھا کرتا جو میں ہوسٹل ہی میں چھٹی گزار دیتا۔" اور وہ اپنے آپ کو حد درجہ قابل رحم سمجھنے لگا۔ اللہ میاں! آج شام بھی نہیں ہوگی کیا ؟ اُس نے ایک اور سگرٹ سلگا لیا۔ پھر ـــــ

"کھٹ کھٹ کھٹ"

کسی نے دروازے پر دستک دی اور وہ چونک گیا۔ ایں ـــ! پروفیسر صاحب ؟ وہ اچنبھے میں آگیا۔ پروفیسر صاحب اب اُس سے بات چیت نہیں کرتے تھے۔ وہ اُن کی ناک جو کاٹنے کو تھا۔ جیسے وہ اُن کی لڑکی کو نگل ہی تو جاتا ـــ مگر یہ کیوں آئے۔ اُس کے منہ سے نکل گیا۔

"کیا کرفیو ختم ہوگیا ؟ ـــ"

"جی نہیں ـــ" انھوں نے جواب دیا اور پھر بولے "شہر میں گولی چل گئی ہے' کرفیو لگ گیا ہے"

"کیوں' کیا ہوا ؟" ـــ وہ گھبرایا۔

"طالب علموں' مزدوروں اور عوام نے مل کر جلوس نکالا تھا اور مطالبہ کیا تھا کہ عوام کے رہنما رہا کر دیے جائیں"

"تو پھر گولی کیوں چلی ؟" وہ اور پریشان ہوگیا۔

"بس چل گئی ـــ کیونکہ حکومت اس کام کو آسانی سے انجام دے سکتی تھی' اور رہنماؤں کو رہا کرنا مشکل ہوگا" پروفیسر صاحب اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ بولے۔

وہ حیران تھا کہ پھر مجھ سے کہنے کی کیا ضرورت ـــ لیکن وہ یہ پوچھنا ہی چاہ رہا تھا کہ اتنے میں للتا آگئی۔ اُس کا ارادہ ہوا کہ کمرے کے اندر جاکر دروازہ بند کرلے۔ مگر وہ ایسا نہ کرسکا۔

پروفیسر صاحب بولے ـــ

"عوام کے بہت سارے آدمی مارے گئے ہیں۔ اور بہت سے زخمی ہیں۔"

"تو میں کیا کروں؟ ــــ" اُس کے منھ سے نکل گیا۔ اور للتا اور پروفیسر صاحب "میں کیا کروں" کو بار بار دہرا کر ہنسنے لگے اور وہ پریشانی کے عالم میں دونوں کو تکتا رہا۔ اتنے میں للتا کے پھاٹک پر ایک کار آکر رکی۔ وہ یہ کار پہچانتا تھا۔ وہ کار زینت کی تھی۔ اُس سے زینت اور روبی نکلیں اور دونوں دوڑ کر للتا کے پاس آئیں۔ اور اسے کھینچ کر لے بھاگیں۔ تینوں کار میں بیٹھ گئیں اور کار چل دی ــــ پروفیسر صاحب "میں کیا کروں" کو بہت حقارت کے ساتھ دُہراتے ہوئے چلے گئے۔

اور وہ یہ سوچ کر تعجب کر رہا تھا کہ "کل تک پروفیسر صاحب زینت اور روبی کو آوارہ لڑکیاں کہتے تھے۔ کیا مجال جو للتا پروفیسر صاحب کی موجودگی میں اُن سے بات بھی کرلے۔ اور پھر للتا پروفیسر صاحب کی موجودگی میں میرے سامنے آ گئی؟ یہ سب کچھ کیا ہوگیا آخر پروفیسر صاحب میں ایسی تبدیلی؟ ــــ کیوں؟" مگر وہ سمجھ نہ سکا۔

اتنے میں آواز آنے لگی ــــــ

"شہر میں چوبیس گھنٹے کا کرفیو لگایا جاتا ہے۔ شہر میں چوبیس گھنٹے ......" مائیکروفون کے ذریعے اعلان کیا جارہا تھا۔ وہ گاڑی جس میں مائیکروفون لگا تھا۔ اعلان کرتی ہوئی آگے چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک دوسری گاڑی سڑک سے گزرتے گزرتے ٹھیک اُس کے بنگلے کے پاس رُکی۔ اور چلّانے لگی ــــ

"یہ جنگ آپ کی اپنی جنگ ہے ــــ یہ مطالبہ آپ کا اپنا مطالبہ ہے۔ یہ مظاہرہ آپ کا اپنا مظاہرہ ہے ــــ امیری اور غریبی کی جنگ، آزادی اور خوش حالی کا مطالبہ، بھوک اور افلاس کا مظاہرہ ــــ آیئے ہمارا ساتھ دیجئے۔ یہ ادارہ آپ کا اپنا ادارہ ہے ــــ مزدوروں، کسانوں اور غریبوں کا ادارہ ــــ نعرہ لگایئے ــــ ہم سچی آزادی چاہتے ہیں ــــ ہم نئی زندگی چاہتے ہیں ــــ نیا ہندوستان کو ہم اور آپ جنم دیں گے ــــ آیئے ہمارا ......"

یہ گاڑی بھی آگے چلی گئی ــــــ

وہ کچھ دیر کوچ پر پڑا رہا۔ پھر بے تابی سے اٹھا۔ دروازہ کھول کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ اور پھر تیزی کے ساتھ آگے سڑک پر بڑھنے لگا۔ راستے میں اُس نے دیکھا اُس کے بھائی جان رکشے سے آرہے ہیں۔ انھوں نے کہا ــــــ

"کہاں چلے شہر میں کرفیو لگ گیا ہے۔"

مگر اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آگے بڑھ گیا۔ اُس کے بھائی جان نے اُسے زور سے پکارا۔ مگر وہ آگے بڑھتا جارہا تھا اُس کے بھائی جان اُسے دیکھتے رہے۔ آگے قریب ایک فرلانگ والے موڑ پر وہ گاڑی اب تک کھڑی تھی۔ اور آواز آرہی تھی ــــــ

"آیئے ہمارا ساتھ دیجئے ــــــ یہ جنگ ...."

اور انھوں نے دیکھا کہ وہ بڑھتا جارہا تھا۔ بڑھتا جارہا تھا۔ پھر جب وہ گاڑی کے پاس پہنچا تو گاڑی کا دروازہ کھلا اور وہ اس میں سما گیا۔ آواز اب تک آرہی تھی .... یہ ادارہ آپ کا اپنا ادارہ ہے ــــ مزدوروں، کسانوں اور غریبوں کا ادارہ ......"

(فروری سنہ ۴۹ء)

جیلانی بانو

جادوگر لمحے

کیا وقت انسان پر خدائی کرتا ہے؟

آپ نہ مانیں، لیکن میں تو وقت کے آگے سر جھکا چکی ہوں۔ ہمارے آس پاس ضرور کوئی انجانی قوت ہے۔ ایک ملکوتی وجود جو چاہے تو ہمیں موم کی طرح پگھلا کے چاہے کسی شکل میں ڈھال دے۔ ہم اپنے اختیار میں کب ہیں ــــــ!

میں تو زبان ہلانے اور ہاتھ اٹھانے کی قوت بھی کھو چکی ہوں۔ کوئی سحر مجھے پتھر بنا گیا ہے۔ یہ ساری باتیں گیلی لکڑیوں کی آنچ بن کر میرے دل میں سلگا کرتی ہیں۔ مگر میں اپنے دل کا حال کسی کو نہیں سناتی۔ ایسے لوگ کہاں ہیں جو میری صورت دیکھ کر نفرت سے منہ نہ پھیر لیں۔ یہاں تو سب نے سارہ کے آنسو دیکھے ہیں۔ ہادی کی چیخیں سنی ہیں کہ اس کی بیوی اپنے ہونے والے بہنوئی کے ساتھ بھاگ گئی۔

کبھی کسی نے ایسی بات سنی ہو گی! میں خود اس ذکر پہ لرز جاتی ہوں ــــــ آج سے پہلے مجھے کوئی ایسی کہانی سناتا، تو ہرگز یقین نہ کرتی ــــــ توبہ! غضب خدا کا ــــــ چھوٹی بہن کی خوشیاں لوٹ لیں ــــــ اور وہ بھی کس نے: بیاہتا، ایک بچے کی ماں جیسی بہن نے ــــــ ہائے اللہ کیسا تعجب خیز واقعہ ہے۔ قیامتی وقت آ گیا ہے ــــــ نہیں قیامت آج کہاں ہے ــــــ قیامت تو میرے سر سے گذر چکی ہے۔

میں کس کس کا ہاتھ پکڑ کے یہ کہانی سناتی پھروں کہ میں نے کچھ نہیں چرایا۔ ڈاکہ تو میری دنیا پہ پڑا ہے۔ اب تو یاد بھی نہیں ہے کہ اس کہانی میں اصل کہاں ہے۔ نقل کیا ہے۔ لوگوں نے اپنی داستان طرازی کے اتنے رنگوں میں یہ بات ڈبوئی ہے کہ میں خود حیران ہوں۔ پلٹ کر عشرت کی طرف دیکھتی ہوں تو وہ بھی دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا ہے۔

اگر اس دن ہادی نہ آ جاتے۔ اگر عشرت کا بیاہ سارہ سے ہو بھی جاتا تو کیا ہرج تھا۔ میں اپنی اتنی پیاری بہن کی بیری تو نہ تھی۔ میں تو صرف ان دونوں کا غرور توڑنا چاہتی تھی ــــــ یہ توڑ پھوڑ کا کھیل بھی کیسا خطرناک ہوتا ہے۔ اس کھیل میں میں نے اپنی ہر چیز توڑ ڈالی ــــــ اور اب اس بچے کی طرح اکیلی بیٹھی ہوں جسے سب بچے لوٹ کر بھاگ گئے ہوں ــــــ!

اس دن عشرت کے ساتھ کار میں سوار ہوتے وقت تو میں نے یہی سوچا تھا کہ میں اپنی معصوم بہن کے ساتھ دھوکے بازی نہیں کروں گی۔ اس کی امانت میں جو خیانت کی ہے اس کا پرائشچت کروں گی ــــــ مگر اتنی سی بھول کا پرائشچت کیا ہے۔

جیون بھر کے آنسو ـــــ مستقبل کا اندھا غار اور زندگی کی راکھ ـــــ کون جانے سارہ آج بھی کہیں جیتی ہے۔ خدا نے اس کی خوشیاں چرالیں۔ اس کے خوب صورت خواب توڑ ڈالے۔ اس کی زندگی میں اندھیرا اور سرگوشیاں ہوں گی ـــــ کیا پتہ سارہ آج بھی بھیگی ہوئی آنکھوں سے یہ کہانی سب کو سناتی ہو۔ پیچ سے کہتی ہو کہ تیری ماں نے میرے اور تیرے پیار کے رشتے کو اپنی ہوس کے پاؤں سے روند ڈالے۔

سارہ کتنی معصوم تھی۔ کتنی جذباتی۔ وہ اکثر مجھ سے تنہائی میں پوچھتی تھی۔

"اپیا، میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس مرد کو کیسے ڈھونڈوں گی جو ہمیشہ سے صرف میرا ہی انتظار کر رہا ہو ـــــ اور ہمیشہ میرا ہی رہے گا!"

تب میں ایک محبت کرنے والے میاں کی مغرور بیوی بن کر اسے جواب دیتی تھی ـــــ "اری پگلی مرد کی تو ذات ہی ہرجائی ہوتی ہے۔ وہ شادی سے پہلے چاہے کچھ کریں، مگر شادی کے بعد تو ہر مرد صرف بیوی کا ہو جاتا ہے جیسے ہادی ہیں۔ تو میں خدا کے بعد ان کی نیت پر ایمان لاسکتی ہوں۔"

"تو صرف جسم ہی ملے تو کیا ملا۔" اس نے بڑی حقارت سے کہا۔

"اچھا تو بنو میں تیرے لئے ایسا ہی دولہا ڈھونڈوں گی جو کوری صراحی کی طرح پاک ہو۔ پیدا ہوتے ہی میری سارہ کے انتظار میں آنکھیں میچے بیٹھا ہو۔"

پھر ہم دونوں ہنسنے لگے۔

جانے کیوں مردوں کے معاملے میں سارہ کی نظر اتنی اونچی تھی کہ کہیں پر نہ ٹھیرتی۔ بعض وقت مجھے اس کے غرور پر غصہ آنے لگتا تھا۔

ان دنوں بابا دہرہ دون میں تھے۔ ہمارا گھر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر تھا۔ نیچے کھیت اور باغ پھیلے ہوئے تھے ـــــ اس لئے شادی کے بعد میں پہلی بار ہادی کے ساتھ بمبئی سے آئی تو ہادی کو یہ جگہ بہت پسند آئی۔ دن بھر ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے باغوں میں گھومتے پھرتے۔ راتوں کو تالاب کے کنارے ایک دوسرے پر پانی اچھالتے اور چاندنی میں نہانے نکل کھڑے ہوتے۔ بچاری سارہ اکیلی کمروں میں ڈولتی پھرتی۔ ہم سارہ کو ساتھ چلنے کے لئے کہتے تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتی تھی۔ کبھی اکیلے میں وہ ہنستے ہنستے کہتی تھی۔

"اپیا تجھے کیا پسند آگیا ہے یہ کالا کلوٹا آدمی۔ ایک منٹ کو اکیلا نہیں چھوڑتا۔ میرا تو دل گھبرا جائے ایسے آدمی سے۔"

اور میں جھوٹ موٹ غصے میں آجاتی تھی۔

"اچھا بنو وقت آنے دو ہم بھی دیکھیں گے کہ تجھے کیسا چاند سا دولہا ملے گا!"

سارہ مجھ سے اتنے قریب تھی کہ ہم نے کبھی اپنے دل کی باتیں اپنے لئے نہ رکھیں۔ میں نے تو ایسی محبت کہیں بہنوں میں نہ دیکھی شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارا اور کوئی بہن بھائی نہ تھا۔ نہ ہم نے سہیلیاں بنائیں۔ بس ایک دوسرے کو تھامے رہتے۔ ایک سے کپڑے پہنتے۔ ایک ساتھ بیٹھتے۔ ساتھ گھومنے جاتے۔ لوگ کہتے تھے ہماری صورتیں بھی ایک سی تھیں۔ بعض وقت اتنی ہنس کر کہتی تھیں کہ دونوں کو دولہے بھی ایک جیسے نہیں ملے تو ایک، دوسری کا دولہا چھین لیں گی۔

لیکن سارہ بڑی مغرور تھی۔ اسے اپنے حسن پر ناز تھا، اور وہ میک اپ کے نئے نئے انداز ڈھونڈ نکالتی تھی۔ کالج کے دنوں میں

مجھ پر تو کئی لڑکوں نے ریجھایا مگر سارہ نے کبھی کسی طرف نظر نہ اٹھائی ۔ وہ شہزادیوں کے انداز میں چلتی تھی، جیسے وہ اپنے آس پاس کے پیچھے چلنے والوں سے بہت بلند ہو ۔

امّی کہتی تھیں کہ میری لڑکیاں تو شہزادیوں کی صورت ہیں ۔ مگر یہ صرف امّاں ہی کا کہنا تھا ۔ جانے ہماری صورتوں میں کون سی کشش تھی کہ راہ چلتے لوگ ٹھٹک جاتے تھے ۔ جو بھی دیکھتا بس دیکھتے ہی جاتا ۔

بابا فوج میں کرنل تھے ۔ اس لئے ان کی ہر بات طے شدہ پروگرام کے مطابق ہوتی تھی ۔ ورنہ ہم دونوں ہائی اسکول بھی پاس نہ کر پائے تھے کہ ہنگاموں کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔ لیکن بابا نے سوچ لیا تھا کہ ہماری شادیاں بی اے کے بعد ہوں گی مگر ہمیں یوں جلدی جلدی بڑھتا دیکھ کر وہ نڈھال ہو جاتے تھے ۔ اور دن میں کئی کئی بار امّی سے پوچھتے ——

"اب حمرا کو کون سا برس لگا ؟"

بابا کے ان سوالوں سے تنگ آ کر میرے بی اے کا رزلٹ آتے ہی امّی نے میرے بیاہ کا شور مچا دیا ۔ بابا نے کنوؤں میں جال ڈالے تھے میرے دولہا کے لئے ۔ اور سچ مچ ہادی ایسے ہی نکلے ۔ امریکہ ہو آئے تھے ۔ بمبئی کی ایک بہت بڑی فرم کے ڈائرکٹر تھے ۔ اور پھر مزاج کے ایسے کہ بالکل موم ۔ صورت شکل بھی بری نہ تھی ۔ رنگ کہہ لو کہ ذرا صاف نہ تھا ۔ لیکن ان کی محبت میں ڈوب کر مجھے کبھی ان کا رنگ سیاہ نہ لگا ۔

سارہ کے مذاق پر مجھے ہمیشہ ہنسی آتی تھی ۔ میں بمبئی گئی تو ہادی نے مجھے سارہ تک بھلا دی ۔ ویسے اس کے خط پڑھ پڑھ کر ہادی نے کئی بار اسے بمبئی آنے کی دعوت دی ۔ مگر اسے دولہا بھائی سے بے حد شرم آتی تھی ۔ وہ میرے بغیر اکیلی گھر میں روتی پھرتی ۔ مگر میری خوشیوں سے بہت خوش تھی ۔

اپیا، کیا دولہا بھائی صرف تیرے ہی ہیں ۔ تجھے کبھی ان پر کوئی شک تو نہیں ہوا ؟

مجھے سارہ کے ان معصوم اندیشوں پر ہنسی آ جاتی تھی، اور میں اس کے سرخ گال چوم کر کہتی ——

"سارہ مجھے سب کچھ مل گیا ہے ۔ اللہ کی قسم اس سے زیادہ کوئی عورت اور کچھ نہیں پا سکتی ۔" —— میں خوشی کے مارے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر لپٹ جاتی تھی ——

ایسے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوتی تھی ۔

ایک بار میں نے اس سے کہا ——

"اب تو میں اپنے دوستوں میں تیری تلاش میں ہوں ۔"

"کیا —— ؟" سارہ تعجب کے مارے کچھ نہ کہہ سکی ۔

"ہاں، اب میں ایک اور دولہا ڈھونڈ رہی ہوں —— ہادی سے بھی اچھا ۔"

"ہادی سے بھی اچھا —— ؟" وہ تعجب کے مارے چیخ پڑی ۔

"اور کیا، اپنی بہن کے لئے تو ایسا ہی دولہا ڈھونڈوں گی ۔"

پھر ہم دونوں ہنس پڑے ۔

سارہ ہنستے ہنستے چپ ہو گئی ۔ اور کنواری لڑکیوں کی بے قراری سمیٹے اچانک کچھ سوچنے لگی تھی ۔ وہی انوکھا انتظار جو ہر لڑکی کی آنکھوں میں بسا ہوتا ہے ۔

سارہ ابھی صرف سترہ برس کی تھی اور اسے بی اے کرنے کے لئے مزید ایک سال انتظار کرنا تھا۔ لیکن ادتی کے گھر آنے جانے سے وہ جیسے اچانک جاگ پڑی تھی۔ اسی لئے اپنی چھوٹی چھوٹی سہیلیوں سے کھیلنے کے بجائے وہ اکیلی کسی کونے میں بیٹھی کچھ سوچا کرتی تھی۔

تب میں نے ایک دن بابا سے کہا کہ وہ سارہ کا بھی بیاہ کر دیں۔

"ابھی سے ـــــ!" بابا کچھ اداس ہو کر ہنسنے لگے۔ کیونکہ انھیں اپنی چھوٹی بیٹی بہت پیاری تھی۔ واقعی اپنے ڈیل ڈول اور عادتوں کی وجہ سے وہ چودہ پندرہ برس کی لگتی تھی۔ کچھ امی ابا کے دلار نے اسے اور بھی بچہ بنا دیا تھا۔

جب پپو دو مہینے کا ہو گیا تو میں اسے لے کر میکے آئی۔ سارہ کو تو ایک کھلونا مل گیا۔ دن رات وہ پپو کو اپنے پاس رکھتی تھی۔ رات کو بھی اس کا کریب اپنے پلنگ سے ملا کر سوتی۔ میں تو اب پپو کی خالہ معلوم ہوتی تھی۔ اور وہ بڑے سلیقے کی ماں بنی نہایت ذمہ داری سے اس کے دودھ کی بوتلیں دھو رہی ہے۔ اُسے نہلا رہی ہے۔ جھولا جھلا رہی ہے اور ڈاکٹروں کے ہاں لے جا رہی ہے۔

ایک بار وہ پپو کو لے کر ڈاکٹر عشرت کی ڈسپنسری گئی تو وہ مریضوں کو بھول کر سارہ کو دیکھتے رہے۔ پھر پپو کو دیکھنے کے بہانے وہ ہمارے ہاں آنے لگے۔

ڈاکٹر عشرت کی ہر طرف دھوم تھی۔ اتنے بڑے ڈاکٹر تو تھے ہی مگر ساتھ ہی حسنِ یوسف بھی لائے تھے کہ ان سے علاج کروانے والی عورتیں جاتے وقت ایک نیا روگ لگا لیتیں۔

خیر صورت کی بات جانے دیجئے۔ ڈاکٹر عشرت میں تو کوئی اور ہی کشش تھی کہ ہمارے سارے گھر کو ان کا دیوانہ بنا گئی۔ اور سارہ کا پیغام بابا نے فوراً قبول کر لیا۔

ان کی میٹھی صورت نے میری ساری زندگی میں کڑواہٹ گھول دی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں جو بار بار انھیں کسی فلم اسٹار کی طرح تعریفی نظروں سے دیکھ رہی تھی اس کی کتنی بڑی سزا پاؤں گی!

جب تک ان کے پیغام پر غور ہوتا رہا اتنے دنوں میں تو وہ مجنوں بن گئے وہ جو کسی عورت کو ایک نظر دیکھنا گوارا نہ کرتا تھا۔ دن رات سارہ کے لئے روئے جاتا۔

مجھے تو وہ سارہ کے لئے ٹھیک نہ لگے۔ کیا پتہ سارہ کے اس سے اچھے پیغام آتے۔ ابھی اس کے بیاہ کی جلدی کیا ہے۔ پھر یہ ڈاکٹری کا پیشہ تو بڑا بدنام ہے۔ پچاسوں لیڈی ڈاکٹر مریض ان کے گرد منڈلاتی رہیں گی۔ پھر عشرت کا مزاج بھی ایسا تھا کہ ہر وقت پھول کی طرح کھلے رہتے۔ جتنی دیر بیٹھے سب کو ہنساتے جاتے تھے۔ بعض لوگوں میں ایسی کشش ہوتی ہے کہ اچھے بھلے لوگوں کو پاگل بنا دیں۔ مجھے عشرت سے ڈر لگتا تھا۔ اس لئے میں نے بابا کو سارہ کی ... بابا تو اتنے مشہور داماد پر ریجھ گئے تھے۔

سارہ سے تو کچھ کہنا ہی بے کار تھا کیونکہ وہ عشرت کے نام سے ہی شرمانے لگی تھی۔ اپنی پسند کا ... اظہار ... لڑکی کرتی ہے۔

ایک بار تو اس ذکر پر وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

"سچ آپا تم نے میرے لئے وہ ڈھونڈا ... بھی ... !"

میرا جانے کیوں دم گھٹنے لگا۔ میں نے اس کی باہیں اپنے گلے سے نکال پھینکیں اور کمرے میں جا کر لیٹ گئی ——— ہونہہ ہادی سے اچھا ——— ہادی سے بھلا اس کا کیا مقابلہ ——— میں نے بڑی اونچی آواز میں سوچا، اور پھر خود ہی شرمندہ ہو گئی۔

سارہ ابھی سے اترانے لگی ہے۔ کیا پتہ گنوں کا کیسا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی مریض عورت ہی اسے جھپٹ لے۔ میرے لاکھ روکنے کے باوجود بابا نے اقرار ہی کر لیا۔

مگر عشرت نے تو اپنا صبر ہی کھو دیا تھا۔ روز کسی نہ کسی بہانے آ دھمکتے۔ سارے گھر کی صحت ٹھیک کرنے پر تُل گئے تھے۔

ادھر سارہ ان کے آنے کی خبر سنتے ہی کمرہ بند کر کے بیٹھ جاتی۔ اس کی ایک جھلک دیکھنے کی خاطر عشرت کو گھنٹوں میری خوشامد کرنا پڑتی تھی۔

"سارہ کو کون سا رنگ پسند ہے؟ ——— وہ کیا چیز شوق سے کھاتی ہے؟ ——— کیسے کپڑے پہنتی ہے؟ ——— میں اُسے پسند تو ہوں نا ——— ؟"

عشرت کے ان سوالوں سے میں واقعی چڑ جاتی تھی۔ یہ آدمی ضرور سارہ کا دماغ خراب کر کے رہے گا۔ ایسی تو وہ پری چہرہ نہیں ہے۔ رہی ہم دونوں کی ایک ہی سی تو صورت ہے۔ ہادی نے تو شادی کے دو برس بعد بھی کبھی یہ نہ پوچھا کہ مجھے کون سا رنگ پسند ہے۔ ہمیشہ اپنی پسند کی چیزیں لاتے ہیں۔

"یہ ساری باتیں تم خود سارہ سے پوچھ لینا۔" میں بیزار ہو کر کہتی۔

"مگر آپ دونوں کی تو پسند بھی ایک ہو گی، صورتوں کی طرح ———"

وہ مسکرا کے کہتا تو میری جان جل جاتی۔ جانے کیوں مجھے عشرت اور سارہ کے ان چونچلوں پر غصہ آتا تھا ——— ہماری شادی ہوئی، مگر ہادی نے اتنا چھچھوراپن کبھی نہ دکھایا۔ وہ ٹھہرے مصروف آدمی۔ اظہارِ عشق بھی کرتے ہیں تو نہایت مختصر الفاظ میں ——— حالانکہ میں سارہ سے کسی بات میں کم نہیں۔ عشرت بھی کہتا ہے کہ میں بالکل سارہ ہوں۔

(مگر ہادی عشرت جیسا تو نہیں!)

(کوئی میرے دل میں بول اٹھتا)

ایک دن عشرت اپنی کار لے کر آئے کہ ہم ان کے ساتھ شاپنگ کو چلیں۔ وہ سارہ کے لئے زیور اور کپڑے وغیرہ خریدنا چاہتے تھے۔ جب کبھی انھیں سارہ سے کچھ کہنا ہوتا تو وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہتے۔

"آج آپ لوگ ہمارے ساتھ چلئے پلیز۔"

"آج آپ لوگ ہمارے ساتھ شاپنگ کیجئے ———"

مگر سارہ نے کبھی یہ درخواست قبول نہ کی۔ وہ یوں ظاہر کرتی جیسے عشرت کی ان خوشامدوں کی اسے بالکل پروا نہیں ہے اس لئے وہ میرے مسلسل اصرار پہ کہہ گئی کہ میں عشرت کے ساتھ جا کر سب چیزیں اپنی پسند سے خریدوں۔ اسے شادی سے پہلے ان کے ساتھ شاپنگ کرنا پسند نہیں ہے۔

مجبوراً مجھ ہی کو عشرت کے ساتھ جانا پڑا۔

عشرت کا بس چلتا تو ساری دوکانیں خرید ڈالتے ۔ جو زیور اور جو کپڑا پسند آتا گیا لیتے گئے ۔ اتفاق کی بات کہ جو چیز عشرت کو پسند آتی تھی وہی مجھے ۔ اس دن کئی ساریوں اور زیوروں پر تو میرا دل بھی للچایا ۔ پتہ نہیں کیوں ہم عورتوں کی نیت ان چیزوں سے بھرتی ہی نہیں ۔

اس دن مجھے بار بار خیال آیا کہ کبھی ہادی بھی میرے لئے یوں فیاضی دکھاتے ۔ سارہ کی قسمت پر مجھے رشک آتا ، اور جی چاہتا تھا کہ عشرت میں کوئی تو عیب نکلے ۔

گھر آئی تو میں نے سارہ کو بتایا کہ عشرت نے کیسی کیسی خوب صورت چیزیں خریدیں ، اور میری کتنی خاطر تواضع ہوئی ۔ وہ شرما شرما کے سب باتیں سنتی رہی ۔

" اللہ قسم ، مجھے تو تیرا دولہا بہت اچھا لگا " میں نے اسے اور خوش کرنے کو کہا ۔

" دولہا بھائی سے بھی اچھے ہیں نا ——— ؟ "

اُس نے اٹھلا کے پوچھا تو سٹپٹا گئی ———

" ہاں ، عشرت اور ہادی کا کیا مقابلہ ——— " میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور سوچنے لگی کہ واقعی عشرت کا کسی سے بھی مقابلہ نہیں ہو سکتا ۔ سارہ کیسی نصیبوں والی نکلی !

ساریاں خریدتے وقت وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ ——— " ہائیے اس ساری کی قسمت جگا ہی دیں " ——— " یہ لاکٹ بھی ناز کرے گا کہ سارہ نے اسے پہنا " ——— اس کے باوجود رستے بھر اسے یہی فکر رہی کہ جانے اتنی معمولی سی چیزیں سارہ کو پسند آتی ہیں یا نہیں !

اس شام ہادی کو جانے کیا ہوا تھا کہ وہ ایک واہیات سا ڈھیلا ڈھالا نائٹ سوٹ پہنے ، شیو بڑھائے ، پپّو کو گود میں لئے ٹہل رہے تھے ۔ توبہ ، کتنے فضول سے لگ رہے تھے ۔ میں چاہتی تھی ، ذرا اپنی زندگی کا رعب بھی عشرت پر ڈالوں ، مگر وہ تو مجھے دیکھتے ہی اُلجھ پڑے کہ ———

پپّو کو چھوڑ کر میں اتنی دیر باہر کیوں رہی !

میرا جی جل گیا ۔ خود تو کبھی اپنے ساتھ کہیں لے جانے کی توفیق نہیں ہوتی ۔ اور اب میں عشرت کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے چلی گئی تو بگڑ بیٹھے ۔

مجھے اس دن ہادی پر بہت غصہ آ رہا تھا ۔ سب سے زیادہ اس بات پر کہ انھوں نے اپنی ایسی ہیئت کیوں بنالی ہے ۔ اللہ نے صورت نہ دی ہو تو آدمی ڈھنگ کے کپڑے ہی پہن لے ۔

اس دن پہلی بار ہماری زور دار لڑائی ہوئی ۔ اور میں نے بھی جاہل عورتوں کی طرح خوب طعنے دیئے کہ انھوں نے مجھے کیا پہنایا ——— کیا دیا ——— !

اگر اس دن ہادی یوں آپے سے باہر نہ ہو جاتے تو شاید آج میں یوں نزع کے عالم میں زندگی نہ گزارتی ۔ بعض وقت کچھ ہونا ہو تو حالات یوں ہی ہمارے ہاتھوں سے پھسلے چلے جاتے ہیں ۔ انسان کے اختیار میں کچھ نہیں رہتا ۔ اگر ہمیشہ کی طرح اس دن بھی ہادی مجھے منا لیتے تو بات اتنی کیوں بڑھتی ! میں اتنے شدید جاڑے میں ساری رات باہر آنگن میں لیٹی روتی رہی ۔ اور وہ کمرے میں جاگ جاگ سگریٹ پیتے رہے ۔ صبح مسجدوں میں اذانیں ہونے لگیں تو وہ مجھے منانے آئے ۔ لیکن بخار کی تیزی میں

مجھے رونے کی سدھ بدھ ہی نہ رہی۔

صبح ڈاکٹر نے بتایا کہ مجھے نمونیہ ہو گیا ہے ـــــ بچارے ہادی میری بیماری پر یوں پشیمان تھے جیسے سارا قصور ان ہی کا ہو، پھر اسی دن ان کے آفس سے ٹیلیگرام آ گیا۔ کسی ضروری کام کے لئے انھیں فوراً بمبئی جانا تھا ـــــ ایسے وقت عشرت کو اپنی قابلیت جھاڑنے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے ہادی کو یقین دلا دیا کہ میری بیماری ختم ہو چکی ہے، اور ان کی غیر موجودگی میں وہ میرا پورا خیال رکھیں گے۔

ہادی تو یہ سن کر بالکل مطمئن ہو گئے اور چل دیئے ـــــ

اب دیکھتی ہوں تو یہاں سے وہاں تک مجھے اپنا کوئی قصور ہی نظر نہیں آتا۔ سارا کھیل ہادی نے بگاڑا۔ وہ مجھے عشرت کے حوالے کر کے کیوں چلے گئے؟ جانتے نہ تھے کہ بیماری انسان کے ہوش و حواس کھو دیتی ہے۔ اور بمبئی پہونچتے ہی جانے کیوں انھیں پھر مجھ پر غصہ آنے لگا۔ یہی کہ میں نے انھیں کھلانے پہنانے کے طعنے کیوں دیئے۔ پپّو کو سارہ کے حوالے کر کے خود تفریح کیوں کرتی ہوں ـــــ اور پھر یہ کہ اس دن میں اتنے غصّے میں کیوں آئی تھی!

ہادی کے خط پڑھ کر میں خود بھی پچھتانے لگی کہ خواہ مخواہ اتنی تلخی بڑھالی۔ اب تو مجھے زندگی بھر اسی ضدی شخص کو بھرنا ہے بابا نے میرے لئے کیا دیکھا ـــــ ایسا ہی ضدی ـــــ اڑیل ـــــ بدشکل انسان ـــــ!

میری بیماری بڑھتی گئی تو پپّو دن رات سارہ کے پاس ہی رہنے لگا۔ عشرت ہاسپٹل کے بعد سارا وقت میرے سرہانے گذارتے تھے۔ اس لئے سارہ نے میرے کمرے میں آنا چھوڑ دیا تھا۔ کوئی کام ہوتا تو سرہانے والی کھڑکی کا پردہ ہٹا کے سیٹی بجاتی اور فوراً عشرت کو باہر جانے کا حکم مل جاتا۔ بچارے عشرت کو یہ دور کا جلوہ اور تڑپا دیتا تھا۔ وہ کمرے میں آ کر انگلیوں پر شادی کے دن گننے لگتے ـــــ "اور کتنے دن رہ گئے ہیں۔ ایک مہینہ پانچ دن، خیر اتنے دنوں اور ترسالیں سارہ بیگم۔ پھر ہماری باری آئے گی"۔

مجھے ان دونوں کے ایسے چونچلوں پر کبھی ہنسی نہ آتی تھی۔ میری بلا سے وہ کچھ کریں۔ آخر مجھے اپنے پروگراموں سے کیوں مطلع کیا جاتے ہیں۔ یہاں ویسے ہی بخار نے دل و دماغ کو جھنجوڑ پھینکا ہے۔ اوپر سے ہادی کے خط آگ برسا رہے ہیں۔

ایک دن مجھے اپنے اوپر جو رونا آیا تو روئے چلی گئی۔ رات کے گیارہ بجے ہوں گے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی سارہ یہ خبر سنا کر گئی تھی کہ شاید آج ہادی آئیں۔ ان کا ٹیلیگرام آیا ہے۔ عشرت کی اس دن ہاسپٹل میں ڈیوٹی تھی۔ لیکن مجھے روتے دیکھ کر انھوں نے طے کر لیا تھا کہ جب تک میں رونے کی وجہ نہ بتاؤں گی وہ میرے پاس سے نہ ہٹیں گے۔

اُن کے کپڑوں میں بسی ہوئی خوشبو میرے قریب آ رہی تھی، اور ان کا خوبصورت گلابی ہاتھ بار بار میرے ہاتھ کو تھام کر مجھے تسلّی دے رہا تھا ـــــ

ارے واہ یہ خوب۔ اب ہر وقت رونے اور ہنسنے کی وجہ کوئی کیا بتائے ـــــ! اور بھئی یہ ہوتے کون ہیں یوں مجھے تسلیاں دینے والے ـــــ؟ دل چاہ رہا تھا کہ کہوں۔ جاؤ ـــــ اپنی ہونے والی بیوی کے ناز اٹھانے کی ترکیبیں سوچو ـــــ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو ـــــ میرے بابا کو یہی پتھر دل انسان رہ گیا تھا جو بیمار [illegible] کو اتنی دور چلا گیا اور وہاں سے زہر میں بجھے ہوئے خط بھیجے جاتا ہے۔

میں نے روتے روتے نظر اٹھا کے دیکھا تو عشرت مجھے دیکھے جا رہا تھا ـــــ جیسے اُسے سکتہ ہو گیا ہو۔

"اس وقت آپ بالکل سارہ لگ رہی ہیں" وہ آہستہ سے بولا ــــــ وہی آنکھیں ــــــ وہی ہونٹ ــــــ سب ــــــ وہی ــــــ مگر اللہ نہ کرے جو میں کبھی سارہ کو یوں رُلاؤں ــــــ ایسی خوبصورت آنکھوں میں آنسو ــــــ!"

"کیا واقعی ــــــ واقعی میں سارہ ہوں ــــــ میں ــــــ میں ــــــ" پتہ نہیں میں کیسے خوشی سے بے اختیار ہو گئی، اس نے مجھے عشرت کے سینے سے جا لگایا۔

چند لمحوں کے لئے میں سارہ بن گئی تھی، اور یہ خوبصورت سجیلا مرد مجھے ہادی لگ رہا تھا۔

پھر سیٹی کی آواز پر چونک کر میں نے کھڑکی کی اُور دیکھا ــــــ وہاں سارہ اور ہادی پپّو کو لئے کھڑے تھے۔ دوسرے لمحے وہ یوں غائب ہو گئے جیسے میرا واہمہ ہوں۔

میرے ہاتھ خود بخود نیچے آ رہے۔ میں پلنگ پر گر کر سوچنے لگی کہ ہوش میں رہوں یا بے ہوش ہو جاؤں۔ مگر عشرت نے مجھ سے جلدی فیصلہ کر لیا اور لڑکھڑا کے فرش پر گر پڑا۔

پھر کئی گھنٹے بعد وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کار کی طرف جا رہا تھا تو میں اس کے پیچھے بھاگی ــــــ

"مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟"

اس خوفناک حادثے کے بعد میرے دل میں دبی ہوئی کوئی خوشی کی کرن چمک اٹھی تھی۔ میں سارہ کو عشرت سے بدگمان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر اب یہ ہو گیا تھا تو کیسا سکون سا چھا گیا۔ ہادی کی قہر انگیز نگاہیں، بدنامیوں کا طوفان، سارہ کی نفرت ــــــ ہر چیز میرے اس سکون تلے دب کر سرد ہو گئی تھی۔ میرے دل میں چبھنے والا کانٹا نکل گیا تھا۔ اور اب میں کچھ نہ سوچنا چاہتی تھی۔ سوائے اس لمحے کے جب میں عشرت کی باہوں میں تھی۔ یہ لمحہ جادو واں ہو گیا تھا۔ اور مجھے اس کے سوا کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ پپّو بھی نہیں، جسے میں نے کل سے نہ دیکھا تھا۔

لیکن عشرت کے ساتھ کار میں بیٹھتے وقت میں نے سوچا تھا کہ میں سارہ کو دھوکا نہیں دوں گی ــــــ وہ تو ایک ایسے دولہا کے انتظار میں تھی جو وقت ہی کا ہو۔ میں نے سارہ کے اس خوبصورت تصور کو توڑ ڈالا تھا ــــــ اس کا کفارہ کیا ہے ــــــ بدنامیوں کا ہالہ ــــــ میری جلتی ہوئی خشک آنکھیں اور عشرت جیسے سرد مہر انسان کا ساتھ

اچانک ایک جادوگر لمحے نے مجھے کہاں سے کہاں پہونچا دیا تھا ــــــ میرے اور ہادی کے درمیان صدیاں پھیل گئی تھیں ــــــ ان سے میرے پیار اور نفرت کے رشتے ٹوٹ چکے تھے۔ اور سارہ سمجھ رہی ہوگی کہ میں نے اسے شعلوں میں دھکیل دیا ہے۔ وہ بے چاری کیا جانے کہ میں نے اس کی نفرت بھری نظروں سے بچنے کے لئے ساری زندگی کا بن باس قبول کیا تھا۔

مجھے ابھی ایک انتظار تھا ــــــ

میں بار بار عشرت کو تک رہی تھی کہ اب اگلا قدم وہ کہاں رکھے گا! مگر وہ تو جیسے ساری زندگی کی گرمی اس لمحے ختم کر چکا تھا اب برف کا تودہ بنا دونوں ہاتھوں میں سر پکڑے بیٹھا رہتا۔ شاید اب سمجھ میں کوئی ایسی بات نہیں رہی تھی جو سارہ جیسی ہو۔ میں اس سے کہنا چاہتی تھی کہ اب ان دنوں کو بھول جاؤ جو ہمارے نہیں رہے۔ لیکن میرے بار بار چھیڑنے پر ایک دن وہ بگڑ بیٹھا کہ میں اپنے گھر کیوں نہیں جاتی!

اُس دن میں چونک پڑی۔ اس جادو والے لمحے کا سحر اچانک ٹوٹ گیا، اور مجھے بے اختیار اپنا ہادی یاد آیا ــــــ اپنا پپّو، جو روز مجھ سے سارہ ہی کی شکایتیں کرتا تھا ــــــ میں ان سب کو چھوڑ کر اس سرد مہر انسان کے ساتھ کیوں آ گئی

مسکان ... آنکھوں میں بسائے مرجانا چاہتا تھا۔

گھر آئی تو ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے اب یہاں کوئی نہ رہتا ہو۔ آیا اور دوسرے ملازم مجھے دیکھ کر سرگوشیاں کرنے لگے۔

امّی نے منہ پھیر لیا اور بابا باہر چلے گئے۔

میری نظریں سارہ کو ڈھونڈ رہی تھیں تاکہ میں اُس کے قدموں میں گر کر معافی مانگوں۔ اُسے یقین دلاؤں کہ عشرت کی زندگی سے میں ایک لمحہ بھی نہیں چرا سکی۔

پھر آیا نے مجھے بتایا کہ پپّو اور ہادی میرے بغیر بہت روتے تھے۔ اس لئے ایک دن اچانک سارہ نے کہا ——— "امّی میں اپنی باقی زندگی بھی آپا کے حوالے کرنا چاہتی ہوں ——— میں بمبئی جا رہی ہوں۔ پپّو اور ہادی کو بہلانے ———"

آپ نے کبھی ایسی انوکھی بات سُنی تھی کہ کسی لڑکی نے اپنی سگی بہن کی خوشیوں کو آگ لگائی ہو، اور پھر اپنے آپ کو ایثار اور قربانی کے مینار پر بھی کھڑا کر لیا ہو ———!

میں سُناتی ہوں آپ کو ——— میں سُناتی ہوں ———

(شمارہ ۱۵۲-۱۵۳ ۱۹۶۷ء)

ملہار ہے یا دیپک

(صفحہ ۸۰۷ سے آگے)

"وہ مر گئے، اب کبھی نہیں آئیں گے ——— دفع ہو یہاں سے" وہ منّی کو غصّے سے جھڑک رہی تھی۔ ماں کو غصّے میں دیکھ کر وہ اپنی چڑیا لئے ہوئے باہر چلی دی مگر رضیہ اداس ہی نہیں بلکہ پریشان بھی ہو گئی ——— اور نہ جانے کتنی دیر وہ اسی طرح بیٹھی رہتی اگر منّی کے چیخنے کی آواز نہ آنے لگتی۔ رضیہ دوڑتی ہوئی گئی ——— منّی چیخ رہی تھی دھاڑیں مار مار کر اور ایک کتّا اس کے ہاتھ سے چڑیا چھین رہا تھا، وہ بے ساختہ کتّے کی طرف جھپٹی اور کتّا چڑیا چھوڑ کر بھاگ گیا۔

"لے اپنی چڑیا مت رو بیٹی!"

کتّے نے فاختہ چھوڑ دی، لیکن اس کے دانت کچھ اس طرح لگے تھے کہ کپڑے میں سوراخ ہو گیا تھا۔

منّی خاموش ہو گئی

"لاؤ منّی ٹھیک کر دیں اس فاختہ کو ——— اب احتیاط سے رکھنا ——— کتّے اس کے دشمن ہیں" اور پھر وہ ان کی یادوں میں کھو گئی۔

ان رومان آفریں ماضی کی یادوں میں جو رنگین بھی تھیں اور بھیانک بھی ——— جن کو کتّے نے تھوڑی دیر کے لئے اُس کے ذہن سے الگ کر دیا تھا ——— منّی اس کی گود میں سونے کی تیاری کر رہی تھی۔

"میری حسین فاختہ" رضیہ نے آہستہ سے کہکر اُسے پیار کر لیا۔

"مت رو۔ مار ڈالوں گی اس کتّے کو ——— بڑا آیا کہیں کا ہماری فاختہ کو مارنے ———"

(شمارہ ۲-۱ ۱۹۵۱ء)

ڈاکٹر احسن منظر

ہوا بند کیوں ہے؟

پہلی بار جب پہرے والا سپاہی سلاخوں کے باہر سے گزرا تو احمد کو وہ خیال آیا۔ دوسری دفعہ وہ اسے آواز دینے کو ہوا اور ہونٹ کھول کر رہ گیا۔ اس کے بعد سپاہی نے متواتر کئی پھیرے کئے۔ لیکن احمد کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ بالآخر جب اُس نے آواز دی تو وہ اتنی مدھم تھی کہ جیل کی اس کوٹھری میں بازگشت بھی نہ پیدا کر سکی۔ جیسی آواز سوتے میں ڈر جانے کے بعد منہ سے نکلتی ہے بلکہ کوشش کے باوجود نہیں نکلتی۔

کوٹھری کے باہر بجری کٹی ہوئی سڑک پر کہرا چھایا ہوا تھا۔ دور سے، دور ہوتی ہوئی نل بوٹوں کی دھمک سنائی دے رہی تھی۔ اگر کوٹھری کے باہر سائبان نہ ہوتا تو چاند بذاتِ خود نظر آجاتا۔ لیکن اب صرف اس کا چھایا احاطۂ نگاہ میں آتی تھی۔ اور سڑک پر درختوں کے سائے کے چلنے سے پتہ چلتا تھا کہ آسمان پر بادل بھاگ رہے ہوں گے۔ باوجود کان لگا کر سننے کے یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ لوگ ابھی جاگ رہے ہیں یا سو گئے۔

جیل میں لوگوں کو کام ہی کیا ہوتا ہے جو رات گئے تک جاگیں۔ جو باتیں جو کتھا کہانی سنائی ہوتی ہے وہ بہت پہلے ختم ہو جاتی ہے۔ قیدی سرِ شام سو جاتے ہیں۔ سنتری جاگتے ہیں اور اکتائے سے نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے وہ محرر جس نے آخری خانہ پُری کی تھی ابھی جاگتا ہو اور لیمپ کے پاس سر نیہوڑائے اونگھ اونگھ کر کچھ لکھ رہا ہو۔ لیکن وہ جگہ یہاں سے دور تھی، زندگی کی اکیلی پہچان اس وقت کتوں کی بین پر مشتمل تھی جیسا کہ ہوتا آیا ہے۔

ایک بار پھر سے بھاری بوٹوں کی چرچراہٹ نزدیک آنی شروع ہوئی۔ ایکا ایکی گھپ اندھیرا چھا گیا، اور ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا احمد کے جسم کو چھوتا ہوا گذرا جیسے اندھیرا پڑے قبرستان سے گذرتے ہوئے کسی نے ٹھنڈے ہاتھوں سے اس کے جسم کو پیچھے سے آکر چھو دیا ہو۔ کوئی پل جارہا ہے کہ بارش شروع ہو جائے گی اور سپاہی اپنی کابک میں جا چھپے گا۔ احمد نے گھبرا کر فیصلہ کر ڈالا۔

اُس نے ٹھنڈی سلاخوں میں سے اپنے سر کو باہر نکالتے ہوئے زور سے آواز دی۔

"دیکھو۔ بات سنو!"

دوسرے ہی لمحے اس نے محسوس کیا فاصلہ تھوڑا تھا، اتنی اونچی آواز کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ الفاظ مصنوعی تھے۔

سپاہی نے ٹھٹھک کر پوچھا — "کیا ہے؟"
"مجھے یہاں ڈر لگ رہا ہے۔"
"ڈر — ! تمھیں؟"
"ہوں" احمد نے سلاخیں پکڑے پکڑے زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
"پھر؟ — کیا حکم ہے؟ تاشے باجے بجواؤں؟ تمھاری بھابی کو بلواؤں؟"
احمد نے آخری جملے کو اَن سنا کرتے ہوئے پوچھا۔ "باہر کہر ہے نا؟"
"ہونہہ کہر — !" سپاہی نے بندوق دروازے سے تھوڑی ہٹا کر دیوار سے ٹیکتے ہوئے کہا۔ "بارش ہونے والی ہے کہ کہر ہے۔"
"مجھے یہاں ڈر لگ رہا ہے۔"
"تو پھر کیا کروں۔ ناچوں۔ گاؤں۔" سپاہی نے پنڈلیوں پر پھیلے ہوئے رگوں کے جال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
"نہیں، یہ تو میں نہیں کہہ رہا۔ بس اکیلے سے جی گھبراتا ہے۔"
"تو پھر ڈھول ڈھمکا کہاں سے آئے؟" سپاہی نے کہا۔
"یہ جگہ سب سے الگ تھلگ کیوں ہے؟"
"جیل میرے مشورے سے نہیں بنی تھی۔ جی چاہے تو سپرنٹنڈنٹ صاحب سے پوچھ لینا۔"
"مجھے بارک میں کیوں نہیں لے چلتے؟"
"میں داروغہ ہوں کہ کیوں نہیں لے چلتے؟" سپاہی نے بندوق اٹھاتے ہوئے کہا۔
احمد زمین سے اٹھ کھڑا ہوا اس خیال سے کہ مبادا وہ کچھ اور کہے۔ سپاہی اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ پھر ڈرتے ڈرتے احمد نے کہا۔
"مجھے یہاں ڈر لگتا ہے۔"
"پھر وہی بات۔ ڈر لگتا تھا، تو جیل کیوں آئے؟" سپاہی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا
"تم تھوڑی دیر یہاں ٹھیر جاؤ۔ مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔"
سپاہی نے دور جاتے ہوئے کہا۔ "مجھے تم سے ڈر لگتا ہے۔"
اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔

وہی لڑکا جس نے اپنی بھابی کو قتل کیا ہے۔ چائے کچھ ٹھنڈی تھی آج!"
"پچھلے سال اس کوٹھری میں میں نے ایک آدمی کو دہشت سے مرتے ہوئے دیکھا تھا۔ رات کو میں گشت کر رہا تھا، پچھلے پہر چیخنے کی آوازیں آئیں۔ جب ہم بتی لے کر گئے تو وہ اینٹھا ہوا پڑا تھا۔ ناخن جنگلی کبوتر کے رنگ کے تھے، اور باچھیں نیچے کو کھنچ گئی تھیں۔ پوسٹ مارٹم میرے سامنے ہوا تھا۔ سُن رہے ہو یا نہیں؟ سوائے اس کے کہ اس کے پیٹ میں کیچوے بھرے

پڑے تھے اور کچھ نہیں ملا۔ کیچوے بھوک سے بلبلا رہے تھے۔ کم سے کم ان کے بجھانے سے تو ایسا ہی دکھائی پڑتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں اندھیرے میں انسان کو اپنا آپ نظر آتا ہے جیسے اندھیرا ایک آئینہ ہو اور اس میں پچھلی تمام برائیاں سارے گناہ صاف دکھائی دیں۔ دن ہوتا ہے تو دوسرے ہی دوسرے دکھتے ہیں اپنا آپ غائب ہو جاتا ہے۔ روشنی سے ضمیر چندھیا جاتا ہے۔ لیکن ان ہتھیاروں کو اپنا آپ نظر آجائے۔ یہ میں نہیں مانتا۔ یار تمھارے سگریٹ میں سے ہمیشہ چنبیلی کے تیل کی بو آتی ہے۔"

"لیکن اس لڑکے کو اپنا آپ نظر آتا ہو یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔" سپاہی نے محرر کے سامنے والی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو اس کے داڑھی بھی ٹھیک سے نہیں نکلی۔"

"داڑھی کا قتل سے کوئی رشتہ نہیں۔ جن کے داڑھی ہوتی ہے وہ بھی قتل کرتے ہیں جن کے نہیں ہوتی وہ بھی۔" محرر نے معمرانہ انداز سے جواب دیا۔

سپاہی نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب عمر سے ہے بھیا۔ تم خود سوچو اس کی عمر کیا ہے۔ سترہ یا زیادہ سے زیادہ اٹھارہ۔ اٹھارہ برس کا تھا تو میں اپنی عورت کو اپنی بیوی کہتے ہوئے شرماتا تھا۔"

ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اس کے چہرے کو چھوتا ہوا نکل گیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔

سپاہی دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں پچھتاوے کی بات کر رہا تھا۔" محرر نے بے رحمی سے کہا۔ "پچھتاوا نہیں ہوتا ہے جن کا دل معصوم ہو!"

"میں بھی پچھتاوے کی بات کر رہا ہوں۔ پچھتاوے کی بھی عمر ہوتی ہے۔" سپاہی نے چڑ کر کہا۔

"اچھا جاؤ پہرے پر جاؤ" محرر نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ اور آنکھوں پر پانی کا چھپکا مارنے چلا گیا۔

کمرے سے باہر نکل کر سپاہی نے دیکھا۔ بارش ہو کر تھم چکی ہے اور جیل کی سڑکوں پر کیچڑ کھڑی ہے۔ وہ کچھ دیر برآمدے میں ستون سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ محرر دن رات اردو کے رسالے پڑھ پڑھ کر اپنے ساتھیوں کے سامنے دون کی لیتا تھا۔ وہ خود شعر کہتا تھا اور اچھا شعر سن کر داد بھی اونچی آوازمیں دے سکتا تھا۔ اس وقت سپاہی کو اس سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ پچھتاوے کے اس بے رحم تجزیے نے اسے بڑے کٹھور روپ میں اجاگر کر دیا تھا۔

جس کوٹھری میں احمد تھا وہ جگہ سب سے الگ تھلگ تھی۔ اس کوٹھری کی پشت پر وہ نالہ کھلتا تھا جس کے منہ پر لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ بادل پھٹ گئے تھے اور چاند، پورنماشی کا پورا چاند، بڑی تیز رفتاری سے آسمان میں بھاگ رہا تھا۔ ہوا کے سوا ساری کائنات حرکت میں تھی۔ یہی آخری چیز تھی جسے سوچ کر سپاہی نے احمد کی کوٹھری کی طرف جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ہوا کے نہ ہونے نے!

اسے معلوم تھا اس وقت اگر وہ احمد کی نظر پڑ گیا تو اس کا پہلا سوال ہوگا۔

"ہوا بند کیوں ہے؟"

بارش سے نہائی ہوئی سڑک پر چلتے ہوئے سپاہی نے کوٹھریوں کے اندر نگا ہیں گڑھو کر دیکھا۔ مٹیالے کمبل اوڑھے کچھ قیدی سو رہے تھے۔ کہیں پر گھپ اندھیرے میں بیڑی کا جلتا ہوا سُرخ سرا ایک بار نیچے غوطہ کھا کر دوبارہ اوپر لوٹ آیا۔

"آج ہوا کیوں بند ہے؟" جیسے کسی نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا ہو۔

"یہ تو حضرت میکائیل سے پوچھو" سپاہی نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"شاید بارش کی وجہ سے ہوا ٹھیر گئی ہے" احمد نے لجاجت سے کہا۔ "بارش ہوئی ہے نا! بارش کے بعد عام طور سے ہوا رک جاتی ہے"

"جب تمھیں ہر بات کا جواب خود معلوم ہے تو مجھ سے کیوں پوچھا کرتے ہو۔ لیٹ کر سو رہو۔ میرا وقت کیوں برباد کرتے ہو؟"

"وقت، کیسے برباد کر رہا ہوں بھائی؛ مجھے معلوم ہے بارک میں کوئی خطرناک قیدی نہیں ہے۔ دوسری کوٹھریاں تین دن سے خالی پڑی ہیں۔ صبح ہی جمعدار سے میں نے پوچھا تھا۔ یہاں کون کون خطرناک قیدی ہیں۔ جو سب سے خطرناک قیدی ہے وہ میں ہوں۔ پھر اگر تھوڑی دیر اپنی بندوق لئے تم میری کوٹھری کے سامنے ٹھیر گئے تو کیا ہوا۔ اس طرح وقت اچھا گزر جاتا ہے"

سپاہی نے بوٹ کے تلوے لگر سے رگڑتے ہوئے کہا۔ "وقت تو تمھارا ختم ہی ہو چکا ہے۔ اس کے اچھے گذرنے کا کیا سوال ہے"

پھر اس نے محسوس کیا یہ بات محرر کے کہنے کی تھی ایک آدمی سے (بلکہ ایک لڑکے سے) جس کا وقت ختم ہو چکا ہے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ خفت مٹانے کے لئے اس نے کہا "تو یہ یہاں کی مٹی کتنی چکنی ہے، ایک بار تلے سے چمٹ جائے چھٹنے کا نام نہیں لیتی"

موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے احمد نے کہا۔ "جب تلے سے کوئی چیز چپٹی ہوئی ہو تو چلنے میں عجیب بے چینی سی رہتی ہے۔ جیسے دانتوں میں کچھ پھنسا رہ جانے پر معلوم ہوتا ہے"

"ہاں آدمی بے کل ہو جاتا ہے" سپاہی نے کہا۔

"مجھے یہاں بے حد ڈر لگتا ہے۔ میرا مطلب ہے جب کوئی آس پاس نہ ہو"

"موت کا خیال آتا ہے؟"

احمد خاموش رہا۔

"نہیں؟" سپاہی نے دیوار سے بندوق ٹیکتے ہوئے کہا۔ "بھائی اندھیرے میں جھانکنے لگتی ہے؟"

"اوں ہنہہ"

"پچھلے سال جو آدمی یہاں دہشت سے مر گیا تھا کسی نے اس کی کہانی تمھیں سُنائی ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر لیٹ کر سو رہو۔ نیند آ جائے گی۔"

احمد سلاخیں پکڑے پکڑے زمین پر بیٹھ گیا۔ سپاہی نے ہتھیلیاں رگڑتے ہوئے پوچھا۔ "احمد آخر سچی بات کیا ہے؟ تم نے اپنی بھابی کو قتل کیوں کیا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" احمد نے بے دھیانی سے جواب دیا۔

"اصلی بات بغیر کسی سے کہے ہی مر جاؤ گے؟"

"پتہ نہیں۔" احمد نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"لوگ کہتے ہیں تمھارے بھائی کو اب بھی تم سے بڑی محبت ہے۔"

احمد خاموش رہا۔

سپاہی نے بیزار ہو کر بندوق اٹھائی اور آگے چل پڑا۔

احمد نے چونک کر کہا۔ "مجھے بے حد ڈر لگ رہا ہے بھائی، یہاں ہوا بالکل نہیں ہے۔ کھڑکیاں ہوا کے رخ ــــ"

سپاہی نے دور ہوتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہے تمھارے شیش محل میں نہ روشنی ہے نہ پنکھا۔"

"تھوڑی سی دیر اور ٹھہر جاؤ۔" احمد نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔

"میں جا کر پنکھا کھینچنے والے قلی کو بھیجتا ہوں۔" دور سے سپاہی کی تمسخر آمیز آواز آئی۔ پھر بجری پر لوٹوں کے چلنے کی آواز ڈوبتی چلی گئی۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ جیسا قبروں کے اندر ہوتا ہے۔ اور وہ سیلن جو سالہا سال سے بے مکین عمارتوں کا خاصا ہوتی ہے۔

سپاہی کے چلے جانے کے بعد احمد پہلے تو کچھ دیر سلاخوں کو پکڑے باہر اندھیرے میں گھورتا رہا۔ پھر گھبرا کر اس نے اپنی پشت کی طرف کھڑکی کو دیکھا۔ بہت سے سوال ثانیے کے لہروں کی طرح آگے پیچھے اس کے ذہن سے ہو کر گذر گئے جن میں پچھلی رات کا خواب بھی تھا۔

لیکن ایسے اندھیرے میں اس کی نو عمر بھابی نے، جس کے پیٹ میں پہلا بچہ تھا اسے آکر تنگ نہیں کیا۔ موت جو یقینی تھی اس کا وہ دہشت ناک روپ بھی اس کے سامنے نہیں آیا جسے سوچ کر ہی بہت سے پیغمبر اور فاتح رو پڑتے تھے۔

وہ کون آدمی تھا جو پچھلے سال دہشت سے یہاں مر گیا تھا؟ احمد ایک کونے میں دبکنے لگا۔ لیکن سلاخوں والی کھڑکی اور سلاخوں والا دروازہ ایسا لگتا تھا چوپٹ کھلے ہوئے ہیں!

پچھلی رات جھپکی آنے پر اس نے دیکھا تھا اس کے پتھر جیسے سر میں آر پار ایک سوراخ ہے جس میں سے ایک سانپ باہر کو سر نکالتا ہے۔ احمد نے لکڑی سے جوں ہی سانپ پر وار کیا۔ سانپ نے اپنا سر اندر کر لیا۔ لکڑی اس کی کنپٹی پر پڑی۔ درد کی تکلیف سے پتھر کے سر نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

تب ہی احمد کی آنکھ کھل گئی۔

اس نے ڈرتے ڈرتے گردن لمبی کر کے سلاخوں میں سے باہر جھانکا۔ اور دوبارہ گٹھڑی مار کر بیٹھ گیا۔ اس

گھپ اندھیرے میں وحشت تھی۔ اندھیرا نہ قتل کی واردات دوبارہ سنا رہا تھا، نہ پھانسی پانے کے خوف کو اس پر مسلط کر پایا تھا۔ ویسے بھی پھانسی کا جسمانی خوف فی الحال بے معنی تھا۔ کیونکہ اُس نے کبھی کسی کو پھانسی چڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ کہیں ایک اُلّو اپنی بھدی موٹی آواز میں دو تین بار چیخا۔ احمد نے اپنے پورے جسم کو سُن ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ یہی اندھیرے کا 'گم بودگی کا' بے کلی کا' دہشت کا پیغام تھا۔

دھیرے دھیرے کوٹھری میں بھی چاندنی پھیل گئی۔

احمد نے کھڑے ہوکر کھڑکی کی دہلیز پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ ایک جلی ہوئی موم بتی کا سیمنٹ پر پھیلا ہوا موم، اور ایک پرانا بلیڈ معلوم نہیں کب کی یہ دو چیزیں وہاں پڑی رہ گئی تھیں۔ کئی بار وہ سونے کے لئے لیٹا، اور جوں ہی غنودگی طاری ہونے لگتی آنکھ کھٹکے سے کُھل جاتی تھی۔ جیسے کھڑکی کی طرف سے یہ کوٹھری غیر محفوظ ہے۔ کوئی جھانک رہا ہے۔ کئی بار اٹھ اٹھ کر وہ دروازے کی سلاخوں تک آیا۔ کتنی ہی بار وہ کھڑکی تک گیا۔ جس طرح بچے رات کو پلنگ سے نیچے پیر رکھتے ہوئے گھبراتے ہیں اور ڈر کے باوجود کبھی کبھی لٹک کر نیچے جھانکنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

صبح جب سپاہیوں نے آکر اسے دیکھا تو اُس کے ہاتھ کھڑکی کی سلاخوں کو مٹھیوں میں بھینچے ہوئے تھے۔ ناخن جنگلی کبوتر کے رنگ کے تھے۔ باچھیں نیچے کو جھک گئی تھیں، اور اس کا جسم اینٹھا ہوا تھا، بے نور آنکھیں کھڑکی کے باہر نالے کی طرف گھور رہی تھیں۔

صبح کے دس بجے احمد کا پوسٹ مارٹم پیر بخش نے کیا جو اس سے پہلے اس کی بھابی کا پوسٹ مارٹم بھی کر چکا تھا، اور جس کے بارے میں مشہور تھا کہ لاش پر چاقو چلاتے ہوئے اس کے کان "ڈاکٹر اور پولیس کے سپاہی کی گفتگو پر رہتے ہیں۔ ہر پوسٹ مارٹم کا مطلب اُس کے نزدیک ایک نئی کہانی ہوتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں اگر اس کا بس چلے، تو وہ کہانی کے فراق میں پورے شہر کو پوسٹ مارٹم کی میز پر لا لٹائے۔

جیل کے محرر نے کہا "تعجب ہے اس لڑکے کے پیٹ سے بھی کیچوے نکلے!"

ایک بڑھیا نے جو اپنے کسی رشتہ دار سے ملنے آئی تھی کہا " آٹے میں مٹی ملی ہوتی ہے بھیا۔ جب پیٹ میں مٹی ہوگی تو کیچوے آپ ہی رہویں گے "

ساڑھے دس بجے ایک لمبا تڑنگا آدمی لاش لینے اکیلا آیا۔ اور بیل گاڑی پر لاش کو لاد کر چلا گیا۔ لاش پر پڑی ہوئی خشک گھاس گاڑی سے دور تک گرتی چلی گئی۔ کیونکہ ہوا تیز تھی۔

لوگوں نے کہا وہ مرنے والے کا بڑا بھائی تھا جس کی بیوی کو مرنے والے نے قتل کیا تھا۔

گاڑی بان گاڑی ہانک رہا تھا اور وہ آدمی بہلی کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا اس کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔

کہا جاتا ہے قتل کی وجہ اسے معلوم تھی۔

کچھ لوگ کہتے ہیں۔ نہیں، صحیح وجہ اسے نہیں معلوم!

لیکن اس بات کی اہمیت ہی کیا ہے؟

(شمارہ ۱۳۸ ۷۳ء)

GOVT GIRLS COL
BHIRAGA
ACC NO 15227
LIBRARY

شیریں

نین دیپ

"ٹھہر د سکھی — مجھے یہ مدتوں کی کھوئی ہوئی محبوب "کوہو" اچھی طرح سُن لینے دو۔ کیسا بے ساختہ پن ہے۔ اس دل نشین صدا میں کتنا پیار، کتنی اپنائیت، کتنی مٹھاس اور کس قدر گہرا درد اور طویل تلاش کا اندوہ!

آج صبح سے ساون کی متوالی گھٹائیں اُمنڈ امنڈ کر جھکی آ رہی تھیں۔ دن کے اُجالے کو اختر شیرانی کے وطن کی شاموں کے سے دلچسپ اندھیرے نے اپنے دامن میں ڈھانپ لیا تھا۔ پورب دیس کی گیتوں اور ولوں سے بھرپور ہوائیں مجھے بار بار چونکا سی رہی تھیں۔ کوندے کی تیز لپک میری نظروں کے سامنے سے بھول کا بھاری بے رنگ پردہ سرکانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرے حافظہ میں کتنے مناظر، کتنے واقعات، کتنی باتیں گڈ مڈ ہو کر اُبھر رہی تھیں۔ کبھی اُبھر اُبھر کر ڈوب جاتیں کبھی ڈوب ڈوب کر اُبھر آتیں۔ ایسے میں اچانک مجھے تمہارا خط مل گیا۔ اللہ! کیسی غیر متوقع نعمت! وہی حسین تحریر۔ وہی دل کش اسلوب بیان۔ وہی سادہ سے چھوٹے چھوٹے جملے اور وہی بیتے دنوں کی لطیف یادوں سے بھرپور سنگیت بھرے فقرے۔ جیسے چنبیلی کی شرمائی لجائی نازک پتیوں پر شبنم کی پھوار گر رہی ہو۔

میں پڑھتی رہی، ایک بار، دو بار، کئی بار، اور پھر یکایک میرے سامنے سے وہ دبیز پردہ ایک دم سے سرک گیا۔ کتنی دھندلی دھندلی تصویریں، پلک جھپکتے ہی صاف روشن ہو گئیں۔ کتنی بھولی بسری خوش گوار آوازیں صاف سُنائی دینے لگیں اور مجھے مثالوں محسوس ہوا جیسے جنم جنم کے اتھاہ اندھیرے کے بعد گھر گھر دیوالی کی دیپ مالا سے جگمگا اٹھا ہے جیسے جاڑوں کے کسی ٹھٹھرے ہوئے کہر آلود دن میں یکایک نرم نرم پُر حرارت دھوپ ہر سو پھیل گئی ہے۔ جیسے بہار آفریں کھیتوں میں حدِ نظر تک بسنت کھلی ہوئی ہے۔ جیسے گجر دم نارنگی کی کلیوں کی نکہتوں سے لدی پھندی ہوائیں کہیں دور سے اساوری کی فسوں خیز دھنیں اپنے آنچل میں سمیٹ لائی ہیں۔ جیسے گھنگور گھٹاؤں سے ڈھکے ہوئے کسی گاؤں کے گھنے باغ میں موربیوں کی سی بہوئیں جھولے پر برکھا کے ملہار گا رہی ہیں۔ اور جیسے میرے چھمچھم میں بھی ہر سو میرے پورب کا سا مدھ اور رنگ بکھر گیا ہے۔ اور سامنے لان کے سرے پر کئی برس پہلے کے میرے اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے آم کے ننھے منے پیڑ پر نہ جانے کہاں سے پردیسن کوئل آ بیٹھی "کوہو" "کوہو" گویا صدیوں تک دیس بدیس بھٹک کر آج اُس نے میرا گھر پا لیا تھا۔

میرا دل آج پہاڑ کی سی مدت کے بعد یکایک کسی جانی پہچانی درد آگیں لذت سے مخمور ہو گیا۔ حواس پر مستی سی چھا گئی۔

نس نس میں نشہ بھر گیا۔ اور مجھے یوں معلوم ہوا جیسے کہیں پاس ہی کوئی مدھم مدھم سرگوشی کے انداز میں آپ ہی آپ گنگنا رہا ہو۔
"بگولہ سا اک افق میں اُٹھا یہ کون تمیر قریب آیا"

میری سکھی! تمھارے خط میں نہ جانے کیسا جادو چھپا تھا جس کے اثر سے میری ہستی کی تمام تر بے رنگی اور جمود چشم زدن میں فنا ہو گیا۔ اور میرے بند بند میں وہ زندگی سے بھرپور آگ پوری تندی سے بھڑک اٹھی جو سُلگ سُلگ کر بجھنے کے قریب ہو چکی تھی!

تم نے لکھا ہے تمھیں بیتے دن اب بھی اُسی شدت سے یاد آتے ہیں۔ تم اب بھی بیداری کے خواب دیکھتی رہتی ہو۔ سپنوں میں اب بھی تمھیں چھوڑے ہوئے گھر اور بچھڑے ساتھی دکھائی دیتے ہیں اور آنکھ کھلنے پر تم پہروں اپنے تکیہ کو جمنا جلی سے بھگوتی رہتی ہو۔

سچ کہتی ہو سکھی! بیتی یادیں واقعی بری طرح یاد آیا کرتی ہیں۔ یادیں اپنے اندر یاد آنے کی عظیم طاقت رکھتی ہیں اور بعض دفعہ تو ہم پر طوفانوں کی طرح پھٹ پڑتی ہیں۔ تمھارا خط پاکر مجھ پر بھی یکایک بے شمار یادیں ماگھ کی طوفانی راتوں کی طرح پھٹ پڑیں۔ لیکن سنو، یہ بات تم ہی تک رہے۔ آج کل پُرانی یادوں کو یاد کرنا بڑی دقیانوسی بات سمجھی جاتی ہے۔ ایک امریکن مصنف کا کہنا ہے کہ انسان عمر سے بوڑھا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی اپنے ماضی کو یاد کرتا رہے تو وہ یقینی بوڑھا کہلائے گا۔ اگرچہ میں یہ انکشاف پڑھ کر کتنے دنوں تک سوچتی رہی تھی کہ دنیا میں کتنے انسان جوان ہیں؟ مگر تم جانتی ہو کسی امریکن کی بات غلط کیسے ہو سکتی ہے! اس لئے اب جب کبھی اتفاق سے ہم میں سے کوئی سکھی سہیلی باہم ملے تو ہمارے درمیان اب افسانوں اور غزلوں کی باتیں نہیں ہوتیں کسی اونچی ادبی تخلیق کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ نئے پرانے مصنفوں پر تنقید نہیں ہوتی۔ مدھر گیتوں کی وصنیں نہیں دہرائیں۔ شروع محبت پر رائے زنی نہیں کی جاتی۔ دبی دبی سرگوشیوں میں اپنے اپنے میٹھے راز بھی نہیں کہتیں۔ اب تو ایک دوسری سے یہ پوچھتی ہیں۔ تمھارے فلاسفی کے ایم۔ اے پاس میاں نے کتنے برس نوکری کی تلاش میں دفتر دفتر کی خاک چھان کر غلہ کے کس آڑھتیہ کی دوکان پر منشی گیری کر لی ہے؟

تمھارے آبا نے اپنی پچھلی چھوڑی ہوئی زمین کے عوض رقبہ حاصل کرنے کے لئے کتنا عرصہ کنبہ بھر کو ایک وقت کے فاقہ رکھ کر پٹواریوں اور تحصیل داروں کی جیبیں بھری ہیں؟

تمھارے بھائی نے خرچ کی تنگی سے کس کلاس کی پڑھائی کے دوران میں خودکشی کا ارادہ کیا تھا؟

تمھاری بوڑھی امی کب سے کھانسی بخار سے بغیر دوا کے جنگ لڑ رہی ہیں؟

اور تم نے اپنے بچے کا ایک اونی کوٹ بننے کے لئے اون کی کتنی ٹھٹھرتی ہوئی راتیں سلائی میں کاٹی ہیں؟

لیکن تمھارا ذہن مجھے خط لکھتے وقت نہ جانے کس طرح حقیقت کے ان خارزار تپتے ہوئے صحراؤں کو عبور کر کے تمھیں اُن مسحور کُن شاداب وادیوں میں لے گیا۔ جہاں قدم قدم پر سبک پگڈنڈیاں راہ گیروں کو ان دیکھے سے اشارے کیا کرتی ہیں۔ جہاں پریم کی نرم روندیاں دل ہی دل میں ان کہی کہانیاں دُہراتے ہوئے دھیرے دھیرے بہتی رہتی ہیں۔ جہاں معمولی صدا پر بھی کسی شعر کا دھوکہ ہوتا ہے۔ جہاں ہر طرف پُر شوق، معصوم مسکراہٹیں بکھری ہوتی ہیں۔ جہاں سرشاری جنون کی حدوں کو چھونے لگتی ہے اور جہاں پہنچ کر زندگی اور خوبصورتی سے شدید محبت ہو جاتی ہے۔ تم اپنے ساتھ مجھے بھی چند شانیوں کے لئے اُس جانی پہچانی کیف بار دنیا میں لے گئی ہو۔ لیکن — معاف کرنا سکھی، میں تمھارے لطیف و جمیل تخیل کا زیادہ دیر تک ساتھ نہیں دے سکتی۔ کیونکہ میرے پچھلے

آنگن کے کونے والے کمرہ میں اندھی گوگی کی چیخیں بلند ہو رہی ہیں: "اسلم - ارے اسلم کہاں جا مرا؟" — اس کی آواز میں اب
وہ چاندی کی گھنٹیوں کی سی کھنک نہیں، شمشان کے بھوتوں کی سی بھیانک پکار ہے - شاید وہ اکیلی بیٹھی ڈر گئی ہے - یا کمرے میں
آتی ہوئی بوچھار سے بھیگ گئی ہے - یا پیاس سے بیتاب ہو رہی ہے: اور میرے دل میں بے اختیار ایک دیوانی خواہش پیدا
ہوئی ہے - میں ساون کی اس موسلا دھار برکھا کی تمام نرملتا سمیٹ کر گوگی کی خالی آنکھوں میں بھر دوں - یہ شفاف موتی گوگی کی
آنکھوں کو نور بخش دیں - ان بدصورت گڑھوں میں پھر سے وہی بڑی بڑی چنچل آنکھیں نمودار ہو جائیں - وہی ہر دم ہنستی ہوئی
بے آرام پتلیاں جنم لے لیں - گوگی ایک لمحہ کے لئے دیکھنے لگے - وہ فخرو پردیسی کی تصویر کو ایک بار بھرپور نظر سے دیکھ لے جس
کو برسوں تمام سے ہاتھ میں تھامے وہ اپنی لمبی لمبی سڈول انگلیوں سے یوں ٹٹول رہی ہے جیسے کوئی کھویا ہوا موتی ٹٹول رہی ہو
کوئی کھوئی ہوئی چیز ڈھونڈ رہی ہو-

گوگی اپنی آنکھیں گنوا چکی ہے - اپنا ماضی بھول گئی ہے اور اپنا حال کھو چکی ہے - وہ اپنی زندگی کا ہر لمحہ بھول چکی ہے۔
وہ تقدیر تک کو بھلا چکی ہے - سوائے فخرو پردیسی کے وہ سب کچھ بھول گئی ہے-

برسات کا ملہار اونچا ہوتا جا رہا ہے جیسے کوئی دیوداسی بھگتی کے نشہ میں سرشار ہو کر تیز تیز رقص شروع کر دے - اور
کوئل سامنے کے آم پر سے اڑ کر کہیں دور جا بیٹھی ہے "کوہو" "کوہو" گویا آج اپنے آخری سانس تک کی بھینٹ دے کر اپنے
بچھڑے ہوئے محبوب کو بلا لینے کا عزم کر چکی ہے - اور میرا ذہن گوگی کی ضیا ریز آنکھوں کی تلاش میں پیچھے کی طرف لوٹ رہا ہے-

فخرو فوجی وردی پہنے سامنے کھڑا ہے!

پیچھے پیچھے فخرو گھر سے بھاگ گیا ہے!

اور پیچھے فخرو گوگی کے ہمراہ دادی اماں کے گھر کے صحن میں داخل ہوا ہے!

نہیں نہیں اور پیچھے، فخرو اس دنیا میں آیا ہے!

ایک صبح کو آنکھ کھلتے ہی مجھے اماں بی نے بتلایا - رات گوگی کا نیا بھائی آیا ہے - میرا دل مارے خوشی کے زور زور سے
دھڑکنے لگا تھا اور شام کو جب میں اماں بی کے ساتھ دادا جان کے قلعہ نما مکان کی فراخ ڈیوڑھی میں داخل ہوئی تھی تو باندی کے نیم
روشن کمرہ میں لیٹی ہوئی شریفن کے ساتھ مجھے ایک کالا - پیلا لجلجا سا چھوٹا انسان پڑا دکھائی دیا تھا - میں اُلٹے قدم لوٹنے لگی ہی
تھی کہ اکرام کی رونے اور ہنسنے کی سی ملی جلی آواز آئی -

"بی بی اپنی سہیلی کے نئے بھائی کو تو دیکھ لو"

میں وہیں ٹھٹک گئی تھی - گوگی کا نیا بھائی! ابھی تھوڑا عرصہ تو ہوا جب ابا جی - دسمبر کی چھٹیوں میں ہم سب کو لے کر
وطن آئے تھے - رشید چچا، حسب معمول نوکروں کے قافلہ کے ساتھ اسٹیشن پر موجود تھے مگر اکرام نظر نہیں آتا تھا-

"اکرام کہاں ہے چچا جی؟" میں نے جھٹ سے پوچھ لیا تھا-

چچا اماں بی سے مخاطب ہو گئے تھے "اکرام کے دونوں لڑکوں کا ایک دن کے آگے پیچھے انتقال ہو گیا ہے - بیچارے
کا برا حال ہو رہا ہے"

خوف سے میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ " کیا ہو گیا تھا اماں بی ؟"

"گوگی کے دونوں بھائی مر گئے ہیں بی بی ۔ ہائے شریفن غریب پر کیا افتاد آئی ایک دم سے دو پلے پلائے بیٹے:...."

اماں بی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں ---- اور میں پلیٹ فارم کا پل کراس کرتے ہوئے سوچنے لگی تھی ۔ مر کر لوگ کہاں چلے جاتے ہیں ؟ کہتے ہیں میری امی بھی مر گئی تھیں ۔ پھر پھوپی مر گئیں ۔ آج تک لوٹ کر نہیں آئیں ۔ اب شاید گوگی کے بھائی بھی کبھی نہ آئیں۔ گوگی قسم کس کی کھایا کرے گی ؟ ہماری گڑیا کے بیاہ میں کہار کون بنے گا ؟ لیکن کیا خبر ہمارے گھر پہنچنے تک وہ واپس بھی آ گئے ہوں ۔ اور جب راہ میں رشید چچا نے مجھے اور چھبو کو میٹھی گولیاں خرید کر دی تھیں تو میں نے تین پیکٹ اور رما فرلے لئے تھے ایک گوگی کے حصّہ کا اور دو اُس کے دونوں بھائیوں کے لئے ۔!

لیکن گھر پہنچنے پر مجھے صرف گوگی ہی ملی جو شریفن کے پہلو سے لگی خاموش میری طرف تکے جا رہی تھی ۔

"بی بی تیری سہیلی تو اکیلی رہ گئی" شریفن مجھے لپٹا کر پیار کرنے لگی ۔ " تو آ گئی ہے ۔ تو اس کی جان میں جان آ جائے گی ۔ اس کا تو آٹھ دن سے ٹکڑا پانی تک بند ہو گیا ہے ۔"

شریفن کی سوجی سوجی آنکھوں میں پانی بھرا ہوا تھا اور اس کے سانولے چہرہ پر جیسے ملتانی مٹی کا لیپ سا ہو رہا تھا۔ میرے حلق میں کانٹے سے پڑنے لگے تھے اور میرا جی چاہا تھا چلا چلا کر رونے لگوں ۔

اور آج شریفن اس نیم روشن میلے میلے سے کمرہ میں گوگی کے ننھے بھائی کو لے کر لیٹی ہوئی ۔ اُس کی آنکھیں اب بھی گیلی تھیں اور چہرہ کا زرد لیپ اور بھی گہرا ہو گیا تھا ۔

اماں بی نے اُس ننھے انسان کو ہاتھوں پر اُٹھا لیا ۔" جیتا رہے بالکل بڑے بھائی پر ہے ۔" اور اُسی وقت اُنھوں نے اُس کا نام فخر الدین رکھ دیا تھا ۔

اگلے سال ہم وطن آئے تو اسٹیشن پر بھاگ رام کو نہ دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا تھا ۔ چچا سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ گھر تک پہنچتے ہوئے ساری راہ پُر ہول خیال آتے رہے ۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی پہلو کے کمرہ پر نظر ڈالی ۔ وہاں ایک بھدا سا تالا لٹک رہا تھا ۔ آنگن میں بہت سی عورتیں اور لڑکیاں ہمارے آنے کی خوشی میں جانے کب سے جمع ہو رہی تھیں ۔ مگر شریفن اور گوگی وہاں بھی نہیں تھیں ۔ اماں بی کو دادی اماں سے گلے مل کر گویا کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی ۔

"بھوجی ! شریفن کہاں ہے ؟ "

"اے تو تمھیں خبر ہی نہیں آیا ! وہ تو دو مہینے ہوئے میاں کو لے کر دفعان ہو گئی ۔" دادی اماں کی آواز میں غصہ کے ساتھ ساتھ دُکھ بھی شامل تھا ۔" اُس پر گیا گلہ جب وہی اپنا نہ بنا ۔ دو برس کا پال پوس کر جوان کیا ۔ نوکر نہیں ، بیٹا بنا کر رکھا جاتے ہوئے اُسے راہ چلتے سنگی جتنا بھی خیال نہ آیا ۔"

"سسرال گئی ہے جیسے وہاں بڑے سگے بیٹھے راہ دیکھ رہے تھے تمہارا نانی کی ! آج تک کہاں تھے سسرال والے ؟" شرفو نائی کی بیو حسب عادت دادی اماں کو بھڑکانے لگی ۔

"آپا جی ! کیا بتاؤں اب تو اُس کی زبان بھی بہت کھل گئی تھی ۔ ایک کہو دس سناتی کیا مجال جو ایک تنکے کے دو کر جائے" وحیمن بوا نے تشریح کی ۔

"رام رام ۔ ہم نے آج تک ایسی بے لحاظ عورت نہیں دیکھی" پرتیبا بوا نے اپنا فیصلہ سُنایا ــــــ لاتعداد سکھی سہیلیوں کے باوجود بھی اس بار دادی اماں کے گھر میں میرا دل اکثر اداس رہتا ۔ مجھے گوگی ہر وقت یاد آتی رہتی ۔ ہر روز اکرام کی یاد آتی ۔ اس کے بغیر ہماری باغ اور ندی کی سیر بالکل بند ہو گئی تھی ۔ حافظ بابا سے اگر کبھی دبی زبان سے کہا بھی تو وہ کھانے کو دوڑا ۔ "یہ اُس کمینے کی لت لگائی ہوئی ہے نا ۔ پتہ بھی ہے ؟ باغوں میں بھوت ہوتے ہیں اور ندیوں پر شام کو جل پریاں نہانے آیا کرتی ہیں ۔ بچیاں ایسی جگہ نہیں جایا کرتیں ۔ سایہ ہو جاتا ہے ۔"

اور میں جل پریوں کے رنگ برنگے پروں کے تصور میں محو ہو جاتی ۔

رات کو مجھے شریفن یاد آیا کرتی جو کام کاج سے فارغ ہو کر ہمارے کمرہ میں آتش دان کے قریب آ بیٹھتی تھی اور کتنی دیر اماں بی سے میری امی اور پھوپی کی باتیں کرتی رہتی اور پھر گوگی کے دونوں بھائیوں کو یاد کر کے رونے لگتی ــ اور ان سب کے ساتھ مجھے وہ کالا، پتلا لجلجا سا چھوٹا انسان بھی ضرور یاد آتا ۔ جس کا نام اماں بی نے فخر الدین رکھا تھا ــ

وقت تیز تیز بھاگ رہا ہے ــ

کتنے سال گذر گئے ۔ کتنی ہی کتابیں رٹ رٹ کر امتحان پاس کر لئے ۔ کتنی نئی دوستیاں قائم ہوئیں اور دل میں کتنے ہی خوبصورت خیال بھر گئے ۔ لیکن گوگی کی یاد ذہن میں جوں کی توں قائم رہی ۔

اس دفعہ دادی اماں کے یہاں آئے ہوتے ہمیں تین چار دن ہوئے تھے ۔ قریب کی مسجد میں عصر کی اذان کبھی کی ہو چکی تھی ۔ پرتیبا بوا کی حویلی کے سامنے والے مندر کی گھنٹیاں زور زور سے بج رہی تھیں ۔ ہر طرف ہلکا ہلکا دھندلکا پھیلنے لگا تھا اور ڈیوڑھی کے آگے والے بوڑھے پیپل کے سائے لمبے ہو رہے تھے ہم آنکھ مچولی کھیل رہے تھے ۔ میں اور رشو چھپنے کے لئے ڈیوڑھی کی طرف بھاگی جا رہی تھیں کہ اچانک گوگی ایک سایہ کی طرح صحن میں داخل ہوئی ۔ میں خوشی سے پاگل سی ہو گئی ۔ گوگی کے ساتھ ایک چھوٹا سا لڑکا بھی تھا ۔ گہرا سانولا رنگ، موٹے موٹے ہونٹ ۔ سر پر الجھے ہوئے سیاہ بالوں کا چھتہ ۔ اور روتی ہوئی سی پُر احتیاج آنکھیں ــ!

دادی اماں لپک کر گوگی کے پاس جا پہنچیں ۔ "شریفن کہاں ہے ؟" وہ گوگی اور فخرو کے سروں پر دونوں ہاتھ پھیر رہی تھیں ۔

"مر گئی ــ" گوگی نے بڑی ناگواری سے جواب دیا ۔

"مر گئی ؟" ــ "کب مری ؟" "کیا ہو گیا تھا اُسے" ؟ ایک ساتھ کئی آوازیں بلند ہوئیں ــ

"پرسوں مر گئی" ۔ گوگی نے دو لفظ مشین کی طرح دُہرا دیئے ۔ دادی اماں رونے لگیں ۔

"وہ غریب کاہے کو جاتی تھی وہ تو وہی حرامی اُکھیڑ کرے گیا تھا" شرفو نائی کی بہو آپ ہی آپ بڑبڑائی ۔

"اللہ بہشت نصیب کرے کبھی کسی کو آدھا بول بھی تو نہیں کہتی تھی ۔ ہزار باتیں کہہ لو چپکی بیٹھی کام میں جُتی رہتی ۔"

رحیمن بوا باورچی خانہ کی چوکھٹ سے لگی اپنی خشک آنکھوں میں آنسو لانے کی کوشش کر رہی تھیں ــ

"اچھا اب بچوں کا دل تھوڑا نہ کرو" دادی اماں نے سب کو ڈانٹ دیا ۔ "جاؤ ننھی گوگی اور فخرو کو اپنے ساتھ کھلاؤ ــ"

اور اس روز سے گوگی اپنی تمام تر زندہ دلی اور شوخی لئے ہوئے دوبارہ میری زندگی میں داخل ہو گئی۔ میں نے اُسے اپنی سہیلیوں کی صف اوّل میں جگہ دیدی تھی۔ لیکن یہ سودا مجھے بہت مہنگا پڑا اُس کا رویہ ہر ایک سے اس قدر جارحانہ تھا کہ مجھے دن میں کئی کئی بار بیچ بچاؤ کرنا پڑتا۔ شرارت اور چھیڑ چھاڑ اُس میں کوٹ کوٹ کر بھر گئی تھی۔ وہ ہر دم پارہ کی طرح تھرکتی لپکتی رہتی۔ اُس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں سے ذہانت کے ساتھ ساتھ ایک عجیب قسم کی دلکش شوخی ٹپکی پڑتی تھی۔ اُس کی زبان موقعہ بے موقعہ لڑائیاں لڑنے میں بہت مشاق ہو گئی تھی۔ ہماری ٹولی میں سوائے میرے اور نصیر کے سب ہی اُس کے مخالف رہتے۔ نصیر کو تو اُس کا مجھ سے بھی زیادہ خیال تھا۔ ایک پل کے لئے بھی اُسے ہم نہ دیکھیں تو بیتاب ہو جاتا۔ اُس کی ہر شرارت پر دل کھول کر قہقہے لگاتا۔ اُس کے ہر کھیل میں بڑی سرگرمی سے شریک رہتا۔ اُسے ایسے گہرے انہماک سے سبق یاد کرواتا جیسے کوئی پجاری بھگوان کی مورتی کے سامنے بھجن گا رہا ہو۔ کبھی ہنستے ہنستے کہا کرتا تمھاری سب سہیلیوں میں گوگی کی ہی آنکھیں خوبصورت ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے ایک ساتھ لاکھوں چراغ روشن ہوں۔"

مخزو گوگی سے بالکل مختلف تھا۔ سست۔ ڈھیلا۔ کند ذہن۔ پڑھنے کے نام سے کوسوں دور بھاگتا۔ چھوٹی موٹی چوریاں کر کے دن دن بھر گھر سے غائب رہتا۔ کبھی کوئی ڈانٹ دیتا تو اُس کی روتی ہوئی پُر احتیاج آنکھوں کی بے بسی اور اندوہ اور بھی گہرا ہو جاتا۔ اُس کا رواں رواں گویا فریاد کرتا۔ "مجھے کچھ نہ کہو۔ میری ماں نہیں ہے۔ مجھے کسی نے کبھی گود میں لے کر پیار نہیں کیا۔ رات کو مجھ پر سے لحاف سرک جاتا ہے تو میں جاڑے میں اکڑتا رہتا ہوں۔ گوگی ساتھ کی چارپائی پر بے خود سوئی ہوتی ہے۔ مجھے اندھیرے میں ڈراؤنے چہرے نظر آتے ہیں اور تب آپ ہی آپ میری آنکھیں برسنے لگتی ہیں۔"

میں مخزو کی بے بسی دیکھ کر اُداس ہو جاتی۔ یوں معلوم ہوتا جیسے کوئی مجھے بہت بلندی سے نیچے گرا رہا ہو اور مجھے بے اختیار اپنی اَن دیکھی امّی یاد آ جاتیں۔ وقت سبک رفتاری سے اپنی منزلیں طے کرتا رہا ـــــ

اکرام گوگی اور مخزو کو لے کر اپنے چچا کے بیٹے کی شادی میں گیا ہوا تھا۔ آٹھ دس دن کے بعد وہ اکیلے مخزو کو لے کر واپس آیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔

"گوگی کہاں ہے مخزو"؟ مجھ سے مارے خوف کے بولا نہیں جا رہا تھا۔

مخزو کے موٹے ہونٹوں پر ہنسی کھیلنے لگی۔ "اُس نے بیاہ ہو گیا ہے" کیسا بیا یا انکشاف تھا۔ اور اکرام اماں بی سے کہہ رہا تھا۔

"کیا کرتا آپا جی۔ بہن آرہ باندھ کر بیٹھ گئی تھی۔ کہنے لگی میرے بیٹے کو ناطہ نہ دیا تو میں یہیں ندی میں ڈوب مروں گی"

میں اور چھمو خوشی اور غم کی ملی جلی کیفیت میں ہر وقت گوگی کے بیاہ کی باتیں کرتی رہتیں۔ گوگی کے بغیر ہماری صحبتوں کی رونق آدھی رہ گئی تھی۔ میرے دل سے کسی وقت بھی اس کی یاد محو نہ ہوتی اور نصیر کھماچ کے درد بھرے سروں میں نرپا ورسی کرتا رہتا۔ "تورے نینن دیپ جلے۔ رتی سجنی ـــ"

اور ایک دن شاہدہ باجی نے اُسے ڈانٹ دیا تھا۔ "کیا اجاڑ دھن الاپتے رہتے ہو ہر وقت۔ نصیر بھائی؟ تمھارے نینن تو وہ دیپ بجھ چکے اب لکیر پیٹنے سے کیا حاصل ـــ"؟

نصیر کا چہرہ ایک دم سے ہلدی کی طرح زرد اور پھر انگارہ کی مانند سرخ ہو گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی

پُر جلال روشنی نمودار ہوتی تھی۔ وہ اس وقت اپنی عمر سے کئی برس آگے پہنچ چکا تھا۔

"نہیں نہیں، وہ دیپ کبھی نہیں بجھ سکتے۔ ان کو کسی کی تمناؤں کا خون ہمیشہ روشن رکھے گا۔ ان کی دمک اور تنویر ابد تک باقی رہے گی۔"

ہم سب حیران رہ گئے۔ ایسی عقلمندی کی اونچی سنجیدہ باتیں ہماری ٹولی کی روایت کے بالکل خلاف تھیں۔

وقت گاتا گنگناتا رواں دواں چلا جا رہا ہے!

اکتوبر کی ایک ولولہ خیز شام کے نشہ بار دھندلکے ہولے ہولے قدم بڑھاتے آ رہے تھے۔ ہلکی ہوا میں کسی لطیف خوشبو کی مہک رچی ہوئی تھی۔ لیکن دور سے کسی گوالے کی بانسری کی مدھر تانیں فضا میں تیر رہی تھیں۔ کہ اچانک فخرو اکرام کے ساتھ میرے نئے گھر کے آنگن میں داخل ہوا۔ سہما سہما گھبرایا گھبرایا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا وہ میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"بی بی۔ آج سے خدا کے بعد فخرو تمھارے سپرد ہے۔ اپنی سہیلی کے بھائی کو آپ سنبھالو۔ جب سے تم خیر سے رخصت ہو کر آئی ہو اسے تو ایسی چپ لگی۔ جیسے ہر وقت کوئی خواب دیکھتا رہتا ہو۔ خدا تمھیں ہمیشہ خوش و خرم رکھے بی بی۔ اپنی تو چار دن کی زندگی ہے۔ آج مرے کل دوسرا دن' یہ دنیا تو سرائے فانی ہے بی بی۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

جب سے شریفن مری تھی وہ ایسی ہی بڑے بوڑھوں کی سی عارفانہ باتیں کرنے لگا تھا۔ بعض دفعہ تو مجھے اس کی باتوں سے ڈر آنے لگتا۔ گھنٹوں تنہا بیٹھا ٹکٹکی باندھے خلا میں گھورا کرتا ۔۔۔

اور اس روز سے فخرو اپنے تمام سابقہ مشاغل کے ساتھ میرے پاس رہنے لگا تھا۔ نوکر، مامائیں اُس کی دشمن تھیں آنے جانے والے اکثر اُس کے مخالف ہو جاتے۔ دن بھر میں اُس کی کئی کئی شکایتیں میرے پاس پہنچتیں۔ کبھی کبھی مجھے اُس پر واقعی غصہ آ جاتا۔ مگر اُس کی روتی ہوئی آنکھیں دیکھتے ہی ساری جھنجلاہٹ پلک جھپکتے ہی غائب ہو جاتی۔ اُن آنکھوں میں اب بھی وہی احتیاج اور محرومی جاگزیں تھی۔ اُس کے سارے وجود سے ایک دل دوز سسکی پھوٹی پڑتی تھی۔

رفتہ رفتہ فخرو کا لاابالی پن آوارگی میں تبدیل ہونے لگا۔ آس پاس کے باغوں میں دن بھر غلیل سے پرندوں کا شکار کیا کرتا۔ تپتی دوپہروں میں کسی تالاب کے کنارے بیٹھا مچھلیاں پکڑتا رہتا اور جب اپنی ان مصروفیتوں سے اُکتا جاتا تو کچھ پیسے چُرا کر دو دو تین تین روز تک دوسرے شہروں کی سیاحت پر چلا جاتا اور واپس آ کر پھر اصطبل میں چھپا رہ کر شام کو چپکے سے باورچی خانہ میں خانساماں کے پاس آ بیٹھتا۔ نوکروں نے اُس کا نام فخرو پردیسی رکھ دیا تھا۔ ایک دن فخرو پردیسی میرے پرس میں سے بیس روپے لے کر ایسا غائب ہوا کہ دنوں سے ہفتے اور ہفتوں سے مہینے گزر گئے اُس کا کہیں نشان نہ ملا۔

میرے دل میں دن رات میں کتنی بار گہرے درد کی کسک اٹھا کرتی۔ کبھی شریفن کا ملتانی مٹی سے لپا ہوا چہرہ نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا۔ "کہاں ہے میرا فخرو؟ اُس کی بھیگی بھیگی آنکھیں گویا چنگاریاں برسانے لگتیں۔ "اپنی گوگی کے بھائی کا اتنا بھی خیال نہ رکھا۔"؟

کبھی اکرام کی آواز آتی "خدا کے بعد فخرو تمھارے سپرد ہے بی بی۔"

میں چونک پڑتی۔ اکرام تو جدائی کی کٹھن منزلیں طے کر کے کب کا شریفن سے جا ملا تھا۔ پھر جیسے وہ بدنکل بدلے

ہوئے لہجہ میں پوچھتا۔ "کسی کی امانت اسی طرح سنبھالا کرتے ہیں بی بی؟ سچ ہے امیروں کو غریبوں کی کیا پروا"؟
کبھی گوگی کی یاد آتی، سسرال بیٹھی بھائی کے لئے تڑپ رہی ہوگی۔ اللہ کہاں ڈھونڈواؤں فخرو کو!
سب مذاق کرتے۔ "اچھا منت مانو، پردیسی آجائے تو کیا کھلاؤ گی؟"
"چرخہ اٹھا گھمایا کرو بہو دیکھ لینا ایک دن خود بخود آجائے گا پردیسی ۔۔۔۔ برہمنی بوا بڑے وثوق سے دلاسے دیا کرتیں۔
اور ایک فوجی ہیڈ کوارٹر سے اپنے نام آیا ہوا لفافہ دیکھ کر میں حیران رہ گئی تھی، جلدی سے کھولا۔
"فخرالدین محمد خاں سپاہی فلاں کی بہن کو معلوم ہو کہ وہ سمندر پار لڑائی کے میدان میں بخیریت اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا ہے اور اس نے اپنی تنخواہ میں سے بیس روپے ماہوار اُس کے نام مقرر کر دیئے ہیں جو ہر ماہ بذریعہ منی آرڈر پہنچ جایا کریں گے"۔

جذبات کی شدت نے میرا سانس رکنے لگا۔ وفور مسرت سے آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ معلوم ہوتا تھا کائنات کی بادشاہی مل گئی ہے۔ اللہ کتنا بے پناہ خلوص تھا اُس بے وقوف جنگلی سے فخرو کے دل میں۔ فخرو پردیسی میرا بھائی! میں نے زیرلب دہرایا۔۔۔!

آخری مارچ کی ایک خنک صبح تھی ہر سو رنگ و نکہت کا سیلاب امنڈ رہا تھا۔ دور افق پر بہار کا مسرور آفتاب طلوع ہو رہا تھا جیسے کہیں لاکھوں شمعیں فروزاں ہوں۔

گہرے لاجوردی آسمان پر اس غضب کا نکھار تھا جیسے بہار جوئے کوثر میں نہا کر آئی ہو۔ برآمدہ کے ستونوں پر لپٹی ہوئی سفید چنبیلی کی بیلوں میں ننھی ننھی رنگ برنگی چڑیاں ہنس کھیل رہی تھیں۔ قریب کے گوردوارہ سے صبح کے راگ کی میٹھی تانیں کانوں میں امرت گھول رہی تھیں کہ کوٹھی کے احاطہ میں ایک غلغلہ سا برپا ہو گیا۔ "پردیسی آگیا"۔ "پردیسی آگیا"۔ سب لوگ اپنا اپنا کام چھوڑ کر لپکے آرہے تھے۔ ڈرائیور نے ایک بڑا سا لوٹ کرا لا کر برآمدہ میں رکھ دیا اور ساتھ ہی فخرو نمودار ہوا۔ فوجی وردی، تیل کنگھے سے خوب بنے ہوئے بال۔ ہنستا ہوا چہرہ۔ اللہ! فخرو کس قدر بدل گیا تھا! میرے روئیں روئیں سے خوشی پھوٹ پڑی۔

"زینب بوا دودھ کا کلسا باورچی خانہ کی سیڑھیوں ہی پر چھوڑ کر بھاگ کے برآمدہ میں آگئیں "مبارک ہو بھوجی، فخرو خیر سے گھر آگیا۔ اچھا تو ہے بٹیا؟ کوٹ اُتار دے گرمی لگ رہی ہوگی"۔
فتو باورچی۔ جلدی جلدی ٹوکرے پر لگا ہوا ٹاٹ کھولنے لگا۔ دنیا بھر کے گلے سڑے پھل ٹوکرے میں بھرے پڑے تھے۔
"کہاں سے اٹھا لایا رے یہ سڑے ہوئے پھل؟" زینب بوا کو یکا یک غصہ آگیا اور وہ گویا سال بھر پہلے کے فخرو کو ڈانٹنے لگیں۔۔۔

فخرو نے اپنی ایک مہینے کی چھٹی میں جیبوں بھر روپے خرچ کئے اور بکس بھر کپڑے سب نوکروں میں تقسیم کئے۔ اب گھر بھر میں اُس کی عزت تھی۔ ہر ایک اُس کی تعریف کیا کرتا اور جس روز وہ واپس جانے لگا تو زینب بوا نے امام ضامن کا روپیہ اس کے بازو پر باندھا۔ مالی نے موٹے موٹے ہار پرو کر اُس کے گلے میں ڈالے اور فخرو پردیسی نوکروں کی پوری فوج کے درمیان کسی فتح مند جرنیل کی مانند شان سے چلتا ہوا تانگہ میں سوار ہو گیا۔
کچھ عرصہ بعد ایٹم بموں نے جاپان کی روح کو جھنجوڑ ڈالا اور انسانیت کی غلامی اور تباہی کا نیا دور شروع ہوا۔

پھر لڑائی بند ہو گئی تو فخرو پردیسی کئی سرٹیفکٹ اور واسرائے ہند کی طرف سے شکریے کا سنہری کارڈ لیے ہوئے نوکری سے فارغ ہو کر گھر آ گیا۔ وہ گوگی سے مل کر آیا تھا اور بے حد خوش تھا۔ اُس نے بائیں ہاتھ کی چوتھی اُنگلی میں چاندی کا گھنگرو والا چھلّا پہن رکھا تھا اور دونوں ہتھیلیوں میں ہلکی ہلکی مہندی رچی تھی۔

"بی بی! گوگی نے میری سگائی کر دی ہے" اُس نے آہستہ آہستہ جھجک جھجک کر مجھے بتلایا۔ اُس کا گہرا سانولا چہرہ سونے کی مانند دمک رہا تھا۔ اور اُس کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں ازلی احتیاج اور بے بسی کے سائے بہت ہلکے پڑ گئے تھے۔

"جب میں گوگی کے یہاں پچھلی بار گیا تھا تب وہ لڑکی اُن کے یہاں آئی ہوئی تھی۔ تیلی پتلی سی ہے لمبی سی گیہواں رنگ ہے۔ قرآن شریف اور اردو پڑھی ہوئی ہے۔ گوگی کہتی تھی اب تو لکھنا بھی سیکھ گئی ہے کروشیا اور سلائیوں کا کام بھی جانتی ہے۔ آپ کو بہت پسند آئے گی۔ گوگی کہتی تھی بی بی سے ہاتھ باندھ کر کہنا یہ ناطہ ضرور منظور کر لیں" فخرو ایک سانس میں سب کچھ کہہ گیا۔

میں ہنس پڑی "ارے تو تو کہانی کہنے لگا۔ شادی کب کریں گے وہ؟"

"عید کے چاند میں کر دیں گے بی بی۔ آپ گوگی کو تاریخ لکھ بھیجیں!"

"اور تیری اُس جاپانی منگیتر کا کیا ہوگا جس کی تصویریں جیبوں میں بھرے پھرتا تھا" فخرو کھسیانہ ہو گیا۔

"وہ تو لوٹنے کھانے کے لئے یونہی جھوٹے وعدے کرتی رہی تھی۔ آخر میں صفا مکر گئی۔ کہتی تھی "میرا منگیتر لڑائی میں گیا تھا اب تک لوٹ کر نہیں آیا مگر میری ماں کی روح مجھے بتلا گئی ہے کہ وہ برما کے گھنے جنگلوں میں دشمن کی نظر سے چھپا ہوا زندہ سلامت موجود ہے۔ اب میں اُس کا انتظار کر رہی ہوں۔ یونہی اُس کی راہ دیکھتی رہوں گی چاہے ساری عمر گذر جائے اگر تھک گئی تو ایک دن ہیراکیری کر لوں گی"

میں نے کہا مر کمبخت حرام موت!

وقت چلتے چلتے دفعتاً ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

عید کے چاند میں عظیم ہندوستان میں آزاد بھارت اور آزاد پاکستان کا پندرہ اگست کا سورج طلوع ہوا اور سنہرے شاداب پنجاب کے باشندے پاگل ہو گئے۔ یہاں کے لہلہاتے ہوئے کھیت جھلس گئے۔ رچپالیں اور ترنجن ویران ہو گئے۔ اس کے پانچوں دریاؤں میں پانی کی جگہ خون بہنے لگا اور انہی دنوں کسی درندے نے فخرو کو بھی پچھاڑ کھایا اور اُس کی ہونے والی ساس جمنا پار کے دیس میں میٹھی گوگی کے خط کا انتظار کرتی رہی اور اُس کی منگیتر اپنے دولھا کے لئے اونی مفلر سلائیوں پر بنتی رہی اور کروشیا کے رومال تیار کر کر کے رکھتی رہی اور گوگی قافلہ در قافلہ ہانکے ہوئے انسانوں کے ساتھ آکر چناب کے کنارے ایک بستی میں آ بسی!

پرسوں شام قیامت کا اُمس تھا۔ جھینگر زور زور سے بول رہے تھے۔ ساون کی شام کا ناگوار اندھیرا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ پچھلے صحن کی بجلی کب کی جل چکی تھی۔ - - - - - - - - - - - اوپر پروانوں کے ڈھیر کے ڈھیر جل جل کر نیچے گر رہے تھے۔ میں برآمدہ کی سیڑھیوں پر کھڑی تھی کہ یکایک کہیں سے کوئی نمودار ہو گئی۔ اُس کے ساتھ ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ گہرا سانولا رنگ، موٹے موٹے ہونٹ، سر پہ اُلجھے ہوئے گھنے بالوں کا چھتہ۔ میرا ذہن بجلی کی سی تیزی سے

برسوں پیچھے کی طرف گھوم گیا۔ جب ایک شام کو گوگی فخرو کو ساتھ لئے دادی اماں کے صحن میں داخل ہوئی تھی اور میں اسی طرح خوشی سے پاگل سی ہو گئی تھی۔ میرے سامنے گوگی کھڑی تھی اپنی اسی رعنائی اور کشش کے ساتھ۔ ماہ وسال کے طویل سفر سے اس میں ذرہ بھر بھی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ ہائے کتنی طویل جدائی کے بعد مجھے گوگی ملی تھی! مگر ــــــ شاید گرمی کے باوجود مجھا میرے جسم میں سر سے لے کر پاؤں تک سردی کی اذیت ناک لہر دوڑ گئی ــــــ

"گوگی تیری آنکھوں کو کیا ہوا؟" الفاظ میرے خشک گلے میں اٹکے جا رہے تھے ــــ

"پھوٹ گئیں۔" گوگی نے بڑی ناگواری سے جواب دیا۔

"کیسے پھوٹ گئیں۔ کب پھوٹیں؟"ــــ

"پارسال جاڑوں میں پھوٹ گئی تھیں۔" گوگی نے مشین کی طرح دہرایا۔ اور پھر جیسے اچانک نیند سے چونکی ہو۔ "بی بی فخرو کہاں ہے؟ میں تو فخرو کو ڈھونڈنے آئی ہوں۔"

گوگی اپنے باپ کی امانت مجھ سے طلب کر رہی تھی۔ میں لرز گئی ــــ

"فخرو تو پیچھے ہی رہ گیا تھا گوگی۔" میں نے رندھے ہوئے گلے سے بتایا ــــ

گوگی دھم سے سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ جیسے صدیوں کے مسلسل سفر سے تھک کر گر پڑی ہو ــــ

اور پرسوں شام سے میں طرح طرح سے گوگی کو جگانے کی کوشش کر رہی ہوں بیتی بیتی باتیں ایک ایک کر کے دہرائیں۔ ایک ایک سہیلی کا نام لیا۔ میں نے اسے نصیر کے قہقہے اور گیت یاد دلائے لیکن گوگی کو سوائے فخرو کے کچھ بھی یاد نہیں رہا اور کل شام اس نے بڑی کرب ناک بے بسی سے خود ہی اعتراف کر لیا ــــ "بی بی مجھے کچھ یاد نہیں آتا میرے چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ اجالے کی ایک کرن بھی کہیں نظر نہیں آتی میں تمہیں کیا بتاؤں مجھے تو بس فخرو یاد ہے۔ فخرو میرا بھائی وہ تمہارے پاس رہتا تھا نا۔ اس کے ساتھ مجھے تم بھی یاد ہو۔ بڑی مشکل سے ڈھونڈا ہے میں نے تمہیں بی بی! اسلم کے ابا نے کوئی جگہ نہیں چھوڑی جہاں سے تمہارا پتہ نہ لیا ہو۔ بڑی مشکل سے ملی ہو تم بی بی۔ مگر فخرو تو یہاں بھی نہیں ہے۔ اس کی منگیتر جمنا پار کے دیس میں بیٹھی اس کی راہ دیکھ رہی ہے۔ اس نے کہیں اور بیاہ کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے کہتی ہے۔ عمر بھر اس کا انتظار کرتی رہوں گی۔ اس کی ساس کے ہمارے پاس خط پر خط آ رہے ہیں۔ مگر فخرو تو یہاں بھی نہیں ہے!"

گوگی کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں میں ڈوب گئی۔

"تیری آنکھیں کیسے چلی گئیں گوگی؟" ــ میں گوگی کی آنکھوں کا پتہ پا لینے پر مصر تھی ــــ

گوگی نیم بیدار ہو گئی۔ "جب سے یہاں آئے ہیں ایک ہی تو لحاف ہے بی بی۔ بوا، اسلم کا ابا، اسلم اور میں بڑے عذاب سے کٹتے ہیں جاڑے۔ میں رات کو کوٹھری میں آگ روشن رکھنے کے لئے دن بھر جنگل سے لکڑیاں چن کر لایا کرتی تھی۔ کانٹوں سے میرے ہاتھ لہولہان ہو جاتے تھے۔ کپڑے پسر پسر ہو گئے تھے اور ایک دن ایک کانٹے دار جھاڑی کی سولیں آنکھوں میں بھی گھس گئیں اور میرے چہرہ پر خون کی دھاریں بہنے لگیں پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ جب میں جاگی تو چاروں طرف اتھاہ تاریکی پھیلی ہوئی تھیں اور میں زور زور سے رونے لگی تھی میں ایسے گھور اندھیرے میں فخرو کو کیسے ڈھونڈوں گی؟ ــــ گوگی اپنی خالی آنکھوں کی لمبی لمبی پلکیں جھپکا جھپکا کر آہستہ آہستہ بول رہی تھی ــــ اور مجھے بے ساختہ نصیر کے کئی برس پہلے کے الفاظ یاد آ گئے ــــــ "وہ دیپ کبھی نہیں بجھ سکتے۔ ان کو کسی کی تمناؤں کا خون ہمیشہ روشن رکھے گا۔۔۔!"

لیکن ٹی بی کے تیز بخار نے نصیر کا خون خشک کر دیا تھا پھر گوگی کی آنکھوں کے چراغوں کی تو میر کیسے باقی رہتی!

ضیاء محی الدین

ستمبر کی ایک رات

پھر شام ہو گئی ہے ثاقب میری جان تم اس طرح ٹکر ٹکر کیوں دیکھ رہے ہو۔ تم شام کی اس بڑھتی ہوئی تاریکی کو کیوں نہیں دیکھتے، تم چپ ہی رہنا چاہتے ہو۔ تو آنکھوں میں تھوڑی سی یاس، تھوڑا سا حزن کیوں نہیں بھر لیتے، خواہ مخواہ دیکھے جاتے ہو ایک ہی چیز پر نظریں کیوں نہیں جما لیتے، تھوڑی دیر کے بعد جب یہ دھندلی دھندلی روشنی کچھ نیلی کچھ بھوری ہوئی شروع ہو گی تو ایک دم نظریں ہم پر گھما دینا اور کہنا۔ "دیکھو یہ عجیب بات، خدا کی قسم میں نے اس طرح بڑھتے ہوئے اندھیرے اور سیاہی کا امتزاج کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہ بڑے مزے کی حس ہے۔ دیکھتے دیکھتے کچھ احساس باقی نہیں رہتا۔ اور اسی سوچ میں کہ پوری طرح اندھیرا کب ہو گا۔ سب چیزیں، سب رنگ عجیب طرح گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ سب خیال گم ہو جاتے ہیں۔ کوئی رنگ رنگ نہیں . . ."

عاصم اپنی آنکھیں کھول دیتا ہے، پھر میز پر پڑی ماچس جلاتا ہے، پھر خود ہی بجھا دیتا ہے۔

صدرالدین عاصم، تم کب تک ماچس جلا جلا کر خوش ہوتے رہو گے میں تمھیں ایک سگرٹ بھی منگوا دیتا ہوں، مگر تم یہ تیلی یہ بار بار جلانا چھوڑ دو، اور اگر تم اتنے ہی بیزار ہو جتنی تم ماچس جلاتے ہو، تو پھر تم سو جاؤ، آنکھیں بند کر لو یا کوئی بے معنی سا لوک گیت شروع کر دو تاکہ ہم جان لیں کہ اس دنیا میں سب مور کھ بور کبھی ہیں۔ اور پھر تمھیں جھنجھوڑیں اور تمھاری بیزاری پر چند منٹ قہقہے لگائیں اگرچہ تم پھر بھی اتنے ہی بیزار رہو گے، اور یہ تمھاری سب سے بڑی کمزوری ہے . . . . اور کیا دنیا میں کوئی ایسا وسیلہ نہیں کہ تم سارا وقت بنیان پہن کر سوتے رہو، اوندھے لیٹ کر پڑھتے رہو۔ —— عاصم تم ایسے آدمی ہو کہ تمھیں صرف مزدوری کرنی چاہیئے۔ —— ورنہ تم مر جاؤ گے —— مر چکے ہو تم —— صدرالدین عاصم اگر تم جینا چاہتے ہو تو آؤ میں تمھیں کسی بارود خانے میں سگرٹ بھرنے پر نوکری دلوا دوں . . . . ثاقب ثاقب آؤ اس شخص کا کچھ کریں ثاقب!"

"ہاں بھئی ضرور اس کا کچھ کریں"

"ثاقب اگر تم سگرٹ پینا نہیں جانتے تو مت ضائع کرو۔ تمھیں سگرٹ ضائع کرنے میں کیا مزا آتا ہے —— تم آرام سے بیٹھے رہا کرو۔ یا زیادہ سے زیادہ اپنی عینک کو اپنی ناک پہ ٹھیک زاویے پر رکھنے کی کوشش کرتے رہا کرو۔ اس سے زیادہ میں تمھیں کچھ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا —— تم میرے چٹکی مت لو —— یہ نہایت فضول قسم کا بدلہ ہے یہ بزدلی ہے آخر تم اعلانیہ کیوں نہیں جنگ کرتے چپکے سے سوئی دوئی چبھونا یا جلتا ہوا سگرٹ کلائی پہ رکھ دینا، بالکل جاپانی قسم کی حرکت ہے —— —— اب اس میں ہنسی کی کون سی بات ہے —— یہ ہنسی بالکل شکست خوردہ ہنسی ہے، لیکن اگر تم اپنی اس ہنسی میں عاصم کو بھی ڈبو لو

تو پھر میں تمھیں ایک نہایت فاتحانہ ہنسی ہنس کر دکھاؤں گا ـــــ عاصم کبھی تم نے ہنسی کے مختلف پہلوؤں کے تجزیوں پر بھی غور کیا ہے ـــــ میرا مطلب کھسیانی یا اداس ہنسی سے نہیں، میرا مطلب ہر دو قسم کی ہنسیوں میں آواز کی مطابقت سے ہے لطیف ہنسی میں سے نکلتے ہوئے نغموں کے پیچھے .... عاصم ٹانگ ہلاتے ہلاتے کہتا ہے: "چپ رہو"

"علو کے ماتھے پر صرف ایک شکن پڑتی ہے لیکن وہ رُکتا نہیں۔

.... "میرا مطلب ان گھنگھروؤں سے ہے جو نغموں کے پیچھے بجتے ہیں، جیسے ایک تال سی دی جا رہی ہو۔ یہ تال بھی خوب ہے تال نہ سہی"........

"خدا کے لئے چپ رہو"

"ثاقب تم مجھے چپ نہیں کرا سکتے، میری زبان پر تو بڑی مدت سے تالا پڑا تھا، آج آپ ہی آپ کھل گیا اور میں اس وقت تک چپ نہیں کر سکتا۔ جب تک کو کہ جلی ماری پھرتی ہے، ہیں اس وقت تک خاموش نہیں ہو سکتا جب تک عاصم کا چہرہ دو کان پر ٹنگے ہوئے سائن بورڈ کی طرح لٹکتا رہے گا، اور جب تک تمھاری آنکھیں اِدھر سے اُدھر بھاگتی رہیں گی، جیسے انھیں کسی موضوع کی تلاش ہو آخر تمھیں کس موضوع کی تلاش ہے، تم یوں ہی کسی انوکھے موضوع کی تلاش میں ساری عمر پریشان رہو گے اور آخر میں اپنی عظمت اور موضوعات کی لستی کا خیال لئے مر جاؤ گے۔ لیکن کیا تم مرنے سے پہلے اپنی ڈائری نہ لکھو گے ـــــ او ثاقب ـــــ"

"کیا واہیات بات ہے، یہ تم بار بار مرنے کا ذکر کیوں کر رہے ہو" ثاقب کوشش کے باوجود اپنے چہرہ پر غصّہ نہیں لا سکتا۔

"تم سب مردہ ہو، ہم سب مردہ ہیں، تم موت سے اتنا کیوں گھبراتے ہو، کیا تم میں کوئی جوانمردی باقی نہیں رہی۔ کیا تم کیسا بیانکا کی نظم بھول چکے ہو۔ کیا تم اسکول میں سیکھے ہوئے وہ تمام اقوال بھول چکے ہو جن میں جاں بازی سے مرنا ہی زندگی کی سب سے بڑی تکمیل ہوتی ہے۔ کیا تم ...."

عاصم کرسی کے دونوں بازو پکڑ کر اٹھنے کی دھمکی دینے کی کوشش کرتا ہے۔ "خدا کی قسم علو اگر تم نے اپنی بکواس بند نہ کی تو میں کچھ کر بیٹھوں گا۔"

"ہاں ہاں ہاں! علو اب تم چپ کرو۔ تم اس قدر بول چکے ہو کہ اب تمھاری باتوں میں کوئی چاشنی نہیں رہی۔ تمھاری تمام شوخی ختم ہو چکی ہے۔ خالی خالی باتیں کرنے سے کیا فائدہ۔"

علو بکواس بند کر دیتا ہے۔

مگر خاموشی سے ثاقب کی الجھن اور بڑھ جاتی ہے۔ عاصم کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں، بڑھتے ہوئے اندھیرے میں صرف ایک کام ہو سکتا ہے، یہاں سے فوراً جانا چاہیے۔ او عاصم، چلو چلیں۔

"کہاں چلیں؟"

"ثاقب تمھیں اس جگہ میں کیا خوبی نظر آئی مجھے تو یہاں وہ بید کی آرام دہ کرسیاں بھی نظر نہیں آتیں جن کا تم ذکر کر رہے تھے، مجھے ان کرسیوں پہ بیٹھ کر عجیب حفاظت کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں پر تو صرف مونڈھے ہیں۔ جن پر چمڑہ منڈھا ہوا ہے اور جو صرف چودھری فتح اللہ کے گھر کے برآمدے میں رکھے ہوتے ہیں، ـــــ بھلا ان مونڈھوں پہ بیٹھنے کے لئے ہم کیوں اتنی دور سے آئے .... صدر الدین عاصم اگر زندگی رہی تو یہاں کبھی نہیں آئیں گے ـــــ"

"علو یہ تمھاری بہت زیادتی ہے ـــــ اگر یہاں مونڈھے ہیں تو کیا حرج ہے۔ یہاں باغ تو ہے۔ پھر یہ بھولو کہ ہم چمن

میں بیٹھے ہیں، بس یہ روشنی ذرا زیادہ ہے، ورنہ یہ چھوٹا سا ریسٹوران کچھ اتنا برا نہیں۔ اس کا نام تو دیکھو۔ سکون
"ثاقب کہتا ہے "نہیں بھئی یہ جگہ بہت عمدہ ہے ——— کم از کم مجھے
"ثاقب تمہاری پسند دن بدن تیسرے درجے کی ہوتی جا رہی ہے۔
عاصم کی بیزاری کچھ کچھ ختم ہو رہی ہے، وہ فوراً شربت انار کے ۳ گلاس منگوا لیتا ہے۔
مگر ثاقب کو اس قسم کی چیزوں سے نفرت ہے۔ وہ عاصم سے صاف صاف کہہ دیتا ہے۔ کہ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ چار منٹر منگوا کر انھیں "ایسف گول" میں گھول کر پی جائے، اور اگر اسے صحت ہی مقصود ہے تو اسے چاہیئے کہ وہ یہاں آنے کی بجائے کسی امریکن بار میں جا کر ملک شیک پیئے ———
عاصم پنجابی نہیں سمجھا، اُسے ایسف گول کا کچھ پتہ نہیں لیکن وہ اس کے باوجود مسکرا دیتا ہے۔ عاصم کی مسکراہٹ میں بڑی تازگی ہوتی ——— جیسے ایک دم انار کی پھانک کھل جائے۔
علو سارے ماحول سے بڑی لاتعلقی کا اظہار کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے کو بالاتر محسوس کرنے کے لئے چہرے پر کچھ اتار چڑھاؤ لاتا ہے۔ لیکن ٹھہر ٹھہر کر آنکھوں کے کونے سے اردگرد بھی دیکھ لیتا ہے، اس کے آنکھوں کے دیکھنے کے انداز سے وہ شریر بچہ یاد آ جاتا ہے جو اباکے کہنے پر بھری محفل میں فر فر نظم سنا کر ناواقف مہمانوں کو داد لینے کے لئے دیکھتا ہے۔
"عاصم"
"ھنہہ"
"تم نے وہ کتاب ختم کر لی"
"کون سی کتاب"؟
"وہی سب تمہارے ..."
"ارے وہ! ہاں میں نے شروع کر دی ہے"
"لاحول، تم کس قدر سست ہو، اب تک وہ تمہیں تین دفعہ پڑھ لینی چاہیئے تھی"
"نہیں اب میں اسے جلد ہی پڑھ لوں گا۔ میرا خیال ہے میں آج ہی رات ختم کر لوں گا" پھر کچھ دیر ٹھہر کر عاصم ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھتے ہوئے کہتا ہے۔ "میں یقیناً اسے آج ہی ختم کر دوں گا" ——— عاصم جب اس طرح باتیں دہرانے لگے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب اگر اسے سگرٹ نہ ملا تو پھر امریکی جمہوریت ساری دنیا پہ چھا جائے گی"
"ارے! وہ تو میں نے علو کو دی تھی"
علو جھگڑا نپٹانے کے انداز میں کہتا ہے "بکو مت، میں نے اس کی شکل تک نہیں دیکھی"
ثاقب جھنجھلا جاتا ہے۔ وہ عینک کو ناک پر پھیر کے جما کر مظلومانہ طریقے سے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ دراصل ثاقب کو سب سے زیادہ شکایت اس بات کی ہے کہ لوگ اس کی بتائی ہوئی کتابیں نہیں پڑھتے، بس مانگ لیتے ہیں۔ اور اب اس بات کو وہ اتنا بڑا جرم بھی نہیں سمجھتا، بیٹھے بیٹھے اسے خیال آ جاتا ہے۔
"او عاصم کیا خبر ہے آج"
"کچھ نہیں" ———

"کچھ کیوں نہیں "

عاصم پھر مسکرا دیتا ہے، میں کہتا ہوں ثاقب یہ جگہ تو بہت ہی ذلیل ہے۔ یہ انار کا شربت چکھا ہے۔ یہ تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے گرا میں لیموں ملا دیا گیا ہو"

اور ثاقب تمھاری دو لڑکیاں کہاں ہیں جو اس "سکون" کو چلاتی ہیں ——— علو اپنے مطلب کی بات چھپا نہیں سکتا۔

لیکن ثاقب اپنی نظریں اسی بورڈ پر جمائے رکھتا ہے۔ جس پر۔ کریمی دواخانہ کا اشتہار سب لوگوں کو وہاں کے شربت عناب کی زندگی بخش فرحت کا مزا لوٹنے کی درخواست کر رہا ہے، وہ اس طرح دیکھتا ہے جیسے اسے اس بات پر واقعی ندامت ہو رہی ہے کہ وہ کیوں اس جگہ پر آئے؟ ——— اور علو سوچتا ہے کیوں نہ وہ بھی کسی بے معنی سی چیز کو ٹک ٹک دیکھنے لگ جائے لیکن کوئی چیز ایسی بے معنی نظر نہیں آتی، کچھ لوگ چلتے پھرتے دکھائی نظر آتے ہیں ——— ادھیڑ عمر عورتیں ——— چند نوجوان بنے ٹھنے، پانچ چھ پان کھائے ہوئے لمبے بالوں والے کالے آدمی، پیروں میں سفید پلاسٹک کی جوتی، جن کی طرف دیکھتے ہی اسکول میں پڑھنے والی برقعہ پوش لڑکیوں کے چہرے کان سرخ ہو جاتے ہیں۔ ——— یہ تو وہی جانا پہچانا منظر ہے ——— کوئی نئی بات نہیں، رات کو تو یہی ہوتا ہے ——— دن کی اور بات ہے، دن میں گھاس کتنی پژمردہ نظر آتی ہے ——— صرف درختوں کے سائے کے نیچے تھوڑی سی طمانیت ——— لیکن وہاں پر بھی لیٹی ہوئی سائیکل کے پاس سنجیدہ طالب علم بودھ راج کی تاریخ پڑھ رہا ہوتا ہے ——— اور علو کی آنکھیں بودھ راج کی تاریخ سے ہٹ کر اس انگریز کی طرف آ جاتی ہیں جو خاکی نیکر پہنے درخت کے تنے کا سہارا لئے جوتوں کو دیکھنے میں مشغول تھا ———

دیر تک اسے دیکھنے کے بعد علو کو خیال آتا ہے کہ اگر یہ فن کار ہے تو اس کی ٹانگیں اتنی موٹی کیوں ہیں " اور وہ اسے اور گھورنے لگ جاتا ہے جیسے ابھی کسی اہم راز تک پہنچنے والا ہے، اور وہ اپنی آنکھوں کو اور زیادہ متجسس بنا لیتا ہے ——— وہ ان بڑھتی ہوئی سرگوشیوں کو بھی نہیں سنتا جو ثاقب اور عاصم ہاتھ مار مار کر کر رہے تھے ——— لیکن علو کا تجسس آندھی کے پہلے تیز بگولے کی طرح جلد ہی ختم ہو جاتا ہے اور اس کی نظریں پھر اسی میز پر آ جاتی ہیں۔ جہاں تین گلاس پڑے ہیں اور جن میں انار کا شربت ختم ہونے کو ہے ——— اس بات پر بہت خوشی ہوتی ہے کہ آخر یہ گلاس خالصتاً بے معنی چیز ہے۔

..... ثاقب کا خیال ہے کہ کچھ بھی ہو تیسری جنگ میں تمام کا تمام جرمنی روس کا ساتھ دے گا ——— وہ اس کے ثبوت میں یورپ کی اسمبلی کا نقشہ کھینچتا ہے جس میں جرمنی کا سوال اٹھا تھا۔ لڈل ہیگ کی کتاب کا حوالہ دیتا ہے، اتحادی جرمنی کے لیڈروں کی تقریریں بیان کرتا ہے۔

مگر عاصم کو یقین ہے کہ ثاقب سرے سے سیاست کو سمجھتا ہی نہیں۔ اور اگر سمجھتا ہے تو پھر انگریزوں کی چالوں سے واقف نہیں، اور اگر واقف ہے تو پھر اس نے پچھلی دو جنگوں کا سیاسی تجزیہ نہیں کیا، اور اگر یہ بھی کیا ہے۔ تو پھر وہ بالکل جاہل ہے ———

علو چپکے سے پھر ایک دفعہ کمرے میں جھانک لیتا ہے۔ لیکن وہاں کوئی نہیں صرف اورنج سکویش کی بوتلیں ہیں اور ایک شیشے کی الماری میں لکس کا صابن ——— "ہیلو شامپو" کی شیشیاں ہیں ——— پرے بتی کے نیچے کچھ لوگ بیٹھے ہیں، جن میں سے ایک ہاتھوں کو یوں ہلا رہا ہے جیسے رجز پڑھ رہا ہو ——— خالی میزیں ——— بے رنگ و روغن میزیں ——— پھر بتیاں بجھ جاتی ہیں ——— اندھیرے میں میزوں کا رنگ عجیب ہو جاتا ہے۔ نہ کالا نہ پیلا۔

عاصم کہتا ہے جنگ ہو ہی نہیں رہی ....

" خدا کے واسطے عاصم تم سیاست کو ختم کرو۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا اور کیا ہم کوئی اور گفتگو نہیں کر سکتے؟ "

"ہاں! ہاں بھئی ہاں ـــــ علو بتا کیا بات کریں؟
"اس وقت صرف سستے بازاری ناولوں کی باتیں ہوں گی۔"
ہاہا! عاصم کو یہ بات بہت بھاتی ہے، بازاری ناولوں کا مطالعہ اس سے زیادہ کسی شخص کا نہیں۔"
ثاقب پوچھتا ہے" علو پھر جب پاک دامن ہیروئن نے بدمعاش کی آنکھیں کھول دیں تو پھر کیا ہوا۔"
علو شروع ہو جاتا ہے ـــــ "ناظرین جب وہ بدمعاش کسی طرح نہ پسیجا۔ بلکہ الٹا ہماری ہیروئن سے بھونڈے بھونڈے مذاق کرتا رہا تو اس ماہ وش نے کڑک کر کہا ـــــ او کمینے رذیل انسان یہ اچھی طرح سُن لے کہ میں تیری کسی چال میں نہ آؤں گی بلکہ الٹا خدا کا قہر تجھ پر لاؤں گی اور عفت مآب دوشیزاؤں کے چھیڑنے پر سخت سے سخت سزا دلواؤں گی ـــــ او سفلے ....
"نہیں نہیں یہ تم کیا کر رہے ہو ـــــ اس سے پہلے تو ہماری پری وش دست بستہ خداوند تعالیٰ کے حضور میں دعا مانگتی ہے۔"
عاصم کو پوری کتابیں یاد ہیں۔
"ہاہا یہ ٹھیک ہے۔"
ثاقب عجیب طرح ہنستا ہے ـــــ اپنے ہی اندر ـــــ اندر ہی اندر ـــــ" یہ بہت ٹھیک۔"
جھک کر بیرا تینوں گلاس اٹھا لیتا ہے ـــــ بند ہو گیا صاحب، ساڑھے دس ہی ـــــ بند کر دیتے ہیں اب تو دس منٹ اوپر ہو گئے۔

یہاں کوئی بنچ خالی ہی نہ تھا وہ تو بڑی آس لگا کر آئے تھے، چلتے چلتے بہت تھک گئے مگر پارسی کا بت قریب ہی تھا، ثاقب نے کہا وہاں بنچ ملیں گے ـــــ پارسی کے بت کے گرد چھوٹا سا قطعہ تھا، جیسا ہر مجسمے کے چاروں طرف ہوتا ہے، تھوڑی سی گھاس اور ٹھنڈے بے جان بنچ ـــــ مگر ہر بنچ پر کوئی نہ کوئی سویا ہوا تھا۔ یہ کیا شرافت ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ اگر گھر بار نہیں ہے تو زمین پر سوئے فٹ پاتھ پر سوئے ـــــ بنچ پر چڑھ کر سونے میں کیا تک ہے۔
"بھلا تم ہی کہو عاصم! کیا اس ہری بھری گھاس پہ سونے میں زیادہ لطف نہیں آتا؟"
عاصم بغیر کچھ کہے گھاس پر بیٹھ گیا، علو بھی جل بھن کر بیٹھ گیا۔ پھر ثاقب نے جیب سے رومال نکال کر نیچے بچھایا اور اس پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا ـــــ چار چار پانچ پانچ کی ٹولیوں میں دو تین گروہ بیٹھے تھے تاش اڑ رہی تھی ـــــ پولیس کا ایک سپاہی قریب سے گزرا اور کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد ایک ٹولی میں شامل ہو گیا، چاروں طرف اجلی اجلی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ صرف تاش کھیلنے والوں کے بلغمی قہقہے کبھی کبھی اس کو جھنجوڑ دیتے جیسے بجلی کی تاریں فضا میں لرزش سی پیدا کر دیتی ہیں .... ایک سائیکل سوار بڑی آہستہ آہستہ آ رہا تھا بت کے قریب پہنچ کر وہ سائیکل سے اتر پڑا ـــــ آرام سے جوتے اتار کر دونوں گھٹنوں پر بازوؤں کی تثلیث بنا کر کافی دیر بیٹھا رہا ـــــ پھر جوتے پہن کر سائیکل پر پیر رکھ دیتے اور" بت کدہ بت اور خدا کو جو خدا کہتے ہیں" گاتا ہوا گزر گیا۔
"ثاقب میری جان یہ بہت بڑا کیرکٹر ہے۔"
"ہاں بھئی" ـــــ
ارے پھر وہی انگریز ـــــ علو کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ انگریز انگریز نہیں بلکہ دکھ کا مارا کوئی انسان ہے جو ابھی اسے اپنی بپتا سنائے گا، اور سنانے سے پہلے کہے گا" صاحب آپ میرا کیا پوچھتے ہو۔ مگر علو تو اس کی داستان سننے کے لئے

بے تاب تھا اور اس نے خیال ہی خیال میں اس انگریز سے دوستی پیدا کرلی۔ اس کی کہانی سنی ——— اسے تسلی دی پھر اسے مہمان بنا کر گھر بھی لے گیا۔

"سنو یہ شخص وہاں بھی تھا ——— وہاں یہ ———"

"ہاں یہ خفیہ پولیس کا ہوگا" ——— عاصم کا تو یہ تھا کہ بغیر سوچے سمجھے ہانک دیتا ہے۔

"کون ——— کون" ثاقب اسے اپنی عینک سے ڈھونڈھنے لگا۔

"آہستہ بولو! وہ دیکھو عین ہٹ کے نیچے ——— کبھی تم نے آج تک کسی انگریز کو اس طرح پٹری پر بیٹھے دیکھا ہے، میں کہتا ہوں یقیناً یہ کوئی فن کار ہے ——— کوئی آڈن واڈن کا ہم پلہ"

ثاقب نے کہا "یا تو یہ فن کار ہے! یا ضرور گھر سے لڑ کر آیا ہے"۔

"تو اگر یہ فن کار ہے تو۔ پھر یہ اتنا موٹا کیوں ہے" ——— عاصم کو بھی یہی اعتراض تھا۔

"آہا آہا عاصم۔ کیا بات کہی تم نے ——— تم بہت بڑے آدمی ہو، تم نے بالکل وہی بات کہی جو میں سوچ رہا تھا۔ تم بہت مردم شناس ہو ——— واہ واہ"!

"ارے یہ تم کو کیا ہوا؟"

ثاقب ہنسا پھر اسی طرح گھل گھل کر ———

پھر ہنسی کی لہریں سکڑ گئیں وہی پرانا کہر چھا گیا ——— ہوا کے جھونکے چھو کر نکل جاتے بغیر جسموں میں رچا ڈ پیدا کئے ——— ایک عجیب دُھلا دُھلا سکون آہستگی سے بڑھنا شروع ہوگیا "بتیوں کی روشنی نقطے بن بن کر آنکھوں سے دور ہوگئی ——— پہلے عاصم نے آنکھیں بند کیں ——— پھر ثاقب نے ہتھیلی پر ماتھا رکھ کے آنکھوں کو سمٹا لیا ——— یہ کیسا حجاب تھا، کہ آنکھیں بند ہوتے بھی دلوں میں اتنی ہی ٹھنڈک تھی ——— سوچ وہی تھی پر بھٹک اپنی اپنی تھی۔

تب عاصم نے سوچا وہی خنکی ہے، وہی گھاس کی نمی ہے، ہواؤں میں بھی وہی بوجھل پن ہے پھر ڈھاکہ میں اور یہاں میں کیا فرق ہے۔ ڈھاکہ میں دل ہے تو کیا، لوگ تو یہاں پر بھی ہیں، اس پھیلتے بڑھتے شہر میں بھی دل ہے ——— دل تو روحوں میں بستا ہے پھر جب کتنی ہی سلونی سلونی صورتیں آنکھوں میں چمک لئے اس کی نظر سے گزر گئیں تو اُس نے کہا۔

"سب جگہیں ایک سی ہوتی ہیں"

ثاقب کی آنکھیں بند ہی رہیں اس نے کہا ——— یہ بالکل غلط ہے، ہر جگہ اپنی اپنی جگہ ہوتی ہے، لاہور......"

"یہ کیا فضول بات ہے ——— جغرافیہ کا فرق ہوتا ہوگا ——— پر لوگ تو وہی ہوتے ہیں ——— میلے کچیلے ——— سر جھکا کے چلنے والے۔

میں لوگوں کی بات کب کہہ رہا ہوں، میں تو لاہور کی بات کر رہا ہوں!"

(ثاقب ——— خواہ کچھ بھی نہ ہو یہ ظاہر ضرور کرے گا کہ کتنی ہی یادیں اس کے دل کو چھید رہی ہیں ——— کچھ کہنے کی بجائے ٹھنڈی سانس بھرنے لگا)

سکون، میں کچھ کھڑاؤ پیدا ہوگیا، جسے سب نے ایک ہی بار محسوس کر لیا، اٹھتے ہوئے قہقہوں کی آواز مدھم پڑنے لگی ——— علو نے دیکھا ایک اور آرٹسٹ چپ چاپ آ بیٹھا ہے ——— پتلون کے پائنچے الٹے کٹے ہوئے جیسے مرکی لڑکیاں

پکنک پر جاتے وقت کرتی ہیں، اکڑوں بیٹھا وہ گھاس کے تنکے اکھاڑ کر ہوا میں چھوڑتا رہا ——— عاصم کہہ رہا تھا تب یہ لوگ اس طرح بنچوں پر نہیں سوئیں گے۔ تب یہ اپنے خوش نما گھروندوں میں سوئیں گے ——— تب ان بنچوں پر صرف ہم سے بے فکرے اور خوش باش بیٹھیں گے۔"

"علو کو ایسا موقع بہت کم ہاتھ آتا ہے ——— " عاصم۔

"ھنہہ"

"ہم بے فکرے ہیں؟"

"ھنہہ"

"اور ہم خوش باش ہیں"

"ہاں؟"

یہ تم ہمیں بے فکر کہہ کر اپنے کو دھوکا مت دو۔

"ثاقب علو سے کہو بکواس بند کرے اور گانا سنائے"

"نہیں میں نہیں گاؤں گا ——— میں اُداسی نہیں چاہتا"

انگریز سگرٹ پہ سگرٹ پینے کے بعد چلا گیا۔ آرٹسٹ پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا۔

"علو کچھ تو گا دو"

"نہیں"

"تو پھر انٹیلیکچوالزم"

"نہیں ہرگز نہیں"

"تو پھر؟"

"چلو یہاں سے چلیں"

ارے کہاں؟

"صدر الدین عاصم تم کہنا ماننا کب سیکھو گے"

میں نہ کہیں جاؤں نہ اٹھوں۔

علو اٹھ کھڑا ہوا

"علو کہاں؟"

"کسی ہنگامے والی جگہ پر"

ثاقب کو ترنم سے گانا نہیں آتا ——— مگر وہ ہلکے ہلکے گنگنانا شروع کر دیتا ہے "چلے تھے یار کہ ....."

ثاقب کوئی شعر؟

ثاقب اس کباب والے کی دوکان کا ذکر کرتا ہے جس کے باہر ایک پینٹنگ ہے پھر اس کے نیچے شعر لکھا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہو یارب کہ ہو معشوق پہلو میں
پیالہ ہاتھ میں، امجد علی کے ہوں کباب آگے

نہیں ثاقب اس سے زیادہ پُرلطف شعر وہ ہیں جو اس چائے کی دوکان پر لکھے ہوئے ہیں۔
وہ کون سے؟
عاصم کو ایسے سینکڑوں شعر یاد ہیں۔ ان کا پس منظر یاد ہے ان کی جزویات سے واقف ہے۔
"لیکن عاصم وہ شعر جو مجنوں پچھواڑوں کے باغ میں آکر لیلیٰ کو گلاب دیتے وقت پڑھتا ہے"
"ہاں، لیلا میری لیلے میں عاشق جانباز"
علو اتنے قہقہے لگاتا ہے کہ اس کی پسلیوں میں درد اٹھنے لگتا ہے۔ ثاقب اس موقع کو بہت اچھا جانتا ہے۔
عاصم پھاٹک پہ پھاٹک کھولے جاتا ہے۔
سڑک کی لمبائی سمٹ جاتی ہے۔

دیکھو، وہ نیلی نیلی بتیاں، ایک قطار سی چلی گئی ہے، مجھے اس جگہ کی کوئی بات پسند ہے تو یہ ہلکے آسمانی رنگ کی جلتی ہوئی ہانڈیاں، اندر کی بات جانے دو، بس صرف ان ہانڈیوں کا ذکر کر رہا ہوں، اندر جو ہوگا سو ہوگا۔ اندر شراب ہوگی ـــــ شراب اور سگرٹوں کی خاکی خاکی بو ہوگی، عورتیں ہوں گی مرد ہوں گے ـــــ بینڈ باجہ ہوگا، (اس کی آواز تو سن ہی رہے ہو) میزوں کے نیچے مسلی ہوئی خالی ڈبیاں ہوں گی ـــــ مستی ہوگی، بدمستی ہوگی ـــــ پھر بھی ـــــ پھر بھی اے میرے دوستو آؤ اور خوش ہو جاؤ کہ رات، اتنی بیت چکی ہے کہ اگرچہ ہم میں سے کسی نے نکٹائی نہیں باندھی پھر بھی ہمیں اندر جانے سے روکا نہیں جائے گا۔
"عاصم کسی طرح اس شخص کو چپ نہیں کرایا جا سکتا"
"دیکھو دیکھو ثاقب تم میرے کہنی مت مارو ـــــ یہ رات کا وقت کہنی مارنے کا نہیں ـــــ یہ تو بڑا خمار آگیں وقت ہے" ـــــ
عاصم نے فیصلہ کیا۔ ہم اندر نہیں جائیں گے۔
"کیوں بھائی؟"
"اس لئے کہ یہ بڑی فضول سی بات ہوگی"
"نہیں نہیں ذرا لطف رہے گا۔ ثاقب یہ شخص ہمارا مزا کیوں کرکرا کرتا ہے"
"چل بھائی چل"

پھر کرسیوں پر بیٹھ کر خاموش ہو گئے ـــــ ادھر ادھر کے شور میں گم ہو گئے۔
"کیا کہا کچھ نہیں؟"
"صاحب دو بجے کے بعد سب کچھ بند"
"ارے بھائی تو پھر کچھ لیمن دیمن"

"کچھ نہیں صاحب"

تو پھر؟

"ہم کیا بتائیں صاحب!"

ادھر اُدھر کا شور کم ہوتا بڑھ جاتا ـــــ بینڈ والے اپنی پوری کوشش سے دلوں کو برماتے پر نا چنے والے بڑی جلدی مدھم پڑ جاتے ـــــ کچھ نیند کا بوجھ تھا ـــــ جسم ایک دوسرے سے اس قدر مس ہو چکے تھے کہ شاید پسینے کی بو نے بھینی بھینی سب کو غائب کر دیا تھا ـــــ اسی لئے مسکراہٹوں کی بجائے سوچے ہوئے چہرے تھے، ہونٹوں پہ دلکشی کی جگہ پپڑیاں جمی ہوئی تھیں ـــــ اب تو یہ تھا کہ کسی طرح یہ رات حرکت میں گزر جائے ـــــ کیسی ہی حرکت، بس ہلے جاؤ ـــــ سر کے بھاری پن کو اپنے ہی کندھوں پہ کیوں رکھو، ـــــ یہ بوجھ کسی اور پہ ڈال دو ـــــ

بڑی اونچی سُر پہ باجہ ختم ہوا پھر خالی خالی قہقہے اُٹھنے شروع ہو گئے۔ اور علو کی بھاگتی ہوئی نظریں کسی جگہ پر ٹک ہی نہ سکیں اُن چھ آدمیوں کو دیکھا تو وہ نہ جانے کس انہونی بات کے انتظار میں آنکھیں چڑھائے بیٹھے تھے یا شاید وہ اپنے اس ساتھی کے بارے میں فکر مند تھے جو اپنے ہی بوجھ سے دوہرا ہوا اونگھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں اس حبشی کی طرح ڈول رہی تھیں جو مرنے سے پہلے صرف ایک بھیانک دلدوز چیخ مارتا ہے۔ علو کو جھرجھری آ گئی۔

کچھ لوگ چلے گئے، کچھ اور آ گئے۔ تین مرد اور ایک عورت جو بالکل چینی کی گڑیا کی طرح تھی جس نے مرد کی بانہہ میں بانہہ ڈال رکھی تھی ـــــ مرد جو سیاہ اور بدصورت اور موٹا اور ٹھگنا تھا ـــــ اور جو چہرے سے یتیم بچہ معلوم ہوتا تھا۔

عاصم نے اس چینی کی گڑیا پر سوئی سوئی نظریں گاڑ دیں۔ یہ گڑیا کسی زمانے میں بہت ہی سیکسی ہو گی۔

ثاقب علو کی بانہہ پکڑ لیتا ہے "ادھر دیکھو کیا ایسی عورتیں بھی مردوں کو ساتھ لئے پھرتی ہیں"

یہ دو عورتیں تھیں یا جنسی بیماریاں، یہ ٹھیک طرح پتہ لگانا مشکل تھا کہ انہیں جنسی گھن پہلے لگا یا تپ دق ـــــ اور وہ دونوں مان گئے کہ اس قدر مدقوق اور کریہہ چہرے انھوں نے آج تک نہ دیکھے تھے ـــــ یہ کیا ہو گیا ہے ـــــ یہاں صرف غلاظت کیوں ہے ـــــ پھر ثاقب نے کہا۔

"خدا سب کو رزق دیتا ہے"

پھر عاصم کی تھکی تھکی آنکھیں کچھ دیر کے لئے کھلیں، اس نے گلے کو ایک کھنکار کے ساتھ صاف کیا، سگرٹ سلگا لیا، اور پچھلے پہر کی ساری خاموشی کو اپنے ارد گرد سمیٹ کر ایک ننگے شانوں والی لڑکی کو گھورنے لگا۔

ایک انگریز آ گیا، لال لال ڈورے، اس کی کانپتی ہوئی انگلیوں نے ماچس پکڑ لی ـــــ پھر عاصم کے کان کے اوپر دوہرا ہو گیا ـــــ تم بہت اچھے لڑکے ہو ـــــ میں تمھارے پاس صرف تھوڑی دیر بیٹھوں گا ـــــ پھر وہ عاصم پر جھک گیا۔ اس کے ہونٹوں کے قریب ہو گیا ـــــ ک کشمیر

"کیا ہوا کشمیر کو؟"

"کشمیر ـــــ جو ہے تو اسے پاکستان کو نہیں گنوانا چاہیے ـــــ بس تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو ـــــ

اسی لئے تمھیں بتاتا ہوں ——— کشمیر اگر چھوڑا تم نے تو پھر ——— پھر پھر تو روس آجائے گا۔

"اچھا؟"

"ہاں ہاں اور تم اگر غور سے دیکھو تو ہم انگریز ——— ہم تمھارے دوست ——— لیکن ہندوستان جو ہے تو وہ بڑی غلطی کر رہا ہے۔"

"کیا غلطی : عاصم تو ہر بات یوں ہی پوچھ لیتا ہے۔

وہ لڑکھڑاتا اٹھ کھڑا ہوا ——— خواہ مخواہ مجھے بناتے ہو، تم سب کچھ خود جانتے ہو، میں تم سب لونڈوں کو جانتا ہوں ——— روس بڑا سخت فضول ہے ——— ہاں یہ ہنسنے کی بات نہیں۔"

تھکے ہارے بیرے دیواروں کا سہارا لئے جماہیاں لے رہے تھے، نہیں صاحب اور نہیں ملے گی ——— کیسے نہیں ملے گی ——— نہیں صاحب حکم نہیں ——— حکم کیسے نہیں لاؤ ——— پھر میز پر مکہ پڑا تو گلاس اور بوتلوں میں تھوڑی دیر کے لئے جھنجھن سی پیدا ہوگئی ——— میں تمھیں قتل کر دوں گا ——— تم مجھے جانتے ہو ——— بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ جونز ——— بیٹھ جاؤ ——— نہیں تم مجھے مت روکو میں آج اسے ——— جونز ڈارلنگ آؤ بھی چھوڑو ——— جونز نے تھوڑی دیر اپنی محبوبہ کی آنکھوں میں دیکھا ——— لیکن یہ حکم نہیں مانتا ——— جانے دو جانے دو جونز اور جونز کے بھائی بندوں نے آ کے کہا ٹیک اٹ ایزی جونز ٹیک اٹ ایزی ———

لیکن میں عزت والا آدمی ہوں ——— میں ———

نہیں نہیں جونز اس کو دفع دفعان کرو ——— یہ کمینے پنچ آدمی ہیں ——— ایسوں کے منہ ———

پھر دبے دبے قہقہے اٹھنے لگے ——— تلخی دور کرنے کے لئے بینڈ والوں نے تیز تیز چیزیں اونچے اونچے سروں میں بجانی شروع کر دیں ——— پھر تال ——— تیسرے پہر کی تال ——— "تھکے تھکے قدم ——— "بس آخری ناچ ——— نہیں نہیں اب نہیں ——— بس آخری ناچ ——— اس کے بعد ———

"عاصم تم کس طرف دیکھ رہے ہو ——— جانتے ہو کل صبح یہ تمام لوگ ایک دوسرے سے کیا کہیں گے؟"

"کیا؟"

یہ ہر شخص سے کہیں گے رات ہم نے بہت انجوئے کیا، بہت ہی لطف آیا، ہیری نے اتنی پی لی کہ لنگا لڑ لنگا ناچنے اور آئرس ——— اُف بالکل "ہیولی" ——— میبیل کے لئے تم آئندہ ہفتے ضرور چلنا . . . . . .

دفعتۃً شور اٹھا ——— کسی کو کچھ پتہ نہ چلا ——— بس ایک میز کے گرد، ہجوم اکٹھا ہو گیا ـ وہی میز جس پر چینی کی گڑیا تھی اور اس کے ساتھ نیم سا سیاہ فام ——— کوئی لڑکھڑاتا ہوا انگریز اس میز پر آیا! اس نے کالے آدمی سے پوچھا کہ اسے ایک سفید عورت کے ساتھ بیٹھنے کا کیا حق ہے۔

"کالے آدمی نے بڑی معصومیت سے پوچھا، مگر تم کون ہو ——— اور یہ ——— یہ کیا بدتمیزی ہے۔"

"میں تمھیں بتاؤں میں کون ہوں ——— میں وائٹ ہوں وائٹ سمجھے اور تو سیاہ کُتا ہے۔"

بس اتنی سی بات پہ اتنا ہجوم ہو گیا اور لوگ تماشہ دیکھنے کے لئے ایک دوسرے کی گردن میں گھسنے لگے ———

جونز کے بھائی بند پہلے تو حکبڑ سے گئے پھر انھوں نے اپنا کالا پن پھیکی ہنسی میں ڈبو دینے کی کوشش کی، ـــــــ جونز نے کہا "بوائے او بوائے یہ تو اس کے سر سے بھی اوپر چلی گئی "

ہیری یا ٹیری نے کہا آؤ دیکھیں تو ـــــــ نہیں ڈار لنگ ـــــ جانے دو ـــــ جھگڑا کرنے کا فائدہ، پھر سب نے گوڈ ڈیم گوڈ ڈیم کر کے شراب کو برا بھلا کہا ـــــــ

اور وہ سیاہ کتا ویسے ہی بیٹھا رہا، پہلے تو اس نے کہا ــــــ" یہ کیا شرافت ہے ـــــ دیکھو بھائیو میں بالکل آرام سے بیٹھا ہوں ۔ میں نے کچھ بھی نہیں کہا ـــــــ پھر چینی کی گڑیا اٹھی اور اس نے ایک اور پھر دو تھپڑ زناٹے کے ساتھ اس پھولے ہوئے سفید چہرے پر مارے ـــــ اس نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا ـــــــ" اُف مجھے ان مردوں سے کس قدر نفرت ہے ـــــــ میرا بس چلے تو میں ان سب کو نچوا دوں " ـــــــ اور پھر رونے لگی ۔

علو کھڑا ہو گیا ـــــــ عاصم بھی کھڑا ہو گیا، دونوں دیر تک کسی چیز کو گھورتے رہے ـــــ

پھر ثاقب نے کہا، تم دونوں کیا سوچ رہے ہو؟ ـــــــ تم بچے ہو ـــــــ کیا تم سمجھتے ہو کہ اگر تم اس شخص کو پیٹ دو گے ۔ تو تم بدلہ لے سکو گے ـــــــ یہ تو شرابی ہے ، اور پھر اس نے آہستہ سے کہا یہ تو ہر روز کی بات ہے "

ہوٹل والوں نے جلدی جلدی بتیاں بجھادیں اور دروازے بندکرنا شروع کر دیئے ۔

سڑک پہ کھمبوں کی بتیاں جل رہی تھیں ۔ مگر فضا کی خنکی سے یوں محسوس ہو رہا تھا ۔ جیسے اب بتیوں کی ضرورت نہیں ـــــــ ٹمن چھنن ـــــ ٹمن چھنن کی آوازیں کہیں کہیں سے سنائی دے رہی تھیں ـــــ" عاصم سویرا ہونے میں کتنی دیر ہے ـــــ ثاقب کہتا ہے علو نے تمام مزا خراب کر دیا ہے ـــــ عاصم کو نیند نے بری طرح ستایا ہے لیکن وہ سونے کا نام نہیں لیتا ـــــ بس چلتے چلتے پوچھتا ہے ۔ "کوئی اور منزل بھی ہے ؟"

علو سے اب صبر نہیں ہوتا " عاصم عاصم مجھے اتنا تو بتاؤ یہ کیا ہوا ـــــــ ہم کیا کر رہے ہیں، آخر یہ ناچنے والے (جن میں سے اکثر اب بھی اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں) یہ اب جا کر کیا کریں گے، ـــــــ میں جانتا ہوں یہ اپنے اپنے کوٹ اتار دیں گے ـــــ مانگے تانگے کی ، پتلونیں کل شام تک استری کرا کے لوٹا دیں گے، لیکن آخر کیوں ، یہ محض بسر کرنے کے لئے اتنی دیر کیوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہتے ہیں ـــــــ یہ لڑکیاں سب کی سب بکاؤ نہیں تھیں، جو نہیں تھیں وہ کس چیز کی تلاش میں آتی ہیں صرف صرف کندھے سے کندھا بھڑانے کے لئے، صرف کسی شوہر، کسی گرے ہوئے ٹامی کو ڈھونڈنے کے لئے ـــــــ لیکن ٹامی تو انھیں "منگ دار" سمجھتا ہے ـــــــ تم نے اس شخص کو دیکھا تھا جو محض ایک سگرٹ مانگنے کے لئے ۱۵ منٹ تک اس امریکن کے پاس بیٹھا رہا جو اپنا کیمرہ اور وہسکی سامنے رکھے اکیلا بیٹھا تھا اور جب اسے سگرٹ مل گیا تو وہ جو یا میتھیو ، یا جو کوئی بھی تھا ، اس جو یا میتھیو کے چہرے پر کتنا ذلیل قسم کا تشکر تھا کس قدر گری ہوئی مکار مسکراہٹ تھی ـــــ کبھی تم نے کسی ہندوستانی دلال کو بھی انگریز کے سامنے اتنا گرتے ہوئے دیکھا ہے ـــــــ اور اس کالے کتے کا خون نہ کھولا اس نے سفید آدمی کا جبڑہ کیوں نہ توڑ دیا اس کی ہڈی پڈی کیوں نہ پیس دی ـــــــ عاصم عاصم یہ لوگ کیا کرتے ہیں ـــــــ یہ سب کیا ہے ـــــــ ہم کیا کر رہے ہیں۔

لیکن عاصم کچھ نہیں بتاتا ـــــ عاصم خاموش ہے، اس کے بھاری بھاری پپوٹے بھڑتے جا رہے ہیں ـــــــ

مجھے آج بہت زیادہ سونا چاہیئے ——— میرا خیال ہے میں پورے ۲۴ گھنٹے سوؤں گا۔

سویرا ہونے میں کتنی دیر ہے ——— کچھ کہہ نہیں سکتے ——— تو پھر اب کون سی منزل ہے ——— کھمبوں کی بتیاں بجھ جائیں تو شاید اس تاریکی کا احساس جاتا رہے۔

"ثاقب اگر یہ بتیاں بجھ جائیں تو کیا بہتر نہ ہوگا"

نہیں، ان بتیوں کو جلتا رہنے دو ——— یہ بتیاں بجھتی ہیں تو صبح کا دھندلکا زہر بن کر سارے جسم میں "تناؤ" پیدا کر دیتا ہے ——— ان بتیوں سے رات کا احساس تو قائم ہے۔

مجھے ان بتیوں سے کم از کم اگلے دن کا احساس تو نہیں ہوتا ——— ساری رات پچھلے دن کا گزرا ہوا حصہ معلوم ہوتی ہے، اس سے ندامت نہیں ہوتی ——— وقت کی رفتار پہ پشیمانی نہیں ہوتی ——— بتیوں کے بجھنے سے ایک دم نیا وقت سامنے آجاتا ہے، پھر سکون کی جگہ بے چینی ہونے لگتی ہے، نئے دن کی بے چینی۔

علو نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر جیسے اس نے اپنے آپ سے کہا "رات تو مرگئی"

عاصم چپ چاپ چلا جاتا ہے۔

علو آؤ۔ حسن یار کی باتیں کریں۔

علو آؤ۔ حسن یار

ہاں ثاقب آؤ۔ حسن یار کی باتیں کریں۔

فٹ پاتھوں پہ آہستہ آہستہ حرکت شروع ہو رہی تھی ——— دگڑ دگڑ اکوں کی مسلسل تال بھی جانے لگی گوڈو کے ڈھیر ملنے شروع ہو گئے تھے ادھر اُدھر کسی چادریں جست ہوئی، لوگ اٹھتے میلی میلی آنکھوں کو صاف کرتے پھر وہیں بیٹھے بیٹھے الوؤں کی طرح فضا کو دیکھنے لگتے جہاں رات کی جگہ ہلکی ہلکی نیلاہٹ لے رہی تھی۔

(شمارہ ۲-۱ ——— سنہ ۵۱ء)

اردو کے ممتاز نقاد

ڈاکٹر حنیف فوق

کا پہلا تنقیدی مجموعہ

مثبت قدریں

مثالی گیٹ اپ - سرورق : زین العابدین

قیمت : ۱۵/- روپے

ملنے کا پتہ :- مکتبۂ افکار رابسن روڈ کراچی

مسیح الحسن رضوی

شہزادوں کی بستیاں

لکھنؤ کی بالائی، گلاب ریوڑی، اَنگڑی اور خربوزے کی طرح مجھے وہاں کی ایک چیز اور عزیز ہے۔ یہ ہیں شہزادے صاحب جن سے بہت کم لوگوں کا سابقہ پڑا ہوگا۔ کیونکہ انھیں دیکھنے، پرکھنے اور جانچنے کے لئے دیدۂ عبرت کی ضرورت ہے اور آج کل اتنی فرصت کسے ہے کہ وہ دیدۂ عبرت کے لئے گھوما کرے۔ میں خود شہزادے صاحب سے ملنے کی سعادت ہرگز نصیب نہ کر پاتا۔ لیکن عجیب اتفاق نے ان کو میری راہ میں ڈال دیا۔ یہ عجیب اتفاق سب کی زندگی میں آیا کرتے ہیں۔ کوئی ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اور کوئی نقصان، اور کوئی دونوں کے بیچ بین رہتا ہے۔

شہزادے صاحب سے میری ملاقات کس طرح ہوئی۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ جو گذشتہ ڈیڑھ دو سو برس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ وہ اس لئے کہ شہزادے صاحب کو تاریخ ہند زبانی یاد ہے۔ مکتیسر کی لڑائی، شان اودھ کی داستانیں دلی کے شاہ عالم ثانی کے واقعات، ان کی نوک زبان ہیں۔ قصہ کو مختصر کرکے میں اصلی واقعات پر آتا ہوں تاکہ شہزادے صاحب سے آپ کا تعارف ہونے میں دیر نہ ہو۔

میں ورم جگر اور اعصابی امراض کا شکار ہو کر لکھنؤ پہنچا۔ یہ کوئی تیس پینتیس برس ادھر کی بات ہے۔ جھوائی ٹولہ میں اس وقت ایک سے ایک بڑھ کر نامی حکیم تھے۔ میں نے سوچا کہ بندے یہ دنیا آنی جانی ہے۔ ڈاکٹروں کے پھیر میں بہت پڑ چکا۔ اب طبیبوں سے رجوع کرکے قسمت آزمائی کر۔ چنانچہ میں نے جھوائی ٹولہ میں ایک مکان کرایہ پر لیا اور حکیم منجھلے صاحب مرحوم کا علاج شروع کر دیا۔ سوچتا ہوں کہ میری بیماری اور شہزادے صاحب میں ضرور کوئی ربط باہمی تھا جب ہی تو میں بیمار ہو کر لکھنؤ آیا، اور میری ملاقات شہزادے صاحب سے ہوگئی۔ نہ لکھنؤ آتا اور نہ شہزادے صاحب سے ملاقات ہوتی۔ اس ملاقات کی میری نظر میں کتنی اہمیت ہے اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ آج اتنی مدت گذر جانے کے بعد مجھے شہزادے صاحب یاد آرہے ہیں۔ اور میں اُن کی داستان آپ کو سنا رہا ہوں لکھنؤ کے خالص نوابوں کی داستانیں آپ نے ضرور سُنی ہوں گی۔ ان کی معصوم، حماقت زدہ صورتیں کبھی آپ نے دیکھی ہوں گی۔ لیکن میں آپ کو مغل شہزادے کی داستان سناتا ہوں۔ مغل شہزادہ جو آل تیمور کا نام لیوا تھا۔ معلوم نہیں شہزادے صاحب آج کل بھی ہیں یا اللہ کو پیارے ہوگئے۔ بہرکیف اگر وہ زندہ ہیں تو میں ان کی درازیٔ عمر کا دعاگو ہوں۔ اور اگر وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں تو حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ میں انھیں سورۂ فاتحہ سے یاد کرتا

ہوں - رہے نام اللہ کا۔

یہ آج ایکا ایکی، اچانک، دبے پاؤں، شہزادے صاحب میرے دماغ میں کیوں سماتے ہیں؟ ان کی یاد میرے دل میں کیوں چٹکیاں لے رہی ہے؟ کیوں مجھے شہزادے صاحب کی اونچی ناک، بلند پیشانی، بیٹھے گال، پٹے اور گل مجھے یاد آرہے ہیں؟ آج تیس برس بعد، ان سب نے مجھ پر کیوں جادو کردیا ہے؟ کیوں ——؟ وہ بادام کی طرح ٹیڑھی، افسردہ، کجلائی ہوئی آنکھیں —— ان کا جادو آج کیوں میرے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے؟ میں آج ایک ایسے علاقے میں قیام پذیر ہوں جہاں اب تک نئے چکتے، دمکتے تمدن کی روشنی نہیں پہنچی ہے۔ میرے چاروں طرف خوفناک بھیڑ ہیں۔ آدم خور تیندوے، اور مگرمچھ ہیں۔ غیر متمدن، صاف شفاف، محنت کش انسان ہیں۔ عالمگیر کے عہد کی بنائی ہوئی ایک سادہ باوقار مسجد ہے۔ بتیوا ندی ہے۔ جس میں جابجا پتھر کی ننھی منی مسجدیں بنی ہیں۔ مغل گھاٹ ہے۔ سید دلی کا پیارا، جھاڑ جھنکاڑ سے گھرا ہوا مزار ہے۔ پھر یہاں کے لوگ ہیں — لمبے تڑنگے، سیاہ فام، یہاں کی سیاہ مٹی کی طرح کالے، سخت اور کھردرے۔ میں یہاں کیوں آگیا ہوں ——؟ میں خود نہیں بتا سکتا۔ غالباً شہزادے صاحب کی یاد تازہ کرانے کے لئے قسمت نے مجھے اس کوردہ مقام پر پہنچا دیا ہے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ یہاں کا ذرہ ذرہ مجھے شہزادے صاحب کی یاد دلاتا ہے۔ شہزادے صاحب جو تیس روپے ماہانہ کی سیاسی پنشن پاتے تھے۔ فالتو وقت میں زردوزی کا کام کرتے تھے، اور اس چکر میں وکیلوں کی چوکھٹ کی دھول لیا کرتے تھے کہ لکھنؤ کا ایک بڑا وقف جو ان کے آباؤ اجداد کی نشانی تھا ان کے نام منتقل ہو جائے۔ اور وہ زندگی کے آخری دن ذرا سکون، ذرا اطمینان اور ذرا لہو ولعب سے گذار دیں تاکہ ان کی مریل بڈھی بیوی، جو شاہان اودھ کی نسل سے تھی، اور جو برائے نام وثیقہ پاتی تھی ان کو بات بات پر طعنے نہ دے۔ وہ انھیں یہ کہہ کر کچوکے نہ لگائے کہ اس کے والدین نے افیون کی پینک میں اس کی قسمت پھوڑ دی۔ نہ آل نہ اولاد، نہ کپڑا نہ لتا، چالیس روپے کی پونجی میں زندگی بسر ہو گئی۔ مکان تک میسر نہ آیا، موئے بندر کی نسل، آل تیمور ہونے کا دم بھرتے ہیں۔

شہزادے صاحب جن کو میں تیس برس سے بھولے رہا ہوں۔ آج مجھے بے اختیار یاد آرہے ہیں، بے اختیار۔

خوفناک بھیڑوں کے نیچے بتیوا ندی رُکی رُکی بہتی چلی جارہی ہے۔ ان ہی بھیڑوں میں کہیں آدم خور تیندوے سستی کے مارے، آنکھیں موندے پڑے ہوں گے۔ ڈاکوؤں کے ان گروہوں کے چولہے گرم ہوں گے جن کے تعاقب میں اتر پردیش اور مدھیہ پردیش کی مشترکہ پولیس لگی ہوئی ہے، اور اسی خوفناک علاقے میں سید دلی محو استراحت ہیں، عالمگیری دور کی مسجد ہے، مغل گھاٹ ہیں اور شہزادے صاحب کی بے پناہ یاد۔ یاد جو اس وقت میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہزادے صاحب اپنے پورے قد سے میرے دماغ میں آکر کھڑے ہو گئے ہیں۔ اور اپنی نوکیلی گرگابیوں سے میرے دماغ کو ٹھوکے دے رہے ہیں۔

"بھول گئے مجھے اور بھولو، بھولو۔۔۔۔۔"

حاشا میں شہزادے صاحب کو نہیں بھولا ہوں۔ میں کوشش بھی کروں تو انھیں بھلا نہیں سکتا۔ وہ میری زندگی کا قیمتی تجربہ ہیں۔ ان کو بھول جانا، اپنے کو بھول جانا ہے۔ اپنے ورثہ کو بھول جانا ہے۔ شہزادے صاحب مجھے نہ ستاؤ۔ میرے دماغ سے نکل جاؤ۔

مغل گھاٹ اور بتیوا میں بنی ہوئی پتھر کی مسجدوں کو دیکھکر مجھے شہزادے صاحب یاد آگئے ہیں۔ یہاں کے سادہ لوگ محنتی لوگ دیکھکر، مجھے شہزادے صاحب کی یاد ستا رہی ہے۔ وہ کالا بھجنگ، دیہقانی دیکھکر مجھے شہزادے صاحب یاد آگئے جو آج صبح لمبا تہمد باندھے میرے پاس آیا تھا اور شام کو کھانے کی دعوت دے گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گڑگڑی تھی۔ اس نے مجھے عالمگیری مسجد کی تاریخ بتلائی اور پھر اپنی چھوٹی چمک دار آنکھوں میں دنیا بھر کا غرور بھر کر بولا کہ میں تیمور کی نسل کا ہوں۔ میں کھرا مغل ہوں۔ بستی میں دوسرے بھی بستے ہیں۔ لیکن میں اصلی مغل بچہ ہوں۔ ڈیڑھ دو صدی سے اس بستی میں ہماری نسل آباد ہے۔ ہم شہزادوں اور سپہ سالاروں کی نسل سے ہیں۔ عالمگیر کی فوجیں جب دکن کی مہم پر گئی تھیں تو انھوں نے یہاں پڑاؤ ڈالا تھا۔ پھر ہم نے یہاں مستقل پڑاؤ ڈال دیا۔ بتیوا کا پانی اور راجپوتوں کی قربت ہمیں بھاگئی۔ ہم یہیں کے ہو رہے۔ ہمارے پرکھوں نے حضرت ابراہیم کی طرح اس بستی کے پھلنے پھولنے کی دعا مانگی تھی۔ یہ کہہ کر وہ ہنسا اور اس کے ہموار سفید دانت جگمگا اٹھے۔ میں نے اس کالے بھجنگ، اجڈ، دیہقانی کو غور سے دیکھا۔ گویا مجھے اس کی بات کا یقین نہ آرہا ہو۔ یقین آنے کی بات بھی نہیں تھی۔ شہزادے کہیں ایسے کالے بھجنگ، الٹا توا ہوتے ہیں۔

اس نے میرے وسوسوں کو بھانپ لیا۔

"حضرت" اس نے خالص شہری انداز میں کہا۔ "آپ کو میری بات کا یقین نہیں آرہا ہے۔ سید ولی کی مزار کی متولیہ سیدانی بی سے پوچھ لیجئے، وہ کبھی جھوٹ نہیں بولی ہیں ـــــ" اتنا کہہ کر اس نے گڑگڑی کو بجایا اور دھوئیں کے مرغولے چھوڑتا ہوا ہنسنے لگا ـــــ "کسی کو یقین نہیں آئے گا۔ کسی کو یقین نہیں آئے گا۔ یہ داستان ہندوستان کی کسی تاریخ میں نہیں ہے۔ یہ علم سینہ ہے۔"

میں اس اجڈ شہزادے کو حیرت سے دیکھتا رہا ـــ دیکھتا رہا۔ پھر اس کے نقش میری آنکھوں کے سامنے ابھرے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ مدھم پڑ گئے۔ اور شہزادے صاحب پورے قد سے میرے دماغ میں آکر سما گئے اور اب وہ وہاں سے کسی طرح نہیں نکلتے ہیں۔ میرا سر درد کر رہا ہے۔ اعصاب جھنجھنا اٹھے ہیں۔

اس تعارف کے سرے ملانے کے لئے میں اپنے لکھنؤ کے قیام اور علاج کی طرف پھر رجوع کرتا ہوں۔ میں جھوائی ٹولہ کے جس مکان میں مقیم تھا، وہ علاقہ اب سے پچیس تیس برس قبل کے عروس البلاد لکھنؤ کا قلب تھا۔ حضرت گنج میں گورے گھومتے تھے جن کو قبلہ گورے صاحب کہا جاتا تھا۔ وہاں کوئی کامی ہاؤس۔ ٹی ہاؤس اور میفیر نہیں تھا۔ کولتار کی چمچاتی ہوئی سڑک پر گورے گھومتے۔ ان کے ساتھ کچھ کالی لڑکیاں بھی ہوتیں۔ جو ملٹری پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ان سے آن ملتیں۔ بعض گوروں کے ساتھ میم صاحب اور بابا لوگ بھی ہوتے جو ہندوستانیوں سے نفرت کرنے والی آیاؤں کے منہ نوچ لیتے۔ یہ افسروں کا طبقہ تھا۔ فوج کے بڑے بڑے کرنل اور بریگیڈیر ـــ ایک واحد انگلش ملاکی ہاؤس پرنس آف ویلز تھا جو صاحب لوگوں کی طرح الگ تھلگ حضرت گنج کی چوڑی سڑک کے کنارے، اپنا سرخ لباس پہنے، نخوت اور غرور کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اندر سے پیانو کی دل نواز آواز شام کے سناٹے میں گونج جاتی اور پھر سناٹا چھا جاتا۔ تو راہ گیروں کو پتہ چل جاتا کہ ہال کے اندر "گاڈ سیو دی کنگ" ہو رہا ہے اور گورے تکا عقیدت سے کھڑے ہوتے ہیں۔

لکھنؤ کا جھوائی ٹولہ، نخاس اور چوک، بالائی اور ٹنڈے کے کباب یہ دوسرا لکھنؤ تھا۔ اسی میں میرا قیام تھا۔ شہزادے صاحب اسی لکھنؤ کے دھندلکے سے ابھر کر ایک شام میرے گھر آن وارد ہوتے تھے۔ انھیں میرے ایک کشمیری پنڈت دوست اپنے ہمراہ لائے تھے۔ یہ کشمیری دوست میرے دیرینہ کرم فرما تھے۔ کشمیری محلہ کے رہنے والے اور لکھنؤ کے کلچر اور اس کی رو بہ انحطاط تہذیب کے نام لیوا۔ ان ہی نے شہزادے صاحب کو میری راہ میں ڈال دیا۔

جاڑوں کی رات تھی۔ شام کے جھٹپٹے میں یہ کشمیری دوست شہزادے صاحب کو لے کر میرے پاس آئے اور میرا ان سے رسمی تعارف کرایا۔ میں نے چائے پان سے ان کی تواضع کی۔ وہ بظاہر چغتائی کا ایک دھندلایا ہوا مرقع تھے۔ بادام کی طرح ٹیڑھی آنکھیں، اونچی ناک، بلند پیشانی اور بیٹھے گال اور گل مچھے۔ مجھے اس کا اقرار ہے کہ انھیں دیکھ کر مجھے خدا یاد آگیا۔ ان کی جامہ وار کی شیروانی جو جگہ جگہ سے رفو کی ہوئی تھی، گلے میں پڑا ہوا کشمیری رومال، اور سیاہ ایرانی ٹوپی، جس کے کنارے چکٹے ہوئے تھے، مجھے اس وقت بھی یاد ہے۔ ان سب چیزوں کے مجموعے کا نام شہزادے صاحب تھا۔ وہ افسردہ افسردہ سے انسان تھے۔ جیسے زندگی نے انھیں دکھ کے سوا کچھ بھی نہ دیا ہو۔ اتھاہ دکھ اور بے اعتمادی۔ اپنے سائے تک سے خوف زدہ ـــ مجھے یاد ہے انھوں نے پہلے ہی دن کی نشست میں شاہ عالم ثانی سے لے کر خود پر ختم ہونے والا شجرہ سنا دیا تھا۔ میری حیرت پر میرے کشمیری دوست مجھے مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔ یہ پہلی ملاقات نصف گھنٹے سے زیادہ کی نہیں تھی۔ پھر ملاقاتیں طویل ہوتی گئیں۔ کبھی کبھار وہ میرے ساتھ چوک اور امین آباد تک جانے لگے۔ انھوں نے مجھے تاریخ ہند کے بیسیوں واقعات سنا ڈالے ـــ ایک سے ایک حیرت میں ڈالنے والے ـــ ان واقعات کی تان ہمیشہ انگریزی راج پر ٹوٹتی ـــ اس کی ناانصافیاں، بدعہدیاں اور اس دن کے خواب جب مغل دربار کی تجدید ہوگی۔ شہزادے صاحب کی تاج پوشی کی رسم ہوگی۔ اور ان کی مریل کھوسٹ چہیتی بیگم، ان کے برابر تخت طاؤس پر جلوہ افروز ہوں گی ملکہ عالم زمانی بیگم۔ اس سے کم تر درجے پر اوقاف کی واپسی پر بات ختم ہوتی۔ جس کے لئے لاکھوں کے اسٹامپ کی ضرورت تھی۔

پھر ایک دن میرے کشمیری دوست میرے پاس آئے۔ انھوں نے بتلایا کہ تمھیں آج منصور نگر چلنا ہوگا۔ شہزادے صاحب کی سال گرہ ہے۔ ان کا دربار لگے گا۔ تمھیں بھی نذر گذارنا ہوگی۔ جب میں شیروانی پہن کر کھڑا ہوا تو میرے کشمیری دوست نے مجھے قہر کی نگاہوں سے دیکھا۔ دربار خاص میں چل رہے ہو، کیا کوئی سیاہ شیروانی نہیں ہے؟ میں نے اپنے دوست کے حکم کے مطابق سیاہ شیروانی نکالی اور اسے پہن کر ان کے ساتھ چل کھڑا ہوا۔

دربار خاص میں چند مخصوص احباب جمع تھے۔ شہزادے صاحب ایک خاص قسم کا چغہ مشروع کا ڈھیلا پائجامہ اور کارچوب کی بنی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی پہنے بیٹھے تھے، جس کے ستارے شمعوں کی مدھم اور سوگوار روشنی میں جھل مل جھل مل کر رہے تھے۔ انھوں نے داہنا ہاتھ سلام کے لئے اٹھا رکھا تھا۔ بڑے پُر تپاک انداز میں وہ مربیانہ طور پر احباب کے سلام کا جواب دے رہے تھے۔ جب میں پہنچا ہوں تو احباب اور مصاحبین قرینہ سے اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ میں مودبانہ "کمر کو" قدرے خم کئے " آہستہ آہستہ چلتا شہزادے صاحب کے پاس پہنچا، نذر گذاری، اور پھر الٹے پاؤں چلتا اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ جو کشمیری دوست نے مجھے آداب محفل سکھاتے ہوتے پہلے ہی بتا دی تھی۔ جب میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا تو ماحول پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ میری روح فنا ہوگئی۔ یہ کمرہ، اور یہ احباب، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ آثار قدیمہ سے برآمد ہوتے

ہیں۔ مختصر یہ کہ پورا ماحول تخ بستہ تھا۔ جس سے کافور جیسی بو آتی تھی۔ میں نے رحم آمیز نظروں سے شہزادے صاحب کو دیکھا، جن کی بادام کی طرح ٹیڑھی آنکھوں میں نہ جانے کتنے خواب بھرے ہوئے تھے۔ خواب جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا تھا۔ وہ صرف شہزادے صاحب ہی کو نظر آسکتے تھے کیونکہ تاریخ ہند انھیں زبانی یاد تھی۔ وہ ان مردہ واقعات کو کتابوں کے سیاہ حروف سے نکال کر جیتی جاگتی دنیا میں گھسیٹ لانا چاہتے تھے۔ مجھے شہزادے صاحب کی اس معصومیت اور سادگی پر رونا نہیں، پیار آگیا۔ اس کے بعد قصیدے گزارے جانے لگے، شہزادے صاحب خاموش، مہربلب بیٹھے تھے اور قصیدے فضا میں گونج رہے تھے۔ اتنے میں کسی نے بہادر شاہ ظفر کی غزل ؎ "کسی کی آنکھ کا نور ہوں ..... " چھیڑ دی۔ میں نے گھبرا کر سر اٹھایا شہزادے صاحب کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

جب ہم لوگ وہاں سے چلے ہیں تو کافی رات گذر چکی تھی۔ میں اور میرے کشمیری دوست چپ چاپ گم صم کشمیری محلہ کی تنگ و تاریک گلیوں کو طے کرتے، جھوائی ٹولہ کی طرف قدم بڑھائے چلے جا رہے تھے۔ سردی کافی تھی اور ہمارے دل نامعلوم غموں سے بوجھل تھے۔ شاید اسی غم کو بھلانے کے لئے میرے دوست مجھے چوک کے ایک چائے خانے میں لے گئے اور گرما گرم چائے اور سموسوں سے میری تواضع کی۔

اس واقعہ کے ایک ہفتے بعد میں جب لکھنؤ چھوڑنے لگا تو شہزادے صاحب مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے مکان آئے لیکن وہ کچھ جھینپے جھینپے اور کھوئے کھوئے سے تھے۔ شاید انھیں کسی طرح معلوم ہوگیا تھا کہ ان کی سال گرہ کے موقع پر دربار خاص کا مجھ پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑا۔ تاہم انھوں نے اپنی عالی ظرفی کا ثبوت دیا اور مجھے خندہ پیشانی کے ساتھ رخصت کیا۔ جب میں شکرم میں سوار ہونے لگا تو انھوں نے میرے داہنے ہاتھ کے بازو پر امام ضامن باندھ دیا۔ لیکن مجھے ان کے اس تکلف نے بہت اذیت پہنچائی اور جب میں گھر پہنچا تو میری اس اذیت میں اور اضافہ ہوگیا۔ کیونکہ جب میری بیوی نے امام ضامن کھولا تو اس میں سے وہی وکٹوریہ والا چاندی کا روپیہ نکلا جو میں نے شہزادے صاحب کو نذر گذارا تھا۔

سامنے بیتوا رکی رکی بہتی چلی جا رہی ہے۔ مغرب میں ڈوبتے ہوئے سورج نے اس کے پانی میں گلابیاں گھول دی ہیں۔ اجڈ شہزادہ جو مجھے صبح ملا تھا ایک گائے کی رسی پکڑے تیزی سے بیہڑ کی چڑھائی چڑھ رہا ہے۔ ایک تیس سالہ دھوپ میں پکائی ہوئی عورت سر پر گھڑے رکھے اس کے پیچھے چڑھائی چڑھتی ہی آ رہی ہے۔ اجڈ شہزادہ تھوڑی دیر کے لئے رکتا ہے۔ عورت بھی رک جاتی ہے۔ میرے دماغ میں شہزادے صاحب پورے قد سے کھڑے ہیں اور میں سوچ رہا ہوں کہ اگر شہزادے صاحب میرے دماغ سے نکل کر لکھنؤ چلے جاتے اور وہاں جاکر دربار لگاتے تو انھیں ایک خواب نظر آتا۔ خواب جس کی تعبیر بھی ہوتی۔ کیا معلوم اس اجڈ شہزادے کی کہانی سچی ہو اور عالمگیر کے عہد میں کوئی مغل شہزادہ بیتوا کا پانی پی کر متوالا ہوگیا ہو اور وہ اپنے سپنوں کی شہزادی کو لے کر یہیں رہتا ہو۔ اور حضرتِ آدم کی اولاد کی طرح اس کی نسل بیتوا کے بیہڑوں میں پھیل گئی ہو۔ جس نے زمانے کے ساتھ چل کر زندگی کے اس راز کو پالیا ہو جس کی تلاش میں شہزادے صاحب کی روح ازل سے بھٹک رہی ہے۔

اجڈ شہزادہ اپنی شہزادی کے آگے آگے بیہڑ پر گائے ہانکتا، چڑھائی چڑھتا چلا آ رہا ہے۔ اس نے اپنی لمبی تہمد کو گھٹنوں سے اوپر کر لیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں بھی مجھے خواب بھرے نظر آ رہے ہیں۔ اور اس وقت مجھے شہزادے صاحب یاد آ رہے ہیں۔ ان کا دربار خاص یاد آ رہا ہے۔ ان کی افسردہ، بادام کی طرح ٹیڑھی، محجوب، شرمسار آنکھیں یاد آ رہی ہیں۔ اجڈ شہزادہ اپنی شہزادی اور اپنی گائے کو لئے عالمگیری مسجد سے آگے مغلانوں کے محلہ میں پہنچ چکا ہے۔ سورج کو بیتوا کی لہروں نے نگھا لیا ہے اور بستی میں سنکھ اور موذن کی اذان کا نغمہ گھل مل گیا ہے۔

(شمارہ ۹۰ ـ ۵۹ء)

GOVT GIRLS COLLEGE ... ACC. No. 15237 ... LIBRARY
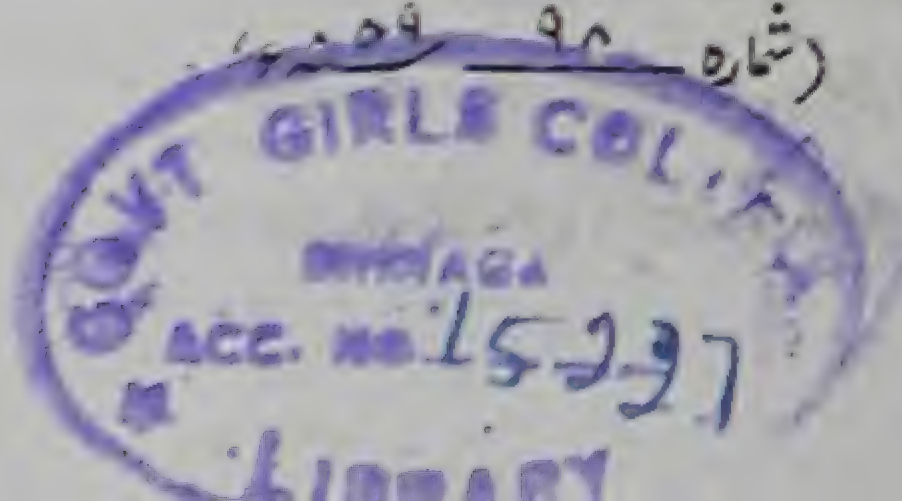
صفیہ اختر

ایک ہنگامہ

کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس
کانفرنس بھوپال پر ایک رپورتاژ

سُنا تھا کہ بھوپال کے مناظر دلکش اور فضا دل فریب ہے۔ ایسا ہی پایا۔ تالاب کا شفاف پانی اور اسے گھیرے ہوئے نیچی نیچی چٹانیں بھوپال کے باسیوں کی دنیا ہیں۔ یہی چٹانیں اپنے دامن میں ایک دنیا بسائے ہوئے ہیں اور انھیں چٹانوں پر سڑکیں چکر کھاتی ہوئی گزرتی ہیں۔ سرِ شام روشنی کے عکس سے سطحِ آب پر سیکڑوں قندیلیں روشن نظر آتی ہیں۔ اس سندرتا کے ہوتے ہوئے بھی یہ وادی احساس کی گرمی اور زندگی کی ــــ لپک سے خالی نظر آتی ہے۔ برسات میں تالاب کنول سے ڈھک جاتا ہے اور پہاڑیاں سرسبز ہو جاتی ہیں۔ بادل امنڈ امنڈ کر آتے ہیں اور موتی برسا جاتے ہیں۔ برسات گزرتے ہی پہاڑیوں کا سہاگ لٹ سا جاتا ہے اور کنول مرجھانے لگتے ہیں۔ لیکن نہ یہ پہاڑیاں ٹس سے مس نظر آتی ہیں نہ کبھی تالاب میں موجیں اٹھتی ہیں۔ بھوپال کا حسن ایک مجسمے یا STATUE کا حسن ہے جس میں حسن کی لطافت، حرکت کا لوچ جذبہ کی گرمی اور ذہن کی روشنی کی تلاش تشنہ رہ جاتی ہے۔

بھوپال کی سیاسی، سماجی اور رہائی دنیا بھی اپنے فطری ماحول سے ہم آہنگ ہے۔ یہاں زندگی کی چیخ تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی اور نیچی نیچی پہاڑیوں کی ثابت قدمی سے متاثر ہو کر دب جایا کرتی ہے۔ اس سوئی سوئی سی دنیا میں جہاں سکوت ہے اور ٹھہراؤ، کچھ ہستیاں زندگی کی بہاروں سے اپنی گودیوں کو بھر لینے کے لئے بے تاب ہیں اور آج زندگی کے درد کی تاب نہ لا کر کراہنے پر مجبور ہیں۔ لیکن فضا کی تغافل پسندی اُن کے نالوں کو "یاں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے" کا مصداق بنا دیتی ہے یہ جماعت ہے بھوپال کے مٹھی بھر ترقی پسند ادیبوں کی جو اپنے نغموں سے تالاب کے ٹھہرے ہوئے شفاف پانی میں ایسا طوفان اُٹھا دینا چاہتے ہیں جو "موج گنگا کی ہمالہ سے گذر جائے گی آج" کو صحیح ثابت کر دے۔

بھوپال کے ترقی پسند ادیبوں کی انجمن یہاں کے ادبی اندھیرے میں Guiding-star یا رہنما ستارے کی حیثیت رکھتی ہو یا نہیں البتہ اس انجمن کے افراد یہاں کی سوئی ہوئی اندھیری رات میں جگنو کی طرح ضرور چمکتے ہیں اور یہ سب اپنی ادبی ضیا پاشیوں کی خاطر اکثر رات کے وقت اکٹھا ہوتے ہیں۔ اپنی سناتے اور دوسروں کی سنتے ہیں۔ شکر ہے کہ اب تک

اس کی نوبت نہیں آئی کہ ؎

" جگنو میاں کی دُم جو چمکتی ہے رات کو
سب دیکھ دیکھ اُس کو بجاتے ہیں تالیاں"

ان جگنوؤں کی روشنی کے پیچھے بچے" اور جوان ہی نہیں دوڑتے، یہاں کے شوقین بوڑھے بھی انھیں اپنی ٹوپیوں میں بند کرکے خوش ہوتے ہیں۔

حال کی بات ہے ارباب انجمن نے تہیہ کیا کہ جیسے بنے بھوپال میں ترقی پسند ادیبوں کی ایک کل ہند کانفرنس کا انعقاد معلوم نہیں اس میں" ذوقِ خود بینی" زیادہ تھا کہ" مذاقِ بزم آرائی"۔ بہر حال کانفرنس تو ہوگی۔ یہ طے پا گیا۔ اللہ بھلا کرے حضرت مارکس اور اُن کی تعلیمات کا، اقتصادی مسئلہ زندگی کا بنیادی مسئلہ بن ہی گیا ہے۔ لہٰذا بغیر زیادہ غور و خوض کے طے پایا کہ کاسۂ گدائی لے کر گھر گھر جاؤ اور در در کی بھیک لاؤ۔ بے چارہ بھوپال کا ستایا ہوا ترقی پسند ادیب (جو حضرات مستثنیٰ ہونے کا دعویٰ رکھتے ہوں اُن سے معذرت کے ساتھ) اپنے حلیئے اور بشرے سے ارباب زر کو کیسے یقین دلا سکا کہ جو پیسے وہ طلب کر رہا ہے اُن کی ضرورت خود اُسے ذاتی طور پر پریشان نہیں کر رہی ہے۔ یہ معجزہ تھا یا کرامات۔ بہر حال چندہ جمع ہوا۔ اور خاصی تیزی کے ساتھ۔ اکثر بزرگوں نے ان نوجوانوں کے سوال کو بچے کی مٹھائی کا سوال سمجھ کر ایک مشفقانہ مسکراہٹ سمیت جیب سے کچھ برآمد کرکے پیچھا چھڑا یا۔ بعضوں نے کانفرنس کا پروگرام سُن کر ایسا ہی اشتیاق ظاہر کیا گویا مداری تماشہ دکھانے والا ہے۔ اور اکثر وضع دار ہستیوں نے اپنی وابستگی کا ثبوت دیتے ہوئے محض اس لئے چندہ دیا کہ حضرت سائل کے والد مرحوم جو اللہ رکھے بڑی حیثیت اور درجے کے آدمی تھے ان سے اُن کے گہرے مراسم اور تعلقات تھے۔ دفتر، کالج اور اسکولوں سے واپسی کے بعد بغیر پیشانیوں کی شکنیں دور کئے اور شیروانیوں کی گرد جھاڑے چندہ کمیٹی کے ممبر رشید صدیقی صاحب کے مشورہ پر کہ" اساتذہ درس و تدریس کے بعد بقیہ وقت بھیک مانگنے پر صرف کریں تاکہ ملک کے بھیک مانگنے کا معیار بلند ہو" سعادت مندی سے عمل پیرا نظر آتے تھے، دن بھر کی محنت سے فراغت اور شام کی گداگری سے فرصت کے بعد جب یہ لوگ روپے سے گرم جیبیں لے کر گھر لوٹتے تو الف لیلیٰ کے مشہور ہیرو علی بابا کی ازدواجی زندگی کی مدھم سی یاد تازہ ہو جاتی۔

فراہمی چندہ کے علاوہ خط و کتابت کی ذمہ داری بھی تھی جو اختر۔ اپنے ذمہ لی یعنی گروپ کی قیادت جعفری کے سپرد کی گئی۔ جعفری کا پُر خلوص انہماک اور اتنی دور سے اُن کی ایسی بھرپور دلچسپی حیرت کا باعث تھی۔ اُن کے خطوط سے اُن کی بے پناہ ہمدردیاں اور انتہائی عمل پسندی مترشح تھی۔ جعفری نے وعدہ کیا کہ وہ آئیں گے اور کرشن کو اپنے ساتھ لائیں گے۔ کرشن چندر، بیدی، ممتاز حسین، حبیب تنویر، کیفی اور اخیر میں احمد عباس بھی آنے پر تیار ہوگئے۔ جب کسی تازہ آمد کی امید بندھتی تو بھوپال کے ترقی پسندوں کی معصوم مسرت پر رشک آنے لگتا۔

عصمت آپا نے غالباً اپنے کو اہل ناز کے طبقہ سے نسبت دے کر نیاز والوں کی پوری پوری نیاز مندی دیکھی، بلاوے پر بلاوا مگر جواب ندارد کبھی خبر بھی آتی تو جعفری کی معرفت جس میں" گر یہ بناطرز انکار کیا تھی" کی گنجائش ضرور باقی رہتی تھی۔ جوش صاحب کے ساتھ اختر کی خط و کتابت کا یہ عالم رہا کہ ؎

" قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
جی جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں"

فراق کی آمد کی خواہش سب کو بے اندازہ تھی۔ فراق صاحب آئیں گے اپنی "آہٹوں کی شاعری" سے بھوپال میں جادو جگائیں گے مقالہ پڑھیں گے، تقریر بھی کریں گے۔ ان کی شخصیت کا ہر پہلو کارآمد بنا جا سکے گا۔ احتشام صاحب کی تنقید سے مارکس کے جدلیاتی فلسفہ اور ان کی شخصیت سے لکھنوی لطافت کی خوشبو کا انتظار تھا۔ شاعر بزم دلبراں مجاز کی شوخ گفتاری کے چرچے ابھی سے تھے مگر افسوس ہے کہ ان تینوں کی آمد سے آخر میں کانفرنس محروم رہ گئی۔

تاریخیں قریب آرہی تھیں اور منتظمین سوتے جاگتے کانفرنس ہی کے خیال میں مبتلا تھے۔ ایسے آزمائش کے دور میں شخصیتوں کا مطالعہ بھی ایک دلچسپ موضوع ہے۔ اختر کی مستعدی و سراسیمگی، اختر سعید کی لطافت پسندی اور خلوص پروری، احسن کی مستقل مزاجی اور خود اعتمادی کے برمحل وقت امتزاج اور انھیں کی فکر سے کانفرنس کی تیاری پختہ ہو رہی تھی، ادھر صہبا، پوسٹروں کے ذریعہ بڑے بڑے بلند آہنگ اعلانات کر رہے تھے۔ بغیر اس اندیشہ کے کہ ان کی لاج انجمن رکھ سکے گی یا نہیں۔ صہبا کی یہ خوش اعتقادی "امید یقین کی اکلوتی بچی" کا خیال تازہ کر دیتی تھی۔

قمر جمالی قلم کی کاوش اور ہاتھ کی محنت میں مساوات رائج کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے تھے۔ منٹو ہال کی آرائش کے سلسلے میں گیلری کی کارنسوں پر "قدم" ٹکا ٹکا کر تصویریں آویزاں کرنے کی گواہی وہاں کے چپراسیوں تک سے وہ بآسانی دلوا سکتے ہیں بھوپال کے۔ اسی انتشار کی وجہ سے قدم قدم پر روڑے اٹک رہے تھے، "لیکن" خضر مل جاتے ہیں جن کو راستہ ملتا نہیں"۔ بھوپال کے اکثر نیتاؤں نے مدد کی۔ ظہیر ہاشمی صاحب نے منٹو ہال میں کانفرنس کرنے کی اجازت دی۔ کامتا پرشاد جی نے سواری اور روشنی کا انتظام کرایا۔ جلال قریشی صاحب نے اپنے [illegible] کے ذریعہ میونسپل بورڈ کی جانب سے تین سو کا عطیہ پیش کر کے عوام کے پیسے عوام کے کام میں شامل کرائے۔ حامد سعید خاں صاحب نے اپنے وسیع دامنِ عاطفت میں بیرون بھوپال سب کو پناہ دینے کا وعدہ کر کے قیام اور طعام کا انتظام اپنے ذمہ لیا، ساتھ ہی استقبالیہ کمیٹی کی صدارت قبول کی۔ بات آگے بڑھی اور "یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ" کے جنون میں ترقی پسند ادیب کانفرنس کے افتتاح کرنے کی رضامندی —— علامہ سلیمان ندوی صاحب سے لے آئے۔ اب تو انجمن کے سر پر سوتے جاگتے مریم کا مقدس ہاتھ تھا۔ اور وہ ہر بلا اور آفات سے محفوظ ہونے کا یقین کر سکتی تھی۔

کالج کے لڑکوں، لڑکیوں کی ایک فوج والنٹیر کے فرائض انجام دینے کو تیار ہو گئی، جن میں اکثر کی —— "لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں" والی سادگی پر مرمٹنے کو جی چاہتا تھا۔

کانفرنس کے آغاز سے دو دن پیشتر جعفری کی گرفتاری کی اطلاع نے منتظمین کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ ایک بمبئی گروپ ہی ایسا تھا جو "نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز" والے مسلک کو بالائے طاق رکھ کر کشادہ پیشانی سے شرکت کے لئے تیار تھا، پر بازو بھی کمزور پڑا۔ بمبئی تار پہ تار روانہ کئے جانے لگے۔ اس بے مائیگی کے احساس نے منتظمین کانفرنس پر تازیانہ کا کام کیا۔ دیکھنے والا قطعی یہی محسوس کرتا تھا کہ "بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد"

وقت کا دھارا روکے نہیں رکتا، پچیس کی صبح آئی اور ساتھ بمبئی کے ترقی پسند مہمانوں کو بھی لائی۔ صدر انجمن کو پوری رات صبح کے دھڑکے نے سونے نہ دیا تھا۔ آخر شب نیند جو آئی تو "روکے رو کے سحر کو روکے کوئی" جوش کے لئے کہہ دینا آسان تھا۔ لیکن عصمت کی آمد کو روکنا نا ممکن تھا، ان کے بس کی چیز بھی نہ تھی۔ عصمت آئیں کنبے سمیت اور اپنے میزبان مکرم کو سوتا پایا۔ شاہد لطیف کی آمد انجمن

کے لئے تقویت کا باعث تھی۔ کرشن، تاباں، مجروح، مہندر، سبھی اسی گاڑی سے آئے اور حامد سعید خاں صاحب کی سپردگی میں پہنچا دیئے گئے۔ ان مہمانوں کی آمد کے بعد کانفرنس کا ہونا موت کی طرح یقینی سا ہو گیا۔ بالکل جیسے موت کے اٹل ہوتے ہوئے بھی اس کے لئے تیار ہونا فطرتِ انسانی کے خلاف ہے۔ اسی طرح معلوم ہوا کہ یہ فن کار توشۂ آخرت کے طور پر بھی کوئی قلمی تیاری اپنے ساتھ کانفرنس کے لئے نہیں لائے تھے۔ نتیجہ کے طور پر عصمت آپا نے شدید اظہار خلوص اور ہلکے سے ناشتے کے بعد قلم سنبھالا اور آنے والے عرصۂ محشر کے لئے پیش کش کی تیاری میں مصروف ہو گئیں۔ سنا جاتا ہے کہ کرشن چندر نے بھی حامد سعید خاں صاحب کے کمرے میں اعتکاف شروع کر دیا۔ منتظمین کانفرنس کے ایک ایک سر میں ہزار سودے سمائے ہوئے تھے، لہٰذا انھیں بھی مہمانوں کے اس انہماک نے خاطر تواضع سے خاصی فرصت دلوا دی۔

۲۵ جنوری کو سات بجے شام کانفرنس کا افتتاحیہ اجلاس ہونا تھا۔ تمام دن ہال سجایا جاتا رہا۔ مرکزی ساتی بورڈ شان داری سے پورے ہال میں جگمگا رہا تھا۔ تصویریں وغیرہ بھی بقول شخصے وقت کو دیکھتے ہوئے بری نہ تھیں۔ منٹو ہال کے عالی شان ستون، نقشین محرابیں، بلند و مرصع چھتیں بذاتِ خود مرعوب کن ہیں۔ آج کی سجاوٹ نے ہال میں زندگی کی لہر سی دوڑا دی تھی۔ والنٹیرز اپنے نشانوں سمیت ہر سمت خراماں نظر آ رہے تھے۔ ادھر استقبالیہ کمیٹی کے ممبروں کے سینوں پر سجے ہوئے خوش رنگ نشان ان کے دل کی دھڑکن کی غمازی کر رہے تھے۔ موٹروں پر موٹریں آ کر رکیں اور دیکھتے دیکھتے ہال بھر گیا۔

جلسے کی صدارت کا اعلان کیا گیا۔ اور بائیں پہلو کی کرسیوں کی قطار سے کرشن چندر نکل کر اسٹیج کی طرف بڑھے۔ اندازہ یہی ہے کہ اکثر اہالیان بھوپال کے دلوں کی ایک دھڑکن ضرور خطا کر گئی ہوگی۔ بس یہی ہیں کرشن چندر؟ دبلا پتلا جسم ہی نہیں ان کی تو آنکھیں تک کمزور ہیں۔ عینک بھی استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ تو ان کی علم دوستی کی روشن دلیل ہے۔ پھر ان کی چاند بھی تو گنجی ہے مگر سنا ہے مردوں کی گنجی چاند خوش نصیبی کی نشانی ہے۔ لباس میں کوئی اہتمام رکھنا آیا ان کے بس کی چیز نہیں یا یہ خود کو ان چیزوں سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ ایسی ڈھیلی ڈھالی جزری کل ہند کانفرنس میں مظاہرے کی چیز تو نہ تھی۔ یہ تخاطب کے وقت دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈال کر شانے نیز ہے بھی تو کر لیتے ہیں۔ بہرحال اب تو حاضرین کو ان کی صدارت بھگتنی ہی ہوگی۔ کرشن چندر کی فرمائش پر مولانا صاحب اسٹیج پر تشریف لائے۔ نہایت نفیس ململ کا سفید عمامہ سر پر اور اس سے بھی زیادہ سفید داڑھی ان کے دمکتے چہرے پر زیب دے رہی تھی۔ مولانا کا قد و قامت بلند نہیں مگر اس کے کشیدہ پن میں بڑھاپے کے ساتھ بھی فرق نہیں آیا۔ ان کے بشرے سے مسلمانوں کی عظمت رفتہ مترشح نظر آتی ہے۔ ان کی چال ڈھال میں ایک عالمانہ وقار ہے اور ان کے تیور میں ایک محقق کا ٹھوس پن۔

"نوجوان ادیبو! اور ہندوستان کی زبان اور قلم کے مالکو!" مولانا نے مخاطب کیا۔ ان کا انداز کچھ عمر کے تقاضے اور کچھ فطری آہستہ کلامی کی وجہ سے گرمیِ گفتار سے محروم ہے۔ وہ ٹھنڈے دل سے آواز کی ایک متعین سطح پر بولتے رہے۔ سننے اور سمجھنے کا فرض حاضرین کے ذمہ رہا۔ "کبھی میں بھی نوجوان ادیب تھا" مولانا نے فرمایا "اس وقت کے بوڑھے مجھے دیکھ کر اور میری باتیں سن کر اسی قسم کے اعتراضات مجھ پر بھی کرتے تھے۔ آخر میں بھی پرانا ہوا اور ان کی عمر کو پہنچا تو مجھے بھی اپنے نوجوانوں کے تیور دیکھ کر ویسا ہی تعجب آتا ہے اب نئے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی دنیا ہے، لیکن عزیزو! ایک دن تم کو بھی پرانا بننا ہوگا۔ اور تمھارا ترقی پسند ادب بھی پرانا ہو چکا ہوگا۔ اس لئے نیا اور پرانا ہونا کوئی خاص بڑائی کی بات نہیں۔ نہ ہر پرانی چیز غلط اور نہ ہر نئی چیز ٹھیک ہے، اس کے غلط اور ٹھیک ہونے کی کسوٹی اس کی افادیت ہے" ان الفاظ سے مولانا نے ادب کے متعلق ایک ارتقائی نظریہ پیش کیا۔ اور ترقی پسندی کے نام سے عام طور پر

جو تعصبات وابستہ ہیں اُن کا ازالہ کیا۔

البتہ علامہ کا ترقی پسند ادب پر "خوردن برائے زیستن" کے مسلک کا الزام اُن کی دقتِ نظر کے شایانِ شان نہ تھا لیکن تقریر کی متلوّن مزاجی اور مولانا کے لہجے کی یکسانیت نے جلد ہی حاضرین کے لئے اس سلسلہ کو صبر آزما بنا دیا۔ بہرحال All is well that ends well۔ مولانا نے اپنی تقریر "پند پیروانا" کو جان سے زیادہ عزیز رکھنے کی اپیل پر خوش اسلوبی سے ختم کی۔ اب صدر استقبالیہ کمیٹی کی باری تھی جو بھوپال کے رؤسا میں ایک قبول اور مقتدر درجہ رکھتے ہیں۔ مگر اپنے طرز و انداز، اپنی پوشاک و حلیہ سے جاگیردارانہ لطافت و خوشبو کے بجائے جمہور پسندی کا نقش قائم کرتے ہیں۔ یہ عمر سے بوڑھے مگر دل و دماغ سے جوان ہیں۔ ان میں ہر تازہ تغیر کو خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہنے کی قوت و صلاحیت ہے۔ ایسے بوڑھے آج کل کے شکستہ خاطر نوجوانوں سے زیادہ قابلِ قدر ہیں۔

آخر کار کرشن کی باری آ ہی گئی۔ کرشن نے خطبہ پڑھنا شروع کیا اور بے اختیار فراق کا یہ شعر یاد آنے لگا ؎

"دیکھ رفتارِ انقلاب فراقؔ
کتنی آہستہ اور کتنی تیز"

کرشن کی شخصیت میں اثر آفرینی نہیں لیکن کشش ضرور ہے اور اس کے لہجہ میں اس کی روح کی کھنک۔ تقریر تخریبی پہلو رکھتے ہوئے بھی کسی موقعہ پر کسی کی دل آزاری کا باعث نہ بنی اس لئے کہ کرشن کا حسین اسلوبِ بیان مدد کر رہا تھا۔ پرانے اسالیبِ بیان کو پھٹے ہوئے جوتوں سے تشبیہ دیتے ہوئے 'اُس کر یا' 'ہاتھوں کے ساگ' 'کو بہتے ختن' اور 'گیسوئے تتار' پر ترجیح دیتے ہوئے دیکھ کر بھی کسی چہرے پر برہمی کے آثار نہ تھے۔ حقیقت نگاری پر زور دیتے ہوئے کرشن نے اردو شاعری میں زمین کی سوندھی سوندھی بُو، کسان کے پسینے بھرے ہوئے مضبوط ہاتھ اور مزدور کی آنکھ سے سنی ہوئی وردیوں کی کمی بتائی۔ ساتھ ہی اس ضرورت کی اہمیت کا احساس دلایا کہ "ہمارے ادب کو زندگی کے ساتھ چلنا ہے۔ اور زندگی بہت دور آسمان کے قریب پرواز نہیں کرتی۔ وہ دھرتی کے سینہ سے لگ کر کھسکتی ہے۔" ہندوستان کی نام نہاد سیاسی آزادی پر کرشن کی تنقید اپنی معنویت اور ادبیت کے اعتبار سے جواب نہ رکھتی تھی۔ "کل آزادی کا رنگ سفید تھا اور آج کالا ہو گیا ہے"۔ کرشن نے اپنے نفیس اندازِ تقریر سے سب کو موہ لیا تھا۔ اس کی بات سنی جا رہی تھی اور مانی جا رہی تھی، قطع نظر اس کے کہ اس کا سر گنجا اور اس کی جرزی ڈھیلی تھی۔ کرشن کی بنسی کا چھایا ہوا طلسم پیغامات سے ٹوٹا۔ منھ کا مزہ بدلنے کو آخیر میں مجروح نے غزل سنائی۔ نغمہ سے کہیں زیادہ نغمہ سرائی نے اثر کیا۔ مجروح کی بھرپور آواز اور مدھر تانیں محفل پر کیف بن کر چھا گئیں۔ مشرق کے تین حکیموں نے تو محض ایک ستارہ کو یروشلم کو سلام کرتے دیکھا تھا اور مسیح کی پیدائش کا مژدہ لے کر چل پڑے تھے۔ جمہور پرست مجروح نے مقطع میں سارے ستاروں کا سلام ماسکو پہنچایا ؎

مری نگاہ میں ہے ارضِ ماسکو مجروحؔ
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

اور اپنی جگہ آن بیٹھے۔ محفل برخاست ہوئی۔ بحیثیت مجموعی حاضرین خاصے مرعوب واپس ہوئے۔

۲۶ جنوری۔ جعفری کے گرفتار ہو جانے سے سہ پہر کی میٹنگ کی صدارت کا قرعہ شاہد لطیف کے نام نکالا گیا۔ آج

شاہد لطیف کو پندرہ پندرہ منٹ بعد ایک پیالی چائے درکار تھی۔ اس لئے کہ جس طرح ہو سکے جوڑ توڑ کر کے خطبہ تیار کرنا تھا۔ شاہد لطیف کی ذہانتیں فلم کے جھوٹے موتیوں کے مول بک سی گئیں ہیں۔ ورنہ رسالہ ساقی کے شباب کے دور میں ان کے اکثر افسانوں نے خاصی دھوم مچادی تھی۔ خصوصاً "بھوک" پر بزرگان کرام نے بڑی لے دے برپا کی تھی۔ شاہد تقریباً ۱۹۳۰ء تک علی گڈھ کی علمی و ادبی فضا میں سانس لے کر پروان چڑھے ہیں۔ اب بمبئی میں فلم سازی اور ڈائرکشن کا کام اپنی "نصف بہتر" عصمت کی شرکت سے کرتے ہیں۔ خطبۂ صدارت گو نہایت افراتفری کے عالم میں تیار ہوا تھا۔ تاہم افسانوی ادب پر مبصرانہ نگاہ کی دلیل تھا۔ شاہد نے پریم چند اور راشد الخیری کی افسانہ نگاری سے لے کر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد تک کے افسانوی ادب کا تاریخی جائزہ پیش کیا اور افسانہ نگاری کے تین دور قائم کئے: اصلاحی دور، جنسی مریضانہ پن اور شاعرانہ تکلفاتی لہجہ کا دور اور موجودہ زمانہ جب کہ گزشتہ دس برس کی پیہم کوششوں کے بعد افسانہ نگار کہیں سنِ بلوغ کو پہنچے ہیں جس کی چند مثالیں "عصمت کے لال چیونٹے" کرشن کا "بت جاگتے ہیں" اور مہندر کا افسانہ "پاکستان سے ہندوستان تک" ہیں۔

ابراہیم یوسف کی ڈرامہ نگاری سے اچھی توقعات وابستہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ تاہم اس تمام اُن کی دو غلطیوں نے مزا کرکرا دیا۔ ڈراما طویل تھا اور پڑھنے میں مستقل یک آہنگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حاضرین نے خود کسی فی البدیہہ ڈرامہ کے مکالمہ کی تیاری شروع کردی اور ابراہیم یوسف صاحب نے "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم" کا تسلی بخش سہارا لے کر ڈرامہ ختم کیا۔

عصمت چغتائی نے اپنا مضمون 'کہانی'، جو آج کل میں چھپ بھی چکا ہے خاصی ترمیم و تنسیخ کے بعد سنایا۔ اس میں کہانی کے مروجہ موضوعات اور سماجی و سیاسی ارتقا کے ساتھ اس کی ترقی کا بصیرت انگیز جائزہ پیش کیا تھا، ساتھ ہی یہ بھی کہ آج کے بدلے ہوئے حالات کہانی سے کیا مطالبہ کرتے ہیں۔ عصمت کا بے تکلف گھریلو لہجہ اور اس کے جاگتے ہوئے غوخ چلبلے محفل کو گدگدا رہے تھے۔ عصمت نے ساز چھیڑتے وقت رنگ محفل کا لحاظ رکھا تھا۔

۲۶ کی رات کو ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ بزم میں خاصا خروش تھا۔ زبان کا مسئلہ ترقی پسندوں کے ہاتھوں طے ہونا تھا۔ پھر بھی آج کی بات ان کے بس کی نہ تھی۔ زبان تو بوڑھوں کا سرمایہ ہے۔ اس کے تحفظ کے لئے وہ ہم سے زیادہ حق دار ہیں سندر لال جی نے صدارت فرمائی۔ سندر لال جی کا یہ دوسرا بچپن ہے۔ وہ اپنے پہلے بچپن کو کھو کر اس بچپن کو پوری طرح ——— عزیز رکھتے ہیں اور خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تقریر کرسی پر بیٹھ کر شروع ہوئی مگر قوت و زور کا یہ عالم کہ بغیر مائیکروفون کی امداد کے ہر ہر لفظ لوگوں تک پہنچ رہا تھا۔ "بچو"۔ "یارو"۔ "بیوقوفو"۔ "کم بختو" کے خطابات نے سننے والوں کے دلوں سے بڑا بوجھ ہلکا کر دیا تھا۔ جگہ جگہ ٹھیلے بازی سے ہال قہقہوں سے گونج جاتا تھا۔ سندر لال جی کے لباس اور انداز میں ہندوستان کے رشیوں کی سی سادگی نے گاندھی جی کی یاد دلادی۔

"اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری" تعصب اور نفرت دور کرنے کی تلقین سے ان کی تقریر لبریز تھی۔ مسلمان ہندی، اور ہندو اردو سیکھیں اور دونوں کو اپنی زبان اور سرمایہ سمجھیں وغیرہ۔ سندر لال جی کی تقریر کا سب سے بڑا گڑ یہ تھا کہ وہ اخیر تک "نئی نئی سی ہے۔ لیکن یہ رہگزر پھر بھی" کا احساس دلاتی رہی۔

دوسری جانب علامہ سلیمان ندوی کی موجودگی ادب کے طالب علموں کے لئے صنعت تضاد کی تعریف سیکھنے میں مددگار ثابت ہو رہی تھی۔ سندر لال جی کی تقریر کے خاتمہ پر وہ اپنی "علم کی سنجیدہ گفتاری، بڑھاپے کے شعور" سمیت آئے اور بتایا کہ

اُردو کس طرح ہندو مسلمان دونوں کے خونِ جگر سے سیراب ہوکر پروان چڑھی ہے اور دونوں کی تہذیب کی آمیزش کا نتیجہ ہے اسی لئے اس پر مذہب کا ٹھپّہ لگانا کم نظری کی دلیل ہے ــــــ جیسے جیسے اسلامی تمدن ہندوستانی معاشرت و تمدن پر اثر انداز ہوا ــــــ فارسی، عربی اور ترکی الفاظ ہندوستان کی رائج زبانوں میں شامل ہوتے گئے اور اُردو نے جنم لیا۔ مولانا کی تقریر پوری توجہ سے سنی اور سمجھی گئی۔

اختر سعید نے زبان کے بارے میں ایک ریزولیوشن پیش کیا جس میں ہندوستانی زبان کو وجود میں لانے کی کوشش پر زور دیا گیا تھا۔ اور جب تک کہ ہندوستانی زبان کی پوری طور پر تشکیل نہیں ہوتی اُس وقت تک اُردو اور ہندی دونوں کو قائم رکھنے کی حکومتِ ہند سے پُر زور اپیل کی گئی تھی۔ احسن نے اس رزولیوشن کی پُر زور تائید کی اور صوباتی حکومتوں کی اردو دشمنی کو ظاہر کیا۔ عمائدین شہر کو احسن کی تقریر چھوٹا منہ، بڑی بات معلوم ہو رہی ہوگی۔ لیکن اس سے انکار نہیں کہ احسن میں جوش تھا۔ خلوص تھا، اور سب سے بڑھ کر اخلاقی جسارت۔ جلسے کے اختتام پر رات بھیگ چکی تھی۔ موٹروں پر موٹریں منٹو ہال سے رنگتی ہوئی نکلیں اور چند ہی منٹ میں سندر لال جی کی شوخ گفتاری کے تذکروں سے بھوپال کا گھر گھر مسکرا اٹھا۔

۲۷ کی صبح عصمت چغتائی علی گڑھ کی بھولی یادوں کو تازہ کرنے حمیدہ سلام الدین کے یہاں پناہ گزین ہوئیں۔ جہاں اچھا کھانا اور بے فکری کی گپ دونوں چیزیں موجود تھیں۔ کرشن وغیرہ سب کے سب میجر محبوب کے یہاں کھانے پر مدعو تھے۔ میجر محبوب نے عصمت کو کھانے کی دعوت سے محروم رکھتے ہوئے غالباً اس کا لحاظ نہ رکھا کہ عظیم بیگ چغتائی کے ملفوظات ثامی کے بعد عصمت چغتائی کے ملفوظات محبوب کی تصنیف کا بھی امکان ہے۔ بہرحال اچھا ہی ہوا عظیم بیگ مرحوم کی قلمی نوازشیں عصمت کی طرح مرنے والوں کو دوزخی نہیں بنایا کرتی تھیں۔ عصمت سے اس کا بھی اندیشہ تھا۔

آج شام عصمت چغتائی صدر نشینی پر آمادہ ہیں، شاید ایسے ہی کسی موقعہ پر شاعر نے عرض تمنا کی ہوگی ؎

منعقد پھر سے کروں محفلِ جمشید و قباد
دو گھڑی صدر نشینی پہ جو آمادہ ہو تو"

شعر تو دلکش ہے۔ لیکن یقیناً شاعر کے تصور میں عصمت جیسی مردمار عورت نہیں ہوسکتی تھی۔ عشوہ و انداز و ادا سے خالی عورت بھی کوئی عورت ہے۔ پھر بھی عصمت میں عورت کا وقار، اس کا بھاری بھرکم پن اور اس کا محبت بھرا دل ضرور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ داورِ محشر ایک نیکی کے صلہ میں ستر گناہ معاف کرے گا۔ شاید عصمت بھی اسی چکر میں بخشی جا کر عورتوں کی جنت میں داخل کر دی جائیں۔ بہرحال یہ تو اُن کا حشر ہوگا۔ آج کی میٹنگ کا کیا حشر ہوا۔ یہ سوال فی الحال زیادہ اہم ہے عصمت کا خطبہ صدارت LOUD SPEAKER کی ستم پیشگی سے خلصے خسارے میں رہا۔ تاہم جتنا سنا گیا، اس میں آزادی اور اس کے بعد فسادات کے اثرات سے متاثر ادبی تخلیقات پر تنقید تھی۔ عصمت نے اسے ہنگامی اور وقتی ماننے سے انکار کیا، اور بتایا کہ ہر زمانہ کا ــــــ ادب ہنگامی ہوتا ہے۔ رامانند ساگر کے "انسان مرگیا" پر نکتہ چینی کرتے ہوئے عباس کے رجعت پسندانہ دیباچہ پر خاصی بوچھار کی۔ "قلمی بے باکی اور نوازا تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی" سے عصمت واقف ہیں مگر ان کے زہر میں لذت اور ان کے نشتر میں گدگدی ہے۔ آج کی ادبی تخلیقات میں، سہرا کرشن کے افسانہ "جالندھی کا پل" اور اس سے بھی زیادہ ادھو کمار کی "چڑیل کی چھوری" کے سر رہا۔ ادھو کمار اپنے حلیئے سے اُودے شنکر کی برادری

سے معلوم ہوتے ہیں ۔ "پرچل کی چھوری" ایک گیت ہے جس میں ایک سیاسی مسئلہ عوام کی معاشرت اور اُن کی روزمرہ زندگی کا سوال بن گیا ہے۔ "جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا" کی اس سے بہتر مثال ممکن نہ تھی۔

لائی دھیج میں چیج بڑی بھاری
ہنگی اکال کی بھر لائی تھاری
بھو نکھن کے پیٹ کو کاری کٹاری

برلا کو سونے کے لائی کنگنوا   دادا پٹیل کو تجوری ہو
چرچل کی چھوری ہو مورے بھیّا   چرچل کی چھوری ہو

ادھوکمار کے گیت، اگر قوم قدر شناس ہو تو "ہومر" کے گیتوں کی طرح گاؤں اور بستیوں میں آگ لگا سکتے ہیں ان میں اپنائیت ہے ۔ بے تکلفی ہے اور خون کی گرمی ۔ ان میں ہمیں اپنی اصلی زندگی مسکراتی اور سسکیاں بھرتی نظر آتی ہے ۔ ان میں ہمیں اپنا رنگ روپ دمکا اور جھلسا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ یہی چیزیں تو ہندوستان کی اصل پونجی ہیں ۔ لیکن افسوس ہم زبردستی وہ بننا چاہتے ہیں جو دراصل نہیں ہیں ۔ ادھوکمار کا پیغام ہندوستان کے اسی فی صدی عوام تک پہنچایا جا سکتا ہے اور اُن کی لے کی لقائی ہر دیہات کے کسان مرد عورت کے بس کی چیز ہے ۔ ادھونے احساس دلایا کہ جوش نے ہندوستان کے کسان کو "ارتقا کا پیشوا تہذیب کا پروردگار" کہنے میں مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے۔

عصمت کی صدارت کے بعد ہی ڈرامہ ہونا تھا جس کے لئے کہنا بے جا نہ ہوگا "مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی" ڈرامہ جی بھر کے ناکام رہا ۔ لوگ دوسرے دن کے مشاعرے کی آس پر زندہ رہنے کا تہیّہ کئے گھر واپس ہوئے ۔

۲۸ر کی شام کو ادبی تخلیقات کا دوسرا جلسہ مہندر ناتھ کی صدارت میں ہوا ۔ بمبئی گروپ میں یہ بھی آئے تھے اور عادل رشید بھی اس محفل کو ماحول ستھرا اور صاف میسّر آگیا ۔ MUSE OF POETRY. کی پوجا شروع ہونے سے پہلے مہندر ناتھ نے ــــ ادب و جنس کے موضوع پر اپنا خطبۂ صدارت پڑھا ۔ ابتدا میں اُنھوں نے ترقی پسند ادب میں جنس کے موضوع کا تاریخی جائزہ پیش کیا اور بتایا کہ "ابتدائی دور میں ترقی پسند ادیب جنسی مریضانہ ذہنیت کا علاج کرنے کے بجائے خود مریض ہو کر رہ گئے ۔ لیکن اب ہمارے ادیبوں نے اپنا رُخ موڑا ہے اور جنس کے موضوع کو ایک تعمیری انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے" مہندر ناتھ نے جنسی افسانوں میں جسمانی محبّت کے ساتھ روحانی رفاقت اور خیال کی ہم آہنگی پر زور دیا ۔ ایسی رفاقت جو ایک نئے سماج کی داغ بیل ڈالنے میں مددگار ہو۔

عادل رشید کا افسانہ "باتیں" پسند کیا گیا ۔ شاہ میر راہی کے "الجھے بال" ایشیائی محبوبوں کی زلفوں کا کام کر کے استاد فن کرشن اور عصمت کا دل اُلجھا کر لے گئے ۔ "زندگی پر ایسی صحت مند اور صحیح نظر ہمارے بس کی چیز نہیں" کرشن نے کہا : راہی واقعی ابھی راہی ہے ، لیکن اس کا راستہ صاف ہے اور اس کے قدم تیز ہیں وہ ضرور آگے بڑھے گا ۔ تاباں کی نظم "دیوالی" تجنی کامیاب چیز ہے ۔ آسنا اثر سامعین پر تحت اللفظ پڑھے جانے کی وجہ سے پیدا نہ کر سکی ۔ ذوقِ نغمہ کی تکمیل اودھونے کی اور محفل برخاست ہوئی ۔

مشاعرہ کی رات کی سی رونق منٹو ہال میں اس سے پیشتر دیکھی ہی نہ گئی ۔ اسٹیج پھولوں سے سجایا گیا تھا اُجلی اُجلی چاندنی ،

گاؤ تکیئے اور قالین ـــــــ ہندوستان کی تاریخ کے پلٹے ہوتے اوراق سے کم نہ تھے۔ والنیٹرز کو اپنی کارگزاری دکھانے کا پورا موقع تھا۔ شہر بھر کی خواتین کا سیلاب امنڈ آیا تھا۔ صنف لطیف میں شاعری کی اس درجہ پوچھ "حسن آیا تھا خود منانے کو" کی مصداق بنی ہوئی تھی۔ طویل انتظار کے بعد جلسہ شروع ہوا۔ ابتدا میں صدر انجمن نے اختتامیہ تقریر کی جس میں اپنے رفقا کا شکریہ، آئے ہوئے مہانوں کی شکرگزاری اور بعض لوگوں ـــــ کی عدم شرکت پر اظہار تاسف تھا۔ بقیہ اور چیزیں رسمی ہو سکتی تھیں، لیکن جعفری کا تذکرہ اختر کے تاثر اور خلوص کا ضامن تھا۔ "وہ ہمارا ادیب وہ ہمارا شاعر، وہ ہمارا نقاد، وہ ہمارا ساتھی آج جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہے وہ نہ آسکا۔ جعفری جو تنہا ہماری انجمن ہے۔ لوگوں نے مجھے ہر اجلاس کے اختتام پر کانفرنس کی کامیابی کی مبارکباد دی، لیکن انھیں کیا معلوم کہ جعفری کے بغیر ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس نہیں ہوا کرتی۔" اس کے بعد بمبئی حکومت کے اس اقدام پر اظہار غصہ کا ایک پر زور ریزولیوشن منظور ہوا۔

مشاعرہ کی صدارت حضرت جوش کو کرنی تھی، لیکن وہ بارہ بجے کی گاڑی سے تشریف لا رہے تھے اس لئے اختر نے اُن کی نیابت اپنا فرض سمجھا۔ مشاعرہ پان، سگریٹ کے دور کے ساتھ شروع ہوا۔ ویسے تو اللہ رکھے بھوپال کا بچہ بچہ شاعر نکلے گا پھر بھی "ہر شے میں کسی شے کی کمی" کا احساس ذہن پر مستقل طاری تھا جو ذرا دیر کے لئے حضرت آزاد کی آمد سے مٹ سا گیا۔ یہ بزرگ فرحت اللہ بیگ کی یادگار، مشاعرے کے ایک فرد معلوم ہوتے تھے۔ کامدار رام پوری ٹوپی اور شانے پر سُرخ رومال جو داد لیتے وقت بالکل لکھنؤ کے دولھاؤں کی طرح چوکھی سلام کرنے کے لئے استعمال ہو رہا تھا۔ پہلا مصرعہ بڑے کڑاکے سے پڑھتے اور دوسرے مصرعہ کا نصف پڑھ کر باقی سامعین کے لئے چھوڑ دیتے۔ محفل کی محفل سیماب وار تڑپ رہی تھی۔ شاعر سے زیادہ سامعین بے قابو تھے۔ صدر مشاعرہ شاعر صاحب کو قابو میں رکھنے کے لئے جہاں اُنھیں حد سے گزرتے دیکھتے اُن کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ـــــ پیچھے گھسیٹ لیتے۔ اس مدافعتی اقدام میں مرکزی خیال، مائیکروفون کا تحفظ تھا۔! مجروح اُن کی محفل میں خوب جمے۔ احسن نے "سہیلی بتاؤ کہاں جا رہی ہو" پڑھ کر راز درون پردہ فاش کرنا چاہا۔ عرشی کی غزل کی خاطر خواہ داد ملی۔ اسعد نے "جان دے دوں گا مرے ساتھ اگر تم نہ رہے" کی دھمکی غریب محبوب کو کبھی دی تھی، آج سر بزم اپنی تیوریوں کے اتار چڑھاؤ سمیت دولت اور حکومت والوں کو جان لینے کی دھمکی سے مرعوب کرنے کی کوشش میں مبتلا تھے۔

ساڑھے گیارہ بجے ہوں گے اور سامعین کھلونے دے کر ہی بہلائے جا رہے تھے کہ ایک غلغلہ سا اٹھا اور پورا ہال "شاعر انقلاب حضرت جوش زندہ باد" کے نعروں سے گونج گیا۔ اہل محفل تعظیماً کھڑے ہوگئے۔ اختر نے اس شعر کے ساتھ کہ

"جوش اعظم کی صدارت میں لیس وپیش نہ کر
جوش تو قبلۂ رندان جہاں ہے ساقی"

صدارت جوش کے سپرد کر دی۔ ع "چاند نکلا سبک ہوئے تارے" ـــــ جوش کا وجود تمام نوجوان شعراء کے بیچ میں مولوی عبدالحق کی تشبیہ "پو دلوں میں دیو" کی یاد دلا رہا تھا۔ چند ایک ہی شعراء کے بعد جوش کی باری آگئی۔ میکدوں کی محفلوں اور مطربوں کی بزم والا شاعر آج "رشوت خوروں کی اپیل" لے کر آیا تھا۔ محفل کی محفل اس طنز لطیف پر دیوانی ہو رہی تھی سے

ہاتھ سے کھودیں اگر اس چیز کو پائیں گے کیا　　ہم اگر رشوت نہیں لیں گے تو پھر کھائیں گے کیا
قید بھی کردیں تو ہم کو راہ پر لائیں گے کیا　　یہ جنونِ عشق کے انداز مٹ جائیں گے کیا"
ملک بھر کو قید کردے کس کے بس کی بات ہے　　خیر سے سب ہیں کوئی دو چار دس کی بات ہے

جوشؔ جوانی کی کشش حصے میں لائے تھے تو بڑھاپے کا حسن بھی ۔ اُن کے طنز میں خدا دادی ہے اور ہلکا پھلکا پن ۔ اُن کی مسرتیں بے لوث ہیں ۔ ان کی عصمت فکر سے سامعین دل و دماغ کی کدورتیں دھورہے تھے ۔ مشاعرہ پورے رچاؤ پر تھا، لیکن طرب کے لمحے اکثر مختصر ہوتے ہیں ۔ حضرت جوش لکھنؤ سے بھوپال تک کی مسافت طے کرنے کے بعد سکون کے متلاشی تھے ۔ بزم برہم ہوئی "بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے" کی شکایت سامعین کے دلوں میں رہ گئی ۔

۲۹ر جنوری :۔ آج کانفرنس کے آخری مراحل طے پانے تھے ۔ مہمان ادیب و شعراء "روزانہ ایسے امتحان کے دو پرچوں" (بقول عصمت آپا) سے حد درجہ بیزار ہو چکے تھے ۔ آج کا دن حامد سعید صاحب کے دولت کدہ پر اطمینان سے گزرا اور لوگوں کو مل بیٹھنے کا موقع ملا ۔ بات چیت بھی اکثر خیالات کی طرح بڑی بے سروپائی سے بہکتی ہے ۔ آج بڑے دلچسپ موضوعات زیر بحث رہے ۔ آزاد شاعری، غزل گوئی میں جدید امکانات، ادب اور پروپیگنڈا ان سب پر گفتگو چھڑتی رہی ۔ آخر میں ترقی پسند شاعری پر یہ اعتراض اٹھایا گیا کہ اس شاعری میں عورت محبوبہ کے علاوہ اور حیثیتوں سے کیوں موضوع سخن نہیں بنتی ، جب کہ وہ بہن ، ماں ، دوست ، ساتھی ، بیوی ، کسان ، مزدوران سب حیثیتوں سے سوسائٹی کی اہم فرد ہے ۔ آخر اسے اب تک عشق کے لئے ہی کیوں مخصوص کر رکھا ہے — یہ بات تقریباً مان سی لی گئی کہ یہ روایتی تصورات کا اثر ہے جس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش ہمارے شاعروں کو کرنی چاہیے ۔ مجروحؔ جن کی شادی کو دو چار ہی دن باقی رہ گئے تھے ، اس کے موضوع سے غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے ۔

کھانے کے بعد جوش صاحب نے بڑے مزے لے لے کر قطعے اور رباعیاں سنائیں ۔ اُن کے عینک سنبھالتے ہی سننے والے ہمہ تن گوش ہو جاتے تھے ۔ شعر سناتے وقت جوش کا احساس غیر معمولی تیزی سے کام کرتا ہے ۔ وہ دادِ سخن کی گرمی میں خفیف سا فرق بھی محسوس کرتے ہیں اور فوراً مسکراتے ہوئے چہرے سے قدرے بے دلی کے لہجے میں کہتے ضرور ہیں " بیکار گیا شعر" اور پھر جنبش سر سے اس کی بھی داد چاہتے ہیں ۔ جوش صاحب کی بے تکلفی کی محفلیں ایک انوکھا لطف رکھتی ہیں — ان کی شخصیت میں غیر معمولی کشش اور ان کے ہر انداز میں زندگی کی ایسی رو ہے جو افسردہ دلوں میں بھی امنگ پیدا کر دیتی ہے اُن کی کشش کا راز وہی ہے جو ایک بے خبر معصوم بچے کی کشش کا ہوتا ہے ۔ بچہ اپنی ذات سے زیادہ کسی میں مبتلا نہیں ہوتا ، پھر بھی لوگ خود بخود اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس کی من موہنی باتوں میں کیف و سرور محسوس کرتے ہیں ۔ اس کی معصوم اور غیر آلودہ مسکراہٹ میں اپنی کھوئی ہوئی زندگی کی جھلک پاتے ہیں ۔ جوش کی شخصیت SOCICAL-TACT سے بری ہونے ہوئے بھی ایک مقناطیسی اثر رکھتی ہے ۔ دل اُن کی طرف کھنچتا ہے اور اہل محفل کی محبت آمیز نگاہوں کا عکس اُن کی آنکھوں میں ایک دائمی مسکراہٹ بن کر جذب ہوتا نظر آتا ہے ۔

آخری مرحلہ ایٹ ہوم کا ، کانی ہاؤس میں طے ہونا تھا ۔ منتظمین کانفرنس آج قدرے فراغت کے احساس سے مسرور نظر آرہے تھے ۔ گروپ کانی ہاؤس کے لان پر سجا تھا ، جوش صاحب مرکز میں تھے اور دیگر اصحاب ——————

" ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں " کی شکایت سمیت ایک ترتیب سے بیٹھ گئے تھے۔ والنٹیر لڑکے دعوت میں پوری دعوے داری سے شامل تھے اور لڑکیوں کی عدم شرکت ایک کمی کا احساس پیدا کر رہی تھی۔ عصمت آپا چند خواتین کے ساتھ کانی ہاؤس کے ایک پردہ والے گوشہ میں حوصلہ افزائی کرتی اور خلوص برستی نظر آرہی تھیں۔

دوسرے دن بمبئی والوں کی فرمائش تھی کہ سانچی کی سیر کی جائے۔ اختر سعید نے ذمہ داری سر لی اور وہی پژمردہ خاطر AMBULANCE CAR جو کانفرنس کے دوران میں ادیبوں اور شاعروں کو منٹو ہال لانے اور واپس لے جانے کے فرائض انجام دے چکی تھی اس خدمت کے لئے بھی حاصل ہوگئی۔ دو بجے ہوں گے کہ یہ لوگ عصمت آپا اور جوش صاحب کو لینے اختر کے مکان پر پہنچے جہاں عصمت آپا کے علاوہ ہر شخص اس بات پر مصر کہ ——— پروگرام ملتوی ہو جائے تو اچھا۔ آخر جیت عصمت ہی کی رہی۔ سب چلنے پر آمادہ ہوگئے اور جوش صاحب کو اس "خلل دماغ" کا سب سے بڑا مریض قرار دے کر اُن کے لئے ۔ AMBULANCE CAR کی بیچ والی خالی جگہ پر بستر لگا دیا گیا ——— اور سب بنچوں پر حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔ اس مُردار لاری میں اگر ذرا بھی حسن کا امکان ہوتا تو جوش صاحب کا ان سر پھرے ادیبوں کے بیچ میں لیٹا ہوا ہونا Passing of Arthur کی مشہور پینٹنگ کی یاد دلا دیتا۔

بہرحال لاری ہچکولے کھاتی ہوئی روانہ ہوئی۔ کرشن اور عصمت ابھی سے خیالی طور پر سانچی پہنچ گئے تھے اور افسانوں کے مواد تلاش کر رہے تھے۔ ادھو کمار رہ رہ کر اپنے گیت کا کوئی ادھورا سا حصہ چھیڑ دیتے اور پھر چپ ہو رہتے عسکری صاحب مستقل پیغمبرانہ شان سے ،

" لگی ٹھوکر تو سارا عشقِ لیلیٰ دب گیا آخر
کہ نیچے قیس اوپر اونٹ ہے اور اُس پہ محمل ہے "

کا ورد فرما رہے تھے۔ اور اثر کو کاری بنانے کے لئے نرت بتانا بھی ضروری خیال کر رہے تھے۔

اختر سعید کے چہرے پر ذمہ داری کے احساس سے تمتماہٹ تھی اور انداز سے خلافِ معمول متعدی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اختر نے بیٹی بیاہ دی تھی یا گھوڑے بیچ چکے تھے اور لاری کے اندر کسی تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ کے مسافروں کا نقشہ پیش کر رہے تھے۔ آنکھیں بند تھیں اور کبھی سر ایک جانب جھک جاتا کبھی دوسری جانب۔

دو چار میل جانے کے بعد ہی لاری نے آگے بڑھنے سے انکار شروع کیا۔ سورج کی شعاعیں ترچھی پڑ گئی تھیں اور سائے دراز ہو چلے تھے۔ آخر پندرہ سولہ میل کھنچ جانے کے بعد سب نے واپسی کا فیصلہ کیا۔

چنانچہ عصمت اور کرشن بقول عادل رشید "ابتدا" اور "انتہا" سے آگے کے ہم وزن " سانچی یا سانچی سے آگے " پہنچنے کے بجائے " سانچی سے پیچھے " پر ہی اکتفا کر کے واپس ہوئے۔

جوش صاحب غروب کے بعد گھر پہنچے اور شام کی محفل حسبِ معمول آراستہ ہوگئی۔ دوسری صبح عصمت کا کوچ تھا۔ اس کے بعد کی ہر گاڑی سے مہمان رخصت ہوتے رہے۔ بس یہ کیفیت طاری تھی :-

" آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے
آ عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے "

(شمارہ ۳-۱ ۴۹ء)

منتخب غزلیں

حسرت موہانی

پاس تو رہتے ہیں مگر دُور ہیں
کھُل کے وہ ملتے نہیں مجبور ہیں

طعنِ عزیزاں کا نہ ہو خوف اگر
میرے لئے اب بھی وہ رنجور ہیں

جان کے معذورِ تغافل انہیں
شوق کے سب طور بدستور ہیں

پردۂ انکار میں اقرار کے
کتنے ہی پہلو ہیں جو مستور ہیں

حسرت ان آنکھوں کی دوا ہے شفا
حُسن کی بیمار جو مشہور ہیں

(شمارہ ۳، سنہ ۱۹۵۱ء)

جگر مرادآبادی

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل

سازِ حیات سازِ شکستہ ہے اِن دِنوں
بزمِ خیالِ جنت ویراں ہے آج کل

آنکھیں تمام مشہدِ عشق و جمال ہیں
سینہ تمام گنجِ شہیداں ہے آج کل

دل کی جراحتوں سے کھِلے ہیں چمن چمن
اور اس کا نام فصلِ بہاراں ہے آج کل

انسانیت کہ جس سے عبارت ہے زندگی
انساں کے سائے سے بھی گریزاں ہے آج کل

وہ قومیت کہ جس سے ہے انسانیت ذلیل
ہندوستاں میں کس قدر ارزاں ہے آج کل

وہ دن گئے کہ طائرِ مقصود تھا شکار
انسان کا شکار خود انساں ہے آج کل

ہے زخمِ کائنات جو ہندو ہے اِن دنوں
ہے داغِ زندگی جو مسلماں ہے آج کل

کیسا خلوص، کس کی محبت، کہاں کا درد
خود زندگی متاعِ گریباں ہے آج کل

کچھ رہبرانِ ملک جو مخلص ہیں واقعی
اُن کا چراغ بھی تہہِ داماں ہے آج کل

اس سے تو خودکشی ہی غنیمت ہے اے جگر
جو مصلحت کہ پیشۂ مرداں ہے آج کل

(شمارہ ۲-۱، سنہ ۱۹۴۸ء)

فراق گورکھپوری

ہر عقدۂ تقدیرِ جہاں کھول رہی ہے
ہاں دھیان سے سننا یہ صدی بول رہی ہے

انگڑائیاں لیتی ہے تمنا تری دل میں
شیشے میں پری ناز کے پر تول رہی ہے

رہ رہ کے کھنک جاتی ہے ساقی یہ شبِ ماہ
اک جام پلا خنکیٔ شب بول رہی ہے

دل تنگ ہے شب کو کفنِ نور پنہا کے
وہ صبح جو غنچوں کی گرہ کھول رہی ہے

اک آگ لگا دیتی ہے دیوانوں کے دل میں
غنچوں کی رگوں میں جو تری ڈول رہی ہے

چھلکاتی ہے جو آگ نگاہوں سے گلابی
اس پردے میں وہ زہر بھی کچھ گھول رہی ہے

شبنم کی دمک ہے کہ شبِ ماہ کی دیوی
موتی سرِ گلزارِ جہاں رول رہی ہے

رکھتی ہے مشیت حدِ پروازِ جہاں بھی
انسان کی ہمت وہیں پر تول رہی ہے

پہلو میں شبِ تار وہ ہے کون سی دنیا
جس کے لئے آغوشِ سحر کھول رہی ہے

ہر آن وہ رگ رگ میں چٹکتی ہوئی کلیاں
اس شوخ کی اک ایک ادا بول رہی ہے

آمادۂ عصیاں ہیں جوانانِ چمن آج
جو شاخ ہے پیمانۂ مے تول رہی ہے

خوش ہے دلِ غمگیں بھی غنیمت ہے یہ وقفہ
اس کی نگہِ ناز بھی ہنس بول رہی ہے

گو حسن کی قیمت ہے ازل ہی سے دو عالم
وہ جنسِ محبت ہے جو انمول رہی ہے

پھر از سرِ نو چونکتی جاتی ہیں فضائیں
خاموش ہیں افلاک زمیں بول رہی ہے

اک کشف و کرامات کا عالم ہے گلستاں
یا بادِ صبا رازِ جہاں کھول رہی ہے

چھڑتے ہی غزل بڑھنے لگے رات کے سائے
پُر درد صدا گیسوئے شب کھول رہی ہے

آتا ہے قرآن آج ادھر بہرِ زیارت
بُت خانے کی خاموش فضا بول رہی ہے

(شمارہ ۲۵-۲۶، سنہ ۱۹۵۳ء)

اثر لکھنوی

بہار ہے ترے عارض سے لو لگائے ہوئے
چراغ لالہ و گل کے ہیں جھلملائے ہوئے

ترا خیال بھی تیری ہی طرح آتا ہے
ہزار چشمکِ برق و شرر چھپائے ہوئے

لہو کو پگھلی ہوئی آگ کیا بنائیں گے
جو نغمے آپ رخ میں نل کی نہیں تپائے ہوئے

سحر نے کھول دیئے اپنے شبنمی بازو
چمن میں پھول ہیں یا گل ترے کھلائے ہوئے

قدیم سے ہے یہی رسم و راہِ ملکِ وفا
وہ آزمائے گئے، جو تھے آزمائے ہوئے

ڈھٹائی دیکھی تجھی سے لڑاتے ہیں آنکھیں
ستارے آنکھوں کی تیری جھپک چرائے ہوئے

جو منتظر تھے کسی کے وہ سو گئے آخر
سسکتی آرزوؤں کو گلے لگائے ہوئے

اب اس کے بعد گلہ کس سے کیجیے کس کا
سمجھتے تھے جنھیں اپنا وہی پرائے ہوئے

ہم اپنے حالِ پریشاں پہ مسکرائے تھے
زمانہ ہوگیا یوں بھی تو مسکرائے ہوئے

وہی ہیں میرے شبستانِ شعر کی زینت
جو خواب حسن و محبت کے ہیں دکھائے ہوئے

اثر سناتی ہیں اب دل کی دھڑکنیں شب کو
فسانے اُس نگہِ مست کے سنائے ہوئے

(شمارہ ۱-۲، سنہ ۱۹۴۸ء)

آسی لکھنوی

حسنِ گل میں نہ سہی نغمے کی آواز میں آ
ایک انداز نہیں دوسرے انداز میں آ

طاقتِ رفتہ کہاں پھرتی ہے آوارہ وطن
آ پھر اک بار مرے شہپرِ پرواز میں آ

اک اشارے سے کرم کر سرِ راہے گاہے
کون کہتا ہے کہ خلوت کدۂ ناز میں آ

طلبِ عشق ہے تعیینِ مقامی سے بری
دل میں آ، جان میں آ، سوز میں آ، ساز میں آ

وقت آخر میں نوائے موت سبھی آتے ہیں
تجھ کو آنا ہے تو پھر عشق کے آغاز میں آ

(شمارہ ۳۰، سنہ ۱۹۵۳ء)

سراج لکھنوی

کمانداروں میں رکھ کر دل کو قسمت آزماتا ہوں
نشانے چوکتے ہیں اور میں بیٹھا مسکراتا ہوں

نصیب اشک ہوں مژگاں پہ تارا بن کے آتا ہوں
مگر پھر چند ساعت جھلملا کر ڈوب جاتا ہوں

وفا دشمن ترا غم بھی سلیقے سے اٹھاتا ہوں
کہ دل ہی دل میں روتا ہوں بظاہر مسکراتا ہوں

ترے معصوم دامن کی قسم اے روٹھنے والے
بہت مجبور ہوتا ہوں تو میں آنسو بہاتا ہوں

نشیمن منتشر، صیاد دشمن، پھول بیگانے
قفس کے رہنے والو آج ہی کل میں بھی آتا ہوں

مآلِ ضبطِ گریہ ہے عرق آلود پیشانی
دلِ طوفاں زدہ کے ساتھ خود بھی ڈوبا جاتا ہوں

سراج اب ختم ہے بربادئ گلشن کا افسانہ
یہ عالم ہے کہ میں اپنا نشیمن خود جلاتا ہوں

(اپریل سنہ ۱۹۴۶ء)

قدیر لکھنوی

طوفانِ غم سے دل کا لہو چشم تر میں ہے
اب میرے ناخدا کا سفینہ بھنور میں ہے

جب سے مرا قیام تری رہ گذر میں ہے
فردوس میرے دل میں ہے جنت نظر میں ہے

صیاد آشیاں کی تباہی نظر میں ہے
ماتم کی شکل دیکھ مرے بال و پر میں ہے

طاری ہوئی ہے عشق پہ جس دن سے بے خودی
حسن نظر فریب، فریبِ نظر میں ہے

جھکتی ہے بار بار جبینِ نیاز کیوں
کوئی کشش ضرور ترے سنگِ در میں ہے

بیٹھا ہوں رنج و غم کا مرقع بنا ہوا
دل میں کسی کی یاد ہے صورت نظر میں ہے

دنیا ہے اس کے واسطے جنت بنی ہوئی
جو خوش نصیب دفن تری رہ گذر میں ہے

ہر زاویے سے حسن کی ہے عشق پر نگاہ
کوئی نظر سے دور ہے کوئی نظر میں ہے

محو جمال دوست ہوں اتنی خبر کہاں　　جلوے میں ہے نظر کہ وہ جلوہ نظر میں ہے
کچھ دیر قتیل آپ کی چٹکی میں تیر تھا　　اب حسن اتفاق کہ میرے جگر میں ہے

بن جائے اُن کے رُخ کا پسینہ جو اے قدیر
ایسا بھی کوئی اشک تری چشم تر میں ہے

(اپریل سنہ ۱۹۴۶ء)

قمر جلالوی

بہاروں میں یہ بھی ستم دیکھتے ہیں　　کہ جلتا ہے گھر اور ہم دیکھتے ہیں
رہِ عشق میں ہیں بڑی احتیاطیں　　یہاں لوگ اک اک قدم دیکھتے ہیں
تری زلف برہم کی تصویر لے کر　　رہِ عشق کے پیچ و خم دیکھتے ہیں
ہنسے جائیے آپ اہلِ جنوں پر　　کہ یہ بات دیوانے کم دیکھتے ہیں

قمر سو گئے وہ سرِ شام شاید
تجلّی ستاروں میں کم دیکھتے ہیں

(شمارہ ۵۷، سنہ ۱۹۵۶ء)

جمیل مظہری

ہے دل میں احساسِ ورداب تک اگرچہ دیوانہ ہو گیا ہوں
جہاں خودی ہے نہ بے خودی ہے اک ایسی دنیا میں کھو گیا ہوں
ہوا موافق بھی ہو عزیزو، تو اس کنارے سے دور رہنا
میں بارہا آ کے اس کنارے پہ اپنی کشتی ڈبو گیا ہوں
یہی تو انجامِ جستجو ہے کہ ٹھوکریں کھا کے بت کدوں کی
جبینِ رسوا کو رکھ کے اپنی حرم کی چوکھٹ پہ سو گیا ہوں
یہ نازبردارگانِ فطرت مری اسیری کو خاک سمجھیں
ملا ہے کچھ اختیار جب سے میں اور مجبور ہو گیا ہوں

جو قافلہ اس طرف سے گذرے وہ ایک ٹھوکر مجھے لگا دے
جمیلؔ میں بیچ راستے میں اسی بھروسے پہ سو گیا ہوں

(شمارہ ۲۰۴، سنہ ۱۹۶۸ء)

آل رضا

اپنا لیا اسے چمن روزگار نے
میرے لئے۔ جو پھول کھلایا بہار نے

تصویر بن کے رہ گئی جلوہ کی اک جھلک
پردہ اٹھا کے چھوڑ دیا پردہ دار نے

ہر دم نئی ادا سے وہ آتے نظر پڑے
آنکھوں سے کتنے کام لئے انتظار نے

زخم زخم کے کیسے کیسے کھلاتی تھی روز پھول
جانے لگی تو مڑ کے نہ دیکھا بہار نے

کتنے ہی واقعات زمانہ کو لے رضا
مجبور ہو کے دیکھ لیا اختیار نے

(مارچ سنہ ۱۹۴۶ء)

عبدالمجید سالک

ہم نفسو! اُجڑ گئیں مہر و وفا کی بستیاں
پوچھ رہے ہیں اہلِ دل، مہر و وفا کو کیا ہوا

عشق ہے بے گداز کیوں، حسن ہے بے نیاز کیوں
میری وفا کہاں گئی، ان کی جفا کو کیا ہوا

یہ تو بجا کہ اب وہ کیف جامِ شراب میں نہیں
ساقیِ مہ کے غمزۂ ہوش رُبا کو کیا ہوا

اب نہیں جنتِ مشام، کوچۂ یار کی شمیم
نکہتِ گل کو کیا ہوا، بادِ صبا کو کیا ہوا

تھم گیا دورِ حیات، رُک گئی نبضِ کائنات
عشق و جنوں کی گرمیٔ ہمہمہ زا کو کیا ہوا

دشتِ جنوں میں ہو گئی منزلِ یار بے سراغ
قافلہ کس طرف گیا، بانگِ درا کو کیا ہوا

نالۂ شب ہے نارسا، آہِ سحر ہے بے اثر
میرا خدا کہاں گیا، میرے خدا کو کیا ہوا

(شمارہ ۲-۱، سنہ ۱۹۵۱ء)

نہال سیوہاروی

یارب اِس زندانِ گل میں میہماں کب تک رہوں؟
قیدیوں کی طرح زیرِ آسماں کب تک رہوں؟

نغمے سے ہر چند گھٹ جاتی ہے تکلیفِ حیات
نغمہ خوانی کی بھی حد ہے نغمہ خواں کب تک رہوں؟

بذلِ مے میں ہے وہی ساقی کو انکارِ شدید
سرگراں اب تک رہا ہوں سرگراں کب تک رہوں؟

مے کدے میں دہر کے ہر سمت ہے قحطِ شراب
مے کدے کا جب یہ عالم ہو جواں کب تک رہوں؟

کارواں سالار کب اُٹھے گا گہری نیند سے
فکر مندِ انتشارِ کارواں کب تک رہوں؟

اب تک ان آنکھوں سے دیکھا آشیاں جلتے ہوئے
شکوہ سنجِ جورِ برقِ آشیاں کب تک رہوں؟

آنے والا ہے تو آ چکتا نہیں کیوں عہدِ گل
پائمالِ سختیٔ دورِ خزاں کب تک رہوں؟

کب سے ہوں مصروف بازی ہائے زنجیرِ گراں
صرفِ بازی ہائے زنجیرِ گراں کب تک رہوں؟

میری ہستی ہے اگر نقدِ گرانِ کائنات
میں بہ عنوانِ متاعِ کارواں کب تک رہوں؟

زندگی کی ہر نفس توہین ہوتی ہو جہاں
زندگی کے بخشنے والے وہاں کب تک رہوں؟

(شمارہ ۵، سنہ ۱۹۵۱ء)

آنند نرائن ملا

زندگی سلسلۂ آہ و بُکا ہے تو سہی　　مگر اس آہ و بُکا میں بھی مزا ہے تو سہی
اب یہ تقدیر مری مجھ کو ملا زہرِ فنا　　انہیں آنکھوں میں مگر آبِ بقا ہے تو سہی
آ گئی ہے اُسے شاید کسی فردوس میں نیند　　ورنہ دنیا کے غریبوں کا خدا ہے تو سہی
نامِ اُلفت سے اگر چڑھ ہے تو کہہ لو کچھ اور　　کوئی شے عقل سے عظمت میں سوا ہے تو سہی
شک سا ہوتا ہے مجھے تو نے پکارا تھا کبھی　　ایک بھُولی ہُوئی کانوں میں صدا ہے تو سہی
غمِ ہستی کے لئے یہ بھی مداوا نہ ہُوئی　　مَے تری چشم کی اندوہ رُبا ہے تو سہی
عشق کی شانِ وفا کا یہ تقاضا ہے کہ ہنس　　اُس کی پرسش پہ خموشی بھی گِلا ہے تو سہی
کھولنے ہم بھی چلے تھے گرۂ دل اپنی　　ایک اُلجھا ہوا ہاتھوں میں سرا ہے تو سہی

وادیٔ شعر میں یہ جادۂ مُلّاؔ ہی نہ ہو
اک الگ ہٹ کے نشانِ کفِ پا ہے تو سہی

(شمارہ ۳-۱۰، سنہ ۱۹۴۹ء)

حفیظ ہوشیار پوری

بچھ رہے ہیں مرے پیش پا راستے　　میرے قدموں سے نا آشنا راستے
جس طرف دیکھو دامن کو پھیلائے ہیں　　میرے نقشِ قدم کے گدا راستے
ایک رستے کی بے انتہا منزلیں　　ایک منزل کے بے انتہا راستے
اتنے بے نقشِ پا دشت حائل ہوئے　　ہو گئے منزلوں سے جُدا راستے
ہم بدلتے رہے رہنما رات دن　　اور بدلتے رہے رہنما راستے
جن میں رہزن سے رہبر کی ہے دوستی　　اب نکالیں گے اُن کے سوا راستے
موج کے دوش پر ناؤ بہتی رہی　　ڈھونڈتا ہی رہا ناخدا راستے
اپنی آواز کی طرح لوٹ آؤں گا　　مجھ کو دیتے رہیں گے صدا راستے
یہ لہو کی لکیریں کہاں تک گئیں　　میری اس جستجو کی سزا راستے

کب سے ہیں میری یلغار کے منتظر		کہکشاں کے خلا در خلا راستے

میں مسافر، سفر میری قسمت حفیظ
میری تقدیر میں نا تمام راستے

(شمارہ ۱۵۵، سنہ ۱۹۶۴ء)

باسطِ بھوپالی

منزلِ دار و رسن لوح و قلم سے آگے		ہر جگہ ہم ہی ملیں گے تمہیں ہم سے آگے

طالبانِ حرم و دیر سے کوئی کہہ دے		اک مقام اور بھی ہے دیر و حرم سے آگے

نغمگی پاتے ہیں زنجیر کی جھنکاروں میں		جن کی نظریں ہیں روایاتِ ستم سے آگے

لاکھ بے ربط سہی، کیسی ہی ناکام سہی		زندگی تلخ نہ تھی تیرے کرم سے آگے

یا سحر ہی سے کبھی منتظرِ شب تھی نگاہ		یا کوئی صبح نہیں ہے شبِ غم سے آگے

کتنی معصوم تھی دنیائے محبت اے دوست		تیرے اقرار، ترے قول و قسم سے آگے

اتنا مبہم بھی نہ تھا، ایسا شکستہ بھی نہ تھا		خطِ تقدیرِ محبت ترے غم سے آگے

یہ مری دُردِ تہہ جام سے پوچھ اے ساقی		کتنے افسانے ہیں افسانۂ جم سے آگے

اُن کی محفل کا جہاں ذکر چھڑا ہے باسط
بات پہنچی ہے شبستانِ ارم سے آگے

(شمارہ ۸۹، سنہ ۱۹۵۸ء)

معین احسن جذبی

دانائے غم نہ محرمِ رازِ حیات ہم		دھڑکا رہے ہیں پھر بھی دلِ کائنات ہم

ہاں اک نگاہِ لطف کے حقدار تھے ضرور		مانا کہ تھے نہ لائقِ صد التفات ہم

بیم و خزاں سے کس کو مفر تھا مگر نسیم		کرتے رہے گلوں سے نکھرنے کی بات ہم

اے شمع دلبری تری محفل سے بارہا		لے کر اُٹھے ہیں سوزِ غمِ کائنات ہم

ڈھونڈا کئے ہیں راہِ ہوس رہروانِ شوق		دیکھا کئے ہیں لغزشِ پائے ثبات ہم

اُن کے غموں کا ہائے سہارا نہ پوچھئے
کچھ پا گئے ہیں اپنے غموں سے نجات ہم

(شمارہ ۸۰-۸۱، سنہ ۱۹۵۸ء)

سکندر علی وجد

دُور گردِ خس و خاشاک ہوئی جاتی ہے
سارے عالم کی فضا پاک ہوئی جاتی ہے

دیکھ! شہبازِ خرد مائلِ پرواز ہوا
ابھی پیمائشِ افلاک ہوئی جاتی ہے

علم کے نور سے اب تا بہ گذرگاہِ خیال
وسعتِ سرحدِ ادراک ہوئی جاتی ہے

آج سرگرمیٔ پیہم سے تری ابرِ کرم
مے فشاں خود ہی رگِ تاک ہوئی جاتی ہے

کس قدر زور پہ ہے نشۂ صہبائے بہار
ہر شگوفے کی قبا چاک ہوئی جاتی ہے

آتشِ عزم کو پھونکوں سے بجھانے والو
زندگی شعلۂ بے باک ہوئی جاتی ہے

تری محبوب نگاہوں نے جسے روکا تھا
وہ نظر اور بھی چالاک ہوئی جاتی ہے

وجد معصومیٔ تکرارِ تبسم کے نثار
زندگی شعر طربناک ہوئی جاتی ہے

(شمارہ ۱-۲، سنہ ۱۹۴۸ء)

GOVT GIRLS COLLEGE
ACC. NO 15227
LIBRARY

شکیل بدایونی

غمِ عشق کے مخالف غمِ عام تک نہ پہنچے
مرے سامنے تو آئے، مرے نام تک نہ پہنچے

میں نظر سے پی رہا تھا تو یہ دل نے بد دُعا دی
ترا ہاتھ زندگی بھر کبھی جام تک نہ پہنچے

وہ سخن بھی کیا سخن ہے نہ ہو جس میں دل کی دھڑکن
وہ صدا بھی کیا صدا ہے جو عوام تک نہ پہنچے

نئی صبح پر نظر ہے، مگر آہ یہ بھی ڈر ہے
یہ سحر بھی رفتہ رفتہ کہیں شام تک نہ پہنچے

مرے طائرِ نفس کو نہیں باغباں سے رنجش
ملے گھر میں آب و دانہ تو یہ دام تک نہ پہنچے

یہ ادائے بے نیازی تجھے بے وفا مبارک!
مگر ایسی بے رُخی کیا کہ سلام تک نہ پہنچے

جو نقابِ رُخ اُٹھا دی تو یہ قید بھی لگا دی
اُٹھے ہر نگاہ لیکن کوئی بام تک نہ پہنچے

انہیں اپنے دل کی خبریں مرے دل سے مل رہی ہیں
میں جو اُن سے رُوٹھ جاؤں تو پیام تک نہ پہنچے

وہی اک خموش نغمہ ہے شکیلؔ جانِ عالم
جو زبان پر نہ آئے جو کلام تک نہ پہنچے

(شمارہ ۳۰، سنہ ۱۹۵۳ء)

سیف الدین سیف

جو ہوم فراق سے چلی ہے　　　وہ رات ابھی کہاں ڈھلی ہے
بُت خانہ بھی تیری ضو سے روشن　　　اک شمع کہاں کہاں جلی ہے
ہے سینہ پہ سینہ دل کی دھڑکن　　　کیا بات نگاہ سے چلی ہے
بے کل تھے کبھی سکوں کی خاطر　　　اب دل کو سکونِ بے کلی ہے

ہم صُبحِ ازل سے پُھنک رہے ہیں
یہ شمع تو رات بھر جلی ہے

(شمارہ ۸، سنہ ۱۹۵۱ء)

علی جواد زیدی

جو نامرادِ کشاکش میں مبتلا نہ ہوا
خودی تو کیا وہ خدا کے بھی کام کا نہ رہا

بجھے گا کوئی دیا کوئی پھول ٹوٹے گا
مجھے بھلا کے نہ سمجھو کہ مسئلہ نہ رہا

ہزار آندھیوں میں اک چراغِ فکر و نظر
گھڑی گھڑی یہی دھڑکا رہا خدا نہ رہا

یہ پیلا چاند یہ شبخوں کا بے زباں شاہد
اداس ہے کہ جوانوں کا قافلہ نہ رہا

وہی ہوا، وہی قطرہ، وہی سمندر ہے
جو سر اُٹھا کے چلا تھا وہ بلبلا نہ رہا

سُنا ہے تیرے سوا اے غرورِ بے باکی
جہانِ نو کے لئے کوئی آسرا نہ رہا

وہ ناشناسوں کا جمگھٹ تھا جلوہ گاہوں میں
ادا شناسوں کو چلنے کا راستا نہ رہا

وجودِ ہوش تھا اک رہگذار کا جلوہ
سرکتی ریت پہ دم بھر بھی نقشِ پا نہ رہا

میں ایک زخم بہ دل، اجنبی سہی، لیکن
جو مُڑ کے دیکھ لیا تم نے پھر گلا نہ رہا

مجھے مٹا دو، مگر سن لو پیش گوئی بھی
یہی کہو گے کہ ہستی میں ہمہمہ نہ رہا

ادب کی قدر کسی مشتری کے بس کی نہیں
یہ قدر کم ہے کہ غیروں کو حوصلہ نہ رہا

شعورِ سوز کو ترسے ہوئے زمانے میں
کمی ہی کیا ہے جو زیدی سا بے نوا نہ ہوا

(شمارہ ۱۹۱، سنہ ۱۹۶۷ء)

غلام ربّانی تاباں

وہی سینۂ محبت، وہی داغِ نامتمامی
یہ ترے فسوں کی خامی کہ مرے جنوں کی خامی

کوئی جام مے کے بدلے جو طلب کرے وفائیں
بڑے شوق سے گوارا کروں رنجِ تشنہ کامی

یہ زمین میری جنت، یہ حسین میری حوریں
مرے طائرِ نظر کو نہ سکھا فلک مقامی

وہی سلسلہ طلب کا مرے دل سے تیرے دل تک
میں قتیلِ خوش ادائی، تو ہلاکِ خوش کلامی

مرا خونِ دل بھی شامل ہے نگارِ انجمن میں
میں چراغِ عارضی ہوں مری روشنی دوامی

وہ حقیقتِ جہاں کو کہے جا رہے ہیں دھوکا
یہ دلیلِ کم نگاہی کہ تجاہلِ گرامی

مرے زمزموں میں گرمی بھی توفیضِ رفتگاں سے
وہی سازِ میرؔ و غالبؔ وہی سوزِ شمسؔ و جامیؔ

(شمارہ ۳۵-۳۴، سنہ ۱۹۵۴ء)

حامد سعید خاں

برقِ خرمن دیکھئے، برقِ گلستاں دیکھئے
جو دکھاتی رسمِ زنداں اہلِ زنداں دیکھئے

کچھ نہ سمجھ تو دیکھنا ہی تھا مآلِ شوقِ دل
حسنِ ارماں دیکھئے یا حشرِ ارماں دیکھئے

بحرِ رنگیں، موجِ رنگیں، نگرمست وعزم مست
ڈوبنے والے کہاں تک راہِ طوفاں دیکھئے

مستیٔ لب پر تصدق چشمِ میگوں پر نثار
اہلِ ایماں کیا متاعِ دین و ایماں دیکھئے

عالمِ دیوانگی اور پھر نویدِ فصلِ گل!
اہلِ زنداں کیا در و دیوارِ زنداں دیکھئے

اور مشکل اور مشکل تر بنا لیتے اسے
آپ کے مجبورجس مشکل کو آساں دیکھئے

اے خوشا غرقاب ورنہ ایک ساحل کے لئے
لاکھ دریا، لاکھ موجیں، لاکھ طوفاں دیکھئے

(شمارہ ۳-۱، سنہ ۱۹۴۹ء)

رئیس امروہوی

دل غمِ دوجہاں میں ڈوب گیا
بے کراں، بے کراں میں ڈوب گیا

آسماں سے اُبھر کے نجمِ سحر
وسعتِ آسماں میں ڈوب گیا

قلزمِ بے کنارِ جلوہ و رنگ
دیدۂ خوں فشاں میں ڈوب گیا

اُف یہ ظلمت کہ ہر نشانِ اُفق
افقِ بے نشاں میں ڈوب گیا

میں زماں تھا، زماں میں غرق ہوا
میں مکاں تھا، مکاں میں ڈوب گیا

جانِ جاناں! ترا سفینۂ حسن
میرے دریائے جاں میں ڈوب گیا

تھا جو ایقاں کا مدعی وہ رئیسؔ
خود سرابِ گماں میں ڈوب گیا

(شمارہ ۱۳۰، سنہ ۱۹۶۱ء)

نظر حیدر آبادی

علاجِ قسمتِ آدم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے
بہر عالم سپاسِ غم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

سکوں کی آرزو جب مستقل آزار ہے یا رب
مزاجِ زندگی برہم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

غریبوں نے کبھی باب اثر کھلتے نہیں دیکھا
دعاؤں پر توجہ کم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

خودی منجملۂ اسبابِ ایماں ہوتی جاتی ہے
جبینِ خواجگی کو خم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

یہ ذوقِ کیف و مستی ورثۂ خسرو نہیں ساقی
ہر اک پیالے کو جامِ جم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

نظرؔ اب یادِ یارانِ وطن بھی بار ہے دل پر
محبت کو بھی نذرِ غم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

(شمارہ ۱۲-۱۱، سنہ ۱۹۵۲ء)

خورشید احمد جامی

غم کا فریب ہے نہ مسرت کا زہر ہے
اب شہر آرزو بھی اُداسی کا شہر ہے

وہ غم، شعورِ غم کی جسے آگ مل گئی
میرا خیال ہے کہ مسیحائے دہر ہے

کل تک جوانیوں پہ خزاں کا عتاب تھا
سنتے ہیں اب حسین بہاروں کا قہر ہے

دیکھو تو صرف ایک اندھیرا ہے بیکراں
سوچو تو زندگی بھی اُجالوں کا شہر ہے

زلفوں کی چھاؤں ہو کہ جوانی کی چاندنی
تریاق ہے کہیں تو کہیں ایک زہر ہے

جس کو فرازِ دار سے دیکھا تھا وقت نے　　کیا جانئے کہاں وہ امیدوں کا شہر ہے
جیسا می غرورِ تلخیٔ آیام سے ہلو
اک دَور کے سَراب کی بیمار لہر ہے

(شمارہ، ۱۲۹، سنہ ۱۹۶۲ء)

ادیب سہارنپوری

زخم کھا کھا کے مسکراتا ہوں　　عظمتِ زندگی بڑھاتا ہوں
غم چھپانے کو مسکراتا ہوں　　آپ اپنی ہنسی اُڑاتا ہوں
موج و طوفاں ہے زندگی میری　　میں حدوں میں کہاں سماتا ہوں
موت کی ہار اور کیا ہوگی　　میں برابر جیئے تو جاتا ہوں
اور اک لمحۂ سکوں کے لئے　　تہمتِ زندگی اُٹھاتا ہوں
حادثوں کا مذاق اُڑانے کو　　آندھیوں میں دیئے جلاتا ہوں
حاصلِ علم و آگہی مت پوچھ　　روز تازہ فریب کھاتا ہوں
معجزہ ہے مری وفا کا کہ میں　　بے وفاؤں کو یاد آتا ہوں
کس کا شکوہ کہ اُن کو پا کے ادیبؔ
میں تو خود کو بھی بھول جاتا ہوں

(شمارہ، ۱۵، سنہ ۱۹۵۲ء)

مجروح سلطانپوری

جس دم یہ سُنا ہے صبحِ وطن محبوس فضائے زنداں میں
جیسے کہ صبا اے ہم نفسو بے تاب ہم آئے زنداں میں

ہو تیغ اثر زنجیر قدم پھر بھی ہیں نقیبِ منزل ہم
زخموں سے چراغِ راہ گذر بیٹھے ہیں جلائے زنداں میں

غیروں کی خلش، اپنوں کی لگن، سوزِ غمِ جاناں، دردِ وطن
کیا کہئے کہ ہم ہیں کس کس کو سینے سے لگائے زنداں میں

یہ جبرِ سیاست یہ انساں، مظلوم آہیں مجبورِ فغاں
زخموں کی مہک، داغوں کا دھواں، مت پوچھ فضائے زنداں میں

صد چاک فریبِ امن و سکوں، عریاں ہے اہنسائی کا جنوں
کچھ خوں سے شہیدوں نے اپنے وہ گل ہیں کھلائے زنداں میں

مجرم تھے جو ہم سو قید ہوئے صیاد مگر اب یہ تو بتا
ہر وقت یہ کس کو ڈھونڈتے ہیں دیوار کے سائے زنداں میں

جسموں پہ یہ کس کا نام سیہ لکھ دیتے ہیں یہ کوڑوں کے نشاں
ہیں تاک میں کس کی زنجیریں اب دام بچھائے زنداں میں

گل بنتی ہے شاید خاکِ وطن شاید کہ سفر کرتی ہے خزاں
خوشبوئے بہاراں ملتی ہے کچھ دن سے ہوائے زنداں میں

رفتارِ زمانہ لَے جن کی، گیتی ہے گُلِ نغمہ جن کا
ہم گاتے ہیں اُن آوازوں سے آواز ملائے زنداں میں

مجروح نے بھی دیکھا اُس کو اے کہنہ نظامِ سرمایہ
تیری ہو یہی بنیاد مگر اب کیا ہے بنائے زنداں میں

(شمارہ ۱۰، سنہ ۱۹۵۱ء)

باقی صدیقی

ترے حضور ہوں فکرِ حیات ہے پھر بھی
مرے لبوں پہ زمانے کی بات ہے پھر بھی

اگر چہ اس میں تری کوششیں بھی شامل ہیں
یہ کائنات مری کائنات ہے پھر بھی

کہاں حقیقتِ جلوہ، کہاں فریبِ شرار　　　ہزار شمعیں جلیں رات رات ہے پھر بھی
فریبِ دوست اگرچہ ہے ایک عام سی بات　　　مرے لئے تو نئی واردات ہے پھر بھی
دعائیں موت کی یاروں نے کیں بہت باقی
ترا غلام بقیدِ حیات ہے پھر بھی

(شمارہ ۲-۱، سنہ ۱۹۵۱ء)

تابش دہلوی

گمرہی سے ہم دیکھیں کس طرح نکلتے ہیں　　　رہبروں کا یہ عالم راستے بدلتے ہیں
کس کو راہبر جانیں، کس کو راہزن سمجھیں　　　آج رہبر و رہزن ساتھ ساتھ چلتے ہیں
سوزِ غم سے ملتی ہے اہلِ دل کو تابانی　　　جو جلائے جاتے ہیں وہ چراغ جلتے ہیں
غم کا اک نہ اک پہلو موجب سکوں ہوگا　　　درد کے سہارے بھی کروٹیں بدلتے ہیں
چھاؤں تیری زلفوں کی دور ہوتی جاتی ہے　　　جن میں تھا سکوں حاصل اب وہ سائے ڈھلتے ہیں
بزمِ حسن و الفت میں یہ تمیز مشکل ہے　　　جل رہے ہیں پروانے یا چراغ جلتے ہیں
منزلِ طلب تو ہے پھر یہ دیر و کعبہ کیا　　　سنگِ راہ کچھ بھی ہوں ہم تو راہ چلتے ہیں
لغزشِ گماں بھی ہے جادۂ یقیں تابش
ایک گام گم کر کے ہم منزلوں سنبھلتے ہیں

(شمارہ ۳۵-۳۴، سنہ ۱۹۵۴ء)

پرویز شاہدی

کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں زبانِ التفات کی　　　تشریح کرتا جاتا ہوں اک ایک بات کی
تھوڑی سی مجھ کو سرخیٔ رخسار دیجئے　　　تصویر کھینچنی ہے مجھے کائنات کی
کل مسکرا دیئے تھے بڑی سادگی سے آپ　　　رنگین ہو گئی ہے کہانی حیات کی
اپنی نگاہِ لطف کو زحمت تو دیجئے　　　کرنی ہے اب اسی کو رفاقت حیات کی
دیکھا تھا کیا خوابِ مسرت میں کیا کہوں　　　دن کو نہ مجھ سے پوچھئے رُوداد رات کی

چمکا ہے جب بھی عارضِ تاباں کا آفتاب　　　چن لی ہے میرے دل نے کرن التفات کی

دل نے جمالیات سے پردے اٹھا دیئے
چھیڑی تھی بحث عقل نے اخلاقیات کی

(شمارہ ۳۵ - ۳۴ سنہ ۱۹۵۴ء)

قیوم نظر

دل ڈوبے ہے میرے سہارو　　　منزل منزل یوں نہ پکارو
آئی خزاں بھی چاک گریباں　　　دیکھو تو بے رحم بہارو
حسن ہمیشہ حسن رہے گا　　　دم مت مارو عشق کے مارو
کم ہمت تھی موت نہ آئی　　　اب جینا ہے، پاؤں پسارو

ایک نظر اور اٹھتی موجو
یہ طوفاں بھی پار اتارو

(شمارہ ۸، سنہ ۱۹۵۱ء)

فضا ابن فیضی

آج تک نقش ہیں حافظے میں مرے صورتیں بھولی بھالی ترے شہر کی
خوش نظر کون ایسا وہ معمار تھا جس نے بنیاد ڈالی ترے شہر کی

میں نہیں ہوں تو ہے کھوئی کھوئی ہوئی روپ کی انجمن زلف کی رہگذر
یہ مرے بعد اے پیکرِ دلبری! کس نے رونق چرالی ترے شہر کی

ہر تبسم خراشوں میں تلتا ہوا، آنسوؤں میں ہر اک چہرہ دھلتا ہوا
راس آئی نہ اِن تلخ ایام میں ہم کو آسودہ حالی ترے شہر کی

کون ہم وضعداروں کو پہچانتا، صاحبِ ذوق و فکر و نظر مانتا
کوئی مانوس چہرہ نہ ہم کو ملا ہر گلی دیکھ ڈالی ترے شہر کی

رُک ہی جاتے کوئی قیس تو ہم نہ تھے کوئی وضعِ جنوں خاص رکھتے نہ تھے
بڑھ کے آواز دیتی کسی موڑ سے رہ گزر خالی خالی ترے شہر کی

دل سلگنے لگا، ہونٹ جلنے لگے، آنچ کھا کھا کے شیشے پگھلنے لگے
رُوح میں پیاس کا زہر ٹپکا گئی یہ گھٹا کالی کالی ترے شہر کی

(شمارہ ۲۲۱، سنہ ۱۹۷۰ء)

شعری بھوپالی

ان سے ہمیں کچھ کام نہیں ہے　　دل کو مگر آرام نہیں ہے
میری تباہی میرا مقدر　　آپ پہ کچھ الزام نہیں ہے
عشق ہے ایسا عالم جس میں　　صبح نہیں ہے شام نہیں ہے
دل ہی تک محدود نہیں غم　　بادہ اسیرِ جام نہیں ہے
حُسن کے جلوے مانگنے والو　　عشق کی دولت عام نہیں ہے
ہم کو نہ اپنا کہہ کے پُکارو　　یہ تو ہمارا نام نہیں ہے

اتنا بھی کیا شعریؔ سے تکلف
ایسا تو وہ بدنام نہیں ہے

(شمارہ ۱۳۱، سنہ ۱۹۶۲ء)

احسن علی خاں

نہ کہکشاں نہ صراط الحذر کی بات کرو　　قدم اٹھاؤ نئی رہگذر کی بات کرو
ابھی ہے طرحِ نشیمن خیال کی حد تک　　ابھی نہ غارتِ برق و شرر کی بات کرو
حدیثِ جورِ قفس ذکرِ بے بسی تا کے　　چمن کی بات کرو، بال و پر کی بات کرو
شکایت ہائے جہانِ سراب سے گزرو　　لطافت ہائے فریبِ نظر کی بات کرو
یہی مجاز و حقیقت، یہی جمال و جلال　　زبانِ شعر میں اب حُسنِ زر کی بات کرو
کبھی تو رہبریٔ راہزن کو بھی سمجھو　　کبھی تو رہزنیٔ راہبر کی بات کرو

چراغِ راہ کے سائے میں رینگنے والو　　سحر سے پہلے شعورِ سحر کی بات کرو
لبوں پہ چاہیے اک مہرِ مصلحت احسنؔ
وہ بدگماں ہوں تو کیا خیر و شر کی بات کرو۔

(شمارہ ۸۴، سنہ ۱۹۵۸ء)

حسن طاہر

ہم دار پہ ہوں یا زنداں میں یہ دل کی لگن کیا کم ہوگی
جو خونِ جگر سے جلتی ہے وہ شمع تو کیا مدھم ہوگی

محبوبۂ گیتی ایک ذرا رندوں کی نظر تو ہونے دے
مشاطۂ مستقبل کی قسم یہ زلف نہ یوں برہم ہوگی

گردش میں رہیں گے جام و سبو مے خوار سلامت ہیں جب تک
ناصح ترے برہم ہونے سے یہ بزم کہیں برہم ہوگی

اک شعلہ بجھ بھی گیا تو کیا مشعل سے مشعل جلتی ہے
جنگل کا جنگل روشن ہے یہ آگ بھلا کیا کم ہوگی

بڑھتے ہی چلو اے ہم سفرو منزل کے نشاں تو ملتے ہیں
کچھ راہ بھی کٹتی جائے گی کچھ شب کی سیاہی کم ہوگی

(کل پاکستان انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کانفرنس میں پڑھی گئی)

(شمارہ ۱۴، سنہ ۱۹۵۲ء)

خلیل الرحمٰن اعظمی

زندگی ہجر سہی، ہجرِ مسلسل ہی سہی　　زندگی آج کوئی موت کا عنواں تو نہیں
ایک بار اور بھی دنیا یہ سنور سکتی ہے　　نکہتِ گل تو نہیں، زلفِ پریشاں تو نہیں

غم کی تقدیر بھی ہم آج بدل سکتے ہیں
غمِ دوراں ہی سہی عمرِ گریزاں تو نہیں

کیسا یہ شور ہے زنجیر کہیں ٹوٹی ہے
دیکھنا ہم سفرو، فصلِ بہاراں تو نہیں

مٹ نہیں سکتا مٹانے سے مرا عزمِ جنوں
پسِ دیوار کوئی سایۂ لرزاں تو نہیں

آپ بھی چاہیں تو یہ آگ نہیں بجھ سکتی
شعلۂ دل ہے کوئی شعلۂ عریاں تو نہیں

ایک ہی جست کی بس دیر ہے اے دیوانو!
یہ کوئی کوہِ ہمالہ درِ زنداں تو نہیں

رقص کرتے ہیں مشینوں کے دھڑکتے ہوئے دل
آج اک شاعرِ جمہور غزل خواں تو نہیں

(شمارہ ۹، سنہ ۱۹۵۱ء)

حبیب جالب

نظر نظر میں لئے تیرا پیار پھرتے ہیں
مثالِ موجۂ ابرِ بہار پھرتے ہیں

ترے دیار سے ذرّوں نے روشنی پائی
ترے دیار میں ہم سوگوار پھرتے ہیں

یہ حادثہ بھی عجیب ہے کہ تیرے دیوانے
لگائے دل سے غمِ روزگار پھرتے ہیں

لئے ہوئے ہیں دو عالم کا درد سینوں میں
تری گلی میں جو دیوانہ وار پھرتے ہیں

کسے خبر کہ تری کائنات کے ذرّے
ترے جنوں میں ستاروں کے پار پھرتے ہیں

بہار آ کے چلی بھی گئی مگر جالب
نظر کے سامنے وہ لالہ زار پھرتے ہیں

(شمارہ ۱۴، سنہ ۱۹۵۲ء)

زھرہ نگاہ

وہ سامنے ہی تو ہے منزلِ امید مگر
بھٹک گئے ہیں اندھیروں میں آج اہلِ نظر

بڑی عجیب ہے اس زندگی کی راہگذر
نہ ابتدائے سفر ہے نہ انتہائے سفر

نقابِ چہرۂ شب اٹھ چکا مگر پھر بھی
اُداس اُداس اُجالے بجھی بجھی سی سحر

نشانِ جادۂ منزل مجھے ملا بھی تو کیا
بھٹک رہے ہیں ابھی تک مرے شریکِ سفر

بدلتے وقت کے طوفان! رہزنوں کو نہ چھیڑ　　ستا رہے ہیں خدائی کو نت نئے رہبر
ترے خیال، تری جستجو، تری خواہش　　تفکراتِ زمانہ میں چھپ گئے یکسر

یہ کائناتِ کہن اور وہ بھی اتنی جمیل
ہے تیری شانِ خدائی کہ میرا حسنِ نظر

(شمارہ ۱۴، سنہ ۱۹۵۲ء)

قابل اجمیری

ہستی کو اپنی شعلہ بداماں کریں گے ہم
زنداں میں بھی گئے تو چراغاں کریں گے ہم

دستِ جنوں کو سلسلہ جنباں کریں گے ہم
سارے جہاں کو اپنا گریباں کریں گے ہم

اب دیکھتے ہیں کون اُڑاتا ہے رنگ و بُو
اپنا لہو شریکِ بہاراں کریں گے ہم

کچھ اور اپنی شانِ تغافل بڑھائیے
ہر دل میں اپنا درد خراماں کریں گے ہم

اچھا ہوا کہ مہر بہ لب کر دیا ہمیں
اک محشرِ خموشی کا ساماں کریں گے ہم

برہم ہوں بجلیاں کہ ہوائیں خلاف ہوں
کچھ بھی ہو اہتمامِ گلستاں کریں گے ہم

دامن کی کیا بساط، گریباں ہے چیز کیا
نذرِ بہار نقدِ دل و جاں کریں گے ہم

ظلمت ہے بیکراں تو اُجالے بھی کم نہیں
ہر داغِ دل کو آج فروزاں کریں گے ہم

جن کو فریبِ شوق میں آنا تھا آ چکے
اب تو ترے کرم کو پشیماں کریں گے ہم

کس شوق سے چلے ہیں مسیحا کو ڈھونڈنے
گویا ضرور کاوشِ درماں کریں گے ہم

سودائے زلفِ دوست اکارت نہ جائے گا
ہر عالمِ کہن کو پریشاں کریں گے ہم

صد شکر رسمِ دار و رسن زندہ ہے ابھی
قائل نشاطِ روح کا ساماں کریں گے ہم

(شمارہ ۳۹، سنہ ۱۹۵۴ء)

شفا گوالیاری

بغاوت کی دلِ گلشن سے جب پھوٹیں گی تنویریں
گلوں کی پتیاں بھی ڈھل کے بن جائیں گی شمشیریں

مکمل سختیٔ تنقید سے ہوتی ہیں تعمیریں
شعاعیں مہر کی ورنہ کلی کا کیوں جگر چیریں

بغیرِ سعیٔ پیہم ہر تمنا خود فریبی ہے
کہ تقدیروں کے آئینے ہوا کرتی ہیں تدبیریں

خلوصِ زندگی، سوزِ مسلسل، جذبۂ صادق
یہی دیوانگانِ شوق کی ہوتی ہیں جاگیریں

کسی صورت بھی تسکینِ نگاہ و دل نہیں ہوتی
نہ جانے کس طرح کھینچی ہیں آزادی کی تصویریں

رہا ہونے پہ بھی کچھ اس طرح محسوس ہوتا ہے
کہ ہر موجِ نظر میں جیسے لہراتی ہوں زنجیریں

جہاں میں آنے والا انقلاب آکر ہی رہتا ہے
نہ کام آتی ہیں تقریریں، نہ راس آتی ہیں تحریریں

وہ مہر و مہ سے کب ممکن جو کر دیتا ہے اک غنچہ
دلِ انساں کی تشریحیں، غمِ دوراں کی تفسیریں

ابھر کر ہی رہے گی صبحِ منزل نقش نو لے کر
یقیناً مسکرائیں گی شفا خوابوں کی تعبیریں

(شمارہ ۵۴، سنہ ۱۹۵۶ء)

باقر مہدی

دُعا نے لے اثر ہے اور میں ہوں　　یہ رونا عمر بھر ہے اور میں ہوں
محبت اور خودی میں کشمکش ہے　　تری بدلی نظر ہے اور میں ہوں
تغافل اک جفائے مستقل ہے　　وہ حسن بے خبر ہے اور میں ہوں
حرم اور دیر سے آگے نکل کر　　بھٹکتی سی نظر ہے اور میں ہوں
ابھی رنگِ زمانہ دیکھتا ہوں　　خیالِ چارہ گر ہے اور میں ہوں
غلامی، اور انساں کی غلامی　　یہ توہینِ بشر ہے اور میں ہوں

مٹے گی تیرگی نظمِ کہن کی
ابھی فکرِ سحر ہے اور میں ہوں

(مئی سنہ ۱۹۴۸ء)

محمد علوی

دم بہ دم بڑھتے چلیں ہم سرکشی کرتے چلیں
موت کو بھی آشکار زندگی کرتے چلیں

ارتقائی منزلیں ہوں، اجتماعی قافلے
نقشِ پا مانندِ شمع روشنی کرتے چلیں

زیرِ لب وہ بڑبڑائیں گوش بر آواز ہم
ہم گلا پھاڑیں، سُنی وہ اَن سُنی کرتے چلیں

دیکھیے کب ہو نگاہِ التفات اپنی طرف
آج اُن کے سامنے اُن کی کہی کرتے چلیں

کاروانِ بے خبر، معلوم رازِ راہبر
رہنما کہلائیں لیکن رہزنی کرتے چلیں

آپ اپنی سدھ نہ لیں آہیں بھریں آنسو بہائیں
کارِ علوی پر مگر طعنہ زنی کرتے چلیں

(شمارہ ۷، سنہ ۱۹۴۹ء)

عرشی بھوپالی

اُفق کے خونیں دھندلکوں کا صبح نام نہیں
قدم بڑھا کہ یہ ساقی ترا مقام نہیں

ابھی نہ دے مجھے اذنِ بہار اے ساقی
ابھی حیات ستاروں سے ہم کلام نہیں

ملا ہے اب کہیں صدیوں کے بعد مستوں کو
وہ مے کدہ کہ جہاں کوئی تشنہ کام نہیں

نہ عارضوں پہ شفق ہے نہ گیسوؤں میں شکن
یہ صبح و شام نہیں میرے صبح و شام نہیں

بہارِ دیر و حرم لے کے کیا کروں ناصح
یہ قافلے تو ابھی تک سحر مقام نہیں

قدم قدم پہ ہے درکار جہد فکر و عمل
یہ زندگی ہے صدائے شکستِ جام نہیں

ابھی تو دامنِ شب میں سسک رہی ہے سحر
بڑھے چلو کہ ابھی ساعتِ قیام نہیں!

(شمارہ ۳-۱، سنہ ۱۹۴۹ء)

اسد بھوپالی

میسّر دولتِ احساس تو ہے
مجھے اُن کی محبت راس تو ہے

کسی کا غم بھی ہوا اپنا ہی غم ہے
طبیعت فطرتاً حساس تو ہے

مجھے منظور آلام و حوادث　　تیرے ملنے کی دل کو آس تو ہے
وہ دُوری ہو کہ قربت مطمئن ہوں　　کوئی ہر وقت میرے پاس تو ہے
تضادِ ظاہر و باطن سے کیا ہے　　اُنہیں اپنے کہے کا پاس تو ہے
بس اے محوِ شکایاتِ تغافل　　محبّت کا انہیں احساس تو ہے
نہیں کچھ برہمی سے اُن کا جانا　　مگر تو ہینِ چشم یاس تو ہے
اسد کی شاعری کچھ بھی ہو لیکن
دلِ مغموم کی عکّاس تو ہے

(شمارہ فروری، سنہ ۱۹۴۸ء)

مُحمّد علی تاج

اُٹھ رہی ہیں دیواریں، ڈھل رہی ہیں زنجیریں
میرے خوابِ زرّیں کی مل رہی ہیں تعبیریں

مہر و ماہ و انجُم کے باوجود اندھیرا ہے
جانے کس نے دنیا سے چھین لی ہیں تنویریں

جُز سیاہ داغوں کے کچھ نہیں جبینوں پر
گھس رہے ہیں صدیوں سے پتھروں پہ تقدیریں

شغلِ بادہ و ساغر، تیری انجمن تک تھا
آج رزمِ ہستی میں کھنچ گئی ہیں شمشیریں

اے عظیم فن کارو! زندگی کے معمارو!!
مُنہ نئے مصوّر کا تک رہی ہیں تصویریں

(شمارہ ۳، سنہ ۱۹۵۱ء)

سعادت حسن منٹو

چچا سام کے نام

(پانچواں خط)

محترمی۔ چچا جان!

تسلیمات۔ میں اب تک آپ کو "پیارے چچا جان" سے خطاب کرتا رہا ہوں۔ پر اب کی دفعہ میں نے "محترمی چچا جان" لکھا ہے۔ اس لئے کہ میں ناراض ہوں۔ ناراضی کا باعث یہ ہے کہ آپ نے مجھے میرا تحفہ (ایٹم بم) ابھی تک نہیں بھیجا۔ بتائیے یہ بھی کوئی بات ہے۔

سنا تھا کہ باپ سے زیادہ چچا بچوں کو پیار کرتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے امریکہ میں ایسا نہیں ہوتا ——— مگر وہاں بہت سی ایسی باتیں نہیں ہوتیں، جو یہاں ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں آئے دن وزارتیں بدلتی ہیں۔ آپ کے یہاں ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہوتا۔ یہاں نبی پیدا ہوتے ہیں، وہاں نہیں ہوتے۔ یہاں ان کے ماننے والے وزیر خارجہ بنتے ہیں۔ اس بر ملک میں ہنگامے برپا ہوتے ہیں مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ ان ہنگاموں پر تحقیقاتی کمیشن بیٹھتی ہے اس کے اوپر کوئی اور بیٹھ جاتا ہے۔ وہاں اس قسم کی کوئی دلچسپ بات نہیں ہوتی۔

چچا جان، میں آپ سے پوچھتا ہوں آپ اپنے یہاں نبی کیوں پیدا نہیں ہونے دیتے۔ خدا کی قسم ایک پیدا کر لیجئے۔ بڑی تفریح رہے گی۔ بڑھاپے میں وہ آپ کی لاٹھی کا کام دے گا۔ اس لاٹھی سے آپ امریکہ کی ساری بھینسیں ہانک سکیں گے (بھینسیں تو یقیناً آپ کے یہاں ضرور ہوں گی)

اگر آپ نبی پیدا کرنے سے کسی وجہ سے معذور ہوں تو مجھے حکم دیجئے میں مرزا بشیر الدین محمود صاحب سے گذارش کروں گا۔ وہ اپنا صاحبزادہ بھیج دیں گے۔ جلدی کیجئے گا۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کے دشمن روس سے مانگ آجائے اور آپ منہ دیکھتے رہ جائیں۔

بات ایٹم بم کی تھی، جو میں نے آپ سے تحفے کے طور پر مانگا تھا اور میں نبی زادوں کی طرف چلا گیا ——— ہاں ——— کتنی معمولی بات تھی۔ میں نے صرف ایک چھوٹا سا بہت ہی چھوٹا ایٹم بم مانگا تھا۔ جس سے میں ایک ایسے آدمی کو اڑا سکتا، جو مجھے اپنی گھیر دار شلوار کے نیفے کے اندر ہاتھ ڈال کر ڈھیلا لگاتا نظر آتا ——— لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے میری خواہش کی شدت کو محسوس نہیں کیا۔ یا شاید آپ ہائیڈروجن بموں کے تجربات میں مشغول تھے۔

چچا جان، یہ ہائیڈروجن بم کیا بلا ہے۔ آٹھویں جماعت میں ہم نے پڑھا تھا کہ ہائیڈروجن ایک گیس ہوتی ہے ہوا سے ہلکی۔ آپ اس کرۂ ارض کے سینے سے کس ملک کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے ہیں؟ روس کا؟

مگر سنا ہے وہ کم بخت نائٹروجن بم بنا رہا ہے۔ آٹھویں جماعت ہی میں ہم نے پڑھا تھا کہ نائٹروجن ایک گیس ہوتی ہے جس میں آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس کے جواب میں آکسیجن بم بنا دیں۔ آٹھویں جماعت میں ہم نے پڑھا تھا کہ نائٹروجن اور آکسیجن گیسیں جب آپس میں ملتی ہیں تو پانی بن جاتا ہے۔ کیا ہی مزا آئے گا۔ ادھر آپ آکسیجن بم پھینکیں گے، ادھر روس نائٹروجن بم ——— باقی دنیا پانی میں ڈبکیاں لگائے گی

خیر یہ تو مذاق کی بات تھی۔ سنا ہے آپ نے ہائیڈروجن بم صرف اس لئے بنایا ہے کہ دنیا میں مکمل امن و امان قائم ہو جائے۔ یوں تو اللہ کی اللہ ہی بہتر جانتا ہے، لیکن مجھے آپ کی بات کا یقین ہے۔ ایک اس لئے کہ میں نے آپ کا گندم کھایا ہے، اور پھر میں آپ کا بھتیجا ہوں۔ بزرگوں کی بات یوں بھی چھوٹوں کو ماننا چاہیے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اگر آپ نے دنیا میں امن و امان قائم کر دیا، تو دنیا کتنی چھوٹی ہو جائے گی۔ میرا مطلب ہے کتنے ملک صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہوں گے ——— میری بھتیجی جو اسکول میں پڑھتی ہے، کل مجھ سے دنیا کا نقشہ بنانے کو کہہ رہی تھی، میں نے اس سے کہا، ابھی نہیں، پہلے مجھے چچا جان سے بات کر لینے دو۔ ان سے پوچھ لوں۔ کون سا ملک رہے گا، کون سا نہیں رہے گا، پھر بنا دوں گا۔

خدا کے لئے روس کو سب سے پہلے اڑائیے گا۔ اس سے مجھے خدا واسطے کا بیر ہے۔ سات آٹھ دن ہوئے، وہاں سے فن کاروں کا ایک وفد آیا تھا، خیر سگالی کرنے، میرا خیال ہے اب واپس چلا گیا ہے۔ اس وفد میں ناچنے اور گانے والیاں تھیں، جنھوں نے ناچ گا کر ہمارے سادہ لوح پاکستانیوں کا دل موہ لیا۔ اب آپ اس کے توڑ میں جب تک وہاں سے کوئی ایسا گاتا، بجاتا، ناچتا، تھرکتا خیر سگالی وفد نہیں بھیجیں گے کام نہیں چلے گا۔

میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ ہالی وڈ کی چند "ملین ڈالر" ٹانگوں والی لڑکیاں یہاں روانہ کر دیجیے۔ مگر آپ نے اپنے کم عقل بھتیجے کی اس بات پر کوئی غور نہیں کیا اور ہائیڈروجن بم کے تجربوں میں مصروف رہے۔ قبلہ جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے۔

ذرا اپنے سفارت خانہ متعینہ پاکستان سے پوچھیے۔ یہاں ہر ایک کی زبان پر تمارا خانم اور مادام عاشورہ کا نام ہے۔ یہاں کا ایک بہت بڑا اردو اخبار "زمیندار" ہے اس کے ایڈیٹر بڑے زاہد خشک قسم کے نوجوان ہیں۔ ان پر اس روسی وفد نے اتنا اثر کیا کہ نثر میں شاعری کرنے لگے۔ ایک پیرا ملاحظہ فرمایئے۔

"جب وہ گا رہی تھی تو کھچا کھچ بھرے ہوئے اوپن تھیٹر (شاید آپ کے یہاں ایسا تھیٹر نہ ہو) میں سامعین کے سانس لینے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ تھیٹر پر جھکا ہوا تاروں بھرا آسمان اور اسٹیج کے چاروں طرف ابھرے ہوئے سرسبز درخت بھی دم بخود تھے اور اس گھمبیر سناٹے میں ایک کوئل کوک رہی تھی۔ اس کی تیز، گہری اور روح کو چیر دینے والی آواز، تاریک رات کے سینے میں جا بجا ان دیکھی روشنی کے گہرے گھاؤ ڈال رہی تھی۔"

پڑھ لیا آپ نے؟ ——— چچا جان یہ معاملہ بہت سنگین ہے۔ ہائیڈروجن بموں کو فی الحال چھوڑیئے اور اس طرف توجہ دیجیے۔ آپ کے پاس کیا حسیناؤں کی کمی ہے۔ چشم بد دور ایک سے ایک پٹاخا سی موجود ہے۔ لیکن میں آپ کو ایک مشورہ دوں، جتنی بھیجیے گا، سب کی ٹانگیں "ملین ڈالر" قسم کی ہوں اور ہمارے پاکستانی مردوں کو بوسہ دینے سے نہ گھبرائیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر آپ نے ایک جہاز بھر کر لی نوس تو تھ پیسٹ بھیج دی تو میں سب کے دانت صاف کرا دوں گا۔ ان کے منہ سے بو نہیں آئے گی۔

آپ میری بات مان گئے، تو آپ کی سات آزادیوں کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ روس والوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے اور تمارا خانم اور مادام عاشورہ تاپتی رہ جائیں گی اور "زمیندار" کے ایڈیٹر کو دن میں تارے نظر آنے لگیں گے۔ لیکن چچا جان، ایک بات سن لیجیے۔ اگر آپ نے ازبتھ ٹیلر کو بھیجا تو اس کے بوسے صرف میرے لئے وقف ہوں گے۔ مجھے اس کے ہونٹ بہت پسند ہیں۔

ہاں، خیرسگالی وفد میں کہیں اس حبشی گوئیے پال روبسن کو نہ شامل کیجیے گا۔ سالا رسالے کا مطلب ہے بیوی کا بھائی۔ ہم اسے گالی کے طور پر استعمال کرتے ہیں، کمیونسٹ ہے۔ مجھے حیرت ہے آپ نے اسے ابھی تک ایسٹ افریقہ کیوں نہیں بھیجا۔ وہاں اسے بڑی آسانی سے ماؤ ماؤ کی تحریک میں ماخوذ کر کے گولی سے اڑایا جا سکتا ہے۔

میں اس خیرسگالی وفد کا بے چینی سے انتظار کروں گا اور "نوائے وقت" کے مدیر سے کہوں گا کہ وہ ابھی سے اس کا پروپیگنڈہ شروع کر دے۔ بڑا نیک اور برخوردار قسم کا آدمی ہے۔ میری بات نہیں ٹالے گا۔ ویسے آپ اسے تحفے کے طور پر ریتا ہیورتھ کی او ٹو گراف تصویر بھجوا دیجیے گا بے چارہ اسی میں خوش ہو جائے گا۔

میں یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ جب آپ کا یہ خیرسگالی وفد لاہور میں آئے گا تو میں اسے ہیرا منڈی کی سیر کراؤں گا۔ شورش کاشمیری صاحب کو میں ساتھ لے چلوں گا کہ وہ اس علاقے کے پیر و ہیں (حال ہی میں آپ نے اس پر ایک کتاب بھی لکھی ہے جس کا عنوان "اس بازار میں" ہے ــــ آپ اپنے سفارت خانے کو حکم دیجیے۔ وہ آپ کو اس کا ترجمہ کرا کے بھیج دے گا) یہاں ایک سے ایک درخشندہ و تابندہ ہیرا پڑا ہے۔ ہر تراش کا، ہر وزن کا۔

اب اور باتیں شروع کرتا ہوں ــــ پاکستان کو آپ کی فوجی امداد دینے کے فیصلے اور مشرق بعید کے دیگر مسائل پر بھارت اور آپ کے اختلافات پر پنڈت نہرو نے پچھلے دنوں جو زبردست نکتہ چینی کی تھی، سنا ہے، اس کا یہ ردعمل ہوا ہے کہ آپ کے ملک کی حکمت عملی میں ایک نیا رجحان ترقی کر رہا ہے۔ بعض کی یہ بھی رائے ہے کہ امریکہ بھارت کو اپنے عزائم کے متعلق اطمینان دلانے کی ضرورت سے زیادہ کوشش کر رہا ہے۔

آپ کے جنوبی ایشیائی اور افریقی معاملات کے اعلیٰ افسر، کیا نام ہے ان کا؟ ــــ ہاں ــــ مسٹر جان جرنیگنز نے اپنے ایک بیان میں بھارت کے لئے اپنے ملک کے خیرسگالی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ اس کا تو یہ مطلب نکلتا ہے کہ واشنگٹن، دلی کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے تڑپ رہا ہے۔

جہاں تک میں سمجھا ہوں پاکستان اور بھارت کو خوش رکھنے سے آپ کا واحد مقصد یہی ہے کہ جہاں کہیں بھی آزادی اور جمہوریت کا ٹمٹماتا دیا جل رہا ہے۔ اُسے پھونک سے نہ بجھایا جائے بلکہ اس کو تیل دیا جائے ــــ بلکہ تیل میں ڈبو دیا جائے تاکہ وہ پھر کبھی اپنی تشنہ لبی کا شکوہ نہ کرے ــــ ہے نا چچا جان؟

آپ پاکستان کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ آپ کو درۂ خیبر بے حد پیارا ہے۔ جہاں سے حملہ آور صدیوں سے ہم پر حملے کرتے رہے ہیں۔ اصل میں درۂ خیبر ہے بھی بہت خوبصورت چیز۔ اس سے پیاری اور خوبصورت چیز پاکستان کے پاس اور ہے بھی کیا؟

اور بھارت کو آپ اس لئے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں کہ پولینڈ، چیکوسلوواکیہ اور کوریا میں روس کی جارحانہ کارروائیاں دیکھ کر آپ کو ہر دم اس بات کا کھٹکا رہتا ہے کہ یہ سرخ مملکت کہیں بھارت میں بھی درانتیاں اور ہتھوڑے چلانا شروع نہ کر دے۔

ظاہر ہے کہ بھارت کی آزادی خدانخواستہ خدانخواستہ چھن گئی تو کتنا بڑا المیہ ہو گا ــــ اس کا تصور کرتے ہی آپ کانپ کانپ اٹھتے ہوں گے۔

آپ کی تاروں والی اونچی ٹوپی کی قسم آپ ایسا مخلص انسان کبھی پیدا ہوا ہے اور نہ ہو گا ــــ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور آپ کی ساتھ آزادیوں کو دن دونی رات چوگنی ترقی دے۔

یہاں ایک علاقہ ہے مغربی پنجاب۔ اس کے وزیراعلیٰ ہیں فیروز خاں نون (ان کی بیگم ایک انگریز خاتون ہیں) آپ نے ان کا نام تو

مگر سنا ہے وہ کم بخت نائٹروجن بم بنا لیا ہے۔ آٹھویں جماعت ہی میں ہم نے پڑھا تھا کہ نائٹروجن ایک گیس ہوتی ہے جس میں آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس کے جواب میں آکسیجن بم بنا دیں۔ آٹھویں جماعت میں ہم نے پڑھا تھا کہ نائٹروجن اور آکسیجن گیسیں جب آپس میں ملتی ہیں تو پانی بن جاتا ہے۔ کیا ہی مزا آئے گا۔ ادھر آپ آکسیجن بم پھینکیں گے، ادھر روس نائٹروجن بم ——— باقی دنیا پانی میں ڈبکیاں لگائے گی۔

خیر یہ تو مذاق کی بات تھی۔ سنا ہے آپ نے ہائیڈروجن بم صرف اس لئے بنایا ہے کہ دنیا میں مکمل امن و امان قائم ہو جائے۔ یوں تو اللہ کی اللہ ہی بہتر جانتا ہے، لیکن مجھے آپ کی بات کا یقین ہے۔ ایک اس لئے کہ میں نے آپ کا گندم کھایا ہے، اور پھر میں آپ کا بھتیجا ہوں۔ بزرگوں کی بات یوں بھی چھوٹوں کو ماننا چاہئیے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اگر آپ نے دنیا میں امن و امان قائم کر دیا، تو دنیا کتنی چھوٹی ہو جائے گی۔ میرا مطلب ہے کتنے ملک صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہوں گے ——— میری بھتیجی جو اسکول میں پڑھتی ہے، کل مجھ سے دنیا کا نقشہ بنانے کو کہہ رہی تھی، میں نے اس سے کہا، ابھی نہیں، پہلے مجھے چچا جان سے بات کر لینے دو۔ ان سے پوچھ لوں۔ کون سا ملک رہے گا، کون سا نہیں رہے گا، پھر بنا دوں گا۔

خدا کے لئے روس کو سب سے پہلے اڑائیے گا۔ اس سے مجھے خدا واسطے کا بیر ہے۔ سات آٹھ دن ہوئے، وہاں سے فن کاروں کا ایک وفد آیا تھا، خیر سگالی کرنے، میرا خیال ہے اب واپس چلا گیا ہے۔ اس وفد میں ناچنے اور گانے والیاں تھیں، جنھوں نے ناچ گا کر ہمارے سادہ لوح پاکستانیوں کا دل موہ لیا۔ اب آپ اس کے توڑ میں جب تک وہاں سے کوئی ایسا گاتا، بجاتا، ناچتا، تھرکتا خیر سگالی وفد نہیں بھیجیں گے کام نہیں چلے گا۔

میں تو آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ ہالی وڈ کی چند "ملین ڈالر" ٹانگوں والی لڑکیاں یہاں روانہ کر دیجئے۔ مگر آپ نے اپنے کم عقل بھتیجے کی اس بات پر کوئی غور نہیں کیا اور ہائیڈروجن بم کے تجربوں میں مصروف رہے۔ قبلہ جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے۔

ذرا اپنے سفارت خانہ متعینہ پاکستان سے پوچھئے۔ یہاں ہر ایک کی زبان پر تمارا خانم اور مادام عاشورہ کا نام ہے۔ یہاں کا ایک بہت بڑا اردو اخبار "زمیندار" ہے اس کے ایڈیٹر بڑے زاہد خشک قسم کے نوجوان ہیں۔ ان پر اس روسی وفد نے اتنا اثر کیا کہ نثر میں شاعری کرنے لگے۔ ایک پیرا ملاحظہ فرمائیے۔

> "جب وہ گا رہی تھی تو کھچا کھچ بھرے ہوئے اوپن تھیٹر (شاید آپ کے یہاں ایسا تھیٹر نہ ہو) میں سامعین کے سانس لینے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ تھیٹر پر جھکا ہوا تاروں بھرا آسمان اور اسٹیج کے چاروں طرف ابھرے ہوئے سرسبز درخت بھی دم بخود تھے اور اس گھمبیر سناٹے میں ایک کوئل کوک رہی تھی۔ اس کی تیز، گہری اور روح کو چیر دینے والی آواز، تاریک رات کے سینے میں جا بجا ان دیکھی روشنی کے گہرے گھاؤ ڈال رہی تھی۔"

پڑھ لیا آپ نے؟ ——— چچا جان یہ معاملہ بہت سنگین ہے۔ ہائیڈروجن بموں کو فی الحال چھوڑیئے اور اس طرف توجہ دیجئے۔ آپ کے پاس کیا حسیناؤں کی کمی ہے۔ چشم بد دور ایک سے ایک پٹاخا سی موجود ہے۔ لیکن میں آپ کو ایک مشورہ دوں، جتنی بھیجئے گا، سب کی ٹانگیں "ملین ڈالر" قسم کی ہوں اور ہمارے پاکستانی مردوں کو بوسہ دینے سے نہ گھبرائیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر آپ نے ایک بہانہ بھر کوئی نوس تو تھ پیسٹ بھیج دی تو میں سب کے دانت صاف کرا دوں گا۔ ان کے منہ سے بو نہیں آئے گی۔

آپ میری بات مان گئے، تو آپ کی ساتوں آزادیوں کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ روس والوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے اور تمارا خانم اور مادام عاشورہ تاہی رہ جائیں گی اور "زمیندار" کے ایڈیٹر کو دن میں تارے نظر آنے لگیں گے۔ لیکن چچا جان، ایک بات سن لیجئے۔ اگر آپ نے ازبتھ ٹیلر کو بھیجا تو اس کے بوسے صرف میرے لئے وقف ہوں گے۔ مجھے اس کے ہونٹ بہت پسند ہیں۔

ہاں، خیر سگالی وفد میں کہیں اس حبشی گویّے پال روبسن کو نہ شامل کیجئے گا۔ سالا رسالے کا مطلب ہے ہوی کا بھائی۔ ہم اسے گالی کے طور پر استعمال کرتے ہیں، کمیونسٹ ہے۔ مجھے حیرت ہے آپ نے اسے ابھی تک ایسٹ افریقہ کیوں نہیں بھیجا۔ وہاں اسے بڑی آسانی سے ماؤ، ماؤ کی تحریک میں ماخوذ کرکے گولی سے اڑایا جاسکتا ہے۔

میں اس خیر سگالی وفد کا بے چینی سے انتظار کروں گا اور "نوائے وقت" کے مدیر سے کہوں گا کہ وہ ابھی سے اس کا پروپیگنڈہ شروع کردے۔ بڑا نیک اور برخوردار قسم کا آدمی ہے۔ میری بات نہیں ٹالے گا۔ ویسے آپ اسے تحفے کے طور پر رینا ہیورتھ کی اوٹوگرافڈ تصویر بھجوا دیجئے گا بے چارہ اسی میں خوش ہوجائے گا۔

میں یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ جب آپ کا یہ خیر سگالی وفد لاہور میں آئے گا تو میں اسے ہیرا منڈی کی سیر کراؤں گا۔ شورش کاشمیری صاحب کو میں ساتھ لے چلوں گا کہ وہ اس علاقے کے پیر ہیں (حال ہی میں آپ نے اس پر ایک کتاب بھی لکھی ہے جس کا عنوان "اس بازار میں" ہے ـــــ آپ اپنے سفارت خانے کو حکم دیجئے۔ وہ آپ کو اس کا ترجمہ کراکے بھیج دے گا) یہاں ایک سے ایک درخشندہ و تابندہ ہیرا پڑا ہے۔ ہر تراش کا، ہر وزن کا۔

اب اور باتیں شروع کرتا ہوں ـــــ پاکستان کو آپ کی فوجی امداد دینے کے فیصلے اور مشرقِ بعید کے دیگر مسائل پر بھارت اور آپ کے اختلافات پر پنڈت نہرو نے پچھلے دنوں جو زبردست نکتہ چینی کی تھی، سُنا ہے، اس کا یہ ردّعمل ہوا ہے کہ آپ کے ملک کی حکمت عملی میں ایک نیا رجحان ترقی کر رہا ہے۔ بعض کی یہ بھی رائے ہے کہ امریکہ بھارت کو اپنے عزائم کے متعلق اطمینان دلانے کی ضرورت سے زیادہ کوشش کر رہا ہے۔

آپ کے جنوبی ایشیائی اور افریقی معاملات کے اعلیٰ افسر، کیا نام ہے ان کا؟ ـــــ ہاں ـــــ مسٹر جان جرنیگنر نے اپنے ایک بیان میں بھارت کے لئے اپنے ملک کے خیر سگالی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ اس کا تو یہ مطلب نکلتا ہے کہ واشنگٹن، دلّی کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے تڑپ رہا ہے۔

جہاں تک میں سمجھا ہوں پاکستان اور بھارت کو خوش رکھنے سے آپ کا واحد مقصد یہی ہے کہ جہاں کہیں بھی آزادی اور جمہوریت کا ٹمٹماتا دیا جل رہا ہے۔ اُسے پھونک سے نہ بجھایا جائے بلکہ اس کو تیل دیا جائے ـــــ بلکہ تیل میں ڈبو دیا جائے تاکہ وہ پھر کبھی اپنی تشنہ لبی کا شکوہ نہ کرے ـــــ ہے نا چچا جان؟

آپ پاکستان کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ آپ کو درّۂ خیبر بے حد پیارا ہے۔ جہاں سے حملہ آور صدیوں سے ہم پر حملے کرتے رہے ہیں۔ اصل میں درّۂ خیبر ہے بھی بہت خوبصورت چیز۔ اس سے پیاری اور خوبصورت چیز پاکستان کے پاس اور ہے بھی کیا؟

اور بھارت کو آپ اس لئے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں کہ پولینڈ، چیکوسلوواکیہ اور کوریا میں روس کی جارحانہ کارروائیاں دیکھ کر آپ کو ہر دم اس بات کا کھٹکا رہتا ہے کہ یہ سرخ مملکت کہیں بھارت میں بھی درانتیاں اور ہتھوڑے چلانا شروع نہ کردے۔

ظاہر ہے کہ بھارت کی آزادی خدانخواستہ خدانخواستہ چھن گئی تو کتنا بڑا المیہ ہوگا ـــــ اس کا تصور کرتے ہی آپ کانپ اٹھتے ہوں گے۔

آپ کی تاروں والی اونچی ٹوپی کی قسم آپ ایسا مخلص انسان کبھی پیدا ہوا ہے اور نہ ہوگا ـــــ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور آپ کی ساتوں آزادیوں کو دن دونی رات چوگنی ترقی دے۔

یہاں ایک علاقہ ہے مغربی پنجاب۔ اس کے وزیر اعلیٰ ہیں فیروز خاں نون (ان کی بیگم ایک انگریز خاتون ہیں) آپ نے ان کا نام تو

سنا ہوگا۔ حال ہی میں آپ نے اپنے دو لنگڑے پر، جو پنچولی فلم اسٹوڈیو کے آگے ہے، ایک کانفرنس بلائی۔ اس میں آپ نے مسلم لیگ (جسے مشرقی پاکستان میں شکست فاش ہوئی ہے) کے کارکنوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں اشتراکیوں (سرخوں) کے مقابلے کے لئے جدوجہد کریں۔

دیکھئے چچا جان آپ فوراً فیروز خاں نون صاحب کا شکریہ ادا کیجئے اور خیر سگالی کے طور پر ان کی بیگم صاحبہ کے لئے ہالی وڈ کے سلے ہوئے دو تین ہزار فراک بھیج دیجئے ــــــ کہیں آپ نے بھیج تو نہیں دیئے ــــــ میں بھول گیا تھا کیونکہ وہ اب ساڑی پہنتی ہیں۔

بہرحال نون صاحب کا اشتراکیت دشمن ہونا بڑی نیک فال ہے کیونکہ کامریڈ فیروز نالدین منصور پھر جیل میں ہوگا ــــــ مجھے اس کا ہر وقت دمے کے مرض میں گرفتار رہنا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔

اب میں آپ کو ایک بڑا اچھا مشورہ دیتا ہوں۔ ہماری حکومت نے حال ہی میں کامریڈ سبط حسن کو جیل سے رہا کیا ہے۔ آپ اس کو اغوا کر کے لے جائیے۔ میرا دوست ہے۔ لیکن مجھے ڈر لگتا ہے کہ وہ اپنی پیاری پیاری نرم نرم باتوں سے ایک روز مجھے ضرور کمیونسٹ بنالے گا۔ یوں تو میں اتنا ڈرپوک نہیں۔ کمیونسٹ بھی ہو جاؤں تو میرا کیا بگڑ جائے گا مگر آپ کی عزت پر حرف آنے کا خیال ہے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ آپ کا بھتیجا ایسے بُرے دلدل میں جا پھنسا ــــــ میری اس برخورداری پر ایک شاباشی تو بھیجئے۔

اب میں احوالِ روزگار کی طرف آتا ہوں۔ چچا جان آپ کی ریش مبارک کی قسم۔ دن بہت برے گذر رہے ہیں۔ اتنے برے گذر رہے ہیں کہ اچھے دنوں کے لئے دعا مانگنا بھی بھول گیا ہوں۔ یہ سمجھئے کہ بدن پر لتے جھولنے کا زمانہ آگیا ہے۔ کپڑا اتنا مہنگا ہو گیا ہے کہ جو غریب ہیں ان کو مرنے پر کفن بھی نہیں ملتا۔ جو زندہ ہیں وہ تار تار لباس میں نظر آتے ہیں۔ میں نے تو تنگ آکر سوچا ہے کہ ایک "ننگا کلب" کھول دوں، لیکن سوچتا ہوں ننگے کھائیں گے کیا ــــــ ایک دوسرے کا ننگ؟ ــــــ مگر وہ بھی اتنا کریہہ ہوگا کہ ننگا ہی لقمہ اٹھاتے ہی وہیں رکھ دیں گے۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے۔ کوئی تنگی سی تنگی ہے۔ کوئی ترشی سی ترشی ہے۔ لیکن چچا جان داد دیجئے ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

لیکن چھوڑیئے اس قصے کو، آپ خوش گو، خوش اندام اور خوش خرام حسینوں کا وہ خیر سگالی وفد بھیج دیجئے۔ ہم اس غربت میں بھی اپنا جی "پشوری" کرلیں گے۔ فی الحال آپ لز ٹیلر کے ہونٹوں کا ایک پرنٹ بھیج دیجئے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔

آپ کا تابعدار بھتیجا

سعادت حسن منٹو

۳۱۔ لکشمی مینشنز۔ ہال روڈ۔ لاہور

(شمارہ ۳۴-۳۵ ۱۹۵۴ء)

جوگندر پال کی مشہور ناول

اِک بوند لہو کی

بہترین گیٹ اپ ــــ قیمت ــــ ۴/۲۵ روپے
مکتبۂ افکار۔ رابسن روڈ، کراچی

شوکت تھانوی

زنانہ مشاعرہ اور مردانہ خطبہ

پچھلے دنوں کراچی کے ایک زنانہ کالج میں بزمِ مشاعرہ آراستہ کی گئی جو سوائے شعرائے کرام کے باقی تمام خواتین پر مشتمل تھی۔ مشاعرے کی صدارت جناب شوکت تھانوی کر رہے تھے، چنانچہ اس موقع پر جو خطبۂ صدارت شوکت صاحب نے ارشاد فرمایا تھا وہ قارئینِ افکار کی خدمت میں پیش ہے، تاکہ اس کی گونج اس مشاعرے کے باہر بھی پیدا ہو سکے۔ (ص)

پرنسپل صاحبہ۔ شعرائے کرام۔ خواتین و حضرات:

ایک زنانہ کالج کے مردانہ مشاعرے کی صدارت کا منصب عطا فرما کر اللہ جانے آپ نے میری عزت افزائی فرمائی ہے یا مزاحِ لطیف سے کام لیا ہے۔ بہرحال میں بکمال سنجیدگی آپ کا شکر گزار ہوں اور اس شکر گزاری کے اظہار کو اس لئے مختصر سے مختصر رکھنا چاہتا ہوں کہ کہیں یہ سنجیدگی بھی کسی تمسخر کی شکل اختیار نہ کر لے۔

خواتین و حضرات! میں نے آج ہی نہیں بلکہ اکثر اس مسئلے پر غور کیا ہے کہ شاعری کے جدید عصر کو انحطاطی دور کہنا منجملہ دوسری وجوہ کے اس وجہ سے بھی کس قدر غلط ہے کہ شاید اس دور سے زیادہ کسی اور دور نے اتنی شاعرات پیدا نہیں کیں۔ جتنی آج نظر آتی ہیں۔ اللہ جانے مبصرینِ شعر و ادب اس کو شاعری کا ارتقا سمجھتے ہیں یا تنزل کہ خواتین بھی بال بچوں کی فکر کے علاوہ فکرِ سخن میں مبتلا نظر آتی ہیں، مگر میں اس کو ارتقا ہی کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے ؎

مردانہ سے زیادہ زنانہ میں دھوم ہے

شروع شروع میں یہ بات مجھے بھی عجیب و غریب نظر آئی تھی کہ مشاعروں میں خواتین نے بھی پہلے سامع کی حیثیت سے حصہ لینا شروع کیا۔ پھر وہ صفِ شعرا پر بھی چھاپہ مارتی نظر آئیں۔ اور رفتہ رفتہ مخلوط تعلیم نے جس رفتار سے فروغ حاصل کیا مخلوط مشاعرے بھی ترقی کرتے نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ خدا نے یہ دن بھی دکھا دیا کہ خواتین کے مشاعرے میں مرد شعرا آئے ہیں تک کا

مناسبت سے شریک نظر آرہے ہیں۔ اس مشاعرے میں آٹے اور نمک والی بات ہر چند کہ بے ساختگی کے ساتھ آگئی ہے، مگر جب آ ہی گئی ہے تو اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھا لیا جائے۔

میں آج یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ اب تو میں چشمِ بد دور بڑا روشن خیال بن چکا ہوں، ورنہ جب شروع شروع میں مجھ کو خواتین سرِ مشاعرہ غزل سرائی کرتی ہوئی نظر آئیں تو میں نے خود اپنے لئے ہنڈکلھیا پکانے کے امکان پر غور کیا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ادب اردو کی کسی تاریخ میں مجھ کو کہیں ایسے مشاعرے کا پتہ نہیں چلا جس میں غالب کے علاوہ کسی غالبانے بھی شرکت کی ہو۔ اور مومن کے علاوہ کسی مومنہ نے بھی شعر سنا کر داد حاصل کی ہو۔ بلکہ میری نظر میں تو صرف وہ مشاعرے تھے جن میں مردوں کے علاوہ عورتوں کا دور دور پتہ نہ ہوتا تھا۔ پھر وہ مشاعرے شروع ہوتے جن کے اشتہاروں میں لکھا جانے لگا کہ خواتین کے لئے پردے کا خاص انتظام ہے۔ اور رفتہ رفتہ اسی کراچی میں ایک ایسا مشاعرہ بھی منعقد ہو گیا جس میں مردوں کے لئے پردے کا خاص اہتمام تھا۔ میں اپنے دوست حضرت ظریف جبلپوری سے آپ کو وہ نظم سنوانے کی کوشش کروں گا جس میں اس زنانہ مشاعرے کو جس میں مرد شعراء کو پردہ نشین بنایا گیا تھا تاریخی حیثیت دی گئی ہے مگر اب اس قسم کے مخلوط مشاعرے ہمارا معمول بن چکے ہیں۔ خدا نظرِ بد سے بچائے شاعرات کی اب کوئی کمی نہیں ہے۔ اور ان میں ایسی ایسی باکمال شاعرات بھی موجود ہیں جو مشاعروں میں حاصلِ مشاعرہ نتائج فکر پیش کر کے مردوں سے خراجِ تحسین حاصل کر ہی لیتی ہیں۔

یہ بات ان بزرگوں کے نزدیک تعجب انگیز ضرور ہے جو فن کو بھی جنس وار تقسیم کرتے ہیں، اور شاعری کو بھی پہلوانی کی طرح خالص مردانہ فن گردانتے ہیں۔ حالانکہ زمانہ وہ آگیا ہے کہ پہلوانی بھی خالص مردانہ فن باقی نہیں رہا ہے۔ آپ نے مشہور خاتون پہلوان حمیدہ بانو کا نام سنا ہوگا جس سے بڑے بڑے پہلوان پناہ مانگتے تھے۔ آپ نے تارا بائی کا نام سنا ہوگا جس نے رام مورتی کو اس طرح آئینہ دکھایا تھا کہ وہ ایک موٹر کو روک لینا اور اپنی گرفت میں لے کر جنبش میں نہ آنے دینا اپنا کمال سمجھتے تھے۔ تو ان محترمہ نے دو موٹروں کو بیک وقت روک کر ثابت کر دیا کہ یہ کمال صرف دہنے ہاتھ کا نہیں، بلکہ ایک عورت کے بائیں ہاتھ کا بھی کھیل ہے۔ آپ ان محترم بزرگوں سے کہہ سکتی ہیں کہ عورت کے شاعر ہونے پر اعتراض کرنے سے پہلے ذرا دوسرے شعبوں میں بھی عورتوں کی رسائی دیکھ لیں۔ اگر زنانہ پولیس ممکن ہے تو خواتین کی شاعری پر تعجب کیوں ہے؟ خواتین اگر رائفل کلب میں نشانہ بازی کر سکتی ہیں تو مشاعروں کی شرکت سے ان کو کون روک سکتا ہے؟ فوجی محکموں میں اگر خواتین آسکتی ہیں تو ہمارے بزرگ ان کو مشاعروں میں دیکھ کر کلجگ کیوں یاد کرنے لگتے ہیں؟ عورت اگر لیڈری کر سکتی ہے تو شاعری کیوں نہیں کر سکتی؟ یہ اور بات ہے کہ میرے ایک نہایت ہی شفیق بزرگ ڈاکٹر اینی بسنٹ کو زندگی بھر مرد سمجھتے رہے۔ اور جب ان کو بتایا گیا کہ وہ خاتون تھیں، تو حمق سمجھ کر بولے کہ جناب والا، وہ خاتون ہوتے تو لیڈی ڈاکٹر اینی بسنٹ ہوتے۔ اس واقعے کو جسے آپ نے لطیفہ سمجھا ہوگا۔ یہاں دہرانے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ میں خواتین کی شاعری کا اول تو مخالف نہیں ہوں، اور اگر مخالف ہوتا بھی تو ایک زنانہ کالج میں اس کی مخالفت کا اظہار نہ کرتا۔ البتہ میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ خواتین کے اسم مبارک یا تخلص کے علاوہ "لیڈی ڈاکٹر" قسم کی کوئی چیز ضرور ہونا چاہئے تاکہ ادب کا مورخ تاریخ میں مردوں کو عورت اور عورتوں کو مرد نہ بنا دے۔ مثلاً "شمیم" ایک مرد کا تخلص ہو سکتا ہے اور ایک عورت کا بھی۔ خود شوکت اللہ جانے کس دن کسی خاتون کا تخلص واقع ہو جائے اور ان کا ذکر تاریخ میں اس طرح آئے کہ:۔

"یہ شوکت نہایت صاحب اولاد بزرگ تھے۔ مزاح نگار کی

حیثیت سے ادب میں داخل ہوئے اور مزاحیہ شاعری

ھی آغوش میں رحلت پا گئی“

اور خود میرا ذکر تاریخ میں اس طرح آئے گا کہ:۔

”یہ محترمہ بڑی شرمیلی واقع ہوئی تھیں۔مشاعروں میں
برقع پہن کر شعر سناتی تھیں اور داد ملنے پر ان کے شوہر
سلام کرتے تھے“

اس تمام گڑبڑ سے محفوظ رہنے کے لئے میری تجویز یہی ہے کہ شاعرات کے لئے ”لیڈر شاعر“ یا نام سے پہلے لفظ ”شاعرہ“ کا آنا ضروری ہے تاکہ تاریخ میں جنسی تبدیلی نہ ہونے پائے۔

خواتین وحضرات! میں مزاحاً نہیں بلکہ واقعی خواتین کی شعر گوئی کا مخالف نہیں ہوں، البتہ خواتین یا تو غزل کے اسلوب کو اپنے حسب حال بنالیں یا نظمیں کہا کریں۔کچھ عجیب سی لغو سی بات معلوم ہوتی ہے جب کوئی شاعرہ اس قسم کا شعر پڑھتی ہے کہ:۔

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

تو یہ عجیب مضحکہ خیز سی بات معلوم ہوتی ہے۔یہ مونچھوں والے شعر عورتوں کو زیب نہیں دیتے۔لہٰذا وہ ”چاہتا ہوں“ کو ”چاہتی ہوں“ تو آسانی سے بنا سکتی ہیں مگر اس کے باوجود یہ زنانہ شعر بمشکل بن سکتا ہے۔اور اس میں نسائی وقار باقی نہیں رہتا۔اس موقع پر مجھے اپنے محترم دوست حضرت جگر مرادآبادی بار بار یاد آرہے ہیں کہ ایک مرتبہ جب ایک محترمہ نے اپنا کلام سنانے کی کوشش کی تو پہلے تو وہ کچھ جز بز سے ہوئے، اس کے بعد مروت سے مجبور ہو کر کلام تو سن لیا، مگر بعد میں کہنے لگے کہ:۔

”غزل تو خوب تھی، مگر سوال یہ ہے جب آپ کا طبقہ بھی غزل سرائی شروع
کر دے گا تو ہم لوگ آخر کس کو مخاطب کریں گے، آپ کا منصب تو فطرت
نے یہ تجویز کیا ہے کہ آپ غزل کی مخاطب ہیں اور ہم دراصل آپ ہی کے
حضور یہ ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ جب ممدوح بھی
قصیدہ کہنے لگے تو مدح گو کہاں کا رہ جائے گا؟“

ممکن ہے جگر صاحب کی یہ بات ان خاتون یا دوسری خواتین کو پسند نہ آئے، مگر اس میں اتنی صداقت ضرور ہے کہ غزل کا موجودہ لب ولہجہ کچھ اس حد تک مردانہ واقع ہوا ہے کہ عورتوں کو غزل پڑھتے ہوئے دیکھ کر مجھے بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ گڑیاں کھیلنے والیاں ہاکی کھیل رہی ہیں۔یہ داڑھی مونچھوں والے شعر خواتین کی زبان سے کچھ ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا ان اشعار میں تذکیر وتانیث کی غلطیاں پیدا ہو گئی ہیں۔یہ باتیں آپ کو شاید اس وقت بھی پسند نہ آئیں اور آپ اپنی اس غلطی پر پچھتائیں کہ اس شخص کو ناحق صدر بنایا۔یہ ہماری بلی تو ہم ہی سے میاؤں کہہ رہی ہے۔دوسرے یہ بحث بھی طویل ہے، میں صرف اس اشارے ہی سے کام لے کر اس کو تشنہ چھوڑنے پر مجبور ہوں، اس لئے کہ اب حاضرات وحاضرین مجھ کو مشاعرے کا ”پیر پریڈ“ سمجھنے لگے ہیں، لہٰذا میں اس مشاعرے کی ابتدا کا اعلان کرتا ہوں۔

(شمارہ ۹۲-۹۳ ۱۹۵۹ء)

کنھیا لال کپور

مقتل صاحب

صبح سویرے ابھی منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پتہ چلا کہ مقتل صاحب نازل ہوئے ہیں۔ کہنے کو تو آپ مقتل ہیں۔ لیکن عادات یا اعمال کا جائزہ لیا جائے تو کسی قاتل سے کم معلوم نہیں ہوتے۔ ایک بار کسی مشاعرے میں یوں ہی اُن کا جی رکھنے کے لئے داد دے بیٹھے تھے۔ بس اس دن سے لٹھ لینی بیاض اٹھائے ہمارے پیچھے پھر رہے ہیں۔ ایک دفعہ آ جاتے ہیں تو جانے کا نام نہیں لیتے۔ لبعا اوقات تو یہ شک ہونے لگتا ہے کہ وہ صاحب خانہ اور ہم مہمان ہیں۔ "آداب عرض ہے قبلہ" کے بعد ہمیشہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ فرماتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے آپ گھر پر ہی ہیں۔ رات ایک غزل ہوگئی تھی اور غزل بھی قبلہ اس پائے کی کہ سنیں گے تو پھڑک اٹھیں گے۔ آپ زیادہ مصروف تو نہیں؟ تمہید باندھنے کے بعد کرسی یا صوفہ پر دراز ہو جاتے ہیں۔ اور قبلہ عرض کیا ہے کی تسبیح پھیرنے لگتے ہیں۔ ہر شعر دوبارہ بلکہ سہ بارہ پڑھتے ہیں، اور جب تک داد وصول نہ کر لیں معاف نہیں کرتے۔ ستم یہ کہ ترنم سے پڑھتے ہیں حالانکہ گلا ایسا پایا ہے کہ آپ پر پہاڑی کوے کا گمان ہی نہیں، یقین ہوتا ہے۔

چنانچہ آج جب کہ جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو، کا وظیفہ پڑھتے ہوئے دروازہ کھولا تو مقتل صاحب معمول سے زیادہ خوش نظر آئے۔ کہنے لگے "قبلہ ویسے تو آپ کو سیکڑوں غزلیں سنا چکا ہوں لیکن اس غزل کی شان ہی اور ہے۔ ندرت بیان ملاحظہ فرمائیے، اور دل کھول کر داد دیجئے۔"

بادل ناخواستہ انھیں تشریف رکھنے کو کہا اور سوچنے لگے اگر آواگون کا مسئلہ صحیح ہے تو ضرور پچھلے جنم میں کوئی ناقابل معافی گناہ کیا تھا کہ اس جنم میں مقتل صاحب سے واسطہ پڑا۔ انھوں نے ہماری گھبراہٹ کو بھانپتے ہوئے فرمایا۔ کیا بات ہے۔ آج کچھ کھوئے کھوئے نظر آ رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے رات نیند نہیں آئی۔ واللہ میر نے کیا خوب کہا ہے ؎

مجھ غم زدہ کو نیند نہ آئی تمام رات

لیکن قبلہ اس موضوع پر امیر مینائی کا شعر بے نظیر ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کبابِ سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سُو بدلتے ہیں
جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

"کباب سیخ کی ترکیب پر غور فرمائیے، اور پھر کتنی مکمل تشبیہ دی ہے۔ خاکسار نے بھی اسی رنگ میں ایک شعر کہا تھا۔

بہت عمدہ شعر تھا۔ کان پور کے مشاعرے میں تین بار پڑھوایا گیا۔ لیکن افسوس اس وقت یاد نہیں آرہا ہے ——
وہ شعر تھا ..... کیا تھا ...... ہاں یاد آگیا ؎

سونا چاہیں تو سو نہیں سکتے
رونا چاہیں تو رو نہیں سکتے

سلاستِ زبان کی داد چاہتا ہوں۔ دیکھیے کتنا صاف شعر ہے۔"

مقتل صاحب یہ سب کچھ ایک سانس میں کہہ جاتے ہیں، اور ہم دل ہی دل میں سوچتے ہیں۔ ان کا شعر اس قسم کا ہے جس پر اگر کبھی رونا چاہیں تو بڑی آسانی سے رو سکتے ہیں، بلکہ سر بھی پیٹ سکتے ہیں۔

اب آمدم برسرِ مطلب والا معاملہ شروع ہوتا ہے "قبلہ پہلے اس غزل کی شانِ نزول ملاحظہ فرمایئے۔ چند دن ہوئے خاکسار ایک مجلسِ وعظ میں چلا گیا۔ یوں ہی غلطی سے، ورنہ آپ جانتے ہیں بندہ ایسا ضعیف الاعتقاد نہیں، وہاں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی —— انھوں نے فرمایا کہ بہت جلد اللہ کو پیارے ہونے والے ہیں۔ میں نے انھیں ایک خاندانی نسخہ بتایا اور کہا ایک دفعہ استعمال تو کر کے دیکھیے۔ ع

ابھی تو میں جوان ہوں

نہ گنگناتے پھریں تو مقتل نام نہیں۔ وہ آب دیدہ ہو کر کہنے لگے ؎

نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

قبلہ جوں ہی انھوں نے یہ شعر پڑھا، مجھے غزل کا موضوع سوجھ گیا۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس پر طبع آزمائی کی جائے۔ ساری رات فکرِ سخن میں کاٹی۔ صبح پانچ بجے مقطع ہوا۔ اور ساڑھے پانچ بجے آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ عرض کیا ہے ؎

"ارشاد" ہم مری ہوئی آواز میں کہتے ہیں۔
"مطلع عرض کرتا ہوں" ؎

آہ کیسے فلک پہ جائے گی
جا کے پھر واں سے کیسے آئے گی

ہم مذاقاً کہتے ہیں "ظاہر ہے مقتل صاحب کہ راکٹ کے بغیر آہ نہ فلک پہ جا سکتی ہے اور نہ جانے کے بعد وہاں سے واپس آ سکتی ہے"

مقتل صاحب ایک کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ فرماتے ہیں "قبلہ آپ تو مذاق کرنے لگے۔ ذرا سنجیدگی سے شعر کی باریکیوں کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ نیا خیال باندھا ہے۔ داد چاہتا ہوں"

"واقعی اچھوتی بات پیدا کی ہے۔ اور لطف یہ کہ ہر شعر میں "کیسے" کی تکرار گراں نہیں گذرتی"

"جی ہاں" —— مقتل صاحب کرسی میں اچھل کر فرماتے ہیں۔ "یہی تو اس شعر کی خوبی ہے۔ ذرا دیکھیے نا! ؎

GOVT GIRLS COLLEGE
SRINAGAR
ACC No 15227
LIBRARY

آہ کیسے فلک پہ جائے گی
جا کے پھروں سے کیسے آئے گی

"بہت خوب، مقتل صاحب!"

"آداب عرض۔ شعر عرض کرتا ہوں" ؎

ہم تو جائیں گے خیر مقتل ہیں
آپ کی یاد بھی تو جائے گی

"سبحان اللہ۔ کمال کر دیا۔ مقتل صاحب مطلع کے فوراً بعد ہی مقطع۔ میرے خیال میں یہ آپ کی مختصر ترین غزل ہے ——"

"نہیں قبلہ ——! آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ یہ مقطع ہرگز نہیں۔ مقتل اس شعر میں بطور تخلص استعمال نہیں ہوا۔ مقطع تو اٹھارہ اشعار کے بعد آئے گا۔ ہاں داد تو دیجئے نا اس شعر کی؟"

"اچھا شعر ہے۔"

"اچھا نہیں صاحب، بہت اچھا کہئے۔ شاید آپ نے غور سے نہیں سنا۔ ایک بار پھر پڑھ دیتا ہوں ؎

ہم تو جائیں گے خیر مقتل ہیں
آپ کی یاد بھی تو جائے گی!

ملاحظہ فرمایا آپ نے ——؟ 'یاد' کا مضمون کتنا فرسودہ ہو چکا ہے۔ لیکن اس شعر میں اپنی تمام تر تازگی و رعنائی کے ساتھ رونما ہوا ہے!"

اس شعر کے بعد اسی قبیل کے وہ سولہ اشعار سناتے ہیں، اور ہر شعر کے بعد داد طلب نگاہوں سے ہماری طرف دیکھتے ہیں۔ ہم بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ ممکن ہے اشارہ سمجھ جائیں اور ہمیں بخش دیں۔ لیکن وہ بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے، ہماری توجہ مبذول کرانے کے لئے ہمارا شانہ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہتے ہیں۔

"داد دیجئے نا صاحب، یہ شعر تو آپ کی توجہ کا خاص مستحق ہے۔"

خدا خدا کر کے غزل ختم ہوتی ہے۔ ہم پندرھویں بار گھڑی کی طرف دیکھتے ہیں —" اچھا مقتل صاحب ہمیں لیکچر تیار کرنا ہے۔ اب آرام کیجئے۔"

وہ جواب میں فرماتے ہیں —" بس ایک نظم اور سن لیجئے۔ اس کے بعد میں خود ہی اجازت چاہوں گا۔"

"بہت طویل تو نہیں ——؟"

"اجی کہاں —— صرف سولہ بند ہیں۔ اور وہ بھی بیس بیس اشعار کے۔"

"گستاخی معاف، پھر کبھی سہی —— اس وقت فرصت ذرا کم ہے۔"

"آپ تو خواہ مخواہ گھبرا رہے ہیں —— میری خاطر صرف چند منٹ کی زحمت گوارا کر لیجئے۔ دیکھئے کبھی کبھار تو آپ گھر پر ملتے ہیں —— اور پھر اگر آپ ایسے سخن فہم کو نہ سناؤں تو کسے سناؤں؟ آخر چمن تنبولی کو تو سنا نے سے رہا۔"

ہمیں چمن تنبولی پر رشک سا آنے لگتا ہے کہ وہ سخن فہم نہیں صرف پان فروش ہے۔ طوعاً و کرہاً مقتل صاحب

(باقی صفحہ ۹۶۹ پر)

شفیق الرحمٰن

زنانہ اردو خط و کتابت

شوہر کو

سرتاجِ من سلامت۔

کورنشات بجا لا کر عرض کرتی ہوں کہ منی آرڈر ملا۔ رسید پر یہ پڑھ کر کہ طبیعت اچھی نہیں ہے ازحد تشویش ہے۔ لکھنے کی بات تو نہیں مگر مجھے بھی تقریباً دو ماہ سے ہر رات بدخوابی ہوتی ہے، آپ کے متعلق بڑے بڑے خواب نظر آتے ہیں خدا خیر کرے۔ صبح کو صدقے کی قربانی دے دی جاتی ہے۔ اس پر کافی خرچ ہو رہا ہے۔

آپ نے پوچھا ہے کہ میں رات کو کیا کھاتی ہوں۔ بھلا اس کا تعلق خوابوں سے کیا ہو سکتا ہے۔ وہی معمولی کھانا ہوتا ہے۔ البتہ سوتے وقت ایک سیر کڑھا ہوا دودھ، کچھ خشک میوہ اور آپ کا ارسال شدہ سوہن حلوہ استعمال کرتی ہوں۔ حلوہ اگر زیادہ دیر رکھا رہا تو خراب ہو جائے گا۔

سب سے پہلے آپ کے بتائے ہوئے ضروری کام کے متعلق لکھ دوں کہ بعد میں یاد نہ رہے، آپ نے تاکید فرمائی ہے کہ میں فوراً بیگم فرید سے مل کر مکان کی خرید کے سلسلے میں ان کا آخری جواب آپ کو لکھ دوں۔ کل اُن سے ملی تھی، شام کو تیار ہوئی تو ڈرائیور غائب تھا، یہ غفور دن بدن سست ہوتا جا رہا ہے، عمر کے ساتھ ساتھ اس کی بینائی بھی کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اس مرتبہ آتے وقت اس کے لئے ایک اچھی سی عینک لیتے آئیں ——— گھنٹوں کے بعد آیا تو بہانے تراشنے لگا کہ تین دن سے کار مرمت کے لئے گئی ہوئی ہے۔ چاروں ٹائر بیکار ہو چکے ہیں، ٹیوب پہلے سے چھلنی ہیں یہ کار بھی جواب دیتی جا رہی ہے، آپ کے آنے پر نئی کار لیں گے۔ اگر آپ کو ضرورت ہو تو اس کار کو منگا لیں۔ خیر تانگہ منگایا، راستے میں ایک جلوس ملا، بڑا غل غپاڑہ مچا ہوا تھا۔ ایک گھنٹے ٹریفک بند رہا۔ معلوم ہوا کہ خان بہادر رحیم خاں کے صاحبزادے کی برات جا رہی ہے۔ برات نہایت شان دار تھی۔ تین آدمی اور دو گھوڑے زخمی ہوئے۔

راستے میں زینب بوا مل گئیں۔ یہ ہماری دور کی رشتہ دار ہوتی ہیں۔ احمد چچا کے سسرال میں جو ٹھیکیدار صاحب ہیں نا، اُن کی سوتیلی ماں کی سگی بھتیجی ہیں۔ آپ ہمیشہ زینب بُوا اور رحمت بُوا کو ملا دیتے ہیں، رحمت بُوا میری

ننھیال سے ہیں، ماموں عابد کے ہم زلف کے تائے کی نواسی ہیں۔ رحمت بوا بھی ملی تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ کبھی باجی قدسیہ کو ساتھ لاکر ہمارے ہاں چند ہفتے رہ جائیں۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے۔ باجی قدسیہ بھی اپنے عزیزوں میں سے ہیں۔ یہ وہی ہیں جو تایا نعیم کے ساتھ ہماری شادی پر آئی تھیں، تایا نعیم کی ساس ان کی دادی کی منھ بولی بہن تھیں، بلکہ ایک دوسرے سے دوپٹہ بدل چکی تھیں۔ یہ سب اس لیے لکھ رہی ہوں کہ آپ کو اپنے عزیز و اقارب یاد نہیں رہتے۔ کیا عرض کروں آج کل زمانہ ایسا آگیا ہے کہ رشتہ دار کو رشتہ دار کی خبر نہیں۔ میں نے زینب بوا کو گھر آنے کے لیے کہا، وہ اسی شام آگئیں۔ میں نے بڑی خاطر کی۔ خواہش ظاہر کرنے پر آپ کے ارسال شدہ روپیوں میں سے دو سو انھیں ادھار دیدیئے۔

ہاں تو میں بیگم فرید کے ہاں پہنچی، بڑے تپاک سے ملیں، بہت بدل چکی ہیں۔ جوانی میں مسز فرید کہلاتی تھیں اب تو بالکل رہ گئی ہیں، ایک تو بے چاری پہلے ہی اکہرے بدن کی ہیں اس پر طرح طرح کے فکر، گھٹنوں پر ہاتھ رکھکر اٹھتی ہیں۔ کہنے لگیں اگلے ہفتے برخوردار نعیم کا عقیقہ ہے اس سے اگلی جمعرات کو نور چشمی بتول سلمہا کی رخصت ہوگی ضرور آنا۔

میں نے حامی بھرلی۔ اور مکان کے متعلق ان سے آخری جواب مانگا۔ پہلے کی طرح چٹاخ پٹاخ باتیں نہیں کرتیں۔ آواز میں بھی وہ کرارا پن نہیں رہا۔ انھیں تو یہ بتول لے کر بیٹھ گئی، عمر کا بھی تقاضہ ہے۔ سوچ رہی ہوں جاؤں نہ جاؤں، دوڈھائی سو روپے خرچ ہو جائیں گے۔ نیا جوڑا سلوانا ہوگا۔ ویسے تو ان سردیوں کے لیے سارے کپڑے نئے بنوانے پڑیں گے۔ پچھلے سال کے کپڑے اتنے تنگ ہو چکے ہیں کہ بالکل نہیں آتے۔ آپ بار بار سیر اور ورزش کو کہتے ہیں۔ بھلا اس عمر میں مستانوں کی طرح سیر کرتی ہوئی کیا اچھی لگوں گی۔ ورزش سے مجھے نفرت ہے۔ خواہ مخواہ جسم کو تھکانا اور پھر پسینہ، نہ آج تک کی ہے نہ خدا کرائے۔ کبھی کبھی کار میں زنانہ کلب چلی جاتی ہوں، وہاں ہم سب بیٹھ کر نٹنگ کرتی ہیں۔ واپس آتے آتے اس قدر تکان ہو جاتی ہے کہ بس۔

آپ ہنسا کرتے ہیں کہ نٹنگ کرتے وقت عورتیں باتیں کیوں کرتی رہتی ہیں، اس لیے کہ کسی کام میں لگی رہیں۔

آپ نے جگہ جگہ خط میں شعر و شاعری اور الٹی سیدھی باتیں لکھی ہیں، ذرا سوچ تو لیا ہوتا کہ بچوں والے گھر میں خط جا رہا ہے، اب ہمارے وہ دن نہیں رہے کہ ایسی باتیں ایک دوسرے کو لکھیں، شادی کو پانچ برس گذر چکے ہیں، خدارا ایسی باتیں آئندہ مت لکھیے۔ توبہ توبہ اگر کوئی پڑھ لے تو کیا کہے۔

ان دنوں میں فرسٹ ایڈ سیکھنے نہیں جاتی۔ ٹریننگ کے بعد کلاس کا امتحان ہوا تھا آپ سن کر خوش ہوں گے کہ میں پاس ہوگئی۔

پچھلے ہفتے ایک عجیب واقعہ ہوا، بڑے لڑکے کو بخار چڑھا تھا یوں تپ رہا تھا کہ چنے رکھوا اور بھون لو۔ میں نے تھرمامیٹر لگایا تو نارمل تھا۔ دوبارہ لگایا تو نارمل سے بھی نیچے چلا گیا۔ پتہ نہیں کیا وجہ تھی۔ پھر گھڑی لے کر نبض گننے لگی۔ دفعتہً یوں محسوس ہوا جیسے لڑکے کا دل ٹھہر گیا ہو کیونکہ نبض رک گئی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ دراصل گھڑی بند ہوگئی تھی۔ یہ فرسٹ ایڈ بھی یونہی ہے۔ خواہ مخواہ وقت ضائع کیا۔

ڈاکٹر میری سٹوپس کی کتاب ارسال ہے، اگر دکاندار واپس لے لے تو لوٹا دیجیے یہ باتیں بھلا ہم مشرق کے رہنے والوں کے لیے تھوڑا ہی ہیں، اس کی جگہ بہشتی زیور کی ساری جلدیں بھجوا دیجیے، ایک کتاب "گھر کا حکیم" کی بڑی

تعریف سُنی ہے یہ بھی بھیج دیجئے۔

چند نئی فلمیں دیکھیں، کافی پسند آئیں، ہیرو کا انتخاب بہت موزوں تھا لمبے لمبے بال، کھوئی کھوئی نگاہیں کھُلے گلے کا کُرتہ، گانے کا شوق، کسی کام کی بھی جلدی نہیں، فرصت ہی فرصت، آپ بہت یاد آئے، شادی سے پہلے میں آپ کو اسی روپ میں دیکھا کرتی تھی، کاش کہ آپ کے بھی لمبے لمبے بال ہوتے، ہر وقت کھوئی کھوئی نگاہوں سے خلا میں تکتے رہتے، کھُلے گلے کا کُرتہ پہن کر گلشن میں گانے گایا کرتے۔ نہ یہ کمبخت دفتر کا کام ہوتا اور نہ ہر وقت کی مصروفیت، لیکن خواب کب پورے ہوتے ہیں۔؟

ان فلموں میں ایک بات کھٹکتی ہے، ان میں عورتوں کی قوالی نہیں ہے۔ فلم بناتے وقت نہ جانے ایسی اہم چیز کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ گیت بے حد معمولی ہیں، مثلاً ایک گانا بھی ایسا نہیں ہے جس میں راجہ جی مورے راجہ یا ہو راجہ آتا ہو۔ یہ سادہ الفاظ گیت میں جان ڈال دیتے ہیں۔

ایک ضروری بات آپ سے پوچھنا تھی، زینب بوا نے شبہ سا ڈال دیا ہے کہ آپ کے لفافوں پر پتہ زنانہ تحریر میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کے دفتر میں کوئی سکریٹری یا اسٹینو گرافر وغیرہ آگئی ہو اور آپ مصروفیت کی بنا پر پتہ اس سے لکھواتے ہوں۔ یہ لڑکی کس عمر کی ہے؟ شکل صورت میں کیسی ہے؟ غالباً کنواری ہوگی، اس کے متعلق مفصل طور پر لکھیئے، اگر ہو سکے تو اس کی تصویر بھی بھیجئے۔

باقی سب خیریت ہے، اور کیا لکھوں۔ بس بچے ہر وقت آپ کو یاد کرتے ہیں، اصغر روز پوچھتا ہے کہ ابا میری سائیکل کب بھیجیں گے۔ آپ نے آنے کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ اب تو ننھی کی بسم اللہ بھی قریب آچکی ہے، میری مانئے تو واپس یہیں تبادلہ کرا لیجئے۔ بھاڑ میں جائے یہ ترقی اور ایسا مستقبل۔ تھوڑی سی اور ترقی دے کر محکمے والے کہیں آپ کو اور دور نہ بھیج دیں۔

آپ بہت یاد آتے ہیں۔ ننھے کی جرابیں پھٹ چکی ہیں۔ ننھی کے پاس ایک بھی نیا فراک نہیں رہا۔ بُرا ہو پردیس کا صورت دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔ امی جان کی اونی چادر اور کمبلوں کا انتظار رہے۔

ہر وقت آپ کا انتظار رہتا ہے۔ آنکھیں دروازے پر لگی رہتی ہیں۔ صحن کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑ رہا ہے، مالی کام نہیں کرتا، اس کی لڑکی اپنے خاوند کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

آتے وقت چند چیزیں ساتھ لائیں۔ بچوں کے جوتے اور گرم کوٹ، ننھے کی جرابیں اور کنٹوپ، ننھی کی فراک، دو چمڑے کے صندوق، زینب بوا کے لئے اچھا سا تحفہ، بلی کے گلے میں باندھنے کے لئے ربن اور کتے کا خوبصورت سا کالر، کچھ سوہن حلوہ اور ننھی کا سویٹر۔ ننھی کے کان میں پھنسی تھی، چچا جان سول سرجن بلانے کو کہتے تھے میں نے منع کر دیا۔ کیونکہ کل تعویذ آجائے گا۔

یہاں کی تازہ خبریں یہ ہیں کہ پھوپھی جان کی بھینس اللہ کو پیاری ہوئی، سب کو بڑا افسوس ہوا۔ اچھی بھلی تھی دیکھتے دیکھتے دم توڑ دیا۔ میں پُرسہ دینے گئی تھی، تایا نعیم کا لڑکا کہیں بھاگ گیا ہے، احمد چچا کا جس بینک میں حساب تھا وہ بینک فیل ہو گیا ہے۔ اور ہاں پھوپھا جان کی ساس جو اکثر بہکی بہکی باتیں کیا کرتی تھیں اب بالکل باؤلی ہو گئی ہیں۔ بقیہ خبریں اگلے خط میں لکھوں گی

سرتاج کو کنیز کا آداب۔ فقط

(ایک بات بھول گئی، منی آرڈر پر مکان کا نمبر ضرور لکھا کیجئے اس طرح ڈاک جلدی مل جاتی ہے)

امّی جان کے نام

میری پیاری امّی میری جان امّی!

بعد اداے آداب کے عرض یہ ہے کہ یہاں پر ہر طرح سے خیریت ہے اور خیر و عافیت آپ کی خداوند کریم سے نیک مطلوب ہوں، صورت احوال یہ ہے کہ یہاں سب خیریت سے ہیں۔ والا نامہ آپ کا صادر ہوا۔ دل کو از حد خوشی حاصل ہوئی۔ چچا جان کے خسر صاحب کے انتقال پُر ملال کی خبر سُن کر دل کو از حد قلق ہوا، جب سے یہ خبر سُنی ہے۔ چچی جان دھاروں رو رہی ہیں۔ خلیفہ جی یہ سُنا ونی لے کر پہنچے تو کسی سے اتنا نہ ہوا کہ ان کی دعوت ہی کر دیتا۔ میں نے سوچا کہ اگر ذرا سی الکسی ہو گئی تو خاندان بھر میں تھڑی تھڑی ہو جائے گی۔ فوراً خادمہ کو لے کر باورچی خانہ میں پہنچی۔ اُس نے جھپاک جھپاک آٹا گوندھا۔ لیکن سالن قدرے تیز آنچ پر پک گئے۔ چنانچہ پھل پھلواری سے خلیفہ جی کی تواضع کی، بہت خوش ہوئے۔ تائی صاحب نے خوان پھجوا حاتم کو شرمندہ کرنے کی کوشش کی، دوسرے روز ناشتہ پر بھی بلوایا۔ اوچھے کے ہوئے تیتر باہر باندھوں کہ بھیتر۔ یہ تائی صاحبہ بھی ہمیشہ اسی طرح کرتی رہتی ہیں۔ رنگ میں بھنگ ڈال دیتی۔

الفت بیا آئی تھیں۔ تائی صاحبہ کا فرمانا ہے کہ یہ بچپن سے بہری ہیں۔ بہری وہری کچھ نہیں، فقط وہ سُنتی نہیں ہیں۔ کیا مجال جو آگے سے کوئی ایک لفظ بول جائے۔

دل گو نہیں چاہ رہا تھا لیکن آپ کے ارشاد کے مطابق اوپری دل سے ہم لوگ ممانی جان سے ملنے گئے۔ وہاں پہنچے تو سارا کنبہ کہیں گیا ہوا تھا، چنانچہ ہم چڑیا گھر دیکھنے چلے گئے، ایک نیا جانور آیا ہے، زیبرا کہلاتا ہے۔ بالکل گدھے کا سپورٹس ماڈل معلوم ہوتا ہے۔ اچھا ہی ہوا، کہ دیکھ لیا ورنہ ممانی جان کی طعن آمیز گفتگو سننی پڑتی۔

پڑھائی خوب زوروں سے ہو رہی ہے، پچھلے ہفتے ہمارے کالج میں مس سیّد آئی تھیں۔ جنھیں حال ہی میں ولایت سے کئی ڈگریاں ملی ہیں، بڑی قابل عورت ہیں۔ انھوں نے "مشرقی عورت اور پردہ" پر لیکچر دیا۔ ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی، مس سیّد نے شنائل کا ہلکا ہلکا گلابی جوڑا پہن رکھا تھا، قمیص پر کلیوں کے سادہ نقش اچھے لگ رہے تھے، گلے میں گہرا سُرخ پھول نہایت خولصورتی سے ٹانکا گیا تھا۔ شیفون کے آبی دوپٹے کا کام مجھے بڑا پسند آیا، بیضوی بوٹے جوڑوں میں کاڑھے ہوئے تھے، ہر دوسری قطار کلیوں کی تھی۔ ہر چوتھی قطار میں دو پھول کے بعد ایک کلی کم ہو جاتی تھی۔ دوپٹے کا پلّو سادہ تھا لیکن بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ مس سیّد نے بھاری سینڈل کی جگہ لفٹی پہن رکھی تھی، کانوں میں ایک ایک نگ کے ہلکے پھلکے آویزے تھے تراشیدہ بال بڑی استادی سے پرم کیے ہوئے تھے۔ جب آئیں تو کوٹی کی خوشبو سے سب کچھ معطر ہو گیا۔ لیکن مجھے ان کی شکل پسند نہ آئی، ایک آنکھ دوسری آنکھ سے کچھ چھوٹی ہے۔ مسکراتی ہیں تو دانت بڑے معلوم ہوتے ہیں۔ بنتی بہت ہیں۔ ویسے بھی عمر رسیدہ ہیں، ہوں گی ہم لڑکیوں سے کم از کم دس سال بڑی۔ ان کا لیکچر نہایت مقبول ہوا۔

آپ یہ سُن کر پھولی نہ سمائیں گی کہ آپ کی پیاری بیٹی امورِ خانہ داری پر کتاب لکھ رہی ہے، مجھے بڑا غصہ آتا تھا جب لوگوں کو یہ کہتے سنتی تھی کہ پڑھی لکھی لڑکیاں گھر کا کام کاج نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ میں نے یہ آزمودہ ترکیبیں لکھی ہیں جو ملک کے مشہور زنانہ رسالوں میں چھپیں گی۔ نمونے کے طور پر چند ترکیبیں نقل کرتی ہوں۔

لذیذ آرنج سکوائش تیار کرنا

آرنج سکواش کی بوتل لو، یہ دیکھ لو کہ بوتل آرنج سکواش ہی کی ہے کسی اور چیز کی تو نہیں۔ ورنہ نتائج خاطر خواہ برآمد نہ ہونگے دوسری ضروری بات یہ ہے کہ مہمانوں اور گلاسوں کی تعداد ایک ہونی چاہیے۔ گلاسوں کو پہلے صابن سے دھلوا لینا اشد ضروری ہے۔ بعد ازیں سکواش کو بڑی حفاظت سے گلاس میں انڈیلو اور پانی کی موزوں مقدار کا اضافہ کرو، مرکب کو چمچے سے تقریباً نصف منٹ ہلاؤ۔ نہایت روح افزا آرنج سکواش تیار ہوگا۔

موسم کے مطابق برف بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ (لیکن برف کو صابن سے دھلوا لینا نہایت ضروری ہے)

انڈا اُبالنا

یہ عمل اتنا آسان نہیں جتنا کہ لوگ سمجھتے ہیں، لیکن اگر مشق ہو جائے تو ذرا مشکل نہیں لگتا۔ ایک انڈا لو۔ (بہتر ہوگا کہ انڈا مرغی کا ہو) بیشتر اس کے کہ عمل شروع کیا جائے یہ معلوم کر لینا بہت اہم ہے کہ انڈا خراب تو نہیں۔ اس کا سہل اور مجرب طریقہ یہ ہے کہ انڈے کو ایک کونے سے ذرا سا توڑ کر تسلی کر لی جائے۔ اب انڈے کو پانی میں ڈبو کر پانی اور انڈا دیگچی میں ڈالو۔ دیگچی کو چولہے پر رکھ کر گرم کرو اور ذرا ذرا سی دیر کے بعد پانی میں انگلی ڈال کر دیکھتی رہو کہ اُبال آنا شروع ہوا ہے یا نہیں۔ شوں شوں کی آواز آئے تو پر آگ بجھا دو۔ اور ہاتھ یا کسی اور چیز کی مدد سے جلدی سے انڈا دیگچی سے باہر نکال کر ٹھنڈا کر لو۔ اب انڈا تیار ہے اور کھایا جا سکتا ہے۔

مزے دار فروٹ سلاد تیار کرنا

مہمانوں کے یک لخت آ جانے پر ایک ملازم کو جلدی سے بازار بھیج کر کچھ بالائی اور ایک ٹین پھلوں کا منگاؤ۔ اس کے آنے سے قبل ایک بڑی قاب کو صابن سے دُھلوا لینا چاہیے ورنہ بعض اوقات فروٹ سلاد میں اور طرح کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ اب ٹین کھولنے کا اوزار لے کر ٹین کا ڈھکنا کھولنا شروع کرو، اور خیال رکھو کہ کہیں انگلی کٹنے نہ پائے۔ بہتر ہوگا کہ ٹین اور اوزار نوکر کو دیدو۔ اب پھلوں کو ڈبے سے نکال کر حفاظت سے قاب میں ڈالو اور بالائی کی ہلکی ہلکی تہہ جماؤ۔ نہایت مزے دار اور مفرح فروٹ سلاد تیار ہے۔ نوش جان کیجیے۔

میز پوش سینا

جس میز کے لیے پوش درکار ہو اُس کا ناپ لو۔ بہتر ہوگا کہ کپڑے کو میز پر پھیلا کر لمبائی کے مطابق وہیں قینچی سے قطع کر لیا جائے۔ اب ہاتھ یا پاؤں سے چلانے والی سینے کی مشین منگاؤ، سوئی میں دھاگہ پرو کر میز پوش کے ایک کونے سے سلائی شروع کرو۔ اور سیتی چلی جاؤ حتیٰ کہ وہی کونا آ جائے جہاں سے بخیہ شروع کیا تھا۔ اب میز پوش استعمال کے لیے تیار۔ بھئی اگر سیتے وقت سارے کپڑے کے دو چکر لگ جائیں تو دگنا پائیدار میز پوش تیار ہوگا۔ ضروریات کے مطابق بعد میں بیل بوٹے کاڑھے جا سکتے ہیں۔

استری پھیرنا

اپنے قد سے تقریباً دو فٹ نیچی میز منگاؤ، استری میں دہکتے ہوئے کوئلے ڈالو اور ہاتھ پھیر کر دیکھتی رہو کہ گرم ہو گئی ہے یا نہیں

جب ہاتھ پھیرنا مشکل ہو جائے تو سمجھ لو کہ استری تیار ہے اور پھیری جا سکتی ہے۔ اب استری کو کپڑے پر پھیرو۔ کپڑے کی تہہ درست کرنا نہ بھولنا چاہیے۔ ساتھ ساتھ پانی کے چھینٹے دیتی جاؤ (کپڑے پر) جب کپڑا بھورا ہونا شروع ہو جائے تو سمجھ لو کہ مکمل استری ہو گئی۔ دوسرا کپڑا پہلے استری شدہ کپڑے پر پھیلا کر یہ عمل دُہرایا جا سکتا ہے۔ جب ایک جانی پہچانی بھینی بھینی خوشبو کمرے میں پھیلنے لگے تو استری یک لخت بند کر دو۔

کپڑے ڈرائی کلین کرنا

مناسب کپڑے چُن کر ایک سمجھ دار ملازم کے ہاتھ ڈرائی کلین کی دکان پر بھجوا دو۔ بھیجنے سے پہلے ایک فہرست ضرور تیار کر لو۔ بہتر ہو گا کہ صرف وہی کپڑے بھیجو جنھیں بعد میں پہچان سکو۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کپڑے واقعی ڈرائی کلین کئے گئے ہیں۔ ایک بڑی آزمودہ ترکیب ہے۔ کپڑوں کو سونگھ کر دیکھو۔ اگر پٹرول کی بو آ رہی ہو تو سمجھ لو ٹھیک ہے۔ اب کپڑے ڈرائی کلین ہو چکے ہیں اور انھیں فوراً استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔

سچ بتانا اچھی امّی جان آپ کو ترکیبیں پسند آئیں؟ ایسے اور بہت سے نسخے بھی میرے پاس محفوظ ہیں جنھیں اگلے خط میں بھیجوں گی۔

میں علی الصبح اٹھتی ہوں، آپ کا ارسال شدہ ٹائم پیس اتنے زوروں سے بجتا ہے کہ رات کو اُسے رضائی میں لپیٹ کر ایک کونے میں رکھنا پڑتا ہے۔ عید پر جو خالہ جان نے مٹاپے کا طعنہ دیا تھا اس کے لئے بڑی کوشش کر رہی ہوں، فالتو چیزوں کا استعمال آہستہ آہستہ بند کر رہی ہوں، نشاستے سے پرہیز کرتی ہوں کپڑوں تک میں سٹارچ نہیں لگنے دیتی۔

ایک خوشخبری دینا تو بھول ہی گئی، آپ کی پیاری بیٹی اس سال فارسی میں کالج میں دوئم آئی ہے۔ یہ سب آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے ورنہ لونڈی کس لائق ہے۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ میں کلاس میں دیر سے پہنچتی تھی، پہلا گھنٹہ فارسی کا ہوتا تھا اور فارسی میں صرف دو لڑکیاں تھیں نجمہ اور میں۔ شاید اطلاع میری سہیلیوں سے نہیں بلکہ رشتہ داروں میں سے کسی نے پہنچائی ہو گی۔

اب خط ختم کرتی ہوں، میری طرف سے بزرگوں کی خدمت میں آداب۔ بچوں کو بہت بہت پیار۔ اور سب کو ما وجب۔

دیکھئے وہ کونسا مبارک دن ہوتا ہے کہ میں اپنی امیّ کو جھک کر آداب کروں اور امّی جان مجھے کلیجے سے لگا لیں اور سدا لگائے رکھیں۔ آمین ثم آمین! فقط ———— ناچیز آپ کی بیٹی

منگیتر کو

جناب بھائی صاحب،

آپ کا خط ملا۔ میں آپ کو ہرگز خط نہ لکھتی لیکن پھر خیال آیا کہ آپ کی بہن میری سہیلی ہیں اور کہیں وہ بُرا نہ مان جائیں۔ وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ کبھی ایک غیر مرد کو خط بھیجوں گی۔

امید کرتی ہوں کہ آئندہ خط لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھیں گے کہ آپ ایک شریف گھرانے کی ایشیائی لڑکی سے مخاطب ہیں۔ احتیاطاً تحریر ہے۔ میرا آپ کو خط لکھنا اس امر کا شاہد ہے کہ ہم لوگ کس قدر وسیع خیالات کے ہیں۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ رشیدہ اور حمیدہ کو جانتے ہیں کلثوم اور رفعت سے بھی واقفیت رہ چکی ہے۔ ثریا اور اختر کو

خط لکھا کرتے تھے۔ آپ کو کلب میں ناچتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے اور ایک شام کو آپ چمکیلی سی پیلے رنگ کی چیز چھوٹے سے گلاس میں پی رہے تھے اور خوب قہقہے لگا رہے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم ماڈرن نہیں ہیں، ہمیں یہ ہوا نہیں لگی، نہ اس روش پر چلنے کا ارادہ ہے، ہمارے ہاں جہاں مذہب، شرافت اور خاندانی روایات کا خیال ملحوظ ہے وہاں اعلیٰ تربیت اور بلند خیالی بھی ہے۔

میں بی۔ اے (آنرز) میں پڑھتی ہوں۔ شام کو مولوی صاحب بھی پڑھانے آتے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے مجھے تانگے میں کالج سے نکلتے دیکھا تھا اور میں نے برقعے کا نقاب الٹ رکھا تھا، آپ نے کسی اور کو دیکھ لیا ہوگا۔ اول تو میں ہمیشہ کار میں کالج جاتی ہوں دوسرے یہ کہ میں نقاب نہیں اٹھا کرتی ہمیشہ برقعہ میرے ہاتھ میں کتابوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

جی ہاں مجھے ٹھوس مطالعہ کا شوق ہے۔ اباجان کی لائبریری میں فرائیڈ۔ مارکس۔ ڈکنز، آگاتھا کرسٹی، کارلائل، پیٹر چینی، تھورن سمتھ اور دیگر مشہور مفکروں کی کتابیں موجود ہیں، میں نے سائیکولوجی پڑھنی شروع کی تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سب کچھ تو مجھے پہلے سے معلوم ہے۔ فلاسفی پڑھی تو محسوس ہوا جیسے یہ سب درست ہے، سوشل سائنس پڑھی تو لگا کہ واقعی یوں ہی ہونا چاہیے تھا، آخر ہمیں ایک نہ ایک روز تو جدید تہذیب کے دائرے میں آنا تھا۔ زمانے کو بیسویں صدی تک کبھی تو پہنچنا ہی تھا۔ میرے خیال میں میں کافی مطالعہ کر چکی ہوں۔ چنانچہ آج کل زیادہ نہیں پڑھتی۔

آپ نے پوچھا ہے کہ موجودہ ادیبوں میں مجھے کون کون پسند ہیں۔ سو ڈپٹی نذیر احمد، مولانا راشد الخیری اور پنڈت رتن ناتھ سرشار میرے محبوب مصنفین ہیں، شاعروں میں نظیر اکبرآبادی مرغوب ہیں۔ خواتین میں ایک صاحبہ جن کا نام انگریزی کے حروف سے شروع ہوتا ہے بہت پسند ہیں، انھوں نے صرف دو ناول لکھے ہیں۔ ان میں جدید اور قدیم زیورات و پارچہ جات، بیاہ شادی کی ساری رسوم اور طرح طرح کے کھانوں کے ذکر کو اس خوبصورتی سے سمو دیا ہے کہ یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ ناول کہاں ہے اور یہ چیزیں کہاں؟

ایک اور خاتون ہیں جو باوجود ماڈرن ہونے کے ترقی پسند نہیں ہیں۔ ان کے افسانے ان کی امنگیں ان کی دنیا سب کچھ صرف اپنے گھر کی فضا اور اپنے خاوند تک محدود ہے۔ مبارک ہیں ایسی ہستیاں۔ ان صاحبہ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا پھر پتہ چلا کہ ان کا رنگ مشکی ہے اور عینک لگاتی ہیں۔

آپ کی جن کزن کا کہنا ہے کہ انھوں نے مجھے کلب میں دیکھا تھا ذرا ان سے پوچھیے کہ وہ خود وہاں کیا کر رہی تھیں۔

یہ جن حمید صاحب کا آپ نے ذکر کیا ہے وہی تو نہیں جو گورے سے ہیں جن کے بال گھنگھریالے ہیں اور داہنے ابرو پر چھوٹا سا تل ہے گاتے اچھا ہیں۔ روٹھتے بہت جلدی ہیں۔ جی نہیں، میں انھیں نہیں جانتی۔ شاید میں اُن سے کبھی نہیں ملی۔

میری حقیر رائے میں تو آپ نے آرٹس پڑھ کر بڑا وقت ضائع کیا ہے۔ آپ کی بہن نے لکھا ہے کہ اب آپ کا ارادہ بزنس کرنے کا ہے۔ اگر یہی ارادہ تھا تو اتنے پڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔ عمر میں گنجائش ہو تو ضرور کسی مقابلے کے امتحان میں بیٹھ جائیے۔ ملازمت کی کوشش کیجیے۔ کیونکہ ملازمت ہر صورت میں بہتر ہے، اس کے بغیر نہ پوزیشن ہے نہ مستقبل۔ یہاں ڈپٹی کمشنر صاحب کی بیوی ساری زنانہ انجمنوں کی سکرٹری ہیں اور تقریباً ہر زنانے جلسے کی صدارت وہی کرتی ہیں۔ دوسرا فائدہ ملازمت

کا یہ ہے کہ انگلستان یا امریکہ جانے کے بڑے موقعے ملتے ہیں۔ مجھے یہ دونوں ملک دیکھنے کا ازحد شوق ہے۔
آپ نے موسیقی کا ذکر کیا ہے۔ اور مختلف راگ راگنیوں کے متعلق میری رائے پوچھی ہے۔ جی ہاں مجھے بھی تھوڑا بہت شوق ہے۔ جے جے ونتی سے آپ کو زیادہ دلچسپی نہیں ——— آپ کو تعجب ہوگا کہ جب دلی سے بھٹنڈہ آتے وقت میں نے جے جے ونتی سٹیشن کو دیکھا تو مجھے بھی پسند نہیں آیا۔ میاں کی ملہار سے آپ کی مراد غالباً خاندانی ملہار ہے۔ جی نہیں میں نے یہ نہیں سنی ویسے ایک خاندان کے افراد بھی میاں کہلاتے ہیں شاید یہ ملہار ان کی ہو۔
آپ کا فرمانا ہے کہ ٹوڈی صبح کی چیز ہے۔ لیکن میں نے لوگوں کو صبح وشام ہر وقت ٹوڈی بچہ ہائے ہائے کے نعرے لگاتے سُنا ہے۔
بھوپالی کے متعلق میں زیادہ عرض نہیں کر سکتی کیونکہ مجھے بھوپال جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ البتہ جوگ اور بھاگ کے بارے میں اتنا جانتی ہوں کہ جب یہ ملتے ہیں تو سوزِ عشق جاگ اٹھتا ہے (ملاحظہ ہو۔ "جاگ سوزِ عشق جاگ")
جی ہاں مجھے فنونِ لطیفہ سے بھی دلچسپی ہے، مصوری، بُت تراشی، موسیقی، فوٹوگرافی اور کروشیے کی بہت سی کتابیں ابا جان کی لائبریری میں رکھی ہیں۔ میں اچھی فلمیں کبھی نہیں چھوڑتی، ریڈیو پر بہت اچھا موسیقی کا پروگرام ہو تو ضرور سنتی ہوں۔ خصوصاً دوپہر کے کھانے پر۔ سیاسیات پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے، اس کے متعلق اپنی رائے اگلے خط میں لکھوں گی۔
آپ کو میری سہیلی کے بھائی نے میرے متعلق باتیں بتائی ہیں، ہاں یہ درست ہے کہ اسحٰق بھائی ہمارے ہاں آتے ہیں۔ لیکن بس پندرہ بیس منٹ سے زیادہ دیر کے لیے نہیں۔ اشفاق بھائی اور انور بھائی ہمارے ساتھ پہاڑ پر ضرور گئے تھے۔ لیکن ان کی کوٹھی ہم سے ایک میل دور تھی، پہاڑ کے دوسری طرف۔ لطیف بھائی اور کلیم بھائی فقط اپنی بہنوں کو چھوڑنے آتے ہیں۔ یہ غلط ہے کہ میں نے عفت کے بھائی کے ساتھ سفر کیا تھا۔ رحیم بھائی یونہی اسٹیشن پر مل گئے تھے۔ میں چھٹیوں پر گھر آرہی تھی، انھیں کوئی کام تھا۔ وہ اپنے ڈبے میں بیٹھے رہے، میں اپنے ڈبے میں۔ آپ جمیل بھائی اور مسعود بھائی سے پوچھ سکتے ہیں۔
آپ کی بہن مجھ سے خفا ہیں اور خط نہیں لکھتیں۔ ذرا ان سے کہئے کہ شکایت تو الٹی مجھے ان سے ہونی چاہیئے۔ انھوں نے رنّی کو وہ بات بتا دی جو میں نے انھیں بتائی تھی کہ رنّی کو نہ بتانا۔ خیر بتانے میں تو اتنا حرج نہ تھا لیکن میں نے ان سے تاکیداً کہا تھا کہ اس سے یہ نہ کہنا کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ اُس سے نہ کہنا۔
اُن سے یہ بھی پوچھیے کہ یہ کزن والی کون سی بات ہے۔ جس پر انھوں نے مجھ سے قسم لی تھی کہ رنّی تک نہ پہنچے۔ مجھے تو یاد نہیں۔ ویسے میری عادت نہیں کہ دانستہ طور پر کوئی بات کسی کو بتاؤں۔ اگر بھولے میں منہ سے نکل جائے تو اور بات ہے۔
خط گھر کی بجائے کالج کے پتے پر بھیجا کیجیے اور اپنے نام کی جگہ کوئی فرضی زنانہ نام لکھا کیجیے، یوں معلوم ہو جیسے کوئی سہیلی مجھے خط لکھ رہی ہے ——————— باقی سب خیریت ہے۔

فقط آپ کی بہن کی سہیلی

(ذرا اس خط کا کسی سے بھی ذکر مت کیجیے تاکیداً عرض ہے!)

سہیلی کو

پیاری سہیلی بھنیلی

اوئی دل پتھر کرلیاہے ، ایسا بھی کیا ، کبھی خیر سلا کے دو لفظ ہی بھیج دیا کرو ، وہی معاملہ ہوا کہ آنکھیں ہوئیں اوٹ تو دل میں آیا کھوٹ ۔

شاید تمھیں پتہ نہیں کہ میں پہاڑ پر گئی ہوئی تھی ۔ بُرا میرا تو وہاں بالکل دل نہیں لگا ، لوگ قدرتی نظارے قدرتی نظارے کی رٹ لگاتے ہیں ۔ میرا تو ہفتے میں جی اچاٹ ہو گیا ۔ نہ کوئی ڈھنگ کا سینما ہال ، نہ اللہ ماری کوئی کام کی کپڑوں کی یا زیوروں کی دُکان ۔ دو مہینے میں صرف آٹھ جوڑے سلوا سکی ۔ اور صرف ایک جوڑی سونے کے آویزے پسند آئے ۔ اس آنے جانے میں نگوڑا نیا گرم کوٹ بھی نہ سِل سکا ۔ اب سردیوں میں وہی پچھلے سال بنوایا ہوا کوٹ پہننا پڑے گا ۔ سچ تو یہ ہے کہ ساری گرمیوں میں ایک بھی نئے ڈیزائن کا جوڑا نہیں سلوا سکی ۔ کسی نئی فلم میں ہیروئن کے کپڑے دیکھوں تو کچھ بنواؤں بھی ۔

ایک بات بتاتی ہوں مگر وعدہ کرو کہ کسی سے نہیں کہوگی ۔ کیونکہ نکلی ہونٹوں چڑھی کوٹھوں ، وہ جو رشید ہے نا ـــــ اب تم مجھے چھیڑو گی ، اے ہٹو ، پہلے سُن بھی لو ، اُس کے چچا کالج میں پروفیسر بن کر آئے ہیں ۔ ہوں گے کوئی پنیتالیس چھیالیس برس کے ، میں اگلی سیٹ پر بیٹھتی ہوں ، چنانچہ حضرت کو غلط فہمی ہو گئی ۔ حالانکہ میں نے اِتنی سی بھی لفٹ نہیں دی ، سوائے اس کے کہ میں غور سے ان کی آنکھوں کو دیکھا کرتی تھی (آنکھیں اچھی ہیں) پروفیسروں کو کون غور سے نہیں دیکھتا ۔ کبھی کبھار ان سے علیحدگی میں سوال پوچھ لئے تو کیا ہوا ۔ کل تین یا چار مرتبہ اُن کے ساتھ چائے پی ، وہ بھی اُن کے بلانے پر ، عید پر انھوں نے چھوٹے موٹے تحفے دیئے جو ان کا دل رکھنے کے لئے قبول کرنے پڑے ۔ صرف ایک دو دفعہ اُن کے ساتھ پکچر دیکھی ۔ بس کیا تھا شاعری پر اُتر آئے ، کہنے لگے تم اب تک کہاں تھیں ۔ میری زندگی میں پہلے کیوں نہ آئیں ۔ حالانکہ ان کی زندگی کے شروع کے حصے میں تو میں پیدا بھی نہیں ہوئی تھی ۔ شکل سورت معمولی ہے ۔ گنجے بھی ہیں ۔ سُنا ہے کئیوں سے وعدہ خلافی کر چکے ہیں ۔ پانچ چھ سال کے بعد بڑے بوڑھوں میں کہلائیں گے ۔ تعجب ہے اس عمر میں بھلا کوئی کیا وعدہ کر سکتا ہے ۔

ناہید نے تو سب کے سامنے ان کی خبر لی ، انھیں جھوٹا ، ہٹ دھرم ، مکار اور نہ جانے کیا کیا کہا ، ان پر کوئی اثر نہ ہوا ، بعد میں معلوم ہوا کہ خیر سے ہاکی فٹ بال کے ریفری بھی ہیں اور اس قسم کے کلمات کے عادی ہو چکے ہیں ۔ دراصل ناہید بندی نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ ، کھٹ شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ، بالکل بلا سوچے سمجھے ، جیسے کہ بعض لڑکیاں اکثر کرتی ہیں ۔

ایک شام کو ان کے مجبور کرنے پر ان کے ساتھ سنیما گئی ، وہاں رشید اگلے درجے میں بیٹھا تھا ۔ نہ جانے چچا کو کیا سوجھا کہ بھتیجے کو بلا کر پاس بٹھا لیا اور مجھ سے اسی طرح باتیں کرتے رہے ۔ رشید کو خواہ مخواہ آگ لگ گئی ۔ رشید کے چچا کی اس حرکت پر مجھے سخت غصہ آیا ، انھوں نے نہ صرف میرا مستقبل کا پروگرام تباہ

کردیا بلکہ ایسی اچھی شام برباد کرکے رکھدی۔ آج کل رشید کی مجھ سے لڑائی ہے، کل میں نے فون کیا تو طعنے دینے لگا، بولا تم بے حد خطرناک ہو۔ عجیب الٹی منطق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی عورت بھی خطرناک نہیں ہوتی ــ یہ مرد ہی ہے جو کمزور ہوتا ہے۔ دونوں جائیں بھاڑ میں، سُنا ہے رشید زیبو کے پیچھے لگا ہوا ہے اور اس کا چچا سلّی کے پیچھے۔

زیبو تو تمھاری ہم جماعت تھی۔ بیچاری بڑی بنتی ہے۔ میں تو اُسے تب سے جانتی ہوں جب سے اُس کے متعلق کوئی چھوٹی سی افواہ تک نہیں اڑی تھی ــ پتہ نہیں کس بات پر اتراتی ہے ــ اُجڑا اجڑا حُلیہ، دبلی پتلی اتنی کہ اچھی طرح دیکھنے کے لئے دوبارہ دیکھنا پڑتا ہے۔ پچھلے سال کسی سیکنڈ لفٹننٹ سے واقفیت تھی۔ اس سال بھی سنا ہے کسی اور سیکنڈ لفٹننٹ کے ساتھ سکینڈل رہا۔ باربار اسے سیکنڈ لفٹننٹ ہی ملتا ہے، پہلا لفٹننٹ بھاگ جاتا ہوگا۔ کیا بتاؤں ان دنوں اِتنی بدل چکی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی۔ پچھلے ہفتے ایک پارٹی پر ملاقات ہوئی ــ میں نے نئے بندے اور نیا نکلس پہن رکھا تھا۔ پھوٹے منہ سے ان کے بارے میں ایک لفظ نہ نکلا، حالانکہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی، ادھر میں نے کئی مرتبہ جھوٹ موٹ اس کی چیزوں کی تعریف کی ہے۔ ملمع کی ہوئی چوڑیوں کو بار بار بجاتی تھی۔ ایسی اکل کھُری ندیدی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ سُنا ہے رشید اسے خوابوں کی ملکہ کہتا ہے، ضرور خوابوں میں ڈرتا ہوگا۔

سلّی غریب بائیس برس کی ہوچکی ہے اور اب تک کوئی نہیں ملا۔ میں نے تو کئی مرتبہ کہا کہ گزٹ بڑھا کرو۔ آج کل ترقی ملنے پر ادھیڑ عمر کے لوگ اکثر نئی شادی کر بیٹھتے ہیں، ایسے کئی مل جائیں گے۔

سُنا ہے اس کے لئے ایک رشتہ بیچ بیچ آیا تھا، کسی بڑے زمیندار کا جس کے پاس دودرجن گائیں بھینسیں تھیں اور جو وہسکی میں دودھ ملاکر پیا کرتا تھا۔ پھر جہیز کے معاملہ میں کچھ گڑبڑ ہوگئی۔

ان صاحبزادی کو بھی پَر لگ رہے ہیں، کیا تو جیسے زبان تھی ہی نہیں، کیا اب کتر کتر چلتی ہے۔ فرماتی ہیں میں تو سرخی اس لئے لگاتی ہوں کہ اور لڑکیوں میں نمایاں معلوم نہ ہوں ــ ایک اور فقرہ ملاحظہ ہو، کہتی ہیں ــــــ موا دل کیا ہے برف کا تودا ہے، اتنی جلدی پگھل جاتا ہے۔ یہ سب رشید کے چچا کا اثر ہے مجھے ان پروفیسر صاحب پر غصّہ ہے تو اس بات کا کہ ساری خرافات مجھ ہی کو سُناتے رہے ابا جان سے کچھ بھی نہیں کہا جیسے کہ خاندانی لوگوں میں دستور ہے۔ گنجے ہیں تو کیا ہوا۔ مرد اکثر گنجے ہوجاتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ان کی عمر زیادہ معلوم ہوتی ہے اگر آنکھوں کی طرف دیکھتے رہو تو صرف چالیس برس کے لگتے ہیں۔ خیر دفع کرو ان سب کو۔

بلّو کی منگنی ہونے والی ہے، میں نے چھیڑا کہ بلّو کا منگیتر پبلشر ہے۔ اس لئے انگوٹھی پر جملہ حقوق محفوظ ہیں ضرور لکھوائیں ــــــ

عفّو کی بات پکّی ہوگئی ہے، نہیں اُس نے منگیتر کو نہیں دیکھا ــ لیکن سنو گی تو خوش ہوگی کہ چھ سو روپیہ ماہوار پاتا ہے، اکلوتا ہے، بہن بھائی کے تفیئے سے پاک ہے۔ عفّو کے والدین نے اچھی طرح یقین کرلیا ہے کہ شراب نہیں پیتا اور کیا چاہیئے؟ اور ہاں لڑکے کی والدہ حج کرنے جارہی ہیں۔ عفّو نے تو یہاں تک سُنا ہے کہ ان کا ارادہ حج کے بعد وہیں رہ جانے کا ہے، خدا کرے یہ خبر سچ ہو۔

اچھا بہن تم اپنی سناؤ، کیا کیا مصروفیتیں ہیں۔ تمھاری خاموشی سے دال میں کالا نظر آتا ہے ـــــ دور ہو تو کیا، تِل تِل رتی رتی سب جانتی ہوں۔ اللہ وہ دن لائے کہ اپنی پیاری سہیلی کے ہاتھ رنگے ہوئے دیکھوں خدا سہیلی دے تو ایسی جس کی دسوں انگلیاں، دسوں چراغ۔

منو تو تمھیں یاد ہوگی۔ اس کی شادی پر ہم سب گئے تھے، سُنا ہے لڑکے نے اعتراض کیا کہ نہ تو رسوم ادا کی جائیں اور نہ باجا گاجا ہو، خاموشی سے سب کچھ ہو جائے ـ توبہ کیسا ہونق لڑکا ہوگا۔ شادی ہو رہی ہے یا کوئی چوری کر رہے ہیں۔ ولایت سے ابھی ابھی آیا ہے اس لئے دماغ درست نہیں ہوا۔ لیکن کون سنتا ہے رسمیں ساری ہوئیں، مانجھے بٹھانا، کنگنا باندھنا، مہندی لگانا، مسالا پسوانا، پانی بھروانا، ساچق بھیجنا، تمھیں خوشی ہوگی کہ مہر تیس ہزار مقرر ہوا ہے اور ڈیڑھ سو روپے جیب خرچ لکھا گیا ہے۔ منو کتنی خوش نصیب ہے۔ باقی کی رسمیں بھی ادا کی گئیں، چوتھی کھیلنا، دلہن کی جوتی دولھا کے کندھے پر لگانا، آرسی مصحف کرنا، دولھا کے سر پر بہنوں کا آنچل ڈالنا، دولھا کو زعفران کے بہانے مرچیں کھلا دینا، دولھا کے جوتے چرا لینا ـ پھر دولھا کو اُلٹی چارپائی سے گرا دینا۔ اس کی شیروانی پلنگ سے سی دینا، میراسنوں کا بیہودہ گانا اور خوب صورت گالیاں دینا۔ بڑا لطف رہا۔ دولھا بھی ایک چغد نکلا۔ جنم نہ دیکھا بوریا سپنے آئی کھاٹ۔ سُنا ہے کہ نکاح کے فوراً ہی بعد کہیں فرار ہوگیا۔ بڑی مشکلوں سے ڈھونڈھ کر لائے۔ پتہ نہیں آج کل کے لڑکے کیسے ہوگئے ہیں۔ یہی رسومات تو قوموں کے زندہ رہنے کے نشان ہیں۔ دولھا نے مہر میں بھی مین میخ نکالی کہ بیس ہزار کا جو جہیز لڑکی کو دے رہے ہیں۔ یہ اپنے پاس رکھئے اور تیس ہزار کی رقم کو کم کرکے مہر دس ہزار کر دیجئے۔ لاحول ولا قوۃ!

شادی میں کچھ لڑکے بھی تھے۔ ہمیں چھیڑنے لگے، ڈانٹا تو بولے سنگار کیوں کرتی ہو۔ یہ لوگ اتنا نہیں جانتے کہ ہم کپڑے اور زیور صرف ایک دوسری کو دکھانے کے لئے پہنتی ہیں موئے لڑکوں کو اس سے کیا۔

منو کی رخصت ہوگئی ـــــ خدا کرے کہ بنتے بنئے میں ہمیشہ بنی رہے۔ لیکن آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ افواہ ہے کہ اس کی ساس نندیں بڑی ظالم ہیں۔ پَر کا کوّا اور رائی کا پہاڑ بنانے کو ہر دم تیار ہیں۔ پر یہ بھی یہ مرحلہ تو ہر لڑکی کو طے کرنا ہے۔

رشید کے چچا بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کے متعلق ایک لطیفہ سنا کہ رنڈوے ہیں۔ مگر کوئی کہہ رہا تھا کہ بیوی زندہ ہیں۔ خیر مجھے اس سے کیا۔

اوئی کتنا لمبا خط لکھا ہے۔ لو اب خوش ہویا اب بھی روٹھی رہو گی۔ اب خط لکھو، مفصل سا ہو۔ کس کس کی نسبت ٹوٹی ہے۔ کس کس کے گھر شکر بٹی ہوئی ہے یا ہونے کا امکان ہے۔ ہماری جاننے والیوں میں سے کوئی سسرال سے لڑ کر آئی ہو۔ میرے متعلق کسی سے کوئی بات تو نہیں سُنی۔ ان دنوں کس کس کے سکینڈل چل رہے ہیں۔ کوئی نیا فلمی گانا پسند آیا؟ غرارے یا جمپر کا کوئی نیا ڈیزائن ـــــ ساری باتیں مفصل لکھنا۔

امید ہے کہ منشی فاضل کا امتحان پاس کر چکی ہوگی۔ کبھی آ کر مل ہی جاؤ۔ صرف چالیس پچاس میل کا تو فاصلہ ہے۔ فقط ـــــــــــ تمھاری دور افتادہ سہیلی

(شمارہ ۲۲-۲۳-۲۴ سنہ ۵۳ء)

مشتاق احمد یوسفی

تو نے پی ہی نہیں

میں نے سوال کیا "آپ کافی کیوں پیتے ہیں ؟"
انھوں نے جواب دیا "آپ کیوں نہیں پیتے ؟"
"مجھے اس میں سگار کی سی بو آتی ہے"
انھوں نے کہا "اگر آپ کا اشارہ اس کی سوندھی سوندھی خوشبو کی طرف ہے تو یہ آپ کی قوت شامہ کی کوتاہی ہے"
گو کہ ان کا اشارہ صریحاً میری ناک کی طرف تھا، تاہم رفعِ شر کی خاطر میں نے کہا "تھوڑی دیر کے لئے یہ مان لیتا ہوں کہ کافی میں سے واقعی بھینی بھینی لپٹ آتی ہے۔ مگر یہ کہاں کی منطق ہے کہ جو چیز ناک کو پسند ہو وہ حلق میں انڈیل لی جائے۔ اگر ایسا ہی ہے تو کافی کا عطر کیوں نہ کشید کیا جائے تاکہ ادبی محفلوں میں ایک دوسرے کے لگایا کریں۔"
تڑپ کر بولے "صاحب! میں ماکولات میں معقولات کا دخل جائز نہیں سمجھتا، تاوقتیکہ اس گھپلے کی اصل وجہ تلفظ کی مجبوری نہ ہو۔ کافی کی مہک سے لطف اندوز ہونے کے لئے ایک تربیت یافتہ ذوق کی ضرورت ہے۔ یہی سوندھا پن لگی ہوئی کھیر اور دھنگار سے رائتے میں ہوتا ہے۔"
میں نے معذرت کی "کھرچن اور دھنگار دونوں سے مجھے متلی ہوتی ہے۔"
فرمایا "تعجب ہے! یو پی میں تو شرفا بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔"
"میں نے اسی بنا پر ہندوستان چھوڑا!"
جھانسے ہوکر کہنے لگے "آپ قائل ہو جاتے ہیں تو کج بحثی کرنے لگتے ہیں۔"
جواباً عرض کیا "گرم ممالک میں بحث کا آغاز صحیح معنوں میں قائل ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ دانستہ دل آزاری ہمارے مشرب میں گناہ ہے۔ لہٰذا ہم اپنی اصل رائے کا اظہار صرف نشہ اور غصہ کے عالم میں کرتے ہیں۔ خیر، یہ تو جملہ معترضہ تھا، لیکن اگر یہ سچ ہے کہ کافی خوش ذائقہ ہوتی ہے تو کسی بچے کو پلا کر اس کی صورت دیکھ لیجیے۔"
جھلا کر بولے "آپ معصوم بچوں کو بحث میں کیوں گھسیٹتے ہیں؟"
میں نے پوچھا "آپ لوگ ہمیشہ بچوں سے پہلے لفظ 'معصوم' کیوں لگاتے ہیں؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ کچھ بچے گنہگار بھی ہوتے ہیں؟ خیر آپ کو بچوں پر اعتراض ہے تو بلی کو لیجیے۔"

"بلّی ہی کیوں؟ بکری کیوں نہیں؟" وہ سچ مچ مچلنے لگے
میں نے سمجھایا "بلّی اس لئے کہ جہاں تک پینے کی چیزوں کا تعلق ہے بچّے اور بلّیاں بُرے بھلے کی کہیں بہتر تمیز رکھتے ہیں۔"
ارشاد ہوا "کل کو آپ یہ کہیں گے کہ چونکہ بچّوں اور بلّیوں کو پکّے گانے پسند نہیں آسکتے اس لئے وہ بھی لغو ہیں۔"
میں نے انھیں یقین دلایا "میں ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا۔ پکّے راگ انہیں کی ایجاد ہیں۔ آپ نے بچّوں کا رونا اور بلّیوں کا لڑنا . . . . .
بات کاٹ کر بولے "بہرحال ثقافتی مسائل کا فیصلہ ہم بچّوں اور بلّیوں پر نہیں چھوڑ سکتے۔"
آپ کو یقین آئے یا نہ آئے مگر یہ واقعہ ہے کہ جب بھی میں نے کافی کے بارے میں استصواب رائے عامہ کیا اس کا انجام اسی قسم کا ہوا شائقین میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹی جرح کرنے لگتے ہیں۔ اب میں اسی نتیجے پر پہونچا ہوں کہ کافی اور کلاسیکی موسیقی کے بارے میں استفسار رائے عامہ کرنا بڑی ناعاقبت اندیشی ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بدمذاقی ہے جیسے کسی نیک مرد کی آمدنی یا خوب صورت عورت کی عمر دریافت کرنا۔ (اس کا یہ مطلب نہیں کہ نیک مرد کی عمر اور خوب صورت عورت کی آمدنی دریافت کرنا خطرے سے خالی ہے) زندگی میں صرف ایک شخص ایسا ملا جو واقعی کافی سے بیزار تھا۔ لیکن اس کی رائے اس لحاظ سے زیادہ قابلِ التفات نہیں کہ وہ ایک مشہور کافی ہاؤس کا مالک نکلا۔
ایک صاحب اپنی پسند کے جواز میں صرف یہ کہہ کر چپ ہو گئے کہ:-

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافی لگی ہوئی

میں نے وضاحت چاہی تو کہنے لگے "دراصل یہ عادت کی بات ہے۔ یہ کم بخت کافی بھی روایتی چنے اور ڈومنی کی طرح ایک دفعہ منہ لگنے کے بعد پھر ملائے نہیں چھوٹتی۔ کیوں نا؟" اس مقام پر مجھے اپنی معذوری کا اعتراف کرنا پڑا کہ بچپن ہی سے میری صحت خراب اور صحبت اچھی رہی۔ اس لئے ان دونوں خوب صورت بلاؤں سے محفوظ رہا۔
بعض احباب تو اس سوال سے چراغ پا ہو کر ذاتیات پر اتر آتے ہیں۔ بزیں نہیں کہتا کہ وہ جھوٹے الزام لگاتے ہیں۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ جھوٹے الزام کو سمجھدار آدمی نہایت اعتماد سے ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ مگر سچے الزام سے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ اس ضمن میں جو متضاد باتیں سننا پڑتی ہیں ان کی دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔
ایک کرم فرما نے میری بیزاری کو محرومی پر محمول کرتے ہوئے فرمایا۔

ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

ان کی خدمت میں حلفیہ عرض کیا کہ دراصل بیسیوں گیلن کافی پینے کے بعد ہی یہ سوال کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ دوسرے صاحب نے ذرا کھل کر پوچھا کہ کہیں کافی سے چڑھ کی اصل وجہ معدے کے وہ داغ (ULCERS) تو نہیں جن کو میں دو سال سے سینچ رہا ہوں اور جو کافی کی تیزابیت سے جل اٹھتے ہیں۔
اور اس کے بعد وہ مجھے نہایت تشخیصی ناک نظروں سے گھورنے لگے۔
استصواب رائے عامہ کا حشر آپ دیکھ چکے۔ اب مجھے اپنے تاثرات پیش کرنے کی اجازت دیجئے۔ میرا ایمان ہے کہ قدرت کے کارخانے میں کوئی شے بے کار نہیں۔ انسان غور و فکر کی عادت ڈالے۔ یا محض عادت ہی ڈال لے) تو ہر بری چیز میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور نکل آتی ہے۔ مثال کے طور پر حقّہ ہی کو لیجئے۔ معتبر بزرگوں سے سنا ہے کہ حقّہ پینے سے تفکرات پاس نہیں پھٹکتے۔ بلکہ میں تو یہ عرض کروں گا کہ اگر تمباکو خراب ہو تو تفکرات ہی پر کیا موقوف ہے کوئی بھی پاس نہیں پھٹکتا۔ اب دیگر ملکی اشیائے خورد و نوش پر نظر ڈالئے۔

مرچیں کھانے کا ایک آسانی سے سمجھ میں آنے والا فائدہ یہ ہے کہ ان سے ہمارے مشرقی کھانوں کا اصل رنگ اور مزا دب جاتا ہے۔ خمیرہ گاؤزباں اس لئے کھاتے ہیں کہ بغیر راشن کارڈ کے شکر حاصل کرنے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے۔ جوشاندہ اس لئے گوارا ہے کہ اس سے نوزائیدہ ملکی صنعت کو فروغ ہوتا ہے بلکہ نفسِ امارہ کو مارنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ شلغم اس لئے زہر مار کرتے ہیں کہ ان میں وٹامن ہوتا ہے لیکن جدید طبی ریسرچ نے ثابت کر دیا ہے کہ کافی میں سوائے کافی کے کچھ نہیں ہوتا۔ اہلِ ذوق کے نزدیک یہی اس کی خوبی ہے۔

معلوم نہیں کافی کیوں، کب اور کس مردم آزار نے دریافت کی۔ لیکن یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یونانیوں کو اس کا علم نہیں تھا۔ اگر انھیں ذرا بھی علم ہوتا تو چائے کی طرح یہ بھی یونانی طب کا جزوِ غالب ہوتی۔ اس قیاس کو اس امر سے مزید تقویت ہوتی ہے کہ قصبوں میں کافی کی بڑھتی ہوئی کھپت کی غالباً ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عطائیوں نے "اللہ شافی اللہ کافی" کہہ کر مؤخر الذکر کا سفوف اپنے نسخوں میں لکھنا شروع کر دیا ہے۔ زمانہ قدیم میں اس قسم کی جڑی بوٹیوں کا استعمال عداوت اور عقدِ ثانی کے لئے مخصوص تھا۔ چونکہ آج کل ان دونوں باتوں کو معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ اس لئے اسے صرف اظہارِ خلوص باہمی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

سنا ہے کہ چائے کے بڑے خوب صورت باغ ہوتے ہیں۔ یہ بات یوں بھی سچ معلوم ہوتی ہے کہ چائے اگر کھیتوں میں پیدا ہوتی تو ایشیائی ممالک میں اتنی افراط سے نہیں ملتی بلکہ غلّہ کی طرح غیر ممالک سے درآمد کی جاتی۔ میری معلومات عامہ محدود ہیں۔ مگر قیاس یہی کہتا ہے کہ کافی بھی زمین ہی سے اگتی ہوگی کیونکہ اس کا شمار ان نعمتوں میں نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں پر آسمان سے براہِ راست نازل کرتا ہے تاہم میری چشمِ تخیل کو کسی طور یہ باور نہیں آتا کہ کافی باغوں کی پیداوار ہو سکتی ہے اور اگر کسی ملک کے باغوں میں یہ چیز پیدا ہوتی ہے تو اللہ جانے وہاں کے جنگلوں میں کیا اگتا ہوگا؟ ایسے اربابِ ذوق کی کمی نہیں جنھیں کافی اس وجہ سے عزیز ہے کہ یہ ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوتی۔ مجھ سے پوچھئے تو مجھے اپنا ملک اس لئے اور بھی عزیز ہے کہ یہاں کافی پیدا نہیں ہوتی۔

میں مشروبات کا "پارکھ" نہیں ہوں۔ لہٰذا مشروب کے اچھے یا برے ہونے کا اندازہ ان اثرات سے لگاتا ہوں جو اسے پینے کے بعد رونما ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے میں نے کافی کو شراب سے بدرجہا بدتر پایا۔ میں نے دیکھا ہے کہ شراب پی کر سنجیدہ حضرات بے حد غیر سنجیدہ گفتگو کرنے لگتے ہیں جو بہت جاندار ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے کافی پی کر غیر سنجیدہ لوگ انتہائی سنجیدہ گفتگو کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے سنجیدگی سے چڑ نہیں بلکہ عشق ہے۔ اسی لئے میں سنجیدہ آدمی کی مسخرگی برداشت کر لیتا ہوں، مگر مسخرے کی سنجیدگی کا روادار نہیں۔ شراب کے نشے میں لوگ بلاوجہ جھوٹ نہیں بولتے۔ کافی پی کر لوگ بلاوجہ سچ نہیں بولتے۔ شراب پی کر آدمی اپنا غم اوروں کو دیتا ہے مگر کافی پینے والے اوروں کے فرضی غم اپنا لیتے ہیں۔ مدہوش ہونے کے بعد سے خمار ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال دیتے ہیں کافی پی کر حلیف بھی حریف بن جاتے ہیں۔

یہاں مجھے کافی سے اپنی بیزاری کا مخلصانہ اظہار مقصود ہے۔ لیکن اگر کسی صاحب کو یہ سطور شراب کا اشتہار معلوم ہوں، تو اسے زبان و بیان کا عجز تصور فرمائیں۔ کافی کے طرفدار اکثر یہ کہتے ہیں کہ یہ بے نشے کی پیالی ہے، بالفرضِ محال یہ گزارشِ احوالِ واقعی یا دعویٰ درست ہے تو مجھے ان سے دلی ہمدردی ہے۔ مگر اتنے کم داموں میں آخر وہ اور کیا چاہتے ہیں؟

کافی ہاؤس کی شام کا کیا کہنا! فضا میں ہر طرف ذہنی کہر چھایا ہوا ہے۔ شوروشغب کا یہ عالم کہ آواز سنائی نہیں دیتی اور بار بار دوسروں سے پوچھنا پڑتا ہے کہ ہم نے کیا کہا۔ ہر میز پر تشنگانِ علم کافی پی رہے ہیں اور غروبِ آفتاب سے غرارے تک، یا عوام اور آم کے خواص پر "انقلاب زندہ باد" والے لہجے میں بحث کر رہے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے کافی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ اور تمام بنی نوعِ انسان کو ایک برادری سمجھنے والے تھوڑی سی دیر بعد ایک دوسرے کی ولدیت کے بارے میں اپنے شکوک کا سلیس اردو میں

اظہار کرنے لگتے ہیں جس سے بیروں کو کلیتاً اتفاق ہوتا ہے۔ لوگ روٹھ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں لیکن یہ سوچ کر پھر بیٹھ جاتے ہیں کہ۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ گھر جائیں گے
گھر میں بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

کافی پی پی کر سماج کو کوسنے والے ایک انگلیچول نے مجھے بتایا کہ کافی سے دل کا کنول کھل جاتا ہے اور آدمی چہکنے لگتا ہے۔ میں اس رائے سے سو فیصد متفق ہوں۔ کوئی معقول آدمی یہ سیال پی کر اپنا منہ بند نہیں رکھ سکتا۔ ان کا یہ دعویٰ بھی غلط نہیں معلوم ہوتا کہ کافی پینے سے بدن میں چستی آتی ہے جبھی تو لوگ دوڑ دوڑ کر کافی ہاؤس جاتے ہیں۔ اور گھنٹوں وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔

بہت دیر تک وہ یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ کافی نہایت مفرح ہے اور دماغ کو روشن کرتی ہے اس کے ثبوت میں انھوں نے اپنی مثال دی کہ "ابھی کل کا واقعہ ہے۔ میں دفتر سے گھر بے حد نڈھال پہونچا۔ بیگم بڑی مزاج داں ہیں۔ فوراً کافی کا TEA POT لاکر سامنے رکھ دیا۔

میں ذرا چکرایا" پھر کیا ہوا؟" میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔
"میں نے دودھ دان میں سے کریم نکالا"۔ انھوں نے جواب دیا۔
میں نے پوچھا "شکردان میں سے کیا نکلا؟"
فرمایا "شکر نکلی، اور کیا ہاتھی گھوڑے نکلتے؟"
مجھے غصہ تو بہت آیا مگر کافی کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

GOVT GIRLS COLLEGE SRINAGAR ACC. No 15227 LIBRARY

عمدہ کافی بنانا بھی کیمیا گری سے کم نہیں۔ یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ دونوں کے متعلق یہی سننے میں آیا ہے کہ بس ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ ہر ایک کافی ہاؤس اور خاندان کا ایک مخصوص نسخہ ہوتا ہے جو سینہ بہ سینہ، حلق بہ حلق منتقل ہوتا رہتا ہے۔ مشرقی افریقہ کے اس انگریز افسر کا نسخہ تو سبھی کو معلوم ہے جس کی مزے دار کافی کی سارے ضلع میں دھوم تھی۔ ایک دن اس نے ایک نہایت پُر تکلف دعوت کی۔ جس میں اس کے حبشی خانساماں نے بہت ہی خوش ذائقہ کافی بنائی۔ انگریز نے بہ نظر حوصلہ افزائی اس کو معزز مہمانوں کے سامنے طلب کیا اور کافی بنانے کی ترکیب پوچھی۔

حبشی نے جواب دیا کہ "بہت ہی سہل طریقہ ہے۔ میں بہت سا کھولتا ہوا پانی اور دودھ لیتا ہوں۔ پھر اس میں کافی ملا کر دم کرتا ہوں"۔

"لیکن اسے حل کیسے کرتے ہو۔ بہت مہین چھنی ہوتی ہے"
"حضور کے موزے میں چھانتا ہوں"
"کیا مطلب؟ کیا تم میرے قیمتی ریشمی موزے استعمال کرتے ہو؟" آقا نے غضبناک ہو کر پوچھا۔
خانساماں سہم گیا "نہیں سرکار! میں آپ کے صاف موزے کبھی استعمال نہیں کرتا"۔

سچ عرض کرتا ہوں کہ میں کافی کی تندی اور تلخی سے ذرا نہیں گھبراتا۔ بچپن ہی سے یونانی دواؤں کا عادی رہا ہوں، اور قوت برداشت اتنی بڑھ گئی ہے کہ کڑوی سے کڑوی

گولیاں کھا گئے بے مزہ نہ ہوا!

لیکن کڑواہٹ اور مٹھاس کی آمیزش سے جو معتدل قوام بنتا ہے وہ میری برداشت سے باہر ہے۔ میری انتہا پسند طبیعت اس میٹھے

زہر کی تاب نہیں لا سکتی۔ لیکن دقت یہ آن پڑتی ہے کہ میں میزبان کے اصرار کو عداوت اور وہ میرے انکار کو تکلف پر محمول کرتے ہیں۔ لہٰذا جب وہ میرے کپ میں شکر ڈالتے وقت اخلاقاً پوچھتے ہیں

"ایک چمچہ یا دو ——؟"

تو مجبوراً یہی گذارش کرتا ہوں کہ میرے لئے شکردان میں کافی کے دو چمچے ڈال دیجئے۔

صاف ہی کیوں نہ کہہ دوں کہ جہاں تک اشیائے خورد و نوش کا تعلق ہے میں تہذیب حواس کا قائل نہیں۔ میں یہ فوری فیصلہ ذہن کے بجائے زبان پر چھوڑنا پسند کرتا ہوں۔ پہلی نظر میں جو محبت ہو جاتی ہے اس میں بالعموم نیت کا فتور کارفرما ہوتا ہے۔ لیکن کھانے پینے کے معاملے میں میرا یہ نظریہ ہے کہ پہلا ہی لقمہ یا گھونٹ فیصلہ کن ہوتا ہے بدذائقہ کھانے کی عادت کو ذوق میں تبدیل کرنے کے لئے بڑا پتّا مارنا پڑتا ہے۔ مگر میں اس سلسلہ میں برسوں تلخئ کام و دہن گوارا کرنے کا حامی نہیں، تاوقتیکہ اس میں بیوی کا اصرار یا کوئی مجبوریاں شامل نہ ہوں۔ بنابریں، میں ہر کافی پینے والے کو جنتی سمجھتا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ جو لوگ عمر بھر ہنسی خوشی یہ عذاب جھیلتے رہے ان پر دوزخ اور جہیم حرام ہیں ——!

کافی امریکہ کا قومی مشروب ہے۔ میں اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتا کہ امریکی کلچر کافی کے زور سے پھیلا یا کافی کلچر کے زور سے رائج ہوئی۔ یہ بعینہٖ ایسا سوال ہے کہ جیسے کوئی بے ادب یہ پوچھ بیٹھے کہ "غبار خاطر" چائے کی وجہ سے مقبول ہوئی یا چائے "غبار خاطر" کے باعث؟ ایک صاحب نے مجھے لاجواب کرنے کے لئے یہ دلیل پیش کی کہ امریکہ میں تو کافی اس قدر عام ہے کہ جیل میں بھی پلائی جاتی ہے، میں نے کہا کہ جب خود قیدی اس پر احتجاج نہیں کرتے تو ہمیں کیا پڑی کہ وکالت کریں۔ پاکستانی جیلوں میں بھی قیدیوں کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا جائے تو انسداد جرائم میں کافی مدد ملے گی —— پھر انھوں نے بتلایا کہ وہاں لاعلاج مریضوں کو بشاش رکھنے کی غرض سے کافی پلائی جاتی ہے —— کافی کے سریع التاثیر ہونے میں کیا کلام ہے۔ میرا خیال ہے کہ دم نزع حلق میں پانی چوانے کے بجائے کافی کے دو چار قطرے ٹپکا دیئے جائیں تو مریض کا دم آسانی سے نکل جائے گا —— بخدا! مجھے تو اس تجویز پر بھی اعتراض نہ ہوگا کہ گنہگاروں کی فاتحہ کافی پر دلائی جائے۔

یہ درست ہے کہ کھانے کے معاملے میں چینی قدرے غیر محتاط واقع ہوئے ہیں، اور غذا ؤں کے بے دریغ انتخاب نے انھیں خاصا رسوا کیا ہے۔ لیکن جہاں تک پینے کی چیزوں کا تعلق ہے ہم نے ان کے متعلق کوئی بری خبر نہیں سنی۔ ان کی رچی ہوئی حس شامہ کی داد دیجئے کہ نہ منگول حکمرانوں کا جبر و تشدد انھیں پنیر کھانے پر مجبور کر سکا اور نہ امریکہ انھیں کافی پینے پر آمادہ کر سکا۔ تاریخ شاہد ہے ان کی نفاست نے سخت قحط کے زمانے میں بھی افیم اور کمیونزم کو پنیر اور کافی پر ترجیح دی۔

ہمارا منشا امریکی یا چینی عادات پر نکتہ چینی نہیں ہے۔ ہر آزاد قوم کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ اپنے منہ اور معدے کے ساتھ جیسا سلوک کرنا چاہے بے روک ٹوک کرے۔ اس کے علاوہ، جب دوسری قومیں ہماری رساول، نہاری اور فالودے کا مذاق نہیں اڑاتیں تو ہم "دخل در ماکولات" کرنے والے کون؟ بات دراصل یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں پیاس بجھانے کے لئے پانی کے علاوہ ہر رقیق شے استعمال ہوتی ہے۔ سنا ہے جرمنی میں (جہاں قومی مشروب بیر ہے) ڈاکٹر بدرجہ مجبوری بہت ہی تندرست و توانا افراد کو خالص پانی پینے کی اجازت دیتے ہیں، لیکن جن کو شب زندہ داری کا چسکا لگ جاتا ہے وہ راتوں کو چھپ چھپ کر پانی پیتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ پیرس کے کیفوں میں رنگین مزاج فنکار یوروپ کی تہذیب کو چڑانے کی غرض سے کھلم کھلا پانی پیا کرتے تھے۔

مشرقی و مغربی مشروبات کا موازنہ کرنے سے پہلے یہ بنیادی اصول ذہن نشین کر لینا ازبس ضروری ہے کہ ہمارے یہاں پینے کی

چیزوں میں کھانے کی خصوصیات ہوتی ہیں ۔ اپنے قدیم مشروبات مثلاً یخنی، سویّاں، ستو اور فالودے پر نظر ڈالئے تو یہ فرق واضح ہو جاتا ہے ستو اور فالودے کو خالصتاً لغوی معنوں میں نہ آپ کھا سکتے ہیں اور نہ پی سکتے ہیں ۔ بلکہ دنیا میں اگر کوئی ایسی شے ہے جسے آپ بامحاورہ اردو میں بیک وقت کھا پی سکتے ہیں تو یہی ستو اور فالودہ ہے جو ٹھوس غذا اور ٹھنڈے شربت کے درمیان ایک ناقابلِ بیان سمجھوتہ ہے ۔ لیکن آج کل ان مشروبات کا استعمال خاص خاص تقریبوں پر ہی کیا جاتا ہے ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اب ہم نے علاوت نکالنے کا ایک اور مہذب طریقہ اختیار کر لیا ہے ۔

آپ کے ذہن میں خدانخواستہ یہ شبہ پیدا ہو گیا ہو کہ راقم السطور کافی کے مقابلے میں چائے کا طرفدار ہے تو مضمون ختم کرنے سے پہلے اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں ۔ میں کافی سے اس لئے بیزار نہیں ہوں کہ مجھے چائے عزیز ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کافی کا جلا چلائے پھونک پھونک کر پیتا ہے ؎

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چائے کے ارماں ہوں گے

(شمارہ ۹۳-۹۲ ۱۹۵۹ء)

مقتل صاحب

(صفحہ ۹۵۲ سے آگے)

کی طویل نظم جوست پد "چنڈول" یا "چنڈال" پر لکھی گئی ہے ، سننے لگتے ہیں ۔ ساتھ ہی یہ خیال ستا رہا ہے ۔ آج اگر لیکچر تیار کئے بغیر کلاس روم میں چلے گئے تو بڑی خفت اٹھانا پڑے گی ۔

نظم کے خاتمے پر اطمینان کا سانس لیتے ہیں ، مگر مقتل صاحب یہ کہہ کر کہ اس نظم کا دوسرا باب شام کو سنائیں گے سارا مزا کرکرا کر دیتے ہیں ۔

اس شام کو کسی دوست کے ہاں پناہ لینی پڑتی ہے ۔ اور وہ ساری شامیں بے اختیار یاد آجاتی ہیں جو مقتل صاحب سے بچ نکلنے کے لئے ہم نے عجیب و غریب مقامات میں گذاریں ۔ لیکن اکثر احتیاط اور کوشش کے باوجود پکڑے گئے ۔ مثلاً ایک شام جب ہم انھیں سامنے سے آتے ہوئے دیکھ کر اپنے دھوبی کے گھر جا گھسے ۔ انھوں نے شب خون مار کر ہمیں وہاں سے برآمد کیا ، اور اپنے گھر لے جا کر آٹھ رباعیاں ، بارہ قطعے اور چھ غزلیں ، سنائیں ۔ اور پھر وہ شام جب ہم میونسپل پارک میں ٹہل رہے تھے کہ یک لخت ایک جھاڑی کے پیچھے سے وہ نمودار ہوئے اور فرمایا ؎

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
بچ جائیں گے کہاں پہ وہ ایسے کہاں کے ہیں

اکثر تنہائی میں جب اپنی بے لبسی پر غور کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مقتل صاحب سے نجات حاصل کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے یا تو اپنے خرچ پر انھیں ایک مستقل سامع بہم پہنچائیں ، یا ایک رات یہ شہر چھوڑ کر کسی دوسرے میں جا بسیں ۔ پھر خیال آتا ہے اگر مقتل صاحب وہاں بھی آدھمکے تو پھر کیا کریں گے !

(شمارہ ۹۸ ۱۹۵۹ء)

فکر تونسوی

علم لازوال دولت ہے

جس رات رانی پیدا ہوئی۔ ستاروں کی چال مدہم تھی۔ اور خدا سویا ہوا تھا اور میں جاگ رہا تھا۔
ہم دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ باپ اور بیٹی نے پہلی بار ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بیٹی نے پوچھا
"غوں غوں غوں —!" یعنی کون ہو تم؟"
میں نے جواب دیا — "من آنم کہ من دانم۔ یعنی میں تمھارا باپ ہوں!"
بیٹی نے سوال کیا۔ "باپ کیا ہوتا ہے؟"
میں نے اسے سمجھایا۔ جو پیار کرتا ہے۔ اپنے بچوں کو ہیرے کی انگوٹھیاں سمجھتا ہے۔ اور ریشم واطلس میں لپیٹ لپیٹ کر رکھتا ہے۔ وہ انھیں پالتا ہے اور وہ بڑھتے ہیں۔ وہ کماتا ہے۔ بچے کھاتے ہیں۔ وہ کپڑے لاتا ہے۔ بچے پہنتے ہیں۔ وہ کھلونے لاتا ہے بچے توڑتے ہیں۔ وہ مناتا ہے بچے روتے ہیں۔ وہ چیختا ہے۔ بچے چلاتے ہیں۔ وہ ہنستا ہے بچے ناچتے ہیں

بیٹی نے آنکھیں مٹکا کر کہا — "باپ اچھی چیز معلوم ہوتا ہے۔"
میں نے کہا۔ "ہاں! اور جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو میں تمھیں لیڈی ڈاکٹر بھی بناؤں گا۔"
رانی نے کہا۔ "غوں غوں غوں! (یعنی مجھے منظور ہے)"

یہ سارا معاملہ زبانی طے ہوا۔ زبانی معاملہ ٹوٹ جائے تو قانون کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر میں رانی کا گلا گھونٹ دیتا۔ تو شاید قانون کا مہذب ہاتھ میرا بھی گلا گھونٹ دیتا۔ لیکن اگر میں رانی کو لیڈی ڈاکٹر بنانے والا معاہدہ توڑ دیتا تو قانون میرا منہ تکتا رہ جاتا۔ قانون کے اختیارات محدود ہیں۔ وہ صرف انسان کی موت کا ذمہ لے سکتا ہے۔ زندگی کا نہیں۔
سات سال تک میں یہ معاہدہ نہیں توڑ سکا۔ لیکن اب اسے توڑ دینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ تجربہ نے بتایا ہے۔ کہ کسی آدمی کو جیب کترنا۔ بلیک مارکیٹیا، رشوت خور اور جوتے باز بنانا تو آسان ہے۔ مگر لیڈی ڈاکٹر بنانا آسان نہیں ہے۔ لیڈی ڈاکٹر وہی لڑکی ہو سکتی ہے۔ جس کا باپ جیب کترا ہو۔ اور اپنی حالت یہ ہے کہ ہندوستان کا ایک ادیب ہوں — جیب کٹوا تو سکتا ہوں — کاٹ نہیں سکتا۔

لیکن رانی بچوں کی طرح لیڈی ڈاکٹر بننے پر بضد ہے۔ حالانکہ بچے کھلونوں کے لئے ضد کرتے ہیں ٹافی کے لئے ضد کرتے ہیں۔ انگور کے ایک دانے کے لئے ضد کرتے ہیں۔ مگر لیڈی ڈاکٹر کوئی ٹافی یا انگور کا دانہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک باقاعدہ اور سنجیدہ عمل کا نام ہے اور یہ عمل کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔

دو سال کی عمر میں ہی رانی نے دیوان غالب۔ مکالمات افلاطون اور چیخوف کی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اور پڑھنے کے بعد پھاڑ ڈالیں۔ مرقع چغتائی کی تمام تصویروں میں اس نے نقائص نکالے۔ اور ان پر میرے پین اور پنسل سے رنگ ٹچنگ کر دی۔ چغتائی صاحب میرے گھر آ کر اپنے مرقع چغتائی کی حالتِ زار دیکھ سکتے ہیں۔ رسالوں، کاپیوں، دیواروں، کرسیوں اور ٹرنکوں پر اس نے تیسرے ہی سال مشق سخن شروع کر دی تھی۔ اور ان منحنی لکیروں، حرفوں اور ہندسوں میں شاید اس نے مابعد الطبیعات کے مسائل مرقوم کر دیئے تھے۔ وہ سوا ان انک کی نیلی شیشی اٹھاتی۔ اور اسے میز پوش اور بستر کی چادروں پر اس آسانی سے الٹ دیتی جیسے وہ چادریں نہ ہوں، بلکہ ڈرائنگ کی کاپیاں ہوں۔ حالانکہ ڈرائنگ کی کاپیوں اور چادروں کے نرخ میں واضح فرق ہوتا ہے۔

تین ہی سال میں یہ حالت ہو گئی کہ گھر میں۔ بازار میں۔ گلی محلے میں۔ عورتوں اور بچوں میں۔ بوڑھوں میں اور جوانوں میں میرے دوستوں اور بیوی کی سہیلیوں میں۔ چھابڑی والے کے پاس۔ دھوبی کے ہاں، اس بھیا کی زبان پر جو ایک ایک آنہ کے چار چار لبکٹ بیچنے کے لئے گلی میں آتا تھا، وہ بازی گر جو اپنے صندوق نما اسٹوڈیو میں سے بچوں کو لندن۔ دلی اور کلکتہ کی سیر کراتا تھا ـــــ غرض کہ چار دانگ عالم میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ رانی کا ارادہ لیڈی ڈاکٹر بننے کا ہے۔

اور پانچویں سال تو میرا ماتھا ٹھنک گیا۔ پانی سر سے گزرتا جا رہا تھا۔ اور میں سو رہا تھا۔ اور خدا جاگ رہا تھا۔ اور ستارے تو کہیں دور دور تک دکھائی نہیں دیتے تھے۔

چنانچہ میں نے ایک دن تنگ آ کر بیوی سے کہا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے"؟

بیوی نے آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر کر لاتے ہوئے کہا

"بیٹی خاندان کا نام روشن کرے گی۔ بھگوان ایسی بھاگوں بھری بیٹی ہر ایک کو دے!"

"لیکن سنو!"۔ میں نے بیوی کو خوابِ غفلت یعنی نشانوں سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "دوسروں کی بیٹیاں جائیں بھاڑ میں۔ مجھے تو اپنی ہی بیٹی لیڈی ڈاکٹر بنتی دکھائی نہیں دیتی۔ اور یہ جتنا پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ اس کی بنیاد ایک کھوکھلے محاذ پر رکھی جا رہی ہے"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ رانی ایک ایسی سوہنی ہے۔ جو حالات کے طوفانِ باد و باراں میں کچے گھڑے پر تیر رہی ہے۔ علم کا دریائے چناب بپھرا ہوا ہے۔ اور وہ اس کچے گھڑے کو مع سوہنی کے ڈبو دے گا۔ اور دوسرے کنارے پر جو مہینوال کھڑا ہوگا ہماری رانی کا لیڈی ڈاکٹر بنا ہوا دھونی رمائے بیٹھا ہے۔ نئے مطلع کھل جانے پر اپنے عشق کے آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔!"

بیوی نے منہ بنا کر کہا:- "بات کا بتنگڑ مت بناؤ۔ بلکہ سیدھے سبھاؤ جاؤ۔ اور اسے کسی اسکول میں داخل کرا آؤ۔ لڑکی لیڈی ڈاکٹر بننا چاہتی ہے۔ اور تم ہو کہ بے پروائی سے اس کی زندگی تباہ کر رہے ہو"

یہ بیوی کا سراسر بہتان تھا۔ ہر انسان اپنی زندگی اپنے ہی ہاتھوں تباہ کرتا ہے میر تقی میر کا یہ شعر میں نے بیوی کے سامنے بطور شہادت

پیش کیا۔ ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں ہیں آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

بیوی کی سمجھ میں یہ شعر بھی نہ آیا۔ اور مجبور ہو کر مجھے کسی اسکول کی تلاش کرنی پڑی۔

تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ میرے گھر سے صرف ایک فرلانگ کے فاصلہ پر ہی ایک شاندار ماڈل اسکول ہے۔ جو کنڈرگارٹن کے جدید ترین سسٹم کے مطابق تعلیم دیتا ہے۔ ایک ریٹائرڈ عیسائی ہیڈ ماسٹر صاحب اس کے انچارج ہیں۔ میں رانی کو لے کر ان کے پاس پہنچا۔ تو وہ بڑے تپاک سے پیش آئے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں میرے اور رانی کے جسم کو ٹٹولا۔

" دیکھئے مسٹر فکر! آپ بھی شاعر ہیں اور میں بھی شاعر ہوں۔ بالکل اسی طرح جس طرح آپ کی بچی پڑھنا چاہتی ہے اور میں پڑھانا چاہتا ہوں۔ یہ اشتراک بھی عجیب چیز ہے دنیا میں۔ شاید اسی موقع کے لئے میں نے ایک شعر لکھا تھا۔ ذرا سنئے۔

تمہارے پاس حسن ہے، ہمارے پاس عشق ہے
ہمارا یہ ملاپ بھی عجیب سا ملاپ ہے

میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "جناب ہیڈ ماسٹر صاحب! سچ کہتے ہیں آپ۔ ملاپ بہت اچھی چیز ہے۔ ہندو مسلم ملاپ۔ ہندو مسلم سکھ ملاپ۔ ہندو مسلم سکھ عیسائی سب آپس میں بھائی بھائی۔ لیکن آپ یہ بتایئے کہ اس اسکول کے قواعد وضوابط کیا ہیں؟"

بوڑھے ہیڈ ماسٹر نے اٹھ کر الماری میں سے اپنی بیاض نکالتے ہوئے کہا۔ "آپ بچی کی فکر نہ کیجئے تو اعد آسمان سے نہیں اترتے۔ یہیں اسکول میں بنائے جاتے ہیں۔ انسان کے ہاتھ ہی میں سب کچھ ہے۔ مثلاً آپ دیکھئے۔ بالکل اسی موضوع پر میں نے یہ تازہ شعر لکھے ہیں۔ ذرا توجہ سے سنیئے!"

انسان زندگی کا کھلونا نہیں نہیں!　　ہنسنے کے ساتھ ساتھ یہ رونا نہیں نہیں!
ہم نے لگا دیا یہاں گندم کا ایک باغ　　دیکھو یہاں نخود نہ بونا نہیں نہیں

میں نے داد دینا مناسب سمجھا اور کہا۔ "ہاں صاحب! گورنمنٹ نے گندم اور نخود کے مارکیٹ نرخوں میں کافی فرق روا رکھا ہے۔ اس لئے نخود بونے سے سراسر نقصان کا احتمال ہے۔ مگر آپ مہربانی فرما کر رانی کو پہلے داخل کر لیجئے۔"

بوڑھے ہیڈ ماسٹر نے بدستور بیاض پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

" وہ تو ہو جائے گا سب۔ لیکن اگر آپ کو فرصت ہو۔ تو میں آپ کو اپنی چند تازہ غزلیں سناؤں۔ جو میں نے بچوں کے لئے لکھی ہیں!"

بچوں کے لئے غزلیں لکھی ہیں آپ نے۔ واقعی یہ ادب میں ایک مستحسن قدم ہے۔ ہمارے ادب میں بچوں کے لئے غزلوں کی بے حد کمی تھی۔

"جی ہاں! جی ہاں! دراصل جدید ترین طریقۂ تعلیم کے لئے یہ غزلیں بے حد ضروری ہیں۔ چنانچہ میں نے یہ ایک اصول بنا رکھا ہے کہ ہمارے اسکول میں جتنے بچے داخل کئے جاتے ہیں۔ انھیں میری غزلیں زبانی یاد رکھنا پڑتی ہیں۔ آپ کی بچی بھی مجھے کافی ذہین معلوم ہوتی ہے۔ تو پھر ذرا سنئے ذرا ایک دو غزلیں..........."

غرض آدھ گھنٹہ تک وہ مجھے غزلیں سناتے رہے۔ اور آدھ گھنٹہ کے بعد یہ نتیجہ نکلا کہ رانی اس اسکول میں داخل نہ کی جا سکی کیونکہ ہیڈ ماسٹر نے نہایت مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ اس اسکول میں داخلہ کے لئے آپ کو پچاس روپے تو بطور ابتدائی اخراجات کے

دینے پڑیں گے - اور اس کے بعد ہر ماہ بیس روپیہ بطور فیس ادا کرنے ہوں گے۔ میں نے انھیں بتایا کہ فیس اور داخلہ وغیرہ کی حالت اتنی بلند پایہ ہے - تو یہ اسکول کھولا ہی کیوں گیا ہے - ہیڈ ماسٹر نے تشریح کی کہ شہر کے چند امیر آدمیوں کی اسکیم پر یہ اسکول کھولا گیا ہے۔ اور اسی لئے یہ جدید ترین لوازمات تعلیم سے آراستہ ہے - اور یہ آراستگی روپیہ کی بدولت ہی قائم ہے۔

چنانچہ میں نے انھیں کورا جواب دیتے ہوئے کہا - کہ یہ اخراجات اور فیس میرے خاندان کی گزشتہ تین نسلوں اور آئندہ تین نسلوں کے لئے تو مشکل ہیں ـــــــ عاقبت کی خبر خدا جانے!

اور ہیڈ ماسٹر مذکور نے مجھے کچھ ایسی نظروں سے گھورا تھا - جیسے کہہ رہے ہوں۔ "تم ٹاٹ پونچھتے ہو - چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا ہی نہیں جانتے - میرا اسکول کنڈر گارٹن اسکول ہے - صرف امریکہ - برطانیہ فرانس میں ہی اس طرز کے اسکول پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں یہ اسکول کھولنے کا فخر...... قہ قہ...... قہ قہ......"

اور جواب میں میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کا ہی یہ شعر پڑھا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب آپ سچ کہتے تھے کہ

"تمھارا نام حسن ہے، ہمارا نام عشق ہے"

اور دونوں کے درمیان ایک ایسی سڑک ہے - جس پر کوئی لاری نہیں چلتی - مگر اپنے شعر کی تشریح بھی ہیڈ ماسٹر صاحب کی سمجھ میں نہیں آئی - اور مجھے یوں لگا - جیسے میرے اور ان کے ذہن کے درمیان سرے سے کوئی سڑک ہی نہیں ہے -

---

اور اسی رات کو میرے اور بیوی کے درمیان خاصی جھڑپ ہوگئی - بیوی کی دلیل یہ تھی کہ میں کنجوس ہوں - اور روپوں کے ڈر ہی سے اسے اسکول میں داخل نہیں کرایا - حالانکہ ہر بچہ اپنی قسمت خود لے کر آتا ہے - میں نے کہا - یہ تو ٹھیک ہے کہ ہر بچہ اپنی قسمت ساتھ لے کر آتا ہے - مگر قسمت کے متعلق تو سُنا ہے کہ یہ ایک ایسا چیک ہے جو کیش نہیں ہو سکتا - اور اسکول والے کیش سے بات کرتے ہیں۔ کورے چیک سے نہیں - بیوی نے کہا - تو پھر کیش پیدا کرو - میں نے جواب دیا - میں تو صرف الفاظ اور استعارے پیدا کر سکتا ہوں اور یہ دو جنسیں منڈی کی غیر ضروری جنسیں کہلاتی ہیں - غرض کہ ایک طویل جھک جھک کے بعد میں اور میری بیوی دونوں نے دیکھا کہ ہم غصہ تو پیدا کر سکے - مگر کیش پیدا نہ کر سکے۔

دوسرے دن ہونے والی لیڈی ڈاکٹر نے مجھے پکڑ لیا - اور کہنے لگی -

"بابو جی تو پھر میں لیڈی ڈاکٹر کب بنوں گی!"

"جب تمھارا بیاہ ہو جائے گا!"

"بیاہ کب ہوگا؟"

"جب دولہا گھوڑی پر چڑھ کر آئے گا!"

لیڈی ڈاکٹر شرما گئی - شرم و حجاب عورت ذات کا قیمتی زیور ہے - اور علم و فن صرف وقت گزاری کا شغل - وقت گزر جاتا ہے اور عورت کو پتہ بھی نہیں چلتا - اس لئے میں اور رانی دونوں تھوڑے عرصے اور صبر کا گھونٹ بھر لیں - تو دولہا آ جائے گا - اور رانی اسکول پہنچنے کی بجائے اپنے کیفر کردار کو پہنچ جائے گی - اور پھر دلہن بننے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ لڑکی لیڈی ڈاکٹر ہی ہو - کروڑوں لڑکیاں دلہن بنتے تو دیکھی ہیں - مگر لیڈی ڈاکٹر نہیں - اور یہ ایک سماجی تجربہ ہے - کوئی ہوائی خیال نہیں ہے -

لیکن یہ سبھی دلیلیں صرف بچوں کو منانے والی یعنی طفل تسلیاں تھیں - میں رانی کو ہر روز دیکھتا - اور میرے سینے سے ایک آہ نکلتی

اور ہر روز کی آہ و زاری سے بچنے کے لئے میں نے پھر فیصلہ کرلیا کہ اسے کسی نہ کسی اسکول میں ضرور داخل کرادیا جائے۔ چنانچہ چند ہفتوں بعد ہم دونوں پھر ایک اسکول میں جا پہنچے۔

یہ اسکول ہمارے گھر سے دو میل کے فاصلہ پر تھا۔ رانی نے کچھ فاصلہ پیدل طے کیا۔ کچھ میرے کندھوں پر سوار ہو کر کاٹا۔ اور جب اس کے پاؤں اور میرے کندھے دونوں جواب دے گئے۔ تو رکشا مدد کو آپہنچی۔ اور میں نے سوچا کہ اگر رانی کو ہر روز اسی طرح اسکول آنا پڑا۔ تو اس کی تین، چار عمر تو راستہ ناپتے ہی گزر جائے گی۔ لیڈی ڈاکٹر نہ جانے کس سنہ میں بنے گی؟

جس اسکول میں ہم پہنچے۔ وہ خاصا بڑا تھا۔ کافی گہما گہمی تھی یوں لگتا تھا۔ جیسے یہاں علم کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ جی خوش ہوگیا۔ اور اپنے ملک میں علم کا یہ سیلاب عظیم دیکھ کر سارا گرد و غبار دھل گیا۔ اور دل کے شفاف آئینہ میں ایک لیڈی ڈاکٹر جھلملا اٹھی ــــــ

اتہ پتہ پوچھ کر ہم ہیڈ ماسٹر کے کمرہ کی طرف بڑھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب میز پر ٹانگیں رکھے ایک ہاتھ میں ایک فلمی رسالہ پکڑے۔ ایک ایکٹریس کی تصویر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بغیر ٹانگیں ہلائے بولے۔

"فرمائیے کیا چاہیئے آپ کو؟"

پہلے تو میرا جی چاہا کہ مجھے آپ کے اندر تمیز چاہیئے۔ تاکہ آپ میز پر سے ٹانگیں ہٹا سکیں۔ لیکن یہ بدتمیزی کرنا میں نے مناسب نہ سمجھا اور کہا ــــــ

"میں اپنی بیٹی رانی کو آپ کے اسکول سے تعلیم دلوانا چاہتا ہوں"

"یہ نہیں ہوسکتا" ہیڈ ماسٹر صاحب نے ایک ہی فقرہ میں کام تمام کردیا۔ مگر میں نے امید کے دامن کو پھر سے زور سے پکڑتے ہوئے کہا

"آپ کا جملہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ براہ مہربانی ذرا وضاحت فرما دیجئے"

"وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں!" ــــ انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"یہ لڑکیوں کا نہیں لڑکوں کا اسکول ہے۔ یہاں کو ایجوکیشن بالکل نہیں ہے!"

"مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ میری لڑکی آپ کے اسکول کے لڑکوں کے ساتھ کیوں پڑھتی ہے۔ آپ میری ذاتی ذمہ داری پر اسے داخل کرلیجئے" ــــــ

"مگر جناب!" ــــ اب انھوں نے شاید بدھو سمجھ کر نصیحت دینے کی خاطر اپنی ٹانگیں میز سے نیچے لٹکا دیں۔ اور بولے۔

"ہم لڑکیوں کو لڑکوں کے ساتھ تعلیم پانے کی اجازت بالکل نہیں دے سکتے۔ کیونکہ اس سے قوم کے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے"

"عجیب بات ہے" اس مرتبہ میں نے انھیں بدھو سمجھ کر نصیحت کا آغاز کیا "اسکول میں تو اخلاق سکھانے اور اسے اونچا کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کے اسکول میں بچوں کے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں۔ یہ اسکول کچھ میری سمجھ میں نہیں آیا ــــــ"

اپنے اسکول کے کیریکٹر پر حملہ ہوتے دیکھ کر ہیڈ ماسٹر صاحب ناراض ہوگئے۔ اور کہنے لگے۔

"جناب آپ اتنی سی بات آخر کیوں نہیں سمجھتے۔ کہ جب دو مخالف جنسیں ملتی ہیں۔ تو ایک تیسری جنس پیدا ہوتی ہے جس کا نام شیطان ہوتا ہے ــــــ"

میں نے سر کھجا کر کہا "شیطان ــــــ ؟ ہاں صاحب! یہ نام سُنا تو ضرور ہے۔ مگر ان صاحب کے متعلق اطلاع ملی تھی کہ ان کی کوٹھی آسمان پر ہے تو اب انھوں نے نقل مکانی کرلی ؟"

ہیڈ ماسٹر صاحب میرے اس مذاق پر قہقہہ مار کر ہنسا۔ یہ قہقہہ سراسر شیطانی قہقہہ تھا۔ اس لئے میں ڈر گیا۔ رانی بھی میرے کندھے سے چمٹ گئی۔ اور اس سے پہلے کہ ہیڈ ماسٹر صاحب چپراسی کو بلوا کر مجھے دھکے دے کر باہر نکلوانے کا آرڈر دیتے۔ میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ اور آئندہ کبھی ادھر نہ آنے کا حلف لیا۔ اور اسکول کے احاطے سے باہر نکل آیا۔

اسکول کے سبھی لڑکے شیطانوں کی طرح ہیں گھور رہے تھے۔ ایک چھوٹا سا لڑکا ایک تختی پر ہندسے لکھ رہا تھا۔ رانی نے جھک کر تختی کے ہندسوں کو دیکھنا چاہا۔ میں نے اُسے گھسیٹ کر باہر لاتے ہوئے کہا "نہیں بیٹی! ہندسے نہیں لکھنے چاہئیں۔ ان سے اخلاق خراب ہوتا ہے ــــــ"

ان دو تجربوں کے بعد مجھے غصہ بھی آیا۔ اور غیرت بھی جاگی۔ کیا یہ دو فٹ کی لڑکی بھی مجھ سے خود نہیں پڑھائی جا سکتی؟ یقیناً ان مرجھائے ہوئے چہروں اور زرد نگاہوں والے ٹیچروں کے مقابلہ پر تو میں رانی کو زیادہ بہتر اور معقول طریقہ پر پڑھا سکتا ہوں۔

چنانچہ ایک دن اپنی برتری کے احساس کو تیز کر کے میں نے رانی کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور اس سے کہا۔

"میں تمھیں پڑھاؤں گا۔"؟

"پڑھائیے! ــــــ"

"سو تک گنتی سناؤ!"

"وہ کیا ہوتی ہے؟"

"سو تک گنتی بس سَو تک گنتی ہوتی ہے۔ اب بھلا اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے کہ وہ کیا ہوتی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے ریاضی داں فیثاغورث سے لے کر ٹوڈرمل تک اور لالہ تیج رام حساب والے سے لے کر فکر تونسوی تک سبھی تسلیم کر چکے ہیں کہ سَو تک گنتی واقعی ہوتی ہے۔ اور یہی گنتی ہی علم ریاضی کی بنیاد ہے۔ اسی کی بنیاد پر آئن اسٹائن نے وقت اور فاصلہ کا قانون دریافت کیا۔ اور اسی کی بنیاد پر دنیا بھر کی پارلیمنٹوں میں سالانہ بجٹ پیش کئے جاتے ہیں۔ اور ریزرو بنک آف انڈیا اور ورلڈ بنک اپنے اپنے بیلنس شیٹ بناتے ہیں۔ اور اقتصادیات اور سیاسیات میں زیروبم پیدا ہوتا ہے اور ......"

میں اُسے پڑھاتا گیا۔ رانی میرا منہ تکتی رہی۔ اور کیا کرتی۔ علم کوئی نرم نرم حلوہ تو ہوتا نہیں کہ آسانی سے حلق میں اتر جائے۔ فیثاغورث اور آئن اسٹائن نے بھی لوہے کے چنے چبائے ہوں گے۔ تب جا کر اس مرتبے تک پہنچے ہوں گے۔

چنانچہ رانی میرا یہ لیکچر سنتی رہی۔ سنتی رہی اور جب ہفتہ بھر تک متواتر میں اسے علم و حکمت کے یہ چنے چبوا چکا۔ تو معلوم ہوا کہ اُسے اور تو کچھ شاید آگیا ہو مگر سَو تک گنتی نہیں آئی۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اسے سَو تک گنتی کیوں نہیں آئی ہے۔ حالانکہ میں خود یہ گنتی نہایت آسانی سے گن سکتا تھا۔

چنانچہ ایک دن میری بیوی نے مجھے شرمندہ کرتے ہوئے کہا۔

گنتی سکھانے کا ایک خاص طریقہ ہوتا ہے۔ اور وہ صرف اسکول کے استادوں کو ہی آتا ہے۔ اگر کوئی بڑھئی سے کہے کہ سونے کے زیور گھڑ دے تو وہ کیا گھڑ سکے گا؟ اسی طرح آپ بھی ......"

کتنی معمولی اور سادہ سی تشبیہ کے ساتھ بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اور ان اشاروں کی اکڑفوں کا مفہوم معلوم ہوا۔ چنانچہ میں دوسرے دن ہی اپنی غیرت اور غصہ کو دفن کر کے اس کی لاش اٹھائے۔ رانی کو انگلی سے پکڑے پھر ایک اسکول کی طرف جا رہا تھا۔

یہ ایک گرلز اسکول تھا۔ جس کے چاروں طرف ایک بلند دیوار تھی۔ جیل کی دیوار اور اس دیوار میں بس یہی ایک فرق تھا کہ جیل کے باہر ایک مسلح پہرہ دار بیٹھا رہتا ہے اور اسکول کے باہر ایک غیر مسلح چپڑاسن اسٹول پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔

میں نے چپڑاسن سے کہا۔ "مجھے اندر جانا ہے"

اُس نے تقریباً میرا منہ چڑا کر کہا ۔ "مردوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے!"

میں نے تشریح کی کہ میں خود اسکول میں نہیں پڑھنا چاہتا۔ بلکہ میری یہ بیٹی پڑھا کرے گی ۔ جو یقیناً مرد نہیں ہے!

وہ بولی ۔ "لیکن آپ تو مرد ہیں"

"وہ تو ظاہر ہے!"

"تو پھر آپ نہیں جا سکتے"

میں نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا ۔ "میں یقیناً جا سکتا ہوں دیکھوں مجھے کون روکتا ہے!"

چپڑاسن نے دوپٹے کا پلو منہ میں دبا کر مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہا ۔ "آپ ایک چِٹ پر اپنا نام لکھ دیجئے۔ میں ابھی جا کر ہیڈ مسٹریس سے ملنے کی اجازت لے آتی ہوں"

اور تین منٹ بعد میں ہیڈ مسٹریس کے کمرے میں موجود تھا۔

ہیڈ مسٹریس ایک بوڑھی سی سال خوردہ عورت تھی۔ اس لئے کچھ مزا نہ آیا۔ میں نے بادلِ ناخواستہ اس کے سامنے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ ہیڈ مسٹریس نے جواب میں اپنا دُکھ ظاہر کیا۔ اور بولی۔

"دیکھئے شریمان جی! بات یہ ہے کہ ہمارے اسکول میں اب مزید لڑکیوں کی گنجائش نہیں ہے۔ پہلی جماعت میں ۶۰ ساٹھ لڑکیوں کا کوٹہ تھا۔ وہ پورا ہو گیا۔ اب ہم مزید لڑکیاں نہیں لے سکتے"

"تو کوٹہ بڑھا دیجئے۔ آپ کا کیا بگڑتا ہے؟"

ہیڈ مسٹریس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے ابھی ابھی یہ بڑھیا اپنی جوانی کے شیریں لمحات کی دلفریب کہانی سنانا شروع کر دے گی اور کہے گی کہ ع　"وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا!"

لیکن اُس نے جوانی کے بجائے اسکول کے بڑھاپے کا قصہ بیان کرنا شروع کر دیا۔ اور کہنے لگی۔

"جناب کوٹہ نہیں بڑھ سکتا۔ کیونکہ ہمارے پاس صرف ایک استانی ہے جو ساٹھ لڑکیوں سے زیادہ نہیں پڑھا سکتی"

"تو دو استانیاں رکھ لیجئے۔ واہ! بھلا یہ بھی کوئی مسئلہ ہے؟"

"استانی تو رکھ لیں۔ مگر اسے تنخواہ کہاں سے دیں! ہمیں سرکاری گرانٹ بھی کم ملتی ہے!"

میں نے کہا۔ "تو گرانٹ بڑھنی چاہیئے۔ آپ گورنمنٹ کو لکھیئے کہ تعلیم بے حد ضروری چیز ہے!"

"کئی بار لکھا ہے۔ وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمیں فوج تعلیم سے زیادہ ضروری ہے! جو دیش کی حفاظت کرتی ہے!"

دیش کی حفاظت کا سوال نازک تھا۔ اس لئے میں ڈر کر خاموش ہو گیا!

"اور پھر ایک بات اور ہے" ہیڈ مسٹریس نے مزید بتایا۔ "ہمارے پاس لڑکیوں کو بٹھانے کے لئے جگہ کی بھی کمی ہے!"

"لیکن محترمہ! سُنا ہے کہ ہندوستان کے ۲۵ ہزار مربع میل رقبہ میں سے بیس ہزار مربع میل جگہ تو خالی اور بنجر پڑی ہے۔ اور آپ فرماتی ہیں کہ جگہ کی بھی کمی ہے!"

اس نے پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ جو میرے جگر کو چیرتی ہوئی چلی گئی۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے کی بنجر اور خالی خالی نگاہوں میں دیکھنے لگے۔ بالآخر میں نے قطعی فیصلہ کر لینے کی غرض سے پوچھا۔

"تو پھر کیا میری رانی لیڈی ڈاکٹر نہیں بن سکے گی!"

"میرا خیال ہے کہ نہیں آپ اسے گھر کا کام کاج ہی سکھائیے۔ ہمارے پراچین زمانہ کی استریاں گھر کی رانیاں ہی کہلاتی تھیں"

میں نے کہا۔ "آپ کی نصیحت سر ماتھے پر!"

ہیڈ مسٹریس کے کمرے سے باہر قدم رکھتے ہوئے میں ایک سکنڈ کے لئے ٹھٹکا۔ اور سوچا اس سے کہہ دوں کہ آپ کی چپڑاسن نے جو مجھ سے ایک روپیہ رشوت لی تھی۔ وہ مجھے لوٹا دیجئے۔ کیونکہ ایسی رشوت کس کام کی جس کا کوئی فائدہ ہی نہ ہو۔ مگر بعد میں یہ سوچ کر کہ کہیں ہیڈ مسٹریس مجھ پر چپڑاسن کو کرپٹ کرنے کا الزام نہ لگا دے۔ میں نے ارادہ ترک کر دیا۔ اور رانی کو لئے ہوئے گھر واپس آگیا۔

اس کے بعد کسی اسکول کا رخ کرنا ڈوب مرنے کے برابر تھا۔

کئی ہفتے مزید بیت گئے۔ اور ہم گھر والوں کے ذہن میں داخلی طور پر یہ طے ہو گیا کہ اگر رانی لیڈی ڈاکٹر نہ بنی۔ تو اسے موت نہیں آ جائے گی۔ میرے ذہن سے ایک بوجھ سا اتر گیا۔ اور میں اپنی دوسری مصروفیات میں ڈوب گیا۔

مگر ایک دن ـــــ

میری بیوی نے یہ کہہ کر مجھے حیران کر دیا کہ وہ بوجھ اترا نہیں گیا۔ بلکہ اس نے اُسے اٹھا کر اپنے ذہن پر سوار کر لیا ہے۔ یعنی رانی کو ایک پرائیویٹ پرائمری اسکول میں داخل کروا دیا ہے۔ یہ اسکول ہمارے نزدیکی گوردوارہ میں کسی نے کھول رکھا ہے۔ تین روپیہ فیس داخلہ اور ایک روپیہ ماہانہ۔ فیس دے کر رانی کو داخل کر لیا گیا ہے۔ اور یہ کہ اب رانی کے سامنے لیڈی ڈاکٹر بننے کا راستہ کھُل گیا ہے!

گوردوارہ میں اسکول ـــ؟ یہ مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ جیسے اس خبر میں ضرور کسی نہ کسی سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ چنانچہ میں نے کرید کر بیوی سے پوچھا۔

"یہ کیسا اسکول ہے؟ کس نے کھولا ہے؟ کیوں کھولا ہے۔ کب سے کھولا ہے؟"

"بس ایک اسکول ہے۔ ایک استانی ہے۔ چار جماعتیں ہیں۔ تیس لڑکیاں ہیں۔ ایک کمرہ ہے۔ اور رانی ان لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھتی ہے!" مجھے کچھ خطرہ سا محسوس ہوا۔ یہ بھی خوب اسکول ہے۔ ایک کمرہ، ایک استانی، چار جماعتیں۔ میں نے پھر پوچھا۔ لیکن یہ بتائیے۔ سرکار نے اسے منظور بھی کیا ہے یا وہ استانی صاحبہ یونہی اسکول کھول کر بیٹھ گئی ہیں۔ گوردوارے کی گرنتھی ہی نہ ہو کہیں کہ بیکار معاش کچھ کیا کر کے' مصداق علم کی گردن پر چھری چلانے بیٹھ گئیں۔

"کچھ بھی ہو۔ مگر اسکول تو ہے۔ کچھ نہ سہی مگر لڑکی کچھ تو پڑھے گی۔"

"ہاں ـــ!" میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "تو پھر لڑکی کچھ نہ کچھ ہی پڑھے گی۔ اور کچھ نہیں پڑھے گی۔"

اس وقت تک میری یہ حالت ہو چکی تھی کہ مجھے رانی کے اکتسابِ علم سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ اب چاہے وہ کسی گوردوارہ میں پڑھے۔ یا کسی مزار پر۔ جب لڑکی کے نصیب ہی کھوٹے ہیں۔ تو اب چاہے جہنم میں جھونک دی جائے۔ یہ تو پھر بھی گوردوارہ ہے!"

چنانچہ تعلیم شروع ہو گئی۔

ایک دن یونہی میری نظر پڑ گئی ۔ رانی اپنی تختی پر کچھ موٹے موٹے ۔ ٹیڑھے بنگے حروف لکھ رہی تھی ۔ انھیں دیکھتے ہی میں پریشان ہو گیا ۔ اور چلا اٹھا ۔

" یہ کون سی زبان کے حروف ہیں جناب !"

رانی شاید زبان کی ریسرچ کے معاملہ میں ابھی کوری تھی ۔ اس لئے گونگوں کی طرح میری طرف دیکھنے لگی ۔ مگر اس کی بجائے بیوی نے جواب دیا ۔

" یہ گورمکھی ہے "

" تو کیا اسکولوں میں آج کل یہ زبان پڑھائی جا رہی ہے !"

" ہاں سنا ہے کئی اسکولوں میں گورمکھی پڑھائی جاتی ہے اور کئی میں ہندی "

" مگر میں کہتا ہوں ۔ ان دونوں میں سے اصلی زبان کون سی ہے ۔ جو سرکاری طور پر پڑھائی جاتی ہے !"

" اصلی زبان کا تو علم نہیں ۔ مگر یہ دونوں زبانیں ہی پڑھائی جاتی ہیں ۔ گوردوارے والی استانی کہتی تھی ۔ کہ مجھے ہندی نہیں آتی ۔ میں تو گورمکھی ہی پڑھاؤں گی "

" عجیب زمانہ آیا ہے ۔ اصلی زبان کا کسی کو علم ہی نہیں ۔ اور جو زبان جس کسی کو آتی ہے ۔ پڑھائے جاتا ہے ۔ یہ تعلیم ہے یا .... یا .... (مجھے ایک گالی سوجھنے لگی)

بہرکیف رانی بے زبان بنی پڑھتی رہی ۔ اور تیسرے ہفتے معلوم ہوا کہ گوردوارہ والی اُستانی بھاگ گئی ہے ۔ اور اسکول " کچھ عرصہ " کے لئے بند ہو گیا ہے ۔ تحقیق کی تو پتہ چلا کہ گرنتھی صاحب نے ایک بیس سال کی نوجوان شرنارتھی لڑکی پر رحم کھا کر اسے یہ اسکول کھلوانے میں مدد کی تھی ۔ ایک کمرے میں اسکول بنایا گیا ۔ اور دوسرے کمرے میں گرنتھی اور شرنارتھی ! ہم شیر و شکر یعنی بھائی بہن ہو کر رہتے تھے ۔

اور جب شرنارتھی بہن بھاگی ۔ تو گرنتھی صاحب کا بیان ہے کہ لڑکیوں کی جمع شدہ فیس مبلغ ایک سو دس روپے بھی ساتھ ہی لے گئی ۔ اور گرنتھی صاحب کا بٹوا بھی ۔

" اور گرنتھی صاحب کا دل بھی " میں نے بیوی کو اطلاع دی ۔

چنانچہ جناب ! تین ہفتے تک علم کے دریا میں اشنان کرنے کے بعد رانی پھر کنارے پر آ گئی ۔ گرنتھی نے وعدہ کیا کہ وہ ایک اور شرنارتھی لڑکی بطور استانی لے آئے گا ۔ مگر شاید بعد میں گرنتھی صاحب نے یہ امدادی اسکیم مسترد کر دی ۔ اور اس کے بعد کبھی گوردوارے سے پہاڑے پڑھنے کی آواز نہ آئی ۔

اب تو حد ہو چکی تھی ۔ مجھے بار بار اپنی بے چارگی کا گھناؤنا احساس ہوتا ۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ایک لڑکی علم کا ایک قطرہ تک نہ پی سکے ۔ چاہے کچھ ہو ۔ میں نے اس صورت حال کا بہادروں کی طرح مقابلہ کرنے کی ٹھان لی ۔

اس سلسلہ میں میں نے بطور احتجاج اخباروں میں آرٹیکل لکھے ۔ ایک کہانی لکھی کئی نظمیں لکھیں ۔ اور ایک ناول لکھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ مجھے ایک دوست نے روک دیا ۔

اس دوست نے کہا۔
"بھلا یہ بھی کوئی بڑی بات ہے۔ لاؤ میں آج ہی رانی کو ایک اسکول میں داخل کرائے دیتا ہوں"
میرے یہ دوست میونسپل کمیٹی کے سکریٹری تھے۔ اور جب وہ مجھے ہمراہ لے کر اس اسکول پہنچے۔ تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ تو وہی میونسپل گرلز اسکول ہے۔ جس کی ہیڈ مسٹریس نے کہا تھا کہ ہمارا کوٹہ پورا ہو چکا ہے۔
میں نے اپنے دوست کو سمجھایا کہ جناب اس اسکول میں داخلہ بند ہے۔ کیونکہ ان کا کوٹہ تو پورا ہو چکا ہے۔
"ہنھہ!" میرے دوست نے مجھے ذلیل کرتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں یہ کوٹے ووٹے کیا ہوتے ہیں۔ اگر سالی ہیڈ مسٹریس نے چوں تک بھی کی تو نوکری سے برخاست کرادوں گا"
"نہیں یار۔۔۔!" مجھے رحم آیا۔ "جب کوٹہ سسٹم اس اسکول کا اصول ہے تو اسے توڑنا نہیں چاہیئے!"
"اصول توڑنے کے لئے ہی بنائے جاتے ہیں دوست!" میرے دوست نے مجھے فارمولا سمجھاتے ہوئے کہا۔
ہم اندر چلے گئے اور جتنا وقت اندر رہے۔ ہیڈ مسٹریس ہاتھ باندھے ہمارے سامنے کھڑی رہی۔ رانی کو بھی پیار کیا۔ اور اسے ایک لڈو منگوا کر کھلایا۔ داخلے کا فارم بھی خود ہی بھرا۔ اور چار روپے فیس داخلہ لے کر رانی کو داخل کر دیا۔ اور اس دوران میں مجھے اپنی حماقت پر سخت غصہ آتا رہا۔ کہ رانی کی تعلیم کا مسئلہ اتنا آسان ہے۔ اور میں اسے خواہ مخواہ ایک مصیبت بنائے سوار کئے رہا۔۔۔۔۔۔

آج رانی کی لیڈی ڈاکٹر بننے کی کہانی ختم ہو رہی ہے۔ تین سال تک وہ اس میونسپل گرلز اسکول میں پڑھتی رہی۔ پڑھتی کیا رہی بس اسکول جاتی رہی۔ اور اس دوران میں مجھ پر کیا کیا پہاڑ نہیں ٹوٹے۔ یہ بیان کرنا بے معنی ہے مختصراً یوں ہے۔
دو سال تک تو وہ پہلی جماعت ہی میں فٹ بال کی طرح لڑھکتی رہی۔ مگر گول نہ کر سکی۔ پہلے سال کے ۳۶۵ دنوں میں سے وہ صرف ۶۵ بار ہی اسکول گئی اور باقی دن میں یا تو چھٹیاں رہیں۔ یا استانی چھٹی پر رہی۔ یا برائیں ٹھہرنے کی وجہ سے چھٹی رہی بعد میں پتہ چلا کہ یہ اسکول اسکول بھی تھا اور برات گھر بھی۔ جو نہی کوئی دولھا گھوڑی پر چڑھ کر اس شہر میں آتا اور اپنا گھر بسانے کے لئے اس اسکول میں آکر ٹھہرتا۔ تو وہ بس جاتا اور اسکول اجڑ جاتا۔ برات اور اسکول میں یہ چولی دامن کا ساتھ کیونکر ہوا۔ یہ راز اسکول کی کوئی استانی نہ کھول سکی۔
پہلے سال کے آخری مہینوں میں استانی نے پیغام بھیجا کہ رانی کی ٹیوشن رکھوا ئیے۔ ورنہ یہ فیل ہو جائے گی۔ پیغام سچائی پر مبنی تھا۔ سال میں دو ماہ پڑھنے پر اگر وہ فیل نہ ہوتی۔ تو کیا افلاطون بن جاتی۔
استانی کی چالاکی یہ تھی کہ ٹیوشن وہ خود دے گی۔ اور اس طرح روپے مار کرلے جائے گی۔ میں نے پہلے سال یہ چالاکی نہ چلنے دی۔ اور رانی کو فیل کرا دیا۔
دوسرے سال پھر وہی عمل دہرایا جانے لگا۔ مگر میں نے اس سال پندرہ روپے بطور ٹیوشن فیس دے کر رانی کو پاس کرالیا۔ پاس یا فیل کروانا تو اپنے اختیار میں تھا۔
مگر دوسری جماعت میں بھی پھر وہی عمل دہرایا جانا تاریخی طور پر لازمی تھا۔ چنانچہ میں نے تاریخی تجربے سے سبق حاصل کرتے ہوئے استانی کو پہلے ہی کہلا بھیجا کہ آپ کی ٹیوشن فیس کھری ہے۔ اور استانی نے جواب میں پاس کرانے کی گارنٹی دلادی۔

لیکن آپ حیران ہوں گے ۔ اور میری جلد بازی پر آٹھ آٹھ آنسو بہائیں گے کہ جب رانی امتحان دے چکی ۔ اور نتیجہ نکلنے میں ابھی ہفتہ بھر باقی تھا ۔ کہ استانی کا ایک اور پیغام ملا ۔

" تین ماہ کی ٹیوشن فیس مل گئی ۔ آٹھ دنوں کی بقایا فیس سوا روپیہ بھجوا دیجئے "

میں بھڑک اٹھا " یہ جھوٹ ہے ۔ بے ایمانی ہے ۔ اس نے آٹھ دن زیادہ نہیں پڑھایا ۔ اس لئے میں سوا روپیہ نہیں دے سکتا ۔ یہ لوٹ مار ہے !"

اور اس کے جواب میں رانی چیخنے اور تڑپنے لگی ۔ " استانی کہتی ہے سوا روپیہ ضرور لے آؤ ۔ ورنہ اسکول مت آؤ ۔ اس نے میرا لبستہ بھی رکھوا لیا ہے ۔ اوں ہوں ہوں مجھے سوا روپیہ ضرور دیجئے "

میں نے دانت پیس کر کہا ۔ " چھوکری ! کیا اوں ہوں کرتی ہے ۔ استانی کا باپ بھی تمھارا لبستہ نہیں رکھ سکتا ۔ یہ اسکول ہے ۔ یا ڈاکوؤں کا سنٹر ۔ تم اب امتحان دے چکی ہو ۔ اور اب استانی تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ۔ تم پاس ہو ۔ اور پاس رہو گی ۔

بیوی نے مجھے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی ۔ " تم بھی خواہ مخواہ غصہ میں آ جاتے ہو ۔ ابھی امتحان کا نتیجہ نکلنے میں پورا ہفتہ باقی ہے ۔ اگر استانی کو سوا روپیہ نہ ملا ۔ تو وہ انتقام لینے کے لئے لڑکی کو فیل کرا دے گی "

" مگر کیسے ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ وہ لڑکی کو کیسے فیل کر سکتی ہے ۔ رانی کند ذہن نہیں ہے ۔ وہ دوسری جماعت کے پورے کورس پر عبور حاصل کر چکی ہے ۔ اور کوئی ماں کا لال اسے فیل نہیں کرا سکتا "

" لیکن استانی تو کر سکتی ہے ۔ تم لعنت بھیجو سوا روپے پر ۔ اور ضد چھوڑ دو ۔ ورنہ وہ ضد میں آ کر لڑکی کو فیل کر دے گی "

" کر دے فیل ! مجھے کوئی پروا نہیں ۔ اس رہزنی اور جیب کتری سے تو اچھا ہے ۔ کہ لڑکی ان پڑھ ہی رہے ۔ آخر ایمانداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے ۔ میں اپنی آنکھوں کے سامنے یہ بے ایمانی نہیں دیکھ سکتا ۔ کوئی ضرورت نہیں لڑکی کو اسکول بھیجنے کی ——— سمجھیں تم ——— ؟"

ہفتہ بھر بعد رانی کے فیل ہونے کی خبر ملی ۔ تو رانی رونے لگی ۔ میں نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا

" اری پگلی ! صرف فیل ہو جانے کو کیا روتی ہے ۔ ابھی تو دیکھتی جاؤ ۔ لیڈی ڈاکٹر بننے تک تمھیں نہ جانے کتنی بار رونا پڑے گا ۔ کیونکہ ایک شاعر نے کہا ہے ؎ مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں ۔

(شمارہ ۲۲-۲۳-۲۴ ـــ ۵۳ء ۶)

ماہنامہ کتاب لاہور

اپنے ہر شمارے میں کم از کم ۲۰ مختلف علوم و فنون پر مبنی مفید اور معلوماتی مضامین شائع کرتا ہے ۔ ۴۸ با تصویر صفحات ، ہر مرتبہ نیا رنگین ، دیدہ زیب سرورق اور قیمت صرف ۵۰ پیسے !

ماہنامہ کتاب ۱ ۔ منٹگمری روڈ ۔ لاہور

محمد خالد اختر

تنقید نگاری سے توبہ

مجھے کتابوں پر ریویو لکھنے میں ملکہ حاصل ہے۔ اور میں انھیں پڑھے بغیر ہی ریویو لکھ سکتا ہوں۔ یہ خدا کی دین ہے۔ جس طرح بعض لوگ شاعر یا پیدائشی مختصر افسانہ نویس ہوتے ہیں۔ غالباً میں ایک پیدائشی تبصرہ نگار ہوں۔

پچھلے دو، تین سال کے عرصہ میں میں نے ادیب سازی کے سلسلہ میں جو کام کیا ہے۔ وہ آپ سے پوشیدہ نہ ہوگا میرا ریویو کرنے کا طریقہ یہ ہے۔

"خیال نو" کا ایڈیٹر جو میرا دوست ہے مجھے کتابیں ریویو کرنے کے لئے بھیجتا ہے۔ میں ان کو ادھر ادھر سے الٹ کر کسی صفحہ کو کھول کر دو، تین سطریں پڑھتا ہوں۔ مثلاً

اس نے کہا۔ "چائے کی پیالی پیو!"

بجورے خاں نے کہا۔ "شکریہ۔ میں ابھی ابھی لیمن پی کر آیا ہوں"

اور پھر کتاب کو بند کر کے اس پر تین چار صفحے کا ریویو گھسیٹ دیتا ہوں۔ اگر کتاب ذرا اہم ہوئی تو میں اسے اپنے بھانجے کو (جو آٹھویں جماعت میں تعلیم پا رہا ہے) پڑھنے کے لئے دے دیتا ہوں۔ اور رات کو سوتے وقت اس سے کہتا ہوں۔ کہ مجھے اس کا پلاٹ سنائے۔ اگر اس کے پلے کچھ نہ پڑا تو سمجھ لیتا ہوں کہ کتاب فی الواقعی ہائی برو ہے۔ اور اپنے ریویو میں اسے وقیع اور عالمانہ بناتا ہوں اب تک یہ طریقہ بہت کامیاب رہا تھا۔ کتنا کامیاب، یہ آپ کو اس شہرت سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ جو اس سلسلے میں مجھے حاصل ہے۔ خود میرے ریویوں پر ریویو لکھے جا چکے ہیں اور مجھے ادب کا ہونہارترین نوجوان نقاد تسلیم کیا جا چکا ہے۔ "خیال نو" جو اس وقت اردو ادب کی آواز ہے۔ اپنے ہر شمارے میں میری تصویر کے نیچے یہ چھاپتا ہے "مٹر شداد لیشمی۔ اردو کے ہونہارترین نوجوان نقاد" وغیرہ وغیرہ۔

لیکن چند دنوں سے اسی تنقید نگاری کی بدولت میں ایک عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ریویوئنگ اتنی پرخطر بھی ہو سکتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ سب گلابوں کی سیج ہے۔ اب اس کے خطرات مجھ پر کھلے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس مصیبت کی وجہ سے حالات اس قدر نازک صورت اختیار کر چکے ہیں کہ کتابیں ریویو کرنا تو رہا ایک طرف۔ میں نے گھر سے باہر نکلنا بھی ترک کر دیا ہے۔ اور اب کراچی چھوڑ کر کسی اور جگہ کوچ کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ وہ جگہ ہے نا، جہاں۔ وہ کیا مصرع

ہے — ہم زباں کوئی نہ ہو ۔ اور میزباں کوئی نہ ہو ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ ٹھیک اسی جگہ میں جانا چاہتا ہوں ۔ صرف وہ جگہ آب مجھے راس آسکتی ہے ۔ کیا کوئی صاحب مجھے اس کا اتہ پتہ بتلا سکتے ہیں کہ وہ کہاں ہے !

مصیبت کا آغاز یوں ہوا کہ "خیال نو" کے ایڈیٹر نے مجھے ایک ناول ریویو کرنے کے لئے دیا ۔ میرا ابھا گا کہیں باہر گیا ہوا تھا ۔ اور پھر میں سمجھا کہ ناول اتنا اہم بھی نہیں ہے (اس کا مصنف کوئی غیر معروف شخص تھا ۔) میں نے درمیان سے ایک صفحہ کھولا ۔ اور پڑھنے لگا ۔

"میں پاگل ہوں — میں پاگل ہوں، میں پاگل ہوں ۔" عبدالشکور نے اپنے کپڑے پھاڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ۔ اس کے دوست حکیم عبدالعلی نے اس کو اس سے باز رکھنے کے لئے کشمکش کی ۔

"کپڑے مت پھاڑو میاں عبدالشکور" میاں عبدالعلی نے کہا "یہ قمیص جو تم پہنے ہوئے ہو میری ہے ۔"

میں نے کتاب کو ایک اور جگہ سے الٹا ۔ یہاں اس قسم کے نادر جواہرات جڑے تھے ۔

"اگر عبدالشکور اپنے تحت الشعور کو کسی طرح اپنے لاشعور میں مدغم کر سکتا ۔ تو اس کی نفسیاتی الجھنوں کا خاتمہ ہو جاتا ۔ اس کو خود بخود ملازمت مل جاتی ۔ اور اس کے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ خود بنفس نفیس ملازمت کو طشت پر رکھے اس کے پاس حاضر ہوتا اس کے مکان کا پچھلے دو ماہ کا کرایہ خود بخود ادا ہو جاتا ۔ اور اس کے قرض خواہ اس کی خوش طبعی سے متاثر ہو کر اپنے پچھلے قرضے مانگنے کی بجائے اسے اور قرضہ دینے پر اصرار کرتے ۔ مگر افسوس کہ عبدالشکور محض دس جماعتوں تک پڑھا تھا ۔ افسوس اس نے ڈاکٹر سگنل فراڈ کی کتاب "سائیکالوجی آف نیوراسس" نہیں پڑھی تھی ۔ افسوس اس نے آندرے ژید نہیں پڑھا تھا ۔ افسوس وہ بصد کوشش جیمز جائس کی "اولیسس" کو ایک صفحے سے آگے پڑھنے میں کامیاب نہ ہوا تھا ۔ اگر وہ کم از کم "اولیسس" ہی آدھی تک مطالعہ کر لیتا ۔ تو اس وقت اس کی نفسیاتی اور جسمانی حالت اس قدر قابل رحم نہ ہوتی ۔ اور جانثار اس سے یوں بے وفائی نہ کرتی ۔ اب وہ اس طرح محسوس کر رہا تھا جیسے وہ پاگل ہو جائے گا ۔ جیسے اس کے لئے پاگل ہو جانے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے ......

یہ کافی تھا ۔ اور میں کتاب کو بند کر کے اس پر ریویو لکھنے بیٹھ گیا ۔

پندرہ منٹ میں میں نے ریویو لکھ ڈالا ۔ چھ صفحے کا ریویو ۔ اس میں میں نے لکھا کہ اس ناول میں مصنف محترم ذوالفقار خاں نے ایک بے کار تعلیم یافتہ نوجوان کے جذبات کی فرائڈین نقطۂ نظر سے تجزیہ نفسی کرنے کی کوشش کی ہے ۔ مگر وہ اس میں زیادہ کامیاب نظر نہیں آتے ۔ پھر بھی ان کی اس کوشش کو ناکامیاب بھی نہیں کہا جا سکتا ۔ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کی ہو بہو عکاسی کرتے ہیں مگر ان کی رومانیت پرستی سب کئے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے ۔ ان کی کردار نگاری کی تکنیک خارجی نہیں بلکہ داخلی ہے ۔ یعنی وہ اپنے کرداروں کے پیچھے چھدرے تحت الشعور میں گھس کر ان کی زبان سے بولتے ہیں ۔ اور جب اس شان دار اور بے حد رقت انگیز سین میں عبدالشکور جو اس ناول کا ہیرو ہے ۔ اپنے کپڑے پھاڑ کر چلاتا ہے "میں پاگل ہوں، میں پاگل ہوں ۔" تو ہمیں صاف طور پر اس میں مصنف خود بولتا ہوا نظر آتا ہے ۔ محترم ذوالفقار خاں میں ایک عیب یہ ہے کہ وہ کرداروں کو باہر سے ٹٹولتے ہیں ۔ اور ان کے بارے میں گہرائی سے نہیں لکھتے ۔ لیکن امید ہے کہ اپنی اگلی کتاب میں وہ اس کے بالکل برعکس تکنیک استعمال کریں گے ۔ ان کی پہلی ہی کتاب سے سب کی آنکھیں کھل گئی ہیں ۔ اور ادبی دنیا میں

ایک ہنگامہ برپا ہوگیا ہے۔ سب نے محسوس کیا ہے کہ ایک نیا ادیب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوچکا ہے۔ جس کی ادبی کاوشوں سے اردو ادب کو چار چاند لگنے کی توقع ہے۔ مگر ذوالفقار خاں کو سنبھل سنبھل کر بڑھنا ہوگا۔ ابھی انھیں فعل نگارش کے متعلق بہت کچھ سیکھنا ہے۔ اور نفسیات کی سب کتابوں کا مطالعہ کرنا ہے۔ ان کے ناول سے گمان ہوتا ہے کہ عبدالشکور نے (جو غالبًا مصنف خود ہی ہے) ابھی تک " سائیکالوجی آف نیوراسس" نہیں پڑھی۔ آندرے ژید نہیں پڑھا۔ میں محترم ذوالفقار خاں سے پوچھنے کی جسارت کروں گا کہ اگر انھوں نے خود اپنے اقرار کے مطابق نہ فرائڈ کو پڑھا ہے نہ آندرے ژید کو اور نہ جالسں کو۔ تو پھر انھوں نے پڑھا کیا ہے۔ ان کتابوں کے مطالعہ کے بغیر وہ ہیں کیسے کوئی ٹھوس یا جامد تخلیق دے سکتے ہیں۔ راقم الحروف نے خود ان تینوں مصنفوں کو ہائی اسکول ہی میں پڑھ ڈالا تھا۔ اس زمانے میں شاید ذوالفقار خاں پتنگ اڑاتے ہوں گے۔ یا بہرام ڈاکو عرف "بے وفا مجاہد" کی قسم کے ناولوں سے اپنی راتوں کی نیند حرام کرتے ہوں گے . . .
محترم ذوالفقار خاں چینی کلاسیکل مصنف چنگ پھنگ پھوں سے بے حد متاثر معلوم ہوتے ہیں (یہ نام میں نے اسی وقت فرضی گھڑ لیا تھا) اور انھوں نے اپنے ناول کے پلاٹ کے سلسلہ میں مسٹر چنگ پھنگ پھوں کے ناول "چیکو! چیکو" سے کسی حد تک استفادہ کیا ہے۔

کچھ اس قسم کے الفاظ تھے میرے ریویو کے۔ لفظوں کے کچھ ہیر پھیر کے ساتھ میں اس موضوع کے متعدد ریویو پہلے کر چکا تھا اور اڈیٹر "خیال نو" کو یہ ریویو حوالہ کردینے کے بعد میں اس کے اور محترم ذوالفقار خاں کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔

جب یہ ریویو "خیال نو" میں چھپا۔ تو اس سے تین چار روز بعد مجھے محترم ذوالفقار خاں کا خط موصول ہوا۔ جس میں انھوں نے میرے حوصلہ افزا ریویو کا شکریہ ادا کیا تھا۔ اور مجھے یقین دلایا تھا کہ انھوں نے چنگ پھنگ پھوں کی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ اور اگر ان کے ناول کی مسٹر چنگ پھنگ پھوں کے ناول سے کچھ مشابہت ہے تو اسے محض اتفاق پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ آگے چل کر انھوں نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ آیا میں ان کو مسٹر چنگ پھنگ پھوں کے پبلشر کے پتے سے آگاہ کر سکتا ہوں۔ جس سے عظیم چینی مصنف کے ناول "چیکو چیکو" کا انگریزی زبان کا ایڈیشن دستیاب ہو سکے۔

میں نے جوابًا لکھ بھیجا : "چیکو چیکو" تو میں نے اصل چینی زبان میں پڑھا تھا۔ جہاں تک مجھے علم ہے ابھی ناول کا انگریزی زبان میں ترجمہ نہیں ہوا"

میرا خیال تھا معاملہ یہیں پر ختم ہوجائے گا۔ دوسرے دن میں ابھی بستر سے نکل کر شیو ہی کر رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں سمجھا شاید دودھ والا ہوگا۔ منہ صابن کے جھاگ میں لتھڑا ہوا ہاتھ میں برتن —— اس حلیہ میں میں نے دروازے کو تھوڑا سا کھول کر محتاط انداز میں باہر سر نکالا۔

"کیا آپ ہی سید لیشمی ہیں!" ایک کھچے دار مونچھوں والا خطرناک شکل کا انسان دروازے کے پاس کھڑا تھا۔

"ہاں! مجھے یہی کہا جاتا ہے —— دوست احباب صرف لشمی کہتے ہیں۔" میں نے مسکرانے اور خرخرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی تعریف؟ کیسے آنا ہوا؟"

"میں ذوالفقار خاں ہوں۔ اور آپ کے حوصلہ افزا ریویو کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔"

میں اس کو اچھے اخلاق میں شمار نہیں کرتا کہ مصنف لوگ بالکل ہی تبصرہ نگار کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جائیں۔ اور خط

کتابت پر اکتفا نہ کرے اس کے گھر کا کھوج جا نکالیں۔ میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ صبح ہی صبح ذوالفقار خاں کی قسم کے مصنف کو اپنے دروازے کے باہر کھڑا دیکھنا کسی تبصرہ نگار کے دلی سکون میں اضافہ کا موجب نہیں بن سکتا۔ میں نے صابن کی جھاگ میں سے اپنے جبڑے چیر کر اس پر یہ ظاہر کیا کہ میں اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔

میں نے کہا "اخاہ" ذوالفقار صاحب۔ آئیے آئیے اندر تشریف لائیے۔ آپ کی کتاب — کئی حیثیت سے — غیر معمولی تھی —"

وہ اندر آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور میں ہاتھ میں برش پکڑے۔ اس کے سامنے والے صوفے پر۔

"ہاں تو وہ آپ کی کتاب خوب تھی۔ !"

"آپ شیو تو کر لیجئے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا

میں جانتا تھا کہ اس شخص کی موجودگی میں میرے لئے شیو کرنا ناممکنات میں سے ہے! شیو کرنے کے لئے دلی سکون اور روحانی اطمینان ضروری ہے ... پھر میرا خیال تھا کہ اس طرح شاید مجھے اس سے جلد چھٹکارا حاصل ہو جائے۔

"شیو کر لوں گا — آپ فرمائیے۔ اتنے سویرے سویرے ......"

"ہاں "چینی کتاب" چیکو! چیکو"! آپ کے پاس ضرور ہو گی۔ آپ نے اپنے ریویو میں اس کا حوالہ دیا ہے — وہ نہیں تو چنگ پھنگ پھوں کا کوئی دوسرا شاہکار۔"

"وہ کتاب "چیکو! چیکو" ! — ہاں! مجھے یاد آیا۔ میں کل ہی تو اسے پڑھ رہا تھا۔ مسٹر چنگ پھنگ، پھوں۔ یہی نام ہے نا — اس وقت چین کے کلاسیکی روایت میں لکھنے والوں میں سب سے زیادہ ممتاز ہے۔ وہ جو میں نے آپ کی کتاب پر اپنے ریویو میں لکھا تھا کہ اس کی چنگ پھنگ پھوں کی کتاب سے مشابہت ہے — تو —"

"آپ نے چینی زبان کب سیکھی تھی۔" مسٹر ذوالفقار نے بات کاٹتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "غالباً اس وقت جب میں لکڑی کے گھوڑے پر سیر کیا کرتا ہوں گا۔"

میں نے اس سوال میں نیش زنی کو نظر انداز کر کے اتنی ہی سنجیدگی سے دور ایک مفکرانہ طور پر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ غالباً ۱۹۲۸ء میں — میں اس وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔"

مسٹر ذوالفقار نے قطع کلامی کر کے مجھے مزید دروغ گوئی سے بچاتے ہوئے پوچھا۔

"آپ نے لن یوٹانگ کی کتابیں پڑھی ہیں۔ وہ سب تو انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں۔"

"میں نے جواب دیا۔" ہاں اچھا لکھتا ہے مگر خارجی اسکول کا مصنف ہے۔ میرا مطلب ہے اس میں داخلیت نہیں۔ پھر بھی برا نہیں۔ میں نے تو اس کی کتابیں اصلی چینی زبان میں پڑھی ہیں۔ ترجمہ میں دراصل وہ بات نہیں رہتی۔"

"اور ینگ پانگ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔" ذوالفقار خاں نے پوچھا

"اچھا لکھتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ اگرچہ میں نے اس کا نام کبھی نہیں سنا تھا۔ چین کی عوامی زندگی کا اس وقت وہ واحد عکاس ہے۔ مگر رومانیت پسندی اس کی تخلیقات میں جو خارجیت — اور — رومانیت کا رنگ لے آتی ہے وہ میری رائے میں اس کی اصلی خوبیوں میں سے بہت کچھ منفی کر لیتا ہے۔ پھر بھی وہ اس وقت چینی ادب کا آندرے ژید ہے —"

"معاف کیجیے" مسٹر ذوالفقار خاں نے یک لخت اٹھتے ہوئے کہا۔
"آٹھ بجے مجھے ایک ضروری کام پر جانا ہے۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔ ینگ پانگ کے متعلق آپ کے ان ارشادات کو میں یہاں کے ہر ادیب تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ خاطر جمع رکھیے اور ویسے جاتے جاتے یہ عرض کردوں کہ پنگ پلینگ ایک کھیل کا نام ہے۔ جو گیند سے میز پر کھیلا جاتا ہے۔"

"میرا مطلب طریقۂ فکر کی مشابہت سے تھا۔ آپ سمجھتے ہیں نا ۔۔۔ سبجکٹیو (طریقہ نہ کہ آبجکٹیو) آپ سمجھتے ہیں نا۔" میں نے بازو ہلا کر اسے اپنا مطلب سمجھانے کی کوشش کی۔ اور اس کوشش میں برش سے اپنی ناک پر سفیدی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

"وہ کتاب تو آپ کے پاس ہوگی ہی۔ بات یہ ہے کہ ہم نئے ادیبوں کو چینی فن کاروں کے شاہکار پڑھنے چاہئیں نیپیئر روڈ پر ایک چینی دندان ساز آہ فنگ میرا دوست ہے۔ میں اس سے اگلے ہی روز دو ڈاڑھیں نکلوا چکا ہوں۔ مسٹر ذوالفقار خاں نے حلق کھول کر اور انگلی اندر ڈال کر مجھے نکلی ہوئی ڈاڑھوں کی جائے وقوع دکھانے کی کوشش کی۔ میرا ارادہ ہے۔ کہ آہ فنگ کی مدد سے میں "چیکو چیکو!" کا اردو ترجمہ کروں۔ ورنہ آپ تو ہیں ہی۔"

"ہاں ضرور کیجیے۔ ہمیں اردو داں طبقے کو چینی ادب سے روشناس کرانا چاہیے۔ ضرور کیجیے۔" میں نے کہا

"اچھا تو مجھے وہ کتاب ایک دو دن کے لئے عنایت کر دیجیے!"

"کون سی کتاب ۔۔۔!"

میں اس کتاب کے متعلق بھول گیا تھا۔

"وہی چیکو! چیکو" ۔۔۔ چنگ پھنگ پھوں کا شاہکار۔"

"وہ کتاب ۔۔۔ ہاں! میں نے خدا جانے اس کو کہاں رکھ دیا ہے۔" میں نے کہا ۔۔۔ "پرسوں بھی تو وہ میرے پاس ہی تھی ۔۔۔ دراصل میرا بھانجہ ہے نا۔ عجیب نامعقول لڑکا ہے۔ میری کتابیں یہاں سے اٹھا کر لے جاتا ہے۔ اور بھینس کے آگے ڈال دیتا ہے ۔۔۔"

"بھینس کے آگے بس" مسٹر ذوالفقار نے کرسی پر سے ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے احتجاج کیا۔

"ہاں بھینس کے آگے ۔۔۔!" یہ اس کی "ہابیوں" میں سے ایک ہے ۔۔۔"

"مگر ینگ پانگ ایک چینی مصنف بھی تو ہے ۔۔۔ آپ مذاق تو نہیں کر رہے۔ ذوالفقار صاحب ٹھہریے! چائے تو پیتے جائیے ۔۔۔" مگر میرا ملاقاتی دروازہ کھول کر باہر جا چکا تھا ۔۔۔

صابن میرے گالوں پر سوکھ چکا تھا۔ اور ذوالفقار خاں کے چلے جانے کے بعد مجھے ایک مبہم سا احساس ہوا کہ ریویوٹری کی حیثیت سے میرا کیریر اب ختم ہو گیا ہے۔

مسٹر ذوالفقار خاں اپنے وعدے کا پکا ثابت ہوا ۔۔۔ قابل سے قابل ترین ڈھنڈورچی بھی اس خوبی سے اس کام کو سر انجام نہ دے سکتا۔ جس خوبی سے اسے ذوالفقار خاں نے کیا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر شہر کا ہر ادنیٰ آدمی کافی ہاؤس کا ہر جرنلسٹ اس قصے کو جانتا تھا۔ اور "پنگ پانگ" کے متعلق میری رائے کو قہقہوں کے درمیان۔

ادبی محفلوں میں دہرایا جاتا تھا — کم ازکم اردو کے دو ماہناموں "صبح" اور "سکرین" کے تنقید نگاروں نے طویل مقالوں میں میری خوب خبرلی — (تنقید نگاروں کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا - کاش ہم لوگوں میں یونین اسپرٹ ہوتا) — مہینے کے اندر اندر ساری ادبی دنیا اس مذاق سے واقف ہوگئی تھی - اور اب جب کہ تین ماہ بعد بھی جب لوگ مجھے دیکھتے ہیں — تو ان کی باچھیں چرنے لگتی ہیں اور وہ مجھ سے پوچھتے ہیں — "پنگ یانگ" کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ؟" —

میرے لئے گھر سے باہر نکلنا دوبھر ہوگیا ہے -

میرا دوست "خیال نو" کا ایڈیٹر اب مجھے اپنے رسالے کے لئے ریویو لکھنے کی دعوت نہیں دیتا — میں اب اس جگہ سے کوچ کرنے کا ارادہ کررہا ہوں — اس جگہ جہاں ہم زبان کوئی نہ ہو — اور مہمان کوئی نہ ہو — وغیرہ وغیرہ . . . اور جہاں ذوالفقار خاں بھی نہ ہو — !

(شمارہ ۴ — سنہ ۵۱ء)

مشہور ادبی مجلہ

فنون

اب ماہ بماہ شائع ہوتا ہے

اردو شاعری اور اردو نثر کی تخلیقی رفتار اور معیار کے مکمل اندازے کیلئے

ہر مہینے

فنون

کا مطالعہ فرمایئے

جو

احمد ندیم قاسمی

کی ادارت میں گذشتہ آٹھ سال سے شائع ہو رہا ہے

سالانہ چندہ: ۲۰ روپے - قیمت فی اشاعت: ۲ روپے - طباعت آفسٹ اینڈ لیٹر پریس سسٹم

ایجنٹس برائے کراچی اور لاہور: طاہر نیوز ایجنسی

ایجنٹس برائے صوبہ سرحد: صادق کمیشن ایجنسی

مینیجر رسالہ فنون ۴۷، انارکلی، لاہور

احمد جمال پاشا

چل مرے خامے بسم اللہ

(انجمن تحسین باہمی)

گذارشِ احوالِ واقعی

عرصے سے فقیر کے ذہن میں ایک ایسی انجمن کا پلاٹ گھوم رہا تھا، جہاں تمام انجمنوں سے جزوی و کلی طور پر یکسر مختلف ہو، جن کے عہدیداروں کے نام اخباروں میں اور جن کا وجود لاشعور میں ہوا کرتا ہے۔ اور جو صبح، شام بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ جن کا انکشاف عموماً کسی نہ کسی روزگار یا انتخاب کے انٹرویو میں اکثر و بیشتر ہوتا رہتا ہے۔ جہاں بطور ثبوت اخبارات کے تراشے ہی طرۂ امتیاز سمجھے جاتے ہیں۔

فقیر نے جس ماحول میں آنکھ کھولی، اس میں سوائے ہر سائز کی انجمنوں کے کچھ نہ نظر آیا۔ گو کہ بہت کچھ ریڈیو، اخبارات اور لوگوں کی معرفت سننے میں آیا کہ آج کل فلاں چیز کا موسم فصل یا زمانہ ہے۔ مگر دیکھنے میں صرف انجمنانِ ناپائیدار ہی آئیں۔ دیکھتے رہنے سے ایک قسم کی تحریک پیدا ہونے لگی۔ طبیعت تجربوں کی جانب مائل رہنے لگی۔ مختلف قسم کے خیالات آ آ کر گھیرنے لگے، جن سے نجات حاصل کرنے کی صرف ایک ہی ترکیب تھی اور وہ یہ کہ فقیر اپنی سرپرستی میں ایک انجمن کی بنیاد ڈال دے۔ اور فقیر نے، بار بار لفظ "فقیر" کی تکرار سے یہ مراد ہرگز نہیں لی کہ مسمی اندوے پیشہ فقیر واقع ہوا ہے یا محکمۂ انکم ٹیکس سے گریز اختیار کرنا چاہتا ہے، بلکہ محض عجز و انکسار کے اظہار کے لئے جان بوجھ کر اس لفظ کا استعمال کر رہا ہے اگر دو نواح کی زندہ و مردہ انجمنوں کے حسب نسب ٹٹولے تو یہ راز کھلا کہ فی زمانہ کسی انجمن کو وجود میں لانا سراسر مالی مشکلات میں مبتلا ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہر قسم کی انجمنیں اور ان کی شاخیں بیک وقت نہ صرف چل رہی ہیں بلکہ صدہا خانمانوں کے ذریعہ معاش کو بھی چلا رہی ہیں۔ ان سے کسی قسم کے مقابلے کا خیال بھی

مگر جس کے دل کو لگی ہوتی ہے، اس کو بہت عرصے تک اُس جھک سے باز نہیں رکھا جا سکتا۔ خامے عقلی گدے لگانے کے

دل میں لانا ان خانماتوں اعلان کے قرب و جوار کے خانمانوں سے چھیڑ چھاڑ کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

بعد فقیر ایک ایسی انجمن کا خاکہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا، جو نہ صرف فنِ انجمن سازی کی تاریخ میں مستقل اضافے کی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ ان تمام حضرات و خواتین کی توجہ بآسانی اپنی جانب مبذول کرانے میں بھی کامیاب ہو سکتی ہے جو ابھی تک کسی انجمن کا ممبر بننے کا کوئی

تجربہ نہیں رکھتے۔ لہٰذا ہمارا خیال ہے کہ

اس کے پڑھنے سے لاکھوں کا بھلا ہو گا

بہتر ہو گا کہ وہ حضرات جو مختلف وجوہ کی بنا پر لکھنے پڑھنے کی اہلیت نہیں رکھ سکے ہیں، وہ اس کو دوسروں سے پڑھوا کر اس پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے جلد اپنے فیصلے سے انجمن کے مستقل پتے پر ہم کو آگاہ کریں، اور جو حضرات پڑھے لکھے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ ہم کو اپنے مفید مشوروں سے معاف رکھیں۔ اور انھیں ضائع نہ کریں۔

اس انجمن کا نام

فی الحال ہم نے بہت سوچ سمجھ کر انجمن کا نام "انجمن تحسین باہمی" رکھ دیا ہے۔ یہ انجمن، موجودہ عالمی، اخلاقی، سیاسی، معاشی، تعلیمی اور متفرق مسائل کا واحد حل تلاش کرے گی۔ پہلے ہم اس کا نام "انجمن تریاک عالم" رکھ رہے تھے، مگر چونکہ "ادارہ تریاق کائنات" ابھی کچھ ہی عرصہ ہوا چندہ لے کر بیٹھ چکا ہے اس لئے ہم کو اپنے ارادے میں ترمیم کرنا پڑی۔

ہمیں شکایت ہے

کہ فی زمانہ انجمنوں کا کام محض ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا رہ گیا ہے۔ اس مقابلے میں وہ کبھی زمانے سے بہت آگے بڑھ جاتی ہیں اور کبھی زمانے سے بالکل ہی پیچھے رہ جاتی ہیں۔ مگر ہماری انجمن کا مقصد، ہر قسم کے مقابلے کا خیال دل سے نکال کر زمانے کے ساتھ چلنا ہو گا اس سلسلہ میں ہم اس حد تک ساتھ دینے پر تیار ہوں گے کہ اگر زمانہ ہمارے ساتھ نہیں چلتا ہے تو ہم زمانے کی انگلی پکڑ کر چلیں گے۔

ہمارا فرض ہے

کہ جب ہم نے انجمن کے نام اور کام سے آپ کو آگاہ کر دیا ہے تو ممبر سازی کی مہم سے قبل بلا آپ سے مزید کچھ چھپائے ہوئے آپ کے سامنے وہ سب کچھ رکھ دیں جس کا نام ہم نے

شرائطِ انجمن

رکھ لیا ہے۔ واضح ہو کہ ان شرائط کو تسلیم کر لینے کے بعد ہی کسی کو انجمن کا ممبر تسلیم کیا جا سکے گا۔

شرطِ اوّل

یہ طے کی جا چکی ہے کہ صرف ان ہی حضرات کو ممبر تسلیم کر لینے میں پیش قدمی کی جائے گی، جو کچھ نہ کچھ کرتے ہوں۔ مثلاً لیڈری پلیڈری وغیرہ وغیرہ ..... بادی النظر میں لیڈری ایک ایسا پیشہ سمجھا گیا ہے جس میں سب پیشے آجاتے ہیں۔ زندگی میں اگر کوئی شعبہ ہے یا نیا کھلنے والا ہے تو اس میں لیڈر ضرور رہو گا۔ ہماری مراد اسی فن شریف سے ہے جو پوری انسانیت کا خود بخود احاطہ کر لیتا ہے

بطور رعایت اس میں چھوٹے بڑے کی تخصیص نہیں کی جائے گی کیونکہ اس کا براہ راست تعلق ہماری انجمن سے اتنا نہیں، جتنا زمانے کے نشیب و فراز سے ہے۔ ہمارا کام تدبیر کرنا ہے، نہ کہ تقدیر سے اُلجھنا۔

شرط دوئم

ممبران کی مصروفیات میں کچھ مناسب ترمیم و اضافہ کیا ہے۔ ہر ممبر کو حساب دینا ہوگا کہ اس نے زیادہ سے زیادہ کتنی تقریریں یا صدارتیں کیں، کتنے مشاعروں اور عرسوں کا صدر یا سجادہ نشین بنا۔ کس کس مقام سے الیکشن کے لئے کھڑا ہوا۔ کن کن کمیٹیوں کا صدر سکریٹری یا ممبر بنا۔

شرط سوئم

کی رو سے ہر ممبر کو دوسرے ممبران انجمن کا پورا پورا خیال رکھنا ہوگا یعنی بیک وقت ایک ممبر کو دیگر ممبران انجمن کا پورا پورا خیال رکھنا ہوگا یعنی بیک وقت ایک دوسرے کی دل کھول کر زبانی و تحریری تعریف نہایت مدلل طریقے پر صاف صاف کرنی ہوگی۔ اس میں شرمانے والوں کو انجمن کا بدخواہ سمجھا جائے گا۔ مثال کے طور پر اگر الف، ب کو بھرے مجمع میں ایشیا کا عظیم ترین فن کار کہہ رہا ہو تو ب کا فرض ہے کہ وہ اس کو اسی مجمع کے سامنے نہ صرف دنیا کا بہترین نقاد تسلیم کرلے، بلکہ مجمع سے بھی اس کی حیثیت کو منوالے۔

شرط چہارم

بالکل بے مثال ہے۔ آج تک کوئی بھی انجمن اپنے ممبران کے سامنے اس کو پیش نہ کرسکی ہے۔ اس کی رو سے ممبران کو اس کا پورا پورا اختیار ہوگا کہ وہ اپنے رشتہ داروں کو ہماری برادری میں ہر وقت شامل کرکے ان کی پوری پوری تحسین کے مجاز ہوں گے۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی معقول آدمی کسی کی خاطر خواہ تعریف کردے تو اس کا پبلک پر اثر ضرور ہوتا ہے۔ جب ہماری انجمن کے بہت سے معقول آدمی بہت سے دوسرے معقول آدمیوں کی تعریفیں کرنے کا سلسلہ شروع کردیں گے، تو پبلک نہ صرف متاثر ہوگی بلکہ ہم کو بہت جلد اپنی نجات کا ذریعہ سمجھنے لگے گی۔ پبلک کے ایسا کرتے ہی ہماری انجمن کی ذمہ داریاں اور عملی مصروفیات بڑھنے لگیں گی۔ پھر ہمارا ہر ممبر سماج کے کسی نہ کسی گوشے کو سنبھال لے گا۔ انجمن کی معرفت اس سماجی تبدیلی کو ہم خاموش انقلاب کے نام سے بھی یاد کرسکتے ہیں۔

فی الحال ہم ان چار ہی شرائط پر اکتفا کرتے ہیں۔ شاید کچھ حضرات کو اعتراض ہو کہ اتنی بڑی انجمن اتنی کم شرائط پر کیسے پھل پھول سکے گی۔ تو ان کو یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہماری انجمن کی دلچسپیوں کا دائرہ میدان عمل میں زیادہ تر رہے گا۔ مگر وقتاً فوقتاً انجمن کی جو ہنگامی نشستیں برپا ہوا کریں گی ان میں ترمیمیں اور اضافے بھی عمل میں آتے رہیں گے، لہٰذا کوئی صاحب شرائط کی کمی کے سبب انجمن سے مایوس ہوتے یا کترانے کی کوشش نہ کریں ورنہ وہ گھلتے ہی رہیں گے۔

بنیادی طور پر ہماری انجمن کا مقصد ممبران انجمن کی متفقہ طور پر تحسین کرنا ہے اور فرد ہی نہیں کہ انجمن کے باہر بھی ممبران کی تعریفیں اسی شد و مد سے ہوں، اس لئے ہم جب بھی اپنے دائرے سے باہر قدم رکھیں گے تو نہایت ایمانداری سے نہایت سخت تنقید سے کام لیں گے۔ اس طرح کے ٹھوس اور عملی اقدامات سے ہمارا دائرہ روز بروز وسیع تر ہوتا جائے گا۔ رفتہ رفتہ ہمارے ہر ممبر کی حیثیت اپنے میدان میں

فطب کی سی ہو جائے گی، اور وہ بھی بلا کسی جد و جہد یا معرکہ آرائی کے!

یہ انجمن صدا زیر زمین ہی رہے گی، اور اس کی نشستیں خفیہ ہوا کریں گی۔ کسی بھی ہونے والی نشست سے ہماری مراد کسی ہونے والے ڈنر، ایٹ ہوم، بوفے یا گارڈن پارٹی سے ہے جس میں معزز ممبران کو آپس میں تبادلۂ خیالات کا مفت موقع دیا جائے گا انجمن نے کوئی

فیس داخلہ

نہیں رکھی ہے۔ ہر وہ شخص جو ہمارے مفاد سے ٹکرائے نہیں اور ہماری شرائط کو تسلیم کرے، پالیسی کے مطابق وہ ہماری انجمن کا ممبر تسلیم کیا جائے گا۔ اس انجمن کا نہ کوئی سرپرست ہوگا اور نہ داعی، فی الحال، اس کو کارکنان قضا و قدر چلائیں گے اور اس میں فقیر کی حیثیت ہرگز کنوینر سے زیادہ نہ سمجھی جائے گی۔

ہم نے اس انجمن کی بنیاد "چندوں" پر نہیں رکھی ہے۔ اور نہ ہمارا ارادہ خواص یا عوام کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنے کا ہے۔ مگر پبلک کے بے حد اصرار پر ہم نے اس کا ضرور التزام رکھا ہے کہ ہمارا ہر ممبر اپنی تازہ ترین کامیابی کے موقع پر ممبران انجمن کو ایک پرتکلف دعوت کے ذریعہ اظہار تشکر کا موقع فراہم کرے۔ اور ہمیشہ کرتا رہے۔ اس قسم کی دعوتوں کا تسلسل انجمن کی کامیابی کی دلیل سمجھی جائے گی۔

ہم دعویٰ کرتے ہیں

کہ انجمن کی یہ مقامی صورت بہت جلد صوبائی اور پھر ملکی صورت اختیار کر لے گی اور قومی فرائض تحسین کا دائرہ بڑھ کر آفاقی شکل اختیار کر لے گا، اور کیا عجب کہ آج جس انجمن کی تشکیل میرے یا آپ کے ہاتھوں ہو رہی ہے کل اسی کی روئداد اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم سے نشر ہو اور ہم رنگ، نسل، قومیت وغیرہ ہر قسم کے امتیاز سے آزاد و بلند و بالا ہو کر "انجمن تحسین باہمی" کے مفاد کے لئے ہر غیر ممکن کو ممکن اور نامناسب کو مناسب بنا کے دکھادیں۔

لہٰذا

ہماری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنی پہلی فرصت میں "شرائط انجمن" قبول کرکے اس کو پھلنے پھولنے کا موقع دیں۔ ہماری اپیل ہر اس شخص سے ہے جو کسی نہ کسی چیز میں دلچسپی لیتا ہے اس چیز کے تحفظ، توسیع، ارتقاء، بقا اور کامیابی کی خاطر ہماری جانب قدم بڑھائے ہم اس کے منتظر ہیں۔ ہمارے منتظر ہونے سے ہماری مراد یہ ہے کہ ملک و قوم کی تقدیر اس کی منتظر ہے۔ دنیا کا مستقبل اس کی جانب پر امید نظروں سے دیکھ رہا ہے

نوٹ

درخواست کنندگان کو لازم ہے کہ وہ بطور ضمیمہ ایک فہرست ان تمام حضرات کی ضرور بھیجیں جن میں وہ ممبر ہونے کی فطری صلاحیتیں پاتے ہیں یا جو ان کے حلقۂ احباب کے دائرے میں آنے کی وجہ سے ان کے لطف و کرم کے مستحق ہیں تاکہ بقیہ ممبران انجمن کو خبردار کیا جاسکے کہ وہ فلاں ابن فلاں احباب کی رو سے تمام رعایتوں کے حقدار" انجمن تحسین باہمی" کی جانب سے تسلیم کئے جاتے ہیں (نوٹ ختم)

ہمارا نعرہ

انجمن تحسین باہمی ـــــ زندہ باد!

ممبران انجمن ـــــ پائندہ باد!

یوسف ناظم

ابنِ سقراط کا خط
بنتِ بقراط کے نام

زیتون کی ڈال! یونہی لچکتی رہو۔

کل مقدونیہ کے سبزہ باغ میں تمہیں جھولا جھولتے دیکھ کر میں فرطِ محبت سے کانپنے لگا۔ محبت کا غلبہ اتنی شدت سے شاید ہی کبھی کسی اور پر ہوا ہو۔ تم پینگ لیتے وقت اوپر سے نیچے کی طرف آتیں تو ایسا معلوم ہوتا جیسے شیر کچھار سے نکلا ہو، اور جب تمہارا جھولا نیچے سے اوپر کی طرف جاتا تو تم سرسبز و شاداب گل مہر کا درخت نظر آتیں۔ ایک مرتبہ تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے تم دھنک بن کر لہرا گئی ہو۔ میں اسی لمحے میں تم پر فدا ہو گیا۔ کیونکہ فدا ہونے کے لئے اس سے بہتر شاید ہی کوئی اور موقع ہوتا۔ تم جھولا جھول کر جب زمین پر اتریں تو مجھے تمہارے قد کا صحیح اندازہ ہوا۔ مجھے تمہارے ہی قد کی لڑکی کی تلاش تھی۔ انسان کے جسم کی ساری چیزیں عبث ہیں اور انسان کی زندگی ہی میں اس کا ساتھ چھوڑ دینے والی ہیں۔ صرف اس کا قد ہے جو آخر تک اس کا ساتھ دیتا ہے۔ یہ بات میں نے اپنے باپ سے معلوم کی ہے۔ گو میرے والد کا خیال ہے کہ بعض صورتوں میں آدمی کا قد بھی جواب دے دیتا ہے۔ میں بھی سوچتا ہوں کہ کمر خمیدہ لوگوں کا صحیح قد کیسے ناپا جاتا ہوگا۔ لیکن یہ ایک الگ بحث ہے اور صرف چند صورتوں میں ایسا ہوتا ہے۔ ورنہ لوگ اپنا قد ہمیشہ برقرار رکھتے ہیں۔ تمہارا قد میرے قد سے کچھ نکلتا ہی ہوا ہوگا نکلا کرے۔ اس سے میری قیمت میں کمی نہیں آسکتی۔ ہم یونانیوں کو ہمیشہ پنجوں کے بل کھڑے رہ کر محبت جتانے کی عادت رہی ہے۔ (میرے والد کے شاگرد افلاطون، محبت کے بارے میں ہمیشہ مجھے کوئی نہ کوئی بات سمجھاتے رہتے ہیں)۔

تمہارے قد کے علاوہ مجھے تمہاری دوسری چیز جو پسند آئی وہ تمہارا خاص الخاص حُلیہ ہے۔ حُلیہ آدمی کا ہمیشہ ایسا ہونا چاہئے کہ اس کی نقل نہ ہو سکے۔ یونانی شاعروں نے اپنی اپنی محبوباؤں کے بارے میں کئی شعر کہے ہیں۔ یہ سارے شعر ایک سے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے ان سب کی محبوبائیں توام بہنیں ہیں۔ لیکن تم ان سب سے مختلف ہو۔ مگر تم یہ سیا ہیا نہ لباس نہ پہنا کرو۔ یہ بھی کوئی پہناوا ہے جس میں معلوم نہ ہو سکے کہ آدمی کہاں چھپا ہوا ہے۔ تم اپنے والد سے کہہ کر اپنے لئے کسی نئی طرز کا لباس سلواؤ۔ تمہارے والد بہت ذہین آدمی ہیں، اور ان کا دماغ ہر معاملے میں خوب کام کرتا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں وہ میرے والد سے بھی زیادہ عقل مند ہیں۔ کیا تم نے اپنے والد کے دماغ کی کوئی رمق ورثے میں پائی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اولاد میں والدین کی ذہانت منتقل نہیں ہوتی، بلکہ کچھ ایسی عادتیں منتقل ہو جاتی ہیں جو نہیں ہونی چاہئیں۔ میرے ساتھ بھی یہی

واقعہ ہوا ہے۔ میرے والد کی ساری ذہانت افلاطون کے حصے میں آگئی ہے۔ (پتہ نہیں یہ کیونکر ہوا۔ لیکن تم دیکھنا افلاطون کے ساتھ بھی آگے چل کر یہی ہوگا۔ اور اس کی ذہانت بھی اس کی اولاد میں نہیں، شاگردوں ہی میں بٹے گی) لیکن چونکہ تمہارے والد کا کوئی شاگرد نہیں ہے اس لئے تم شاید محروم نہ رہی ہو۔ میں اسی بھروسے پر تم سے ربط بڑھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے صاف صاف بتاؤ کہ تم کتنی سمجھدار ہو۔ اگر تم بھی میری طرح غبی نکلیں تو ہم دونوں کہیں کے نہ رہیں گے۔ افلاطون کا خیال ہے میں بالکل کند ذہن ہوں۔ سوائے محبت کے مسائل کے اور کوئی نکتہ میرے دماغ میں پرورش نہیں پاتا۔ تم مجھ سے ملنے سے پہلے اگر ایک مرتبہ افلاطون کا ایک انٹرویو دو تو ٹھیک رہے گا۔ تمہارے اس انٹرویو کے بعد میں افلاطون سے مشورہ کر لوں گا۔ لیکن کہیں افلاطون کی باتوں پر لٹو نہ ہو جانا۔ یہ بڑا حاضر دماغ شخص ہے۔ میرے والد جو بھی کہتے ہیں خود انہیں تو یاد نہیں رہتا لیکن اس منحوس کو برابر یاد رہتا ہے۔

تم اگر سبز باغ میں کبھی جھولا جھولنے جاتی والی ہو تو مجھے ضرور اطلاع دینا۔ یوں بھی میں وہاں اکثر موجود رہتا ہوں، اور جھولوں کے ارد گرد ہی پایا جاتا ہوں۔ جھولا جھولنے والی لڑکیاں مجھے سلام اور پیار بھی کرتی ہیں، اور میں سبھی کو خط بھیجا کرتا ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ کیا تم کھانا پکانا بھی جانتی ہو۔ یقیناً جانتی ہوگی۔ اور تمہارے ہاں کھانے فارمولوں کے مطابق پکائے جاتے ہوں گے جبھی تو تم اتنی تندرست اور توانا نظر آئیں۔ ہمارے ہاں تو کھانے پکانے کا کوئی ڈھنگ ہی نہیں۔ جیسا پک گیا ہم لوگوں نے کھا لیا۔ ہمارے والد صاحب کو کھانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تو کہتا ہوں انہیں ذائقہ محسوس کرنے والی زبان ہی نہیں ملی صرف بولنے والی زبان ملی ہے۔ میں تو اکثر دوستوں کے ہاں جا کر اپنا پیٹ بھرتا ہوں۔ خود افلاطون کے ہاں کونسا اچھا کھانا پکتا ہے۔ اور رہتا بھی تو وہ دن بھر یہیں ہے — اچھا کھانا میری کمزوری ہے۔ میری کمزوریاں اور بھی بہت سی ہیں، تم خود رفتہ رفتہ واقف ہو جاؤ گی — ہاں مجھے گھوڑے کی سواری کا البتہ بہت شوق ہے اور بعد میں تم بھی چاہو تو سیکھ سکتی ہو، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس سے بھوک کھلتی ہے۔ گھوڑے کی بھی اور سوار کی بھی۔ تمہارے لئے ابھی سے میں ایک عمدہ گھوڑی کی تلاش شروع کر دیتا ہوں۔ تمہارے لئے سفید رنگ کی گھوڑی مناسب رہے گی۔ تم دیکھنا تو سہی کیا عمدہ چیز ڈھونڈ کر لاتا ہوں تمہارے لئے — سارا یونان اس پر فدا ہو جائے — افلاطون بھائی سے جب تم ملو تو اسے اپنے سیدھے ہاتھ کی انگلی کا ناپ بھی دے دینا۔ یاقوت کی انگوٹھی تو تمہیں پسند ہی آئے گی۔ اصل میں ہے یہ کہ میرے والد کے پاس ان کے معتقدین کے دیئے ہوئے کئی یاقوت یونہی پڑے ہوئے ہیں۔ ایک انگوٹھی تمہاری بن جائے گی تو ہمارا کیا نقصان ہو جائے گا۔ یاقوت کے علاوہ اگر تمہیں اور کوئی پتھر پسند ہو تو مجھے بلا تکلف لکھ دینا۔ غالباً سنگ ستارہ بھی ہمارے ہاں پڑا ہوگا۔ یہ بڑھیا جو میرا خط لے کر تمہارے پاس آرہی ہے بالکل بھروسے کی عورت ہے اور میرے علاوہ اور بھی لوگوں کی یہ خدمت سر انجام دیتی آئی ہے۔ میں نے اس سے پہلے جہاں جہاں بھی خط بھیجے اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ پہونچا دیئے تھے۔ اور ان لڑکیوں کے والدین یا بھائیوں کو ان کی ہوا بھی نہیں لگی تھی۔

کاش میں سب سے پہلے تمہیں ہی خط لکھتا، تم بڑے باپ کی بیٹی ہو۔ اور اگر ہم دونوں کے والد آپس میں سمدھی بن جائیں تو کتنا اچھا ہو۔ یوں بھی لوگوں کو ان کے نام سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں اگر بھائی نہیں تو ہم زلف تو ضرور ہوں گے۔

فقط۔　　　　تمہارا — ابن سقراط

(شمارہ ۱۹۸-۱۹۷، سنہ ۱۹۶۸ء)

دل کش شخصیت

بِناکا کی مسکراہٹ اس قدر دل کش کیوں ہوتی ہے؟
بِناکا کی دنیا اس قدر پُر مسرت کیوں ہوتی ہے؟
یہ بِناکا ہی سے پوچھئے... بِناکا کے ہر ٹیوب میں آپ کے لئے شخصیت کی دل کشی کے تمام اسباب مہیا ہوتے ہیں۔ آج ہی بِناکا ڈینٹل کریم کا ایک ٹیوب خریدیے۔ خواہ سادہ یا کلوروفل کے ساتھ، خواہ اسٹینڈرڈ سائز یا فیملی سائز۔

صبح بِناکا شام بِناکا   روشن تیرا نام بِناکا

سیبا (پاکستان) لمیٹڈ۔ ۱۵۔ ویسٹ وہارف۔ کراچی
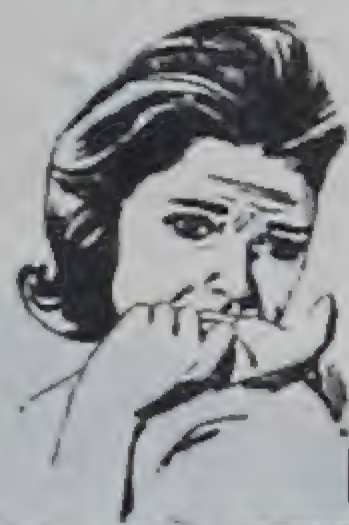
Binaca
Binaca
Binaca
Binaca
New Quality

KEYMER

CBP 9 · 3/70

AIC
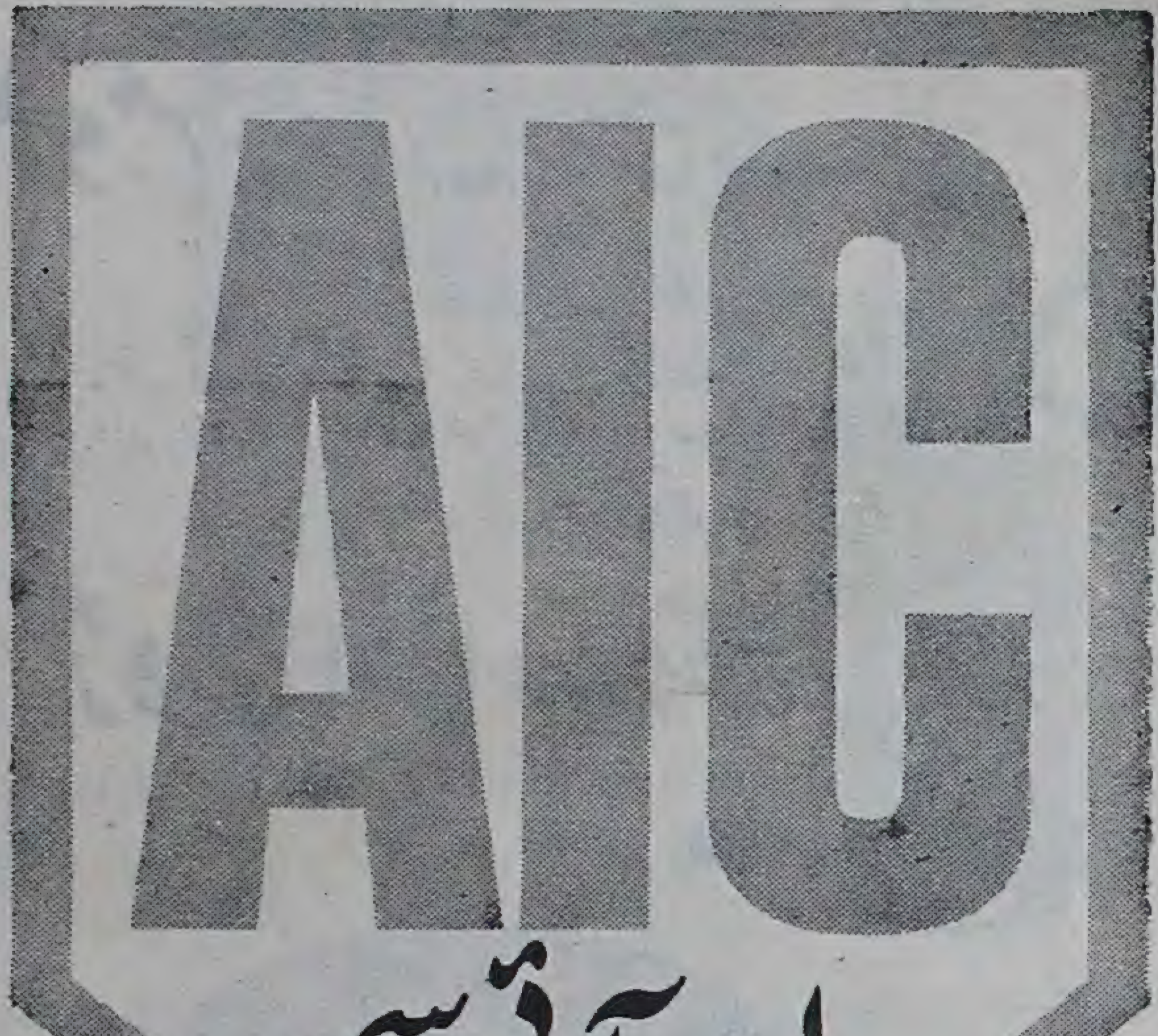
اے آئی سی
آپ کے لئے
تحفّظ کا منصوبہ

شوہر بنے... باپ بنے... ابھی شوق پورے نہ ہوئے کہ ذمے داریوں کے احساس نے جھنجوڑ دیا۔ وسوسے بے چین کرنے لگے۔
ذمے داریاں نباہنی پڑتی ہیں۔ اور اہم ذمے داریاں بہتر نباہنے کا بہتر ذریعہ ہے۔ اے آئی سی!
اے آئی سی کے یہاں بیمہ پالیسی تیار کرتے وقت آپ کے سبھی تقاضوں کو سامنے رکھا جاتا ہے تاکہ یہ پالیسی مستقبل کے تحفظ کا ایک بھرپور منصوبہ ثابت ہو۔
اے آئی سی کے پریمیم بھی اوروں سے کم ہیں

اور بامنافع پالیسیوں پر وافر بونس ملتا ہے۔
اے آئی سی حالات کو پُرامید بناتی ہے۔
مزید معلومات کے لئے یہ کوپن پُر کرکے کسی ایک پتہ پر بھیج دیجئے۔

کراچی: پوسٹ بکس نمبر ۵۰۳۸۰، کراچی
لاہور: پوسٹ بکس ۲۲۰، لاہور
راولپنڈی: پوسٹ بکس ۹۲، راولپنڈی

نام ....
پتہ ....
تاریخ پیدائش ....
آمدنی ....
WL

آدم جی انشورنس۔ ہم ذہنی سکون دیتے ہیں۔

AIC.I.74.70.UD
LINTAS 66

JAMIA
PETROLEUM

پاکستانیوں سے بہتر امیدیں ـ
اور جامعہ سے بہترین توقعات ـ

جامعہ

پٹرولیم کی صنعت میں
اوّلین پاکستانی ادارہ

- جملہ صنعتی ضروریات کے لئے خصوصی پٹرولیم لُبریکینٹس بنانے والا سب سے بڑا ادارہ -
- افواجِ پاکستان کو لُبریکینٹس اور گریس کے سب سے بڑے سپلائر-
- ڈائریکٹوریٹ آف انوسٹمنٹ پروموشن اور سپلائز کی پٹرولیم لُبریکینٹس اور گریس کی جملہ ضروریات کے سب سے بڑے سپلائر-

1149A
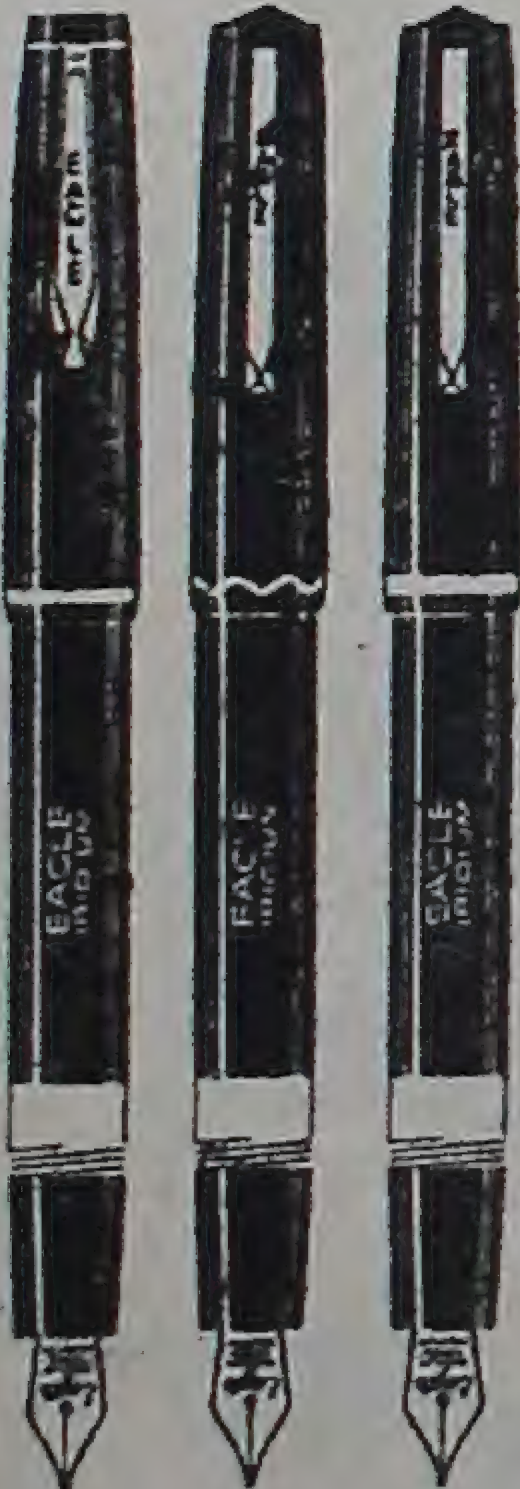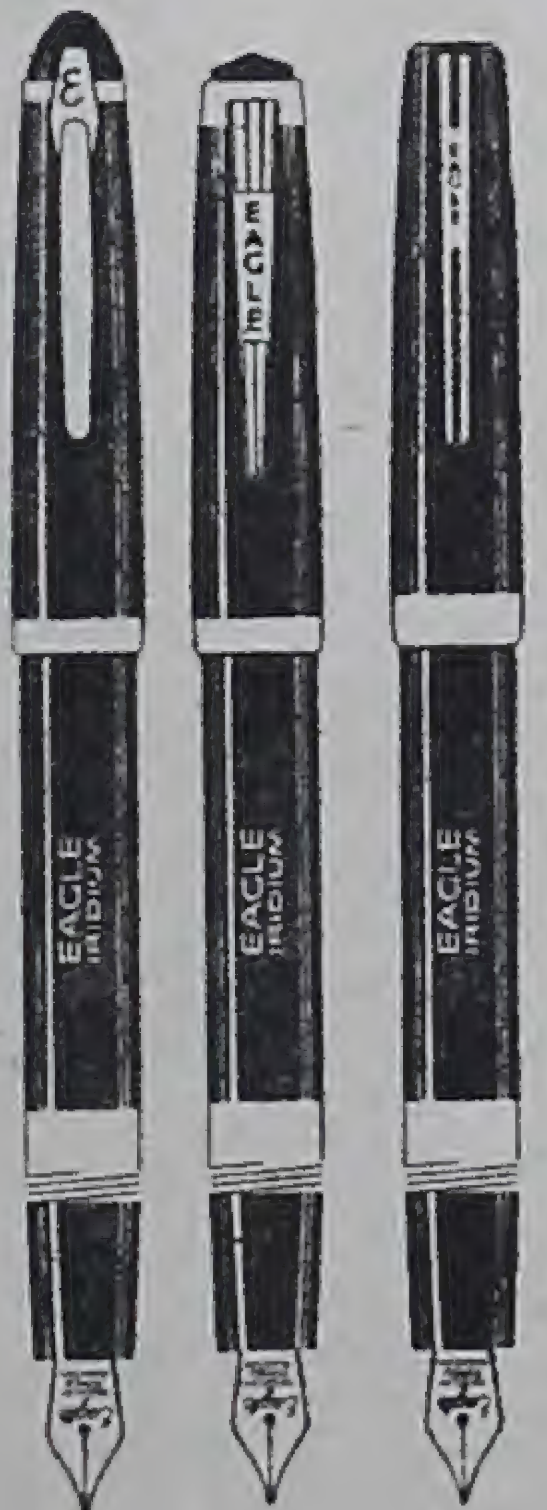
کراچی میں آپ کے میزبان
ہوٹل نیشنل سِٹی
ریگل ریڈیو اینڈ ٹی۔وی مارکیٹ — صدر
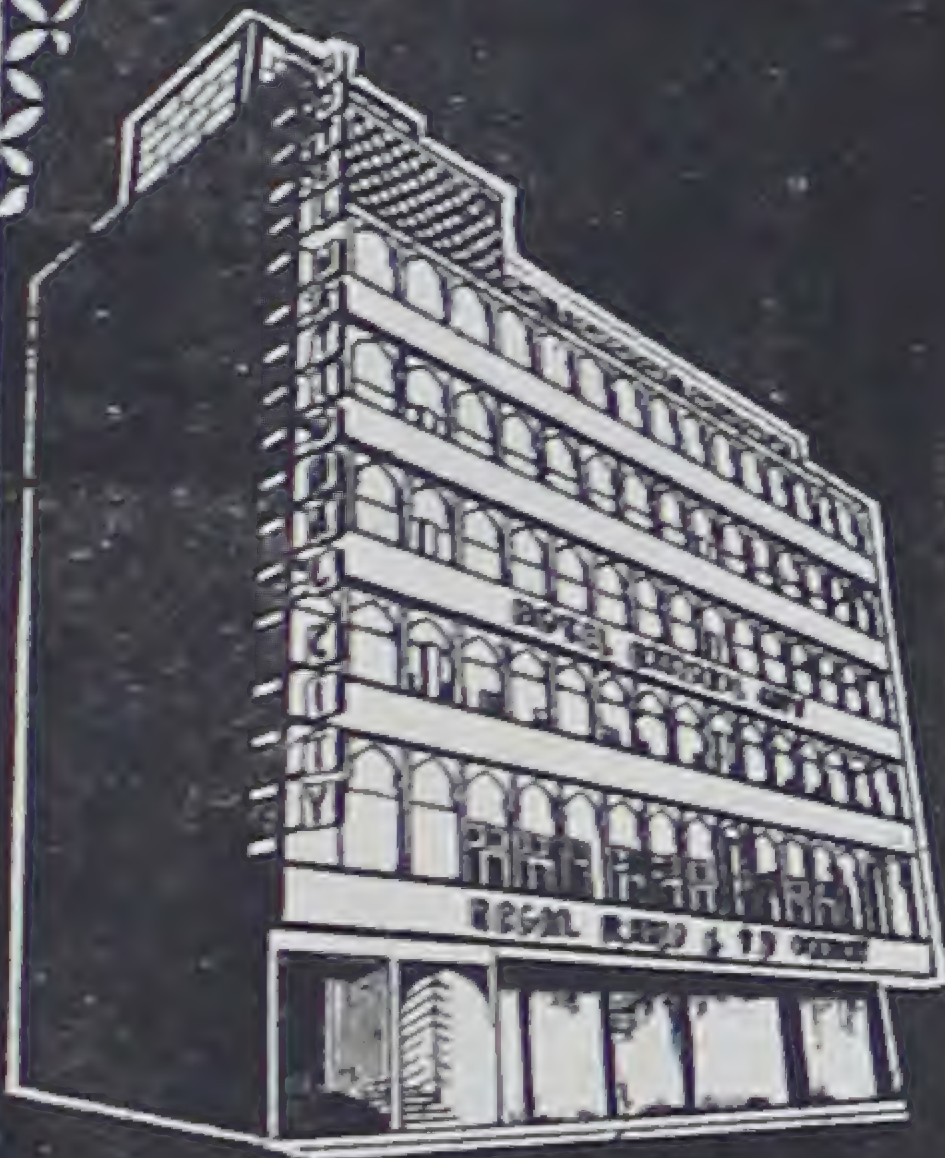
شہر کے قلب
میں واقع

★ پُر تکلف
★ کم خرچ
★ ایئر کنڈیشنڈ
★ ہر کمرے میں ٹیلیفون
★ ہر منزل پر لفٹ کی سہولت
★ نفیس پاکستانی و مغربی کھانے
★ بالائے بام، ہمارے مسرور لاؤنج میں
"اِسٹینکر" کی خصوصی پیشکش

آپ کی میزبانی — باعثِ شادمانی

HNC

تار کا پتہ:- "HOTELCITY" ٹیلیفون:- ۵۱۳۹۰۱ - ۵۱۳۸۵۰ (۵ لائین)

مغربی پاکستان میں فروخت ہونے والی گاڑیوں میں
ہر تیسری گاڑی ٹویوٹا

کورونا مارک ۲
بے شمار خوبیوں
کی حامل ہے ۔
مثلاً — طاقتور ،
۸۲ ہارس پاور انجن ،
جو قطعی تکلیف نہیں دیتا
اندرون کار کشادہ اور آرام دہ
جگہ ۔ لمبی چوڑی باڈی ۔
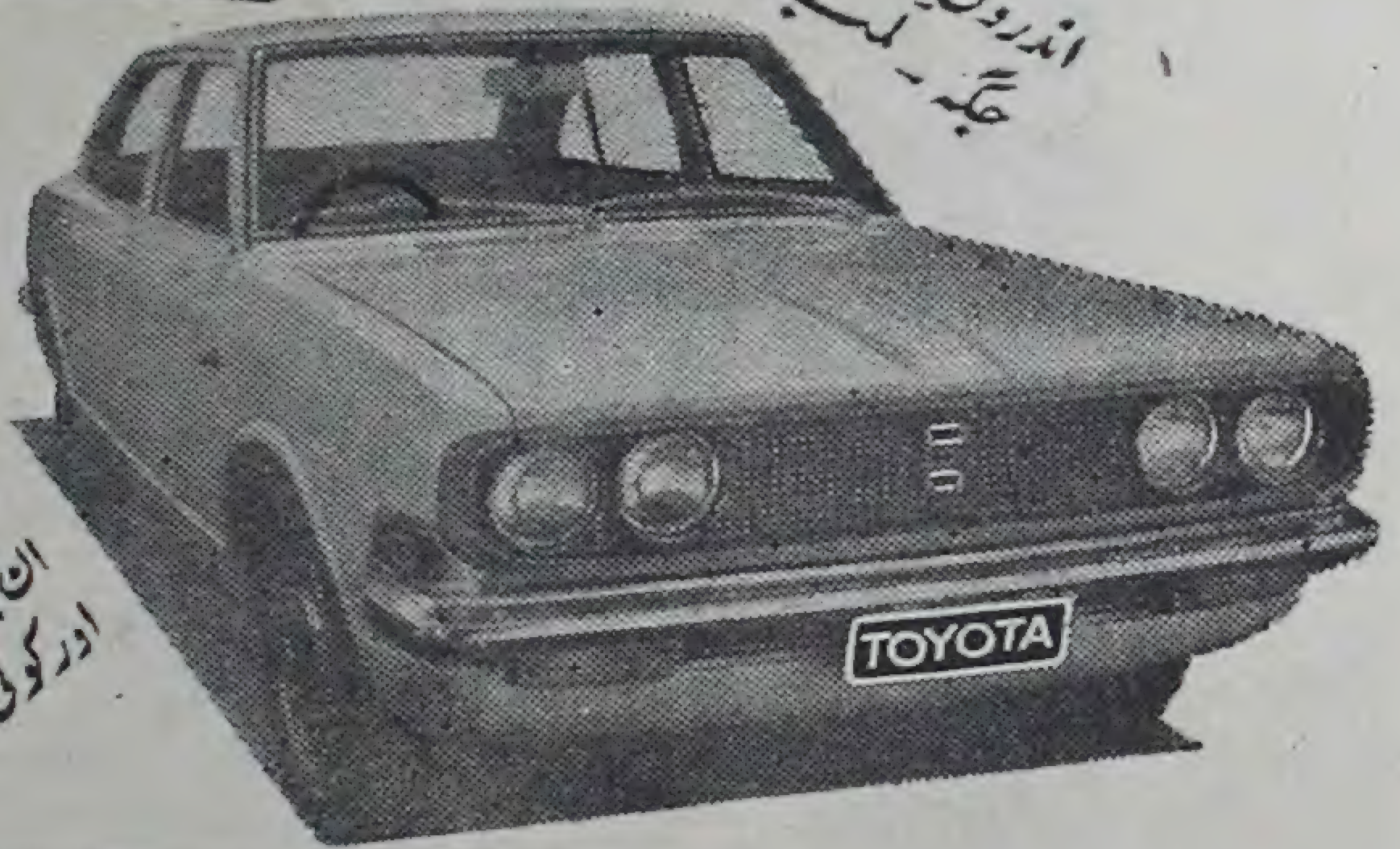
اعلےٰ سسپنشن ۔
فوری پک اپ اور
ایک گیلن میں ۳۵ میل
کا سفر طے کرتی ہے ۔
اس کے علاوہ
فروخت کے بعد معقول سروس ۔
ان ہی خصوصیات کے سبب ٹویوٹا کا
اور کوئی کار مقابلہ نہیں کر سکتی ۔

TOYOTA

TOYOTA

TOYOTA

MORNOO

منسوب موٹرز

ایک بار ٹویوٹا ۔ ہر بار ٹویوٹا

M.M. 7.70

ASIATIC

میرزا ادیب

شہید

(تمثیل ایک باب میں)

کردار

* رضیہ
* ماں
* باپ
* شاداں
o اور
* ایک سایہ

زمانہ : ۶ر ستمبر ۱۹۶۶ء

مقام : شہر قصور کی ایک نواحی بستی

جائے وقوع : ایک دو منزلہ مکان کا نچلا کمرہ۔

وقت : شام۔

منظر : اسٹیج جس کمرے کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ ہمیں پہلا تأثر یہ دیتا ہے کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی بھارتی بمباری سے یہ مکان جس کا یہ کمرہ ایک حصہ ہے، کافی حد تک متأثر ہو چکا ہے، اور اب گھر والے اس کی آرائش و تہذیب کی طرف توجہ نہیں دیتے۔

کمرے کا سامان کسی ترتیب سے نہیں رکھا گیا۔ دیواروں میں کچھ دراڑیں دکھائی دے رہی ہیں ــ سامنے کی دیوار میں ایک دروازہ ہے جس کا ایک پٹ کھلا ہے۔ اس پٹ میں سے اوپر جانے والی سیڑھیاں نظر آ رہی ہیں۔

دوسرا دروازہ دائیں دیوار میں ہے، جس کے آگے صحن ہے۔ باہر اندر آنے کے لئے یہی دروازہ استعمال ہوتا ہے۔

کمرے کے درمیانی حصے میں ایک میز، اس پر کپڑوں سے یکسر محروم دو گل دان۔ چائے کی ٹرے، چند خالی پیالیاں، ایک پلیٹ، پلیٹ پر روٹی کے کچھ ٹکڑے، ان کے علاوہ جاوید کی کم و بیش ایک فٹ اونچی اور ایک فٹ سے کچھ کم چوڑی تصویر (تصویر کے رنگین فریم کے) پر ایک سنہری ہار، یہ ہار فریم کے اوپر ٹنا ہوا میز

پر پھیلا ہوا ہے۔
ادھر اُدھر چار کرسیاں، ایک صوفہ سیٹ،
صوفوں پر میلے کپڑے، کتابیں اور اخبارات،
کمرے کے بلب روشن ہیں۔
پردہ اُٹھنے پر ہم رضیہ کو دیکھتے ہیں جو میز
کے پاس ایک کرسی پر اس انداز سے بیٹھی
ہے کہ اس کا منہ میز کے سرے پر جھکا ہوا
ہے۔ اور باہر سے سر اور چہرے کو اپنے
حلقے میں لے رکھا ہے۔ اُس کا جسم مسلسل
کانپ رہا ہے، معلوم ہوتا ہے سسکیاں
بھر رہی ہے۔
صحن والے کمرے سے ماں آتی ہے۔ عمر
چالیس کے لگ بھگ۔ چہرہ اداس اور ستا
ہوا۔ لباس شلوار، قمیص اور دوپٹہ۔
وہ بیٹی پر نظریں جمائے آگے بڑھتی ہے۔
اُس کے پاس آتی ہے اور جھک کر آہستہ سے
اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔
رضیہ کی کپکپاہٹ بڑھ جاتی ہے۔

ماں : رجو! ۔۔ نہ بیٹی! نہ!
رضیہ : (سر اٹھائے بغیر) ام ۔ ی ۔ ی!
ماں : اُٹھو ۔۔ رجو! اُٹھو نا بی بی رانی!

(ماں اُس کے دائیں بازو پر ہاتھ رکھ دیتی
ہے)
شاباش! اُٹھ بیٹھو!
(رضیہ اُٹھنے لگتی ہے۔ سسکیاں ابھی تک
بھر رہی ہے۔ رخسار آنسوؤں سے تر معلوم
ہوتے ہیں، آنکھیں سوجی ہوئی ہیں، وہ اُٹھ
نگاہیں جھکائے کھڑی ہے۔

ماں شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے
لگتی ہے۔
رضیہ کی عمر دس برس سے زیادہ نہیں ہے،
لباس وہی جو ماں کا ہے۔ ایک لمحے کے
لئے سر اٹھا کر ماں کو دیکھتی ہے، اور پھر
بے اختیاری کے عالم میں دائیں ہاتھ سے
چہرہ ڈھانپ لیتی ہے۔ اور ایک قدم اور
ماں کے قریب ہو جاتی ہے۔
ماں اِسے خود سے لپٹا لیتی ہے)

ماں : رجو! چُپ، بیٹی چُپ!
رضیہ : (ماں سے الگ ہوتے ہوئے)
امّی!
ماں : جاؤ بیٹی! ہاتھ منہ دھولو!

(رضیہ صحن والے کمرے کی طرف جانے لگتی
ہے۔ ماں اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہتی
ہے۔ جب وہ دروازے میں سے گذر جاتی
ہے، تو تصویر کو دیکھتی ہے۔ ایک آہ بھرتی
ہے اور ٹرے میں پلیٹ اور خالی پیالیاں
رکھنے لگتی ہے۔
صحن والے دروازے میں باپ آتا ہے۔
اُدھیڑ عمر کا آدمی، کمر کسی قدر جھکی ہوئی،
کھچڑی داڑھی، آنکھوں پر عینک، ہاتھ
میں چھڑی، پاجامے، کرتے اور واسکٹ
میں ملبوس۔ دائیں شانے پر ایک پیلے رنگ
کا پٹکا۔ چہرہ افسردہ، مگر معلوم ہوتا ہے
اپنی افسردگی پر قابو پانے کا ڈھنگ آتا
ہے۔
ماں اپنے کام میں مصروف ہے)

باپ : فاطمہ!

(ماں ہار وہیں میز پر رکھ دیتی ہے اور شوہر کو دیکھتی ہے)

ماں : آپ کہاں چلے گئے تھے؟

باپ : یہیں تھا۔ رجّو کہاں گئی؟

ماں : میں آئی تو میز پر سر رکھ کر رو رہی تھی۔

باپ : بچی ہے نا، صبر آتے آتے آئے گا!

ماں : اور آج کے دن تو زخم ہرے ہو گئے ہیں — ہم سب کے!

باپ : آج کے دن......

(فقرہ مکمل نہیں ہے)

اور اب کہاں ہے؟

ماں : میں نے کہا تھا خود کو سنبھالو، منہ دھونے غسل خانے میں گئی ہے!

باپ : صبر کی تلقین کرو اسے!

ماں : صبر کی تلقین! — کس طرح کروں؟

باپ : یہ ہار کس نے ڈالا ہے؟

(باپ آگے بڑھ کر چھڑی میز پر رکھ دیتا ہے اور تصویر پر نظر ڈالتا ہے)

ماں : رجو نے — بھائی کے گلے میں تو نہ ڈال سکی اس کی تصویر......

(ماں فقرہ مکمل نہیں کر پاتی۔ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھنے لگتی ہے)

باپ : اللہ کو یہی منظور تھا۔ اور فاطمہ!

ماں : جی؟

باپ : یہ سعادت دنیا میں بڑے خوش قسمت ہی کے حصے میں آتی ہے۔ شہادت کو تم کیا سمجھتی ہو؟ وطن کی خاطر جان دینا یہ شرف ہر ایک کو کب ملتا ہے؟

ماں : اچھا، اللہ ہمیں صبر دے! میں نے کہا رجو کے ابا!

(ماں سر اٹھا کر شوہر کو دیکھتی ہے)

باپ : کہو۔

ماں : تصویر اٹھا کر کہیں چھپا نہ دوں؟

(ماں شوہر کے جواب کا انتظار کئے بغیر تصویر اٹھانے لگتی ہے۔ دروازے پر رضیہ آتی ہے)

رضیہ : امی!

(ماں شوہر کو دیکھتی ہے۔ جیسے پوچھ رہی ہے کہ تصویر لے جاؤں یا یہیں رہنے دوں)

باپ : (ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے) رہنے دو۔

(ماں تصویر وہیں رکھ دیتی ہے۔ رضیہ آگے آتی ہے اور ہار کی ترتیب درست کرنے لگتی ہے — ماں اور باپ دونوں کی نظریں اس پر جمی ہوئی ہیں)

باپ : رجو بیٹی!

رضیہ : جی ابا جان!

(رضیہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر ہار کا جائزہ لینے لگتی ہے)

باپ : تم نے پرسوں ترسوں کہا تھا مجھ سے کہ واپسی پر تمہارے لئے ٹافیاں لیتا آؤں! مجھے یاد ہی نہیں رہی یہ بات! چلو اب لے آئیں، جو ٹافیاں اچھی لگیں لے لینا۔ ٹھیک ہے نا!

(رضیہ نفی میں سر ہلاتی ہے)

ماں : کیوں رجو!
باپ : تم نے خود ہی تو تاقیوں کے لئے کہا تھا۔
ماں : جاؤ بیٹی۔
رضیہ : نہ امی!
ماں : مگر کیوں؟
رضیہ : جی نہیں چاہتا۔
باپ : چلو تو سہی۔ بڑی دوکان پر چلیں گے۔ وہاں بہت سی نئی چیزیں آئی ہوئی ہیں۔
(باپ دروازے کی طرف جانے لگتا ہے۔ رضیہ ابھی تک وہیں کھڑی ہے)
ماں : جاؤ نہ رجو! تمہارے ابا جی کہہ رہے ہیں، کیا ان کا کہا نہیں مانو گی؟
(رضیہ دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگتی ہے۔ دونوں دروازے میں سے نکل جاتے ہیں۔ ماں تصویر کو دیکھتی ہے۔ اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلتا ہے: "میرا لال!"۔ وہ میز کے پاس کھڑی ہے کہ صحن والے دروازے سے آواز آرہی ہے "رضیہ!"۔ ماں مڑ کر دیکھتی ہے۔ اور کہتی ہے "آؤ شاداں بہن!"۔ دو تین لمحوں کے بعد شاداں آتی ہے۔ ماں کی ہم عمر — لباس وہی — شاداں آگے بڑھتی ہے۔ اس کا چہرہ مسکرا رہا ہے مگر جیسے ہی تصویر پر نظر پڑتی ہے اُداس سی ہو جاتی ہے)
شاداں : کیا بات ہے، آج دن بھر اُدھر نہیں آئیں۔ میں تو سمجھتی تھی تم لوگ گھر پر ہو ہی نہیں، اتنی خاموشی!
ماں : ہم تو کہیں بھی نہیں گئے۔ یہیں رہے دن بھر۔!
شاداں : کوئی آواز نہیں آئی۔ نہ تمہاری نہ رضیہ کی!
ماں : کیا بتاؤں بہن!
شاداں : خیر تو ہے۔ کوئی خاص بات؟
ماں : آج جاوید کی چوبیسویں سالگرہ ہوتی۔
شاداں : ۱۶ ستمبر کو!
ماں : یہی اس کے پیدا ہونے کا دن ہے اور یہی دن — ۔۔۔۔
(ماں شدتِ تاثر سے خاموش ہو جاتی ہے)
شاداں : دکھ تو ہونا ہی ہے ماں باپ کو —
(شاداں جھک کر تصویر دیکھتی ہے)
کتنا خوب صورت نوجوان تھا!
ماں : تصویر تو اس کے سامنے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی۔ تمہارا کنبہ پچھلے سال یہاں نہیں تھا، ورنہ تم اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتیں! اب تو چلا گیا ہمیشہ کے لئے!
شاداں : تصویر ہی کو دیکھا جا سکتا ہے!
ماں : یہی دن تھا — وہ چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ صبح سے گھر میں بڑی رونق تھی۔ میری رجو نے یہاں رنگا رنگ جھنڈیاں لگا رکھی تھیں — سب عزیز، ہمسائے، دوست جمع کر رکھے تھے۔ اتنی چہل پہل اتنا ہنگامہ تھا کہ لگتا تھا کسی کی شادی ہو رہی ہے — رجو کو بھائی کی سالگرہ منانے کا بڑا شوق تھا۔ کئی ماہ سے وہ اس دن کا

انتظار کر رہی تھی۔ دوست احباب میرے جاوید کو تحفے دے رہے تھے۔ رجو نے ایک ایک پیسہ جمع کر کے جو ہار خریدا تھا، وہ الماری میں سے نکال کر خوشی خوشی بھائی کی طرف لے جا رہی تھی کہ عین اسی وقت.....

(ماں ایک لمحے کے لئے رُک جاتی ہے)

شاداں : کیا ہوا؟

ماں : دروازے پر دستک ہوئی۔ جاوید کو ڈیوٹی پر حاضر ہونے کا حکم مل گیا تھا۔ حکم ملتے ہی وہ جانے لگا۔ ہم نے روکا تو کہنے لگا: وطن نے مجھے پکارا ہے میں نہیں رُک سکتا!

شادان : اسی وقت چلا گیا۔

ماں : اُسی گھڑی! اُسی لمحے! ـــ بہن کہتی رہی بھائی جان یہ ہار تو گلے میں ڈال لو۔ مگر نہ مانا۔ بولا: واپس آ کر یہ ہار اپنے گلے میں ڈالوں گا ـــ اور چلا گیا۔ رجو ہار ہاتھ میں لے کر گلی میں نکلی۔ لیکن ـــ

شادان : اور وہ واپس نہ آیا۔

(ماں اس کے جواب میں منہ سے کچھ نہیں کہتی۔ صرف ایک آہ بھرتی ہے)

شادان : میں یہی سوچتی تھی، آج بات کیا ہے رضیہ ہے کہاں؟

ماں : تمہارے آنے سے دو تین منٹ پہلے اپنے باپ کے ساتھ باہر گئی ہے۔

شادان : کہاں؟

ماں : باپ مجبور کر کے لے گیا کہ آؤ تمہیں ٹافیاں لے دوں۔

شادان : میرے یہاں کیوں نہیں بھیج دیا اُسے، عذرا دل بہلا لیتی اُس کا۔

ماں : میں نے تو کہا تھا مگر گھر سے باہر نکلی ہی نہیں۔ سارا دن چُپ چاپ بیٹھی رہی!

شادان : اب آئے گی تو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔

ماں : بڑی اُداس ہے۔

شادان : اُداس تو ہونا ہی ہے۔

(جاتے ہوئے)

بھیج دینا اُسے ہمارے یہاں!

ماں : اچھا۔

(شاداں صحن والے دروازے کی طرف جانے لگتی ہے۔ اور چلی جاتی ہے ـــ شاداں چلی گئی ہے مگر ماں ابھی تک دروازے کو دیکھ رہی ہے ـــ میز پر سے برتن اُٹھاتی ہے۔ اس کے اوپر باقی خالی پیالیاں رکھنے لگتی ہے۔ رضیہ آتی ہے۔ ہاتھوں میں ایک لفافہ ہے۔ لفافہ لا کر وہ میز پر رکھ دیتی ہے)

ماں : تمہارے ابا جان کہاں ہیں؟

رضیہ : وہ اپنے کسی دوست سے باتیں کرنے لگے ہیں گلی میں۔

ماں : رجو!

رضیہ : جی!

ماں : عذرا نے تمہیں بلایا ہے۔

رضیہ : کل جاؤں گی

ماں : نہ۔ بیٹی! اُس نے بلایا ہے۔ اُس کی ماں کہہ گئی ہے کہ رضیہ کو ہمارے ہاں بھیج دینا۔

رضیہ : چلی جاؤں گی۔

صادق : جلدی جاؤ۔

یہ برتن صاف کر دوں صبح سے پڑے ہیں۔
وہاں پلیٹ اور پیالیاں لے کر سیڑھیوں
والے دروازے کی طرف جانے لگتی ہے۔
ایک منٹ کے بعد وہ سیڑھیوں پر چڑھتی
ہوئی دکھائی دیتی ہے۔
رضیہ وہیں کھڑی رہتی ہے۔ آگے بڑھ کر
تصویر کے قریب ہو جاتی ہے۔ روشنی مدھم
ہونے لگتی ہے — یہ روشنی اب اتنی مدھم
ہو چکی ہے کہ اسٹیج پر اب جو کوئی بھی ہوگا،
وہ واضح طور پر نظر نہیں آئے گا۔ صرف سایہ
دکھائی دے گا۔ صحن والے دروازے کی
طرف سے ایک سایہ بڑھتا ہے۔ یکایک
رضیہ کی آواز ابھرتی ہے)

رضیہ : بھائی جان آپ!

جاوید : رضیہ!

رضیہ : آپ — اوہ بھائی جان! کہاں تھے آپ!

جاوید : یہاں، وہاں — جہاں تہاں! ہر جگہ
ہر مقام پر! کہاں نہیں تھا میں!

رضیہ : آپ تو میدان سے لوٹے ہی نہیں تھے۔ ابا
جان کہتے تھے، انہوں نے آپ کا لہو سے
بھرا ہوا جسم دیکھا تھا — اور بھائی جان!
آپ — بھائی جان آپ ہیں نا۔

جاوید : تم دیکھ ہی نہیں رہیں مجھے!

رضیہ : ہائے — ہمیں آپ کا کتنا انتظار تھا۔

جاوید : مجھے معلوم تھا میری پیاری بہن میرا
انتظار کر رہی ہے۔

رضیہ : معلوم ہے آج کون سا دن ہے؟

جاوید : چھ ستمبر، میری سالگرہ کا دن!

رضیہ : پچھلے سال اسی دن میں نے گھر کتنا سجایا
تھا۔ کتنی رونق تھی ہمارے یہاں کتنے
لوگ آئے تھے اور آپ کو معلوم ہے.....

جاوید : مجھے سب کچھ معلوم ہے!

رضیہ : میں کتنا خوب صورت ہار آپ کے لئے لائی
تھی بڑے بازار سے خرید کر! —

جاوید : وہ ہار میں اب بھی دیکھ رہا ہوں۔

رضیہ : دیکھ رہے ہیں نا! — اپنی تصویر کے گرد۔

جاوید : ہاں!

رضیہ : میری کتنی آرزو تھی کہ یہ ہار آپ کے گلے میں
ڈالوں — مگر آپ چلے گئے!

جاوید : اسی لئے تو آیا ہوں۔

رضیہ : کس لئے؟

جاوید : وہ ہار تم اب بھی میرے گلے میں ڈال سکتی
ہو!

رضیہ : اچھا!

جاوید : کیوں نہیں!

رضیہ : تو — اُتار دوں ہار!

جاوید : کیوں نہیں۔

(ہار فضا میں لہراتا ہے)

رضیہ : اوہ بھائی جان!

جاوید : اب تو خوش ہو نا!

رضیہ : (ہنستے ہنستے) پسند ہے نا یہ ہار آپ کو؟

جاوید : میری رضیہ کا ہار مجھے پسند نہیں ہوگا تو اور
کس کا ہوگا۔ یہ ہار تو شفق اور قوسِ قزح
کو گوندھ کر بنایا گیا ہے — کتنا پیارا —

کتنا خوب صورت ہار ہے۔

رضیہ : میں نے بیسیوں ہاروں میں اسے پسند کیا تھا

جاوید : تم جو ہار بھی لے آتیں، مجھے بے حد پسند آتا!

رضیہ : بھائی جان!

جاوید: ہاں رضیہ!

رضیہ : آپ دروازے کی طرف کیوں دیکھ رہے ہیں؟

جاوید: مجھے جانا ہے.

رضیہ : نہیں بھائی جان!

جاوید : دیکھو میں نے تمہاری خواہش پوری کردی، اب مجھے جانا چاہئے.

رضیہ : آپ کیوں جائیں گے!

جاوید : کیونکہ مجھے جانا ہے۔ اور جانا کہاں ہے! پہلے کی طرح یہیں رہوں گا۔ تمہارے آس پاس، صبح کی روشنی میں — دوپہر کی دُھوپ میں — رات کے اندھیروں میں ہر وقت تمہارے قریب — تم مجھے نہیں دیکھ سکتیں مگر میں تمہیں دیکھا کرتا ہوں۔ صبح سویرے جاگتے ہوئے، اسکول جاتے ہوئے — گھر لوٹتے ہوئے — ابّا جان امّی سے باتیں کرتے ہوئے، سہیلیوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے — ستارہ رضیہ۔

رضیہ : بھائی جان، نہ جائیں آپ — نہ جائیں!

(سایہ پیچھے ہٹنے لگتا ہے۔ دوسرا سایہ اس کی طرف بڑھتا ہے)

(بھائی جان کہتی ہوئی آواز بلند ہوتی ہے

اور اس کے ساتھ ہی اسٹیج پر روشنی آجاتی ہے۔ روشنی میں ہم دیکھتے ہیں، کہ رضیہ دروازے سے کچھ دور کھڑی ہے۔ باپ دروازے میں بڑھ رہا ہے۔

باپ : کیا ہوا رجو؟

رضیہ : بھائی جان!

باپ : بھائی جان —؟

رضیہ : وہ آئے تھے۔

(ماں آتی ہے)

ماں : کون آئے تھے؟

رضیہ : بھائی جان — ابھی یہیں تھے۔ میں نے اُن کے گلے میں ہار ڈالا تھا۔

ماں : اچھا؟

(ماں اور باپ دونوں کی نظریں ہار پر جاتی ہیں جو تصویر کے گرد بدستور دکھائی دے رہا ہے)

باپ : بیٹی! جانے والے کب لوٹ کر آتے ہیں!

رضیہ : کہتے تھے کہ تم میرے گلے میں ہار ڈالنا چاہتی تھیں، اس لئے آگیا ہوں — اب میرے گلے میں ہار ڈال دو۔ اور میں نے ہار ان کے گلے میں ڈال دیا۔

ماں : بھائی کے خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھیں نا!

(شاداں آتی ہے)

شاداں : (ماں سے)

رضیہ کو تم نے بھیجا کیوں نہیں؟ عذرا انتظار کر رہی ہے۔

(حیران ہو کر)

(باقی صفحہ ۱۰۱۹ پر)

ابراہیم یوسف

طوفان

کردار

مسٹر زیڈ	:	پولیس کا افسر
مسٹر ایکس	:	محکمۂ جاسوسی کا منشی
مسٹر سی	:	ایک باغی
مسٹر آر	:	دوسرا باغی
بڑھیا	:	آزادی کی خواہشمند ایک جوشیلی عورت
نوجوان	:	بڑھیا کا لڑکا
مالک ہوٹل	:	ایک سرمایہ دار

منظر: ایک ہوٹل کا کمرہ۔ کمرہ ہوٹل کے بالائی حصہ کا ہے۔ چونکہ اس قصبے میں یہی ایک ہوٹل ہے اور حکومت کے اراکین اکثر اس ہوٹل میں قیام کرتے ہیں، اس واسطے بہترین فرنیچر سے آراستہ ہے۔ تمام کمرے میں دری کا فرش ہے۔ مشرقی جانب ایک دروازہ ہے جس پر ریشمی پردے پڑے ہوئے ہیں۔ دروازے کے سامنے ایک برآمدہ نظر آرہا ہے جس پر ایک آرام کرسی پڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے جنوبی دروازے سے لگی ہوئی ایک مسہری بچھی ہے جس پر صاف وشفاف بستر ہے اس کے پاس ایک چھوٹی سی میز ہے۔ اس پر ایک ٹیبل لیمپ رکھا ہے، جس پر سبز شیشے کا شیڈ ہے۔ میز پر دو چار اخبار بھی پڑے ہیں۔

کمرے کے مغربی جانب ایک کھڑکی ہے جس پر دروازے کی طرح ریشمی پردے ہیں، اس وقت پردے ہٹے ہوئے ہیں۔ کھڑکی میں کھڑے ہوجاتے سے ایک سڑک دکھائی دیتی ہے۔ اس پر ہمیشہ ٹریفک رہتا ہے۔ جس کے باعث کمرے میں شور وغل کی آواز آتی رہتی ہے۔

کھڑکی میں سے کچھ فاصلے پر پہاڑ نظر آتے ہیں، اور ان پہاڑوں پر بہتی ہوئی ایک تیزرو ندی دکھائی دیتی ہے جس کے بہنے کی آوازیں اکثر خاموشی میں اس کمرے میں سنائی دیتی ہیں۔ موسم اس وقت طوفانی ہے۔ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ تیز ہوا چل

رہی ہے، اور بجلی کبھی کبھی ایک کڑاکے کے ساتھ چمک جاتی ہے۔ مسٹر زیڈ کھڑکی میں کھڑا، ندی کی تیزی، بادلوں کی گرج، ہوا کے طوفان اور بجلی کی چمک سے قطع نظر اس وقت اپنی نگاہیں ٹریفک پر جمائے ہوئے ہے۔ لوگوں کے ہجوم، گاڑیوں اور موٹروں کی بھاگ دوڑ، پولیس اور فوج کی غیر معمولی مصروفیات اس وقت کسی غیر معمولی حادثے کی طرف اشارا کر رہی ہیں۔

—مسٹر زیڈ ایک دراز قد انسان ہے، مونچھیں بڑی بڑی ہیں اور آنکھیں اندر دھنسی ہوئی، سیاہی مائل سوٹ پہنے ہوئے ہے۔ وہ خاموشی سے کھڑا سڑک پر نظریں جمائے رہتا ہے۔ چند منٹ کے بعد مسٹر ایکس داخل ہوتا ہے۔ مسٹر ایکس پستہ قد ہے جسم بھرا ہوا ہے اور باتیں کرتے وقت آنکھوں کو مستقل طور پر مٹکاتا رہتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انتہائی خطرناک اور چالاک انسان ہے۔ کمرے میں داخل ہو کر مسٹر زیڈ کو فوجی سلام کرتا ہے، اور پھر خاموش کھڑا ہو جاتا ہے۔ مسٹر زیڈ مسٹر ایکس کو دیکھ کر)

مسٹر زیڈ: قاتل کا کوئی پتہ چلا؟

مسٹر ایکس: حضور والا! ابھی تک نہیں۔

مسٹر زیڈ: (غصہ سے) ابھی تک نہیں — یہ ہماری کمزوری اور حکومت کی توہین ہے۔

(سوچتے ہوئے)

اور پھر قاتل کی سراغ رسانی پر تو دو ہزار روپے انعام بھی مقرر ہے۔

مسٹر ایکس: حضور والا! ضرور مقرر ہے۔ لیکن میاں بغاوت کے آثار ہیں۔ اب حکومت کو اپنا رویہ تبدیل کرنا پڑے گا۔ سختی سے کام چلتا نظر نہیں آتا۔

مسٹر زیڈ: بغاوت؟ — اس حکومت کے خلاف بغاوت، جو اُن کی عزت، ناموس، امن وسکون اور دولت کی حفاظت کرتی ہے

(غصے سے)

یہ بغاوت نہیں سرکشی ہے۔

مسٹر ایکس: حضور والا! سرکشی اور بغاوت ہم معنی ہیں۔ حفاظت ہی مقصود ہے تو پیار اور ظلم کا اتحاد ہونا چاہیئے — یک طرفہ وزن پلڑے کو زمین سے اٹھنے نہیں دیتا۔

مسٹر زیڈ: (مسٹر ایکس کو غور سے دیکھ کر)

تم حکومت کی مشینری کے ایک پرزے ہو، تمہارے اوپر حکومت کی بنیادیں ہیں اگر تم ڈگمگائے تو دیواریں گر پڑیں گی۔ تمہیں مستقل مزاج ہونا چاہیئے۔

مسٹر ایکس: میرے قدم کبھی نہیں ڈگمگاتے — لیکن اب میں روزانہ کی اطلاعات سے اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ حکومت کو اپنا رویہ تبدیل کرنا چاہیئے، ورنہ یہ قصر استبداد منہدم ہوتا نظر آتا ہے۔

مسٹر زیڈ: (غصے سے)

میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ تمہارے خیالات پر بھی وہی فضا اثر انداز ہے جو میں نے اس گندے قصبے میں آکر محسوس

کی ہے۔

(مسٹر ایکس فوجی سلام کر کے کمرے سے نکل جاتا ہے۔ مسٹر زیڈ کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذہنی پریشانی میں مبتلا ہے۔ کمرے میں ٹہلتا رہتا ہے۔ کچھ دیر بعد آہستہ آہستہ بڑبڑاتا ہے)

مسٹر زیڈ: محکمۂ جاسوسی ناکام ہو چکا ہے! وہ محکمہ جس کے بل بوتے پر آج تک عوامی تحریکوں کو کچلا گیا ہے، سرکش جماعتوں کے پرخچے اُڑائے گئے ہیں۔

(پھر خاموشی سے کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد مالک ہوٹل کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ بہت موٹا تازہ اور بے ڈول انسان ہے۔ مسٹر زیڈ کو سلام کر کے)

مالک ہوٹل: حضور والا! کیا آج شام کھانے کا انتظام ہوٹل میں ہوگا ـــ یا ـــ

(مسٹر زیڈ کا چہرہ طنز آمیز نگاہوں سے دیکھ کر)

آج بھی آپ کہیں مدعو ہیں؟

(مسٹر زیڈ مالک ہوٹل کو سر سے پیر تک دیکھتا ہے جیسے اس نے اس طنز کو محسوس کر لیا ہے)

مسٹر زیڈ: میں آج کھانا ہوٹل ہی میں کھاؤں گا ـــ مگر دیکھو ـــ میں اس قدر چار جز ادا کرنے کو تیار نہیں۔

مالک ہوٹل: لیکن حضور....

مسٹر زیڈ: (قطع کلام کر کے) تم لوگ تو چاہتے ہو کہ ہم کو جس قدر الاؤنس حکومت کی جانب سے ملتا ہے وہ سب تمہاری نذر کر جائیں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کھانا اور اڑانا جانتے ہیں میں ہر روپے میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کرنا چاہتا ہوں۔ سمجھے؟

مالک ہوٹل: سمجھ گیا سرکار!

مسٹر زیڈ: ہاں دو روپے سے زیادہ نہ ہو ـــ میں کھانے کا بل اس سے زیادہ ادا کرنے کو تیار نہیں ـــ مجھے صرف پچیس روپے یومیہ ہی تو الاؤنس ملتا ہے۔

(پھر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ مالک ہوٹل سلام کر کے دروازے کی جانب جاتا ہے۔ مسٹر زیڈ مالک ہوٹل سے مخاطب ہو کر)

مسٹر زیڈ: اور ہاں بھئی ـــ ایک بات تو اور سنو۔

مالک ہوٹل: (رُک کر) فرمایئے۔

مسٹر زیڈ: (مالک ہوٹل کے پاس آ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر)

تمہارے اس ہوٹل میں تو ہر قسم ہی کے لوگ آتے ہوں گے!

مالک ہوٹل: جی ہاں۔

مسٹر زیڈ: کیا تم ان میں سے کسی پر شک کر سکتے ہو جس نے قصبے کے مجسٹریٹ کا قتل کیا ہے؟

مالک ہوٹل: حضور والا! بہت مشکل ہے۔ لوگ اس قسم کی گفتگو ہوٹل اور سرِعام کرتے ہوئے گریز کرتے ہیں۔

مسٹر زیڈ: تم ہماری کچھ رہنمائی کرو۔

(دو انگلیاں اٹھا کر دو پر زور دیتے ہوئے)

دو ہزار روپے انعام مقرر ہے ۔

مالک ہوٹل :۔ دو ہزار!

(کچھ اس انداز سے کہتا ہے جیسے کسی نے دو ہزار روپیہ اس کے ہاتھ میں رکھ دیا ہے) ۔

لیکن سرکار معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام کسی جماعت کا ہے فرد کا نہیں۔

مسٹر زیڈ: (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں ۔ ہمارے محکمۂ جاسوسی کو بھی یہی اطلاع ملی ہے کہ یہاں کوئی دہشت پسند جماعت موجود ہے، اس میں لوگ شامل ہیں اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا ہے۔

مالک ہوٹل : اور ایسے لوگ عام شہریوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں ۔ ان کا شناخت کرنا سخت دشوار ہے ۔

(کمرے میں کچھ دیر کامل خاموشی رہتی ہے مسٹر زیڈ کمرے میں ٹہلتا رہتا ہے ۔ مالک ہوٹل خاموش کھڑا کھڑکی سے باہر دیکھتا رہتا ہے ۔ مسٹر زیڈ مالک ہوٹل سے مخاطب ہو کر)

مسٹر زیڈ: تم جانتے ہو جب کسی ملک میں شورش اور بغاوت پھیلتی ہے تو اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟

(مالک ہوٹل مستفسرانہ انداز میں مسٹر زیڈ کا چہرہ دیکھتا ہے ۔ مسٹر زیڈ مالک ہوٹل کا چہرہ اس انداز سے گھورتے ہوئے جیسے اسے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہو)

تباہی و بربادی، قتل و غارت، پولیس اور فوج کی گولیاں — لوٹ مار تمہارے اس ہوٹل اور دیگر خوب صورت عمارتوں میں آگ و طوفان — تاریخ بغاوت ایسے ہی واقعات سے بھری پڑی ہے ۔ لیکن اگر ایسی شورشوں کو قبل از وقت ہی دبا دیا جائے تو —

مالک ہوٹل : (قطع کلام کر کے) اس کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں؟

مسٹر زیڈ : ہاں ۔ ملک ان تمام لعنتوں سے پاک ہو جاتا ہے ۔

مالک ہوٹل : (سوچتے ہوئے) ملک میں تباہی و بربادی پھیلے گی ۔

(کمرے میں چاروں طرف دیکھ کر)

یہ خوب صورت کمرہ، یہ قیمتی فرنیچر سب تباہی کی نذر ہو جائے گا ۔ میں برباد کر دیا جاؤں گا ۔

(کھڑکی میں سے پہاڑوں کو دیکھنے لگتا ہے پہاڑوں پر بہتی ہوئی ندی اپنے ساتھ بڑے بڑے درختوں کو بہا کر لاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ۔ پھر جیسے خود ہی سے باتیں کر رہا ہو)

یہ ندی آج کل کس قدر خوں خوار ہو گئی ہے کیسے بڑے بڑے درخت جڑ سے اکھاڑ کر رکھ دیے ہیں ۔

مسٹر زیڈ : (مالک ہوٹل کے چہرے پر پریشانی محسوس کرتے ہوئے)

اس ندی میں طوفان آ رہا ہے نا ۔ اگر اس قصبہ میں بغاوت پھیلی تو پھر اس کمرے

اور ہوٹل ہی کی کیا حقیقت ہے۔ سرکاری عمارتیں، خوب صورت ٹاؤن ہال، قیمتی لائبریریاں، درس گاہیں، سب تباہ ہو جائیں گی ــــ بچے یتیم، خوب صورت جوان عورتیں بیوہ، تمہارے بینک لوٹ لئے جائیں گے ــــ تمہارا سرمایہ برباد ہو جائے گا۔ تم مفلس ہو جاؤ گے۔

مالک ہوٹل: (بے تاب ہو کر التجا آمیز لہجے میں) تو مجھے اس تباہی سے بچائیے۔

مسٹر زیڈ: گھبراؤ نہیں۔ اس کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تم بھی کوشش کرو کہ قاتل کا سُراغ لگ جائے ــــ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرتی ہے۔

مالک ہوٹل: میں آپ کی ہر ممکن مدد کرنے کو تیار ہوں ــــ لیکن قاتل کون ہے؟ اس کا مجھے علم نہیں۔

مسٹر زیڈ: (کچھ سوچ کر) حکومت نے دو ہزار روپیہ مقرر کیا۔

(کچھ دیر خاموش رہ کر)

میری تحقیقات سے قاتل کا سُراغ ضرور ملے گا۔

(سگریٹ جلا کر پینے لگتا ہے۔ دو تین کش لے کر مالک ہوٹل کے پاس جاتا ہے اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر رازدارانہ لہجے میں)

ایک سودا کرتے ہو؟

مالک ہوٹل: (تعجب سے) سودا؟

مسٹر زیڈ: ہاں سودا ــــ

(رازدارانہ لہجے میں)

اگر قاتل کا سُراغ مل گیا تو میں تمہیں مطلع کر دوں گا ــــ اور تم حکومت کو۔ تمہیں دو ہزار روپیہ مل جائے گا۔ بس ایک ہزار تمہارا ایک ہزار میرا۔

(مالک ہوٹل کسی گہری سوچ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مسٹر زیڈ اس کا چہرہ گھورتا ہے۔ مسٹر زیڈ کے چہرے پر امید و بیم کے ملے جلے اثرات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ چند سیکنڈ وہ خاموش کھڑا رہتا ہے۔ پھر اس انداز سے جیسے وہ مالک ہوٹل کے سوچ بچار سے گھبرا گیا ہو)

جواب دو دوست، یہ ایک ایسا کوئی بڑا مسئلہ تو نہیں۔

(پھر ہاتھ مسکرا کر مالک ہوٹل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے)

لو ہاتھ ملاؤ، اور کہو، مجھے منظور ہے!

مالک ہوٹل: (آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھا کر ملاتے ہوئے) مجھے منظور ہے مگر....

مسٹر زیڈ: (قطع کلام کر کے) اب اگر وگر کچھ نہیں۔ بس جاؤ اور خاموشی سے اپنا کام کرو۔

(مالک ہوٹل دروازے کی جانب بڑھتا ہے)

لیکن دیکھو....

(مالک ہوٹل رک کر مسٹر زیڈ کا چہرہ دیکھتا ہے)

کسی کو یہ راز معلوم نہ ہو، ورنہ باغی شہر میں اودھم مچا دیں گے اور پھر تباہی و بربادی۔

(مالک ہوٹل کچھ سوچتا ہوا کمرے سے نکل جاتا ہے۔ مسٹر زیڈ ٹہلنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد مسٹر ایکس داخل ہوتا ہے۔ مسٹر زیڈ کو فوجی سلام کرکے)

مسٹر ایکس: حضور والا۔ کچھ مشکوک لوگ گرفتار کئے گئے ہیں، اگر حکم ہو تو آپ کے سامنے حاضر کروں۔

مسٹر زیڈ: ضرور — ابھی لاؤ۔

(سگریٹ پھینک دیتا ہے اور دوسری سگریٹ جلا کر ایک صوفے پر بیٹھ جاتا ہے مسٹر ایکس کمرے سے نکل جاتا ہے۔ اور چند منٹ بعد "مسٹر سی" کو لے کر داخل ہوتا ہے۔ اور خود مسٹر زیڈ کے آنکھ کے اشارے پر کمرے سے نکل جاتا ہے۔ مسٹر زیڈ کچھ دیر تک مسٹر سی کو سر سے پیر تک دیکھتا رہتا ہے۔ پھر کچھ طنز آمیز لہجے میں)

ہوں — تو آپ ہی باغیوں کے سرغنہ ہیں؟

مسٹر سی: (تعجب سے) سرغنہ! گویا باغیوں کی یہی قسمیں ہوتی ہیں۔

(زور دار قہقہہ لگا کر)

ہمارے یہاں تو ایسی کوئی تفریق نہیں۔

(مسکراتے ہوئے)

ہمارے یہاں سب لیڈر ہیں اور سب سپاہی۔ ہم سب اپنے حقوق کے تحفظ کے واسطے ظلم و استبداد کے خلاف دوش بدوش کھڑے ہیں۔

(طنزیہ لہجے میں)

یہ چھوٹے بڑے اور امیر و غریب کی تفریق آپ ہی کو مبارک ہو۔

مسٹر زیڈ: لیکن حکومت کے خلاف بغاوت کا انجام جانتے ہو؟

مسٹر سی: اگر حقوق کا تحفظ اور ظلم کے خلاف احتجاج بغاوت ہے تو میں خوش ہوں کہ میری زندگی کا مقصد حاصل ہو رہا ہے۔ اس بغاوت پر زندگی کے تمام عیش قربان۔

(فاتحانہ مسکراہٹ سے مسٹر زیڈ کو دیکھتا ہے)

مسٹر زیڈ: لیکن بغاوت کا انجام تباہی و بربادی ہے۔ خون کی ہولی ہے۔ فنون و ادب کو تباہ کرنا ہے۔ بزرگوں کی یادگاروں کو خون سے رنگنا ہے۔

مسٹر سی: (مسکرا کر) یہ ایک خوش گوار انتقام ہے (طنزیہ لہجے میں)

بزرگوں کی وہ عمارتیں جن میں کبھی آزادی کے گیت گائے جاتے تھے اب اپنی غلامی پر ماتم کر رہی ہیں۔

(جوش میں ذرا بلند آواز سے)

اب ان کے در و دیوار کو ہمارے خون کے نقش و نگار کی ضرورت ہے طوفان کے دھارے میں بہہ کر ہمیں وہ حاصل کرنا ہے جس کے لئے ہماری روحیں بے چین ہیں جس میں اب ان عمارتوں کی ضرورت نہیں جن پر انصاف کے نام کے پرچم اڑتے ہیں۔ لیکن جو ہر شام انصاف کے نام پر ماتم کرکے شب کی

سپاہیوں میں اپنی گردنیں جھکا لیتے ہیں
ہمیں وہ ادب اور آرٹ نہیں چاہئے جو
روح کو بیدار نہیں کرتا بلکہ اسے لوری
دے کر سُلاتا ہے۔

مسٹر زیڈ: لیکن بغاوت کا انجام موت ہے

مسٹر سی: (مسکرا کر) اور موت، آزاد زندگی کی
پہلی سیڑھی ہے۔

مسٹر زیڈ: تو پھر قاتل کا پتہ نہیں دے سکتے ہیں'

مسٹر سی: (جوشیلے لہجے میں) عوام باغی ہیں' ان
کی روحیں باغی ہیں۔ کچل دیجیے' ان جذبات
کو، مٹا دیجئے ان روحوں کو، آپ کا
مجرم خود بخود فنا ہو جائے گا۔
(ایک شانِ استغنا سے دروازے کی
جانب دیکھتا ہے۔ مسٹر زیڈ تالی بجاتا
ہے۔ مسٹر ایکس داخل ہوتا ہے)

مسٹر زیڈ: دوسرے شخص کو لاؤ۔
(مسٹر ایکس مسٹر سی کو اپنے ساتھ لے کر
کمرے سے نکل جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد ایک
دوسرے شخص' مسٹر آر کو لے کر داخل ہوتا
ہے۔ مسٹر آر کی عمر پچاس سال سے زیادہ
معلوم ہوتی ہے۔ معمولی لباس پہنے ہے
مسٹر آر کو کمرے میں چھوڑ کر مسٹر ایکس
کمرے سے نکل جاتا ہے۔ مسٹر زیڈ مسٹر
آر کو دیکھ کر ایک کرسی کی طرف اشارا
کر کے)

مسٹر زیڈ: تشریف رکھیے۔

مسٹر آر: (طنزیہ مسکرا کر)۔ تشریف؟ حضور والا
آپ یہ کیا فرما رہے ہیں! آپ حاکم ہیں

اور میں باغی۔ میں آپ کے مقابلے میں کھڑا
ہی رہوں گا۔ بیٹھنا ٹھہراؤ ہے اور ٹھہراؤ
بغاوت کی موت۔
(مسکرا کر)
میں بیٹھنا نہیں چاہتا۔
(سینہ پھلا کر)
میں آپ کے مقابلے میں کھڑا رہنے کا عزم
کر چکا ہوں۔

مسٹر زیڈ: ابھی ہم نے مسٹر سی کے خیالات معلوم
کئے۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ لوگوں میں مستقل
مزاجی ہے۔

مسٹر آر: (فاتحانہ مسکرا کر) مجھے یہ سُن کر خوشی ہوئی
کہ آپ کو ہماری مستقل مزاجی اور اپنی
غلطی کا احساس ہو گیا۔

مسٹر زیڈ: (سگریٹ کا کش لے کر) لیکن دیکھو بھئی اس
طرح ہڑبونگ مچانے سے تو کچھ حاصل نہ
ہو گا۔ تمہارا جذبۂ آزادی صحیح ہے۔ لیکن
انقلاب کے ذریعے کسی چیز کو حاصل کرنے
کی کوشش نہ کرو۔ انقلاب ہر چیز کی
موت ہے حتیٰ کہ انقلاب کے دھارے
میں خود انقلاب کی رُوح بہہ جاتی ہے۔
اور چٹیل میدان کے علاوہ کچھ باقی نہیں
رہتا۔

مسٹر آر: (طنزیہ مسکرا کر) دلائل حقیقت کی کسوٹی
قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ حقیقت کو
جھٹلانا صرف دلائل ہی کا کام ہے۔
(جوشیلے لہجے میں)
لیکن ہماری روح کو جس قدر کچلا گیا

ہے۔ ہمارے جذبات کا جس طرح مذاق اڑایا گیا ہے وہ انقلاب ہی چاہتے ہیں۔

(افسردہ لہجے میں)

ہمارے اس چھوٹے سے قصبے میں کیسا امن و امان تھا۔ لیکن یہاں فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئیں۔ اور اس کے بعد ہر طرف شیطانی قہقہے فضا میں گونجنے لگے۔ وہ دوشیزائیں جن کی معصومیت اور پاکیزگی فرشتے چُرا لیا کرتے تھے، ایک بھی دوشیزہ نہ رہی سب کی عزت و ناموس پر ڈاکے پڑے ان میں سے بہت سی خودکشی کی نذر ہوگئیں۔ بہت سی کوٹھوں کی رونق بن بن کر گاہکوں سے اشارے بازی کرنے لگیں۔ اور بہت سی ایسے امراض کی شکار ہوگئیں جن کا کوئی علاج نہیں ــ ایسے حالات میں بھی اگر مردوں کی رُوح بیدار نہ ہو تو ان مردوں پر لعنت ہے۔

مسٹر زیڈ: مجھے اس کا افسوس ہے ــ میں......

مسٹر آر: (قطع کلام کرکے) ۔افسوس نہ کیجئے، ورنہ حکومت کی کرسی بیوہ ہو جائے گی چکدار چاندی سونے کے سکے کسی کی جیب میں کھنکنے کے واسطے بے تاب ہو کر اپنی آب و تاب کھو دیں گے۔

مسٹر زیڈ: (غصہ سے) لیکن اس بغاوت اور سرکشی کا انجام جیل خانے کی تاریک کوٹھری ہے۔ سمجھ لو اسے۔

مسٹر آر: مرحبا، اس تاریک کوٹھری پر، جس میں رُوح جگمگا اٹھے۔ جہاں روح بیدار ہو، جہاں صحیح جذبات کی تخلیق ہو، جہاں کی نیند میں بیداری ہو، جہاں کے خوابوں میں آزادی کے نغمے سنائی دیں وہ تاریک کوٹھری جس کے مقدر میں ہو میں اس مقدر پر رشک کرتا ہوں۔

مسٹر زیڈ: (کچھ سوچ کر) اگر تم قاتل کا پتہ بتلا دو تو حکومت آزاد کر دے گی اور تمہارے ساتھ ہمدردانہ سلوک بھی کرے گی۔

مسٹر آر: اگر حکومت کی عقل کا اس قدر دیوالیہ ہو گیا ہے تو میں سوائے ماتم کے اور کیا کر سکتا ہوں۔ ہاں مجھے قاتل کا پتہ معلوم ہے اور آپ بھی اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔

(جوشیلے لہجے میں)

وہ نفرت و حقارت کا طوفان ہے جس کی موجیں اب اس قدر گستاخ ہوگئی ہیں کہ اب وہ بندوں کو توڑ کر طوفان لانے کے لئے بے تاب ہیں۔

(دور دروازے کی جانب دیکھ کر)

کیا اب آپ مجھے جانے کی اجازت دیں گے؟

(مسٹر زیڈ تالی بجاتا ہے مسٹر ایکس داخل ہوتا ہے اور فوجی سلام کرکے کھڑا ہو جاتا ہے)

مسٹر زیڈ: اور کوئی ہے؟

(مسٹر ایکس نفی میں سر ہلاتا ہے)

ان دونوں بدمعاشوں کو حراست میں رکھو۔

(مسٹر ایکس فوجی سلام کر کے مسٹر آر کا ہاتھ پکڑتا ہے)

مسٹر آر: (مسکرا کر) میں خوش ہوں کہ آپ مجھے صحیح جگہ بھیج رہے ہیں۔ جہاں میری آزاد روح اور ناقابلِ تسخیر جذبات آپ کے پیدا کئے ہوئے فلسفۂ زندگی کو جس کا کھوکھلا پن اب ظاہر ہو چکا ہے فنا کر دیں گے۔

(مسٹر ایکس کے ساتھ کمرے سے نکل جاتا ہے۔ مسٹر زیڈ اٹھ کر خاموشی سے کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے اور کچھ سوچتا جاتا ہے کچھ دیر بعد مالک ہوٹل داخل ہوتا ہے اور مسٹر زیڈ کے پاس جا کر رازدارانہ لہجے میں)

مالک ہوٹل: حضور والا! ایک بوڑھی عورت آپ سے ملاقات کرنا چاہتی ہے۔ شاید اس سے کوئی پتہ چل سکے۔

مسٹر زیڈ: جلد لاؤ اُسے۔

(مالک ہوٹل کمرے سے نکل جاتا ہے اور چند سیکنڈ بعد ایک بوڑھی عورت کو ساتھ لے کر داخل ہوتا ہے اور اسے کمرہ میں چھوڑ کر خود کمرے سے نکل جاتا ہے، عورت کی عمر تقریباً پچاس سال کے قریب ہے جس وقت وہ کسی چیز پر نظریں جما کر اسے دیکھتی ہے تو پیشانی کے بل اُس کے عزم و ارادہ کی پختگی کا اظہار کرتے ہیں)

مسٹر زیڈ: کہو ماں! مجھ سے کوئی کام ہے؟

بڑھیا: ہاں تم حکومت کے ایک اعلیٰ افسر ہو میں تمہارے پاس ایک فریاد لے کر آئی ہوں۔

مسٹر زیڈ: کہو کہو۔ میں تمہاری فریاد ضرور سنوں گا اور انصاف کرنے میں اپنی تمام کوششیں صرف کر دوں گا۔

بُڑھیا: میں ایک مظلوم عورت ہوں۔ میرے صرف ایک ہی لڑکا ہے حسین اور عقل مند۔ وہ فوج میں ملازم تھا، جنگ شروع ہوئی اور اس نے جنگ پر جانے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ جنگ کے نعرے کچھ اور تھے روح کچھ اور۔ جسے اس نے سمجھ لیا۔ ملک و قوم کے لئے وہ جان دے سکتا تھا مگر غلامی کی زنجیریں اور مضبوط کرنے کے واسطے نہیں۔ اب آپ ہی بتلایئے کہ یہ اُس کے ساتھ نا انصافی نہیں تو اور کیا ہے؟ اسے جیل خانے کی کوٹھڑی میں ٹھونس دیا گیا ہے۔

مسٹر زیڈ: تو ماں صرف تمہارے ایک ہی لڑکا ہے؟

بڑھیا: ہاں میرا ایک ہی لڑکا ہے۔

مسٹر زیڈ: تم اس سے محبت بھی کرتی ہو؟

بڑھیا: بے پناہ —— کون اپنی اکلوتی اولاد سے محبت نہیں کرتا؟

مسٹر زیڈ: اور تم یہ بھی چاہتی ہو کہ وہ آزاد کر دیا جائے؟

بڑھیا: کیوں نہیں۔ وہ کون سی ماں ہے جو اپنی اولاد کی آزادی کی خواہش مند نہیں؟

مسٹر زیڈ: (بڑھیا کا چہرہ غور سے دیکھ کر) تمہارا اکلوتا لڑکا آزاد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک شرط پر....

بڑھیا: وہ شرط بھی بیان کر دو۔

مسٹر زیڈ: تو وعدہ کرو کہ شرط پوری کرو گی۔

بڑھیا: اگر پوری کرنے کے قابل ہوئی تو ضرور پوری کروں گی۔

مسٹر زیڈ: تو اس شخص کا پتہ بتلاؤ جس نے مجسٹریٹ کا قتل کیا ہے۔

(بڑھیا کے چہرے پر غصے کے آثار پیدا ہوتے ہیں اور وہ نفرت سے مسٹر زیڈ کا چہرہ دیکھتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر)

بڑھیا: کیا آپ اس کو گرفتار کر سکیں گے؟

مسٹر زیڈ: ہم اس کو گرفتار ہی نہیں کریں گے، بلکہ اسے فنا کر دیں گے۔

بڑھیا: تو سن لیجئے۔ وہ دوشیزاؤں کی لٹی ہوئی عصمتیں ہیں، وہ غریبوں کی آہیں ہیں، وہ دولت مندوں کی عیش پرستی ہے، وہ آزادی کے خواب ہیں۔ وہ غلامی سے نفرت ہے۔ (جوش میں آ کر)

آپ یہ چاہتے ہیں کہ میرے بچے سے میری محبت کا ناجائز فائدہ اٹھائیں۔ اگر میرے ایسے سو لڑکے بھی ہوتے تو میں انہیں آزادی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیتی۔ فخر و غرور سے سر اونچا کر کے چلتی اور لوگوں سے کہتی کہ میں نے اپنے سو بچے آزادی کی راہ میں بھینٹ دیئے ہیں، سب لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے میں بھی آنسو بہاتی مگر خوشی کے — یہ تو ایک ہی لڑکا ہے، رہنے دیجئے اس کو تاریک کوٹھڑی میں بند۔ یہی اس کی کامیابی ہے۔ اور میں خوش ہوں کہ مجھے اس کی آزادی نہیں، ملک کی آزادی چاہیئے۔

مسٹر زیڈ: دیکھو ماں، بلا وجہ کی ہٹ نہ کرو۔

بڑھیا: مجھے ماں نہ کہو۔ بوڑھی عورت جس وقت ماں کا لفظ سنتی ہے تو اس کے دل سے محبت کے سوتے بہہ نکلتے ہیں۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔

(مسٹر ایکس گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوتا ہے اور جلدی جلدی کہنا شروع کرتا ہے)

مسٹر ایکس: حضور والا! ایک شخص جو کئی روز سے جیل خانے میں بند تھا قاتل کا پتہ دینے کے لئے تیار ہے۔ جلد از جلد اس کا بیان قلم بند کر لیجئے۔ ورنہ کہیں ....

مسٹر زیڈ: فوراً اسے حاضر کرو۔

(مسٹر ایکس کمرے سے نکل جاتا ہے۔ اور مسٹر زیڈ بڑھیا کی موجودگی کے احساس سے قطعی بے پروا ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ مسٹر ایکس نوجوان کو لے کر داخل ہوتا ہے۔ نوجوان اور بڑھیا کی آنکھیں چار ہوتی ہیں اور دونوں ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، نوجوان بڑھیا کو دیکھ کر ایسے لہجے میں جس میں نفرت اور طنز دونوں موجود ہیں)

نوجوان: کیوں ماں، مجھ سے بہت محبت ہے۔؟
اس محبت میں کس بے قصور کی گردن کٹوانے
کا ارمان دل میں ہے؟ — ماں میں ...

بڑھیا: (قطع کلام کرکے)
مجھے بار بار ماں نہ کہہ۔
(نفرت سے دوسری جانب منہ پھیر لیتی
ہے)
اگر تو پیدا ہی نہ ہوتا تو میں خوش ہوتی —
ذلیل بزدل کہیں کا — کس کی گردن کٹوانا
چاہتا ہے؟
(پھر ایک دم پلٹ کر نوجوان کے پاس
جاکر)
تجھ جیسے غدار کو دنیا میں رہنے کا حق نہیں
(ایک چھپے ہوئے خنجر سے نوجوان پر حملہ
کرتی ہے)
قبل اس کے کہ تو کسی کا نام بتلائے، میں
تیری زبان ہمیشہ کے واسطے بند کر دینا
چاہتی ہوں۔
(مسٹر ایکس دوڑ کر بڑھیا کا ہاتھ روکنے
کی کوشش کرتا ہے۔ مگر قبل اس کے کہ
وہ اس کے پاس پہونچے خنجر اپنا کام کر
چکتا ہے۔ مسٹر ایکس اور زیڈ حیران
کھڑے رہ جاتے ہیں۔ نوجوان فاتحانہ مسکرا
کر بڑھیا کو دیکھتا ہے، پھر خنجر سینے سے
نکالتے ہوئے)

نوجوان: ماں! میں نے زندگی کی عین راحت حاصل
کرلی ہے۔ میں خوش ہوں کہ میری زندگی
تمہارے صحیح جذبات کی نذر ہوئی۔
(پھر چند سیکنڈ کھڑا رہتا ہے۔ خنجر ہاتھ
میں لے کر لڑکھڑاتا ہوا مسٹر زیڈ کے پاس
جاتا ہے)
میں آپ کو قاتل کا نام بتلانا چاہتا ہوں۔
(ایک دم مسٹر زیڈ پر خنجر سے حملہ کرتا ہے
اور مدافعت سے پہلے ہی خنجر مسٹر زیڈ
کے سینے میں پیوست ہوجاتا ہے اور وہ
گر پڑتا ہے)
اب سن لیجئے اس قاتل کا نام .... مجسٹریٹ
کا قاتل اب آپ کا بھی قاتل ہوچکا ہے۔
(نوجوان یہ کہتا ہوا فرش پر گر پڑتا ہے۔
دونوں کے سینوں سے خون فرش پر مختلف
سمتوں میں بہنے لگتا ہے)

بڑھیا: بیٹا! — (اس پر جھک کر) — میرا بہادر
بیٹا.....

نوجوان: (اپنے دونوں ہاتھ عورت کی گردن میں
حمائل کرتے ہوئے)
ماں! زندگی کا مقصد — آزادی حاصل
کرنا ہے.... میں اس قدر بزدل تو ...
نہیں ہوں کہ ... جو کام میں نے آزادی
کی .... خاطر کیا ہے اسے پوشیدہ رکھ کر
...... غلامی کی زنجیروں کو اور مضبوط کرا
دوں.... اور پھر اس ظالم گورنمنٹ کے
ظلم کا نشانہ ...... کوئی ایسا بے قصور....
بن جائے جس سے ...... ہماری تحریک
آزادی کو بہت سی امیدیں ہیں۔

بڑھیا: جب آزادی کی خواہش جوشیلی نہیں بلکہ
سنجیدہ ہوجاتی ہے جب نفرت وحقارت

کے جذبات زندگی سے وزنی ہو جاتے ہیں
پھر تحریک آزادی کو کوئی نقصان نہیں
پہونچا سکتا۔ سمجھے کہ اب ہم پس و پیش
کے دوراہے پر نہیں کھڑے ہیں۔ ہم نے
آزادی کی راہ پر قدم بڑھا دیا ہے، اور
غلام آباد کو جانے والی سڑک کو ڈائنامیٹ
لگا کر ہمیشہ کے واسطے فنا کر دیا ہے
(نوجوان کے ہاتھ ڈھیلے ہو کر بڑھیا کی
گردن کو چھوڑ دیتے ہیں۔ بڑھیا کی آنکھوں
سے دو آنسو نوجوان کے بہتے ہوئے خون
پر گر کر جذب ہو جاتے ہیں۔ بڑھیا کھڑی
ہو کر نوجوان کی لاش کو فاتحانہ انداز
میں مسکرا کر دیکھنے لگتی ہے۔ بادل زور سے
گرجتا ہے اور تیز ہوا کے جھونکے کمرے میں
داخل ہوتے ہیں۔ دور سے انقلاب زندہ باد
— آزادی ہمارا حق ہے — غلام رہنا بے
عزتی پر مسکرانا ہے — کی آوازیں آتی ہیں
جو آہستہ آہستہ تیز ہوتی جاتی ہیں۔ مسٹر ایکس
دوڑ کر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑکی بند کرتے
ہوئے)

مسٹر ایکس: غضب کی تیز ہوا ہے۔

بڑھیا: طوفان ہے طوفان۔ وہ ان بند دروازوں
کو توڑ ڈالے گا۔
(پھر نوجوان کی لاش کو مسکرا کر دیکھتے
ہوئے)
دیکھ بیٹا آخر طوفان آ ہی گیا۔

(پردہ)

(جون سنہ ۱۹۴۷ء)

(انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال میں پڑھا گیا)

شہید (صفحہ ۱۰۰۷ سے آگے)

کیا ہوا؟ معاملہ کیا ہے؟

ماں: کہتی ہے بھائی جان آئے تھے، اور میں
نے اُن کے گلے میں ہار ڈالا۔

شاداں: خواب دیکھا ہو گا۔

رضیہ: نہیں چاچی! میں نے اپنے ہاتھوں سے اُن
کے گلے میں ہار ڈالا تھا۔

شاداں: ہار تو وہ پڑا ہے بچی۔
(شاداں آگے بڑھ کر ہار اٹھانے کی کوشش
کرتی ہے کہ یکایک چیخ مار کر ہاتھ پیچھے
ہٹا لیتی ہے۔

شاداں اور باپ: (ایک ساتھ) کیا ہوا؟

شاداں: لہو!

ماں: لہو؟

شاداں: ہار پر لہو —
(ماں جلدی سے ہار اٹھا لیتی ہے)

ماں: سچ — لہو!
(ماں، باپ اور شاداں حیرت سے ہار
کو دیکھ رہے ہیں۔ رضیہ کی نگاہیں دروازہ
پر جمی ہیں، اور اسی حالت میں جلدی سے
پردہ گرتا ہے)

(شمارہ ۱۹۸-۱۹۷، سنہ ۱۹۶۸ء)

انتظار حسین

دو کھیل ایک کہانی

منظر : کسی گاؤں کے اسٹیشن پر گاڑی آکر ٹھہرتی ہے جہاں مسافروں کا شور بھی کم ہے اور سودا بیچنے والوں کی صدائیں بھی کہیں کہیں سے سنائی دیتی ہیں۔ رات کا وقت ہے۔ نسیم گاڑی سے اُتر کر قلی کو آواز دیتا ہے۔

نسیم : قلی۔ قلی!

(وقفہ)

یہ سامان لے کر باہر چلو۔ سواری مل جائے گی اِس وقت؟

قلی : (سامان اٹھاتے ہوئے) تانگے کھڑے ہیں باہر

(وقفہ)

لیو تانگے والے یہ سامان دھرو صاحب کا.....

تانگہ والا : چلنا کہاں ہے؟

(پہچان کر)

ارے بھیا، آؤ آؤ۔

(قلی سے)

کردار

نسیم

اُس کا چچا

بیگم — نسیم کی والدہ

اصغر — نسیم کا دوست

ثریا — اصغر کی بیوی

بیگم افتخار } حقیقی بہنیں
ریحانہ

نوشابہ — نسیم کی محبوبہ

تانگہ والا

ہاں رکھ دو سامان — اور کہو اچھے تو رہیو بھیا بہت بہت۔ جانو چار سال بعد آئے ہو اپنے گاؤں؟

نسیم : (کبیدہ خاطر ہو کر) ہاں کبھی بہت دنوں بعد آنا ہوا۔ جلدی سے گھر پہونچاؤ، بڑی سردی ہو رہی ہے — لینا قلی، اپنی مزدوری۔

تانگہ والا : (ہانکتے ہوئے) ابھیں لیو ابھیں۔

نیا جانور ہے ابھیں سرپٹ بھاگی۔
(تانگہ چل دیتا ہے)
پہلے تو ہم پہچانا نہیں، پھر گور کیا تو دیکھا بھیا ہیں۔
(ہنستا ہے)
نوکر ہو سہر ماں معلوم ہوت۔
(دعا دے کر)
اللہ روجی بنائے رکھے ۔۔۔ ارے ہاں، اور گریب آدمی کے پاس کا ہے دعا دے کے سوا۔
(گھوڑے کو ہنکاتے ہوئے)
گاڑی ایک گھنٹہ دیر سے پہونچی ہے آج، مارے سردی کے بولا ئے گئے۔

نسیم : کیا حال ہے گاؤں کا؟

تانگہ والا : ٹھیک ہے بھیا۔ گیہوں کی فصل اچھی بھئی تو ہے۔ امسال دیکھو جو پالا والا نہ مار جائے۔ زمیندار صاحب تو صبح دیکھائی پڑے رہیں اپنے چوپال میں۔ ہم اسٹیشن جات رہیں سلام کیں مگر کچھ بتائیں نہیں کہ بھیا آنے والے ہیں۔

نسیم : میں اطلاع کے بغیر آیا ہوں۔

تانگہ والا : جبھیں۔ جب کو نو آونے والا ہوا تو ہمکا اطلاع جرور ملی۔

نسیم : کیا حال ہے چچا میاں کا؟

تانگہ والا : بڑھائے گئے ہیں بے چارے۔ انہیں کے دم سے تو روشنی ہے گاؤں ماں۔ ہمرا تو بڑا کھیال رکھت ہیں زمیندار صاحب۔

نسیم : کیسی ویران اور اندھیری سڑک ہے یہ اور تم لوگ تانگے پر لالٹین تک نہیں لگاتے؟

تانگہ والا : (ہنس کر) کا کونو سہر تھوڑی ہے جو گیس ہنڈے لگائے پھریں۔ عمر بیت گئی یہی سڑک پر تانگہ ہانکت۔ اٹکل سے راستہ دیکھائی دے جات ہے۔

نسیم : کمال ہے۔ وحشت ہوتی ہے ایسی تاریکی دیکھ کر۔

تانگہ والا : بہت دنن بعد آئے ہو نہ۔ یہی مارے۔

نسیم : میں شاید صبح ہی پھر واپس چلا جاؤں۔

تانگہ والا : اب آئے ہو تو رہو کچھ دنوں۔ بیگم امی جانے دیہیں اتنی جلدی؟
(ہنس کر)
معلوم ہوت ہے سہر کی ہوا لگ گئی تمکا۔
(تانگہ رکتا ہے اور تانگے والا پکارنا شروع کرتا ہے)
زمیندار صاحب .... سرکار .... زمیندار صاحب ....

چچا : (اندر سے) کون؟

تانگہ والا : بھیا اترے ہیں گاڑی پر سے۔ دروازہ کھولو۔

چچا : نسیم؟

تانگہ والا : ہاں بھیا کی سواری لے کے آئے ہیں بندگی سرکار۔

چچا : (خوش ہو کر) ارے نسیم ۔
نسیم : آداب عرض ۔
چچا : جیتے رہو ۔
(عجلت میں)
چلو چلو اندر چلو، بڑی سردی ہو رہی ہے'
(تانگے والے سے)
سامان یہیں چوپال میں رکھ دو نسیم کا،
اور پیسے صبح آ کر لے جانا ۔
تانگے والا : ارے تو مانگ کون رہا ہے مالک، یہ
کونو مو کرہے ہے پیسے لیبکا ۔ سامان یہیں
دھری ؟
چچا : ہاں ہاں یہیں تخت پر رکھ دو ۔ جاؤ اپنی
امی کے پاس جاؤ ۔ صبح باتیں ہوں گی تم
سے ۔
(پکار کر)
میں نے کہا سنتی ہو بھاوج صاحبزادے
تشریف لے آئے ہیں تمہارے ۔
بیگم : (دور سے بے تابانہ) نسیم ۔
نسیم : (والہانہ) امّی !
(دوسرے دن علی الصباح)
(نسیم جمواہی لیتا ہے)
بیگم : جاگ گئے تم ۔ یہی انتظار کر رہی تھی کہ
تم سو کر اٹھو تو چائے بناؤں نیند آ گئی
تھی رات کو ۔
نسیم : جی نہیں ۔ بلکہ تک نہیں جھپکی ۔
بیگم : (فکر مند لہجے میں) ساری رات ؟ تمہاری
نیند کا اس طرح اُڑ جانا تو بہت ہی بُرا
ہے ۔ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش
کیا کرو ۔ دن میں سو رہنا کسی وقت ۔
نسیم : دعوت جو کر رہی ہیں آپ سب کی ؟
بیگم : مہمان زیادہ دیر تھوڑی ٹھہریں گے یہ تو
ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں زیادہ سے
زیادہ دو ایک گھنٹے کوئی جشن منایا جا سکتا
ہے ۔
(ہنس کر)
تمہارے دماغ میں شہر کے ہنگامے ہیں
شاید ؟
نسیم : مہمانوں کے آنے کے لئے آپ نے یہ سارا
اہتمام کیا ہے ۔ میرا مطلب تھا کسی اور
دن ....
بیگم : وہ سب تمہیں دیکھنے کے لئے بے چین ہیں'
اس لئے میں نے سوچا، .....
نسیم : (بات کاٹ کر) سب کو اپنے گھر میں جمع
کر کے اس سنسان قصبے میں زندگی پیدا
کی جائے ۔
بیگم : تمہارے نزدیک تو اب یہاں کی ہر چیز
مُردہ ہو گئی ہے ۔ یہاں ہفتے میں دو بار
بازار لگتا ہے ۔ ایک مدرسہ ہے یہاں ۔۔
شفا خانہ ہے ۔ ڈاک خانہ ہے ۔ تمہارے چچا
کے چوپال میں شام کو ریڈیو بولتا ہے ۔ ایک
میلہ سا لگ جاتا ہے اس وقت ۔
نسیم : (مذاقاً) اور ۔۔ ؟
بیگم : اور ریل کا اسٹیشن ہے یہاں ۔ جہاں ہر وقت
ریلیں آتی ہیں ۔ یہ سب کچھ زندگی کی علامتیں
نہیں ہیں ؟ گھر سے بھاگنے کے شوق نے اب
تمہاری نظر ہی کو بدل دیا ہے تو کوئی کیا

LIBRARY ACC. NO. 15227

کرے۔

نسیم: آپ میرا برا مان گئیں امّی ؟

بیگم: برا نہیں مانا میں نے۔ ڈر رہی ہوں کہ یہ بہانہ بنا کر تم پھر چل دوگے۔ پہلی دفعہ بھی تم دو سال کے بعد آئے تھے اور تین دن رہ کر چلے گئے۔ یاد ہے ؟

نسیم: جی ہاں۔

بیگم: مگر اس مرتبہ تو میں تمہیں ہفتوں نہیں جانے دوں گی۔

نسیم: میرا بڑا حرج ہوجائے گا امّی۔ مجھے اپنا نیا کھیل اسٹیج کرنا ہے جا کر۔

بیگم: میں نے تو سُنا ہے تمہارا کوئی کھیل کامیاب ہی نہیں ہوتا، تو پھر اب کوئی اور دھندا کرو نا، میں آج جعفر سے کہوں گی کہ وہ تمہیں تجارت کرنے کے لئے مال گذاری سے کچھ روپیہ اور دے دیں۔ چھوڑو یہ لکھنا لکھانا۔

نسیم: مگر میں اپنی ناکامی پر بالکل بد دل نہیں ہوں۔ تمام بڑے لکھنے والوں نے ہمیشہ اسی طرح جد و جہد کی ہے اور بالآخر وہ کامیاب ہوئے ہیں۔

بیگم: اچھا ناشتہ کرو آ کر۔ منہ ہاتھ بھی تو تم نے نہیں دھویا ابھی تک۔

نسیم: بس ایک پیالی چائے دے دیجئے۔ ناشتہ نہانے کے بعد کروں گا۔

بیگم: نہار منہ؟

نسیم: میں عادی ہوں پہلے چائے پینے کا۔

بیگم: اچھی عادتیں لگا ڈیں شہر میں رہ کر۔ یہ لو چائے۔ اور ہاں نہا دھو کر جلدی کپڑے بدل لینا۔ ذرا دیر کے بعد لوگ آنا شروع ہوجائیں گے۔

نسیم: اتنی جلدی؟

بیگم: لوگوں کو خبر ہوجائے کہ تم آگئے ہو، بس تانتا بندھ جائے گا۔ صبح صبح جو بھی چوپال میں آیا ہوگا، اس سے تمہارے چچا نے کہہ دیا ہوگا۔

نسیم: مگر میں کپڑے بدل کر کیا کروں گا امّی۔ لوگ مجھے دیکھنے آرہے ہیں یا میرے کپڑوں کو —؟

بیگم: دیکھنے تو تمہیں کو آرہے ہیں مگر میرا مطلب یہ تھا کہ نوشابہ آنے ہی والی ہوگی۔ ثریا کو شادی کے بعد تم پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہو۔ شہر کے سلے ہوئے جوڑے تو تمہارے بکس میں موجود ہیں ان میں سے کوئی پہن لو۔

نسیم: کون سارا سامان کھولے، اور اس میں سے چیزیں نکالنے بیٹھے۔

بیگم: یا اللہ ایسی کاہلی۔ میں نے صبح اُٹھتے ہی تمہارا سامان کھول دیا۔

نسیم: (بے دلی سے) یہ کیا کیا آپ نے؟

بیگم: کیوں؟

نسیم: میں یہاں نہیں رکوں گا۔

بیگم: (گھبرا کر) نہیں رکوگے؟

نسیم: بس زیادہ سے زیادہ کل صبح تک ٹھیر سکتا ہوں۔

بیگم: (بے چین ہو کر) لیکن کیوں۔ تم رات ہی تو

آئے ہو اور کل صبح چلے جاؤ گے؟ یہ بھی کوئی کھیل ہے؟ تمہیں معلوم ہے میں تمہارے آنے کا کب سے ایک ایک دن گن رہی ہوں؟

نسیم : (ہمت سے) مجھے معلوم ہے امّی، مگر میرا تو یہ خیال تھا کہ میں آپ کو بھی شہر لے جا کر اپنے ساتھ رکھوں گا۔

بیگم : میں ابھی کیسے جا سکتی ہوں۔ دو مہینے کے بعد آم کے درختوں میں بور آ جائے گا۔ میں چلی گئی تو باغ کی فصل ستیاناس نہ ہو جائے گی؟

نسیم : چچا میاں تو ہیں؟

بیگم : وہ ایسے ہوتے تو پھر رونا کس بات کا تھا ان کا خود کا کام کچھ کم ہے جو میری بھی خبر لیں۔ تمہارے ابّا کے مرنے کے بعد ساری جائداد کی دیکھ بھال میں ہی کرتی ہوں۔ اللہ رکھے تم اس قابل تھے مگر تمہیں اپنے شوق سے فرصت نہیں۔

نسیم : کچھ دنوں کے لئے تو چل سکتی ہیں آپ میرے ساتھ؟

بیگم : پھر یہی کچھ دنوں آئے۔ ثریا کے عنقریب بال بچہ ہونے والا ہے۔ سب یہی کہیں گے کہ جوڑے ٹوپی کا وقت آیا تو پھپھو غائب ہو گئیں ۔۔ مگر یہ گھر تم کو کاٹنے دوڑتا ہے کیا؟

نسیم : بڑی سنسان جگہ ہے امّی۔
(ریل کی سیٹی دور سے سنائی دیتی ہے)
ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہاں دن کے وقت بھی رات کا سناٹا ہو جیسے اس قصبے کا نام اور اس کے تمام افسردہ حروف میرے سامنے آ کر موت کا رقص کرنے لگے ہوں۔ یہاں اندھیرا ہے خاموشی ہے اور رات جیسی تنہائی۔

بیگم : بس لگے ڈرامہ بولنے۔ شہر جیسی رونق یہاں کہاں ہو سکتی ہے؟

نسیم : شہر میں جب مجھے پیہم ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا تو میں نے سوچا تھا کہ گھر چل کر مجھے کچھ سکون مل جائے گا۔ یہاں مجھے نئے نئے خیالات سوجھیں گے۔ میں کسی انوکھے موضوع کی تلاش کروں گا ۔۔ گاؤں کی سادگی مجھے لکھنے کے لئے آمادہ کرے گی، لیکن یہ سب کچھ میری خام خیالی تھی میں اس جگہ کو بھول گیا تھا۔ اسٹیشن سے گھر تک آنے میں یہ راز صرف پانچ منٹ میں مجھ پر ظاہر ہو گیا کہ یہ بستی زندگی سے یکسر خالی ہے۔

بیگم : تم تھک گئے ہو نسیم۔ تمہارے پاس تمہارا تھکا ہوا خیال ہے اور کچھ نہیں۔

نسیم : ایسا نہیں ہے امّی۔ میں اس جگہ کے بارے میں کچھ تصور بھی نہیں کر سکتا۔

بیگم : تمہارے پاس تصور ہے کہاں میرے لال۔

نسیم : ہاں نہیں ہے۔
(جعفر نسیم کا چچا ہنستا ہوا داخل ہوتا ہے)

چچا : یہ ایک بات اتنی دیر میں تم نے بالکل

پیچ ہی کہ تمہارے پاس کسی قسم کا کوئی تصور نہیں ہے۔

بیگم : بڑی دیر سے میں اسے یہی سمجھا رہی ہوں

چچا : میں بڑی دیر سے تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔

نسیم : مگر آپ کا یہ خیال غلط ہے چچا میاں کہ میرے پاس کسی قسم کا کوئی تصور نہیں ہے جب کہ میں ایک افسانہ نگار بھی ہوں اور ڈرامہ نگار بھی۔

چچا : (افسوس کرتے ہوئے) ہاں نہیں ہے تصور تمہارے پاس، اور مجھے یہ کہتے ہوئے بڑا دکھ ہو رہا ہے۔ کوئی شائبہ تک نہیں ہے تمہارے پاس تصور کا۔ کیا کہہ رہے تھے تم اسٹیشن سے گھر تک آنے میں کیا ظاہر ہو گیا؟ کہ یہ بستی زندگی سے یکسر خالی ہے؟

نسیم : جی ہاں۔

چچا : (ہنس کر) آنکھیں ہونا شرط ہے۔ یہاں کی زندگی میں ہر قسم کی خوشی بھی ہے اور دکھ بھی۔ یہ کہو کہ تم دیکھ ہی نہیں سکتے۔ شہر کی اونچی سوسائٹی کے بارے میں لکھتے لکھتے تمہارا قلم گھس گیا ۔۔۔ یہاں رات کے کلب نہیں ہیں، کاک ٹیل پارٹیاں نہیں ہیں ۔۔ لیکن ان سے فائدہ؟ میں نے تو ہر رنگ میں شمع کو جلتے ہوئے دیکھا ہے۔ شہر میں بھی رہا اور اب یہاں بھی زندگی کے دن گذار رہا ہوں۔

نسیم : مگر آپ میرے فن پر کس طرح اعتراض کر سکتے ہیں؟

چچا : اس لئے کہ ان سات سالوں میں جب سے تم شہر جا کر رہے ہو تم نے سات پیسے بھی نہیں کمائے۔

نسیم : لکھنے والے کے لئے صرف پیسہ کمانا ہی کوئی شرط نہیں ہے۔

چچا : یہ تمہارا خیال ہے۔ اصلی دودھ کی صرف یہی ایک پہچان ہے کہ اس پر بالائی جم جائے۔

بیگم : خیر اب اتنا بھی نہیں ۔۔ تھوڑا بہت روپیہ جو ہم کبھی کبھار بھیج دیتے ہیں وہ شہر کی زندگی کے لئے ہوتا ہی کیا ہے۔ بغیر کچھ کمائے ہوئے کوئی گذر کر سکتا ہے وہاں؟ ۔۔ اور ہاں تو اگر اس نے کچھ نہیں کمایا تو کیا ہوا۔ اس نے کتابیں لکھیں، ڈرامے لکھے۔

چچا : جنہیں نہ کسی نے پڑھا اور نہ دیکھا۔

بیگم : بھئی کسی کی اس طرح ہمت شکنی نہیں کرنی چاہئے۔

چچا : میں نے یہ بھی تو کہہ دیا کہ مجھے یہ سب کچھ کہتے ہوئے بڑا دکھ ہو رہا ہے۔ میں بے رحم نہیں ہوں۔ مجھے بھی نسیم سے ایسی ہی محبت ہے جیسی تمہیں۔ یہ ذہین ہے مگر احمقوں جیسی باتیں کرتا ہے۔
(ہنس کر)
اسٹیشن سے گھر تک آنے میں اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ ساری بستی زندگی سے یکسر خالی ہے۔
(ہنستا ہے)

نسیم : آپ ہی مجھے دکھائیے کہ یہاں زندگی کہاں

ہے؟

چچا : میں دکھا سکتا ہوں۔

(مہمانوں کی گفتگو اور قہقہے سنائی دیتے ہیں)۔

بیگم : تم نے ابھی تک بستر نہیں چھوڑا، اور لوگ آنا شروع ہو گئے، چلو اب جلدی سے اٹھ کر کم از کم منہ ہاتھ ہی دھو ڈالو۔

نسیم : ہٹایئے امّی۔ آنے دیجیئے اب سب کو۔

(اصغر، ثریا، بیگم افتخار، ریحانہ اور نوشابہ ایک ساتھ داخل ہوتی ہیں)

اصغر : (خوش ہو کر) نسیم، خوب آئے یار تم۔
(بغل گیر ہو کر)
اے دوست کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا ـــ

نسیم : بتاؤ کیا حال ہے تمہارا اصغر؟

اصغر : اماں دیہاتی آدمی کا حال ہی کیا۔ بھابی کو دیکھا تم نے اپنی؟ ادھر آؤ ثریا۔

ثریا : (سامنے آ کر) تسلیم!

نسیم : اچھا آپ ہیں، آداب۔ تشریف رکھئے۔

اصغر : بھئی شہر جا کر تو تم ہم سب کو بھول ہی گئے

نسیم : ہاں جی، کچھ دھندے ہی ایسے تھے وہاں، اور سناؤ کیسی گذر رہی ہے آج کل؟

بیگم : تم ادھر آجاؤ افتخار کی دلہن آگست کے قریب، سردی میں کچھ پہنا بھی تو نہیں ہے تم نے۔ نسیم کو تو جانتی ہو نہ؟

بیگم افتخار : ہاں ہاں، کیوں نہیں۔

نسیم : آداب!

بیگم افتخار : تسلیم!

نسیم : ہاں تو اصغر یار، تم تو بوڑھے بھی ہو گئے اتنی جلدی، بال وال سب سفید کر ڈالے، میں تو سمجھتا تھا کہ دیہات کی زندگی آدمی کو ہمیشہ جوان بنائے رکھتی ہے۔

اصغر : ہاں، مگر بے فکری شرط ہے۔

نسیم : تو تمہیں کیا چکر ہے؟

اصغر : ولادت ہونے والی ہے نہ، اُس کے چکر میں ہوں۔

نسیم : Oh, I see. ہاں، مگر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، کوئی معقول نرس ہے یہاں؟

بیگم : ہاں ہاں کیوں نہیں۔ شہر کی پاس شدہ نرس بھی ہے اور تجربے کار دائیاں تو بے شمار ہوں گی۔

اصغر : یار اللہ نے بیٹا دیا تو اس کا نام بھی نسیم رکھیں گے۔

بیگم : بے شرم۔

نسیم : (خوش ہو کر) اچھا کیوں؟

اصغر : تم فخر خاندان ہو اور دل چاہتا ہے کہ ہمارا لڑکا بھی تمہارا جیسا ذہین ہو۔

بیگم : تم نے ریحانہ کو نہیں پہچانا نسیم؟

نسیم : نہیں پہچان سکا۔

ریحانہ : ظاہر ہے کہ آپ نے نہ پہچانا ہوگا۔ کیوں یاد رہتے آپ مجھے۔
(ٹھنڈی سانس لے کر)
عرصہ گذر گیا۔ سالہا سال بیت گئے۔

نسیم : (یاد کر کے) میں نے آپ کو کہاں دیکھا تھا؟

ریحانہ : کہاں دیکھا تھا؟ ــ سبحان اللہ ــ ہم

دونوں آپس میں کھیلا کرتے تھے — کیوں آپا؟

بیگم افتخار: (ہنس کر) نہ جانے کس زمانے کا ذکر کر رہی ہے۔ وہ باتیں یاد ہوں گی اب نسیم کو؟

ریحانہ: واقعی عرصہ تو کافی گذر گیا — پھر آپا کے ساتھ ہی بھی شہر چلی گئیں اور دولہا بھائی کے انتقال کے بعد جب پلٹی تو آپ شہر جا چکے تھے۔

بیگم افتخار: اوہو تو اس قصے کا یہاں کیا تک ہے؟ یہ اُس وقت بہت چھوٹے تھے، بھول گئے ہوں گے؟

بیگم: اچھا تو تم سب ایک دوسرے سے مل لئے (دیکھ کر)

ارے ہاں نوشابہ کو تو دیکھا ہی نہیں تم نے۔ وہ بےچاری چھپی ہوئی کھڑی ہے۔ یہ تو یاد ہو گی تمہیں؟ ادھر آؤ بیٹی!

نسیم: (تکلفاً) اچھی ہو نوشابہ!

نوشابہ: تسلیم — کل ہی تو شاید پڑھ رہی تھی میں کسی اخبار میں تمہارے کسی کھیل کا حال۔

نسیم: (خوش ہو کر) اچھا، کیا لکھا تھا اخبار میں؟

نوشابہ: بڑی بُرائی لکھی تھی تمہارے کھیل کی۔

نسیم: معاف کرنا، مجھے یہ سُن کر بڑا افسوس ہوا کہ تمہارے والد کا انتقال ہو گیا۔

بیگم: بڑی بیماری اُٹھائی بےچاروں نے۔

نوشابہ: میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ ان کی موت مسلسل تکلیفوں سے ان کی رہائی تھی۔

(ٹھنڈی سانس لیتی ہے)

نسیم: واقعی، تم اپنے گھر ہی میں ہو نہ؟

نوشابہ: ہاں ابھی تو ہوں، مگر ہیں کب تک اُس میں اکیلی کھڑی رہوں گی؟

نسیم: (پریشان ہو کر) اچھا تو کوئی اور نہیں ہے گھر میں؟

ریحانہ: (بیچ سے بول کر) میں نے نہ معلوم آپ کے کس کھیل کے بارے میں سُنا تھا کہ اسے بڑی کامیابی نصیب ہوئی۔

نسیم: اچھا۔

ریحانہ: ہاں میں نے سنا تھا کہ وہ متواتر دو تین ہفتے تک برابر چلتا رہا — ہم اور آپا اکثر شہر میں تھیٹر دیکھنے جایا کرتے تھے، دولہا بھائی زندہ تھے اس وقت۔ انہیں دو ہی تو سال ہوئے ہیں ابھی مرے ہوئے۔ مگر ان کے بعد آپا ایسی سوگوار ہو گئیں — دنیا تج دی آپا نے دولہا بھائی کے مرنے کے بعد — پھر نہ یہ شہر ہیں کبھی کھیل تماشہ دیکھنے گئیں نہ بائیسکوپ — اب تو میں نے سنا ہے کہ ہر غم کو لوگ جلدی سے رو پیٹ کر ختم کر لیتے ہیں، مگر ہم نے تو خوب سوگ منایا — کیوں آپا؟

بیگم افتخار: بس توبہ ہے ریحانہ توبہ ہے۔

ریحانہ: کیوں کیا ہوا! میں بہت زیادہ باتیں کر رہی ہوں۔

بیگم افتخار: بہت زیادہ کیا، بالکل پاگلوں کی طرح بولتی چلی جا رہی ہو۔

ریحانہ : میں ہمیشہ سے باتونی ہوں۔
(بیوقوفوں کی طرح ہنستی ہے)
اور آپ ہمیشہ سے اس قدر خاموش اور سنجیدہ .....
(ٹھنڈی سانس بھر کر)
اچھا اب میں نہیں بولوں گی۔
(سب کی ہنسی)

نوشابہ : اس قصبے میں تمہاری سب سے زیادہ میٹھی زبان ہے ریحانہ، اور سب سے زیادہ ملائم دل۔ سچ کہتی ہوں بڑی معصوم ہو تم۔

ریحانہ : (ہمت سے) اور تم یہاں سب سے زیادہ خوب صورت ہو۔
(نوشابہ اور ریحانہ کی ہنسی)

اصغر : (سب کو مخاطب کر کے) اب ذرا ہم دونوں کو بھی تو باتیں کر لینے دو۔ کچھ اپنی کہیں کچھ اِن کی سُنیں۔ مدت کے بچھڑے ہوئے ملے ہیں۔ تم دو ایک لڑکیاں جہاں اکھٹا ہو جاؤ.....

بیگم : (بگڑ کر) یہ ریحانہ ہے سب کے مُنہ سے بات چھینے لے رہی ہے۔ آخر ثریا بھی تو ہے کیسی خاموش اور سلیقے سے بیٹھی ہے؟

اصغر : ارے میاں، چوپال میں چل کر بیٹھیں چچا میاں کے پاس، وہاں باتیں ہوں گی۔

بیگم : پہلے کچھ کھا پی لو پھر جانا کہیں۔

ثریا : "ناشتہ" تو ہم کر کے آئے ہیں پھوپھی اماں۔

بیگم : ارے تو ایک ایک پیالی چائے پینے میں کون سی قباحت ہے۔ اُس تخت پر چل کر بیٹھو جہاں دسترخوان بچھا ہوا ہے۔

نسیم : اور میں جب تک غسل وغیرہ سے فارغ ہو لوں۔
(مہمان دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ نسیم اپنی حجامت بنانے کا سامان ٹھیک کرتا ہے کہ اتنے میں جعفر چچا اُس کے پاس آجاتے ہیں)

چچا : حجامت گھر کے نائی سے بنوا لیتے، وہ تمہارے آنے کی خبر سُن کر دوڑا آیا تھا۔

نسیم : شیو تو چچا میاں میں اپنے ہاتھ ہی سے کرتا ہوں، اُسے کچھ انعام دے دیجئے۔

چچا : گاؤں کی یہ ریت بزرگوں کے وقت سے چلی آرہی ہے کہ حجام، مالی اور سنہار اپنے فرائض نہیں بھولتے۔

نسیم : مگر اب تو زمانہ بہت کچھ بدل گیا۔

چچا : ہاں وہ زمانہ اندھیرے میں چلا گیا۔

نسیم : مگر یہاں اندھیرا کہاں ہے جہاں بقول آپ کے زندگی اور اس کے ہنگامے بکھرے پڑے ہیں۔ "زندگی کی ہر خوشی اور اس کا دکھ درد" وہ کیا جملہ تھا آپ کا؟

چچا : وہ تو اگر تمہارے پاس بینائی اور شعور ہوتا تو تمہیں نظر آتا۔

نسیم : (طنزاً) مجھے نظر آتا ہے۔

چچا : تمہیں کچھ نظر نہیں آتا۔

نسیم : بہرحال یہ تو میں دیکھتا ہی ہوں کہ یہ تمام لوگ، مرد اور عورتیں بڑے شریف

اور سادہ لوح ہیں۔

چچا : (ہنس کر) شریف اور سادہ لوح؟

نسیم : نہیں ہیں یہ لوگ ایسے؟

چچا : (سنجیدہ بن کر) میں تمہیں ایک بات بتاؤں نسیم۔ اس تخت پر دستر خوان کے ارد گرد زندگی کی ٹریجڈی بھی موجود ہے اور کمیڈی بھی۔

نسیم : آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں چچا میاں؟

چچا : کاش کہ میں ایسا کر سکتا۔

نسیم : مگر ان کی زندگی کا المیہ کیا ہے بجز اس کے کہ وہ سادہ لوح ہیں؟

چچا : وہاں تمہارے لئے دو کھیل ہیں ممکن ہے تین ہوں۔ بشرطیکہ تم انہیں محسوس کر سکو۔

نسیم : (تعجب سے) کھیل؟

چچا : تم ان میں سے انتخاب کر سکتے ہو جسے چاہے لے لو جسے چاہے چھوڑ دو۔ ذہانت انتخاب ہی کے فن کا دوسرا نام ہے۔ اگر تم مواد کو کوئی شکل دینا جانتے ہوتے تو معمولی سی چیز میں زندگی پیدا کر سکتے تھے۔ یہ جو ایک چھوٹا سا اجتماع ہے اس کا ہر کردار مخصوص ہے۔ ان سب کو اگر تم اسٹیج یا سینما میں دیکھتے تو بات تمہاری سمجھ میں آجاتی، مگر اس طرح جب کہ وہ کہانی سے الگ چل پھر رہے ہیں تمہیں ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔

نسیم : آپ کا مطلب امی کے ان مہمانوں سے ہے جو تخت پر بیٹھے چائے پی رہے ہیں؟

چچا : ہاں، اور میرا مطلب تم سے بھی ہے اس لئے کہ تم اپنے کو ڈرامہ نگار کہتے ہو۔

نسیم : مگر یہ تو ایک چھوٹا سا جماد ہے جس میں میرے نزدیک تو کوئی خدمت نہیں۔

چچا : اس لئے کہ اس جماد کے ساتھ کوئی سجاوٹ نہیں ہے اسٹیج کے انتظامات نہیں ہیں۔ یہ سارے کام تو تمہارے تھے!

نسیم : میرے؟

چچا : ہاں، بحیثیت ایک فن کار کے تم اسے کوئی شکل دیتے یا زندگی۔

نسیم : لیکن کوئی موضوع بھی ہو تب نہ؟

چچا : وہ تو میں نے بتایا کہ دو باتیں ہیں۔

نسیم : مجھے تو ایک بھی نظر نہیں آیا۔ کیا آپ کے خیال میں ریحانہ موضوع بن سکتی ہے؟ جس طرح وہ بے وقوفی کی باتیں کر رہی تھی۔

چچا : بننے کو تو اصغر اور اس کی بیوی ثریا بھی بن سکتی ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں ہر جگہ ملنے والے یہ دو کردار اپنے اندر بڑی جان رکھتے ہیں۔ اصغر کیسا شوخ اور شریر لڑکا تھا مگر اس کی بیوی نے اسے سدھا لیا۔ یہ دونوں کس قدر معصوم اور ولادت کے خیال سے خوش ہیں۔ مگر انہیں کیا معلوم کہ بچوں کی یہ لمبی ڈوری ہر سال بڑھتی چلی جائے گی، اور غریب باپ ۴۰، ۵۰ سال کی عمر میں سب کو چھوڑ کر مر جائے گا۔

نسیم : تو اس میں ڈراما کیا بنا؟

چچا : (ہنس کر) اچھا مجھے اور اپنی امی کو دیکھو۔

نسیم : آپ دونوں بھی عام انسانوں کی طرح ہیں۔

چچا : بعض لوگ عام انسانوں کی طرح سے بھی ایک چٹان ہوتے ہیں۔

نسیم : پھر بھی میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ میں اپنی ماں اور چچا کو ایسے پہلے آؤں۔

چچا : (دوبارہ ہنس کر) اچھا تو تم اس سارے کھیل میں اپنے کو دلن کی حیثیت سے پیش کر سکتے ہو۔

نسیم : یہ کیسے؟

چچا : نوشابہ کے ساتھ تمہارا سلوک اس کی شہادت ہے۔

نسیم : (گھبرا کر) میرا سلوک؟

چچا : تعجب کا اظہار کر کے یہ بہانہ مت کرو کہ تم نے اس کا دل نہیں توڑا ہے۔

نسیم : (تعجب سے) میں نے؟

چچا : (زور دے کر) ہاں تم نے۔ چار سال ہوئے تم اسے بے سہارا چھوڑ کر شہر نہیں چلے گئے؟

نسیم : لیکن ہم میں کوئی ایسا عہد و پیمان نہ تھا کوئی چیز ہمارے درمیان نہ تھی۔

چچا : تمہارے درمیان تمہارے اپنے یہ الفاظ تھے ـــ "نوشابہ! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں!!" ـــ اور سب کچھ تھا۔ تمہیں یاد ہے چار سال پہلے وہ کس قدر خوش تھی مگر اب اس کا چہرہ دیکھو؟ تمہارے چار سالوں کی عدم موجودگی کا کرب اس کے وجود میں شامل ہو چکا ہے۔ وہ وقت سے پہلے بوڑھی ہو چکی ہے۔

نسیم : مگر اس کی یہ شکل میری وجہ سے نہیں ہے۔ اس نے بڑا کٹھن وقت گذارا۔ عرصہ تک اپنے بیمار باپ کی خدمت کرتی رہی اور قدرتاً اس کا یہ حال ہو گیا۔

چچا : (طنزاً ہنستا ہے)

نسیم : ابھی وہ مجھ سے جس طرح ملی اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے درمیان کوئی ایسی بات نہ تھی۔

چچا : جانتے ہو کیوں؟ ذرا محسوس کرو۔ نہیں یہ نہیں معلوم کہ اُس کے ذہن میں کیا ہے؟ وہ سوچے کیا بیٹھی ہے؟

نسیم : میں یہ معلوم بھی کرنا نہیں چاہتا۔

چچا : اس لئے کہ تم ڈرتے ہو....

نسیم : (بات ٹالتے ہوئے) اچھا ریحانہ اور بیگم افتخار کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

چچا : ہاں ـــ یہ دونوں بہنیں بظاہر تمہارے یہاں زرق برق پوشاکیں پہن کر آئی ہیں لیکن ان کپڑوں کے اندر....

نسیم : (بات کاٹ کر مذاق اُڑاتے ہوئے) وہی ٹوٹا ہوا دل؟

چچا : نہیں، بلکہ خالی پیٹ۔

نسیم : (بے چین ہو کر) اوہ۔

چچا : میں یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا مگر میرا اندازہ ہے کہ یہ دونوں صبح سے بھوکی ہوں گی، جیسا کہ عام طور پہ ہوتی ہیں۔ باوجود اس کے کہ یہ دونوں ایک بڑے

گھر میں رہتی ہیں اور کسی تقریب کے موقع پر رکھے رکھائے جوڑے پہن لیتی ہیں' مگر ان دونوں کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں ہے، کوئی ذریعۂ معاش نہیں ہے ــ یہ گھرانہ اپنے اچھے دنوں میں بڑا فیاض تھا. کوئی ضرورت مند ان کے در سے خالی نہیں پھرا. اور اب ان اچھے دنوں کی یاد کا تحفظ ان دونوں کا شعار ہے ۔

نسیمہ : (اور زیادہ پریشان ہو کر) کیا یہ سچ ہے ؟

چچا : جھوٹ کیوں ہونے لگا؟ لوگ شہر کے علاوہ اس قصبے میں بھی بھوکے ہو سکتے ہیں. تم نے ان دونوں کے چہروں پر ایک قسم کی محرومی بھی دیکھی ؟

نسیمہ : جی نہیں !

چچا : اور میں کہتا کیا ہوں ــ تمہارے پاس نہ احساسات ہیں نہ آنکھیں ــ ورنہ یہ ساری چیزیں تمہارے کھیل کے لئے مختلف ٹکڑے تھے. جنہیں تم بڑی خوب صورتی سے جوڑ کر ایک ڈراما تیار کر لیتے ۔

نسیمہ : اچھا آپ اپنے طور پر کیا ہیں ؟ ٹریجڈی یا کمیڈی ؟

چچا : میں تو ایک بے مقصد انسان ہوں، اور کچھ بھی نہیں ۔

نسیمہ : اس کے علاوہ کچھ اور ؟

چچا : (ہنس کر) اپنی زبان میں میلو ڈراما سمجھ لو مجھے ۔ اس لئے کہ میں نے اپنے اندر کے انسان کو مار ڈالا ہے ۔

نسیمہ : یہ کیا کہا آپ نے ؟

چچا : میں نے اس کے دل پر حملہ کیا، پیٹھ میں چھرا نہیں گھونپا. اب میں صرف انسان کی ایک یادگار رہوں، اور اپنے اندر کے مرے ہوئے انسان کو ہر جگہ پہچان لیتا ہوں.

نسیمہ : (لاشعوری طور پر) آپ سچ کہتے ہیں. یہاں کہیں ضرور کوئی ڈراما ہے. میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ کہاں اور کس کے ساتھ' مگر میں کوشش کر کے ڈرامائی عنصر ڈھونڈ نکالوں گا. میں اب سب کچھ دیکھ رہا ہوں' یہ ساری چیزیں یا تو میرے دماغ میں واقع ہوں گی ــ یا میں حالات ترتیب دے رہا ہوں یا حالات مجھے ترتیب دے رہے ہیں ــ میں ڈرامائی اصول کے تحت آپ سب کو الگ الگ جگہ دوں گا. میں آپ سب کو ایک کھیل کے اندر دیکھنا چاہتا ہوں تا آپ سب میرے دماغ کے ساتھ ساتھ رہیں گے میں آپ سب کے بارے میں سوچتا رہوں گا.

چچا : (ہنس کر) اچھا شبّو دکر چکے تم، اب جا کر غسل لے لو ۔

(غسل لیتے وقت نسیم کو مختلف قسم کے خیالات گھیر لیتے ہیں)

پہلا تصوّر

نسیمہ : (انتہائی محبت سے مخاطب کر کے) نوشابہ !

نوشابہ : (ٹھنڈی سانس لے کر) آج کتنے دنوں کے بعد میں نے تمہیں دیکھا ہے ۔

نسیم : چار سال بعد۔ امی نے تمہاری بابت مجھے سب کچھ بتلا دیا۔

نوشابہ : وہ بڑی مصلحت اندیش ہیں۔

نسیم : میں نے تمہاری بربادیوں کا حال سنا تھا نوشابہ۔ میں تمہیں خط لکھنا چاہتا تھا مگر.....

نوشابہ : مجھے معلوم ہے۔ تم اپنے ڈراموں میں مصروف رہے اور مجھے بھلا بیٹھے۔

نسیم : تم ایسی دکھائی دیتی ہو جیسے . . .

نوشابہ : بہت تھکی ہوئی اور افسردہ . . .

نسیم : بلکہ انتہائی سنجیدہ بھی۔

نوشابہ : (غم وغیرہ کا اظہار کرتے ہوئے) میں چاہتی ہوں میں اس تقریب سے بھاگ جاؤں۔ میں سچ سچ سن رسیدہ اور تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہوں۔ آپا کی مسلسل بیماری اور تیمارداری نے مجھے ایسا بنا دیا۔ انہوں نے اتنے دکھ جھیلے کہ ان کی موت ان کی نجات بن گئی۔

نسیم : ہاں مجھے امی نے بتایا۔۔۔ مگر تمہاری تنہائی . . . ؟

نوشابہ : میں اسے رفع کر لوں گی۔ میں نے کچھ سوچا ہے۔

نسیم : (مسکرا کر) اچھا شادی ہونے والی ہے تمہاری؟

نوشابہ : (غصے میں) نسیم!

نسیم : معاف کرنا، شاید مجھے یہ نہیں کہنا چاہئے تھا۔

نوشابہ : یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ کچھ دنوں کے بعد میں شاید تمہیں کبھی نہ مل سکوں۔

نسیم : (بے تاب ہو کر) نوشابہ!

نوشابہ : (محویت کے عالم میں) کبھی نہیں۔ تمہارے لئے بھی اور ہم دونوں کے لئے بھی ایسا ہی مناسب ہے۔ میں تم سے کچھ باتیں اس وقت بالکل صاف صاف کہنے آئی ہوں، تمہیں یاد ہوگا میں ۱۶ سال کی عمر تک کتنی شرمیلی تھی مگر تم سے بے جھجک ملتی رہی میں اب بھی اتنی ہی شرمیلی ہوں، اور یہ سب کچھ میری فطرت کے خلاف تھا۔

نسیم : میں تمہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ یہی کہنا چاہتی ہو نہ؟

نوشابہ : بالکل۔ اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہماری محبت محض ایک مذاق تھی۔

نسیم : مگر میں تم سے اب بھی بہت محبت کرتا ہوں نوشابہ۔

نوشابہ : (مسکرا کر) یہ تمہارا محض خیال ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو جس طرح تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے . . . .

نسیم : (بات کاٹ کر) ہاں، مگر میں اپنی خواہش کا اظہار زبان تک نہ لا سکا۔ مجھے وہ شام اچھی طرح یاد ہے جب ہم باغ سے رات کو لوٹ رہے تھے ۔۔۔ یاد آیا تمہیں۔؟ دوسرے دن میں جانے والا تھا اُس رات میں نے کئی بار ہمت کی کہ تم سے شادی کے لئے کہوں، مگر ایسا نہ کر سکا۔ میں گھر آ گیا، اور میں نے اپنے بستر پر لیٹ کر یہ سوچا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ میں ایک

لاابالی طبیعت کے ساتھ آزاد ہوں۔

نوشابہ: میں بھی ایسا سوچ سکتی تھی، مگر میں نے یہ نہیں سوچا ــ تم نے یہاں سے چلے جانے کے بعد مجھے کچھ لکھا بھی نہیں۔ اور میں نے یہی سوچا کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ میں نے بھی بھلانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں مجھے کئی سال لگ گئے، لیکن آخر کار مجھے کامیابی ہوئی۔ اب تم میرے لئے اس اجنبی سے بھی کم حیثیت رکھتے ہو جو راستے میں مل جائے۔ تم نے میرا دل توڑا جیسا کہ لوگ کہتے ہیں لیکن وہ پھر جڑ گیا ابا کے مر جانے کے ابعد میں آزاد ہوں، دنیا اور محبت سے کنارہ کشی کرنے کے لئے بالکل آزاد ــ

نسیم: مجھے اس وقت ایسا محسوس ہوا جیسے تم انتہائی بے رحم ہو۔

نوشابہ: نہیں ایسا نہیں محسوس ہونا چاہئے۔ تمہیں میرے ساتھ اپنی بدسلوکی کو نہیں بھولنا چاہئے نسیم۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ صرف تم سے الوداع کہنا باقی ہے۔

نسیم: نوشابہ میرا خیال تھا کہ اب بھی ....

نوشابہ: نہیں۔ تم اب میرے لئے ہر خیال سے بہت دور ہو۔

دوسرا تصوّر

ریحانہ: (تھکی ہوئی آواز میں) لو آپا گرتے پڑتے پہونچ ہی گئے اپنے گھر۔

بیگم افتخار: خدا کا شکر ہے آگ ابھی تک سلگ رہی ہے، ورنہ راستے کی سمائی ہوئی سردی سے برا حال ہو جاتا۔ کلیجہ اب تک کانپ رہا ہے۔

ریحانہ: لکڑیاں کتنی اچھی ہیں جو ابھی تک جلتی رہیں تھوڑی سی لکڑیاں اور ڈال کر آنچ کر دوں۔

بیگم افتخار: نہیں اب لحاف میں چل کر گھس رہو، لکڑیاں اب کم رہ گئی ہیں، کل تمہیں شاید پھر کاٹنا پڑیں۔

ریحانہ: تو کیا ہوا؟

بیگم افتخار: میں چاہتی ہوں، تمہارا ہاتھ بٹاؤں مگر....

ریحانہ: ارے نہیں آپا، مجھے لکڑیاں کاٹنے میں ذرا سی بھی تکلیف نہیں ہوتی۔ ذرا سا بدن ہی گرم ہو جاتا ہے۔

بیگم افتخار: میرے بدن میں تو اس وقت گرمی آتی ہے جب یہ جلتی ہیں۔

ریحانہ: (ہنس کر) وہ تو میں ہمیشہ سے کہتی ہوں۔

بیگم افتخار: طنز کر رہی ہو؟

ریحانہ: طنز؟ نہیں آپا ــ (ہنستی ہے)
کیسی اچھی تقریب رہی آج کی آپا۔ خدا کرے گاؤں کے ہر گھر میں ایسا نسیم کوئی نہ کوئی آتا رہے۔

بیگم افتخار: مگر تم تو وہاں جا کر بالکل پاگل بن گئیں ایسی حرکتیں کر رہی تھیں تم جیسے کوئی تین سال کا بچہ مارے خوشی کے اچھلنے کودنے لگتا ہے۔

ریحانہ : ہائے میرے اللہ کیا میں نے بہت باتیں کیں؟

بیگم افتخار: بے حساب۔

ریحانہ : لیکن آپا وہاں کی روشنی، ہشاش بشاش لوگ، مزے دار کھانا، وہ میں سمجھتی ہوں بجائے میرے پیٹ میں جانے کے دماغ میں چلا گیا۔

(وفورِ جوش میں گانے ناچنے لگتی ہے) -

'چندا کی چاندنی میں'۔

بیگم افتخار: ذرا ہوش میں رہو ریحانہ اپنے۔

ریحانہ : میری سمجھ میں نہیں آتا آپا کہ تم آخر شرافت کی پُتلی کب تک بنی رہوگی۔ شہر میں ہم دونوں کیسے خوش ہو کر گایا کرتے تھے۔

بیگم افتخار: (ٹھنڈی سانس لے کر) وہ دن خواب وخیال ہوگئے۔

ریحانہ: (اور زیادہ لمبی سانس لے کر) سچ سچ آپا، یہ گانا ہم نے کہاں سُنا تھا؟

بیگم افتخار: کوئی تصویر دکھانے لے گئے تھے تمہارے دولہا بھائی، اُس میں تھا۔

ریحانہ : اور کس قدر خوش تھیں، اُس روز تم آپا۔ گھر آکر تم نے مجھے گود میں اٹھا لیا تھا، اور میں نے تمہارے بالوں میں پھول سجائے تھے۔

بیگم افتخار: مجھے یاد ہے۔

ریحانہ : ہم دونوں کتنے خوش تھے آپا۔ دولہا بھائی کس قدر خوبصورت تھے۔

بیگم افتخار: ہاں ـــ مگر تم پھر بھی خوش قسمت ہو ریحانہ۔

ریحانہ : اس لئے کہ میرے پاس تمہارا جیسا کوئی غم نہیں ہے؟ ـــ لیکن آج جب میں نے نسیم کے یہاں اصغر اور ثریا کو شادی کے بعد پہلی مرتبہ دیکھا تو میرا ایسا دل چاہا کہ میں چیخیں مار مار کر روؤں۔

بیگم افتخار: پگلی ـــ

(موضوع بدل کر)

ارے ہاں، نسیم کیا کہہ رہا تھا تم سے؟

ریحانہ : بڑا بداخلاق آدمی معلوم ہوتا ہے وہ تو آپا۔

بیگم افتخار: شہر میں رہنے والا نوعمر طبقہ ایسی ہی زندگی گذارتا ہے۔

ریحانہ : اچھا، یہ کیوں؟

بیگم افتخار: اخباروں میں ہر روز خبریں آتی رہتی ہیں ـــ قتل، خودکشی، رات کے کلب ـــ تمہارے اس جھولے کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا وہ؟

ریحانہ : (گھبرا کر) میرے جھولے کے بارے میں؟ کچھ نہیں آپا، وہ تو صرف مذاق کر رہا تھا۔

بیگم افتخار: مذاق تو تھا مگر تم اس قدر گھبرا گئیں جیسے سچ مچ تمہارے جھولے میں کوئی چیز ہے۔

ریحانہ : جھولے میں؟

بیگم افتخار: ہاں ہاں اسی میں تو کہہ رہا تھا وہ۔

ریحانہ : اگر سچ پوچھو آپا تو، تھا تو اس میں۔

بیگم افتخار: تھا؟ کیا مطلب۔

ریحانہ : میں یہ جانتی ہوں تمہیں یہ سن کر رنج ہوگا

GIRLS C... ACC. No. 15227 LIBRARY

آپا۔ لیکن میں مجبور تھی، میں قسم کھاتی ہوں
مجھے کسی نے نہیں دیکھا۔ اس وقت نسیم
تو وہاں تھا بھی نہیں۔ لیکن اسے شک کس
طرح ہوا؟ یہ میں بھی نہ سمجھ سکی — میں نے
اسے اپنا جھولا کھولنے نہیں دیا۔ اور یہ تو
تم جانتی ہو کہ ہم نے کتنے دنوں سے گھی
کی خوشبو تک نہیں سونگھی۔

بیگم افتخار: (گھبرا کر) یہ تم کیا کہہ رہی ہو ریحانہ!

ریحانہ: آپا، وہ روغنی ٹکیاں جو نسیم کی امی نے
چائے کے ساتھ لا کر رکھی تھیں کتنی مزے دار
تھیں۔

بیگم افتخار: ہاں، بہت مزے دار تھیں۔ میں نے ایک
کھائی تھی، دوسری کھانا چاہتی تھی، مگر
اتنی دیر میں وہ سب ختم ہو گئیں۔

ریحانہ: دو ٹکیاں میں نے صبح کے لئے اس جھولے
میں رکھ لی تھیں۔

بیگم افتخار: (چلا کر) ریحانہ!

ریحانہ: (ڈر کر) دو ٹکیاں میں نے رکھ تو ضرور
لیں آپا۔

بیگم افتخار: میں تو اس قسم کا کوئی خیال تک دل
میں نہیں لا سکتی۔

ریحانہ: یہ ہیں دونوں ٹکیاں — سونگھو کیسی گھی
کی خوشبو آ رہی ہے ان میں سے —
(خوشامدانہ)
تم خفا ہو مجھ سے آپا؟

بیگم افتخار: (کچھ سوچ کر) مجھے ہونا چاہئے تھا مگر
میں نہیں ہوں۔
(سرد آہ بھر کر)
یا اللہ ہم کس قدر نیچے گر چکے ہیں۔

ریحانہ: اچھے دن پھر آ جائیں گے آپا۔ ذرا ہماری
مرغیوں کو انڈے دینے دو۔

بیگم افتخار: یہ تین چار مرغیاں دن پلٹ دیں گی؟
— اچھا ہوا کہ خاندان کے سب لوگ مر
گئے۔ انہوں نے یہ زمانہ نہیں دیکھا۔

ریحانہ: ہم سے بھی برے دن لوگ گذارتے ہیں
آپا، بھوک لگی ہو تو ایک ٹکیا کھا لو۔ گرم
کر دوں؟

بیگم افتخار: (غصہ میں) میں اسے نہیں کھاؤں گی۔

ریحانہ: اچھا صبح کھانا۔ صبح کے وقت کچھ تھوڑا
سا سہارا ہو جائے گا — جعفر چچا نے آپ
کو کیا چیز دی تھی آپا؟

بیگم افتخار: (یاد کر کے) ارے ہاں ایک خط دیا تھا
انہوں نے۔ میں نے اب تک دیکھا ہی نہیں
اسے۔ روشنی تیز کر دو ذرا، تو پڑھوں۔

ریحانہ: روشنی اس قدر کم ہے کہ دیوار پر لگی ہوئی
دولہا بھائی کی تصویر تک نظر نہیں آتی۔
(روشنی تیز کر کے)
لیجئے اب پڑھئے خط۔

بیگم افتخار: (پڑھتے ہوئے) "تمہارے اور اپنے
پرانے تعلقات کی بنا پر" — ہوں۔

ریحانہ: کیا ہوا آپا؟

بیگم افتخار: سو روپے کا نوٹ رکھا ہے اس میں۔

ریحانہ: (ایک دم اچھل کر) سو روپے؟

بیگم افتخار: ہاں جڑاول بنانے کے لئے دیئے گئے
ہیں۔

ریحانہ: (خوش ہو کر) کتنے فیاض ہیں جعفر چچا۔

بیگم افتخار: ہاں۔

ریحانہ: اچھا آپا، اس میں سے ہم کچھ کپڑا خرید لیں گے۔ ایک بکری لے لیں گے تاکہ صبح کی چائے کے لئے دودھ کا آرام ہو جائے، مرغیوں کے لئے کچھ دانہ خرید لیں گے اور.....

بیگم افتخار: (بات کاٹتے ہوئے) نہیں نہیں، یہ کچھ نہیں خریدا جائے گا ان روپوں سے۔

ریحانہ: تو پھر کیا ہوگا؟

بیگم افتخار: اگر جعفر چچا سے میں نے یہ مدد لے لی تو کیا میں پھر کبھی ان کے گھر سر اونچا کر کے جا سکوں گی؟

ریحانہ: لیکن یہ میری طرح ٹکیاں چرانے والی بات نہیں ہے آپا؟

بیگم افتخار: تم اب کبھی ایسا نہیں کرو گی ریحانہ وعدہ کرو مجھ سے۔

ریحانہ: (بے چین ہو کر) میں وعدہ نہیں کر سکتی آپا۔ مجھے خود اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہے۔ تم مضبوط ارادوں کی ہو۔ میں بھوکی ہوں، میں اچھے کپڑے پہننا چاہتی ہوں۔ میں اچھا کھانا چاہتی ہوں۔ دیکھتی ہو میرے جسم پر کس قسم کے کپڑے ہیں؟

بیگم افتخار: مگر ہم سے ایک بڑے گھر کا نام منسوب ہے ریحانہ۔

ریحانہ: میں بڑے نام سے باز آئی آپا۔ ہم دست نگر ہیں، ہم دنیا کی لاج میں مر رہے ہیں کب تک ان چیزوں کی روشنی میں دیکھا جائے گا جو ہمارے پاس نہیں ہیں؟

بیگم افتخار: اگر ہم غریب ہیں تو یہ ہمارا قصور نہیں، ــــ میں اس نوٹ کو بہت خوبصورتی سے یہ کہہ کر واپس کر دوں گی کہ ہمیں ضرورت نہیں ہے۔

ریحانہ: واپس کرو گی؟

بیگم افتخار: ہاں۔

ریحانہ: تم ان سے یہ کہو گی کہ ہمیں ضرورت نہیں ہے اور وہ اس پر یقین کر لیں گے؟

بیگم افتخار: وہ یہی سمجھیں گے کہ ہم نے اخلاقاً انکار کر دیا۔ اگر ہم ضرورت مند نہیں تو یہ انکار بھی کوئی قصور نہیں۔

ریحانہ: تو پھر وہ تمام روپیہ واپس کر دو جو انہوں نے وقتاً فوقتاً ـــ تم سمجھتی ہو کہ میں کچھ نہیں جانتی؟

بیگم افتخار: (غصہ میں) میں اس نوٹ کو آگ میں جلائے دیتی ہوں ـــ نہیں واپس کروں گی بس۔

ریحانہ: (خوشامدانہ) ایسا نہ کرنا میری آپا، صبح تک سوچ لو۔

بیگم افتخار: ابھی چولہے میں اتنی آگ ہے کہ یہ نوٹ جل جائے۔

ریحانہ: صبح تک انتظار کرو، ممکن ہے تمہارا خیال بدل جائے۔

بیگم افتخار: اسی چیز سے تو میں ڈرتی ہوں۔ اس وقت میرے جذبات بھڑکے ہیں۔ ممکن ہے صبح تک ختم ہو جائیں۔

(آگ کا بھبکا اٹھتا ہے)

ریحانہ: (چلا کر) یہ کیا کیا تم نے آپا؟

(مضمحل آواز میں)
میں ان ٹکیوں کو بھی آگ میں ڈالے دیتی ہوں۔

بیگم افتخار: نہیں نہیں، انہیں صبح کھانے کے لئے رہنے دو۔

ریحانہ: اب میں انہیں نہیں کھا سکتی آپا، یہ میرے حلق میں اٹکیں گی۔
(رونے لگتی ہے)

بیگم افتخار: (گھبرا کر) میں خود بھی تمہارے ساتھ کھاؤں گی ریحانہ۔ شاید اس سے میرے غرور کا سر کچھ نیچا ہو۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ تم رونے لگو۔ مجھے ماننا پڑا۔ مجھے یقین ہے کہ میں خود بھی رو رہی ہوں۔
(ریحانہ کے ساتھ بیگم افتخار بھی رو پڑتی ہیں)

تیسرا تصور

نوشابہ: میرا خیال تھا کہ میں نسیم کو بالکل بھول چکی ہوں۔ میرا خیال تھا میں نے اسے اپنے دل سے نکال کر الگ پھینک دیا ہے۔ لیکن میں اپنے آپ کو بھی دھوکا دے رہی تھی اور اسے بھی ـــ میں نے اس پھول کو رکھ چھوڑا تھا جو اس نے کبھی مجھے دیا تھا۔ اب میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کئے دیتی ہوں۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ میں سب کچھ بھول چکی ہوں میں اب بالکل خالی ہوں ـ ہر قسم کی انسانی محبت سے بالکل خالی ـــ میرے خدا، مجھے صبر دے، طاقت دے، مجھے اپنے دل سے مقابلہ کرنے کی ہمت عطا فرما۔ میری محبت جو کبھی کبھی سسک کر اپنی زندگی کا ثبوت دیتی ہے اسے مردہ کر دے۔
(نسیم غسل کے بعد کمرے میں آتا ہے اور پہلے سے بھی زیادہ پریشان ہے)

چچا: ہاں تو کیا سوچا تم نے اتنی دیر میں؟ ـ میرا خیال ہے تم نہاتے بھی رہے اور سوچتے بھی رہے ہو۔

نسیم: میں اپنا کھیل ابھی دکھاتا ہوں آپ کو، ناشتہ کر چکے سارے لوگ؟

چچا: مدت ہوئی۔ تمہیں دیکھ کر اب سب ادھر ہی آ رہے ہیں۔

اصغر: ارے میاں کہاں تھے تم دسترخوان پر بڑے بڑے مال ٹال تھے۔

نسیم: میں صبح کے وقت کچھ کھانے کا عادی نہیں ہوں۔

بیگم: یہ اچھی علت شہر سے لگا کر لائے ہیں کہ نہار منہ چائے پی لی۔

اصغر: ناشتہ تو بعد مدت کے آج کیا ہے نسیم کے طفیل میں۔

ریحانہ: جب ہی گاجر کا سارا حلوا تم کھا گئے۔

شوبیا: (برامان کر) تم نے کچھ کم کھایا؟

بیگم: جتنا، جس کے پیٹ میں آیا اتنا کھا لیا سب نے۔ یہ بتاؤ کہ چیزیں مزے دار بھی تھیں؟ کیوں افتخار کی دلہن!

بیگم افتخار: بڑی لذیذ۔ انتہائی مزے دار۔ آپ کے ہاتھ کے آب و نمک کا کیا کہنا۔

ریحانہ : نسیم تو ہم سے الگ ہی الگ نہ معلوم کہاں رہے۔

نسیم : ہاں میں نہیں شریک ہو سکا آپ کی خوشیوں میں۔

مشوریا : تم تو شہر جا کر ہم سب کو بھول گئے۔

نسیم : مجھے سب یاد ہیں، اچھا دیکھئے میں شریک ہوتا ہوں آپ کی خوشیوں میں ـــ ریحانہ میں تمہارے اس جھولے کی تلاشی لے سکتا ہوں؟

ریحانہ : (گھبرا کر) کیوں میرے جھولے میں کیا ہے؟

نسیم : یہی میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس میں کیا ہے؟

ریحانہ : (بظاہر غصے میں مگر ڈر کر) تمہارا خیال ہے کہ میں نے تمہاری والدہ کا زیور رکھ لیا ہے اس میں؟

نسیم : میں تلاشی لینا چاہتا ہوں۔

ریحانہ : ہرگز نہیں۔ تم سب کے سامنے مجھے ذلیل کرنا چاہتے ہو۔

اصغر : ارے مذاق کر رہے ہیں نسیم۔

بیگم : بری بات ہے بیٹا، اپنے مہمان سے ایسا مذاق نہیں کرتے۔

چچا : یہی وہ کھیل ہے جو تم مجھے دکھانا چاہتے تھے؟

نسیم : جی نہیں، یہ کوئی کھیل نہیں ہے، نہ مذاق ہے۔ بلکہ ساری سچائی اور ساری حقیقت میرے اس سوال کے جواب میں مضمر ہے ریحانہ کیا چیز ہے تمہارے اس جھولے میں مجھے دیکھنے دو۔

بیگم : کیسی ضد کر رہے ہو نسیم۔ بری بات ہے۔

اصغر : ریحانہ مہمان ہے تمہاری۔ یہ مذاق برا لگ جائے گا اُسے۔

بیگم افتخار : (برا مان کر) تم دکھا کیوں نہیں دیتی ہو ریحانہ۔ جھولا پھینک دو سامنے۔

بیگم : تم بھی برا مان گئیں ذرا سے مذاق کا۔

بیگم افتخار : نہیں میرا مطلب تھا اگر کچھ شک گذرا ہے نسیم کو تو جھولا ضرور دیکھ لیں۔

اصغر : ارے میاں تو کون سی رو کر دیہاں پڑی تھی جو اُس نے جھولے میں چرا کر رکھ لی ہوگی۔

بیگم : توبہ اللہ، بیٹھے بٹھائے یہ اچھی مصیبت نازل ہوگئی ـــ وہ ساری خوشیاں، وہ سارے قہقہے ـــ خدا کے لئے بھول جاؤ اس بات کو اور پہلے کی طرح ہنسو کھیلو۔

نسیم : (بے تابانہ) نہیں نہیں، ان خوشیوں اور قہقہوں سے بھی زیادہ اہم چیز اس کمرے میں موجود ہے ـــ کیا چیز ہے تمہارے جھولے میں ریحانہ؟

بیگم : (بگڑ کر) میں کہتی ہوں نسیم: نہیں مانو گے تم؟

نسیم : میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو دکھانا چاہتا ہوں کہ اس تقریب، اس سارے ہنگامے کا پس منظر کیا ہے۔ آپ کہتی ہیں نہ کہ میرے پاس تصور نہیں ہے احساس نہیں ہے۔ میں سوچ نہیں سکتا۔

چچا : ہاں تم حقیقتوں کو بے نقاب نہیں کر سکتے

(باقی صفحہ ۱۰۵۵ پر)

آغا ناصر

ضرورتِ رشتہ

کردار

* حکیم صاحب — عمر تقریباً ۵۰ سال
* بیگم — حکیم صاحب کی بیوی
* پہلا امیدوار — ۲۸ سال کا ایک نوجوان
* دوسرا امیدوار — تقریباً ۳۵ سال کا ایک حکیم
* بڑے میاں — ۸۰ سالہ بزرگ
* جمن — حکیم صاحب کا نوکر

منظر : (حکیم صاحب کے مکان کا ایک نیم تاریک نیم روشن کمرہ، ایک تخت پر بیگم بیٹھی چھالیا کتر رہی ہیں، حکیم صاحب آرام کرسی پر لیٹے خلال کر رہے ہیں)

بیگم : آخر لڑکی سیانی ہو گئی ہے۔ اللہ رکھے اس کی تمام ہم جولیاں اپنے اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ جوان لڑکی کو اب کب تک گھر میں بٹھائے رکھو گے؟

حکیم جی : بیگم تم ہی بتاؤ، آخر کیا کروں؟ اب تو بس ایک ہی ترکیب رہ گئی ہے۔

بیگم : وہ کیا؟ میں بھی تو سنوں۔

حکیم : اخبار میں شادی کا اشتہار نکلوائے دیتا ہوں۔ کیوں؟

بیگم : اے نوج جو میری بٹیا کا اشتہار نکلے اخبار میں۔ تم تو سٹھیا گئے ہو — خوب سوچا تم نے۔

حکیم : اب وہ زمانہ چلا گیا بیگم۔ آج کل اخباروں میں اشتہار دے کر شادیاں کرنے کا عام رواج ہے — اور اس میں حرج ہی کیا ہے — لوگ آئیں گے۔ میں ان سے مل کر باقاعدہ بات چیت کروں گا اور ہر طرح کا اطمینان کر لینے کے بعد کچھ طے کیا جائے گا۔ سمجھیں!

بیگم : سمجھی تو مگر.....

حکیم : مگر وگر کچھ نہیں — ذرا قلم دوات لا کر دو مجھے۔ ابھی لکھے دیتا ہوں اخبار کے لئے اشتہار، ارے جمن — ارے او لڑکے جمن — قلم دوات تو اٹھا لا مطب میں سے۔

بیگم : جو تمہاری مرضی ہو کرو۔ میں تو بس اتنا

کہتی ہوں کہ خاندان کی عزت کا خیال رکھنا

حکیم : تم فکر نہ کرو، مجھے خود خیال ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا، انشاءاللہ۔

جمن : (آتا ہے) لیجئے سرکار، یہ قلم دوات۔

حکیم : ہاں لا، اِدھر۔ اور ذرا وہ کاغذ اُٹھا دینا بیگم۔ ہاں لاؤ بس ٹھیک۔

(اشتہار لکھتے ہوئے)

"ضرورتِ رشتہ۔ ایک نوجوان سلیقہ شعار تعلیم یافتہ لڑکی کے لئے رشتہ مطلوب ہے نوجوان، تعلیم یافتہ، برسرِ روزگار اور شریف خاندان ہونا چاہیئے۔ اس پتے پر صبح آٹھ سے بارہ بجے کے درمیان خود آکر ملاقات کریں۔ (پتہ)

(موسیقی)

حکیم : جمن، ارے او لڑکے جمن۔ نہ جانے کہاں مَر جاتا ہے کم بخت۔ (چیخ کر) ارے او جمن کے بچے۔

جمن : جی سرکار ــــ؟

حکیم : کہاں تھا کم بخت؟ دیکھ باہر جا کر ذرا دیکھ تو سہی۔ کچھ لوگ آئے؟

جمن : باہر تو کوئی بھی نہیں ہے سرکار۔

(آہستہ سے)

اور یہاں آئے گا بھی کون۔ وہ ایک بیچارے مرزا صاحب تھے پرانے مریض، پرسوں وہ بھی چل بسے!

حکیم : ارے کیا بکے جا رہا ہے کم بخت! میں مریضوں کی بابت نہیں پوچھ رہا ہوں ــ تو باہر جا کر کھڑا ہو جا ــ رشتے کے سلسلے میں امیدوار آئیں گے۔ اگر کوئی آئیں تو عزت کے ساتھ لانا۔ سمجھا؟

جمن : بہت اچھا سرکار۔

حکیم : اور ہاں ہیں ــ دیکھ آج میں مریضوں کو نہیں دیکھوں گا۔ کوئی مریض آنے پائے صرف امیدواروں کا معائنہ ہوگا۔

جمن : بہت اچھا سرکار۔

دوسرا منظر

حکیم صاحب کا مطب۔ ایک میز، چار کرسیاں، دوا الماریاں اور دواؤں کی چند شیشیاں)

امیدوار : سلام علیکم۔

حکیم : وعلیکم السلام۔

(کھانستے ہیں)

امیدوار : (شرماتے ہوئے) جی ... وہ .... آج صبح کے اخبار میں یہ خبر پڑھی ... وہ میرا مطلب ہے وہ آپ کے رشتے کا اشتہار پڑھا .... اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔

حکیم : ہوں۔ میں سمجھتا ہوں ــ آپ کا نام؟

امیدوار : بندے کو۔ صاحبزادہ عبدالودود احمد اسحاق چشتی اکبرآبادی کہتے ہیں۔

حکیم : صاحب میں نے تو صرف آپ کا نام دریافت کیا تھا ــ خاندان کا شجرۂ نسب نہیں پوچھا تھا۔ خیر تو جو کچھ بھی ہیں آپ، کرتے کیا ہیں آپ؟

امیدوار : جی ملازمت کرتا ہوں۔

حکیم : رہنے کا انتظام ہے۔ میرا مطلب ہے

رہائش کے لئے کوئی کوارٹر یا مکان وغیرہ،

امیدوار: جی ہاں اچھا خاصا بڑا فلیٹ ہے میرے پاس۔

حکیم: خیر خیر، تعلیم کہاں تک پائی ہے؟

امیدوار: بی اے تک۔

حکیم: ہوں۔ تنخواہ؟

امیدوار: تقریباً تین سو روپے ماہوار۔

حکیم: تقریباً تین سو روپے ـــ یہ تقریباً سے کیا مُراد ہے؟

امیدوار: جی میرا مطلب ہے تین سو روپے ہی ہے۔

حکیم: عمر؟

امیدوار: ۲۸ سال

حکیم: ۲۸ سال؟ معلوم ہوتا ہے ورزش وغیرہ بالکل نہیں کرتے۔ کیوں؟

امیدوار: جی، کرتا تو ہوں۔

حکیم: ورزش کے باوجود اس قدر لاغر و کمزور؛ استغفراللہ۔ ذرا نبض تو دیکھوں تمہاری صاحبزادے۔ آں ـ آں ـــ حرکت تپ مادہ۔ معدے کی درمیانی تین آنتیں متورم ـــ برخوردار، مربۂ سیب مع دو ورق چاندی ہر صبح نہار منہ ـــ کشتۂ مرکب کی ایک خوراک ہر شب!

امیدوار: جی!

حکیم: نیند آتی ہے رات کو؟

امیدوار: جی ہاں، بالکل ٹھیک آتی ہے۔

حکیم: اچھا تو....

(سوچتے ہوئے)

اوں... ہاں۔ ذرا زبان تو دکھاؤ۔

(امیدوار منہ کھولتا ہے۔ آ ـ آ ـ آں)

ہاں ذرا اور ـ ذرا اور کھولئے ـــ زبان نکالو باہر ـ ہاں بس ـ ٹھیک ـ ٹھیک ہوگئی تشخیص، چل گیا پتہ۔ دیکھو چلتے پھرتے سر چکراتا ہوگا ـ صبح منہ کا ذائقہ تلخ ہوتا ہوگا ـــ اور ـ!

امیدوار: لیکن ـــ

حکیم: میں سمجھتا ہوں ـــ میں سب سمجھتا ہوں۔ دیکھو۔ برگ بادیساں ۳ ماشے، جائفل ایک تولے، مصطگی ۳ تولے، دانہ عناب ۷ عدد، گل بنفشہ مع الائچی کلاں ۵ عدد، اور عرق بزوری ہر صبح شام ـ کل آکر بنوا لیجئے گا نسخہ!

امیدوار: مگر قبض.....

(قبلہ کہنا چاہتا ہے)

حکیم: کیا فرمایا قبض؟ ـــ قبض کی بھی شکایت ہے؟

امیدوار: جی نہیں۔ قطعی نہیں ـــ میں عرض کر رہا تھا کہ.....

حکیم: دیکھو۔ گرم چیزوں کا استعمال کم کرو ـ گوشت، انڈا اور مچھلی قطعی بند۔

امیدوار: (ذرا لرزش لیجے میں)
جی، مگر میں علاج کرانے نہیں آیا۔ میں تو رشتے کی درخواست لے کر آیا تھا۔

حکیم: ہاں ہاں یاد آیا۔ تو کیا تنخواہ بتائی تھی تم نے؟

امیدوار: تین سو روپے ماہوار۔

حکیم: اور ماہانہ خرچ؟

امیدوار: یہی کوئی دو سو روپے!

حکیم: جی ــ تین سو تنخواہ اور دو سو خرچ ــ واضح سی بات ہے۔ تنہا کے لئے دو سو خرچ کرتے ہو تو جب ایک سے دو ہو جاؤگے تو چار سو درکار ہوں گے۔ کیوں؟

امیدوار: (گھبرا کر) لیکن ــ لیکن۔

حکیم: لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تمہارے ہی بھلے کو کہتا ہوں۔ برخوردار؛ شادی وادی کا خیال دل سے نکال دو۔

امیدوار: مگر سُنئے تو سہی۔

حکیم: سُننا وننا کچھ نہیں۔ تشریف لے جا سکتے ہیں آپ۔

(لڑکے جمن، دوسرا امیدوار۔

جمن: جی ابھی تو نہیں۔

(موسیقی)

(دوسرا امیدوار داخل ہوتا ہے)

امیدوار: آداب عرض کرتا ہوں۔

حکیم: تشریف رکھئے، جناب کا اسم شریف؟

امیدوار: جی ــ جی ہاں۔

حکیم: میں نے اسم مبارک دریافت کیا جناب کا؟

امیدوار: جی مبارک علی خاں؟ آپ جانتے ہیں کیا اُنہیں؟ ــ مرحوم اُستاد تھے میرے ــ کیا شان تھی اُن کی بھی ــ شاعری میں یکتا، پٹے بازی میں اُستاد، طبابت میں لاثانی ــ اور بنوٹ کے ہاتھ دکھانے میں تو اپنا ثانی ہی نہ رکھتے تھے۔ صاحب کیا شان تھی ان کی بھی ــ آخر میں تو جنت مکیں نواب مبارک کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ اور سچ بات ہے اُن کے ٹھاٹھ بھی نوابوں ہی جیسے تھے۔

حکیم: خدا جانے کیا واہی تباہی بکے جا رہے ہیں آپ۔ بندہ نواز میں آپ کا نام دریافت کرنا چاہتا ہوں۔

امیدوار: بے شک، بے شک۔

حکیم: کیا بے شک؟ میاں نام کیا ہے تمہارا؟

امیدوار: (گھبرا کر) جی میرا نام ــ شریف ــ! شریف الدین، آپ نے لیا تو تھا اُس وقت؟ اور ہاں دیکھئے میں ایک کان سے ذرا اُونچا سنتا ہوں؟

(اس کے بعد حکیم صاحب ذرا زور سے بولتے ہیں)

حکیم: ہوں، تو یوں کہئے نا۔ اچھا تو شغل کیا ہے جناب کا؟

امیدوار: وہ یہی جو آپ کا ہے۔ میرا مطلب ہے حکمت۔

حکیم: دولت خانہ؟

امیدوار: کتب خانہ؟ ــ وہ کتب خانہ دراصل میرا نہیں میرے دوست کا ہے، مرزا امید علی صاحب کا، اکثر وہیں نشست رہتی ہے۔ اس لئے عام طور پر لوگ یہی خیال کرتے ہیں کہ کتب خانہ میرا ہے۔ لیکن دراصل وہ مرزا امید علی.....

حکیم: کتب خانہ نہیں، میں نے آپ کا دولت خانہ دریافت کیا تھا۔

امیدوار: اوہ معاف کیجئے۔ غریب خانہ بس اب تو کراچی ہی میں سمجھئے۔ ویسے احقر ساحل

باشندہ یوپی کا ہے ۔ لیکن اب تو ماضی
کی باتیں خواب بن گئی ہیں ۔ کیا تھا کچھ
وہاں ، اور یہاں کیا دھرا ہے صاحب ۔
ایک مختصر سا مکان ہے ۔ دو کمرے اور
ایک صحن ، برآمدے میں مطب ہے ، ویسے
بفضلِ تعالیٰ کاروبار خوب چل رہا ہے ۔

حکیم : جی تو حکمت کرتے ہیں آپ ؟ آزادی سے
قبل بھی یہی شغل تھا کیا ؟

امیدوار : جی ہاں ۔ پشت ہا پشت سے طبابت
ہی چلی آ رہی ہے ہمارے خاندان میں تو ۔
غالباً آپ نے حکیم قدوس الرّب صاحب
کا نام سنا ہوگا ؟

حکیم : قدوس الرّب ۔ جی ہاں ۔ جی ہاں کیوں
نہیں ، بڑے زندہ دل انسان تھے ۔ جن
دنوں میں راجہ صاحب کا شاہی طبیب
تھا تو اُن سے ملاقات ہوئی تھی ۔ کیا کہنا
صاحب اِن کا ، ہر وقت ہنسی مذاق دل لگی
کیا کہنا اُن کا .....

امیدوار : جی مرحوم میرے چچا تھے ۔

حکیم : اچھا ۔ تو اب یہاں تنہا ہیں آپ ؟

امیدوار : جی نہیں ، میری خالہ ہیں ، دو خالہ زاد
بھائی ہیں ۔

حکیم : والدین حیات نہیں کیا ؟

امیدوار : لین دین کا حساب ؟ اجی بچپن ہی سے
خالہ کے پاس رہا ، انہوں نے ہی پرورش
فرمائی ۔ اب اُن سے لین دین کا حساب
ہی کیا ۔ جو کچھ اُن کا ہے سو میرا ، اور جو کچھ
میرا ہے سو اُن کا ۔

حکیم : لین دین نہیں ۔ میں نے پوچھا والدین ،
بقیدِ حیات نہیں آپ کے ؟

امیدوار : اوہ ۔ جی نہیں ۔ والدہ ماجدہ کا سایہ
تو صغیر سنی ہی میں میرے سر سے اُٹھ گیا
تھا ۔ والد بزرگوار نے دوسری شادی کر
لی تھی ، اور مجھے خالہ اپنے یہاں لے آئی
تھیں ۔ اب تقریباً دو سال کا عرصہ ہوا ،
والد بھی چل بسے ۔

حکیم : یوں کہیے ، آپ کی خالہ نے پالا ہے آپ
کو ؟

امیدوار : جی بالکل ۔

حکیم : حکیم قدوس الرّب آپ کے چچا تھے نا ،
تو اس حساب سے آپ شیخ ہوئے ؟

امیدوار : جی ہاں ۔ اب میں کیا عرض کروں ، آپ تو
واقف ہی ہیں عمِ مرحوم سے ۔

حکیم : ٹھیک ہے ۔ ایک تو تم میرے ہی ہم پیشہ
اور پھر عالی خاندان بھی ہو ، مجھے تو بس
سب سے بڑی فکر یہی تھی کہ لڑکا شریف
خاندان کا ہونا چاہیے ۔

(جمن آتا ہے)

جمن : سرکار ۔ وہ ۔

حکیم : کیا ہے ؟

جمن : بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں ، کوئی بہت ضروری
بات کرنی ہے ۔

حکیم : اچھا چلو ، میں ابھی آتا ہوں ۔ معاف کیجیے
میں ابھی حاضر ہوا ۔

(وقفہ)

امیدوار : خیریت تو ہے قبلہ ؟

حکیم : جی ـــ وہ پڑوس میں ایک صاحب کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔

امیدوار : کون بے درد صاحب؟

حکیم : میں نے کہا، پڑوس میں ایک صاحب کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے ـــ بے چارے سخت پریشان ہیں ـــ سوڈا پیا، سکائی کی ـــ کسی طرح بھی درد کم نہیں ہو رہا ـــ جمن سے، یہ لے جا کر دے دو، ہلجات ہلیلہ اور برگ سنا مکی مرکب کی ایک ہی خوراک سے اللہ نے چاہا تو افاقہ ہو جائے گا۔

امیدوار : جی کیا فرمایا ـــ؟ ہلجات اور برگ سنا مکی پیٹ کے درد میں؟

حکیم : جی جی ـــ بڑا مجرّب نسخہ ہے۔ اب تم سے کیا چھپانا ـــ میرے دادا جان مرحوم نے بتایا تھا یہ نسخہ۔

امیدوار : پیٹ کے درد میں ہلجات اور سنا مکی کا مرکب؟ ـــ کیا فرما رہے ہیں آپ قبلہ ـــ دردِ شکم میں ہلجات کھلانے سے موت واقع ہو جاتی ہے۔

حکیم : کس نے کہہ دیا تم سے؟ ـــ میاں دردِ شکم کا تیر بہدف علاج "ہلجات" ہلیلہ اور برگ سنا مکی کا مرکب" ہے۔

امیدوار : قبلہ پیٹ کے درد میں آملہ اور روغن زرد کا مرکب تو دیا دیتی ہے مگر یہ ہلجات! اجی اس کا پیٹ کے درد سے کیا تعلق؟ ہلجات اور پیٹ کے درد میں اتنا ہی تضاد ہے جتنا زمین و آسمان میں، سیاہ و سفید میں، رات اور دن میں۔

حکیم : لوٹے اور بالٹی میں ـــ گیہوں اور مکئی میں، ـــ اونٹ اور گدھے میں ـــ لاحول ولاقوۃ ـــ تمہیں کس نے بنا دیا ہے حکیم ـــ تمہیں تو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے۔

امیدوار : میں نے کہا قبلہ آپ کسی بڑے سے بڑے طبیب سے دریافت کر لیں۔

حکیم : چپ رہو بس ـــ بڑے ہمیں تعلیم دینے والے آئے، چلے جائیں آپ ٹھنڈے ٹھنڈے یہاں سے ابھی ـــ اسی وقت ـــ ایک دم .....

ابے او لڑکے جمن ـــ دوسرا امیدوار۔

امیدوار : صاحب میری بات تو سنئے۔

حکیم : بس آپ چلے جائیں ابھی ـــ لاحول ولاقوۃ طبیب بنے پھرتے ہیں نہ امراض کی..... شناخت نہ ادویات کی تمیز.....

لڑکے جمن، دوسرا امیدوار۔

(موسیقی)

بڑے میاں : سلام علیکم۔

حکیم : وعلیکم السلام۔

ارے او ـــ لڑکے جمن۔ میں نے منع کیا تھا نا تجھ سے کہ آج کسی مریض کو نہیں دیکھوں گا۔

بڑے میاں : جی مریض نہیں ـــ میں تو اسی رشتے کے سلسلے میں حاضر ہوا تھا جو آج صبح کے اخبار میں نکلا ہے۔

حکیم : اوہ ـــ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی بھلا کسی اور ہی کو بھیج دیا ہوتا۔

بڑے میاں : شکریہ شکریہ ـــ بھلا اس میں تکلیف کی

کون سی بات ہے۔ آپ سے شرف ملاقات ہی حاصل ہو گیا۔

حکیم : آپ سے ملاقات تو ایک، مرتبہ اس سے قبل بھی ہو چکی ہے۔

بڑے میاں : جی ہاں، مجھے یاد آ گیا، شاید کسی کانفرنس میں۔

حکیم : جی۔ جی ہاں، خوب یاد آیا۔ پچھلے سال ہم اور آپ پاس پاس ہی تو بیٹھے تھے۔ آپ کے صاحبزادے بھی ہمراہ تھے آپ کے نا۔

بڑے میاں : جی نہیں — میرا صاحبزادہ — غلط فہمی ہوئی آپ کو۔ وہ میرا بھتیجا ہے۔

حکیم : چلیے، بیٹے اور بھتیجے میں کیا فرق ہے۔ تو کیا کرتا ہے وہ؟

بڑے میاں : وہ کسی موٹر کمپنی میں مینیجر ہے۔

حکیم : ماشاءاللہ، ماشاءاللہ۔ اب آپ سے کیا بات چیت۔ آپ تو واقف کار ہی نکل آئے۔

بڑے میاں : بات تو پھر بات ہے۔ زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ میرے لئے بھی اطمینان کر لینا ضروری ہے۔ اور پھر آپ کے لئے تو ہے ہی۔

حکیم : (ہنس کر) یہ فرمائیے کہ آمدنی کیا ہے؟

بڑے میاں : یہی کوئی پانچ سو روپیہ۔

حکیم : عمر کیا ہوگی؟

بڑے میاں : عمر! — بس موزوں ہی سی ہے — بال سفید ہو جانا تو آج کل اس قدر عام ہے کہ بچپن ہی میں نزلے کا اثر ہو جاتا ہے — ورنہ عمر؟ اب آپ سے کیا عرض کروں — آپ تو واقف ہی ہیں۔

حکیم : ہوں ہوں ٹھیک ہی ہے۔ میں نے تو یونہی بس دریافت کر لیا تھا۔

بڑے میاں : جی — پھر آپ کی دعا سے بینک میں بھی کچھ جمع پڑا ہوا ہے۔ اب میرے بعد سب انہیں کا ہے، پیچھے — اور کون بیٹھا ہے میرا —!

حکیم : جی، بجا ارشاد۔

بڑے میاں : غریب خانہ تو آپ نے دیکھا ہی ہوا ہے، میرا ذاتی مکان ہے۔

حکیم : جی — اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ کہ شریف خاندان ہے آپ کا — روپیہ پیسہ جائیداد گہنے سب بے کار ہیں، اصل چیز تو شرافت ہے۔

بڑے میاں : جی ہاں — اور حکیم صاحب سب سے بڑی بات تو یہی ہے کہ میاں بیوی کے دل مل جائیں۔

حکیم : جی — بجا فرمایا آپ نے — دل ملے ہوں تو غربت میں بھی مسرت ہے اور اگر طبیعت جوڑ نہیں کھاتی تو پھر سب بے کار ہے۔

بڑے میاں : بلاشبہ — تو پھر اب ....

حکیم : ہاں۔ آپ تشریف رکھیں۔ اگر اجازت ہو تو ذرا بیگم سے بھی مشورہ کر لوں۔

بڑے میاں : ضرور — ضرور —

(حکیم جی اٹھ کر اندر چلے جاتے ہیں)

حکیم : بیگم — ارے کہاں ہو بیگم؟

بیگم : اے کیا ہوا۔ خدا خیر کرے۔

حکیم : ہیرا تلاش کیا ہے تمہاری بیٹی کے واسطے ہیرا۔

بیگم : کون ہے آخر؟

حکیم : ارے کیا پوچھتی ہو بیگم۔ بس سمجھ لو عمر بھر راج کرے گی راج ــ

بیگم : اب کچھ بتاؤ گے بھی ــ کون ہے؟ ــ کیا کرتا ہے؟ کیا نام ہے؟

حکیم : نام ــ نام تو دریافت نہیں کیا میں نے ابھی ــــ وہ دراصل لڑکا خود نہیں آیا، بس پیام آیا ہے۔

بیگم : اے تو شریف ہے نا آخر ــ خود کاہے کو آتا ــ شریفوں میں ایسا ہوتا ہے کہیں کہ لڑکا خود پہونچے اپنا پیغام لے کر!

حکیم : ٹھیک کہتی ہو بیگم۔ شریفوں میں کہیں ایسا نہیں ہوتا۔ مجھے یاد ہے جب تم سے منگنی طے پاگئی تھی میری تو میں نے تمہاری گلی سے کبھی گذرنا بند کر دیا تھا۔ ایک دن کیا ہوا بیگم کہ ...... !

بیگم : (ہنس کر) اے اب چھوڑو بھی یہ داستانیں بتاؤ کرتا کیا ہے لڑکا؟

حکیم : نوکر ہے چار پانچ سو کا۔ بنک میں روپیہ ہے ذاتی مکان ہے۔ بولو کیا کہتی ہو؟ بات پکی کر لوں؟

بیگم : ہاں ہاں، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے، مگر اتنی بات ہے کہ ذرا اک نظر لڑکے کو میں بھی دیکھ لیتی۔

حکیم : ہاں کیوں نہیں ــــ میں پوچھے لیتا ہوں ان سے ــــ!

بیگم : ایسے نہیں۔ کل شام کی دعوت کر دو سب کی ــ اور میری طرف سے کہہ دو کہ لڑکی کی والدہ دیکھنا چاہتی ہیں لڑکے کو ــ!

حکیم : بالکل بالکل ــ میں ابھی دریافت کئے لیتا ہوں ــ تم ذرا چائے کا انتظام کرو۔

(حکیم صاحب باہر چلے جاتے ہیں)

بڑے میاں : (کھانس کر) جی .... تو ....

حکیم : ارے جمن، ارے او لڑکے جمن ــ ذرا اندر جا کر دیکھو۔ وہ بیگم کچھ چائے وائے کے لئے کہہ رہی تھیں۔

بڑے میاں : ارے رے۔ حکیم صاحب بھلا اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو بحمد اللہ ابھی چائے پی کر ہی آرہا ہوں۔

حکیم : جی۔ تکلف کاہے کا۔ بس وہ ذرا عورتوں کی خوشی ہو جاتی ہے۔ آپ ہی کہئے اب میرے گھر میں سے بھلا اس بات کی اجازت کیسے دے سکتی ہیں کہ پیام منظور ہو اور آپ بغیر منہ میٹھا کئے چلے جائیں۔

بڑے میاں : اوہ، تو پھر اس کا مطلب ہے کہ ....

حکیم : جی ہاں ــ بالکل .... !

بڑے میاں : تو پھر وہ تاریخ وغیرہ .... !

حکیم : جی ہاں ــ اک بات تھی ذرا ــ میرے گھر میں سے لڑکے کو دیکھنا چاہتی ہیں ــ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو کل شام ماحضر غریب خانے پر ہی تناول فرمائیں اور ساتھ ہی لڑکے کو بھی لیتے آئیں۔

بڑے میاں : جی۔ لڑکا۔ مگر لڑکا کیسا ــ ناچیز تو خود کو آپ کی غلامی میں پیش کرنا چاہتا تھا۔

حکیم : کم بیتی کم ــ ارے دوڑنا بیگم ــ او لڑکے جمن ــ لعنت ہو تجھ پر خدائی ــ

پرکاش پنڈت

ٹیلی فون

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے — اور ایک وقفے تک بجتی چلی جاتی ہے۔ پھر چونگا اٹھانے کی آواز)

مرد : ہیلو فور ناٹ ناٹ ٹو ون۔

ٹیلی فون کی آواز: دینا ناتھ جی ہیں؟

مرد : جی ہاں، میں بول رہا ہوں، آپ کون صاحب ہیں؟

آواز : بھئی مبارک ہو دینا ناتھ، میں رادھے شیام بول رہا ہوں۔

مرد : کہو دوست کیا حال ہے۔ یہ رات کے ساڑھے آٹھ بجے تمہاری محبت کی کون سی رگ پھڑکی ہے۔ کاہے کی مبارکباد دے رہے ہو؟ کیا پانڈے جی والے کیس کا پتہ چل گیا؟

آواز : ارے یار تم بھی بس ایک گھن چکر ہو — سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے ہر وقت دفتر کا بھوت سوار رہتا ہے تم پر کسی وقت تو کوئی ڈھنگ کی بات کیا کرو۔

مرد : اچھا تو بتاؤ، کاہے کی مبارک باد دے رہے تھے؟ تمہارا پارہ بھی ہر وقت ایک سو دس ڈگری پر رہتا ہے۔

آواز : ٹیلی فون لگوانے کی، اور کاہے کی۔

مرد : اوہ، اچھا اچھا۔ تمہیں بھی مبارک ہو بھائی۔ سچ پوچھو تو رادھے شیام ٹیلی فون واقعی زندگی کا ایک بہت ضروری حصہ ہے۔ آج جب سے گھر میں ٹیلی فون لگا ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے تمام فاصلے مٹ گئے ہیں۔ جس سے جس وقت چاہو ملاقات کر لو۔ ویسے تم جانو سوشل لائف کو نبھانا بڑا مشکل ہے۔ کسی سے ایک ذرا سی بات کرنا ہو تو سمجھو ساری شام برباد، اور دہلی کے فاصلے تو تم جانتے ہو اپنی مثال آپ ہیں۔ اب یہی دیکھو جنت اور جہنم کے درمیان بھی اتنا فاصلہ نہ ہوگا، جتنا میرے اور تمہارے گھر کے درمیان ہے۔

آواز : ہاں یہ تو ہے۔

مرد : اور دیکھو، خدانخواستہ کسی وقت کوئی

مصیبت آجائے، تو ٹیلی فون کے بغیر جیسے شہر میں رہے ویسے جنگل میں رہے۔ آپ کے سامنے آپ کا گھر لٹ رہا ہے اور آپ کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔

آواز : تو تم نے چوروں کے ڈر سے ٹیلی فون لگوایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے بہت رقم جمع ہو گئی ہے۔

مرد : ارے نہیں دوست! وہ تو بات سے بات نکل آئی تھی، ورنہ یہاں کیا رکھا ہے۔ تم کسی زخم، چوٹ یا بیماری ہی کی بات لو۔ کون جانے کس وقت کیا ہو جائے۔ ایسے میں ٹیلی فون کے بغیر...

آواز : آداب عرض ہے بھائی جان۔ میں نے مبارک باد دینے کے لئے ٹیلی فون کیا تھا ٹیلی فون کے فائدے سننے کے لئے نہیں۔ بائی بائی۔

مرد : بائی بائی۔

(چونگا رکھنے کی آواز)

مرد : (اونچی آواز میں)

سنا ڈارلنگ! بھئی کہاں ہو۔ ادھر آؤ۔ میں کب سے یہاں بیٹھا تمہیں آوازیں دے رہا ہوں۔

(قدموں کی چاپ)

عورت : (طنزاً) جی فرمائیے۔

مرد : اوہو حضور کے تیور آج پھر بگڑے ہوئے ہیں۔ بھئی معاف کرنا، میں آج بھی تمہارے ساتھ شاپنگ کے لئے نہیں جا سکا۔ یقین مانو ڈارلنگ سیدھا آفس سے چلا آرہا ہوں

اس قدر کام کرنا پڑتا ہے کہ بس عرق نکل جاتا ہے۔ صبح جو فائیلوں کے ڈھیر میں ڈوبتا ہوں تو یہ سمجھو اس وقت......

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے)

مرد : ہیلو! دینا ناتھ سپیکنگ!

آواز : صبح اٹارسی کی گاڑی کس وقت چھوٹتی ہے؟

مرد : رانگ نمبر۔

(چونگا رکھنے کی آواز)

مرد : ہاں تو میں کہہ رہا تھا ڈارلنگ!

عورت : جی چھوڑیئے، میں سب جانتی ہوں کہ کتنا کام رہتا ہے۔ آپ کی پوری شام یار دوستوں کی محفل میں گذرتی ہے۔ اور لوگ بھی ہیں دیکھتی ہوں، پانچ بجتے ہی گھر کو بھاگے آتے ہیں۔ لیکن آپ گھر کو گھر سمجھیں جب نا۔

مرد : نہیں ڈارلنگ، یہ بات نہیں ہے۔ مجھ پر یقین نہ کرنے کی تو تمہاری پرانی عادت ہے اب تو گھر پر بھی ٹیلی فون لگ گیا ہے۔ کل اس وقت ٹیلی فون کر کے دیکھ لینا کہ میں آفس سے بولتا ہوں یا نہیں۔

عورت : اس کا مطلب یہ ہے جناب کل بھی دیر سے آئیں گے۔

مرد : کیا کروں ڈارلنگ: کوئی کتنا بڑا افسر ہی کیوں نہ ہو۔ نوکری آخر نوکری ہے۔ میرا کام کوئی اور تو کرے گا نہیں، مجھی کو کرنا پڑے گا اور آج کل کام کی اتنی بھرمار ہے کہ.....

عورت : جی میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ دنیا سے نرالے

نہیں ہیں۔ ساری دنیا پانچ ساڑھے پانچ حد چھ بجے گھر لوٹ آتی ہے۔

مرد : تم جس دنیا کی بات کرتی ہو۔ وہ کلرک لوگوں کی دنیا ہے ڈارلنگ۔ کلرک لوگ تو .....

عورت : کلرک لوگ! تو آپ کے خیال میں یہ کھنہ صاحب کلرک ہیں؟ آپ سے کہیں زیادہ تنخواہ پاتے ہیں۔ آپ سے بڑا عہدہ ہے۔

مرد : کھنہ صاحب کی بات دوسری ہے۔

عورت : جی ہاں کھنہ صاحب کی بات دوسری ہے ملہوترہ صاحب کی تیسری، کشوری لال کی چوتھی، رگھبر دیال کی پانچویں۔ میں سب جانتی ہوں۔

مرد : (کھینچ کر) ڈارلنگ! تم کچھ نہیں جانتیں!

عورت : جی ہاں میں کچھ نہیں جانتی۔ اسی لئے تو آپ مجھے بے وقوف بنا لیتے ہیں۔ میں سب جانتی ہوں کہ آپ کی شامیں کہاں گزرتی ہیں؟

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ چونگا اٹھانے کی آواز)

مرد : فور ناٹ ناٹ، ٹو، ون

آواز : جی میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ اٹارسی کی گاڑی.....

مرد : جی میں نے آپ کو بتایا تھا کہ آپ رانگ نمبر ملا رہے ہیں۔ یہ ریلوے انکوائری نہیں، سیلز ٹیکس آفیسر کا مکان ہے۔

آواز : ریلوے انکوائری کا نمبر کیا ہے؟

مرد : ڈائرکٹری دیکھیے۔

آواز : یہاں ڈائرکٹری نہیں ہے۔

مرد : تو جہنم میں جائیے۔ میں سیلز ٹیکس آفیسر ہوں۔ ٹیلی فون کی ڈائرکٹری نہیں ہوں۔

(جھلا کر چونگا رکھنے کی آواز)

مرد : عجیب مصیبت ہے۔ ٹیلی فون کیا لگوایا کہ ..... ہاں تو ڈارلنگ ابھی تمہارا غصہ اُترا ہے یا نہیں؟

عورت : ہمیں کسی پر غصہ کر کے کیا لینا ہے ہمارے غصے کی کسی کو کیا پروا۔ ہماری تو قسمت ہی .....

مرد : کیا ہوا ہے تمہاری قسمت کو؟

عورت : جی نہیں، کچھ نہیں ہوا۔ راج کھوگ رہی ہوں۔ شوہر پوری پوری شام .....

مرد : یہ تم ہر روز شام کا کیا قصہ لے بیٹھتی ہو۔ کہاں گذرتی ہے میری شام۔

عورت : میری بلا سے جہاں کہیں گذرے۔ مجھے کیا پڑی ہے۔

مرد : تم تو ناحق الزام دیتی ہو ڈارلنگ! بڑی شکی طبیعت ہے تمہاری، مجھ سا سعادت مند شوہر کبھی نہیں ملے گا؟

عورت : جی ہاں کیا کہنے ہیں آپ کی سعادت مندی کے۔ یہ تو کہئے کہ آپ کی قسمت اچھی تھی جو مجھ جیسی بے وقوف بیوی آپ کو مل گئی کوئی آج کل کی لڑکی ہوتی تو ناک چنے چبوا دیتی۔ آگے پیچھے گھومتے پھرتے۔

مرد : میں تو ڈارلنگ تمہارے بھی آگے پیچھے.....

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے)

مرد : پھر یہ کوئی مصیبت آئی۔

(چونگا اُٹھا کر)

ہیلو دینا ناتھ سپیکنگ۔

آواز : (نیا تُلا انداز) آداب عرض کرتا ہوں قبلہ!

مرد : آداب عرض۔ فرمایئے۔

آواز : جناب بات یہ ہے کہ میں نے ابھی ابھی ایک نظم مکمل کی ہے۔

مرد : کیا؟

آواز : نظم، بندہ پرور! میں نے ابھی ابھی ایک نظم مکمل کی ہے۔

مرد : نظم مکمل کی ہے۔ تو میں کیا کروں؟

آواز : بس حضور! اتنا کیجئے کہ میری نظم سن لیجئے بات دراصل یہ ہے کہ....

مرد : جی نہیں شکریہ۔ دیکھئے میرا خیال ہے کہ آپ نے غلط نمبر ملایا ہے۔ میں کوئی شاعر یا سخن فہم نہیں ہوں۔ میرا نام دینا ناتھ ہے، اور میں سیلز ٹیکس آفیسر ہوں۔

آواز : کوئی مضائقہ نہیں، آپ جو بھی ہوں، اس سے چنداں فرق نہیں پڑتا۔ دراصل نظم مکمل کرنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا تھا کہ آنکھیں بند کر کے پانچ بار ڈائل گھماؤں گا، اور جو نمبر بھی مل جائے گا، بس اسی کو اپنی نظم سُنا دوں گا۔ وہ چاہے سیلز ٹیکس آفیسر ہو یا کسی اسپتال کا مہتر۔

مرد : یہ کیا بیہودگی ہے؟

آواز : آپ کچھ بھی کہئے۔ نظم بہرحال آپ کو سُننا ہے۔

مرد : ہرگز نہیں۔ میں ہرگز ہرگز آپ کی نظم نہیں سنوں گا سمجھے؟

آواز : کمال ہے۔ کیسے نہیں سنئے گا۔ یہ شاعر کا موڈ ہے۔

مرد : میں موڈ ووڈ کچھ نہیں جانتا۔

آواز : آپ کچھ جانتے بھی ہیں؟

مرد : میں صرف یہ جانتا ہوں کہ آپ بڑے پاجی ہیں۔ نالائق ہیں۔ احمق ہیں۔ گدھے ہیں۔

آواز : یہ آپ اپنی تعریف فرما رہے ہیں؟

مرد : نان سینس۔

(چونگا رکھنے کی آواز)

مرد : حد ہے۔ ڈھٹائی کی حد ہے سُنا ڈارلنگ! کوئی شاعر صاحب تھے۔ فرما رہے تھے کہ نظم لکھی ہے سُنو۔ کمال کی دیدہ دلیری ہے۔ نہ جان نہ پہچان، خالہ جی سلام۔ بالکل اُلٹی کھوپڑی کے ہوتے ہیں یہ شاعر لوگ۔ خواہ مخواہ شریف آدمیوں کو پریشان کرتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی تُک ہے....

عورت : جی ہاں بڑے شریف ہیں آپ۔ آپ کی شرافت کے تو دنیا میں چرچے ہیں۔

مرد : تمہارا غصہ ابھی دور نہیں ہوا ڈارلنگ! بھئی یہ کیا ظلم ہے۔ میں تھکا ہارا آفس سے آرہا ہوں۔ تمہیں کچھ تو خیال کرنا چاہیئے۔

عورت : خیال کرنے کے لئے اور بہت سی موجود ہیں میرے خیال کی آپ کو کیا ضرورت ہے؟

مرد : پھر وہی۔ تمہارا غصہ تو بس ناک پر دھرا رہتا ہے۔ آخر کوئی بات بھی تو ہو۔

عورت : جی ہاں میرا تو سر پھر گیا ہے۔ آپ صبح نو بجے سے رات کے نو بجے تک باہر گلچھرے اُڑاتے پھریں، اور گھر والے چاہے مریں چاہے جئیں،

یہ کوئی بات ہی نہیں ہے۔ اگر یہی کچھ کرنا تھا تو شادی ہی کیوں کی تھی؟

مرد : (تعجب سے) گلچھرّے!

عورت : ہاں ہاں گلچھرّے۔ آپ سمجھتے ہیں میں جانتی نہیں ہوں۔ میں سب جانتی ہوں۔

مرد : اچھا بابا! تم سب جانتی ہو۔ بس تم جیتیں، ہم ہارے۔ اب غصہ تھوک دو۔ ادھر بیٹھو میرے پاس۔

عورت : جی مہربانی شکریہ۔ میں ایسی چکنی چپڑی باتوں میں آنے والی نہیں ہوں۔ وہ اور ہوں گی جو.....

(دروازہ کھٹ کھٹانے کی آواز)

مرد : (ذرا اونچی آواز میں) کون؟

دوسرے مرد کی آواز : دینا ناتھ جی! میں ہوں۔ سربجھ دیال۔ سنا ہے آپ کے یہاں ٹیلی فون لگ گیا ہے۔

مرد : آیئے آیئے، دروازہ کھلا ہے۔

(قدموں کی چاپ قریب آتی ہے)

دوسرا مرد: یہ آپ نے بہت اچھا کیا دینا ناتھ جی کہ ٹیلی فون لگوا لیا۔ آپ کے پڑوسیوں کو ٹیلی فون کرنے کے لئے دو میل دور جانا پڑتا تھا اور آپ جانتے ہیں میرا کام ٹیلی فون کے بغیر ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔ سٹہ بازی میں یہی کچھ تو ہے دینا ناتھ جی۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ ہر گھڑی بھاؤ بدلتے رہتے ہیں۔ یہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ ٹیلی فون لگوا لیا۔ اب آپ کو تکلیف دیا کروں گا۔

پہلا مرد: نہیں نہیں۔ اس میں تکلیف کی کیا بات ہے آپ کا اپنا گھر ہے۔ ٹیلی فون کریں گے؟

دوسرا مرد: جی اسی لئے تو حاضر ہوا ہوں۔ اور دیکھئے اب میں دکان پر بھی یہی نمبر دیئے دیتا ہوں۔ اب میرے ٹیلی فون اسی نمبر پر آیا کریں گے۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی لیکن....

پہلا مرد: نہیں نہیں، اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔

(چونگا اٹھانے اور ڈائل گھمانے کی آواز۔ ڈائیل گھمانے کی آواز پر ذیل کے پانچ حروف سپرامپوز ہوں)

دوسرا مرد: تھری۔ ایٹ۔ فور۔ فائیو۔ نائین۔

ٹیلیفون کی آواز: ہیلو سربجھ دیال گھنشیام داس ٹو

دوسرا مرد: میں سربجھ دیال بول رہا ہوں منیم جی، اس وقت کیا بھاؤ ہیں؟

آواز : (ایک ہی سانس میں) سونا ۸۸ روپے، چاندی ۱۴۵ روپے، مٹرہ ۱۴ روپے، گوارا ۸ روپے، سرسوں ۲۳ روپے، سرسوں کا تیل ۵۶ روپے ۴ آنے، تیل توریا ۱۱ روپے، تیل تارامیرا ۵۹ روپے، تیل مونگ پھلی ۷۵ روپے، تیل بنولہ.....

دوسرا مرد: منیم جی

آواز : جی سیٹھ جی۔

دوسرا مرد: ایک بار پھر بتایئے

آواز : (پھر ایک ہی سانس میں) سونا ۸۸ روپے، چاندی ۱۴۵ روپے، مٹرہ ۱۴ روپے، گوارا ۸ روپے، سرسوں ۲۳ روپے، سرسوں کا تیل ۵۶ روپے ۴ آنے.....

دوسرا مرد: بس بس منیم جی ہوگیا۔ مونگ پھلی کا تیل

ہو گیا۔

آواز : کتنا خریدوں سیٹھ جی؟

دوسرا مرد : خریدو نہیں۔ منڈے پر دس ہزار لگا دو۔ صبح کا بھاؤ کیا تھا؟

آواز : ۸۵ روپے سرکار۔

دوسرا مرد : ٹھیک ہے۔ بس لگا دو۔ اور میرا خیال ہے پندرہ ہزار لگا دو...... اور سنئے منیم جی، پندرہ منٹ کے بعد مجھے ٹیلی فون کیجئے۔ اب تو ہمارے گھر کے پاس ہی ٹیلی فون لگ گیا ہے۔ نمبر نوٹ کر لیجئے۔ دینا ناتھ جی، کیا نمبر ہے آپ کے ٹیلی فون کا؟

پہلا مرد : (مری ہوئی آواز میں) فور۔ ناٹ، ناٹ، ٹو، ون۔

دوسرا مرد : منیم جی۔

آواز : جی سیٹھ جی!

دوسرا مرد : فور ناٹ، ناٹ، ٹو، ون۔ دیکھئے، پندرہ منٹ کے بعد ضرور ٹیلی فون کیجئے۔

آواز : جی سیٹھ جی۔

(چونگا رکھنے کی آواز)

دوسرا مرد : بڑا آرام ہو گیا ہے۔ دینا ناتھ جی۔ بڑا آرام ہو گیا ہے۔ دو میل دور جانا پڑتا تھا۔ اور گھنٹوں ٹیلی فون پر بیٹھنا پڑتا تھا — آپ جانیں سٹہ بازی میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ ہر گھڑی بھاؤ بدلتے رہتے ہیں — اچھا پندرہ منٹ بعد پھر آپ کو تکلیف دوں گا۔

پہلا مرد : (اسی مری ہوئی آواز میں) جی نہیں، اس میں تکلیف کی.....

(قدموں کی چاپ دور چلی جاتی ہے)

(ٹیلی فون کی گھنٹی)

(چونگا اُٹھانے کی آواز)

پہلا مرد : ہیلو۔

آواز : ہیلو۔

پہلا مرد : (ذرا تیز ہو کر) ہیلو۔

آواز : (اسی تیزی کے ساتھ) ہیلو۔

(چونگا پٹکنے کی آواز)

پہلا مرد : ڈارلنگ! ڈارلنگ! یہ سب کیا ہو رہا ہے!

عورت : کیا ہو رہا ہے؟

پہلا مرد : کچھ نہیں ڈارلنگ! کچھ نہیں۔ اٹھو۔ تم اُٹھو ایک دم تیار ہو جاؤ۔

عورت : تیار ہو جاؤں۔ کس بات کے لئے تیار ہو جاؤں؟

پہلا مرد : بس تم تیار ہو جاؤ۔ ایک دم۔ اسی وقت۔ ایک منٹ میں۔

عورت : لیکن تیار ہو کر کیا کروں؟

پہلا مرد : باہر چلیں گے۔

عورت : (تعجب سے) باہر؟ باہر کہاں؟

پہلا مرد : کہیں بھی۔ کسی ہوٹل میں۔ کسی سینما میں اور نہیں تو کچھ شاپنگ کریں گے۔

عورت : شاپنگ کریں گے! — اس وقت شاپنگ کریں گے؟ — آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے؟

پہلا مرد : ہاں ڈارلنگ! میرا دماغ خراب ہو گیا ہے اور اگر تم جلدی تیار نہ ہوئیں تو میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میرا دماغ پھٹ جائے؟

عورت : لیکن آخر ہوا کیا ہے؟ یہ آپ ایک دم پریشان کیوں ہو گئے؟

پہلا مرد : وہ پندرہ منٹ کے بعد پھر آئے گا ڈارلنگ! ڈارلنگ۔ اس کے پندرہ منٹ کے بعد پھر وہ آئے گا۔ اور اس کے پندرہ منٹ کے بعد پھر —

عورت : تو پھر کیا ہوا۔ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟

پہلا مرد : نہیں ڈارلنگ۔ مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ ڈارلنگ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میں سچ کہتا ہوں میں پاگل ہو جاؤں گا۔ بس اب تم دیر نہ کرو چلو جلدی سے کہیں بھاگ چلیں۔

عورت : بھاگ چلیں!

پہلا مرد : ہاں ڈارلنگ! اب میں یہاں ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتا۔ ابھی پندرہ منٹ کے بعد وہ پھر آئے گا۔ اور میرا سر گھوم رہا ہے۔ دن بھر دفتر کا کام کرتے کرتے میرا دماغ خالی ہو گیا ہے۔ دفتر کی فائیلیں میرا دماغ چاٹ چکی ہیں۔ اور ابھی پندرہ منٹ کے بعد وہ پھر آئے گا۔

عورت : میں اسے منع کر دوں گی۔

پہلا مرد : نہیں ڈارلنگ تم اسے منع نہ کر سکو گی، اور اگر وہ نہیں آئے گا تو کوئی اور آئے گا۔ کوئی اور نہیں آئے گا تو ٹیلی فون آئے گا۔

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے)

(چونگا اٹھانے کی آواز)

پہلا مرد : (مردہ آواز میں) ہیلو ہیلو۔

آواز : دینا ناتھ!

پہلا مرد : (اُسی آواز میں) بول رہا ہوں۔

آواز : یہ تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے دینا ناتھ؟ میں بلونت رائے بول رہا ہوں سیلز ٹیکس کمشنر!

پہلا مرد : (ایک دم گھبرا کر) جی کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔

آواز : دیکھو پانڈے جی والے کیس کی فائل تمہارے پاس ہے نا؟

پہلا مرد : جی ہاں، جی ہاں، میرے ہی پاس ہے۔

آواز : تو اسے لے کر فوراً میرے پاس آؤ۔ بنگلے پر یہ تمہارا ٹیلی فون کس وقت لگا تھا؟

پہلا مرد : جی شام کو۔

آواز : اچھا کب تک آ رہے ہو؟

پہلا مرد : جی ابھی ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

(چونگا رکھنے کی آواز)

پہلا مرد : (آواز میں مُردنی آجاتی ہے) ڈارلنگ! میں جا رہا ہوں ڈارلنگ!

عورت : کہاں جا رہے ہو، اس وقت؟ یہ اس وقت کس کا ٹیلی فون تھا؟

پہلا مرد : صاحب کا ٹیلی فون تھا ڈارلنگ! بُلایا ہے، فوراً بُلایا ہے۔

عورت : صاحب نے بلایا ہے؟

(آواز میں تیزی آجاتی ہے)

کیوں مجھے بے وقوف بناتے ہیں۔ میں سب جانتی ہوں کہ اس آدھی رات کے وقت کس نے بُلایا ہے۔ آپ کو میرے سر کی قسم، جو جھوٹ بولیں۔ سچ بتائیے۔ کہاں جا رہے ہیں میں کچھ نہیں بولوں گی۔

پہلا مرد: تمہارے سر کی قسم ڈارلنگ! صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔

عورت: جھوٹی قسمیں! اب آپ جھوٹی قسمیں بھی کھانے لگے۔ میں سمجھتی تھی۔ ایک دن آپ کو ٹھوکر لگے گی، اور آپ سنبھل جائیں گے۔ لیکن نہیں، میری قسمت ہی پھوٹ چکی ہے جائیے، جہاں آپ کا جی چاہے، جائیے۔ میں بھی اب اس گھر میں نہیں رہوں گی — ایک دن نہیں رہوں گی — ایک منٹ نہیں رہوں گی......

(سسکیاں بھرتی ہے)

جائیے جہاں آپ کا جی چاہے چلے جائیے۔

پہلا مرد: ڈارلنگ: ڈارلنگ!

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے اور بجتی چلی جاتی ہے)

(شمارہ: ۳۵-۳۴، سنہ ۴۶ء)

دو کھیل، ایک کہانی

(صفحہ ۱۰۳۹ سے آگے)

نسیم: (جذبات پر قابو ہونے کے بعد) میں کرنا بھی نہیں چاہتا۔ بعض حقیقتیں ناقابل برداشت ہوتی ہیں۔ انہیں ڈھکا مندا ہی رہنا چاہئے۔ کوئی اس حقیقت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جو ریحانہ کے جھولے میں پڑی ہوئی ہے۔ کوئی اس جھولے کے اندر نہیں جھانک سکتا۔ نہ میں، نہ آپ، نہ امی — آپ سب اپنا شغل جاری رکھئے میں جا رہا ہوں۔

بیگم: ارے سنو تو نسیم ....نسیم ...نسیم

(پکارنے میں دوسری آوازیں بھی ماں کا ساتھ دیتی ہیں)

(چند لمحے بعد)

تانگہ والا: آخر بات کا بھی کچھ ہوگا تو معلوم ہوئے — رات آئیو اور صبح بھاگ جائے رہے ہو؟

نسیم: تم مجھے جلدی سے اسٹیشن پہونچا دو گاڑی کا وقت قریب آگیا ہے۔

تانگہ والا: دیکھو بھیا سڑک پر کیسی روشنی ہے یہ ہرے بھرے کھیت کھلیان۔ ہم کہا لوٹ چلو گھر۔ پھیری تانگہ؟

نسیم: ارے نہیں نہیں، جلدی کرو جلدی۔ صرف ایک منٹ رہ گیا گاڑی آنے میں۔

تانگہ والا: (گھوڑے کو ٹکٹکاتے ہوئے) چل اے چل — ایسا منحوس ہے کم بخت کہ جوں پیرن سے بھیا کا وا ہی پیرن سے واپس لئے جا رہا ہے۔

(صرف ٹاپوں کی آوازیں فضا میں برقرار رہتی ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

شمارہ ۵۳، سنہ ۱۹۵۶ء

ڈاکٹر ست پرکاش سنگر

ٹیگور اور کھیتی باڑی

(ہند و دیو مالا کے دو پرندوں کوّے اور نیل کنٹھ یا گُرڑ کے درمیان کئی ہزار سال قبل آج کے متعلق گفتگو ـــ)

کاگ بھسنڈی :- گُرڑ جی ! آپ نے ایک سوال پوچھا تھا۔

گُرڑ :- ہاں کاگ بھسنڈی جی - آپ نے اس کا جواب دینے کا وعدہ فرمایا تھا۔

کاگ :- میں بات کرتے کرتے سمادھی لگا بیٹھا، اور اُسی حالت میں دور مستقبل میں جا پہنچا۔

گُرڑ :- کیا آپ کلجگ کا نظارہ نہیں کر سکے۔؟

کاگ :- کیوں نہیں کر سکا ؟ اُسی کی تو بات کر رہا ہوں۔

گُرڑ :- واہ مہاراج ! آپ سچے تپسوی ہیں۔ مستقبل کو دیکھ سکتے ہیں - اگر تنگیٔ وقت کی شکایت نہ ہو تو مجھے بھی گیان دان دیجئے - اور کلجگ کے بارے میں کچھ بتلایئے۔

کاگ :- گُرڑ جی ! کچھ لوگ کلجگ کو کَرجگ کہتے ہیں جب کہ لوگ ہاتھوں سے کام کر سکیں گے - میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا۔ ہاں کلجگ کی خاص باتوں پر روشنی ڈال سکوں گا - آپ کے ساتھ تبادلۂ خیالات کر سکوں گا۔

گُرڑ :- اسے تبادلۂ خیالات مت کہئے کاگ جی ! میں تو گیان کا پیاسا ہوں۔

کاگ :- گُرڑ جی ! کلجگ کی ہر بات اُلٹی ہوگی اور کمال کی بات یہ ہوگی کہ لوگ اسے سیدھی مانیں گے۔

گُرڑ :- کیسے ـــ ؟

کاگ :- آج میں آپ کے ساتھ تعلیم یافتہ لوگوں اور تعلیم کے بارے ہی میں بات چیت کروں گا۔ کلجگ میں سبھی لوگ نام نہاد تعلیم یافتہ ہوں گے - اُن کا وطیرہ ست جگ اور ترتیا جگ کے لوگوں سے ایک دم مختلف ہوگا۔

گُرڑ :- کیسے ـــ ؟

کاگ :- انتہا درجے کے اگیانی ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے گیان کا ڈنکا پیٹیں گے - مورکھوں کے سرتاج ہوتے ہوئے بھی اپنی عقل مندی کی ڈینگیں ماریں گے۔

گُرڑ :- لیکن کاگ بھسنڈی جی - وہ دان لوگ تو کبھی ڈینگ نہیں مارتے۔

کاگ :- میں تو کلجگ کے ودوانوں کی بات کرتا ہوں، وہاں تعلیم حاصل کرنے کا نرالا ڈھنگ ہوگا۔

گُرڑ :- آج کے طریقے سے مختلف ؟

کاگ :- ایک دم مختلف ۔ آج کل تو ایک طالب علم سالہا سال تک گورو کے قدموں میں بیٹھتا ہے ۔ کمال سادگی کی زندگی بسر کرتے ہوئے اپنا سارا وقت تعلیم حاصل کرنے میں لگاتا ہے ۔ لیکن کلجگ میں ایسا نہیں ہوگا ۔ وہاں پڑھنے کے لئے وقت اتنا ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ لگے گا ۔ ایک طالب علم ایک سال کے اندر اپنے کپڑوں پر اتنا خرچ کرے گا جس سے ایک خاندان کا گزارا چل سکے ۔ کتابوں پر اتنا خرچ کرے گا کہ اُس پیسے سے ایک اچھا کتب خانہ بن سکتا ہے ۔ لیکن اس کا وقت دوسرے کاموں میں اتنا زیادہ لگے گا کہ کورس کی کتابیں پڑھنے کے لئے اسے فرصت ہی نہ ملے گی ۔ کتابوں کی بجائے تعلیم حاصل کرنے کے وہ دوسرے ذرائع ڈھونڈے گا ۔

گرُڑ :- کتابوں کو پڑھنے کے علاوہ تعلیم حاصل کرنے کے دوسرے ذریعے بھی ہو سکتے ہیں ۔ کاگ جی ؟

کاگ بھسنڈی :- کتابوں کے مطالعے کے علاوہ بھی کلجگ میں ایک نئی بات چلے گی ۔ یوگ دھیان سے میں نے دیکھا ہے کہ لوگوں کی توجہ حقیقت سے ہٹ کر تخیل کے سمندر میں غوطہ لگائے گی ۔ زندہ لوگوں کو چھوڑ ، لوگ تصاویر کو زیادہ پسند کریں گے ۔ اور ہو سکتا ہے کہ وہ ٹاکی جیسی کسی چیز کی تخلیق کریں ۔

گرُڑ جی :- نہیں کاگ بھسنڈی جی ! ایسا تو ناممکن ہے ۔

کاگ :- گرُڑ جی ! کلجگ میں کچھ ناممکن نہیں ہوگا ۔ چلتی پھرتی تصویروں میں استری پُرش ایک دوسرے سے باتیں اور عشق کرتے نظر آئیں گے ۔

گرُڑ :- نہیں ۔ نہیں ۔ ایسا نہیں ہو سکتا ۔

کاگ بھسنڈی :- لیکن میں تو آپ کو تعلیم کے متعلق بتلا رہا تھا ۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ کلجگ میں طلباء کتابیں پڑھنے کی بجائے سینما دیکھیں گے ۔ کپڑے ایسے پہنیں گے کہ سادہ زندگی ایک پُرانی یادگار بن کر رہ جائے گی ۔ گندی اور سستے رومان کی کتابوں کو پسند کریں گے ۔ اعلیٰ پائے کے ادب کو پڑھنے کی فرصت اور سمجھنے کی بُدھی نہیں ہوگی ۔

گرُڑ :- لیکن اگر انھیں مناسب ڈھنگ کی کورس کی کتابیں ملیں گی تو دوسری قسم کا ادب پڑھنے کی بات ہی کیا ہوگی ؟

کاگ بھسنڈی : گرُڑ جی ! اسی بات کا رونا ہوگا ۔ کلجگ میں کورس کی کتابیں منظور کرنے کا اپنا ڈھنگ ہوگا ۔ لوگا بھیاس سے میں نے دیکھا ہے کہ اُن دنوں مناسب ڈھنگ سے کوئی بات نہیں ہوگی ۔ کام کرنے اور کرانے کا ایک ہی طریقہ ہوگا ۔

گرُڑ :- کیا ؟

کاگ بھسنڈی : اپروچ ۔ رسائی ۔ کلجگ میں اس لفظ کا عام استعمال ہوگا ۔ ہر کام کرانے کے لئے اپروچ کی ضرورت ہوگی ۔ نصاب کی کتابیں مقرر کرانے کے لئے ' چناؤ کے ذریعے کمیٹیاں بنیں گی ۔ چناؤ لفظ کا مذاق بننے پر بھی ، وہ چناؤ کہلاتے گا ' علمیت کے لفظ کو بدنام کرنے والے ، کند ذہن کتابیں لکھیں گے یا دوسرے لوگوں سے لکھوائیں گے ۔ پھر اپنی اپروچ کے بل بوتے پر انھیں نصاب میں درج کرالیں گے ۔

گرُڑ :- لیکن کاگ بھسنڈی جی ! ان کمیٹیوں میں تو بڑے بڑے عالم لوگ اور ادھیاپک ہوں گے ۔ کلجگ میں بھی بڑے بڑے ودوان ہوں گے ۔

کاگ بھسنڈی : ان لوگوں کو وہ پروفیسروں کے نام سے پکاریں گے ۔ تعلیمی اداروں کو وہ اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹی کا نام دیں گے ۔

گرڑ :- بڑے بڑے نام ہیں یہ تو کاگ بھسنڈی جی !
کاگ بھسنڈی :- ہاں بڑے نام اور پھیکے پکوان ہوں گے ۔
گرڑ :- کیسے ؟
کاگ بھسنڈی :- پروفیسر لوگوں میں زیادہ تر وہ لوگ ہوں گے
جن کو مقرر کرنے والوں کے پاس اپروچ ہوگی ۔
پروفیسر لوگ لیاقت نہیں سفارش کی بنا
پر مقرر ہوں گے ۔ سفارش ہی سے اُن کی
ترقی ہوگی ۔ سفارش قابلیت کی جگہ حاصل
کرے گی ۔ اسکولوں اور کالجوں میں سفارش
ایک مضمون بن کر نصاب میں اپنی جگہ بنائے گی ۔
یہ مضمون نصاب کا ایک لازمی کورس بن جائے گا ۔
ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب سفارش میں
بڑی بڑی ڈگریاں ملیں گی ۔ ان ڈگریوں کو لینے
والے ڈاکٹروں کے نام سے پکارے جائیں گے ۔ اور
لوگ سفارش کے علم میں ڈاکٹر بن جائیں گے ۔
گرڑ :- میں سمجھا نہیں کاگ جی ۔ ڈاکٹر یا وید تو وہ
لوگ ہوتے ہیں جو بیماری کو دور کرنے کی دوائی
دیتے ہیں ۔
کاگ بھسنڈی :- اور کلجگ کے تعلیمی ڈاکٹر دوائی دیئے
بغیر ہی بیماری کو کافی پھیلا سکیں گے ۔ ان کی
موجودگی سے کوئی بیماری کم نہیں ہوگی ۔
گرڑ :- آگیان روپی روگ بھی نہیں ؟
کاگ بھسنڈی :- وہ بھی نہیں ۔ ان کی تو محض موجودگی بیماری
کی افزائش کے لئے کافی ہوگی ۔ سب سے پہلے
وہ تکبر کی بیماری پھیلائیں گے ۔
گرڑ :- علمیت اور تکبر تو ایک دوسرے کے دشمن ہیں ۔
کاگ بھسنڈی :- کلجگ میں علمیت کا دوسرا نام ہی تکبر ہوگا ۔
علمیت کا آغاز ہی غرور سے ہوگا ۔
گرڑ :- یہ تو ہندوستانی روایت کے خلاف ہے ۔

کاگ بھسنڈی :- کلجگ کی بیشتر باتیں روایت کی خلاف
ورزی کرنے والی ہوں گی ۔ اس زمانے میں نعرہ
بازی زوروں پر ہوگی ۔ کلجگ کا سب سے بڑا
نعرہ سوشلزم اور کمیونزم کا ہوگا ۔ اور اس نسبت
سے تفرقات کا ارتقا ہوگا ۔
گرڑ :- یہ تو متضاد باتیں ہوئیں ۔
کاگ بھسنڈی :- تبھی تو اس کا نام کلجگ ہے ۔ مساوات
کا ڈنکا پیٹنے والے یہ لوگ تفرقات کو بڑھاوا
دیں گے ۔ اور اس میں پیش رو ہوں گے کالجوں
اور یونیورسٹیوں کے پروفیسران ۔
گرڑ :- یہ عجیب بات ہے ۔
کاگ بھسنڈی :- اور یہ پروفیسر لوگ سماج میں مساوات
کے سخت ترین دشمن اور تفرقات کے زبردست
علم بردار ہوں گے ۔ یہ باہمی تمیز قابلیت نہیں
تنخواہوں کی بنا پر ہوگی ۔ اور تنخواہ سفارش کی
بنا پر ۔ پروفیسروں کے تقرر کی کمیٹیوں کا تقرر
سفارش پر مبنی ہوگا ، اور پروفیسروں کا تقرر
ان کمیٹیوں کے ممبران تک اپروچ کی وجہ سے
ہوگا ۔ مقرر ہو جانے پر وہ لوگ فوراً امتیاز کے
جذبے کو بڑھاوا دیں گے ۔ تنخواہ کے آدھار پر اپنے
کو کلاسوں میں منقسم کرلیں گے ۔ زیادہ تنخواہ پانے
والا پروفیسر ، کم تنخواہ پانے والے پروفیسر سے
خود کو برتر تصور کرے گا ۔ اور اس سے بات
کرنے ، یا اس کے ساتھ رابطہ رکھنے میں ہتک
عزت محسوس کرے گا ۔
گرڑ :- لیکن کاگ جی ! جب ایک عہدے سے دوسرے
عہدے تک پہنچنے میں خاص رکاوٹ نہیں ہوگی
تو امتیاز کے جذبے کو بذاتِ خود دھکا لگے گا ۔
کاگ بھسنڈی :- ترقی اتنی آسان نہیں ہوگی ۔ اس کے

لئے کوئی اصول نہیں ہوگا۔ ترقی کا معیار اپنے
کام میں مہارت حاصل کرنا نہیں۔ بلکہ افسر کو
خوش کرنا ہوگا۔
گرڑ :۔ یہ تو ہونا ہی چاہیے۔
کاگ بھسنڈی :۔ لیکن کلجگ میں افسر کو خوش رکھنے کا
معیار بھی مختلف ہوگا ۔ افسر اپنے ماتحت کے
کام سے نہیں، دوسری باتوں سے خوش ہوگا۔
گرڑ :۔ مثلاً ؟
کاگ بھسنڈی :۔ مثال ایک ڈھنگ کی نہیں ہوسکتی۔
یہ تو افسرِ اعلیٰ کے رجحان اور دلچسپی پر مبنی ہوگی۔
کچھ افسر نقد روپے سے خوش ہوجاتے ہیں۔
کچھ روپے کو کسی بھی تشکل میں پاکر۔ کچھ افسران
بیوی کے علاوہ دوسری عورت کو پاکر، اپنے ماتحت
کو ترقی دیں گے اور کچھ اپنی بیوی کو خوش رکھنے
والے ماتحت کو۔ کلجگ کی خوبی یہی ہوگی کہ
زندگی کے ہر شعبے میں چاہے وہ تعلیم سے
متعلق ہو یا بیوپار سے، ترقی وہی پائے گا جو
اپنے کام میں اناڑی ہوتے ہوئے بھی اپنے
افسر کے ذہنی رجحانات اور اس کی دلچسپیوں
کو سمجھ کر، اسے ہر مناسب اور نامناسب
طریق سے خوش کرسکے۔
گرڑ جی :۔ کاگ بھسنڈی جی ! یہ تو آپ نے بڑی
ڈراؤنی تصویر پیش کی ہے۔
کاگ بھسنڈی : کلجگ کی خوبی یہ ہوگی کہ اسے وہ ڈراؤنی
تصور نہیں کریں گے ۔ یہ تو اس کی عام
حالت ہوگی ۔ اسکولوں، کالجوں اور
یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے لوگ نہ صرف
امتیاز کے جذبے کو بڑھائیں گے، بلکہ اس پر
فخر محسوس کریں گے۔ ریسرچ کا شور کانوں کے
پردے چاک ہو، ان کا علمیت کا معیار ریسرچ
کی افراط ہوگا۔ اس میں مضمون کی اہمیت
کو بالکل دخل نہیں ہوگا ۔ ہر مضمون، چاہے
وہ زندگی کے لئے سودمند ہو یا نہ ہو، ریسرچ
کے لئے مناسب تصور کیا جائے گا اور کچھ لوگ
اپنا سارا جیون ان فضول مضامین پر ریسرچ
کرنے میں صرف کردیں گے ۔ اور سماج میں
عالم فاضل کہلائیں گے۔ حکومت کی طرف
سے انھیں خطاب عنایت ہوں گے۔
گرڑ جی :۔ نہیں ۔ نہیں ۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔
کاگ بھسنڈی :۔ یوگ دھیان سے میں نے یہی نظارہ
کیا ہے۔
گرڑ :۔ ایسے کون سے مضامین ہوں گے جن پر
ریسرچ کرنے سے سماج کو خاص فائدہ نہیں
پہنچے گا ؟
کاگ بھسنڈی :۔ ایک ہو تو گنا دوں ۔ مثال کے طور
پر کتے کی دُم، اُلو کی آنکھ، خرگوش کے کان،
غالب کی شاعری اور وٹامن بی کمپلیکس، ٹیگور
اور کھیتی باڑی ؛ آریوں کے زمانے میں ہوائی
جہاز کی سیر۔ کلجگ کی یہی خوبی ہوگی کہ ایسے
عجیب و غریب اور غیر اہم مسائل پر زور دے کر،
ان پر مضامین لکھ کر، اپنی علمیت کا ڈھونگ
پیٹا جائے اور لوگوں سے اسے تسلیم کرایا جائے۔
گرڑ :۔ یوں کہئے کہ کلجگ اشتہار بازی کا زمانہ
کہلائے گا ۔؟
کاگ بھسنڈی :۔ کہلائے گا نہیں، ہوگا۔ کچھ کام کئے
بنا ہی، اشتہار بازی کے بوتے پر، لوگ اپنی
بڑائی کو منوالیں گے۔
گرڑ :۔ لیکن اسکولوں کے ماسٹر، کالجوں اور یونیورسٹیوں

کے پروفیسر، خلوص اور سچائی سے تعلیمی کاموں میں دلچسپی نہیں لیں گے تو اور کیا کریں گے؟
کاگ بھسنڈی :۔ تعلیم کے نام پر پیسے کمائیں گے۔
گرڑ :۔ وہ کیسے ؟
کاگ بھسنڈی : کلجگ کی زندگی اس قدر کھوکھلی ہوگی کہ لوگوں کو اپنی ضروریات بڑھانے کے علاوہ دوسرا کام ہی نہیں ہوگا ۔ ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے پیسے کی ضرورت ہوگی اور دھرم کرم کو چھوڑ کر لوگ پیسے کمانے کی چنتا میں غرق رہیں گے سماج کا ایک لازم جزو ہونے کے سبب ماسٹر اور پروفیسر لوگ بھی اس بیماری سے بچ نہیں سکیں گے ۔ کلجگ کا انمول اور نایاب پھل "قناعت" ہوگا ۔ ہر ایک ادھیاپک چاہے وہ دس کمائے یا ایک سو دس ۔ اپنی قسمت سے نالاں رہے گا ۔ اور تنخواہ سے غیر مطمئن اور دوسرے طریقوں سے پیسے کمانے کی فکر میں غلطاں ہوگا ۔ ادھیاپک لوگ کلاس کو اسکول کے وقت نہیں پڑھائیں گے، اس کے بعد ٹیوشن رکھ کر انھیں لڑکوں کو پڑھا کر ان سے پیسے کمائیں گے ۔ کلجگ میں یہ بیماری عام ہوگی، تعلیم میں دلچسپی نہ رکھنے والے لوگ، ماہران تعلیم کہلائیں گے ۔ اور تخیل تخلیق میں ایک دم ناکام اور کوڑھ مغز لوگ ادھر اُدھر سے چوری کرکے کتابیں لکھیں گے ۔ پھر کمیٹی کے ممبران کی منت سماجت کرکے، ان کتابوں کو نصاب میں لگوائیں گے ۔ ممبران کو رشوت دینے تک سے گریز نہیں کریں گے ۔ ان کمیٹیوں کے خود ممبر بننے کے لئے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ماحول میں سیاسیات بھر کر، اسے حد درجہ گندہ بنادیں گے یونیورسٹیوں میں تعلیم کی جگہ سیاسیات کا بول بالا ہوگا ـــ پڑھانے والے لوگ اپنا اصلی کام چھوڑ کر سیاسی میدان کے کھلاڑی بنیں گے اور ہمیشہ ایک دوسرے کو نیچا دکھلانے کی کوشش میں مصروف رہیں گے ۔ گرڑ جی ! کلجگ میں پرائمری اسکول کے ماسٹروں سے لے کر یونیورسٹی کے پروفیسران تک، ہر کوئی سیاسی اکھاڑے کا پہلوان ہوگا، اور اسکول اور کالج سیاسیات کے اڈے ہوں گے۔
گُرڑ جی :۔ یہ تو بری بات ہوگی۔
کاگ بھسنڈی :۔ یہی نہیں ۔ کلجگ کی تعلیم ایک دم اَن پریکٹیکل ہوگی ۔ اس کا سماج سے اور سماجی بھلائی سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔ ۔۔ زیادہ پڑھے لکھے لوگ اپنے کو سماج سے ایک دم علیحدہ تصور کریں گے ۔ لوگوں سے ملنا اپنی توہین سمجھیں گے ۔ سماج کے کام آنے سے پرہیز کریں گے ۔
گُرڑ جی : لیکن اسے تعلیم کیسے کہا جا سکتا ہے ؟
کاگ بھسنڈی :۔ یہی تعلیم کہلائے گی ۔ اور سماج اور تعلیم یافتہ لوگوں میں امتیاز بنائے رکھنا اسی کا فریضہ ہوگا ۔ اپنے کو سماج سے علیحدہ تصور کرنا، دوسرے لوگوں سے اپنے کو بڑا سمجھنا، اس وقت کی تعلیم کی خوبی ہوگی ۔ جنتا کے خرچ پر پڑھنے والے لوگ، تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسی جنتا سے لاتعلقی کا برتاؤ کریں گے ۔
گُرڑ :۔ تو کیا پڑھے لکھے لوگ اتنے خود غرض بن جائیں گے ؟ اپنی خواہشات کو پورا کرنے میں مصروف اور سماجی ماحول سے بے پروا شخص

تو روگی بن جائے گا۔

کاگ بھسنڈی :۔ آپ نے درست فرمایا گرڑ جی۔ کلجگ کا زبردست ترین یہی روگ ہوگا۔ سماج سے بے پرواہی لوگوں کو خطرناک ذہنی بیماریوں کا شکار بنا دے گی۔ لوگوں کو اپنے پڑوسیوں میں دلچسپی نہ رہے گی۔ لوگوں کا ایک دوسرے پر سے وشواس اٹھ جائے گا۔ اسی کے ساتھ خود اعتمادی بھی اٹھ جاتے گی۔ اپنے سوائے اسے سماجی زندگی میں کوئی دلچسپی نہ رہے گی۔ اور وہ سنکی ہو جائے گا۔

گرُڑ :۔ کیا کہا سنکی ؟

کاگ بھسنڈی :۔ ہاں، سنکی۔ کلجگ میں یہ راگ خطرناک روپ دھارن کرے گا۔ خود اعتمادی سے محروم شخص اتنا سنکی ہو جائے گا کہ وہ زندگی کی ہر بات کا مذاق اڑائے گا۔ جس شخص کو اپنے اوپر وشواس نہیں، اُسے ایشور اور اس کی قدرت پر کیا وسواس ہوگا؟ نتیجہ یہ ہوگا کہ کلجگ کا تعلیم یافتہ آدمی معمولی باتوں سے گھبرائے گا۔ زندگی کی جد وجہد سے ڈر کر وہ فرار کا راستہ اختیار کرے گا۔

گرُڑ جی :۔ کرشن کے دیش میں ایسا ہوگا؟ زندگی کا شانتی اور بہادری سے مقابلہ کرنے کے لئے جہاں گیتا کا اپدیش دیا گیا ہے، وہاں لوگ فراریت کی پالیسی اپنائیں گے؟

کاگ بھسنڈی : کلجگ کی خوبی یہ ہوگی کہ گیتا کا پاٹھ تو لوگ بھارت میں کریں گے۔ لیکن اس پر عمل سمندر پار کے گوری چمڑی والے کریں گے۔ ہندوستانی لوگ گیتا کے نام پر فخر کرنا اور ودیشی لوگ اس پر عمل کرنا اپنا دھرم تصور کریں گے۔

گرُڑ :۔ یہ تو اچھی بات نہیں۔

کاگ بھسنڈی :۔ اصلی اور سچی تعلیم مفقود ہونے سے اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے؟ تعلیم کا اصلی مقصد تو انسان کی شخصیت کا ارتقا ہوتا ہے جس سے وہ اپنے آپ میں اُلجھا نہ رہ کر خود کو سماج کا لابدی جزو تصور کرتا ہے، اور سدا ہی اس سماج کی سیوا کے لئے تیار رہتا ہے۔ اسی سے جہاں اُس کی شخصیت میں اضافہ ہوتا ہے وہاں ساتھ ہی سماج کو بھی فائدہ ہوتا ہے۔ اچھی اور سچی تعلیم سے انسان اور سماج کی دوری کا نور ہوتی ہے لیکن کلجگ میں غلط تعلیم کو لوگ صحیح تعلیم تصور کریں گے۔ اس سے دیش کو زبردست نقصان ہوگا۔ اس میں رتی بھر شبہ نہیں۔

گرڑ :۔ کاگ بھسنڈی جی!۔ یہ تو اچھی تصویر نہیں۔ اگر کلجگ میں زمانے بھر میں. . . .

کاگ بھسنڈی : گرڑ جی! میں تو محض اسی دیش کی بات کر رہا ہوں، جہاں تک دوسرے دیش کا تعلق ہے ان کی حالت ہندوستان سے ایک دم مختلف ہوگی درحقیقت سمندر پار کے گورے جو منددری کی اولاد ہوں گے وہی تعلیمی میدان میں بازی جیتیں گے بھارت واسی اپنے تکبر کے بوجھ ہی سے دبے رہیں گے، ان کا یہ تکبر دیش کے لئے کتنا مہنگا ثابت ہوگا، اس کا بہت کم لوگ اندازہ لگا سکیں گے۔

گرُڑ :۔ کاگ بھسنڈی جی! علمیت اور گیان سے بھری آپ کی باتوں سے مجھے کتنا لابھ پراپت ہوا ہے اُس کا میں ورنن نہیں کر سکتا۔ اسکے لئے آپکا دھنیہ وادکرتا ہوں اچھا نمسکار!

کاگ بھسنڈی : نمسکار۔ گرڑ جی!

علاقائی نظمیں

جسیم الدین
ترجمہ
یونس احمر

میں، وہ، اور کتاب

(بنگلہ)

کوئی نہیں ہے اس کمرے میں، میں ہوں، وہ ہے اور کتاب

اُس کے مکھ میں جھانک رہا ہے سورج دیوتا اپنی دھوپ
اُس کا چہرہ ہنسی کا چندن، لہریں جس کی رُوپ انوپ

وہ پڑھتی ہے، پھر رُکتی ہے اور نین کے بان چلاتی ہے
میں نظموں کے ہار بناتا ہوں پھر مطلب ان کا سمجھاتا ہوں
یہ چاہت ہے اُن نینوں کی یا بھنورے کالے کالے ہیں
جو ہولے ہولے اُڑ اُڑ کر مکھڑا اُس کا چوم رہے ہیں
جب رنگ سے پنکھ چھو جاتا ہے، اک بجلی سی لہرا جاتی ہے
کچھ دیر کی خاطر میگھ نگر میں رُوح مری اُڑ جاتی ہے
اس چھوٹی سی کتاب میں جانے کیا لکھا ہے اور کیا نہیں لکھا

میری نظر بس دیکھ رہی ہے اس کی ہنسی کی پیاری ریکھا
اس کے پیارے مکھ میں ہنسی ہے یا ہے ہنسی کی اُجلی ندیا
گڑھے ہیں اُس کے گال میں ایسے جیسے فلک پر ہو تارا

وہاں ہیں بیٹھے بھونرے کالے یا کہ کھلے ہیں سُندر پھول
یا ہے سچ مچ نظر کا دھوکا، یا ہے نظر کی میری بھول
نہیں نہیں مُسکان، ہنسی اور اس کے روپ کی آشیش بھلا
ان گڑھوں کو بھر دے گی اپنی جوانی کا دے کے پیار

اُس کا سندر سندر مکھڑا جس میں نہیں ہے ذرا حجاب
کوئی نہیں ہے اس کمرے میں، میں ہوں، وہ ہے اور کتاب

(شمارہ، ۲۱۴، سنہ ۱۹۶۹ء)

شہزاد احمد
ترجمہ
رحمان رضوانی

وقت کی بات

(پنجابی)

پنجابی	ترجمہ
پتہ نہیں اوہ کیہڑا دن سی	کون کہے وہ کون سا دن تھا
جس دن یاداں	جس کی یادیں
دل دی پرلی کوٹھڑی وِچوں	دل کی اندھیری گہرائی سے
اکھاں کڈھ کے گھوری پا کے	حیراں حیراں سی نظروں سے
میتوں ویکھن لگ پیّیاں سن	مجھ کو گھور کے دیکھ رہی تھیں
میں کلا	میں تنہا —

میں لکھاں وچ کلّم کلّا
اپنے آپ توں ڈردا
اپنے سائے توں گھبراندا
دل دے سارے بوہے میٹ کے
اکھاں میچ کے بیہہ جاندا ساں
پر اج سارے بوہے کھلے نیں
تے آن والی ٹھنڈی وا
دل دی ہنیری کوٹھڑی وچوں
سیٹی مار کے لنگھ جاندی اے
یاداں دے چہرے وی بدلے بدلے نیں
تے اکھاں جاگو میٹی نیں
لنگھے ہوئے ویلے دا دکھ
آن والے ویلے دا سکھ
ہر کھن آون والے ویلے دا ہر پل
خوشیاں دیاں خوشبوواں
لے کے آوندا اے
تے دل دیاں میلاں
اکھاں دے اتھرو
اپنے نال ای پنڈاں بنھ کے
لے جاوندا اے
جاندی واری سانوں کہہ جاوندا اے
فیر نہ ایہہ دکھ سہنا
فیر نہ دل دے بوہے بھیڑ کے بہنا

لاکھوں میں تنہا
اپنے آپ سے سہما ڈرتا
اپنے سائے سے گھبراتا
بند کئے دل کے دروازے
آنکھیں موند کے رہ جاتا تھا
آج کھلے دروازے سارے
اور ہوا کے ٹھنڈے جھونکے
دل کی اندھیری گہرائی سے
شور مچاتے بہتے جائیں
یادوں کے چہرے بدلے ہیں
آنکھیں کچھ سوئیں، کچھ جاگیں
بیتے وقت کی تلخی اور دکھ
آنے والے دور کا ہر سکھ
مستقبل کا اک اک لمحہ
خوشیوں کی ـــ
مہکاریں لائے
دل کا میل
آنکھوں کے آنسو
اپنے ساتھ ـــ
بہالے جائے
جاتے جاتے یہ کہہ جائے
پھر نہ کبھی تم یہ دکھ سہنا
پھر دل کے در بند نہ کرنا

(شمارہ ۱۰۸-۱۰۷، سنہ ۱۹۶۰ء)

شیخ ایاز

تصنیف و ترجمہ

خونِ انساں

(سندھی)

میں نے دیکھا ہے اُسے
کون کہتا ہے کہ وہ جلوۂ مستور مرا واہمہ ہے
چاندنی راتوں کے احساسِ جمیل
تم بتاؤ کہ وہ محبوبِ حسیں
میری آغوش میں کس طرح مچل جاتا ہے
موسمِ گل کی سُلگتی شامو!
تم بتاؤ کہ مرا کاشانہ
آتشِ گل سے دہکتا ہے جب
بارشِ حُسن دوعالم کی طرح
حلقۂ لوئے چمن سے وہ مرا پیکرِ ناز
ہائے کس طرح جھکتے لب و رخسار لئے
خلوتِ دل میں چلا آتا ہے
ہائے یہ ثروت و دولت کا پجاری، یہ ہجوم
خونِ انساں کو چراغوں میں جلانے والا
تیرگی اور بڑھانے والا
کون سمجھائے اسے
جلوۂ مہتاب بھی ہے
کون سمجھائے اسے
تیری آنکھوں سے ترا نور تری بیداری

چھین ہی لے گی کبھی
جس سے ہو حاصل بینائیِ دل
ایسا اک خواب بھی ہے .

(شمارہ ۳۴-۳۵ ، سنہ ۱۹۵۴ء)

اجمل خٹک

ترجمہ

منصور قیصر

شہید

(پشتو)

میرا جواں شہید خون میں لتھڑا ہوا ہے
اس کا سر اُونچا ہے اور اُس کے ہونٹوں پر تبسم ہے
اُس نے قوم کی عزّت اور آبرو رکھ لی ہے
آج غازی کی تلوار کا منہ پھر آفتاب کی طرح چمک رہا ہے
یہ میری قوم کا شہ زور جوان ہے
اور میرے ہی لشکر کا سپاہی ہے
یہ میرے ہی پہاڑ کا شاہین ہے

یہ قوم کی ناموس ہے ، اس کی موت اور زندگی وفا ہے
اے ماؤ اور بہنو!
اُس نے اپنے سر کی قیمت دے کر تمہاری حیا کا تحفظ کیا ہے
اے مہ جبینو!
اپنے گلے کے ہاروں کو اُس کے سر کا صدقہ بنا دو
یہ اپنے خون میں نہایا ہوا شہید تمہاری ہی عزت کے لئے شہید ہوا ہے

اُس نے تمہاری لاج رکھی ہے اور تمہاری عصمت کو محفوظ کیا ہے
اُس کے پاک خون کو لے کر اپنے ہونٹوں کی سُرخی بناؤ
اُس کی پاک مٹی کو لے کر چُومو ..... اور
اُس کی (قبر کے) پتھروں سے زیور بناؤ
اُس نے ہمارے لئے جان دی ہے
اس لئے یہ ہمیں جان سے بھی زیادہ عزیز ہے
یہ ہماری قوم کا بہادر جوان اور ہمارے لشکر کا سپاہی ہے
یہ ہمارے پہاڑ کا شاہین ہے۔

(شمارہ ۱۸۴، سنہ ۱۹۶۶ء)

گل خان نصیر
ترجمہ
شان الحق حقی

جانِ معانی

(بلوچی)

مرا دل ہے دل کی جوانی ہے تو　　مری زیستِ زندگانی ہے تو
میں غم کی گھٹا میں بھی ہوں شادماں　　نہ کیوں ہوں مری شادمانی ہے تو
مری گفتگو کیا ہے اک موجِ نور　　نہ کیوں ہوں کہ اس کی روانی ہے تو
محبت ہے سرشاری و بے خودی　　میں تیرا "مرید" اور "حانی" ہے تو
مرا دل بلاؤں سے لرزاں نہیں　　مری ضامنِ کامرانی ہے تو

بڑا شاعرِ نکتہ داں ہے نصیرؔ!
مگر اس کی جانِ معانی ہے تو!

(شمارہ ۸۱ — ۸۰، سنہ ۱۹۵۸ء)

خواجہ غلام فریدؒ
— مترجمہ —
ناصر کاظمی

انہد مرلی شور مچایا

(سرائیکی)

مرشد نے سب بھید بتائے
عقل و ہوش و حواس اڑائے
مدہوشی میں ہوش سکھا کر　　منزل کا رستہ دکھلایا
انہد مرلی شور مچایا

جلوۂ وحدتِ کامل دیکھا
نقشِ دوئی کو باطل دیکھا
عالم کے اسرار کو سمجھا　　دھیان گیان کے راز کو پایا
انہد مرلی شور مچایا

نورِ حقائق ہوا نمایاں
سرِ حقیقت ہو گئے آساں
فاش ہوا ہر نکتۂ پنہاں　　قرب و بعد کا فرق مٹایا
انہد مرلی شور مچایا

سن کر اس مرلی کی باتیں
اُلجھے راز انوکھی باتیں
بھولے سبھی صفاتیں ذاتیں　　وحدت نے وہ رنگ جمایا
انہد مرلی شور مچایا

(جشنِ فرید منعقدہ ملتان میں پڑھا گیا)

(شمارہ ۲۰۷، سنہ ۱۹۶۸ء)

غلام احمد مہجور
ترجمہ
مقبول احمد سید

طلوعِ صبحِ بہار

(کشمیری سے)

سیاہیٔ شبِ ہجراں کا زور ٹوٹ گیا
اُفق سے جھانک رہی ہے نگارِ صبحِ وصال
قدم قدم پہ ہیں لالے کی مشعلیں روشن
نظر نظر سے عیاں ہے سکون و صبر و قرار
چمن کا دامنِ صد رنگ ہے بہارِ نظر

روش روش پہ کھلے ہیں کنول محبت کے
سُنا ہے سیرِ گل و لالہ کے بہانے سے
ہماری دید کو آئے گی وہ بہارِ خیال
مہک اُٹھی ہے جو بُوئے وفا سے وادیٔ دل

ہٹا چکے ہیں دلوں سے غبارِ جورِ خزاں
فسانۂ شبِ ہجراں بھی لوگ بھول گئے
کچھ اس طرح سے ہوئی ہے طلوعِ صبحِ بہار

(شمارہ ۱۰۲، سنہ ۱۹۶۰ء)

بین الاقوامی نظمیں

ماؤزے تنگ
ترجمہ
طفیل احمد جمالی

کفن بدوش آسکو تو آؤ!

(چینی)

دُھلی دُھلی سی حسیں فضا میں دمک رہا ہے زمیں کا چہرہ
کہ اُجلے ملبوس میں چمکتا ہے لالہ رُخ نازنیں کا چہرہ

لچکتی مستِ خرام ندیاں، یہ چوٹیاں جادوگرنیاں ہیں
ادائیں اُن کی ہیں فتنہ ساماں تو ان کے عشوے بھی جاں ستاں ہیں

جمالِ کافر پکارتا ہے، دلاوروں کو، بہادروں کو
کہ سر بکف ہو سکو تو آؤ، کفن بدوش آسکو تو آؤ!

مگر نہ آیا کہیں سے اب تک کوئی حریفِ صلائے جاناں
کہ شی ہوانگ اور شاہ ووتی نہ تھے قتیلِ ادائے جاناں

نہ تائی سونگ اور نہ تائی سو کتے گدازِ عشق و وفا کے محرم
شکارِ شاہیں سے پائی فرصت کمانِ چنگیز نے نہ اک دم

تمام کشور کشا شہنشاہ قعرِ ماضی میں کھو چکے ہیں
بس ایک ہم ہیں جو آج سوزِ غمِ محبت میں جل رہے ہیں

(شمارہ ۷، سنہ ۱۹۵۱ء)

گورکی
ترجمہ
سید فیضی

طوفانی پطریل کا نغمہ

(روسی)

سیاہ ابر سمندر کی وسعتوں پہ محیط
دھواں دھواں سا فضاؤں کی گود میں لرزاں
اٹھا ہی چاہتا ہے برق و باد کا طوفاں

مگر۔ اس عالمِ خوف و ہراس میں پطریل
پیمبرانہ جنوں کا یہ حشر کارِ جمیل
نظر نظر میں لئے قاہری و جباری
اندھیری رات کے پردوں میں بجلیوں کی طرح
غلافِ ابر میں ہے آشنائے سوز و گداز
اک اضطرابِ مسلسل کا ایک نغمہ نواز

تلاطم اس کے حسیں بازوؤں میں رقصاں ہیں
غضب رسیدہ نگاہوں میں ابر و طوفاں ہیں

مچل رہے ہیں سمندر کی سطح پر گرداب
ہوائیں چیخ رہی ہیں ۔ فضائیں گریاں ہیں
مذاقِ زیست پہ چھایا ہے ۔ موت کا عالم
گرج کے شور سے مرغانِ آب لرزاں ہیں
یہ بحر ۔۔۔ یہ فلکِ نیلگوں کی پہنائی
بپھرتی موجوں میں طغیانیوں کے ساماں ہیں
یہ برق و باد کا منظر خروشِ طوفاں میں
اکیلا بے خودیٔ شوق سے ہے نغمہ نواز
تباہ کاریٔ فطرت کا جیسے پاس نہیں

بلندیوں سے اُترتے ہُوئے سیاہ بادل
فلک کو چُومتی موجوں کے دل نشیں انداز
یہ گرم خیز تموّج ، یہ تَرم رو پرواز
سپہرِ تیرہ کو ہے برق پاشیوں کا جنوں
یہ جھاگ اُگلتی ، یہ سر پھوڑتی ہوئی لہریں
تلاش کرتی ہیں بے کار بہ رہی ہیں سکوں
یہ بڑھتا سیل ہے ، یا دندناتا آبِ رواں
مٹا ہوا ہے نظر میں فریبِ پست و بلند
وہ دیکھ ۔۔۔ نیلی چٹانوں سے لہریں ٹکرا کر
اُچھل رہی ہیں سمندر سے جھاگ کی مانند
اور ۔۔۔ اضطرابِ عمل کا مجسمہ ! پٹریل
جنوں نوازیٔ فطرت پہ مسکراتا ہوا
سیاہ ابر کے پردوں میں گیت گاتا ہوا
بلندیوں سے ہم آغوش ہے یہ شوکت و ناز
وہ جانتا ہے کہ طغیانِ برق و باد کبھی

طلوعِ مہر کا منظر چھپا نہیں سکتے
یہ بہتی آگ ہے اس کے لپکتے شعلوں کو
سمندروں کے تھپیڑے بجھا نہیں سکتے

غلافِ ابر سے بجلی چمکتی ہے لیکن
ہر عکس اس کا سمندر میں جھلملاتے ہوئے
ذرا سی دیر کو اک موجِ آتشیں بن کر
اُچھل کے پھر دلِ دریا میں ڈوب جاتا ہے

شرار و سیل کے دھارے اُبل رہے ہیں ابھی
ابھی فضاؤں میں رقصاں ہے مستیٔ پیٹریل
کہ جس کے نغموں سے ڈھلتا ہے زندگی کا فسوں
سمندروں میں ابھی جست و خیز ہونے دے
یہ برق و باد کا طوفان ہے تیز ہونے دے
اور اس مہیب تموج کے بعد ایک سکوں!!
تباہیوں سے بکھرتا ہوا پیامِ حیات
نیا زمانہ، نئی زندگی، نئے دن رات!

(شمارہ ۲-۱، سنہ ۱۹۵۱ء)

ناظمؔ حکمت
ترجمہ
محمد قاسم

تمہارے ہاتھ

(ستوکی)

غریب انسانو! میرے ساتھیو

جنہیں جھوٹ کے سہارے زندہ رکھا جاتا ہے
جب تم بھوک سے نڈھال ہوتے ہو
اور جب تمہیں روٹی اور گوشت کی ضرورت ہوتی ہے
تو ایک مرتبہ بھی شکم سیر ہوئے بغیر
تم اس دنیا کو خیرباد کہہ دیتے ہو
اس کے پھل دار درختوں سے رخصت ہو جاتے ہو
سوچو،
دنیا بیل کے سینگوں پر قائم نہیں
اس کو چلانے والے تمہارے ہاتھ ہیں

(شمارہ ۱۷۹، سنہ ۱۹۶۶ء)

قاضی جرجانی

مترجمہ

ڈاکٹر سید محمد یوسف

علم کی عزت

(عربی)

یقولون لِی فِیکَ انقباضٌ وإنّما
رأوا رجُلاً عن موقفِ الذُّلِّ أحجما

لوگ کہتے ہیں کہ میں آئینہ ہوں۔ بات صرف اتنی ہے کہ ان کا پالا ایسے آدمی سے پڑا ہے جو ذلت کی جگہوں سے دُور رہتا ہے۔

إذا قِیلَ: هٰذا مشربٌ قُلتُ: قد أریٰ
ولکنّ نفسَ الحرِّ تحتمِلُ الظَّما

جب کوئی کہتا ہے کہ "گھاٹ یہ رہا!" تو میں کہتا ہوں کہ وہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے، لیکن ایک شریف النفس پیاس برداشت کرسکتا ہے۔

ولم أقضِ حقَّ العلم ان كان كلّما
بدا طمع صيّرتُه لی سُلّما

میں علم کے حق میں کوتاہی کروں گا اگر ایسا ہو کہ جب بھی کوئی لالچ پیدا ہو میں اس کے زینے پر چڑھتا چلا جاؤں۔

ولم ابتذل فی خدمة العلم مُهجتی
لِاخدم من لاقیت لکن لاخدم ما

میں نے علم کی خدمت میں اس لئے پتا نہیں مارا ہے کہ جو سامنے آئے اُس کا خادم بنوں بلکہ اس لئے کہ مخدوم بنوں۔

أأشقی به غرسًا واجنیه ذلّة
اِذن فاتباعُ جهل فدکان أحزما

کیا میں علم کا پودا لگانے میں ہر قسم کی تکلیف اُٹھانے کے بعد اس سے ذلّت کا پھل پاؤں، تب تو زیادہ دانش مندی یہی ہے کہ جہل کے راستے پر چلا جائے

ولوان اهلَ العلم صانوه صانهُم
ولو عظّموه فی النفوس لَعُظِّما

اگر اہل علم، علم کا مرتبہ بلند کرتے تو علم بھی ان کا مرتبہ بلند کرتا اور اگر وہ دِلوں میں علم کی عظمت بٹھاتے تو ضرور اُس کی عظمت مسلّم ہو جاتی۔

ولکن اهانوهُ فهانوا ودنّسوا
مُحیّاه بالاطماع حتّٰی تجهّما

لیکن انہوں نے تو علم کو رُسوا کیا، نتیجے میں خود بھی رُسوا ہوئے اور علم کے چہرے کو ذاتی منافع کی آلائش سے ایسا گندا کیا کہ وہ نفرت انگیز بن گیا۔

(شمارہ ۱۰۵، سنہ ۱۹۶۷ء)

ٹی، ایس، ایلیٹ

ترجمہ

قرۃ العین حیدر

چہار آہنگ

(اسنگو پیٹری)

میں دیوتاؤں کے متعلق زیادہ نہیں جانتا
لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دریا ایک طاقتور مٹیالا دیوتا ہے
تُند مزاج، غصیلا
اپنے موسموں اور اپنے غیظ و غضب کا مالک، تباہ کن
وہ ان چیزوں کی یاد دلاتا رہتا ہے
جنہیں انسان بھول جانا چاہتے ہیں
وہ منتظر ہے اور دیکھتا ہے اور منتظر ہے
دریا ہمارے اندر ہے سمندر نے ہمیں گھیر رکھا ہے
خاتمہ کہاں ہے ـــــ بے آواز چیخوں کا
خزاں میں خاموشی سے مُرجھاتے پھولوں کا
جو چُپ چاپ اپنی پنکھڑیاں گراتے ہیں
جہاز کے بہتے ہوئے شکستہ ٹکڑوں کا خاتمہ کہاں ہے؟
خاتمہ کہیں نہیں ہے۔ صرف اضافہ ہے
مزید دنوں اور گھنٹوں کا گھٹتا ہوا تسلسل
ہم نے کرب کے لمحوں کو ڈھونڈ نکالا
(سوال یہ نہیں کہ یہ کرب غلط فہمی کا نتیجہ تھا
یا غلط چیزوں کی تمنا کا
یا غلط چیزوں کے خوف کا)

یہ لمحے منتقل ہیں جس طرح وقت منتقل ہے
ہم اس بات کو بہ نسبت اپنے کرب کے دوسروں کے کرب میں
بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں
کیونکہ ہمارا اپنا ماضی کرم کی دھاراؤں میں چھپا ہے
لیکن دوسروں کی اذیت ایک غیر مشروط تجربہ ہے
جو کبھی فرسودہ نہیں ہوتا۔
لوگ بدل جاتے ہیں، مسکراتے بھی ہیں مگر کرب موجود رہتا ہے
لاشوں اور خس و خاشاک کو
اپنی موجوں میں بہاتے ہوئے دریا کی مانند
وقت جو تباہ کن ہے، قائم بھی رہتا ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کیا کرشن کا یہی مطلب تھا
کہ مستقبل ایک مدھم گیت ہے۔
اور ان کے واسطے جو ابھی پچھتانے کے لئے پیدا نہیں ہوئے
پچھتاوے کا گلِ سُرخ
جو ایک ایسی کتاب کے پیلے اوراق میں رکھا ہے
جو کبھی کھولی نہیں گئی۔
آگے بڑھو مسافرو۔ ماضی سے بھاگ کر
تم مختلف النوع زندگیوں یا کسی قسم کے مستقبل کی طرف
رواں نہیں ہو۔
آگے بڑھو۔ تم جو سمجھتے ہو کہ سفر میں ہو
تم وہ نہیں جنہوں نے بندرگاہ کو پیچھے ہٹتے دیکھا
تم وہ نہیں، جو دوسرے ساحل پر اُتروگے۔
اس لمحے کہ دونوں کناروں کے درمیان وقت معطل ہے
مستقبل اور ماضی پر یکساں دھیان کرو

یہ لمحہ کرم یا نہ کرم کا نہیں ، جانو
کہ موت کے سمے انسان کا دماغ وجود کے جس نقطے پر
بھی مرکوز ہو (اور موت کا سمے ہر لحظہ ہے)
وہ محض ایک کرم ہے
جو دوسروں کی زندگیوں میں بار آور ہوگا
کرم کے پھل کا خیال نہ کرو۔ آگے چلو
"مسافرو اور ملاحو!
تم ، جو گھاٹ پر اترو گے اور
تم ، جن کے جسم سمندر کے فیصلے سہیں گے
یا جو کچھ بھی تم پر بیتے گی ، یہ تمہاری منزل ہے
کرشن نے ارجن سے میدانِ جنگ میں کہا :
الوداع — نہیں — بلکہ آگے بڑھو
مسافرو!

(شمارہ ، ۱۶۳ ، سنہ ۱۹۵۶ء)

کارل سینڈبرگ
ترجمہ
عنبر چغتائی

فردا

(امریکی)

آؤ جہاں باسیوں کی نئی بستیوں کی بات
آؤ کہ چھیڑیں "ماہ رسا" ہستیوں کی بات

مستقبلِ قریب میں کچھ تازہ جدّ و جہد
ماضی کی بات ، خاک بسر بستیوں کی بات

"کل" کھتا ہوا کا جھونکا کہ سورج پئے غروب
مغرب میں جس نے چھُپ کے کہی پسپتیوں کی بات

دُنیا ہوائے جلوۂ فردا کے کچھ نہیں!
رندوں میں آج کل ہے نئی مستیوں کی بات

فردا ہی موج بحر ہے، فردا ہی آسماں
اے کارل سینڈ برگ نہ کر پستیوں کی بات

(شمارہ ۱۵۶، سنہ ۱۹۶۴ء)

ھائنے

ترجمہ

مصطفیٰ زیدی

ریستوران میں

(جرمنی)

ہم ایک چائے کی میز پہ آکر　　عشق کا قصہ لے بیٹھے تھے
ہر خاتون بڑی کومل تھی　　مرد نہایت دل والے تھے

معتبرانِ شہر میں اک نے　　اُس کو فلاطونی ٹھہرایا
اُن کی شریکِ حیات نے اس پر　　طنز سے "جی اچھا!" فرمایا

پادریوں میں اک یہ بولے　　عشق گھریلو ہو نہ تو اس سے
نظمِ شکم برہم ہوتا ہے　　اک لڑکی نے پوچھا: "کیسے؟"

اک خاتون نے یہ فرمایا　　عشق میں ہے تلوار کی تیزی
اور اسی دوران میں اٹھ کر　　چائے کی پیالی شوہر کو دی

اک گوشہ بالکل خالی تھا　　تم بھی جو آتیں ہم مل رہتے
عشق کا مطلب سب پا جاتے
گو، ہم منہ سے کچھ بھی نہ کہتے

(شمارہ ۶۵، سنہ ۱۹۵۷ء)

بوچویا مورا

ترجمہ

پیر علی محمد راشدی

انسان

(حبا پانی)

اس بوڑھے ماہی گیر میں
جو ساحل پر ایڑیاں جمائے کھڑا ہے
مجھے ایک انسان نظر آ رہا ہے
سمندر سے اس کا عشق رہا ہے
اب بوڑھا ہو چلا ہے
مگر کتنا عرصہ اپنے محبوب سے ہم آغوش رہ چکا ہوگا

اس بوڑھے ماہی گیر کا
سمندر سے عشق رہا ہے
اس سمندر سے جو خود بوڑھا ہونے کا نہیں
عاشق خود بوڑھا ہو چکا ہے
پر اپنے اس ہمیشہ جوان معشوق کی طرف
استقلال سے پاؤں جمائے ہوئے
ہمت سے آنکھیں اٹھائے ہوئے

دیکھ رہا ہے
راہِ محبت میں —
اس بوڑھے کی ثابت قدمی
سمندر کی طرح بیکراں ہے!
نہیں نہیں — سمندر سے بھی زیادہ ہیں
اس کی ثابت قدمی کی گہرائیاں اور پہنائیاں!!

تعجب کی بات ہے کہ اس قدر ثابت قدمی
ایک انسان میں نظر آرہی ہے
دیکھ لے سمندر، تو بھی دیکھ لے
ایک انسان دیکھ لے

اس انسان کے اعصاب دیکھو
آہنی ہیں،
جسم دیکھو
تانبا ہے،
آنکھیں دیکھو
شعلے جھڑ رہے ہیں کان ابرو سے!
چہرہ دیکھو
وہ گہری اور موٹی لکیریں
نقشہ ہیں ساری انسانیت کا
دیکھ لے سمندر!
دیکھ لے
تو بھی ایک انسان دیکھ لے!

(شمارہ ۱۶۷، سنہ ۱۹۶۵ء)

حافظ شیرازی

ترجمہ

نریش کمار شاد

دو آتشہ

(فارسی)

فارسی	اردو
دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خللست صراحئ مئے ناب و سفینۂ غزلست	اس زمانے میں وہ رفیقِ عزیز جس میں کچھ بغض ہے نہ کینہ ہے یا مئے ناب کی صراحی ہے یا غزل کا حسیں سفینہ ہے
فقیہہ مدرسہ دی مست بود و فتویٰ داد کہ مے حرام وے بہ ز مال اوقافست	مدرسے کا فقیہہ مستی میں کہہ رہا تھا یہ کل برائے مے مے یہ مانا حرام ہے لیکن مال اوقاف سے تو بہتر ہے
در مذہبِ ما بادہ حلال ست ولیکن بے روئے تو اے سروِ گل اندام حرامست	میرے مذہب میں یوں تو جائز ہے جانِ من! شغلِ ساغر و مینا تجھ سے معشوقِ گل بدن کے بغیر مجھ کو لیکن حرام ہے پینا
با محتسبم عیب مگوئید کہ او نیز پیوستہ چو ما در طلبِ عیش مدامست	محتسب سے مری برائی کا ذکر کرتے ہو کیا ارے بھائی! وہ بھی میری طرح ہمیشہ سے عیش و عشرت کا ہے تمنائی!

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گل بیز ست
بہ بانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز ست

مے ہے یُوں تو نشاط خیز بہت
اور ہوا بھی ہے عطر بیز بہت
علی الاعلان اسے نہ پی کہ ابھی
کیوں کہ ہے محتسب بھی تیز بہت

(شمارہ، ۱۲۷، سنہ ۱۹۶۲ء)

ڈاکٹر پیٹرک لومبا
ترجمہ
کوثر انصاری

صبح افریقہ

(افریقی)

پیٹرک لومبا، جنہوں نے افریقی عوام کی جدوجہد آزادی میں نہ صرف بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا بلکہ اپنی جان تک دے دی، نہ صرف ایک مقبول اور مخلص لیڈر تھے بلکہ ایک کامیاب انقلابی شاعر بھی تھے۔ یہ بات الگ ہے کہ انہیں شاعر کی حیثیت سے غیر معمولی شہرت نہ مل سکی۔ "صبح افریقہ" لومبا کی ایک شاہکار نظم ہے جس میں نیگرو عوام کے سچے جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

نیگروؤ!
ایک ہزار برس تک تم نے ایک جانور کی طرح مصائب کا سامنا کیا
ہے۔ تمہارے جسم کی راکھ صحرا میں اُڑتی ہوئی ہواؤں میں بکھیر دی گئی۔
تم پر ظلم کرنے والے نے عظیم الشان جادو کے مندر تعمیر کئے تاکہ تمہاری
چیختی ہوئی رُوح زندہ رہے اور تم مصائب برداشت کرتے رہو۔
گورے نے اپنے لئے تم پر چابک چلائے اور گھونسے مارنے کا حق
حاصل کیا اور تمہیں حق دیا کہ تم روتے رہو اور مر جاؤ!
تم سے تعلقات قائم کر کے اُس نے تمہیں نہ ختم ہونے والی
بھوک دی۔
اور گھنے جنگل کے سائے میں بھی خوفناک موت درختوں کی شاخوں

کی طرح تمہاری طرف رینگتی ہوئی بڑھتی رہی۔ اُس نے تمہارے
جسم اور تمہاری سسکتی ہوئی روح کو دبوچ لیا۔
تب انہوں نے تمہاری چھاتی پر ایک خوفناک زہریلا سانپ رکھ
دیا۔ سینے قسم کے موتیوں کی جھلک دکھا کر انہوں نے تم سے تمہاری
پیاری بیوی چھین لی۔ تم اپنی تمام دولت سے محروم کر دیئے گئے۔
تمہارے جھونپڑے سے تم تم گاڑیاں رات کی تاریکی میں آوازیں
دیتی ہوئی نکلیں۔
خوفناک کالے دریاؤں تک چیخ پکار سُنائی دیتی رہی اُن لڑکیوں
کی جن کی عصمت لُوٹ لی گئی۔
ان لبوں سے خون اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور جہاز
انہیں اُڑا کر اس ملک میں لے گئے جس کا ظالم بادشاہ ہے۔
وہاں تمہارا بچہ اور تمہاری بیوی دن رات خوفناک بے رحم ہل میں
چلتے رہے۔ ان کا انگ انگ درد سے چلا اُٹھا
تم دوسروں کی طرح انسان ہو۔ یہ لوگ تمہیں اس پر یقین کرنے کا
پرچار کرتے ہیں کہ بالآخر خدا سب کو آرام دے گا۔
اور تم آگ میں جلتے ہوئے دہکتے ہوئے دردناک گیت گاتے رہے
اس بے گھر بھکاری کا گیت جو اجنبی کے دروازے پر صدا دے
کر گاتا ہے۔
اور جب تم جذبات سے مغلوب ہوئے اور تمہارا خون کھولنے لگا
تو رات کو تم نے ناچنا شروع کر دیا۔ کراہنا شروع کر دیا ایک طوفان
کی گرج کی طرح۔
ایک ہزار سال کے مصائب کی وجہ سے تم میں ایک قوت نمودار ہوئی
تم نے اپنے غلام براعظم میں گرجنا شروع کر دیا۔
تمام دنیا حیران ہو گئی۔ خوف سے کانپ کر جاگ اٹھی تمہاری آواز

میں خون کی سی روانی پیدا ہو گئی۔
گورا انسان نئے گیت سے زرد پڑ گیا، اُس گیت سے جو رات
کے اندھیرے میں روشنی کی شمع بن گیا
ہمدم! یہ صبح نَو ہے صبح نَو۔ ہمارے چہروں سے دیکھو۔
ہمارے قدیم افریقہ میں ایک نئی صبح غلام ہوئی ہے۔
اب یہ دھرتی، یہ پانی، یہ عظیم دریا ہمارے ہوں گے جنہیں غریب
نیگرو ایک ہزار برس سے دوسروں کے حوالے کرتا رہا ہے۔
اور یہ سورج کی تیز کرنیں پھر ہمارے لئے چھائیں گی
یہ کرنیں تمہاری آنکھوں سے آنسوؤں کو خشک کر دیں گی۔ تمہارے
چہرے کے زخموں کو صاف کر دیں گی۔
جونہی تم زنجیروں اور وزنی بیڑیوں کو توڑ دو گے۔ بُرے اور ظالم
دن پھر کبھی نہیں آئیں گے
کالی زمین سے ایک آزاد اور بہادر کانگو اُبھرے گا
ایک آزاد اور بہادر کانگو!!

(شمارہ ۱۱۵، سنہ ۱۹۶۱ء)

میرینے سودسکو

ترجمہ

خیر النساء انصاری

ٹرائے

(روماینشے)

ہمارے چاروں طرف ہیں فرس ٹروجن کے
ہر اک فرس میں ہے پوشیدہ اک سپاہِ غنیم
جو بوتلوں سے، لباسوں سے اور نقشوں سے

شبِ سیاہ میں باہر نکلنے لگتی ہے
ہم ایسے ناداں کہ ان بونلوں لباسوں کو
بڑے ہی شوق سے بازار سے خریدتے ہیں
پھر اپنے گھر میں سجاتے ہیں، اور ان میں سے
ہر ایک شب کو نکلتی ہے اک سیاہ غنیم!

(شمارہ ۱۸۶، سنہ ۱۹۶۷ء)

اندریج سلادکووِچ
ترجمہ
نصیر احمد زبیری

لیکن یہ ممکن نہیں

(سلواکی)

ممکن ہے میں تیرے شیریں ہونٹوں کا منکر ہو جاؤں
ممکن ہے میرے ہاتھ تجھ تک نہ پہنچ سکیں
ممکن ہے مجھے رنج و غم میں دُور جانا پڑے
ممکن ہے مجھ سے کسی کو محبت نہ رہے
ممکن ہے میں پیاس کی شدت سے مر جاؤں
ممکن ہے میں تنہائی میں افسردہ رہوں
ممکن ہے میری زندگی مشکلوں کے ریگستان میں گھر جائے
ممکن ہے میں جی کر بھی نہ جیوں
ممکن ہے میں اپنی زندگی کا خود خاتمہ کروں
لیکن یہ ممکن نہیں
کہ میں تجھ سے محبت نہ کروں!

(شمارہ ۱۷۹، سنہ ۱۹۶۶ء)

پی ایر دے رون سار

ترجمہ

ڈاکٹر ریاض الحسن،

جب تم جوان تھیں!

(فرانسیسی)

جب تمہارا سر بالکل سفید ہو جائے گا
اور شام کے وقت شمع کی روشنی میں
تم آگ کے کنارے بیٹھے ہوئے سوت کات کر
اُس کے پونے بناتی ہوگی
تو اُس وقت میرے اشعار گا کر تعجب انگیز لہجے میں کہوگی کہ
"رون سار نے میری تعریف کی تھی جب میں حسین تھی"۔
تب تمہاری کوئی ملازمہ اس بات کو سن کر
اور کام سے تھک کر آرام کرنے کے لئے جا رہی ہوگی
تو میرا نام سن کر یک بہ یک چونک پڑے گی
اور تمہارے لافانی نام کی بڑائی بیان کرے گی
اُس وقت میں زمین کے نیچے بغیر گوشت پوست کے
مہندیوں کے درخت کے سائے میں ابدی آرام کر رہا ہوں گا
اور تم ایک باوقار سن رسیدہ خاتون ہوگی
اور میرے عشق پر اور اپنی ضد پر افسوس کروگی
اس لئے میری جان! خوش دلی سے زندگی گذارنا سیکھو
اور فکر فردا مت کرو
اور جو کچھ عشرت امروز مل سکتی ہے جمع کرلو!

(شمارہ ۲۰۶، سنہ ۱۹۶۸ء)

علاء الدین الآزاد
ترجمہ
یونس احمر

مخالف ہوا

(بنگلہ کہانی)

مخالف ہوا میں ناؤ کھینا تکلیف دہ ہی نہیں مسرت انگیز بھی ہے۔ اور یہ غم و مسرت کی طرح اپنی گہری چھاپ چھوڑ جاتا ہے۔

شام کی روشنی بجھ جانے کے بعد جب ظلمت آشوگنج میں اپنی ناؤ لے کر آیا، اُس وقت اُس کی چھاتی میں ہاہاکار مچی ہوئی تھی ـــــ اس میں شدید بے کلی تھی، ہولناک طوفان بل رہا تھا اس کے اندر۔ ٹھیک وقت پر منزل مقصود تک پہنچ جانا اور پھر کسی سے ملنے کی تمنا ـــــ عجیب اضطراب کا عالم تھا وہ۔ بھوت کی آنکھوں کی طرح سُرخ لیکن گہری طرح مٹیالی لالٹین جلا کر اُس نے ٹونٹونی کے قریب رکھی ـــ ٹونٹونی کی گود میں اس کا ایک یتیم بھائی سو رہا تھا اور دوسری طرف دوسرا بھائی بھی لیٹا ہوا تھا ـــــ

ظلمت نے پاؤں کے پاس رکھے ہوئے کپڑے کو پہنا اور پھر عالم اضطراب میں جانے سے پہلے اس نے لڑکی کو تسلی دیتے ہوئے کہا ـــــ

"ڈرنا مت، جلد لوٹ آؤں گا"

ٹونٹونی نے اپنی دو خاموش آنکھوں کو اوپر اٹھا کر باپ کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اُس وقت تک جا چکا تھا۔

پہلے تو سیٹی کی آواز سنائی دی۔ پھر آہستہ آہستہ پہیوں کی آواز ـــ یہاں تک کہ گاڑی اسٹیشن پر آکر رک گئی۔ گاڑی کا رکنا تھا کہ اس کے قدم تیزی سے اٹھنے لگے جیسے وہ دوڑ رہا ہو۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ مسافر ڈبوں سے نکلیں گے دوسرے مسافر اندر گھسیں گے اور اس ریل پیل میں نہ جانے اس کی کیا گت بنے ـــ اور پھر جس سے ملنے کے لئے وہ آیا تھا

وہ ملے نہ ملے۔

کچھ دیر کے بعد ریلوے لائن کے پاس سے بل کھاتے ہوئے راستے کو پار کرکے تین افراد بڑی ہوشیاری سے ندی کنارے آکر رک گئے۔ آسمان ابر آلود ہونے کی وجہ سے خاصا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ تاہم اس اندھیرے میں معلوم پڑتا تھا کہ اُن میں دو مرد ہیں اور ایک عورت۔ ان کے سروں کے اوپر سے میگھنا پل آدھ میل آگے چلا گیا تھا۔ قابل دید اور بہت ہی خوب صورت۔ لیکن ان کو یہ سب چیزیں دیکھنے کی فرصت کہاں تھی ظلمت نے چھلانگ ماری اور ناؤ میں گھس گیا، اُس نے جلدی سے کینوس کا تھیلا رکھا اور پھر نیچے آکر کھونٹی سے ڈوری کھولی اور اس ڈوری کو کھینچتے کھینچتے گمبھیر آواز میں اُس نے کہا۔

" آجاؤ بھئی۔ جلدی سے سوار ہو جاؤ "

مرد نے جانے کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ اس کو سامنے رکھے ہوئے پتھروں سے ٹھوکر لگی۔ اس نے کسی طرح خود کو سنبھالا اور اپنی ہمراہی سے کہا۔

" کم بخت کہاں آگئے ہم۔ انگلیاں بھی چھل گئیں میری "

" ایسی بھی کیا جلدی۔ ذرا ہوشیاری سے چلو "

" رہنے بھی دو اپنی نصیحت۔ یہ سب کچھ تمھاری ہی وجہ سے تو بھگت رہا ہوں۔ ہنہہ! "

ہمیشہ کی گرم اور تنک مزاج عورت جمنا کے پتلے پتلے دونوں ہونٹ صلواتیں سنانے کے لئے تڑپ رہے تھے لیکن بڑی مشکل سے وہ خود پر قابو پا سکی۔ اُس نے سوچا۔ وہ سارا راستہ ریل کے ڈبے میں کھڑا آیا ہے اور اتنی دور تک پیدل چلتا رہا ہے۔ کیا فائدہ اس پہ برس پڑنے سے۔

نند نے دھوتی کو کمر سے باندھا، اور بہت دیر کے بعد آخر کار ناؤ میں سوار ہو گیا۔ ناؤ کی لکڑی کی سطح چیں چیں کرنے لگی۔ وہ ایک لمبی سانس کھینچ کر بیٹھ گیا۔

" باپ رے باپ یہ کیا —— یہ تو آدمی کے بچے معلوم ہوتے ہیں " نند ہنسنے لگا اور ٹونٹونی متحیر نگاہوں سے اس کو دیکھنے لگی۔

ساری کے پلو کو کمر سے باندھتے ہوئے جمنا ناؤ کے پاس گئی۔ ظلمت اب تک نیچے کھڑا ہوا تھا۔ جمنا کے دونوں کھلے ہوئے پاؤں کو دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اُس نے ذرا قریب جا کر جمنا سے پوچھا۔

" ناؤ پر اٹھ سکو گی تو لو میرا ہاتھ پکڑ لو "

شاید کوئی اور گھڑی ہوتی تو وہ راضی نہ ہوتی۔ لیکن اس وقت تو اندھیرا پھیل چکا تھا اور میگھنا کنارے گہری خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن ممکن ہے اس پر اسرار فضا کا اس پر اثر نہ ہوا ہو البتہ اس کے دل میں یہ خوف سما گیا تھا کہ کہیں وہ گر نہ جائے اور پھر جمنا نے صرف اس کا ہاتھ ہی نہیں پکڑا بلکہ ایک پاؤں ناؤ پر رکھ کر اس کے گلے میں اپنی باہیں بھی حمائل کر دیں۔

جمنا کے نرم وگداز جسم کے لمس حسین نے اس کو اور مست و بے خود کر دیا۔ اور پھر اس کے گھنے گیسوؤں کی خوشبو اس کی ناک میں آئی تو جیسے وہ اپنی ساری کائنات لٹا بیٹھا۔ لیکن وہ بے قابو نہ ہوا۔ اس نے سوچا کہ اس وقت مزید پیش دستی ٹھیک نہیں ہے۔ اس کو ناؤ پر بٹھا کر خود بھی اوپر آگیا، اور دیکھتے دیکھتے ناؤ رواں ہو گئی۔ اس کی رگوں کا خون مشتعل ہو رہا تھا۔

ظلمت سوچنے لگا۔ دونوں کے مکان قریب تھے اور دونوں اتنا گھل مل گئے تھے جیسے قریبی رشتہ دار ہوں بچپن سے لے کر جوانی تک ایک ساتھ اٹھے بیٹھے، اس کے باوجود وہ جمنا کو پہچان نہ سکا۔ لیکن آج وہ اتنے دنوں کے بعد اس کی گرفت میں آئی بھی تو اس کا پر اسرار سلوک اس کو پیش دستی سے روکنے لگا۔ آخر یہ پابندی کیوں؟ کھاتے میں نام درج کرانے کے بعد جمنا نہ جانے کتنی بار رکھ میں روپے پیسے باندھ کر برہمن باڑے گئی لیکن اس کو کچھ نہ ملا۔ جمنا اس کی عزت کرتی ہے مٹھائیاں خرید کر لاتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے پان سگریٹ لا کر قرینے سے اس کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ بچوں کی خیریت پوچھتی ہے ــــ مگر اس سے آگے نہیں بڑھتی ۔ حالانکہ اندر ہی اندر اس کا اضطراب بڑھتا جاتا ہے، اور بے کلی اور بے چینی آرام نہیں لینے دیتی۔ اور مڑے ہوئے پھٹے ہوئے نوٹوں کے بدلے جس چیز کی اس کو خواہش ہوتی ہے وہ نہیں ملتی۔

کچھ روز پہلے کی بات ہے۔ ظلمت نے اس کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ اگر وہ رضامندی دیدے تو وہ اس سے بیاہ کر لے گا۔ لیکن اس تجویز پر عمل درآمد تو اور بھی کٹھن ہے۔ کیونکہ جن زنجیروں سے اس کے پاؤں باندھے گئے ہیں وہ کمزور نہیں۔ اگر وہ اس راہ سے بھاگ بھی گئی تاہم رہائی مشکل ہے۔

”صرف تم راضی ہو جاؤ، باقی میں نمٹ لوں گا“ ظلمت نے اس دن دست بستہ گھبرائی ہوئی آواز میں اس سے کہا تھا۔

”نہیں مانجھی، ہرگز نہیں۔ تم چلے جاؤ۔ آئندہ سے کبھی نہ آنا یہاں۔“

”مگر تمھیں دیکھے بغیر مجھے چین جو نہیں ملتا جمنا یقین کرو۔“

اور ظلمت کو آخر کار مایوس و نامراد درِ محبوب سے لوٹنا پڑا تھا۔ آج بھی جمنا کو معلوم ہے کہ باپ کی زندگی کی آخری گھڑی میں مانجھی اس مقصد کی تکمیل کرا لینا چاہتا ہے۔ مگر وہ اپنے خیالات کی باگ موڑ لیتی ہے۔ مانجھی کی آنکھوں میں التجا ہے اور ہاتھوں میں کشکول ہے ــ اس کے باوجود . . . . .

جمنا مڑی ہی تھی کہ اس کو اپنے سامنے آٹھ نو سال کی بچی بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ اس کی گود میں گدڑی سے لپٹا ہوا گوشت کا محض ایک لوتھڑا بھی تھا۔ وہ اس کے پاس گئی، اور لالٹین سے اس کا چہرہ دیکھ کر مانجھی سے بولی۔

”یہ تمھارے ہی بچے ہیں مانجھی؟“

”ہاں، تین بھائی بہن ہیں۔“ یہ کہکر ظلمت زور زور سے پتوار چلانے لگا۔

لالٹین رکھ کر جمنا پھر نند کے پاس آگئی، اور اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ نند یکایک دانت نکوس کر ہنسنے لگا۔ نہ جانے کیوں ــ اس کے بعد اس نے جیب سے سگریٹ نکالی۔ ایک کو تو اس نے خود ہونٹوں سے دبالی اور دوسری جمنا کے سامنے پھینک دی۔

جمنا سگریٹ پیتی ہے اور اس کا دھواں اس کی طبیعت پر بار بھی نہیں گذرتا، لیکن اس وقت سگریٹ

پینے سے انکار کرتے ہوئے وہ بولی —

"تم پیو - میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے"

یہ الفاظ دانستہ نہیں نادانستہ طور پر اس کی زبان سے نکل آئے تھے لیکن نند فوراً پوچھ بیٹھا "سر میں درد تو نہیں؟"

"نہیں - تھکن سی ہے"

"تو پھر کچھ اور پی لو"

جمنا اس کا مفہوم سمجھ گئی - بولی - "تم کبھی درست نہیں ہو سکتے - ساتھ لائے ہو کیا؟"

"صرف ایک بوتل لایا ہوں -" اور بوتل دکھاتے ہوئے اس نے کہا - "تمھارا باپ تو مرنے ہی والا ہے - رات بھر جاگوگی کیسے؟ - لو تھوڑی سی چڑھالو"

جمنا نے ایسی تیکھی نظروں سے اس کو دیکھا کہ وہ ایک دم سے خاموش ہو گیا۔

میگھنا پانی سے لبالب ہے اور ناؤ چڑ چڑ آواز نکالتی آگے بھاگی جا رہی ہے - لیکن رفتار بہت تیز نہیں ہے - اگر ایک ہاتھ آگے بڑھتی ہے تو پاؤ ہاتھ پیچھے بھی چلی جاتی ہے - ظلمت برابر اپنی پوری طاقت سے پتوار چلائے جا رہا ہے "شام کا اندھیر پھیلنے سے پہلے نتائی برمن کی سانس اوپر چلی رہی تھی - نہ جانے اب کیا حال ہے - اگر آخری وقت میں جمنا باپ سے نہ مل سکی تو نہ جانے اس پر کیا گذرے گی" ظلمت پتوار چلاتے چلاتے سوچتا بھی جا رہا ہے۔

جمنا بھی شاید یہی سوچ رہی ہے - اور غالباً وہ اسی لئے نند کے پاس سے اٹھ کر ناؤ کے سرے تک آگئی - کیا آخری بار باپ کا زندہ چہرہ نہیں دیکھ سکے گی - کاش ان دو آنکھوں سے - ڈبڈبائی آنکھوں سے ایک بار...... "بس اس کے دل کی یہی واحد اور آخری آرزو ہے - اُس کے باپ نے سوگند کھائی تھی کہ وہ مرتے دم تک جمنا کا چہرہ نہیں دیکھے گا - اور واقعی دس سال اس طرح بیت بھی گئے - تو کیا آج بھی...... ؟ زندگی کے آخری سفر سے پہلے تھوڑی دیر کے لئے بھی نہیں...... ؟ جمنا سے بھیانک خطا سرزد کیوں نہ ہوئی ہو مگر یہ اس کا خون ہے - اس کی بیٹی ہے - لاڈ و پیار میں پلی ہوئی جمنا —

اندھیرے میں جمنا کی دونوں آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوؤں کے قطرے گرنے لگے۔

نتائی برمن ویسے دیکھنے میں بڑا ہی نرم معلوم ہوتا ہے مگر اس کا دل پتھر کا ہے - بشرہ کے فسادات کے بعد سارے لوگ جیلے پاڑہ کو اجاڑ ویران کر کے چلے گئے لیکن نتائی برمن سینہ تانے کھڑا رہا - اس کے قدم نہیں ڈگمگائے - نہ اس کے کوئی لڑکا ہے نہ ناؤ - جال بھی نہیں، تاہم نتائی آباؤ اجداد کی بنائی ہوئی رہائش گاہ چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا - آج بھی ہاٹ بازاروں میں اس کا ڈنکا بجتا ہے - اور یہی چیز اس کے دل میں اعتماد پیدا کرنے کی محرک ہے اور پھر جمنا بھی تو ہے اور داماد بھی - اوپر والا اتنا ظالم تو نہیں کہ بھوکا مار دے گا۔

لیکن جس رات کو غنڈوں نے منہ میں کپڑا ٹھونس کر جمنا کو گھر سے باہر نکالا اور اس کی بے عزتی کی —— اُس کے دوسرے ہی دن اُس کا داماد بھی ہندوستان چلا گیا - اس کے باوجود نتائی اپنے فیصلے پر ثابت قدم رہا — وہ لڑکی کو اپنے سے جدا نہیں کر سکتا —— ایک طرف پیٹ کا دھندا؛ دوسری طرف خستہ مکان میں رات کو زندگی کا خطرہ ——

میں صرف تم کو بچانے کے لئے گھر سے باہر گئی تھی بابا — بابا —" جمنا جیسے فریاد کر رہی تھی — خاموش فضا میں جیسے طوفان کے جھکڑ چلنے لگے۔

نند چونک پڑا۔ عقب سے صرف ناؤ کھینے کی آواز آرہی تھی — مچر، مچر — لگاتار!

ناؤ میگھنا کے چوڑے کشادہ پاٹ سے نکل کر تنگ ندی سے ہوتی ہوئی دکھن پاڑے کے گھاٹ پر آکر رک گئی۔ جمنا کا دل دھڑک اٹھا۔ اور متحیر نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ظلمت اد سامنے آگیا۔ اس نے ناؤ کو کھینچا اور کھونٹی سے ڈوری باندھ دی۔

لیکن نند چپ چاپ تھا۔ اُس نے کہا۔ "تم جاؤ، میں یہیں رہتا ہوں۔"

"بابا سے نہیں ملوگے؟"

"مل کر اب ہوگا کیا۔ میرا تعارف کراتے ہوئے تم ہی مشکل میں پھنس جاؤگی۔ مجھے یہیں رہنے دو۔"

"بہت اچھا تو میں ظلمت کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔ البتہ تم اس کے بچوں کا خیال رکھنا۔"

نند نے ایک اور سگریٹ جلاتے ہوئے کہا — "اچھا جاؤ۔"

ڈونٹو ئی جیسے زندہ نہیں ہے مرچکی ہے۔ وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ باپ نے آکر اس کے جسم پر پھٹی سی چادر رکھی اور کہا "ڈرنا مت، جلد آجاؤں گا۔"

جب دونوں کچھ دور آگے نکل گئے تو نند نے چپکے سے شراب کی بوتل نکالی۔

چاروں طرف گہرا اندھیرا ہے۔ لیکن اس سڑک سے دونوں مانوس ہیں، اس لئے چپ چاپ چلے جا رہے ہیں جمنا آگے ہے اور ظلمت پیچھے۔ اس کے دل میں مختلف قسم کے خیالات و احساسات کا جوار بھاٹا بل رہا ہے — کیا وہ جمنا کے دو نرم و گداز ہاتھوں کو پکڑ لے اور — قریب کے جھاڑ جھنکاڑ میں لے جائے؛ لیکن جمنا کے جسم کی خوشبو ہواؤں میں مل کر اس طرح اس کو مست و بے خود بنا رہی ہے کہ وہ اس میں گم ہو جاتا ہے۔ اس کو صرف اسی خیال سے ابدی مسرت مل رہی ہے کہ جمنا اس کے قریب ہے — خواہ تھوڑی ہی دیر کے لئے سہی۔

مٹی کے لال تیل سے جلتا ہوا چراغ کانپ رہا ہے اور نتائی برمن کو چاروں طرف سے اُس کے پڑوسی گھیرے ہوتے ہیں — عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی۔ ان میں مانجھیوں کے وہ تین خاندان بھی ہیں جو اپنا وطن چھوڑ کر نہیں گئے۔ باقی لوگ مسلمان ہیں۔

بڈھے فقیر محمود کے ہاتھ میں مٹی کا ایک گلاس ہے اور وہ نتائی کے پاس کھڑا ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ نتائی چند گھڑی کا مہمان ہے۔ جان حلق میں اٹکی ہوئی ہے۔ کسی دم میں روح پرواز کر جائے گی۔

"بابا — بابا — میرے بابا —" صحن میں کچھ دیر کھڑی ہو کر وہ چیختی ہوئی کمرے میں بھاگی۔ سب کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں۔

تکیے پر رکھے ہوئے سر کو جمنا نے اپنی گود میں رکھ دیا۔ پڑوس والے حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے، اور کانا پھوسی بھی کر رہے تھے۔

ایک معمر عورت نے اپنے پاس کھڑی ہوئی دوسری عورت سے کہا۔
" ذرا اس لاج کی ماری کا چھل تو دیکھو۔"

تھیلے سے جمنا نے انگور کے چند خوشے نکالے۔ اُس نے نتائی کو رس پلانا چاہا۔ مگر کیا اُس کے اندر رس پینے کی سکت بھی تھی۔ فقیر محمود نے اشارے سے جمنا کو منع کیا کہ جو مر رہا ہے اب اس کو پکڑ کر رکھنے سے کیا حاصل دس سال کے عرصے میں جمنا نے خوب پیسے پیدا کئے لیکن پھوٹی کوڑی سے اس نے اپنے بابا کی مدد نہیں کی۔ نتائی برمن بھی بڑا ہی خود دار تھا۔ اس نے کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا۔ البتہ بھات (پکا ہوا چاول) قبول کرلیتا۔ گرم گرم بھات۔

اب تک نتائی نے آنکھیں نہیں کھولی ہیں۔ جمنا نے چمچے سے اس کے ہونٹوں میں انگور کا رس انڈیلا اور کہا۔

"بابا ـــ بابا، میرے بابا ـــ"

فقیر محمود نے بھی قریب جاکر آواز دی۔

"نتائی، آنکھیں کھولو، دیکھو کون آیا ہے۔ جمنا آئی ہے ـــ تمھاری جمنا ـــ"

آہستہ آہستہ نتائی برمن کے پپوٹے ہلے۔ اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے اپنی بیٹی کے چہرے کو دیکھا۔ جمنا نے ایک بار پھر انگور کا رس پلاتے ہوئے کہا۔

"پہچان نہ سکے بابا۔ میں ہوں جمنا، تمھاری جمنا ـــ لو بابا پیو، تھوڑا اور۔"

جملہ پورا ہوا ہی تھا کہ نتائی کی دونوں آنکھیں ایک بار کھلیں پھر یک بارگی ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں۔ اور انگور کا رس اُس کے مردہ منہ سے ہوتا ہوا نیچے بہنے لگا ـــ زندگی موت کے ہاتھوں شکست کھاگئی۔

پاس پڑوس والوں کو نتائی برمن کی موت کا اس حد تک یقین ہو چلا تھا کہ انھوں نے پہلے ہی سے ملّی منگل کمیٹی کو اطلاع کردی تھی اور وہاں سے دن ہی کے وقت تابوت آگیا تھا۔ چنانچہ اس کے مرنے کے بعد کسی کو افسوس ہوا۔ اور نہ کسی نے آنسو ہی بہائے۔ البتہ گاؤں کے بوڑھے مربیوں کو نتائی کی تکلیف پر تھوڑا بہت دکھ ہوا۔ اور تمام لوگوں کو سب سے الگ تھلگ کھڑی ہوئی نارنجی رنگ کی ساری میں ملبوس ایک لڑکی کے چھل فریب کو دیکھ کر حیرت ضرور ہوئی۔ دس سال پہلے جب یہ گاؤں چھوڑ کر چلی گئی تھی اُس وقت جو کم سن تھے وہ جوان، جو جوان تھے وہ ادھیڑ، اور جو ادھیڑ تھے وہ اب بوڑھے ہو چلے تھے، لیکن جمنا ـــــــ؟ سب بڑی حیرت سے اس کو دیکھ رہے تھے۔

وہ لوگ جمنا کا لباس دیکھ رہے تھے۔ وہ اس کا رونا اور آنسو بہانا دیکھ رہے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ وہ چپ چاپ کیسے چتا کے پاس کھڑی ہوئی ہے۔ لیکن کسی نے اُس سے کوئی سوال کیا اور نہ ان میں سے کوئی بھی اس کے قریب ہی آیا۔

جب تک چتا جلتی رہی جمنا بھی خاموش، مہر بہ لب کھڑی رہی۔ بھڑکتے ہوئے شعلوں پر اس کی نگاہ جمی ہوئی تھی اور کچکچاتی ہوئی لکڑیوں کے ٹوٹنے کی آواز سن رہی تھی ـــ دیکھتے دیکھتے اس کے بابا کا وجود راکھ کے ڈھیر میں بدل گیا ـــ ایک مٹھی راکھ۔ جس کو پانی میں بہا دینے کے بعد پھر کچھ باقی نہیں رہے گا۔ کیا زندگی کا مقصد صرف یہی رہ گیا ہے؟

کیا یہی ہے اس کا مطلب اور نتیجہ ؟ یہ دراصل سحر کاری ہے، فریب ہے!
اور اگر یہ سحر کاری ہے تو پھر صداقت اور جھوٹ میں کیا فرق رہ جاتا ہے — زندگی کے یہ سارے ہنگامے بے مطلب اور بے مقصد ہیں - نجات اور آزادی کہاں ہے ؟
جمنا ان خیالوں میں اس طرح محو ہوئی کہ اس کو یہ بھی پتہ نہ چلا کہ چتا کی آگ کب کی سرد ہو چکی ہے -
آج آخری رات ہے - جو لوگ نتائی کے جسم کو جلانے کے لئے شمشان تک آئے تھے ان میں سے اب یہاں کوئی بھی نہیں - سب رخصت ہو چکے ہیں -
آسمان پر اب تک سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں - ادھر اُدھر جو دو ایک تارے نظر آجاتے ہیں وہ بھی ٹمٹما رہے ہیں، نہ جانے کس کے جادو ٹونے اور منتروں سے پوری فضا شانت ہو گئی ہے - چاروں طرف خاموشیوں کے پہرے ہیں -
جمنا نے ظلمت کو نہیں دیکھا تو کیا ہوا — اس کی نگاہ تو برابر اسی کی طرف ہے - دن بھر محنت و مشقت کے بعد اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی ہیں - مگر وہ آنکھوں کو رگڑ رگڑ کر جاگ رہا ہے - چتا کے شعلوں کی آخری چنگاری بھی بجھ گئی - اب وہ جمنا کے قریب دبے پاؤں گیا - اور آہستہ سے پکارا -
"جمنا ——!"
"ہوں ——!"
جیسے قریب ہی کسی اور دنیا کے پردے میں چھپی ہوئی کسی اور کی آواز سنائی دی -
ظلمت نے پھر پکارا ——
"جمنا ——!"
اور اُس نے شانے کو جھٹکا دے کر مڑتے ہوئے دیکھا اور تیکھے انداز سے پوچھا ——
"کون، کون ہو تم ؟"
"میں ! میں ہوں ظلو —— مانجھی "
اب ظلمت اُس کے بالکل سامنے کھڑا ہو گیا، لیکن اُس کے پاؤں کانپ رہے تھے -
"مانجھی، کون مانجھی ؟ اوہو، اچھا - تم ہی تو مجھے یہاں تک لائے ہو - کیوں ؟"
"ہاں، میں ہی لایا ہوں" یہ کہہ کر اس نے جمنا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا - شمشان میں بھوتوں کا خوف ہے - اس نے ہاتھ کو کھینچتے ہوئے کہا - "رات بہت ہو چکی ہے، واپس نہیں جاؤ گی !"
"نہیں، نہیں مانجھی، اب مجھ کو میرے گھر لے چلو"
ٹھیک ہے - وہ ہوش میں ہے - ظلمت نے اپنی چادر اس کو اُڑھا دی اور دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر وہ اس کو ناؤ کے پاس لے آیا - ناؤ کے اندر گہری تاریکی ہے — شراب کے نشے میں چُور نند سو رہا ہے اور خراٹے بھی لے رہا ہے - بچے بھی سو رہے ہیں -
ظلمت اس کے اور قریب آیا تو وہ بے قابو ہو کر اس پر گر پڑی — اس نے مضبوطی سے اُسے اپنے بازوؤں میں

لے لیا ۔ جمنا بالکل نڈھال ہو چکی تھی ۔ ظلمت اس کو گود میں اٹھا کر ناؤ میں لے آیا، اور بڑی ہوشیاری سے کہ ناؤ نہ ڈگمگائے پھر وہ آہستہ سے بیٹھ گیا۔ جمنا کی سانس تیز ہو گئی ۔ اس کے سینے میں مدوجزر پیدا ہونے لگے۔

لیکن ظلمت بیٹھا رہا ۔۔۔ چپ چاپ اور ساکت وجامد۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت ۔۔۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری ہو گئی ۔۔۔ کاش یہ رات اور طویل ہو جائے، کاش سورج نہ طلوع ہو! ۔۔۔ آج حیات وموت، مسرت وغم اور سکھ دُکھ ایک ہو گئے ہیں ۔۔۔ آج کوئی ایک دوسرے سے الگ الگ نہیں۔

لیکن تعجب کی بات تو یہ ہے کہ آج اُس کی جنسی برانگیختگی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی ہے ؟ جس کی ذرا سی قربت سے وہ پاگل ہو جاتا تھا آج وہ اس کے قبضے میں ہے ۔ مگر وہ جوش دیوانگی کہاں ؟ ۔۔۔ ظلمت صرف اُس کے بالوں کو مس کر کے دوامی لذت محسوس کر رہا ہے ۔ اور اندھیرے میں نظریں گاڑ کر اس کے حسن کو، اس کی جوانی کو دیکھ رہا ہے ۔۔ کاش نگاہوں کی یہ لذت کبھی ختم نہ ہو ۔۔ مگر نہیں، اس کو ختم ہونا ہے اور یہ حقیقت ہے ۔ ایسی گھڑی کئی بار اس کی زندگی میں آچکی ہے مگر فتّو کی سمجھ میں کبھی کچھ نہ آیا، اور وہ تھک کر ہر بار سو جاتی اور پھر وہ اس کے پہلو میں بیٹھا رات بتا دیتا ۔ البتہ کبھی کبھی اس کے اندر شورش پیدا ہوتی، ہلچل سی مچ جاتی اور تب اس کو محسوس ہوتا کہ اس سیاہ چمڑے میں اور اس سرد و نرم شخص کے اندر ایک اور شخص بھی موجود ہے جو بے حد مغرور ہے ۔ اس کو طاقت وقوت کی پروا نہیں کیونکہ وہ خود زورآور ہے۔

درحقیقت محبت کرنا ہی عین زندگی ہے ۔ اگر یہ نہیں تو پھر موت کے بھیانک اندھیرے پگ پگ ٹھوکریں کھاتا ہے ۔ اٹھتی جوانی میں اس نے ایک بار محبت کی تھی ۔ تب بھوک اس کے لئے کچھ نہ تھی ۔ اور بیکار حیات کو بے معنی سی چیز سمجھتا تھا۔ فتو جب تک زندہ رہی اُس وقت تک قسمت کے آگے سپر ڈالنا اس نے نہیں سیکھا ۔ لیکن وہ بھی قبر میں چلی گئی ۔ روپے جمع کر کے زمین خریدنا اور اس پر مکان بنانے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا ۔ کچھ دن تک ظلمت دیوار پر پھیلی ہوئی بیل کی طرح ڈولتا رہا۔ تب محنت کرنے سے خوف کھاتا اور مستقبل کے تصور سے کانپ اٹھتا تھا ۔

لیکن یکا یک ایک دن جمنا سے مڈبھیڑ ہوئی تو جیسے اس نے خود کو پالیا۔ اور پھر اس نے سوچا ۔ "کھونا اور پالینا ایک ہی روپ کی دو تصویریں ہیں"۔

ظلمت کو یقین کرنا پڑا کہ جمنا اور فتو کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ۔ دونوں ایک ہی ہیں ۔ اور یہ سوچ کر نڈھال اور بے جان جمنا کی پیشانی پر اُس نے گرم بوسے کی ایک چھاپ رکھ دی ۔

سونے کے لئے نہیں، بلکہ یونہی آنکھیں بند کئے وہ بہت دیر تک پڑا رہا ۔ اور جب آنکھیں کھلیں تو اُس نے اوپر آسمان میں تاروں کو ٹمٹماتے ہوئے دیکھا، اور پھر اس کے سر پر سے چڑیوں کی ایک قطار اڑ کر گذر گئی ۔ صبح ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اس طرح بیٹھا رہنا اب ٹھیک نہیں ۔ کیونکہ گاؤں کے لوگ علی الصباح جاگ پڑتے ہیں اور ندی کنارے آتے ہیں ۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو آفت ہی آجائے گی ۔

جمنا کے کان کے پاس اپنا منہ لے جا کر ظلمت نے آواز دی ۔

"جمنا، جمنا!"

اور جمنا ایکا ایکی نیند سے چونک کر اٹھ بیٹھی۔ اُس نے کپڑوں کو ٹھیک کیا اور غصے میں بولی۔

"مانجھی تم؟"

ظلمت پہلے تو گھبرایا، پھر خود کو سنبھالتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

"نیند آ گئی تھی تمھیں؟"

"ہاں آ گئی تھی۔" اس نے اپنا گاؤں، ننّد کو خواب میں گُم اور پورب کے آسمان کو دیکھ کر کہا۔ "جلدی پتوار اٹھاؤ، اور سورج نکلنے سے پہلے پہلے اُس کنارے لے چلو!"

ظلمت بادبان اڑا اور پتوار ہاتھ میں لے اُس کنارے چل پڑا۔ اس درمیان میں ننّد نے دو ایک بار کن انکھیوں سے دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن پھر آنکھیں بند کر لیں۔ جمنا بھی چپ چاپ رہی۔ ٹیل کی اور دیکھ کر نہ جانے وہ کیا سوچنے لگی۔ اور پھر آہستہ آہستہ مانجھی کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

اس کے بعد اس نے ظلمت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا مانجھی سچ سچ بتاؤ، تم نے میرے ساتھ بدتمیزی تو نہیں کی؟"

ظلمت نے سر ہلایا۔ پھر پوچھا۔

"کیوں؟"

"نہیں، یونہی پوچھ رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر جمنا پھر خاموش ہو گئی۔ اور ندی کے پانی سے کھیلنے لگی۔

"دیکھو ندی میں گر نہ پڑو۔"

جواب دینے کی بجائے منہ نیچے کر کے وہ ہنسنے لگی، جیسے اس بات کی ذرا بھی اہمیت نہیں۔ اتنے میں بچہ رو پڑا۔ اور ٹونٹونی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھوں کو ملتے ہوئے بچے کو گدڑی سے اٹھا کر گود میں لے لیا۔ اس کے باوجود روتا رہا اور چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔

ظلمت نے نیند کی ماتی آنکھوں سے جمنا کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ آنکھیں بالکل سپاٹ تھیں۔ جمنا نے بھی اپنی آنکھیں نیچی نہیں کیں۔

چند لمحوں کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ٹونٹونی کے پاس آ کر بولی۔

"لا مجھے دے دے۔ دیکھوں تو۔"

لیکن اس کی گود میں آنے کے بعد بھی بچے کا رونا بند نہیں ہوا۔

"عجیب و غریب بچہ ہے یہ تو۔" اُس نے سوچا۔

اور پھر اس کو بچپن کی باتیں یاد آ گئیں۔ جب وہ اس طرح گڈے کو گود میں لے کر کھیلتی تھی۔ پھر وہ ایک طرف بیٹھ گئی۔ اُس نے اپنے بلاؤز کا بٹن کھولا۔ اور اپنا دودھ پلانے لگی۔ اور بچے کو جیسے وہ شے مل گئی جس کی اُسے

ضرورت تھی ۔ وہ بڑے اطمینان سے چوسنے لگا ۔
دودھ تو نہ تھا اس کے باوجود اسے سکون مل رہا تھا۔
ناؤ گھاٹ پر آکر لگ گئی ۔ ظلمت نے پتوار رکھ کر ڈوری کھینچتے کھینچتے پکارا۔
"جمنا ۔۔۔ !"
وہ قریب آگئی ۔ چہرے پر اب بھی مجبوری اور سپردگی کی چھاپ تھی ۔ اس نے پوچھا ۔۔۔ "اچھا مانجھی اگر میں تمھارے پاس آگئی تو تم دوسروں کو دیکھ کر ڈر تو نہیں جاؤ گے ؟"
"نہیں ۔۔۔ !"
"اگر ضرورت پڑی تو کیا تم مجھ کو بہت دور لے جا سکو گے ؟"
"ہاں ۔۔۔ !"
"تو پھر مکان ٹھیک کر لو، اور تین دن بعد رات کو میرے پاس آجاؤ۔"
"اچھا ۔ !"
ظلمت نے ہر بات کا جواب اس طرح دیا جیسے نکاح پڑھاتے وقت قاضی کے سوال کا جواب دیا جاتا ہے اُس کو یہ سب خواب معلوم ہوا۔
بچے کے گال چوم کر جمنا نے اُسے ظلمت کو دے دیا۔
دونوں ایک دوسرے کو چپ چاپ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے ۔
اس کے بعد جمنا نے ننھو کو نیند سے جگایا، اور پھر دونوں چل پڑے ۔
ظلمت اُس وقت تک جمنا کو دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔
میگھنا کی لہریں پھر اچھلنے لگیں ۔ اور ہواؤں میں طوفان پلنے لگا ۔ مخالف سمت کو ناؤ کھیتے کھیتے اس کے دونوں بازو تھک گئے ۔ وہ نڈھال ہوگیا، اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے منہ سے جھاگ نکل پڑیں گے ۔ لیکن اس کے باوجود وہ ناؤ کھیتا رہا ۔ کیونکہ اس کو ابھی بہت دور جانا تھا ۔۔ شاید پہاڑ کی اُور یا جنگل کی سمت یا پھر کسی اور ملک میں ۔ ممکن ہے پھر کہیں اور ۔۔۔ بہت دور ۔۔۔ !

(شمارہ ۱۵۳-۱۵۲ سنہ ۶۴ء)

قمر ہاشمی کا پہلا نمائندہ شعری مجموعہ
کوہِ ندا
جس میں روایت و درایت کا حسین امتزاج ہے
عنقریب شائع ہو رہا ہے

سوبھو گیان چندانی
ترجمہ
ابرار الرحمٰن جاوید

کون جانے بہار کب آئے

(سندھی کہانی)

"سنو تو ذرا"

"ہاں ہاں کہو!"

"یہ میں کہہ رہی ہوں، کہوں!"

"کہو بھئی ...... کون روکتا ہے؟"

"آج مجھے سینما لے چلو"

"بس اتنی سی بات ہے۔ ضرور چلیں گے۔ میں ایک گھنٹے کے لئے ایک ادبی نشست میں جا رہا ہوں تم تیار ہو کر میری منتظر رہنا تاکہ ہم پہلے شو پر پہنچ سکیں"

"تو تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ نہیں لے چلو گے۔ میں یہ بہانے خوب سمجھتی ہوں۔ آدھی رات کو واپس آؤ گے اور کہو گے بھئی بھول گیا تھا یہ دوست آخر تم کو چھوڑ کیسے دیتے ہیں" ——— اور وہ روہانسی ہو کر منہ لبسورتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ اتنے میں ککو باہر سے دوڑتا ہوا آیا اور مجھے کپڑے تبدیل کرتے دیکھ کر بولا۔

"میں بھی چلوں گا اماں مجھے بھی کپڑے پہنا دو۔ میں بابا کے ساتھ گھومنے جاؤں گا"

"بیٹے تم کپڑے پہن لو تو پھر ہم سینما دیکھنے چلیں گے۔ وہ دیکھا تھا پہلے! میں اسے بہلانے لگا" وہ، لڑکیاں آتی ہیں، لڑکیاں جاتی ہیں اور لڑکیاں ناچتی ہیں" "تو اچھا بیٹا ہے نا! جا اماں سے کپڑے لے کر پہن لے تو میں تانگہ لے آؤں۔ تانگے پر چلے گا نا میرا بیٹا۔ وہ ماں کی طرف بڑھا تو میں تیز تیز قدموں سے باہر نکل آیا ——— عباس کے گھر ادبی نشست تھی۔ وہاں جانا ضروری تھا۔ یہ مجھے علم تھا کہ ایک گھنٹے میں چھٹکارا پانا مشکل ہے۔ لیکن اگر ایک گھنٹے میں واپس آنے کا وعدہ نہ کرتا تو ایک گھنٹہ باتیں سننا پڑتیں۔ ارادہ تھا کہ دوران محفل ہی چپ چاپ اٹھ کر چلا آؤں گا۔ کم از کم میں ککو کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔

عباس کے گھر پہنچا تو محفل کا آغاز ہو چکا تھا۔

علیم بڑے جوش سے کہہ رہا تھا "میں یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ اس افسانے میں کوئی صحت مند خیال پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ میں تو یہ

کہوں گا کہ اسے افسانہ کہنا ہی غلط ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے بھی اس میں بے حد کمزوریاں ہیں اور ہر لحاظ سے یہ ایک ناکام کوشش ہے۔"

کیا پڑھا۔ کس نے پڑھا۔ اس کی مجھے خبر نہ تھی۔ دیر سے محفل میں پہنچنے کی سزا یہی ہوتی ہے۔

شورش نے کہنا شروع کیا: "مجھے حیرت ہے کہ خیر محمد کی اس تخلیق کو افسانہ ماننے سے انکار کیا جا رہا ہے جبکہ اس میں افسانے کے لوازمات افسانوی طرز تحریر، مرکزی خیال، دلچسپ مکالموں کے ذریعہ کرداروں کی عکاسی اور ترقی پسند رجحانات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ باقی رہا لذت کا مسئلہ تو اگر کوئی بات سُن کر لطف نہ آئے تو اُسے پھر سنا ہی کیوں جائے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ادیب یا فنکار اپنی تخلیق میں کتنی لذت پیدا کرتا ہے یا دل کو متاثر کرنے والا لطف۔ میرا دعویٰ ہے کہ "آٹھ مردوں کی بیوی" سندھی ادب میں ایک نئے رجحان کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ذرا غور تو کیجئے ایک بیچاری مظلوم عورت ہے جو عمر بھر پیار اور محبت سے محروم رہی ہے اور جس کا پہلا شوہر اس کے باپ کا ہم عمر ہے جو اس میں احساسات کو تو جگا سکتا ہے مگر اس کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ دوسرا مرد اس کا عاشق ہے جو اسے بھگائے جانے کے بعد فروخت کر دیتا ہے۔ ایک اسے چھوڑ کر مر جاتا ہے تو دوسرا اسے اس لئے ساتھ لے جاتا ہے کہ وہ مرنے والے مرد کا بھائی ہے۔ پھر وہ بھی اس مظلوم عورت پر اتنے ظلم کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کی حفاظت کی خاطر بھاگ نکلتی ہے اس طرح سے وہ مختلف مردوں تک پہنچتی ہے جو اسے بے بس سمجھ کر اپنی ہوس کا شکار بناتے رہتے ہیں۔ اس طرح سے وہ عورت، جو ماں، بہن، بیوی اور بیٹی ہوتے ہوئے معصوم کمزور اور بے دست و پا بھی ہے مردوں کے بنائے ہوئے سماج میں تھپیڑے کھانے کے لئے زندگی کے عمیق سمندر میں ہاتھ پاؤں ... مارنے لگتی ہے، ذرا غور تو کیجئے کہ ہمارے معاشرے میں کتنی ہی عورتیں ایسی ہیں جن کے لئے زندگی مستقل ایک محبس ہے جہنم ہے اور بے موت مرنے کے برابر ہے۔ محنت مزدوری کرنا، کپڑے دھونا، جھاڑو دینا، برتن مانجھنا اور اسی قسم کے دوسرے پست درجے کے کام کرتے رہنا ہی عورت کا روزمرّہ کا دستور ہے۔ سب سے زیادہ ظلم تو یہ ہے کہ اس کو چار دیواری میں بند کر دیا جاتا ہے اور اس عمل نے اس کی ذات سے فکر، قوت ارادی اور خودداری کے جذبات کو ختم کر دیا ہے اور اس کو مرد کے احکامات، خواہشات اور خیالات کے لئے محض کھلونا بنا دیا ہے۔ کبھی آپ نے اس پر غور کیا ہے اور اس معاملہ میں کچھ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ افسانہ ہر سوجھ بوجھ رکھنے والے شریف آدمی کے لئے اس کی ماں، بہن، بیوی، بیٹی غرضکہ ہر عورت کی طرف سے للکار ہے۔ دنیا میں مظلوم بہت ہیں مگر عورت کی نسبت سب ظالم ہیں"۔ ـــــ اب بات سمجھ میں آنے لگی تھی۔ خیر محمد کے افسانے میں یہ تمام پہلو موجود تھے یا نہیں یہ دوسری بات تھی۔ مگر ... اب بحث ضرور دلچسپ رخ اختیار کر رہی تھی ـــ!

نور نے کہا ـــ "صاحب صدر، شورش صاحب نے کچھ اس انداز سے اپنی بات کی ابتدا کی ہے کہ اب بنیادی طور پر یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ عورت کو آزادی دینے سے فوائد زائد ہیں یا نقصان۔ میری ناقص عقل میں تو یہی آتا ہے کہ عورت کا مقام اس کا گھرانا اور خاندان ہے۔ جن کہانیوں کی طرف کہانی اشارہ کرتی ہے وہ ایک خراب معاشرے کی پیداوار ہیں۔ اگر ہمارا معاشرہ ہمارے مذہبی احکامات کے مطابق نیک نیتی سے کاربند ہے تو یہ خرابیاں پیدا ہونے کا احتمال نہیں رہتا۔ دوسری طرف آپ اس سے باخبر ہوں گے کہ مغربی ممالک میں عورتوں کی آزادی نے کیا کیا مسائل پیدا نہیں کئے ہیں۔ ۵۰ فیصدی شادیوں کا انجام طلاق کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور بداخلاقی دن بدن ترقی پا رہی ہے۔ خود ہمارے اپنے ملک کی طرف بھی نظر ڈالئے۔ کیا آپ کسی کالج کی لڑکی کی پاک دامنی کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟ ـــــ شکر کا مقام تھا کہ مولانا نور نے اپنی مفصل رپورٹ نہ پڑھنی شروع کی تھی ورنہ ایک اونگھنے کی سی کیفیت محفل پر ضرور طاری ہو جاتی ـــ سب بولے "ٹھیک ہے پہلے یہ طے ہونا چاہیئے کہ عورت کا سماج میں صحیح مقام کیا ہے"۔

محبوب بولا ـــ "صاحبو! یہ تو بتاؤ کہ اگر عورت کسی سے محبت کرے تو اسے جھوٹیا یا باسی کیوں سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور اگر مرد ساری عمر عیش کرے تو بھی اس کو نیا اور نوعمر کنوارا سمجھا جاتا ہے جب کہ محبت کرنے سے نہ عورت گھس سکتی ہے نہ مرد، بشرطیکہ حد سے زیادہ نہ بڑھ جائے۔ میں تو "فری لو" آزاد محبت، کا قائل ہوں، لیکن میری محبوبہ کو میری نظروں سے نہ دیکھنا کیونکہ پرائی نگاہیں بھی عورت کو ناپاک کر دیتی ہیں۔ (اس آخری جملے میں طنز کی

بحالت نمایاں تھی ——— ہارون نے کہا "میری سو میری اور جو تیری وہ سب کی" یہ بالکل عیاشوں کا مقولہ ہے" اس کے لئے کوک شاستر سے لے کر انسان کے دنیا میں پیدا ہونے کا مقصد تک تلاش کیا جانے لگا۔ بد قسمتی سے عورت جو مجلس کا موضوع بحث تھی اس کا ایک فرد بھی وہاں موجود نہ تھا" ہماری جنت میں صرف حوا ہی زائد ہے"

سرور بولا میں فقیر آدمی ہوں، میرے پاس اصولوں کی کوئی قدر نہیں ہے شادی میں جو تکلف ہے اس کا میں خوگر نہیں ہو سکتا ہوں جہاں مل جائے وہاں کھائے۔ یہ اصول دوسرے فریق کے ضمن میں بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں۔ گھوڑے کو گھر باندھنا اور اس کے دانے کا بندوبست کرنا، یہ میرے لئے ممکن نہیں ہے" ——— الیاس کہنے لگا میری رائے میں آزادی دو دھاری تلوار ہے جن عورتوں کو آزادی چاہیے انھیں خاندان کو پالنے اور گھر کے اخراجات پورے کرنے میں بھی حصہ لینا پڑے گا۔ میں گھریلو، مزدور یا اسی قسم کی عورتوں کی بات نہیں کر رہا۔ یہ بیچاری تو اپنے شوہروں سے زیادہ ہی مصروف رہتی ہیں۔ میں پڑھی لکھی عورتوں کی بات کر رہا ہوں۔ ان کی تعلیم کا فائدہ ہی کیا۔ اگر وہ صرف اپنے شوہر کے زینت بنی رہیں اور ان کے علم او صلاحیتوں سے نہ گھر کو فائدہ پہنچے نہ انھیں خود کو۔ پڑھی لکھی عورتوں کی حیثیت اگر گھر کے دوسرے فرنیچر کی طرح صرف دوستوں کو رشک دلانے یا اپنے میں برتری کے احساس کو ابھارنے کے لئے ہو تو ایسی تعلیم سے کیا حاصل؟"

آصف نے کہا میں تسلیم کرتا ہوں کہ عورت کو آزاد ہونا چاہیے اس کے لئے میں گاڑی کے دونوں پہیوں کی برابری سے لے کر آج کل کی رومانی محبت، رفاقت وغیرہ جیسے دلائل سے آپ حضرات کو بور کرنا نہیں چاہتا اس لئے کہ میں خود بھی ایسا بیان کرتے وقت بور ہونے لگوں گا قصہ مختصر یہ کہ... میں اپنی محبوبہ یا بیوی کو وہ رتبہ دینے کے لئے تیار ہوں جو اسے لینا آ سکتا ہے اور یہ قسم کھا کر یقین دلا سکتا ہوں آپ گواہ رہیں کہ اس کی آزادی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوگی لیکن اس کے بدلے میں مجھے یہ یقین ملنا چاہیے کہ مجھے اس کا نوکر، محافظ، یا پہرہ دار سپاہی بن کر اس کے پیچھے پیچھے نہ چلنا پڑے گا۔ اگر اسے آزادی چاہیے تو اپنی عزت اور عصمت کی حفاظت کا کام بھی اپنے ذمے لینا پڑے گا۔ پولیس کے سپاہی کے فرائض مجھ سے ادا نہ ہوں گے"

بات دل سے نکلی تھی لہذا سچی تھی۔ بیگم صاحبہ کو اگر سہیلیوں کے پاس جانا ہو تو نوکر کو ساتھ لینا کافی ہے لیکن اگر ماں کے گھر جائیں گی تو آپ چاہے ارسطو کی کتاب ہی کیوں نہ پڑھ رہے ہوں۔ پھر بھی اسے چھوڑ کر آپ کو ان کے ساتھ جانا ہی ہوگا۔ اور پھر وہاں آپ کی ایسی عزت ہوگی کہ خود تو بہنوں اور رشتہ داروں کے ساتھ گپ شپ کریں گی اور ایک دوسرے کی برائیاں کریں گی۔ آپ کو دور سے صرف قہقہے سننے میں آئیں گے۔ ایک دفعہ دل چاہے گا کہ دیکھیں بھلا کس بات پر یہ سب ہنس رہی ہیں۔ اور اگر ایسا کرتے ہوئے انھوں نے دیکھ لیا تو گھر واپس آ کر کہیں گی ——— "توبہ آپ کتنے بے شرم ہیں غیر عورتوں کو دیکھتے ہیں (آپ کی اس حرکت نے) مجھے وہاں سب کے سامنے شرمندہ کیا ہے"

اس طرح محافظ کے یہ فرائض واقعی سخت نکلے۔ میری بیوی ایک بار للّو کو لے کر بازار سے گذرتی ہوئی میری خالہ کے گھر پہنچی تھی۔ چھپا سا تھا۔ عورتیں سڑکوں پر نہیں گھوم سکتی تھیں۔ اگر کہیں ضرورتاً جائیں تو موٹر میں بیٹھ کر جلدی سے ہو آئیں یا کبھی کبھار برقعہ میں جایا کرتیں لیکن یہ تو بغیر رخ روشن چھپائے بازار سے گذر رہی تھی جب راستے میں دونوں طرف بیٹھے ہوئے لوگ اسے بڑے انہماک سے تکنے لگے تو اسے احساس ہوا کہ سارا بازار اسے ننگی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اس نے تیز قدموں سے گھبرا کر راستہ طے کرنا چاہا لیکن للّو بڑے اطمینان سے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ مارے حیا کے یہ دو منٹ اس کے لئے دو گھنٹے بن گئے۔ سارا بدن پسینے میں نہا گیا۔ واپس آئی تو کہنے لگی۔

"یہ آدمی ہیں یا بھیڑیے۔ ایسے گھورتے تھے جیسے سالم ہی نگل جائیں گے"

اس پر میں بول پڑا تھا" تم ہو بھی تو نگل جانے والی چیز" اور وہ منہ بسور کر روٹھ گئی تھی۔

اس لئے اگر انھیں آزادی کی خواہش ہے تو صاحب ضرور وہ آزاد رہیں مگر ہر وقت جتنی کر بیٹھنے اور چلنے کے لئے بھی مرد کو سہارے کی لاٹھی بنائیں۔

"قلندر کو پھر موقع مل گیا بولا۔" ما بدولت اس حد تک برداشت کرنے کو تیار ہیں کہ اگر ہماری مستقبل کی محبوبہ اپنے لئے عشق کے میدان میں آزادیٔ عمل (فریڈم آف ایکشن) کی خواستگار رہے تو ما بدولت کو یہ آزادی عطا کرنے میں) کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن جو بچے پیدا ہوں گے ان کو پالنے پوسنے کی ذمہ داری میں نصف حصہ لینا ہوگا۔

نجبور بولا" یہ ساری باتیں ہماری اخلاقی قدروں' مذہبی روایات اور قبائلی غیرت کے خلاف ہیں۔ یہ مغرب سے مستعار لئے ہوئے خیالات ہیں۔ عمل کے میدان میں مرد فطری طور پر حاسد ہوتا ہے اور ——————" اپنا مال بھی اپنا ہونا چاہیے" کے جذبات کے تحت کام کرتا ہے۔"

رحیم نے کہنا شروع کیا" ہم اپنے موضوع سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ انسان اپنا عمل حقائق کے مطابق رکھتا ہے اور اصول صرف حقیقتوں کو سمجھانے اور ان پر روشنی ڈالنے میں ہی معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہم میں سے کونسا ایسا ہے جو دل میں بے شمار تمنائیں پیدا ہونے کے بعد عملی طور پر انھیں پورا دیکھنے کے لئے) بھی کچھ کرسکتا ہے انسان کو فوراً گھبرانا نہیں چاہیے۔ بلکہ جس بات کو وہ صحیح مان لے اس پر عمل کرنے کی بھی کوشش کرنی چاہیے ہم سب کسی نہ کسی درجے تک عورتوں کی آزادی کے قائل ہیں لیکن ایسے کتنے لوگ ہیں جو اپنے خیالات پر کاربند ہیں۔ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو اپنی کسی رشتہ دار خاتون کو اپنے عزیز ترین اور .... شریف دوست کے ساتھ بے تکلف ہونے کی اجازت دے سکتے ہیں عورتوں پر اعتبار کرنا انھیں آزادی دینے کی طرف پہلا قدم ہوگا۔ اگر ان پر یہ اعتبار نہ کیا جائے گا تو وہ کسی حد تک مغلوب رہیں گی لیکن آزاد ہونے کے بعد اپنی مرضی سے عمل پیرا ہونے کا انھیں بنیادی حق حاصل ہوگا۔

چائے آئی اور بحث سمٹ کر پھر تیز ہوتی گئی۔ عباس کے گھر سے اٹھ کر بے تکلف دوستوں کی یہ جماعت ہوٹل میں جا بیٹھی اور آخر کار آدھی رات کو وہاں سے اٹھی اور وہ بھی جب ہوٹل والے نے دروازے بند کرنے شروع کئے (سب لوگ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے) میں نے بھی گھر واپس آکر دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے دروازہ تو کھولا لیکن میری طرف کچھ انداز سے دیکھا کہہ رہی ہو۔

"تمھیں گھر بار کی کیا پرواہ! تمھیں تو اپنے دوست ہی عزیز ہیں!"

میں نے خاموشی سے کپڑے بدلے۔ وہ ایک طرف کھڑی آنسو بہانے لگی اور پھر سسکیاں بھرنے لگی۔ اور پھر اچانک ہی بولی "تم نے شادی کیوں کی تھی۔ اگر میرا یہ حال کرنا تھا۔ میرا نہیں تو گلّو کا تو خیال کیا ہوتا بے چارہ رو رو کر سو رہا ہے۔"

اب مجھے یاد آیا کہ میں نے اس سے سینما دکھانے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے کہنا چاہا میں بھول گیا تھا لیکن مجھے یہ کہنے کی ہمت ہی نہ تھی اس لئے کہ یہ جملہ کئی بار کام آچکا تھا۔ اس نے برسنا چاہا میں بستر کی طرف جانے لگا۔ تو وہ چڑ کر بولی۔!

"تم کو یہ کیا ہو گیا ہے اب بات بھی نہیں کرتے۔"

میں اسے خوش کرنے کی خاطر بولا۔ "کیا کہوں میری جان وہی پرانے حال ہیں۔"

اس پر اس نے آنکھیں اٹھا کر مجھے گھور کر دیکھا اور ایک سرد آہ بھر کر کہنے لگی۔ "کون جانے بہار کب آئے۔"؟

آنسو بھرے نینوں کو اس نے میری اشک ..... آلودہ آنکھوں میں اتارنا چاہا اور بڑے درد سے بولی۔!

"تم کیوں روتے ہو ——" اور یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنے سینے میں سمیٹ لیا جیسے میں بھی اس کا گلّو تھا۔

(شمارہ ۱۱۰ سنہ ۶۰ء)

نوتیج

تیرتی ہوئی ناؤ

(پنجابی کہانی)

گیت ابھی ابھی ختم ہوا تھا۔ اور گیت کی مہک رات کی رانی کی طرح کمرے میں بسی ہوئی تھی۔ ہم سب الزکھے سرور
کی حالت میں اندر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کس قدر دل فریب آواز تھی۔
ہنسی کی ایک مدھم سی جھنک سنائی دی! ہنسی، جیسے چاندی کے کئی چھوٹے چھوٹے گھنگھرو بج اٹھے ہوں۔ اندرا نے
اندر کی طرف دیکھ کر کہا۔ "والی میرا سب سے اچھا گیت ہے۔" اور وہ اپنی بیٹی کو اٹھا لائی ــــ "میرا گیت ــــ گیت نے ڈالی"
"سچ مچ یہ گیتوں کا گیت ہے۔" پروفیسر دیو نے بے بی کو اندرا سے لیتے ہوئے کہا ــــ شاید انھیں کسی کتاب کا
نام یاد آگیا تھا لمحہ بھر کے بعد بڑی سنجیدگی کے ساتھ انھوں نے کہا۔ "ہمارے بچپن میں سورگ ہمارے اردگرد ہوتا ہے۔"
اور پھر کلچر کی ایک نمائش سی شروع ہوگئی۔ ایک پروفیسر، ایک فوجی افسر اور ایک بیوپاری کتابوں میں پڑھے
ہوتے فقروں کو اپنا بنا بنا کر بولنے لگے۔
ایک نے کہا۔ "بچپن میں ہی آدمی کی آئندہ زندگی کی جھلک مل جاتی ہے جس طرح پو پھٹتے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ دن
کس طرح کا ہوگا اور کسی نے کہا۔ "کہتے ہیں بھگوان مندر کے قریب کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر پجاری کو بھول گیا تھا" اندراجی
ان بچوں میں اپنی بے بی ضرور ہوگی۔
اتنے میں ایک چھوٹی سی آیا اندر آئی۔ "سب سے اچھے گیت کی کھلائی" ــــ بی بی جی، بے بی کی فیڈ کا وقت ہوگیا
ہے ــــ" چودہ برس کی کالی کلوٹی۔ دبلی پتلی اس لڑکی کی طرف پروفیسر، فوجی افسر اور بیوپاری تینوں دیکھنے لگے۔ میں بھی
دیکھ رہا تھا اس کی کالی سیاہ اور سوکھی ہوئی باہیں۔ بے بی کی گلابی فراک پر دو خراشوں کی مانند معلوم ہوتی تھیں
اس کا دوشیزگی کی طرف بڑھتا ہوا چہرہ آٹھ ماہ کی تھل تھل بے بی کے چہرے سے چھوٹا دکھائی دیتا تھا۔ معلوم ہوتا
تھا کہ بے بی اور اس کی کھلائی دو الگ الگ قسم کے جاندار تھے۔ اندرا سے بے بی کو لے کر وہ چلی گئی۔
بیوپاری نے کہا۔ آپ نے یہ تو خوب نظر بٹو رکھ چھوڑا ہے؟

پروفیسر بولا ۔ بچے کی زندگی پر ماحول کا بڑا گہرا اثر پڑتا ہے ۔ خیال رکھیئے کہیں آپ کی بچی کا اتنا اچھا رنگ سیاہ نہ پڑ جائے ۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ کھلائی اپنے چہرے سے بھی بڑے پھولوں سے کڑھے ہوئے پردے کے پیچھے سے یہ سب کچھ سن رہی تھی ۔

پروفیسر نے پھر کہا ۔ یقیناً ۔۔ اگر آپ کی آیا ایسے بچے مندر کے باہر کھیل رہے ہوتے تو بھگوان پجاری کو کبھی نہ بھولتا ۔

کمرے میں سے گیت کی مہک اڑ چکی تھی ۔ اور چاروں طرف ایک بدبو سی چھا گئی ۔ میں نے کوئی بہانہ بنا کر اجازت مانگی اور باہر نکل گیا ۔

لیکن اس آیا کا سایہ بھی جیسے میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا اور صرف وہی آیا ہی نہیں، اس ایسے کئی بچے میرے پیچھے پیچھے آرہے تھے اور اس طرح نہیں جیسے چاندی کے گھنگھرو بج اٹھتے ہیں ۔ بلکہ اس طرح جیسے بغیر چپوؤں کی کوئی ناؤ منجھدار میں کھڑپ کھڑپ کرتی ہے ۔ ان میں سے کئی ایک کو میں پہچانتا تھا ۔ زندگی کے راستوں پر مختلف مقامات پر کبھی نہ کبھی وہ مجھے ملے تھے ۔

وہ پریتو تھی ! اس کے باپ نے ایک فوجی افسر کے گھر میں اسے کھلائی رکھا دیا تھا " سردار جی جیسے تیسے آپ کے ٹکڑوں پر پل جائے گی "

پریتو کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس وقت اس کی کیا عمر تھی ۔ جب وہ اپنے گھر کے لئے کمانے لگی تھی ۔ اس کے مالک سردار جی اور بی بی جی بڑے اچھے تھے خود ہی ہر ماہ اس کے باپ کو منی آرڈر کے ذریعے روپے بھیج دیتے تھے ۔ اس کے سردار کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا ۔ جالندھر، پونا، مدراس، بمبئی، سری نگر ۔۔ اور وہ بھی ان کے ساتھ ان جگہوں کو دیکھ آئی تھی ان شہروں کی کوئی بات شاید اُسے یاد ہو لیکن اپنے گاؤں کی ہر چیز فراموش ہوتی جا رہی تھی سوائے اس کے کہ اس کے گاؤں کے باہر ایک بڑا سا جوہڑ تھا اور اس جوہڑ کے قریب ایک ٹوٹا ہوا چھکڑا پڑا تھا جوہڑ اور ٹوٹا ہوا چھکڑا ۔ اور بس اس کے علاوہ اسے کچھ یاد نہ تھا ۔ سہیلیوں کے ساتھ گھر گھر کد کڑے لگانا ۔ گڈی گڈے کا بیاہ، مٹی کے کھلونے، آنکھ مچولی، گیند کا اُچھالنا اسے کچھ بھی تو یاد نہ رہا تھا ۔

اپنی ماں کی بھی اُسے بڑی دھندلی سی یاد تھی ۔ ہاں ماں کی ایک بات اسے اچھی طرح یاد تھی ۔ اس کا باپ کچھ دنوں سے علیل تھا ۔ ماں نے اس کے لئے دودھ چولھے پر رکھا ہوا تھا ۔ پریتو دودھ کے لئے مچلنے لگی تو ماں نے کہا تھا " لڑکیاں دودھ نہیں پیتیں ۔۔۔ خبردار اگر کبھی تو نے دودھ کو منہ لگایا ۔ تیرے پیٹ میں سوجن ہو جائے گی اور تو مر جائے گی ۔۔۔ اور وہ آج تک دودھ پینے کی جرأت نہ کر سکی تھی ۔ اس کی بی بی نے اُسے کئی بار دودھ دیا، لیکن وہ پی نہ سکی، حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہ خود ہر روز بے بی کو دودھ پلاتی تھی ۔ اور اسے کبھی سوجن نہ ہوتی تھی ۔

ایک بار پریتو کے سردار کی تبدیلی اس کے گاؤں کے قریب کے شہر میں ہو گئی ۔ پریتو بہت خوش ہوئی ۔ اس کی بی بی نے اسے اکثر موقعوں پر کئی چیزیں دی تھیں، پرانے کپڑے، پرانے کھلونے ۔ ربن اور کئی کچھ اور ۔ اُس نے ان سب چیزوں کو نئے سرے سے بڑے چاؤ کے ساتھ اپنے ٹرنک میں جوڑا ۔ اپنی ماں کے لئے، اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے لئے

جنھیں اس نے دیکھا تک نہ تھا۔

اور جب ٹرنک کو اٹھائے ہوئے فوجی ٹرک میں سے اپنے گاؤں اُتری تو جیسے اُسے پر لگ گئے تھے۔ سامنے اس کے گاؤں کا جوہڑ سوکھا پڑا تھا۔ اور وہاں وہ لوٹا ہوا چھکڑا بھی موجود نہیں تھا۔ اُس کے گھر کو جاتی ہوئی گلی کی تنہا نشانی! چاؤ کے پر جیسے سکّے سے لد گئے۔ وہ اپنا گھر بھول گئی تھی۔ اپنا گھر۔ شیریں گھر۔ گھر جس کے بارے میں لوگ گیت گاتے ہیں جس کے سُکھوں کو بلخ اور بخارے سے بھی زیادہ کہا جاتا ہے۔

گاؤں کی لڑکیاں کھل کھلا کر ہنسنے لگیں۔ جب اُس نے بڑی معصومیت کے ساتھ ان سے پوچھا "اری لڑکیو! میرا گھر کہاں ہے —— میں ہرناموں کی بیٹی ہوں، اور وہ کون میرے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔ میرے بچپن کا ہم جماعت بشیر، وہ بہت خوبصورت گیت گایا کرتا تھا "کنکاں[1] دیاں فصلاں پکیاں نے"—— جب اسکول میں کوئی افسر آنے والا ہوتا تو استاد اُسے —" لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" یا کوئی اور خدا کی حمد یا افسر کی تعریف کے گیت رٹا دیتے تھے۔ لیکن یہ گیت گاتے ہوئے اُسے خوشی بالکل نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ جب کبھی اسے اس طرح کا گیت گانا پڑتا تھا اسے نئے کپڑے سلانے پڑتے تھے۔ اور اپنے باپ کی پگڑی کو نئے سرے سے رنگا کر باندھنا پڑتا تھا کبھی گلابی، کبھی بسنتی، تقریباً ہر بار نیا رنگ، وہ میرا گہرا دوست تھا۔ اور میں نے اُسے ایک رنگ برنگا گیند بطور نشانی دیا تھا۔

ایک دن وہ اسکول نہ آیا۔ پھر دوسرے دن بھی نہ آیا۔ اور پھر کبھی نہ آیا۔ میں اُداس ہو گیا، اس کے گاؤں پہنچا۔ باہر چراگاہ میں وہ ایک بھینس چرا رہا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا:-

"ارے بشیر اب تم اسکول کیوں نہیں آتے؟"

اور اُس نے جواب دیا" میرے باپ نے بھینس خرید لی ہے"

اس وقت اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔" باپ نے بھینس خرید لی ہے؟" میری دنیا میں بھینس کا تعلق صرف دودھ اور لسی کے ساتھ ہے۔ لیکن اس بھینس کا تعلق اسکول سے اُٹھ جانے اور دوستوں سے جدا ہو جانے سے تھا۔ اسے اس بھینس کا دودھ کبھی نہ پینے کو ملتا بلکہ اُس کے باپ کو گھر کے گذارے کے لئے سارا دودھ ٹھیکیدار کے پاس فروخت کرنا پڑتا تھا۔

بشیر۔ میرے پیچھے پیچھے ان بچوں کے ساتھ بھاگا آرہا تھا۔ بشیر جسے میں نے خوبصورت رنگوں والا گیند دیا تھا لیکن گیند کے ساتھ کھیلنے کی فرصت نہ دے سکتا تھا۔

—— اور وہ تھا سولہ ایک برس کا لڑکا جو ہمارے شہر میں آلو چنے کا چھیبا لگاتا ہے اور اس کی آمدنی سے اپنی اندھی ماں اور ایک چھوٹے بھائی کا پیٹ پالتا ہے۔ نہ جانے اُس کی ماں اپنی تاریک زندگی کے اس تنہا اُجالے کو پیار کے ساتھ کس نام سے پکارتی تھی، لیکن ہمارے شہر میں سب اُسے کالو کہتے ہیں۔

کالو اسکول کے باہر چنے بیچتا ہے۔ جب آدھی چھٹی کے وقت لڑکے اس کے پاس سے چنے لینے آتے ہیں۔ لڑکے

---

[1] گندم کی فصل پک چکی ہے۔

لو تیج

جن کی آنکھوں میں کھیل کا خمار ہوتا ہے تو کالو باوجود کوشش کے یاد نہیں کر پاتا کہ کبھی اُس نے بھی جی بھر کے کھیلا ہے۔ کبھی اُس کے ہاتھ نے گلی کو پُر لطف اُچھالا دیا ہے۔ کبھی ملائم اور چمک دار کانچ کی گولیاں اُس نے ہاتھوں میں لے کر دیکھی ہیں، کبھی وہ گیند سے کھیلا ہے۔

کتنے ہی برسوں سے کالو چنے بیچ رہا ہے۔ جی بھر کے نیند لئے بھی اُسے مدتیں گذر چکی ہیں۔ منہ اندھیرے اُٹھ کر اُسے اپنی اندھی ماں کی مدد سے چنے بنانے پڑتے ہیں۔ چھیبا تیار کرنا پڑتا ہے اور پھر سارا دن ان کی بکری کے لئے مارے مارے پھرنا پڑتا ہے۔ شام کو بکری گن کر اگلے دن کے لئے سودا خریدنا پڑتا ہے۔

کالو جب دوسرے بچوں کو گاتے ہوئے سنتا ہے تو اُس کے کانوں کو ایک نا معلوم قسم کا وہم ہوتا ہے شاید اُس نے بھی کبھی گیت گایا ہو۔ لیکن اُس کے کانوں نے صرف اپنے آلو اور چنے کے گرم ہونے کی آوازیں ہی سُنی ہیں۔

اور جب اسکول کے بچے اس سے چنے لیتے ہوئے آپس میں پڑھائی کی حساب اور سائنس کی تاریخ اور جغرافیہ کی باتیں کرتے ہیں تو اسے لمحہ بھر کے لئے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے وہ کسی انجانے دیس کی پری کی کہانی سنا رہے ہوں۔

اور وہ لڑکی ——— اسے میں نے ہندوستان کے دارالحکومت دہلی کے سب سے بڑے بازار میں بارہا دیکھا ہے۔ سردی، گرمی ——— بارہ مہینے ایک ہی سے کپڑے پہنتی ہے۔ اور یہ گیارہ برس کی لڑکی سردی کے دنوں میں گرم کوٹوں سے بھری ہوئی دکانوں کے سامنے اخبار بیچتی نظر آتی ہے، بھوک نے کھُرچ کھُرچ کر اس کے چہرے پر اپنے لئے گھونسلا بنا لیا ہے۔ پُر رونق ہوٹلوں کے سامنے اس کے معصوم گلے میں سے نکلی ہوئی اخبار بیچنے کی صدا اکثر لوگوں نے سُنی ہے۔

یہ اخبار بیچنے والی لڑکی خود اخبار نہیں پڑھ سکتی۔ خود یہ قاعدہ بھی نہیں پڑھ سکتی، اس کا ذہن الفاظ کی روشنی سے محروم ہے کبھی گیت اور کہانیاں پڑھ کر خوشیوں سے معمور نہیں ہوا۔ ہر روز اخبار بیچنے کے لئے بلند آوازیں دے دے کر اس کی آواز اس کی عمر کے لحاظ سے کہیں بھاری اور کھردری ہو گئی ہے اس کے چہرے پر بچپن کی جھلک تک نہیں ملتی۔ لیکن اس کا ڈیل ڈول، ہمیشہ بچوں ایسا ہی رہے گا۔ بچپن میں خوراک کی کمی کے باعث اس کا بڑھنا بہت حد تک رُک چکا ہے اور دوشیزگی کا نکھار اسے کبھی نصیب نہ ہو گا۔

اور یہ لڑکی ہر روز اخبار بیچتی ہے وہ اخبار جن میں ہمارے رہنماؤں کی تقریریں شائع ہوتی ہیں کہ روحوں کی امیری سب سے بڑی امیری ہے۔ اخبار جن میں دولت اور خوش حالی کی گرمی سے سرمست عورتوں، مردوں کے ہجوموں میں بیٹھے ہوئے لیڈروں کی تصاویر ہوتی ہیں۔

اور وہ تھا ایک بہاری لڑکا: راجو! کلکتہ کے ایک چوراہے پر اس نے میرے بوٹ پالش کئے تھے اسی طرح کے لڑکوں کی وہاں ہر چوراہے پر بھیڑ سی لگی رہتی ہے اور اس شہر میں ایسے کتنے ہی چوراہے تھے، ان تمام لڑکوں کے لئے زندگی میلے بوٹ میں سمٹ کر رہ گئی تھی ——— ہجوم کے ہجوم گذر جاتے تھے ——— اور وہ ٹانگوں سے اوپر کبھی کچھ بھی نہ دیکھتے۔ صرف بوٹوں کی طرف دیکھتے اور انھیں میلا دیکھ کر آوازیں دیتے اور اپنی قسمت کا انتظار کرتے۔

SRINAGAR ACC. NO. 15227

بوٹ پالش کرتے ہوئے راموجس طرح لوٹتے ہوئے برش سے پالش لگاتا تھا۔جس طرح چمکانے کے لئے بوٹوں پر کپڑا رگڑتا تھا۔اس سے سرمایہ دار شہر کی زندگی کی مشینی حرکت واضح ہوتی تھی لیکن پھر بھی اس کی ادا میں ایک ہنر تھا۔قید کئے ہوئے کھیل تھے۔ایک مقید ناچ کا تال تھا۔ جیسے ہنر، کھیل، ناچ ہر چیز کو پیسے کی بادشاہی نے ایک بوٹ میں جکڑ دیا تھا اور اوپر قانون کے تسمے باندھ دیتے تھے۔

اس طرح کے بچوں کی ایک فوج میرے پیچھے پیچھے آرہی تھی! وہ جو لدھیانہ میں رات کے دو بجے مجھے رکشہ چلاتے ہوئے ملا تھا۔ اس کے پاؤں پیڈل تک نہیں پہنچتے تھے، اور اسے کبھی ایک اور کبھی دوسرے پاؤں پر جھکنا پڑتا تھا، اس نے ہنس کر کہا تھا ۔ " نہ جانے کسے سوجھی ہے ۔ چھومنتر کر کے انسانوں کو گدھے بنا کر سڑکوں پر پھینک دیا ہے۔ جاؤ کمبخت، رکشا کے آگے جُھک جاؤ۔" اور کئی اور تھے جو سیلن بھری کوٹھریوں میں چڑیاں اور گیند بٹن اور بیڑیاں بناتے تھے۔ منہ پر سیاہی ہاتھ میں لئے ہوئے روٹی کے ڈبے پر سیاہی، چھاپہ خانے میں ٹاٹ سے نجات پا کر باہر نکلتے ہوئے۔

لیکن یہ تو میرا پیچھا ہی نہ چھوڑ رہا تھا، آگے ہی بڑھتا چلا آرہا تھا۔اور میں اب بھی سہم سا گیا۔کہیں اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے مجھے کوئی دیکھ نہ لے، بالکل وہی خوف مجھ پر پھر سے طاری ہو گیا۔ جیسے ایک بار پہلے ہوا تھا جب رات کے دس بجے کلکتے کی چورنگی میں وہ مجھے ملا تھا۔

"صاحب ۔ اُس نے مجھے پیچھے سے آواز دی تھی ۔ میں حیران تھا۔ چودہ برس کا ایک لڑکا، چمکیلے اور سنورے ہوئے پٹوں والا مجھے کیوں بُلا رہا ہے ۔

" صاحب ـــــــ"

میں اُسے جانتا نہ تھا لیکن میرے رُک جانے سے وہ میرے قریب آگیا۔

"صاحب تفریح کو چلیں گے ۔بہت عمدہ مال ہے ـــ ہر قسم ـــ"

چودہ برس کا وہ معصوم لڑکا مجھ سے کہہ رہا تھا۔ اس کے پان سے رنگے ہوئے ہونٹوں پر ایک پر اسرار کیفیت تھی۔

چورنگی میں "ماڈرن بتیوں" میں رنگ برنگے کاروباری پیغامات جل بجھ رہے تھے :

" آؤ ہم فرپو میں کھانا کھائیں" ہر وقت چائے کا وقت ہے :" پلیئرز سگریٹ سب سے بہترین سگریٹ ہیں

اور ان ماڈرن بتیوں کے جلنے بجھنے کی طرح کلکتے کے! بین الاقوامی شہر میں وہ لڑکا مجھ سے کہے جا رہا تھا، بنگالی پنجابی یوربین، اینگلو انڈین، چینی، برمی، اسٹوڈنٹ، پرائیویٹ ـــ ہر قسم کی چیز ہے، چلئے صاحب ۔بغل میں بٹھا کر دیکھئے ـــــ ایک دم جوان ـــــ"

اور مجھ پر لرزہ سا طاری ہو گیا تھا ۔ یہ لڑکا جو میرے چھوٹے بھائی کی عمر کا تھا، زندگی میں یہ اپنی ماں اپنی بہن کی آنکھوں میں کس طرح نظر آسکیں گے ۔کسی کے ہونٹوں سے شیریں محبت چکھ کر اسے کس طرح محسوس ہوگا کہ یہ خود ہی عظیم خدا ہے ـــــ اور معصوم مہکتا ہوا پھول کسی کے بالوں میں ٹانکنے کے لئے ـــــ اور اس کا

سارا وجود ایک گیت بن گیا ہے۔ کسی دوسرے کے کانوں کے لئے ـــ اور وہ اُبلتا سمندر ہے۔

اُس نے مجھے بتایا کہ اس کا باپ جہاز میں ملازم تھا۔ پہلی جنگِ عظیم میں اُس کے جہاز پر بم گرا اور وہ ڈوب کر مر گیا۔ اس کی بوڑھی ماں ہے، ایک چھوٹا بھائی ہے اور گھر کا سارا بوجھ اس کے کندھوں پر ہے۔ "صاحب چوری کریں تو قید کا ڈر ہے اس دھندے میں تو کبھی کبھار کوئی سنتری پیٹ کر ہی خلاصی کر دیتا ہے۔ میں نے ماں کو بتایا ہے ـ میں بزنس کرتا ہوں، ایک دوست کی دکان پر شام سے رات تک بیٹھتا ہوں" اور میرے چھوٹے بھائی کی عمر اتنے لڑکے کے چہرے پر کچھ ایسی خودستائی عود کر آئی جو کافی عمر میں پہنچنے پر ہی آ سکتی ہے، "میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو پڑھنے بٹھا رکھا ہے، اسے کسی اچھے دھندے میں لگاؤں گا۔ صاحب درزی کا کام کیسا ہے؟"

اور وہ چلا گیا۔ اسے کچھ فاصلے پر گورے جہازیوں کی ایک ٹولی نظر آ گئی تھی۔

ماڈرن بتیاں اُسی طرح جل بجھ رہی تھیں۔ کل چورنگی کے میدان میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا تھا۔ ایک مزدور نے کہا "وہ دیکھو مزدوروں کا خون جل رہا ہے" اور جلسہ میں بیٹھے ہوئے ایک لاکھ لوگ زخم خوردہ سے ان بتیوں کی طرف دیکھنے لگے تھے، ہر روز وہ انھیں دھوکہ دیتی رہی تھیں۔ ایک مقناطیسی کشش کی طرح ان کی جیبوں میں سے پیسے کھینچتی رہی تھیں، لیکن آج اُنھوں نے ایک بالکل نئی چیز کی طرح ان کی طرف دیکھا، اس مزدور نے کس طرح بڑے حلم کے ساتھ کہا تھا۔ کوئی لفظی قلابازی نہیں۔ رحم کی کوئی التجا نہیں۔ ایک للکار تھی زندگی اپنے حقوق چھیننے کے لئے اٹھی تھی، دو لاکھ آنکھوں کے انگارے اس للکار کے پیچھے تھے ان کی آگ میں زندگی کو تپایا جا رہا تھا۔ یہ آنکھیں سارے ہندوستان کی نمائندہ تھیں اور ساری دنیا کی کروڑوں ایسی دہکتی ہوئی آنکھیں ان کے ساتھ تھیں۔ ان آنکھوں کے پیچھے سپنے لٹک رہے تھے۔ ان کروڑوں سپنوں کو جوڑ کر نئی تپتی ہوئی دنیا کے لئے ایک عظیم سانچا بنایا جا رہا تھا۔

آ جاؤ اے کالی آیا۔ پردے پر کڑھے ہوئے پھولوں سے بھی چھوٹے چہرے والی! آؤ پرتیو، دودھ سے خوف زدہ پریتو! تم جو اپنا گھر بھول گئی ہو، آؤ میرے ہم جماعت بشیر! تیرے دل کے کسی کونے میں اب بھی وہ رنگین گیند ساکت پڑا ہو گا۔ آؤ کالو اپنی اندھی ماں کی آنکھوں کے نور! آؤ اے اخبار بیچنے والی لڑکی، الفاظ کے نور سے محروم ـ تم جس کے چہرے پر بھوک نے آشیانہ بنا رکھا ہے۔ تم رامو۔ جس کے کھیل، ہنر اور ناچ کو ایک میلے بوٹ نے جکڑ رکھا ہے۔ اور تم اے پان سے رنگے ہوئے ہونٹوں والے! چورنگی میں اچھے دھندے کی حسرت لئے بنگالی پنجابی۔ یوروپین، ایک دم نوجوان کے کاروبار کے معصوم اشتہار۔ اور تم سب جو ان کنکر پتھروں کی طرح اس زندگی کے پہاڑ پر سے لڑھک رہے ہو۔ آؤ سب اس زندگی کو تپا کر سپنوں کے سانچے میں ڈھالنے والوں کے ساتھ مل جائیں اور اپنی آنکھوں کے انگارے ان کی آنکھوں کے انگاروں میں شامل کر دیں۔ تاکہ تمھارا بھی کوئی گھر ہو سکے، کوئی یادوں کا مسکن ہو سکے۔ ان گنت رنگ برنگے گیندوں سے کھیلا جا سکے۔ بھینسوں کے تھن تمھیں دودھ پلا سکیں۔ تم بھی تاریخ، جغرافیہ، سائنس اور حساب کے پریدیسوں میں قدم رکھ سکو۔ کسی کی آنکھوں میں آشیانہ اور آسمان ڈھونڈ سکو ــ!

(شمارہ ۲۷ سنہ ۵۳ء)

سردار خاں فنا

ترجمہ

یونس قیاسی

پُل پُختہ

(پشتو کہانی)

تاریک رات کی خاموشی میں جب نیفو کوٹوالی سے ہوتا ہوا چوک آبریشم گراں تک پہنچا تو گھنٹہ گھر نے تین بجائے۔

"حد ہو گئی۔ ابھی صرف تین بجے ہیں۔ تبھی تو یہ لوگ اب تک سوئے پڑے ہیں۔" نیفو نے چونک کر آبریشم گراں کے وسیع اور اجڑے ہوئے خاموش میدان میں بے سدھ پڑے ہوئے بھکاریوں اور مزدوروں پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔

"تین بجے تو رات کا پچھلا پہر ہوتا ہے۔ لیکن چائے والا بابا تو کہتا ہے کہ میں تم لوگوں کی خاطر رات کے پچھلے پہر اٹھتا ہوں ...... تو پھر؟ ——" نیفو نے اپنا سر کھجایا۔

"چائے کی ایک پیالی تو پی لیتا اس سے۔ تب مزدوری کرنے کے لئے تازہ دم ہو جاتا۔" نیفو نے زمین پر بنائے ہوئے چائے والے بابا کے اُس چولھے کی جانب دیکھا۔ جس کی کچی اینٹیں اب بکھری ہوئی پڑی تھیں۔ اور آوارہ کتے انھیں سونگھ سونگھ کر مست ہو رہے تھے۔

"ہشت ...... کتے ...... ان چولھوں میں کیا ڈھونڈ رہے ہو۔ یہاں تو گڑ کی چائے پکتی تب۔ اور کبھی کبھی اوجھڑی بھی —— نہ کہ پلاؤ اور قورمہ۔ جاؤ کہیں ان چولھوں کو سونگھو جہاں مرغن غذائیں پکتی ہیں۔" پھر نہ جانے کیوں اُس نے ایک اینٹ اٹھا کر کتے کو دے ماری۔ کتا چلانے لگا۔ اور پھر گرد و نواح سے دوسرے کئی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

---

[1] پُل پختہ پشاور شہر میں گھنٹہ گھر کے قریب ایک ایسے بازار کا نام ہے، جہاں مزدور، مزدوری کی آس میں بیٹھے راہ گیروں کا منہ تکتے رہتے ہیں۔

"کیا کروں ---- پُل پر جاؤں ---- یا چائے والے بابا کا انتظار کروں پُل پر جانا بھی ضروری ہے کہیں پھر مزدوری ہاتھ سے چلی نہ جائے ---- کل بھی ٹھیکیدار مزدوروں کو کام پر بہت جلدی لے گیا تھا .... لیکن .... ایک پیالی چائے تو پی لیتا ---- کل سے کچھ نہیں کھایا ---- آنتیں دُکھ رہی ہیں" فیضو پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"لیکن چائے والا بابا تو ابھی تک نہیں آیا ---- وہ سوچنے لگا ---- خدا نخواستہ کہیں بیمار تو نہیں پڑ گیا وہ ---- اگر وہ بیمار پڑ بھی گیا تو اس کا نواسہ بھی تو ہے ---- یا کہیں اُسے میونسپل کمیٹی والے پکڑ کر نہ لے گئے ہوں۔ جنھوں نے پرسوں بھی ملنگ بابا کا اوجھڑی سے بھرا ہوا مٹکا سڑک پر دے مارا تھا ---- کہتے تھے اس سے بیماری پھیلتی ہے ---- ہونہہ ---- بیماری ---- ہم پہلے کب تندرست ہیں۔ اب بھی آنتیں دُکھ رہی ہیں۔ اور وہ بیماری کو روک رہے ہیں ---- بھوک کا کوئی پوچھتا تک نہیں ---- لیکن اچھی صحت کا ڈھنڈورا برابر پیٹا جا رہا ہے ---- یہاں تو کسی اچھی بھلی صحت کو خراب کرنے کے لئے ناقص غذا تک نہیں مل رہی ---- میری آنتیں دُکھ رہی ہیں ---- اور وہ کہتے ہیں بیماری پھیلتی ہے ---- بیماریاں ---- آخ تھو ---" فیضو نے تھوک کر اپنی پھٹی ہوئی چادر سے بُکل مار لی۔

فیضو کا اصل نام فیض محمد تھا ---- لیکن گاؤں کے لوگ اسے بچپن ہی سے فیضو کے نام سے پکارتے۔ پھر جب وہ بڑا ہوا تو مکمل فیضو بن گیا۔ پُل پختہ کے دوسرے مزدور تو اسے کبھی کبھی فیضو کی بجائے پیا زو کہہ دیا کرتے تھے۔ جس پر فیضو کبھی خفا نہ ہوتا۔ وہ سوچتا کہ غریب تو ہے اس قابل کہ اُسے اُس کے پورے نام سے نہ پکارا جائے۔ غریبوں کے نام تو اسی طرح ٹیڑھے میڑھے ہونے چاہئیں۔ جیسا کہ اُس کا اپنا نام ہے۔

فیضو ابھی چھ ہی مہینے کا تھا کہ اُس کا باپ فوت ہو گیا۔ اس کے معصوم چہرے پر یتیمی کے چانٹوں کے داغ ابھی تازہ تھے کہ ماں کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ اور وہ ماں باپ کی شفقت سے محروم ہو کر رہ گیا۔ فیضو کا ماموں ریدی گل گاؤں کا پُرانا چرواہا تھا ---- جو اپنی اکلوتی اور چھوٹی بچی تجر پان کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اب فیضو کا سرپرست بن گیا تھا ----

جب ریدی گل گاؤں بھر کے امیر لوگوں کے جانوروں کو چرانے کے لئے کھیتوں پر لے جاتا۔ تو کلی جیسی صورت والا فیضو اس کے ساتھ ہوتا ---- اور اس کا ہاتھ بٹاتا ---- ریدی گل جب فیضو کو ڈنڈا ہاتھ میں لئے گائے کے پیچھے دوڑتا ہوا دیکھتا تو منوں موٹا ہونے لگتا۔ اور دل ہی دل میں کہتا اس کی کمر مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔

واقعی فیضو کی جوانی ریدی گل کا سہارا بن کر اُبھری۔

لیکن اب بھی ریدی گل اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس کر رہا تھا۔

وہ دونوں جانوروں کے ہمراہ کھیتوں سے گاؤں پہنچتے۔ تو ریدی گل گاؤں کے میدان میں ٹھیر جاتا۔ اور فیضو مالکوں تک ان کے جانور پہنچانے کا کام شروع کر دیتا۔

اور پھر جب ریدی گل گھر آ جاتا تو تجر پان چائے دانی اور تنور پر پکائی ہوئی مکئی کی روٹی آگے رکھ دیتی۔ اور پیالی میں چائے ڈالتے ڈالتے دو تین مرتبہ فیضو کا بھی پوچھ لیتی۔

اس وقت ریدی گل کو یوں محسوس ہوتا، جیسے آج وہ اپنے تمام جانوروں کو کھیتوں سے گھر کا واپس لے آیا ہے

اور مالکان اسے دھتکار رہے ہوں۔

وہ تفکرات کے سمندر میں ڈوب جاتا تو تجر پان اس سے کہتی :

"کیوں بابا — ؟ کیا آج پھر تم سے کسی کی بھیڑ بکری یا بھینس گائے گم ہوگئی ہے ؟ — یا جانوروں کا ریوڑ کسی کی پکی ہوئی فصل کھا گیا ہے ؟ — بابا! — کہیں آج فیضو نے کسی سے لڑائی تو نہیں کی ؟"

ریدی گل جلدی سے نفی میں سر ہلا دیتا۔

"نہیں بیٹی ! ویسے آج میں کچھ زیادہ تھک گیا ہوں۔"

"جب فیضو ہے تو ریوڑ کے ساتھ کھیتوں پر تمھارے جانے سے فائدہ ؟"

"ہاں — اگرچہ میرا اس کے ساتھ جانا برائے نام ہی ہے ۔ پھر بھی میں اس کے ساتھ جانا ضروری سمجھتا ہوں۔ بیسیوں واقعات انسان کو پیش آسکتے ہیں ۔ ویسے ہے تو وہ بھی جوان، خدا اس کی جوانی اسے نصیب کرے ۔ ۔ ۔"

تجر پان ریدی گل کے اس دعائیہ جملے کے بعد دل ہی دل میں آمین کہہ دیتی ۔ اور پھر چائے دانی کو چولھے میں جلی ہوئی گوبر کی راکھ میں دبا کر رکھ دیتی۔

ریدی گل پھر سوچنے لگ جاتا ۔

لیکن سوچ کے یہ سلسلے جلد ہی ختم ہوگئے ۔

ریدی گل نے تجر پان کو فیضو سے بیاہ ڈالا — نہ جانے اس میں قدرت کی کون سی مصلحت تھی کہ ریدی گل نے اپنے کندھوں سے تجر پان کا بوجھ اٹھا کر فیضو کے کندھوں پر رکھتے ہی دنیا کے دکھوں اور غموں سے بھی نجات حاصل کرلی ۔

ریدی گل کی موت کے بعد فیضو اب اکیلا رہ گیا ۔ سسر کی موت کے ساتھ ہی اس کے دل میں ایک نئی خواہش اور ایک نئی تمنا نے جنم لیا۔

"ہوسکتا ہے تیرے ہاں بیٹا پیدا ہو جائے"

پھر وہ سوچتا ۔

"اگر میرے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو اس کا نام کیا رکھوں گا"

کیا نام رکھوں گا ؟

نام ——،

نام ——،

"نیاز محمد نام رکھ دوں گا اس کا —— لیکن اگر تجر پان کہے کہ بچے کا نام میرے نام سے ملتا جلتا ہونا چاہیے جیسے نیاز محمد —— ریاض محمد —— فیض محمد ...... ہونہہ —— فیضو نہیں تو فیض محمد ——" نیاز محمد" بھی "نیازو" اور "نیازے" بن سکتا ہے ۔ خیر کچھ بھی ہو — بیٹا ہو —"

پھر اسی طرح فیضو کی یہ دلی تمنا ایک سال سے دوسرے سال میں داخل ہوتی گئی — اور کچھ مدت گذر جانے کے بعد وہ پانچ بیٹیوں کا باپ بن گیا — گویا غموں کا ایک اور ہار اس نے اپنے گلے میں ڈال لیا — اب بیماری

اس کے لئے کوئی نئی آفت نہیں تھی۔

وہ غموں اور بیماریوں کی چکی میں پس کر رہ گیا۔

گاؤں کے لوگوں نے اس سے اپنے وہ جانور واپس لے لئے جنہیں چرانے کے لئے اب اُس کے جسم میں طاقت بھی باقی نہ رہی تھی ۔۔۔ اس کا سارا کام بگڑ گیا۔

اور ایسا کیوں نہ ہوتا ۔ جب کہ غربت کے علاوہ اس میں ایک دوسری بڑی کمزوری بھی موجود تھی ۔ اور اسی کمزوری کی وجہ سے گاؤں کا خان اور بڑی بی بی اس سے سخت ناراض تھیں۔

اُس کی اس کمزوری کو دور کرنے کے لئے مرحوم ریدی گل نے بھی فیضو کو کافی سمجھایا تھا ۔۔ اور اس پر یہ بات بھی واضح کر دی تھی کہ "ہم اسی خان کی تعمیر کردہ چھت کے نیچے سر چھپائے ہوئے ہیں، اسی کے کھیتوں میں جانور چراتے ہیں ۔ اور پھر وہ خان ہے اور ہم غریب ۔۔۔۔۔"

شروع میں فیضو پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا ۔۔۔ لیکن تجر پان کو اپنانے کے بعد وہ اپنے سسر کی صرف اتنی سی بات مان گیا تھا کہ اب کبھی کبھی خان کے حجرے میں چلا جایا کرتا تھا ۔ اور کسی حد تک حجرے کے جملہ آداب بھی سیکھ چکا تھا ۔ جہاں ایک ہی جست میں خان کے لئے چلم بھر کر اس کے حضور میں پیش کرنا ، اس کی موجودگی میں چارپائی پر نہ بیٹھنا وغیرہ بھی شامل تھا۔

حجرے کے یہ آداب سیکھنے پر خان اس سے قدرے خوش تو تھا لیکن بڑی بی بی تجر پان کی خدمت سے مطمئن نہیں تھیں ۔ اور اس وجہ سے فیضو کہیں اور سر چھپانے کی جگہ تلاش کرنے لگا ۔ وہ ہر مشکل جھیلنے پر رضامند تھا ۔ لیکن تجر پان کو بڑی بی بی کی خدمت کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

فیضو کے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا ۔ جب گاؤں والوں سے مٹھی بھر آٹا قرض لینے کا ذریعہ بھی نہ رہا، تو اُس نے کالے چونا گر کے مشورے پر عمارتوں میں چونا کرنے کا کام شروع کر دیا۔ چونے کی ایک بالٹی اور گھاس پھونس کی ایک جھاڑو نے اس کی گاڑی چلا ڈالی ۔

اب وہ خان کا مزدور نہ تھا ۔ پھر بھی گاؤں میں رہتے ہوئے حجرے میں حاضری دینا ضروری تھا۔

وہ کالے کے ہمراہ روزانہ صبح سویرے پُل پختہ پر پہنچ جاتا ۔۔ جہاں کبھی کام لگ جاتا، اور کبھی مسلسل کئی دنوں تک بے کار بیٹھے رہنا پڑتا ۔

کالا اُسے روزگار کے طریقے بتانے کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سے مزدوری گُر سمجھا چکا تھا۔ یعنی جب کبھی ان دونوں کو مزدوری نہ ملتی تو وہ شام کو سبزی منڈی کا رخ کرتے جہاں دن بھر کی پھینکی ہوئی باسی اور بے کار سبزیاں اور گندے فروٹ اٹھا کر بچوں کے لئے گھر لے جاتے ۔

چائے والا بابا بھی اب کالے ہی کی وجہ سے اسے پہچاننے لگا تھا ۔ جو چوک آبریشم گراں میں مزدوروں اور بھکاریوں کے لئے گڑ کی چائے بنا کر باسی روٹی کے ساتھ بیچا کرتا تھا ۔۔ جب کبھی اسے مزدوری نہ ملتی ، یا پیسے تھوڑے ملتے تو وہ چائے والے بابا کے پاس آکر آٹے کے بجائے باسی روٹیاں خرید کر لے جاتا ۔ اور ان پر گذارا کرتا۔

لیکن آخر گذارے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

آج سات دن سے کالا بیمار تھا۔ اور فیضو اکیلا مزدوری کے لئے جایا کرتا تھا۔ وہ پل پختہ پر بے کار مزدوروں کی لائن میں بیٹھ کر سارا دن راہ گیروں کے چہروں پر نظریں جمائے رکھتا، اور جب گھنٹہ گھر پر چار بج جاتے، تو وہ آہستہ سے اٹھ کر سبزی منڈی کی طرف چل دیتا۔ چائے والے بابا سے باسی روٹیاں اُدھار لیتا، اور جلدی جلدی گھر کا رُخ کرتا۔ لیکن نہ گلی سڑی سبزیوں پر گذارا ہوتا اور نہ چائے والا بابا ایک روپے سے زیادہ کی روٹیاں قرض دیتا۔

اسی طرح آج تیسرے روز سے وہ اور اُس کی بچیاں بھوکی تھیں۔

رات سوچتے سوچتے اس کی آنکھ تو لگ گئی۔ لیکن پھر فوراً ہی چھوٹی پتو کے رونے سے کھل گئی۔

"تو نے تو میری بوٹیاں نوچ ڈالیں لیکن میرے سینے میں دودھ کہاں سے آئے۔ آخر میں بھی تو انسان ہوں"

نجریاں کی یہ باتیں سُن کر فیضو کی نیند کوسوں دور بھاگ گئی۔

وہ اور چھوٹی پتو تو سو گئیں۔ لیکن فیضو ساری رات جاگتا رہا ___ سوچتا رہا ___ اور جب اسی سوچ میں کروٹیں بدل بدل کر تھک گیا تو اٹھا اور بھوکا پیاسا شہر کی جانب چل دیا۔ جب وہ تاریک رات کی خاموشی میں کوتوالی سے ہوتا ہوا چوک آبریشم گراں تک پہنچا، تو گھنٹہ گھر نے تین بجائے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چائے والے بابا کا انتظار کرے یا پُل پختہ پر جائے۔

"تیرا بیڑا غرق ہو جائے فیضو! تو یہاں چائے والے بابا کے انتظار میں بیٹھا ہے۔ اور اگر وہ ٹھیکیدار سامنے مزدوروں کو کام پر لے جائے تو ___؟" فیضو نے اپنے آپ پر غصہ کیا۔ اور پھر پل پختہ کی جانب چل دیا۔ جب وہ چوک یادگار سے گھنٹہ گھر کی جانب مڑا، تو اچانک اس کی نگاہیں گھنٹہ گھر کی بڑی بڑی سوئیوں سے ٹکرائیں۔ اور وہ گھڑیال پر بنے ہوئے ایک ایک نمبر کو گننے لگا۔

"ٹھہرو! کون ہو تم؟" ایک بھاری آواز گونجی۔

"جی ..... جی ..... جی میں ..... میں فیضو ہوں ..... فیضو" فیضو نے اپنا منہ چادر کے پلّو سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔

"فیضو کسے کہتے ہیں؟"

"جی یہ ..... یہ میرا نام ہے ..... میرا نام ....."

"کیا کرنے آئے ہو یہاں؟"

"جی ..... جی ..... جی مزدوری ___"

"مزدوری، اور اس وقت؟" شہر میں گشت کرنے والی پولیس کے سپاہی ہنسنے لگے۔

"جی نہیں" ..... ٹھیکیدار ..... صبح سویرے ....."

"لیکن تم تو چور ہو؟"

"جی ..... جی نہیں ..... مزدور ہوں"

(باقی صفحہ ۱۱۵۱ پر)

سعید تقی الدین لبنانی
ترجمہ
ضیاء الحسن موسوی

لال کتاب

(عربی کہانی)

میں نے وہسکی کا ایک گھونٹ لیا۔ ایسی ناگواری سے جیسے میں کسی "یہودی جھوٹ" پر یقین کر رہا ہوں۔ میں ہوش میں تھا جیسے کوئی عدن کے قہوہ کی لذت اپنی رگ رگ میں محسوس کر رہا ہو۔ اور نیم بیداری میں خواب دیکھ رہا ہو۔ اس کیفے میں بیٹھا ہوا۔ میں "تاریخ" سن رہا تھا۔ اور دیکھ رہا تھا۔ زندہ تاریخ۔ چلتی پھرتی حملہ آور مضحکہ خیز۔ کیف آور۔ برہنہ۔ بالکل عیاں گویا کتابوں اور کالجوں کے پروفیسروں نے جو کچھ مجھے بتایا تھا وہ سب کچھ بھی تو نہ تھا۔ کبھی تصور بھی ان مناظر اور ان مکالمات تک نہ پہنچتا۔

مجھے "منیلا" کے اس کیفے میں جنگ ہی جنگ کا نقشہ نظر آرہا تھا۔ خراب وہسکی۔۔۔۔ آبرو باختہ لڑکیاں۔ لوگوں کا شوروغوغا۔ بحری اور میدانی فوج کے سپاہی اور شہر منیلا کے شمال میں یہ کیفے اور یہ "بار" ہم وہسکی چڑھا رہے ہیں۔ لڑکیاں لوگوں کے زانو سے زانو بھڑائے ہوئے بیٹھی ہیں۔ بینڈ بج رہا ہے۔ نفیری چیخ رہی ہے۔ طبل پٹ رہا ہے۔ اور گھنگھرو جھن جھنا رہے ہیں۔ منیلا کا معرکہ درپیش ہے۔ فوجی ٹرک سپاہیوں سے لدے ہوئے گزر رہے ہیں۔ آسمان پر شکاری طیارے اڑ رہے ہیں۔ اور جاپانیوں کے فوجی مرکزوں پر بم باری کی آوازیں آرہی ہیں۔ اگر جاپانی ایک بم پھینکتے ہیں۔ تو امریکی توپوں کے دہانے ہزاروں بم اگلتے ہیں۔ اگر کوئی جنوب کی طرف کچھ دور جائے۔ تو اس کو محصور شدہ جاپانی اچھی طرح دکھائی دیں گے۔ کتوں کی سی آنکھیں۔ بندروں کے سے منہ اور حیوانوں کی سی حرکتیں یہی تو ان کا حلیہ اور ان کی صفات بیان کی جاتی ہیں۔

جب بھی بار کا دروازہ کھلتا ہے مجھے نیا منظر نظر آتا ہے۔ وہ بحری سپاہی کسی ساقی سے دھینگا مشتی کر رہا ہے۔ وہ مدہوش فوجی کسی لڑکی کو کھسوٹ رہا ہے۔ کوئی امریکی دیکائی "دوشیزہ" چیونگ گم اور لیڈی کولون کے بدلے منیلا کی چیزیں خرید رہی ہے۔ لکڑی کے جوتے۔ گلوبند۔ مونگے کے ہار۔ کوئی فوجی لوگوں کو بار بار سنائے ہوئے جنگ کے قصے سنا رہا ہے۔ یا بیہودہ قسم کے لطیفے جن کی ہر تان عورت کے جسم اور شراب کے گلاس پر ٹوٹتی ہے۔ اتنے میں ایک ہاکر تازہ اخبار بیچتا ہوا نظر آیا۔ میں نے ایک اخبار خرید لیا۔ پورا شمالی منیلا امریکی فوج کے قبضہ میں آچکا ہے مگر جاپانیوں نے بھاگتے ہوئے وہ تینوں پل تباہ کر دیئے ہیں۔ جو شہر کے شمالی حصے کو جنوب سے ملاتے تھے۔ اب صرف ایک پل رہ گیا ہے۔ وہ بھی اس لئے تباہ نہیں کیا گیا کہ پائپ لائن اس پر سے گزرتی ہے۔ اور اگر اسے تباہ کر دیا جاتا تو جنوبی شہر پانی سے محروم ہو جاتا۔ امریکی قیادت حیران ہے۔ اس لئے کہ اس پل کی تباہی سے پائپ لائن کی تباہی لازمی ہے۔ اور اس لئے بھی کہ جاپانی بڑی دلیری سے اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔ جو سپاہی مارا جاتا ہے۔ اس کی جگہ فوراً تازہ دم سپاہی آجاتا ہے۔

مگر میں ..... مجھے ان مناظر سے نہ کوئی دلچسپی تھی۔ نہ توپوں کی آواز سے میرا زہرہ آب ہو رہا تھا۔ نہ ہی اس چلتے پھرتے تاریخ کے ڈرامے کو فلسفیانہ نظروں میں سمونا چاہتا تھا۔ میری تو ساری فکر اور توجہ اور جستجو "ابراہیم جوہر" پر مرکوز تھی۔ کیا وہ بخیریت ہے .... یا .... یا وہ بات جس کا گھڑی گھڑی خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ میں نے وہسکی کا ایک اور گلاس منگوایا۔

ابراہیم پندرہ سال کا ہم پیالہ و ہم نوالہ ابراہیم۔ اس کے متعلق میرا تعلق خاطر فطری تھا ..... کچھ ہفتے پہلے تک تو ہم ساتھ ہی تھے پھر وہ سوئز کی کانوں میں چھپ گیا۔ اور میں ادھر نکل آیا۔ آج ہی پتہ چلا تھا کہ امریکی فوجوں نے سوئز کی کانوں پر قبضہ کرلیا ہے۔ اور جو غیر ملکی ہاتھ آئے۔ اور زندہ بچ رہے ہیں۔ وہ منیلا لائے جا رہے ہیں۔ واقعی کسی شخص سے اپنا لگاؤ اس وقت تک صحیح طور پر معلوم نہیں ہوتا۔ جب تک کہ وہ گم نہ ہوجائے۔ یا کم از کم کوئی ایسا اندیشہ نہ پیدا ہوجائے میں کرسی چھوڑ کر سیدھا فوجی گارڈ تک پہنچا۔ جو شہر کے اس پار قائم کیا گیا تھا۔

"وہ لوگ جو بچائے گئے ہیں کب تک یہاں پہنچ رہے ہیں؟"

"اب کی اگر تم نے پھر یہ سوال کیا۔ تو میں تمہیں شوٹ کردوں گا۔" سپاہی نے ٹامی گن سے مجھے ڈراتے ہوئے کہا۔ پھر بولا "کتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ شام کو چھ بجے سے پہلے کوئی امید نہیں۔"

چھ بجنے میں تھوڑی دیر تھی۔ میں وہیں کھڑا ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد قافلے آتے دکھائی دیے۔ فوجی لاریاں جن کے آگے پیچھے جیپ میں فوجی سپاہی بندوقیں تانے ساتھ ساتھ تھے۔ مایوس ہو کر میں شاید تعب اور ناامیدی سے گرنے ہی والا تھا۔ کہ کسی نے میرا نام لے کر آواز دی۔ ابراہیم۔ میں خوشی سے اچھل پڑا۔ وہ ڈرائیور کے پاس بیٹھا تھا اور گہری سبز فوجی وردی پہنے ہوئے تھا۔ وہ اترا مگر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ وہ بالکل بدل چکا تھا۔ نہ اس کی آنکھوں میں وہ چمک تھی۔ نہ آواز میں سوز و دلولہ نہ انداز میں گرم جوشی۔ چند ہفتوں میں اتنی تبدیلی ——

بس ایک چیز ایسی تھی جو نہیں بدلی تھی بغل میں "لال کتاب"۔ مجانی الادب[1] جس کو وہ انجیل۔ توریت۔ زبور اور نہ معلوم کیا کیا کہا کرتا تھا ان سے ملو آپ ہیں میجر اینڈرسن — اور ہم سب بار میں داخل ہوگئے۔ مجھے کچھ ناکامی کا سا احساس ہو رہا تھا۔ مگر میں کچھ زیادہ جذباتی انسان نہیں ہوں۔ یہی کیا کم ہے کہ ابراہیم موت کے منہ سے زندہ سلامت نکل آیا تھا۔ پندرہ برس کا پرانا رفیق۔ اگر وہ بدل گیا تھا۔ تو کیا ہوا اس جنگ نے بڑے بڑے عقلمندوں کو بے وقوف بنا دیا ہے۔ جنگ ایک عالمگیر مرض۔ اب وہسکی پی جائے۔ غالباً اب اس کا مزا اچھا معلوم ہو!

ہم تینوں ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ابراہیم نے ایک لڑکی کو اشارے سے بلا لیا۔ "دیکھو اس امریکی جوان کی خبرگیری کرو۔ یہ تھکے ہوئے ہیں۔ اور بھوکے پیاسے بھی ہیں ....."

اور ہیری۔ پیارے ذرا تم مجھے تھوڑی دیر کے لئے معاف کرو تو میں اپنے اس ہم وطن سے اپنی "حبشی" زبان میں باتیں کرلوں" ابراہیم نے اپنے ساتھی سے کہا۔

اور میرا منہ کڑوا ہوگیا۔ یہ ابراہیم نے لونڈیاں بھڑانا کب سے شروع کردیا؟ اور آج وہ مجھے "ہم وطن" کہہ رہا ہے۔ حالانکہ ہمیشہ میرا تعارف کراتے ہوئے وہ کہا کرتا "میرا سب سے بڑا دشمن۔ میرا چچا زاد بھائی۔ میری سب سے بڑی مصیبت —" اور یہ "حبشی" زبان۔ حالانکہ وہ آج تک جب کبھی عربی بولتا۔ تو بڑے فخر کے ساتھ سینہ نکال کر بات کرتا تھا۔

میری دونوں آنکھوں کے بیچ میں انگلی رکھتے ہوئے بولا۔

---

[1] مجانی الادب عربی کے ادبی اور اخلاقی شہ پاروں کا انتخاب ہے۔ عربی میں اس کا مقام "گلستان سعدی" کا سا ہے۔ (مترجم)

"میں یہ کتاب جلا ڈالوں گا ــــــ تمھیں "راجی" یاد ہے ؟"

"جی ہاں ــــ یاد ہے"ــــ

اور اس کے وہ مقالات بھی یاد ہیں جو پڑھا کرتے تھے ہم تم ؟ کیا نام تھا اس کتاب کا ؟"

"شبنم اور موتی ــــ"

"بالکل ٹھیک ہے ـ تمھیں وہ یاد ہے ـ ایک جگہ اس نے لکھا تھا "عقل دراصل ٹھنڈا جنون ہے !"

"ہاں یاد ہے !"

"تو میں گزشتہ پندرہ سال سے اسی ٹھنڈے جنون میں مبتلا تھا ـ مگر اس جنگ کے برقی جھٹکوں نے مجھے اس بحران سے نکال لیا ہے ـ میں جاگ اٹھا ہوں ـ میں کتنا گدھا تھا ـ میں تجارت کرنے چلا تھا ـ اور بغل میں یہ لال کتاب دبا کے ! جس میں جنگلی اور صحرائی زندگی کی عادتوں کے علاوہ کوئی کام کی باتیں نہیں ـ وقار . . . . عزت نفس . . . . . . سخاوت . . . . . . مہمان نوازی . . . . . . عطار ، رفاقت شرافت ـ عصمت ، عفت ، اخلاق اور نہ معلوم کیا کیا فرشتوں کی دنیا کی باتیں ـ اور میں اس قانون کو اس شیطانی دنیا میں نافذ کرنے کی حماقت کرتا رہا ـ ہاں دیکھو شاید میں بھول جاؤں ـ جب تم لبنان پہنچنا تو وہ ہمارا استاد جو تھا کیا نام ہے اس کا زیدون اس کی قبر پر میری طرف سے تھوک دینا " قہقہہ لگا کے اُس نے کہا " لاؤ ایک پیگ وہسکی لاؤ " اور پھر بولنے لگا " یہ تم توپوں کی آوازیں سُن رہے ہو ؟ تم شاید یہ سمجھتے ہو گے کہ جنگ اسی کا نام ہے ـ جو تم دیکھ اور سُن رہے ہو . . . . یہ جنگ نہیں ہے ـ یہ تجارت ہے ـ جنگ ، امن ـ مذہب ـ علم یہ سب تجارت ہے ـ یہ بات مجھے میرے اس امریکن دوست نے سمجھائی ہے ـ تم اس کو پہچانتے ہو ـ تم نے اس کے سینہ پر اعزازی تمغہ دیکھا ہے ـ جو فوج میں صرف چند ہی جانبازوں کو نصیب ہوتا ہے ـ جس امریکن اخبار نے اس کی جانبازی اور بہادری کی تفصیلات شائع کی تھیں ـ اس نے اس کو ۵ ہزار ڈالر دیئے تھے ! اور اس اخبار کی اس اشاعت کی چالیس لاکھ کاپیاں فروخت ہوئی تھیں ـ ہالی وڈ نے اس کو ایک فلم کے سلسلہ میں آفر دیا ہے ـ تم جانتے ہو اس نے مجھ سے کیا کہا ہے ؟ یہ کہتا ہے کہ وہ لڑائی کے ساتھ ساتھ بزنس کرتا جاتا ہے ـ فوجی سامان فروخت کرتا ہے ـ تم اسے چوری کہو گے . . . . . . بیوقوف کہیں کے ـ تمھاری اور اس منحوس کتاب کی زبان میں اس کو چوری کہتے ہیں ـ مگر غلط ! میجر انڈرسن کہتا ہے کہ یہ بزنس ہے بزنس ـ اور میں تم سے بھی کہنا چاہتا ہوں کہ میں عقلمند ہو گیا ہوں ـ اور آج سے ابھی سے میں نے طے کر لیا ہے کہ میں بزنس کروں گا ــــ سمجھے تم ــــ ؟"

نشہ اس کے دماغ پر چھاتا جا رہا تھا ـ اس نے جیب سے دیا سلائی نکالی اور ایک تیلی جلا کر اس "لال کتاب" "مجانی الادب" کے قریب لے گیا ــــ میں نے اُچک کر کتاب چھین لی ـ ـ

"یہ تم مجھے دیدو ـ میری ساری کتابیں جل چکی ہیں ــــ ایک عربی کتاب تو میرے پاس رہے "

"اچھا ! تو آپ فرانسیسی کتابوں سے مضامین اور خیالات چرانے کا کام ختم فرما چکے ہیں ـ اور اب عربی کی پرانی کتابوں کی باری ہے ــــ کوئی بات نہیں ـ تصنیف و تالیف ، ادب ، صحافت یہ بھی تو بزنس ہے ـ اگر فوجی سامان حلال ہے ـ تو مصنفین اور اہلِ قلم کی بضاعت بھی حلال ہے ـ لیجیے یہ کتاب آپ کو عطا کی گئی "

میں ناگواری کے ساتھ تلخ جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ ایک سپاہی نے قریب آ کے سلوٹ کیا اور ایک لفافہ میجر انڈرسن کے حوالے کر دیا ـ میجر نے گود میں بیٹھی ہوئی لڑکی کو دو ڈالر دیئے ـ اور اس کو رخصت کرتے ہوئے لفافہ چاک کیا ـ

"کیا تمھارے اس دوست پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے ؟"

"بالکل بالکل!"—— ابراہیم نے سر ہلا کے جواب دیا۔ نشہ اس پر کافی اثر کر چکا تھا۔
میجر نے خط پڑھنا شروع کیا ——

"فرنٹ کمانڈر تمھاری اس تجویز سے متفق ہے۔ اس جگہ گارڈ کے قریب پانچ کشتیاں چار مسلح موٹریں اور چار سو سپاہی اور تھوڑے سے دستی بم موجود ہیں۔ فوراً حملہ شروع کر دیا جائے۔ اندھیرا ہونے سے پہلے تم اور تمھارے سپاہی حملہ شروع کر دیں۔ اس حملہ میں شرکت اختیاری ہوگی۔ اس کی اطلاع سپاہیوں کو دیدی جائے۔ جن کا انتخاب تم پر منحصر ہے۔ رات سے پہلے بڑے پل کو عبور کر لینا ضروری ہے"

میجر نے ہنستے ہوتے ابراہیم سے کہا:۔ "دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ جنرل گدھا ہے۔ دو ہفتے ہو گئے سامنے سے پل پر حملہ ہو رہا ہے۔ مگر میرا پلان ہے۔ کہ کشتیوں میں سوار ہو کے دریا کے بالائی حصے سے بہاؤ کے ساتھ ہم پل کی دوسری طرف پہنچ جائیں اور عقب سے حملہ شروع کر دیں۔ پہلے تو ہم دستی بموں سے جاپانیوں کا صفایا کر دیں گے۔ پھر جنرل صاحب کو ان کی کمپنی سمیت ملاقات کا شرف عطا کریں گے"

بل ادا کر کے ہم لوگ باہر آئے۔ میجر نے اپنی بیوی اور اپنے بچے کی تصویر ابراہیم کو دیتے ہوئے کہا:۔ "یہ میرے کیلیفورنیا کے گھر کا پتہ ہے۔ اگر میں واپس آ گیا۔ تو اس امانت کی حفاظت کے دو ہزار ڈالر۔ نہیں تو تم میری بیوی سے کہدینا کہ تم مجھ سے ملے تھے" یہ کہہ کر وہ مل کے مزدوروں کی طرح لاری میں چڑھ گیا۔ اور ہم دونوں پناہ گزینوں کے کیمپ کی طرف چل پڑے۔ میرے خیمے کا نمبر ۲۷ تھا۔ میں اور ابراہیم پہلے کیمپ کے دفتر میں گئے۔ جہاں اس نے رجسٹر میں اپنا نام و پتہ لکھا۔ اور پھر بستر وغیرہ حاصل کیا۔ اپنا کارڈ بنوایا اس کے خیمہ کا نمبر ۸۷ تھا۔ ہم دونوں وہاں پہنچے۔ ابراہیم نے اپنا سامان رکھا۔ اور پھر میرے پاس آ کر خیمہ سے باہر خاموش بیٹھ گیا۔

آپ کسی کے پاس بیٹھے ہوں۔ اور پھر یہ محسوس ہو رہا ہو۔ کہ دونوں کے بیچ میں ساری دنیا کے صحرا اور دریا حائل ہیں۔ کتنا اذیت دہ احساس ہے یہ؟ میں سوچنے لگا۔ کیا کیا بکواس کر رہا تھا ابراہیم۔ ابھی کچھ دن پہلے اچھا خاصہ معقول انسان تھا۔ مجانی الادب کے قصے پڑھ پڑھ کر ہنستا۔ یا سنجیدہ ہو کر انسانی احساسات۔ انسانی اقدار اور انسانی محبت و نفرت پر تبصرہ کرتا۔ مگر آج۔ پھر مجھے اس ہولناک جنگ کے مناظر یاد آ گئے۔ شاید یہ عارضی تبدیلی ہو۔ کسی دماغی صدمہ کا نتیجہ —— ؟ کیمپ کے لاؤڈ اسپیکر نے رات کے کھانے کی تقسیم کا اعلان کیا۔ اور میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اپنے اپنے برتن ہاتھ میں لے کر ہم دونوں طعام خانے کی طرف چل پڑے۔ اور قطار میں کھڑے ہو گئے۔ گولیوں کی سنسناہٹ اور توپوں کی گرج کی ہلکی اور تیز آوازیں برابر سنائی دے رہی تھیں کیمپ کے لاؤڈ اسپیکر سے ریکارڈ بج رہے تھے۔

تو مجھے اب بھی اسی طرح چاہتی ہے
اس اٹھتی جوانی میں بھی۔ جس طرح تو اے حسینہ
بھولے پن اور بالی عمریا میں چاہا کرتی تھی
جب تیرا سینہ بھرا نہ تھا۔
جب تیری رگوں میں بجلیوں نے اپنا آشیانہ نہ بنایا تھا

فضا میں ایک طیارہ شکن گولہ پھٹا۔ اور لاؤڈ اسپیکر سے آواز آئی۔

ذرا بانہوں میں بانہیں ڈال کے
دل لینا ہمارا سنبھال کے

رکابیوں میں کھانا لے کر ہم واپس آ گئے۔ میں اپنی خاموشی برقرار نہ رکھ سکا۔
"تم نے اس آدمی کو دیکھا۔ جو لائن میں ہمارے سامنے کھڑا تھا؟ وہ نیشنل سٹی بنک کا منیجر تھا۔ اور اس کے آگے جو چینی تھو

وہ ایک معمولی چائے خانہ میں نوکر تھا۔ سبحان اللہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ امریکی کتنے شریف آدمی ہیں۔ ایک صف میں محمود و ایاز کو کھڑا کرکے ایک ہی کیسا ناعطا کرتے ہیں۔ اپنے اس ہم وطن کو بھی جوڈالر لٹاتا ہے۔ اور اس زرد چینی کو بھی۔ جو ہفتے بھر میں ایک ڈالر کماتا ہے۔"

ابراہیم نے خوشی اور جھنجھلاہٹ کے ملے جلے انداز میں کہنا شروع کیا۔

"اچھا تمہارے وہ فرسودہ خیالات اچانک بدل گئے۔ اور اس لال کتاب کی سڑی ہوئی لاش اب تمہارے کاندھوں پر بھی بوجھ بن گئی ہے؟ تو اچھا اب سنو! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اتنے میں لاوڈ اسپیکر نے قطع کلام کردیا۔ اور ریکارڈ روک کے اناؤنسر نے بولنا شروع کردیا۔

"منیلا کے محاذ کی قیادت نے اعلان کیا ہے کہ وہ چوتھا پل جو شہر منیلا کے جنوبی حصہ اور شمالی حصہ میں واحد اتصال ہے۔ پندرہ منٹ پہلے ہماری فوجوں کے قبضہ میں آگیا ہے! اس معرکے میں ہمارے ۳۸ جانباز کام آئے۔ جن میں میجر انڈرسن بھی شامل ہیں۔ امریکی فوج کا مایۂ ناز جانباز انڈرسن اس حملہ کی قیادت کرتے ہوئے بہادری کی موت مرگیا۔ اور اپنی بہادری کے دائمی نقش چھوڑ گیا۔"

اور پھر ریکارڈ بجنے لگا۔

ذرا بانہوں میں بانہیں ڈال کے
دل لینا ہمارا سنبھال کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

رکابیاں بھری ہوئی سامنے تھیں۔ مگر جیسے ہمارے ہاتھ جکڑے ہوئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ ابراہیم نے اپنی جیب سے میجر کی بیوی اور اُس کے بچوں کی تصویر نکالی اور پرزے پرزے کرکے پھینک دی۔

"تین سال سے سالا لڑ رہا ہے۔ اور مرنے سے دو ایک گھنٹے پہلے یہ مصیبت میرے سر ڈال گیا۔ بھاڑ میں جائے اس کی بیوی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا کسی آشنا کے ساتھ بھاگ جائے ــــــ!"

اور وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اچھا ہی ہوا کہ اس وقت میرے پاس ریوالور نہیں تھا۔ ورنہ۔

کاش یہ ابراہیم واپس ہی نہ آتا۔ جہاں بہت سے لوگ سونے کی کانوں میں دب کے مرگئے یہ بھی۔ میں کم از کم اس کی یاد کے ساتھ دوستی اور شرافت کے جملے تو استعمال کرسکتا۔ کاش اب اس کی منحوس صورت کبھی نہ دکھائی دے ــــ

آخر کار جاپانیوں کو شکست ہوئی۔ توپیں خاموش ہوگئیں۔ گولیوں کی سنسناہٹ بند ہوگئی۔ اور منیلا کی سڑکوں پر ہنستے ہوئے امریکی چہرے کم نظر آنے لگے۔ گری ہوئی عمارتیں پھر سے بننا شروع ہوگئیں۔ ملبے صاف ہونے لگے۔ اور فوجیوں کی جگہ ہنستے روتے لوٹے لنگڑے شہری بازاروں میں گھومتے پھرنے لگے۔ میں خبریں اور مضمون لکھ لکھ کر بھیجتا رہا۔ اور وقتی ضرورتوں کے لئے چھوٹی موٹی تجارت بھی۔ دن بھر گھومتا پھرتا اور شام کو اپنے کمرے میں پڑ رہتا۔ ڈائری لکھتا۔ خواب دیکھتا۔ اور گنگنا لیتا۔ میں نے ابراہیم کو اپنے سمجھانے کے لئے "مردہ" تصور کرلیا تھا۔ حالانکہ کبھی کبھی اخبارات میں اس کی تصویر دکھائی پڑتی۔ دعوتوں اور پارٹیوں میں۔ ہوائی اڈوں پر ہر ایک سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑا آدمی ہوگیا ہے۔ اور ان آدمیوں میں شمار کیا جاتا ہے جن کے نام ساتھ "قوم" کا تذکرہ ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہفتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مہینے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک سال ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دو سال ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایک دن صبح کو میں ڈاک خانہ جا رہا تھا۔ ایک شاندار ہرے رنگ کی موٹر نے میرا راستہ روک لیا۔ ابراہیم اترا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ "یہ کاغذ اور تھیلا موٹر میں پھینکو اور مجھ سے لپٹ کے ایک بار یہ کہو کہ تم نے مجھے معاف کردیا۔" وہ دبلا ہوگیا تھا۔ میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ مجھے ہالی وڈ کے ایکٹروں کی طرح بالکل "ہیجڑا" نظر آیا ــ "آب رواں" کی بش شرٹ۔ شاموز جیسے کپڑے کی پتلون

نائیلون کی بنیائن اور جراب۔ تین چار رنگ کے چمڑوں کا جوتا۔ کنگن نما گھڑی جس کے ڈھکنے پر ہیروں سے E.J. (ابراہیم جوہر کے ابتدائی حروف) لکھا تھا۔

"تم نے مجھے معاف نہیں کیا ——— ؟" وہ چلایا۔ "موٹر میں گھسو۔ جلدی کرو۔ تم سے اچانک ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ میں تم کو صبح سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ مجھے تمھاری مدد کی سخت ضرورت ہے۔"

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ "مجھے پیدل چلنا ہی اچھا لگتا ہے۔ اور تم کو میری مدد کی ضرورت ہے .... میری یعنی کہ ... تم مجھ سے کہہ رہے ہو ——— ؟"

"خفا نہ ہو۔ برسو نہیں ———" اور اُس نے ڈھکیل کر مجھ کو موٹر میں بند کر دیا۔ اور موٹر اسٹارٹ کر کے ایک بلڈنگ میں پہنچا، جس پر لکھا تھا۔ "امریکن ملٹری ڈسپوزل"۔

اور اپنا بریف کیس لے کر وہ اترا۔ میں بھی ساتھ ہولیا۔ اندر جا کر معلوم ہوا کہ میرے "دوست" کے بڑے ٹھاٹ ہیں۔ بڑا رعب ہے۔ جدھر سے گزرتے ہیں۔ ادب و احترام سے سلام ہوتا ہے۔ اکثر لوگوں نے اسے "جنرل" کہہ کے پکارا

"یہ کیا حرکت ہے ——— ؟"

"بات یہ ہے کہ اس دفتر کا اعلیٰ افسر کرنل ہے۔ اور لوگ مجھے اس سے بڑا سمجھ کر "جنرل" کہتے ہیں ———"

اتنے میں ایک امریکی لڑکی آئی۔ ابراہیم نے بڑی گرم جوشی سے اس کو پیار کیا۔ "سال گرہ مبارک"۔ اور جیب سے ایک نکلس نکالا اور اُس کے گلے میں پہنا دیا۔ میں جناب کا بریف کیس تھامے رہا۔ اور آپ پیار کرتے رہے اور اس کی کمر سہلاتے رہے۔

ابراہیم کے پہنچتے ہی دفتر میں بڑی سرگرمی محسوس ہوئی۔ رجسٹر الٹنے لگے۔ کاغذات ڈھونڈے جانے لگے۔ اور ایک کمرے میں جو چینی تاجر جمع تھے۔ وہ یکے بعد دیگرے ابراہیم سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ کاغذات کا تبادلہ ہوا۔ اور یہ محسوس ہوا کہ یہاں کی دنیا ابراہیم کے گرد گھومتی ہے۔ "پچاس ہزار ڈالر ..... نہیں ساٹھ ہزار ڈالر ....." طرح طرح کی بولیاں سُن کے ہم باہر نکلے۔ ایک چینی ساتھ ساتھ آیا۔ اور موٹر میں ایک تھیلی پھینک کر کہنے لگا۔ "اچھا یہ لیجئے۔ یہ ساٹھ ہزار اور مجھے سلپ دیدیجئے"۔ ابراہیم نے ایک چھپے ہوئے کاغذ پر کچھ اندراجات کئے۔ اور دستخط کر کے کاغذ اُس کے حوالے کر دیا۔

"اچھا اب دفتر چلیں گے ———" دفتر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ شاید ابراہیم میری حیرت کو بھانپ گیا۔ "بات یہ ہے میرے دوست کہ مجھے کسی پر اعتبار نہیں۔ میں اکیلا ہی کام کرتا ہوں"۔

اس نے برقی سوئچ دبا کے روشنی کی۔ اور آہنی سیف کھولا۔ جس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ تھیلی اس میں رکھ کے سیف بند کر دیا۔ اور سارے دفتر کی کنجیاں میرے حوالے کرتے ہوئے بولا۔

"دیکھو اس شہر میں تمھارے علاوہ کسی پر مجھے بھروسہ نہیں ہے۔ کل مجھے "کوہ ایلوکوس" جانا ہے۔ چار گھنٹے موٹر میں اور بیس میل پیدل چلنا ہوگا۔ وہاں مجھے سونے کی کانوں میں اپنا حصہ لینا ہے۔ تم کو وہ آئرلینڈ والا آدمی یاد ہے۔ خدا بخشے مرتے مرتے وہ مجھے اپنے شیئر دے گیا ہے۔ میں رات کو روانہ ہوں گا اور صبح صبح وہاں پہنچ کر حد بندی کر کے ان پتھروں کی جانچ کروں گا۔ جو رقبہ مقرر کرنے کے لئے لگائے گئے ہیں۔ اور جن پر اس جانب کا نام کندہ ہے۔ مجھے وہاں بس تین دن لگیں گے۔ تم یہاں بیٹھنا لوگ میری چٹھیاں لے کر آئیں گے۔ اسی کے مطابق تم رقمیں وصول کرنا اور ادا کر دینا"۔

"مگر سیف کی کنجی تو تم نے اپنے پاس ہی رکھ لی ہے۔ میں کسی کو رقم دوں گا کہاں سے ؟"

ابراہیم نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا

"تم صبر تو کرو ۔ کل تم کو خود بخود سب معلوم ہو جائے گا ۔ سیف کھولنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی ۔ اور ہاں میرا سب کاروبار "گ ۔ ل ۔ اینڈ کمپنی کے نام سے ہے "

"گ ۔ ل ۔ اینڈ کمپنی ؟ ـــــ کیا مطلب ؟"

"تم یہ سمجھ لو کہ "گدھے لوگ اور ان کے ساتھی " خدا کے واسطے تین دن صرف تین دن میرا کاروبار سنبھال لو ۔ اس کا معاوضہ ۵ ہزار ڈالر تم کو دوں گا اور اس کے بعد تم چاہو تو ـــــ خیر پھر بات چیت ہو گی "

دوسرے دن صبح میں نے دفتر کھولا ۔ جو مقبرے کی طرح تاریک تھا ۔ میں نے ساری کھڑکیاں کھول دیں ۔ روشنی کر دی ۔ اور میز پر بیٹھ کے اخبار پڑھنے لگا ـــــ تھوڑی دیر کے بعد ایک حبشی صاحب داخل ہوئے " صبح بخیر ڈاکٹر صاحب مزاج کیسا ہے ؟"

"صاحب میں ڈاکٹر نہیں ہوں ـــــ آپ کو کس سے ملنا ہے ؟"

"میں چچا جو ہوں ۔ سلام کا جواب تو دیا کرو ۔ یہ "مخمل" "مقدس ٹڈیوں کا شوربا" اور "فرشتوں کی یخنی " لایا ہوں "

میرے ہاتھ پاؤں کپکپانے لگے ۔ اگر وہ راستہ روکے نہ کھڑا ہوتا ۔ تو شاید میں دفتر چھوڑ کر بھاگ جاتا ۔ اُس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہنے لگا ۔

"اے مبارک بھیڑ! پیتل کے ازاربندوں کا بھاؤ بڑھ گیا ہے ـــ !"

ڈر کی وجہ سے میری آواز بیٹھ گئی تھی ۔ وہ میری اجنبیت کو شاید بھانپ گیا اور بولا " تم شاید امریکہ کی تجارتی زبان سے ناواقف ہو ۔ "مخمل" جوئے کی میزوں کی آمدنی ہوتی ہے "مقدس ٹڈیوں کا شوربا" وہسکی اور "فرشتوں کی یخنی" بقیہ شرابیں ـــ پیتل کے ازاربند ہم لوگ پولیس کو کہتے ہیں ۔ لو یہ رات کی شراب فروشی اور جوئے کی آمدنی ہے ۔ پولیس کو اس کا حصہ دیدیا گیا ہے ۔ یہ کلب میں اور تمھارا مالک دونوں مل کر چلاتے ہیں "

یہ کہہ کے اس نے دونوں تھیلیاں میز پر رکھدیں ۔ اور ایک پرچہ میرے ہاتھ میں دے کے کمرے سے باہر نکل گیا ۔

پرچہ پر عربی میں یہ لکھا تھا ۔ " اس کالے سور سے کلب کی آمدنی وصول کرلو "

ابھی اس حبشی دیو کو گئے ہوئے ایک منٹ بھی نہ گزرا تھا کہ وہی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی ۔ جس کو کل ابراہیم نے چمٹا کر پیار کیا تھا ۔ اور سالگرہ کی مبارک باد دی تھی ۔ اُس نے مسکراتے ہوئے سلام کیا ۔ اور ایک پرچہ پیش کیا ۔

" اس لونڈیا کو دو سو ڈالر دیدو اور دو پیار لے لو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہو سکے تو زیادہ بھی " ابراہیم ۔

میں نے تھیلی میں سے دو سو ڈالر کے نوٹ اس کے حوالے کر دیئے ۔

"میرے لائق کوئی خدمت ؟"

"جی نہیں ۔ بہت بہت شکریہ " میں نے اسے دروازے تک پہنچا دیا ۔ وہ مڑی ۔ مگر میں اس سے پہلے ہی مڑ چکا تھا میں میز پر بیٹھ گیا ۔ اور ایک اسسٹنٹ فلم " کی طرح حیرت انگیز واقعات کا انتظار کرنے لگا ـــ میری عقل حیران تھی ۔ اتنے میں ایک امریکن ادھیڑ عمر کا اندر آیا " یہ پانچ ٹن ناقص اور ناقابل استعمال آٹے کی خرید کا آرڈر ہے " اور میرے کان میں چپکے سے کہنے لگا " شکر کی بوریاں تیار ہیں " مگر یہ تو خراب آٹے کا پرمٹ ہے ۔ اور تم شکر کی بات کر رہے ہو " میں نے حیرت سے پوچھا ۔

" ارے بھائی پرمٹ تو آٹے کا ہے ۔ مگر ہم نے معاملہ ٹھیک کر لیا ہے ۔ ڈلیوری ہو گی شکر کی "

اور ابراہیم کی ایک چٹ اُس نے میرے ہاتھ میں پکڑا دی ۔

"اس پرمٹ کو اپنے پاس رکھو ۲۸۲ نمبر کو ٹیلی فون کرو۔ اور ان سے ۵۲ ہزار ڈالر نقد (چیک نہیں) وصول کر کے ان کو ڈلیوری آرڈر دستخط کر کے اور مہر لگا کے حوالے کر دینا۔"

.... ابراہیم

میں نے اس حکم کی بھی تعمیل کی ـــــ دوپہر تک یہی ہوتا رہا۔ دفعتہً کل والے گنجے کیپٹن صاحب داخل ہوئے اور ادھر ادھر کی بات کے بعد بولے ۔

"وہ ایٹم بم کہاں رکھا ہے ۔؟"

میں نے جواب میں منہ کھول دیا۔ بھلا جواب ہی کیا تھا اس کا ـــــ انھوں نے میز کی دراز کھولی۔ وسکی کی ایک بوتل نکالی شیلف پر سے دو گلاس اٹھائے اور انڈیلتے ہوئے کہا "یہ ہے ایٹم بم!" اور اپنی پیدائش سے اس جنگ تک کے سارے بیہودہ قصے سنا ڈالے۔" اور پھر میں نے ڈسپوزل میں تجارت کے اچھے مواقع دیکھے اور تمھارا مالک مل گیا۔ اس طرح ہم دونوں نے خوب بزنس کی۔ ٹینڈر طلب کئے جاتے ہیں۔ اور تاجروں کے سامنے کھولنے کے بجائے بند کمرے میں لفافے چاک ہوتے ہیں۔ اور جو سودا ابراہیم کو پسند آتا ہے۔ اس کے لئے وہ اونچے سے اونچے ٹنڈر پر دس سینٹ فی سو ڈالر بڑھا کے ٹنڈر بھر دیتا ہے۔ اور سودا ہو جاتا ہے ـــــ گلاس خالی ہونے کے بعد کیپٹن صاحب نے چھ ہزار ڈالر کا پرچہ نکالا اور میں نے ان کو رقم حوالے کر دی۔ اور وہ تشریف لے گئے۔

گھڑی کی سوئیاں گھسٹتی ہوئی جب ۴ تک پہنچیں۔ تو کمرہ خوشبو سے بس گیا۔ میں نے نظریں اٹھا کے دیکھا ـــــ بلونڈ ـــــ چہرہ پر روز کی سرخی۔ گہری لپ اسٹک۔ رنگے ہوئے ناخن۔ تنگ اسکرٹ میں ابھرا ہوا سینہ اور بل کھاتی ہوئی کمر ـــــ

"اس مہ جبین کو تین سو ڈالر دیدو۔ اور چاہو۔ تو .... ابراہیم

دستخط کے بعد اس رقعے پر مڑے ہوئے سینگ بنے ہوئے تھے۔

میں نے نوٹ گن کر حوالے کئے۔ اور جب وہ چلی گئی تو میز پر سر رکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔

باقی چار دن کے حالات اور واقعات بیان کرنے سے کیا فائدہ۔ غرض ہر قسم کی رشوت۔ فریب...... دھوکا.... عورت....... شراب یہی باتیں دہرائی جاتی رہیں۔ اور میں اپنے اوپر لعنت کرتا رہا کہ میں نے خود ہی اپنا گلا کیوں پھنسا دیا۔ ابراہیم کو وعدہ سے دو دن زیادہ ہو چکے تھے۔ نوٹوں سے میزوں کی درازیں بھر چکی تھیں۔ اور میں حد سے زیادہ تنگ آ گیا تھا ـــــ کہ ایک تار آیا۔

ابراہیم سینٹ میری اسپتال میں سخت بیمار ہے۔ تم فوراً پہنچو۔"

.... فادر جارج ہنکنس

یا تو میں ابراہیم کو گالیاں دے رہا تھا۔ یا تار پڑھتے ہی میری حالت دگرگوں ہو گئی۔ نہیں نہیں۔ میں جلد ہی ابراہیم کے پاس پہنچوں گا۔ اس کو نصیحت کروں گا۔ اس کو یہ لال کتاب۔ مجانی الادب پھر سے سنبھالنا پڑے گی۔ یہ ساری چار سو بیس ختم کرنا پڑے گی۔ ابراہیم بیارا ابراہیم جو جاپانی توپوں اور ہوائی جہازوں کی بمباری سے محفوظ رہا۔ اب اس بیماری سے بچ جائے گا۔ اور میں اس کو ساتھ لے کر لبنان بھاگ جاؤں گا۔ اور میں پہلی ٹرین سے روانہ ہو گیا۔ اس بدوی عرب کی طرح جو اپنے قبیلہ پر حملہ کی خبر سن کر اپنے خیموں کی طرف بھاگ رہا ہو۔ ... ٹرین رکنے سے پیشتر میں اس اسٹیشن پر کود پڑا۔ اور اسپتال کا راستہ پوچھتا تیز تیز چلنے لگا۔ اسپتال کی عمارت نظر آئی... اور میرا دل خود بخود ڈوبنے لگا۔ برآمدے میں سیاہ کپڑے پہنے فادر سے ملاقات ہو گئی۔

"فرزند من کیا تم ابراہیم کے دوست ہو؟"

"جی ہاں مقدس باپ!"

"تم کو دیر ہو گئی میرے بچے۔ یہ دیکھو میرے ان ہاتھوں کو دیکھو اور یہ سمجھو کہ تمھارے دوست کا خون انہی ہاتھوں سے ہوا ہے۔ وہ سڑک کے راستے موٹر سے آ رہا تھا۔ پل جاپانیوں نے تباہ کر دیا تھا۔ جو اب تک زیر تعمیر ہے۔ کاش وہ ریل سے آیا ہوتا بیس میل پیدل چل کے جب وہ گرجا میں پہنچا تو پسینے سے شرابور تھا۔ رات بڑی سخت سردی تھی۔ میں اس کو کوئی کمبل بھی نہ دے سکا ہماری "خانقاہ" بہت مفلس ہے۔ صبح کو معلوم ہوا کہ مسٹر جوہر کو سردی لگ گئی ہے۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ بخار سے جل رہا تھا۔ اس کے پھیپھڑوں میں سردی لگ گئی تھی۔ خدا مجھے معاف کرے۔ مگر میں بھی تو مجبور ہوں۔ میں نے چندہ جمع کر کے "ڈسپوزل" سے دو سو کمبل خریدنا چاہے تھے۔ مگر یہ دیکھو۔۔۔۔۔ فادر نے کتاب مقدس کے اندر سے ایک کاغذ نکالا۔

"آپ نے دو سو کمبل کے لئے ۲ اسو ڈالر کا آفر دیا ہے۔ مگر گ۔ ل کمپنی نے دس سینٹ فی صدی زیادہ ریٹ کا ٹینڈر دیا ہے۔ اس لئے معافی چاہی جاتی ہے۔"

افسر ڈسپوزل امریکی افواج

فادر مسلسل توبہ و استغفار میں مشغول تھا کہ اتنے میں ڈاکٹر آ گیا۔

"ڈاکٹر ان کو کمرہ ۳ میں لے جائیے مرحوم ابراہیم جوہر کی میت کے پاس۔"

میں چلنے ہی والا تھا کہ فادر نے پوچھا۔

"ہاں میرے بچے "نماز" کا کیا ہو گا کیا تمھارا دوست اس "لال کتاب" پر ایمان رکھتا تھا۔ جو تمھاری بغل میں ہے؟"

"ہاں فادر۔۔۔ مگر بعد کو وہ اس سے منکر ہو گیا تھا۔ پلٹ گیا تھا۔۔۔۔۔"

میں کمرہ ۳ کی طرف چلا۔ ڈاکٹر مریض کی موت پر بار بار افسوس کر رہا تھا۔ جیسے کسی دوکان سے کوئی گاہک بغیر سودا لئے واپس چلا جائے۔ میرے عزیز اگر ہمارے پاس "پنیسلین" ہوتی تو تمھارے دوست کی جان ضرور بچ جاتی۔ بازار میں تو ایک شیشی بھی نہیں ملتی۔ ہم نے ملٹری ڈسپوزل کو (۵۰۰) شیشیوں کے لئے لکھا تھا اور معقول قیمت پیش کی گئی تھی۔ مگر وہاں سے جواب آیا کہ گ۔ ل کمپنی نے اس سے بھی زیادہ قیمت آفر کر کے مال خرید لیا۔ عزیز من یہ کون سی کمپنی ہے جو تمام مال خرید لیتی ہے۔ یہی معاملہ کمبلوں کا بھی ہوا۔ اور لوہے کی مسہریوں کا بھی۔۔۔۔"

میں نے کمرے میں پہنچ کر ابراہیم کے چہرہ سے سفید چادر ہٹائی۔ اس کا چہرہ موم کی طرح مٹیالا سفید ہو رہا تھا۔ اس کی باریک مونچھیں ٹیڑھی ہو گئی تھیں۔ چار دن شیو نہ کرنے سے بال بے ترتیبی سے اُگ آئے تھے۔ سرہانے اس کا سوٹ ٹنگا ہوا تھا۔ اور اس کے کوٹ کے کالر میں ایک پژمردہ پھول ٹنک رہا تھا۔ اس کی نرم و نازک ہیئت میں وہ رنگین پر بھی نہیں تھا۔ جو اس لڑکی نے سالگرہ کی مبارکباد کے بعد اپنے پرس سے نکال کر لگایا تھا۔

میں اکیلے کمرے میں خاموش ابراہیم کے بے جان جسم کے پاس بیٹھا تھا —— میرے ہاتھ میں وہی "لال کتاب" تھی۔ جس کو ابراہیم آگ لگانا چاہتا تھا۔ میں نے مضبوطی سے کتاب کا وہ حصہ پکڑ لیا۔ جس پر دیا سلائی کے شعلہ سے سیاہی پیدا ہو گئی تھی۔ نیم تاریک کمرے میں ڈھلتے ہوئے سورج کی کرنیں داخل ہو رہی تھیں۔ اور ابراہیم کے مردہ چہرے کے خطوط پر میری نگاہیں جم کے رہ گئی تھیں ——!

(شمارہ ۲۴-۲۳-۲۲ سنہ ۵۳ء)

صادق ہدایت
ترجمہ
محمد حیات خاں سیال

کیمیا

(ایرانی کہانی)

ماکان کا قصر بڑا مضبوط اور مستحکم تھا۔ اس کی تین فصیلیں اور سات برج تھے جو چونے اور سیمنٹ سے تیار کئے گئے تھے۔ آج سے دو سو سال پہلے یہ جگہ آباد اور پُررونق تھی۔ اس زمانے میں ماکان ہر روز عصر کے وقت اس محل کے ایوان کے بائیں بُرج میں آ بیٹھتا تھا، تاکہ نیچے بہتے ہوئے دریا پر اس لڑکی کو دیکھے جو ہر روز بالکل اسی وقت نہانے کے لئے وہاں آتی تھی، اور بالآخر جو اسی کی موت کا باعث بنی۔ اس کے بعد یہ قلعہ تباہ ہو گیا۔ در و دیوار پر سبزہ اُگنے لگا۔ دروازے ٹوٹ چکے تھے، دیواریں گرتی جا رہی تھیں۔ ستون خستہ حالت میں تھے۔ اس ویران جگہ پر سکوت کا عالم طاری رہتا تھا۔ لیکن اب بھی محل کے سامنے سے ایک سیمیں ندی زمزمہ کناں گذرتی تھی جو آہستہ آہستہ ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔

اس ویران جگہ کو "گجستہ دژ" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ کس جادو کے سبب ایک لاغر بوڑھا آدمی بائیں برج میں قیام پذیر تھا۔ اس بوڑھے آدمی کا نام خشتون تھا۔ جب سورج غروب ہو جاتا، اور محل کے قریب کے گاؤں پر تاریکی چھا جاتی، اس وقت وہ سیاہ لباس پہن کر بائیں برج سے باہر نکلتا اور محل کے قریب ہی ایک ٹیلے پر چلتا پھرتا، اور خشک لکڑیاں جمع کرتا۔

وہ دیوانہ تھا یا عقل مند، متمول تھا یا مفلس، کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ قرب و جوار کے لوگ اُس کی نگاہوں سے پرہیز کرتے تھے اور اس بات نے سب کو حیران کر دیا تھا کہ ایک جوان عورت ہر روز عصر کے وقت محل کے قریب ندی میں غسل کرتی تھی۔

ایک روز جب ہوا نہایت خوش گوار تھی اور کبوتروں کا ایک دستہ آسمان پر چکر لگا رہا تھا۔ روشنک حسب معمول ندی میں نہانے میں مشغول تھی، اچانک اس نے دیکھا کہ ایک راہب نما شخص خاکستری داڑھی، بلند قامت، سیاہ لباس پہنے اس کی طرف آ رہا ہے۔ لڑکی نے ڈر کر اپنا کرتا اٹھایا اور سینے کو چھپا لیا۔

وہ آہستہ سے قریب آیا اور کہا۔

"اے لڑکی! تو یہاں کیا کر رہی ہے؟"

روشنک جو کپڑے پہننے میں مصروف تھی، کہنے لگی۔

"نہا رہی تھی۔"

"پیاری لڑکی، ڈرو نہیں میں تمھارے باپ کی جگہ ہوں۔"

"میرا باپ — وہ تو بہت عرصہ پہلے مر چکا ہے۔ اس وقت میں بالکل چھوٹی سی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں، لیکن ہاں — اس کی داڑھی سیاہ تھی۔ مجھے پیار کرتا تھا اور اپنے زانوؤں پر بٹھاتا تھا۔"

"افسوس، میری بھی ایک لڑکی تھی۔"

"کیا آپ اسی محل کے رہنے والے جادوگر ہیں؟"

"ہاں لوگ مجھے یہی کہتے ہیں۔"

"لوگ تو مجھے اور میری والدہ کو بھی برا کہتے ہیں — میں تنہا یہاں نہانے آتی ہوں تو کہتے ہیں کہ لڑکی کو نہیں چاہئے کہ ...."

"ان گاؤں والوں کے متعلق کہہ رہی ہو۔ یہ بے چارے — جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ بس پیٹ کے پیچھے پڑے ہیں۔"

"لیکن میں پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب تیرتی ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ تمام پرندے میرے ہم نوا ہیں۔ دل چاہتا ہے ہر وقت دریا میں رہوں۔ پانی کے زمزمے سنتی رہوں ..... کاش میں مچھلی ہوتی ....."

"ہاں آدمی زاد بھی ایک جانور ہے۔ اس کے تمام احساسات ہم میں بھی موجود ہیں۔"

"جب میں دریا سے نکلتی ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ میری ہستی کا کچھ حصہ پانی میں رہ گیا ہے۔ اور پھر اندوہ و غم میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔"

"لیکن تم تو جوان ہو۔ گوشہ نشینی بوڑھوں کے لئے ہوتی ہے جو کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہتے۔"

"میرا دل چاہتا ہے میں مچھلی بن جاؤں اور تیرتی پھروں۔"

"میرا دادا بھی اسی قسم کے خیالات رکھتا تھا اور آخر غرقاب ہوا۔"

"کتنی حسین موت ہے۔"

"نہیں وہ مکمل طور پر نہیں مرا۔ اس کا ایک لڑکا تھا اور ماں باپ کی طرح تمام خاصیتیں اس میں موجود تھیں۔"

"کیا آپ کا باپ بھی کیمیا گر تھا؟"

"نہیں وہ کوشش کرتا تھا، اور تمام لوگ صرف سونے کی جستجو کرتے ہیں۔"

"تو کیا آپ سونا بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں؟"

"فرض کیا میں کامیاب بھی ہو جاؤں تو میرے کس کام کا۔ سات سال ہو چکے ہیں۔ نمناک زمین پر بے خوابی کی حالت میں رات بسر کرتا ہوں۔ کتابوں میں پُر اسرار باتیں تلاش کرتا ہوں۔ اسی حالت میں عمر کا آفتاب لب بام آ پہنچا ہے۔ جس چیز کو اکسیر

کہتے ہیں وہ تو تمھاری جادو بھری مسکراہٹ میں ہے نہ کہ جادوگر کے ہاتھ میں۔"

"آج تک میرے ساتھ کسی نے اس قسم کی باتیں نہیں کیں، تمام لوگ مجھے پاگل کہتے ہیں۔"

"وہ تمھاری زبان نہیں سمجھتے۔"

"ہاں میں ابھی بچہ ہوں۔ لیکن میری زندگی بڑی غمناک ہے۔ میں چاہتی تھی کہ کچھ وقت تمھارے سامنے رہوں اور تمھاری باتوں کو غور سے سنوں ـــــ لیکن میری والدہ تنہا ہے اور تمام گاؤں والے ہمیں اچھا نہیں سمجھتے۔ میں بھی تو تنہا ہوں۔"

"دنیا میں ہر انسان تنہا ہے، دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔" زندگی ایک جیل خانہ ہے۔ بعض زنداں کی دیوار پر تصویریں بنا کر دل لگا لیتے ہیں۔ بعض راہِ فرار اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ بعض روتے دھوتے رہتے ہیں۔ لیکن اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھیں۔ کیا کروں کئی سالوں سے کسی ذی روح سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔"

روشنک نے متعجب ہو کر کہا۔

"آہ میری والدہ آگئی۔"

اس وقت ایک بلند قامت عورت سفید چادر اوڑھے نزدیک آئی۔ نگاہیں خشتون کی نگاہوں سے ٹکرائیں اور چند لمحوں کے بعد غش کھا کر گر پڑی ـــــ لڑکی جو ماں کے اس مرض سے بخوبی واقف تھی اس کی جانب دوڑی اور اس کا سر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا۔

خشتون نزدیک آیا اور اپنی انگلیوں سے اُس کی پیشانی کو مس کیا۔ وہ ہوش میں آئی اور اُٹھ بیٹھی۔

خشتون ان سے دور جا رہا تھا اور لڑکی کی پُر تجسس نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔

اس مرد اور عورت سے متعلق گاؤں میں عجیب و غریب باتیں مشہور تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ اس مرد کا نام خشتون نہیں بلکہ ملّا شمعون یہودی ہے۔ یہ سات سال پہلے ایک درویش کے ہمراہ اس ویران جگہ میں اقامت گزیں ہوا تھا۔ چند دنوں کے بعد اس کا ساتھی غائب ہو گیا، لیکن کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ اس پر کیا گزری؟

بعض لوگ کہتے تھے کہ وہ بڑا ریاضت کرنے والا ہے۔ دن کو صرف ایک بادام پر اکتفا کرتا ہے۔ اور جنات کو تسخیر کرتا ہے۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ وہ کوہ دماوند سے سُرخ گندھک لایا ہے اور کیمیا گری میں مصروف ہے، اپنے ساتھی کو قتل کر دیا ہے اور اس کی کتابوں وغیرہ سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔

بعض لوگوں کا نظریہ تھا کہ اس برج میں اُس نے خزانہ پا لیا ہے۔ اور شہر میں جو لڑکیاں گم ہوئی ہیں، اُن کی گم شدگی میں اس کا بھی ہاتھ ہے۔ انھیں یقین تھا کہ جو بھی ایک بار اس کی نگاہوں سے نگاہیں ملاتا ہے مسخر ہو جاتا ہے۔

ایک گروہ کہتا تھا کہ تمام دن نماز پڑھتا ہے۔

کچھ لوگ قسم کھا کر کہنے کو تیار تھے کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ملا شمعون نے قبرستان سے ایک کھوپری چرائی ہے جونہی غروب آفتاب کے وقت وہ ٹیلے پر نمودار ہوتا لوگ بسم اللہ پڑھتے۔ اور حیران کن بات یہ تھی کہ سردی ہو یا گرمی محل کے بائیں برج سے ہر وقت نیلے رنگ کا دھواں نکلتا رہتا تھا۔

روشنک اور اس کی ماں کو وہاں آتے ہوئے تقریباً چار ماہ ہو چکے تھے۔ ان کا گھر اس ویران محل کے قریب ہی تھا، اس گھر میں کئی سالوں سے کوئی آباد نہ تھا۔ گیارہ سال پہلے خورشید کا باپ گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ مکان جنات کا مسکن ہے اور اسی لئے پتھروں کی بارش ہوتی تھی، حالانکہ پڑوسی اس مکان کو سستے داموں خریدنے کے لئے پتھر پھینکتے تھے اگرچہ وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور یہ مکان ویران ہی رہا۔

آٹھ سال پہلے خورشید کا شوہر اچانک لاپتہ ہو گیا۔ اس پر الزام لگایا گیا تھا کہ وہ یہودی ہے۔ اس کے بعد اُسے ایک کاغذ پہنچا جس میں لکھا تھا۔

"تجھے ترک کیا، لیکن کسی دن واپس آؤں گا۔"

خورشید اس واقعہ کے بعد چار سال باپ کے مکان میں رہی۔ اور سخت بیمار ہو گئی۔ کئی گھنٹوں تک متواتر غشی کی کیفیت طاری رہتی۔ اور پھر رات کو بسا اوقات خواب کی حالت میں اٹھ کر کسی راستے پر چل پڑتی، پھر واپس آ کر سو جاتی۔ اسی سال اُس کے باپ کا انتقال ہو گیا، اور یہ مکان اس کے حصے میں آیا۔ وہ یہیں زندگی بسر کر رہی تھی۔ ایک طرف اس مکان کی ویرانی اور دوسری طرف خورشید کا رات کے وقت گردش کرنا۔ لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا کرنے کے لئے کافی تھا ــــ اب گاؤں والے ماں اور بیٹی دونوں کو خشتون کا ساتھی سمجھنے لگے تھے۔

روشنک کی ماں کی خشتون سے ملاقات کے بعد اسی رات جب کہ تمام جان دار محوِ خواب تھے اور گاؤں میٹھی نیند کے مزے لے رہا تھا، خورشید حسبِ معمول بستر سے اٹھی ــــ بیٹی کی چارپائی کے قریب جا کر دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ اس نے سفید چادر اوڑھی اور آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی گھر سے باہر آئی۔ لیکن آج کی سیر کا راستہ مختلف تھا۔ کچھ دیر تامل کے بعد اُس نے وہ چھوٹی سی دشوار گذار پگڈنڈی اختیار کی، جو ویران ندی کی طرف جاتی تھی ـــ

بائیں برج کے قریب پہنچ کر وہ قدرے رُکی۔ پھر چوبی دروازہ کھولا۔ اور خاموشی سے دالان سے گذر کر دائیں طرف کے دروازے کو کھولا اور پانچ سیڑھیاں نیچے اُتر گئی۔

سامنے تہہ خانہ تھا۔ ہوا بڑی سرد اور نمناک تھی۔ درمیان میں ایک بتی جل رہی تھی۔ خورشید ایک کونے میں ٹھہر گئی۔ سر جھکا کر چہرے کو ہاتھوں میں چھپا لیا۔ بتی کی روشنی میں وہ کافی ڈراؤنی معلوم ہوتی تھی۔

خشتون آتش دان کے قریب بیٹھا تھا۔ میلا کچیلا لباس پہن رکھا تھا۔ آنکھیں آگ پر دھری ہوئی پیالی پر جمی تھیں۔ ایک زنگ خوردہ تلوار دیوار کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ کمرے میں ایک عجیب قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

چند لمحات خاموشی میں گذرے۔ خشتون نے نووارد مہمان کی طرف منہ پھیر کر بھی نہ دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد اُٹھا۔ اس عورت کے قریب گیا اور آمرانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں تو آج خالی ہاتھ آئی ہے اسے کیوں نہیں لائی۔ لیکن کل رات تو میرے پنجے سے زندہ نہیں جا سکے گی۔ کل رات جب تیری لڑکی سو رہی ہو اُسے اٹھا لینا اور چادر میں لپیٹ کے یہاں لے آنا۔ یاد رکھنا بیدار نہ ہونے پائے۔ اچھی طرح سن لے! اگر راستے میں ٹھوکر لگے تو ٹھہر جانا تاکہ دوبارہ سو جائے۔ پھر اُسے ہال کمرے میں لے آنا اور میرے حوالے کر دینا۔ کیا تو نے اچھی طرح

سن لیا ہے۔"

خورشید سر جھکائے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ سانس مشکل سے آ رہی تھی۔ پیشانی پر سے پسینے کے قطرے گر رہے تھے۔

خشتون قدرے خاموشی کے بعد بولا۔

"اچھی طرح سمجھ لے میں نے کیا کہا ہے۔ کل رات اُسے لے کر آنا۔"

عورت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"بہت اچھا۔"

"جس راستے سے آئی ہے اُسی راستے واپس چلی جا! کل رات اپنی لڑکی کو ساتھ لانا اور میرے سپرد کر دینا۔"

خورشید کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی باہر نکل آئی۔

خشتون آتش دان کے پاس گیا اور پیالی میں پڑی ہوئی سبزی مائل مائع کو دیکھنے لگا۔ وہاں سے ہٹ کر دیوانہ وار کہنے لگا۔

"کل رات خون کے تین قطرے ___ اکسیر کے لئے۔ باکرہ لڑکی کے خون کے تین قطرے۔ میرے استادوں نے خونِ جگر پیا۔ لیکن مقصد کو نہ پہنچے ___ ان میں سے آخری میرے ہاتھوں سے قتل ہوا۔ اور مصروشام کے جادوگروں کے اسرار میرے لئے چھوڑ گیا۔ ان کی محنت کا پھل مجھے ملے گا۔ سات سال سے مردوں کی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں تمام خوشیوں سے کنارہ کش ہوں۔ بیوی بچوں کو ترک کیا۔ تہ خانوں میں راتیں کاٹیں لیکن کل ___ نہیں پرسوں تہ خانے سے باہر نکلوں گا، اور روئے زمین کی تمام مسرتیں میرے لئے ہوں گی ___ یہ تمام لوگ جو مجھ سے بیزار ہیں میرے پاؤں پر گریں گے اور آرزو کریں گے کہ میں انھیں گالیاں دوں ___ میرے دامن کا بوسہ لیں گے ___ سونا ___ سونا ___ (قہقہہ لگاتا ہے)۔ میرے نزدیک سونے کی حیثیت خاک سے بھی کم ہوگی ___ تمام دنیا مجھے عقل کل کہے گی۔ ہر ایک کی زبان پر میرا نام ہوگا۔ روپیہ، خوشی، عورت، زمین آسمان اور خدا سب میرے زیر نگیں ہوں گے ___ ہاں کل رات اس باکرہ کے خون کے تین قطروں کی ضرورت ہے۔ وہ کیوں میرے ہاتھوں قتل نہیں ہوگی۔ اکسیر اعظم کی قربانی ___ لیکن اس کا جسم روح کی پرواز کے بعد میرے قبضے میں ہوگا۔ بلند قہقہہ لگاتا ہے)۔ سونا سونا ___ کتنا دل کش رنگ ہوتا ہے ___ کیا جادو ہے کہ دنیا و آخرت کے افسانے اسی کے گرد گھومتے ہیں ___ سونا، ___ سونا ___"

اس کے بعد وہ آتش دان کے قریب گیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

دوسرے دن خشتون نے تمام وقت سامان تیار کرنے میں گذارا۔ آتش دان کے قریب ایک لکڑی کا تختہ نصب کیا، اس پر سفید چادر بچھائی۔ ارد گرد شیشیاں پڑی تھیں۔ بتی کے قریب ایک قلمی کتاب کا صفحہ کھلا تھا جس میں خطوط کھینچے ہوئے تھے۔ زنگ خوردہ تلوار اس کی دسترس میں تھی۔ پیالی میں سے سفید دھواں نکل رہا تھا۔

وہ ہر لمحہ بے تابی سے مڑ کر دروازے کی طرف نگاہ کر لیتا تھا۔

دروازہ کھلا اور خورشید کوئی سفید لپٹی ہوئی چیز بغل میں لئے داخل ہوئی۔

خشتون نے جونہی دیکھا، اُٹھا، اور اُس کے قریب جاکر آمرانہ لہجے میں کہا۔

"مجھے معلوم تھا تو اسے ضرور لائے گی۔ اسے میرے حوالے کردے۔ اب تو آزاد ہے۔ جا، دور دور تک تیری زبان بند رہے گی تاکہ تو کسی کو کچھ نہ بتا سکے۔ اچھا! لا اسے مجھے دے۔"

اس نے لپٹی ہوئی چیز کو عورت کے ہاتھ سے لیا اور لکڑی کے تختے پر آتش دان کے قریب لٹا دیا۔ خورشید کے ماتھے سے پسینے کے قطرے گر رہے تھے وہ آہستہ آہستہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

یہ لمحات خشتون کے لئے بڑے قیمتی تھے۔ اُس نے جلدی سے چادر ہٹائی۔ روشنک کا حسین چہرہ، بکھری ہوئی زلفیں گھنی پلکیں، صاف نظر آ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی۔

خشتون نے تلوار اٹھائی، زیر لب کچھ پڑھا، اور تلوار کی نوک سے اس تختے کے گرد حصار کھینچا۔ پھر کتاب کھولی، اور دیّی کی روشنی میں کچھ پڑھنا شروع کیا۔ اس نے روشنک کے ہاتھ اور پاؤں مضبوطی سے باندھ دیئے اور اس کی گردن پر تلوار کا وار کیا۔ خون فوارے کی طرح بہہ نکلا۔ اور خشتون کے چہرے پر خون کے چھینٹے پڑے۔ اس نے آستین سے منہ صاف کیا۔ اور پھر کچھ عجیب وغریب زبان میں پڑھنے لگا۔

اس وقت اس کی شکل انتہائی خوفناک تھی۔

اس دوران میں روشنک نے حرکت کی اور اس کا سر ایک طرف کو لٹک گیا۔ خشتون نے شیشے کی کھلی بوتل اٹھائی اور اُس کے گلے کے نیچے رکھ دی۔

روشنک نے پھر جھٹکا کھایا اور گردن دوسری طرف لٹک گئی۔ خشتون نے خون آلود سر کو پکڑ کر پھیرا۔ خون کا فوارہ چھوٹا اور خشتون مختلف شیشوں میں اسے بھرنے لگا۔

خون کے آخری قطرے لینے کے لئے اُس نے جب بتی کو اور قریب کیا تو اچانک روشنک کی پیشانی پر اس کی نظر پڑی ایک سیاہ ہلالی نشان جو اس کی بیٹی کی پیشانی پر تھا، صاف نظر آ رہا تھا۔

جونہی اُس نے اپنی بیٹی کو پہچانا وہ خوف زدہ ہوگیا۔ گھبرا کر اس نے بتی کو پرے پھینکا، اور ہاتھ میں خون سے پُر شیشی لئے فریاد بلند کی۔

"کیمیا — کیمیا ...... خون کے تین قطرے ...... اپنی بیٹی کا خون — روشنک کا خون"

پھر شیشے کی بوتل کو اس نے زور سے دبایا کہ وہ چکنا چور ہوگئی — ٹکڑوں کو پیالی کی طرف پھینکا۔ پیالی تپائی پر سے گر پڑی اور سبزی مائل مائع زمین پر پھیل گئی اور شعلے بھڑک اٹھے۔

گرد و نواح کے لوگ صبح تک ان شعلوں کو ویران محل سے بلند ہوتے دیکھتے رہے۔

(شمارہ ۱۷۱-۱۷۰ سنہ ۶۵ء)

لو ہسون
ترجمہ
ریکاف

بقایا

(چینی کہانی)

لوچین شہر کی شراب کی دوکانیں اسی طرز کی بنی ہیں جیسی چین کے دوسرے شہروں میں نظر آتی ہیں۔ یہاں کاؤنٹر پر گرم پانی کا مٹکا رکھا ہوتا ہے جس پر شراب رکھ کر گرم کی جاتی ہے۔ جب گاہک اندر داخل ہوتے ہیں تو کاؤنٹر کے قریب پہنچ کر ایک کلھڑ شراب طلب کرتے ہیں۔ آج سے تقریباً بیس سال قبل ایک کلھڑ شراب کی قیمت چار آنے تھی لیکن اب بارہ آنے ہے۔ گاہک کاؤنٹر کے قریب ہی کھڑے ہوکر گرم شراب کی چسکیاں لیتے ہیں۔ انھیں ایک آنے میں ایک پلیٹ بانس کی جڑ یا دلیا بھی شراب کے ساتھ کھانے کو مل جاتی ہے۔ یہاں بیشتر غریب اور مزدور طبقے کے گاہک آتے ہیں تو انھیں دوکان کے اندرونی حصے میں بٹھایا جاتا ہے۔ جہاں وہ شراب کی کافی مقدار اور مرغن غذائیں منگوا کر کھاتے ہیں۔

میں نے بارہ سال کی عمر سے ہی شن ہنگ کی دوکان پر جو شہر کے مغربی دروازے کے قریب واقع ہے کام کرنا شروع کیا۔ شن ہنگ کو میں بالکل بدھو نظر آیا، اس لئے اس نے میری ڈیوٹی دوکان کے باہری حصے میں لگائی۔ اس حصے میں آنے والے بیشتر گاہک سیدھے سادے ہوتے اور بڑی جلدی خوش و مطمئن ہوجاتے لیکن کبھی کبھی کوئی ایسا گاہک بھی آنکلتا جو ہمیں کافی پریشان کرتا۔ کچھ گاہک تو کاؤنٹر کے قریب ہی کھڑے ہوکر اپنی نظروں کے سامنے کلھڑ میں شراب بھری جانے پر اصرار کرتے تاکہ شراب میں ملاوٹ کا احتمال نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ملاوٹ کا امکان قطعی نہ رہتا اور اس صورتِ حال پر میرا کوئی بس نہ تھا لیکن دوکان دار نے یہ سمجھ کر کہ میں بیرونی حصے میں بھی کام کرنے کے قابل نہیں ہوں مجھے ملازمت سے علیحدہ کرنا چاہا۔ لیکن میری خوش قسمتی کہ جن صاحب کی سفارش پر میں ملازم ہوا تھا وہ کافی اثر و رسوخ والے تھے اس لئے مجھے نوکری سے الگ نہ کیا گیا، لیکن اب صرف شراب گرم کرنا ہی میرا کام رہ گیا۔

مجھے سارا دن اپنے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا رہنا پڑتا۔ اس جگہ پر میری کارگزاری سے دوکان دار مطمئن تو ہوگیا تھا لیکن کام بڑا سخت اور صبر آزما تھا۔ دوکان دار بڑا غصہ ور تھا اور بیشتر گاہک بھی چڑچڑے مزاج والے ہوتے تھے اس لئے میرا دل کام میں نہ لگتا۔ ہاں جب کبھی کُنگ ای چی دوکان میں آتا تو دوکان میں قہقہے گونجنے لگتے۔ اور میرا دل بھی

بہل جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک میرے دل میں کُنگ ای چی کی یاد بسی ہوئی ہے!

لمبے چغے پہن کر آنے والوں میں کُنگ واحد گاہک تھا جو کاونٹر کے قریب کھڑا ہو کر شراب پیتا تھا، وہ طویل القامت تھا اور اس کا جسم گٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی جھریوں کے درمیان جگہ جگہ چوٹ کے نشانات نظر آتے تھے اس کی داڑھی بڑی اور الجھی ہوئی تھی۔ اس کا چغہ بڑا مضبوط تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے دس بارہ سال سے دھوبی کی شکل نہیں دیکھی ہے۔ وہ کچھ ایسے انداز میں باتیں کرتا کہ اس کی آدھی بات سننے والوں کی سمجھ ہی میں نہ آتی اور سننے والا اپنی خجالت مٹانے کے لئے دھیرے دھیرے مسکرانے لگتا۔ وہ جونہی دوکان میں داخل ہوتا سب کی نگاہیں اس کے چہرے پر جم جاتیں اور ہر ایک کے ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ اُبھر آتی۔

"کیا بات ہے کُنگ؟" کوئی آواز دیتا "آج تمھارے چہرے پر ایک دو نئے نشان نظر آرہے ہیں"

سُنی اَن سُنی کرکے کُنگ کاونٹر کے قریب جاتا اور دو کلھڑ شراب اور ایک پلیٹ ڈلیا کا آرڈر دیتا۔

دوسری آواز آتی ——

"معلوم ہوتا ہے آج پھر بڑی رقم پر ہاتھ صاف کیا ہے!"

"تم لوگ کیوں کسی شریف آدمی کو ناحق بدنام کرتے ہو"

کُنگ جواب دیتا، اور شراب کا کلھڑ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیتا۔

"واہ رے شریف آدمی واہ — کیا کہتے ہیں تمھاری شرافت کے۔ ابھی پرسوں ہی کی بات ہے کہ تم نے ہُو کے مکان سے کتابیں چرائی تھیں اور ان لوگوں نے تمھیں پکڑ کر خوب مارا تھا"

شرم کے مارے کُنگ کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ اور کن پٹی کی رگیں تن جاتیں ——

"بھلا کتاب کی چوری کو چوری کہا جا سکتا ہے؟" وہ آہستہ سے کہتا۔ "کتابیں اٹھا لے جانا تو پڑھے لکھے لوگوں کا کام ہے۔ اور تم لوگ اسے چوری قرار دیتے ہو؟" —— یہ کہہ کر وہ کنفیوشس اور دوسرے بزرگوں کے اقوال سنانے لگتا اور لوگ قہقہے لگاتے۔

میں نے لوگوں سے سُنا ہے کہ کُنگ کو قدیم کلاسیکی ادب کی بڑی واقفیت ہے۔ لیکن اس نے آج تک نہ تعلیم حاصل کی تھی نہ کوئی امتحان پاس کیا تھا۔ اس کا کوئی مستقل ذریعۂ معاش بھی نہ تھا۔ اور ان دنوں اُس کی اقتصادی حالت بہت خراب تھی۔ یہاں تک کہ وہ بھیک مانگنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ بڑا خوش خط تھا اس لئے کبھی کبھار اسے نقل کرنے کا کام مل جاتا تھا۔ لیکن وہ کہیں جم کر کام نہ کرتا، اور چند دنوں بعد اپنا قلم اور کاغذ اٹھا کر کہیں غائب ہو جاتا! اسی لئے لوگ اسے کام دیتے ہوئے جھجکتے تھے۔

بات یہاں تک بگڑی تھی کہ اب اُس کے لئے آوارہ گردی کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔ لیکن ہماری دوکان پر اس کا برتاؤ ہمیشہ قابلِ تعریف اور مثالی رہا تھا۔ وہ ہمیشہ شراب کی قیمت ادا کر دیا کرتا۔ اگر کبھی اُس کے پاس پیسے نہ ہوتے تو ہم اس کا نام دوکان کے بورڈ پر نادہندگاہکوں کی فہرست میں لکھ دیتے۔ لیکن وہ ایک ماہ کے اندر ہی اپنا حساب بے باق کر جاتا اور اس کا نام اس فہرست سے نکال دیا جاتا۔

آدھا کلھڑ پیتے ہی وہ ترنگ میں آجاتا، لیکن جوں ہی کوئی اس سے یہ سوال کرتا ۔ "کیوں گُنگ ۔ کیا سچ مچ تمھیں پڑھنا لکھنا آتا ہے؟ ۔ تو پھر تم نے کوئی امتحان پاس کیوں نہیں کرلیا؟"

یہ جملہ سُن کر اُس کا دل اداس ہو جاتا، اور اس کا چہرہ اُتر جاتا ۔ پھر اس کے ہونٹ کانپنے لگتے اور وہ جواباً قدیم کلاسیکی ادب کے جواہر پارے سنانے لگتا ۔

جسے سنتے ہی دوکان میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ ہنسنے لگتے ۔ ان موقعوں پر میں بھی خوب ہنستا ۔ اور دوکان دار بھی گُنگ سے بے تکے سوالات کرکے لطف اُٹھاتا ۔

غالباً یہ سوچ کر کہ ان عمر رسیدہ لوگوں سے باتیں کرنا فضول ہے وہ ہماری جانب متوجہ ہوتا ۔

ایک دن اُس نے مجھ سے پوچھا :۔

"کیوں بیٹے کیا تم نے اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے؟"

اور جب میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اُس نے کہا ۔

"اچھا تو میں تمھارا امتحان لوں گا ۔ بتلاؤ ہوئی شانگ کیسے لکھا جاتا ہے؟"

میں نے یہ سوچ کر کہ یہ بھیک منگا بھلا میرا کیا امتحان لے گا، اُس کی طرف دھیان ہی نہ دیا ۔

لیکن چند لمحے میرے جواب کا انتظار کرنے کے بعد اُس نے بڑی گمبھیرتا سے کہا ۔

"نہیں لکھ سکتے؟ تو میں تمھیں سکھاؤں گا ۔ کیونکہ آگے چل کر تم بھی اپنی دوکان کھولو گے اُس وقت تمھیں لکھنے پڑھنے کی ضرورت ہوگی ۔"

چونکہ میں کبھی اپنی دوکان کھولنے کا تصور بھی نہ کرسکتا تھا ۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے مالک دوکان دار کو بھی کبھی ہوئی شانگ لکھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، اس لئے میں نے اسے جواب دیا ۔

"کون تم سے کہہ رہا ہے کہ تم مجھے لکھنا پڑھنا سکھاؤ ۔ مجھے سب کچھ آتا ہے ۔ ہوئی شانگ یوں لکھا جاتا ہے ۔ دیکھو ٹھیک ہے نا ۔"

گُنگ بہت خوش ہوا ۔ کاونٹر پر اپنی انگلیوں سے تال دیتے ہوئے بولا ۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے ۔ لیکن ہوئی شانگ چار مختلف طریقوں سے لکھا جاتا ہے ۔ کیا تمھیں چاروں طریقے معلوم ہیں؟"

مجھے اُس کی بات پر غصہ آگیا ۔ اور میں وہاں سے کھسک گیا ۔ وہ شراب میں اپنی انگلیاں ڈبو کر چاروں طریقوں سے لکھنے والا تھا کہ میری بے رخی دیکھ کر رُک گیا ۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں کی چمک بجھ گئی ہے ۔ اس کے منہ سے ٹھنڈی سانس نکل پڑی ۔

دوکان سے اُبھرنے والے قہقہوں کو سن کر پڑوس کے بچے بھی کبھی کبھی دوکان میں آکر گُنگ کے ارد گرد جمع ہو جاتے اور وہ اپنی پلیٹ سے دلیا نکال کر دو چار بیجے ہر ایک کو دیتا ۔ لیکن جب لڑکے وہیں ڈٹے رہتے اور ان کی للچائی ہوئی نظریں دلیا کی پلیٹ پر جمی رہتیں تو گُنگ گھبرا کر پلیٹ اپنے ہاتھوں کے نیچے کھسکا کر اُسے ڈھک لیتا ۔

اور پلیٹ پر جھکتے ہوئے کہتا ۔

"بس اب اور نہیں ملے گا ۔ خود میرے پاس زیادہ نہیں ہے ۔ اب جاؤ ۔"

اور لڑکے ہنستے کودتے چلے جاتے ۔

کُنگ واقعی بڑا دلچسپ انسان تھا!

یہ واقعہ خزاں کی آمد سے کچھ پہلے کا ہے ۔ دوکان دار حساب کتاب کی جانچ میں مشغول تھا، دفعتًا اُس نے کاغذ نیچے رکھتے ہوئے کہا ۔

"کُنگ بہت دنوں سے نہیں آیا ۔ اُس کی طرف ہمارے اُنیس آنے بقایا ہیں ۔"

میں نے بھی سوچا تو پتہ چلا کہ واقعی کُنگ بہت دنوں سے نہیں آیا تھا ۔

"وہ بھلا اب کیوں کر آسکتا ہے ۔" ایک گاہک نے کہا ۔ "اس بار مارپیٹ میں اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں ۔"

"کیا واقعی ۔۔ ؟"

"ہاں ۔ اُس نے پھر کتابیں چُرانے کی کوشش کی تھی ۔ وہ بھی صوبے کی مشہور عالم ودانش ورٹنگ کے کتب خانہ سے ، بے چارا پکڑا گیا ۔"

"پھر کیا ہوا ؟"

"ہوتا کیا ۔ پہلے تو تحریری معافی مانگنی پڑی ، اس کے بعد اُس کی خوب پٹائی کی گئی ۔ اُسے تمام رات مارا پیٹا گیا اور اُس کے دونوں پاؤں ٹوٹ گئے ۔"

"پھر ۔۔۔۔ ؟"

"بس دونوں پاؤں ٹوٹ گئے ۔ پھر کیا ؟"

"ہاں ہاں یہ تو میں سمجھ گیا ، لیکن اس کے بعد کیا ہوا ؟"

"اس کے بعد کیا ہوا؟ پتہ نہیں کیا ہوا؟ شاید کُنگ مر گیا ہو!"

دوکان دار نے پھر کوئی سوال نہ پوچھا اور حساب جوڑنے میں مشغول ہو گیا ۔

خزاں کے بعد جوں جوں موسمِ سرما قریب آتا گیا ، ہوا میں خنکی بڑھتی گئی ۔ اب میرا زیادہ وقت کھٹی کے قریب گذرتا اور میں ہر وقت اپنی روئی کی صدری پہنے رہتا ۔

ایک دن دوپہر کو ، جب دوکان میں کوئی گاہک نہ تھا ، اور میں اپنی جگہ پر آنکھیں موندے بیٹھا ہوا تھا میرے کانوں میں دفعتًا ایک آواز آئی ۔

"ایک کلھڑ شراب گرم کردو بھائی ۔"

آواز بہت ہلکی تھی ، لیکن جانی پہچانی تھی ۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا ، لیکن سامنے کوئی نظر نہ آیا ۔ میں نے اُٹھ کر ادھر اُدھر دیکھا تو سامنے دروازے پر کُنگ بیٹھا ہوا دکھائی دیا ۔۔۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور گالوں کی ہڈیاں باہر کو

کو ابھری ہوئی نظر آرہی تھیں ۔ اُس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ اُس کے جسم پر ایک پُرانی پیوند لگی صدری تھی اور وہ
پھوس کی چٹائی پر پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی اُس نے کہا۔

"ایک کلہڑ شراب گرم کردو۔"

دفعتاً دوکان دار نے کاؤنٹر سے جھانک کر پوچھا۔

"گُنگ ای جی آیا ہے کیا؟ بھائی تمہارے ذمّے اُنیس آنے واجب الادا ہیں۔"

"وہ پیسے میں بعد میں ادا کردوں گا۔ اس وقت کے پیسے دے رہا ہوں لیکن دیکھنا ذرا اچھی شراب دینا۔"

"تم نے پھر چوری کی گنگ ---؟"

دوکان دار نے حسب معمول مُسکراتے ہوئے پوچھا۔

گُنگ نے ہولے سے کہا۔

"تمھیں ہمیشہ مذاق ہی سوجھتا ہے۔"

"واہ، اس میں مذاق کی کیا بات ہے۔ اگر تم نے چوری نہیں کی تو پھر لوگوں نے تمھاری ٹانگ کیوں توڑی؟"

"میں گر پڑا تھا، اور میری ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔"

میں نے دیکھا کہ گنگ کی آنکھیں دوکان دار سے کہہ رہی تھیں۔

"کوئی دوسری بات کرو نا بھائی۔"

اسی دوران میں کئی گاہک وہاں آگئے ۔ میں نے گرم شراب کا پیالہ لے جا کر گُنگ کے سامنے رکھ دیا۔

گُنگ نے اپنی پھٹی ہوئی صدری کی جیب سے پیسے نکالے اور مجھے تھما دیئے۔

جب وہ مجھے پیسے دے رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ کیچڑ میں سنے ہوئے تھے۔ مزدورہ ہاتھوں کے
بل رینگتا ہوا یہاں تک آیا تھا۔

اُس نے جلدی سے شراب کا پیالہ خالی کردیا اور ہاتھوں کے بل رینگتا ہوا چلا گیا۔

کافی مدّت گذر گئی۔ لیکن ہم نے گُنگ کو پھر نہیں دیکھا۔ سال کے آخر میں دوکان دار نے بورڈ اُتارتے ہوئے کہا۔

"گُنگ کے ذمّے ہمارے اُنیس آنے اب بھی بقایا ہیں۔"

کشتیوں کے میلے میں بھی دوکان دار نے یہی جملہ دہرایا۔ لیکن جب دوبارہ خزاں کا موسم آیا تو اُس نے یہ بات
پھر نہ کہی۔ نیا سال آیا لیکن گنگ پھر بھی نظر نہ آیا۔

شاید گُنگ ای جی مر گیا۔!

(شمارہ ۱۵۳ - ۱۵۲ ؁ ۶۴ء)

کافکا

ترجمہ

علی ناظم

ڈولچی سوار

(جرمن کہانی)

کافکا بیسویں صدی کے جرمن ادب میں عہد آفریں شخصیت کا مالک ہے جس کا اثر و نفوذ نہ صرف جرمن بلکہ بین الاقوامی ادب نے بھی قبول کیا ہے۔ ان کی نثری تخلیقات جن سے جرمن ادب میں ماورائی عہد کا آغاز ہوتا ہے اپنے موضوع اور فنی ساخت کے اعتبار سے گہری رمزیت لئے ہوتی ہیں۔ یہی رمزیت بسا اوقات ان تخلیقات کو الفاظ کا چیستاں بھی بنا دیتی ہے۔ زیرِ نظر کہانی "ڈولچی سوار" (DER KIIBELREITER) اس کے ضخیم مجموعہ "تذکرہ ایک جدوجہد کا (BESCHREIBUNG EINES KAMPFES) سے لی گئی ہے۔ جسے کافکائی فن کی ایک نمائندہ کہانی کہا جا سکتا ہے۔

یہ تخلیق اپنے اجنبی نام سے لے کر آخری پُراسرار جملے تک کافکا کے غیر معمولی انداز، اس کے تخیل کی رسائی اور اس کے عجیب و غریب احساس کی نمائندگی کرتی ہے۔ جس میں وہ ہئیت کے مروجہ اصولوں سے انحراف کر کے خارجیت کے بندھنوں سے یکسر آزاد ہو جاتا ہے۔ اور محض لاشعور کی دھندلی گہرائیوں میں غوطہ زنی کر کے اس دنیا کے عجیب و غریب اور منتشر تلازمات کا ایک سلسلہ پیش کرتا ہے۔ یہاں وہ ایک لمحے کے لئے اپنے قاری کو تخیل کی ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیتا ہے جہاں کرب کی موجودگی کے باوجود اس کا احساس باقی نہیں رہتا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس نے جابجا واہمہ کی بھی مدد لی ہے لیکن اس واہمہ پر حقیقت کا دھوکہ ہوتا ہے اور کبھی کبھی اس اجنبی احساس میں حقیقتیں بھی واہمہ نظر آنے لگتی ہیں؛ زیرِ مطالعہ کہانی اس التباس (ILLUSION) کی بہترین مثال پیش کرتی ہے۔

کہانی کا عام تاثر انسانی جبریت ہے جس کے پہلے ہی منظر میں انسان نیچر کی جابر قوتوں سے نبرد آزما ہے۔ لیکن اس مقابلے میں اس کی حیثیت مجبورِ محض کی ہے۔ وہ مزاحم ہونے کی سکت نہیں رکھتا اور نہ ہی ان ذرائع کا مالک ہے جو اس کو مقابلے کا اہل بنا سکیں۔ بدقسمت انسان کا سرد سے

جاں بہ لب ہونا اور اس کے ساتھ ہی اذیت ناک ماحول کے ابتدائی جملے انسانی بے بسی کا ایک المناک مرقع پیش کرتے ہیں۔ اس وقت اس بدنصیب کی سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ وہ مزاحمت کے ذرائع کو حاصل کرے جو یہاں کوئلہ کے سمبل میں حرارت و توانائی یا زندہ رہنے کی ازلی خواہش کا اظہار ہے لیکن یہ تمنا مادی طور پر کسی صورت میں پوری نہیں ہوتی، اور وہ اپنی ناکامی کے احساس سے بھی مغلوب ہے پس یہ تشنۂ تکمیل خواہش تحت الشعور کی گہرائیوں میں پہنچ کر "نفسیاتی خودحرکیت" (AUTOMATIC PSYCHICISM) کا موجب بنتی ہے۔ اور وہ واہمے میں اس آرزو کو پورا ہوتا ہوا دیکھنے لگتا ہے۔ کوئلے کی ڈولچی سواری کا جانور بنتی ہے، اور دیومالا کے قالین کی طرح انسانی آرزوؤں کے جلوس کو لے اڑتی ہے اس لاشعوری پرواز میں وہ کوئلے والے کے یہاں پہنچتا ہے اور اس سے کوئلے کی بھیک مانگتا ہے۔ زندہ رہنے کی جدوجہد کے سلسلے کی ایک اور کڑی! کوئلے والا رضامند ہے لیکن یہاں پھر ایک جابر قوت مزاحم ہوتی ہے اور اس طرح واہمے میں بھی یہ خواہش جوں کی توں تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہے۔ اس موقع پر کافکا شوپنہار کی مانند خالص جبریت کا قائل نظر آتا ہے: کوئلے والی کا انکار، جہد البقا کے سلسلے پر آخری ضرب ہے جس کے بعد انسان خود بھی زندہ رہنا نہیں چاہتا، اور یوں وہ اپنے آپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے "یخ بستگی کے اتھاہ غاروں" میں سما دیتا ہے جو آہستہ اور تکلیف دہ موت کا ہولناک علاقہ ہے۔

کہانی میں SITUATION کے لحاظ سے سرد کمرہ، ڈولچی کا سفر، زینے کی گفتگو اور یخ بستہ غاروں کا علاقہ انتہائی اہم مقامات ہیں، جو حقیقت و واہمہ کے لحاظ سے باری باری اپنی جگہ بدلتے ہیں۔ بدنصیب انسان کمرے میں حقیقتاً موجود ہے لیکن لاشعوری پرواز کے بعد جن مقامات کا تذکرہ آتا ہے ان کا مادّی وجود مشکوک ہے تاہم وژن کی شدت قاری کو کسی موقع پر بھی اس بات کا احساس نہیں ہونے دیتی کہ بدنصیب انسان اس وقت بھی اپنے کمرے ہی میں موجود ہے۔ اور اس کی برفانی قبر ہی کہرآلود کمرہ ہے جہاں ڈولچی خالی پڑی ہے اور آتش دان اب تک ٹھنڈی سانسیں لے رہا ہے:

کہانی میں ڈولچی کی پرواز کے ساتھ ہی لاشعور کے منتشر اور ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے تلازمات کا سلسلہ بھی قابلِ غور ہے۔ پراسرار زینہ جس سے ڈولچی نیچے اترتی ہے یخ بستہ گلی جس میں ڈولچی کی پرواز ظاہر کی گئی ہے۔ بوجھ تلے دبے ہوئے اونٹوں کی بے چارگی کا احساس، کوئلے والے اور کوئلے والی سے گفتگو "ابھی نہیں" کے الفاظ کا گرجے سے آنے والے شور میں مدغم ہو جانا، کوئلے والی کا لبادہ اور اس کے ہاتھوں "سیدھی سادی سواری" کی شکست اور آخر میں اذیت ناک موت کے غار، ان تلازمات کے ایک طویل سلسلے کو ظاہر کرتے ہیں۔

کہانی کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے تجزیے سے بدقسمت انسان کا جو سراپا ظاہر ہوتا ہے اس میں خود کافکا کی محروم و ناآسودہ شخصیت کا پرتو دیکھا جا سکتا ہے۔ تنگ دبے ہنگم سائز

جلتی ہوئی آنکھیں، بے گھر، بے در، معتوب وستم رسیدہ، دائم المریض، غریب الوطن، معاشی بدحالی، خاندانی مسرتوں سے یکسر محروم، بھرے شہر میں تنہا، اور سب سے آخر میں تائید ایزدی سے بھی محروم انسان۔ یا بدنصیب آرٹسٹ فرانس کافکا!

(مترجم)

کوئلہ ختم ہوگیا۔ ڈولچی خالی ہے۔ کرچھے کا کوئی مقصد نہیں۔ آتش دان ٹھنڈی سانسیں لے رہا ہے۔ کمرہ کہرے بھرا ہے۔ کھڑکی کے اُس پار درخت ٹھنڈ بنے کھڑے ہیں، اور آسمان ایک نقرئی پردے کی مانند ہر اس شخص کی نگاہوں کے سامنے تن گیا ہے جو اس سے رحم کا طالب ہے۔

کہیں سے کوئلہ آجائے ورنہ میں منجمد ہوجاؤں گا۔ میری پشت کی جانب بے رحم آتش دان ہے اور سامنے ایسا ہی آسمان، بس مجھے ان دونوں کے درمیان ہی سفر کرنا ہے، اور کوئلے والے تک پہنچنا ہے۔ اب تک اس نے میری کئی التجاؤں کو رد کیا ہے۔ لیکن آج میں اُسے بتادوں گا کہ میرے پاس کوئلے کی راکھ تک باقی نہیں رہی ہے۔ اور یہ بھی کہوں گا کہ اب میں اسے آسمان پر سورج کی جگہ سمجھنے لگا ہوں۔ میں ایک فقیر کی مانند اس کے سامنے جاؤں گا۔ اس فقیر کی طرح جو بھوک کی شدت سے بے تاب ہوکر کسی نہ کسی دہلیز پر بیٹھ جاتا ہے اور آخر گھر کی باورچن دسترخوان کی جھوٹن کا کچھ نہ کچھ حصہ اس کے پیالے میں انڈیل ہی دیتی ہے۔ بس ایسا ہی میں بھی کروں گا۔ وہ ظالم و بدخو ہی لیکن میں تو اس سے رحم کی اس کرن کے ساتھ بھیک مانگوں گا جو سب سے کہتی ہے —

"انسان تو کسی کو قتل نہیں کرے گا!"[1]

بس ایک کرچھا کوئلوں کا سوال ہے۔

میری راہ تو معین ہی ہے بس ڈولچی ہی پر چل نکلتا ہوں۔ ایک ڈولچی سوار کی مانند — میرے دونوں ہاتھ کنڈے پر جمے ہوئے ہیں جو اس سواری کی واحد لگام ہے۔ اور اب میں اس کو بڑی مشکل سے چلاتا ہوا زینے سے نیچے لاتا ہوں۔ آہا نیچے آکر یہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگی — واہ کیا شاندار سواری ہے! بے چارے بوجھوں مرتے ہوئے اونٹ جب تھک کر بیٹھ جاتے ہیں تو شتربان کا کوڑا ان کو دہلا دیتا ہے۔ وہ اٹھتے ہوئے کانپنے لگتے ہیں۔ اور یوں میری سواری سے بہتر نہیں اُٹھ سکتے — یخ بستہ گلی میں پہنچ کر یہ اسی شان سے ہچکولے کھاتی ہوئی چلی جارہی ہے۔ کبھی کبھی تو میں ایک منزلہ مکان کے برابر اوپر اٹھ جاتا ہوں۔ لیکن نیچے آتے وقت دروازے کی بلندی سے زیادہ نیچے نہیں دھنستا۔

اسی طرح غیر معمولی بلندیوں پر پرواز کرتے ہوئے آخر میں کوئلے والے کے گودام پر جا پہنچا، جہاں وہ اپنی میز پر جھکا ہوا کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ اس کے یہاں کی فضا اس حد تک گرم ہے کہ دروازہ بھی کُھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔

"کوئلے والے" — میں نے سردی سے کپکپاتے ہوئے آواز نکالی، جس کے ساتھ ہی منہ سے منجمد سانس کے دُخان بھی نکلنے لگے۔ "کوئلے والے! مجھے تھوڑے سے کوئلے چاہئیں۔ دیکھو میری ڈولچی خالی ہے۔ اس حد تک

---

[1] انجیل مقدس

خالی کہ میں اس پر سواری کرنے لگا ہوں۔ مجھ پر رحم کرو جیسے ہی میرے پاس پیسے آئیں گے میں تم کو ادا کردوں گا۔"

کوئلے والے نے کان پر ہاتھ رکھا۔

"کوئی آواز دے رہا ہے؟" اُس نے بیوی سے مخاطب ہوکر پوچھا، جو قریب ہی آتش دان کے پاس بیٹھی آگ تاپ رہی تھی۔ "تونے کچھ سُنا؟ مجھے تو کوئی خریدار معلوم ہوتا ہے۔"

"مجھے تو کچھ بھی سنائی نہیں دیا۔" بیوی نے بالکل بے پروائی سے جواب دیا۔ وہ پشت کی جانب سے آتش دان کی گرمی سے لطف اندوز ہورہی تھی۔

"ہاں ہاں — میں نے ہی آواز دی ہے۔ میں تمھارا پرانا خریدار ہوں۔ تمھیں تو مجھ پر ہمیشہ سے بھروسہ رہا ہے۔ بس آج میں کچھ ایسا ہی مجبور ہوگیا ہوں۔"

"عورت —" کوئلے والا بولا۔ "کچھ سنتی ہے، کوئی آواز دے رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کوئی نہ کوئی ضرور دروازے پر ہے۔ شاید کوئی پرانا خریدار آیا ہے جبھی تو اس جانے پہچانے انداز میں آواز دے رہا ہے۔"

"تیرے تو کان بجتے ہیں۔" عورت نے ایک گھڑی کے لئے سانس روکی، اور پھر آرام سے دونوں ہاتھوں کو سینے پر رکھ لیا۔ "کوئی بھی تو نہیں ہے۔ گلی سنسان پڑی ہے۔ سب خریداروں کو مال پہنچا دیا ہے۔ اور اب تو دوکانداری کا وقت بھی نہیں ہے۔ خریدار کہاں سے آگیا۔ یہ تو آرام کا وقت ہے۔"

"لیکن میں تو یہاں ڈولچی میں بیٹھا ہوں —" میں پوری قوت سے چلّایا۔ اور سردی کی شدّت سے میری آنکھوں سے پانی جاری ہوگیا — "ذرا ادھر تو دیکھو۔ تم مجھے یہیں بیٹھا ہوا پاؤ گے۔ صرف ایک کرچھا کوئلوں کا سوال ہے۔ اگر دے دوگے تو بہت مہربانی ہوگی —" "سب خریداروں کو مال پہنچا دیا ہے —" اُف! مجھے ڈولچی میں بیٹھ کر بھی یہ سُننا پڑ رہا ہے۔"

"ابھی آیا۔" کوئلے والے کی آواز آئی۔

اور پھر وہ چھوٹے چھوٹے قدم بھرتا ہوا زینے کی جانب چلنے لگا۔

لیکن عورت بھی ساتھ ساتھ اٹھی، اور اس کا بازو پکڑ کر بولی —

"بس رہنے دے — کہاں چلا؟ — اپنی رحم دلی کو رکھ چھوڑ — میں جاتی ہوں۔ تجھے اپنے رات رات بھر کھانسنے کا بھی کوئی خیال ہے؟ — جہاں گاہک کی آواز آئی اور چل کھڑا ہوا، اور وہ گاہک بھی خیالی — ذرا بیوی بچوں کا بھی خیال کرلیا کر، اور اپنے پھیپھڑوں پر بھی رحم کھا۔ ساری ساری رات کھانستا ہے۔ میں جاتی ہوں۔"

"لیکن ذرا مروّت سے کام لیجیو۔ جو بھی گودام میں ہے اگر مانگے تو دے دیجیو۔ پیسے کی کوئی بات نہیں ہے۔ بعد کو آتے رہیں گے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" عورت بولی اور زینے پر آگئی۔ یقیناً اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔

"بی کوئلے والی۔ سلام۔" میں نے کہا۔ "مجھے ایک کرچھا بھر کوئلے چاہئیں۔ بس اسی ڈولچی میں ڈال دو۔ میں اس کو خود ہی گھر سے چلاتا ہوا لایا ہوں۔ اگر اچھے نہ ہوں تو چورا ہی دیدو — میں تمھیں پورے پیسے

دوں گا۔ لیکن ابھی نہیں۔"

آف کیا قیامت کے دو الفاظ تھے۔

"ابھی نہیں — ! ابھی نہیں !!"

اور پھر کس بے معنی انداز میں یہ الفاظ شام کے اُس شور میں مدغم ہو گئے جو قریب کے گرجے سے بلند ہوا تھا —

"ابھی نہیں — !!!"

"کیا مانگتا تھا ؟" کوئلے والے نے پوچھا۔

"خاک —" عورت نے چیخ کر جواب دیا — "کوئی بھی تو نہیں تھا۔ مجھے نہ کچھ سنائی دیا اور نہ کچھ دکھائی دیا۔ بس چھ بج رہے ہیں اس کا شور ہے۔ ہماری دوکان داری کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ آج سردی کس بلا کی ہے اور کل کے لئے کام بھی بہت ہے —"

اُس نے نہ کچھ دیکھا تھا اور نہ کچھ سنا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ لبادہ اتارتے ہوئے اس کو فضا میں گھما گھما کر مجھے بھاگ جانے کا اشارہ کر رہی تھی۔ اُسے ایسا کرنا پڑ رہا تھا۔ میری ڈولچی میں ایک عمدہ سواری کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ لیکن افسوس اس میں مزاحم ہونے کی صلاحیت نہیں۔ بہت سیدھی سادی ہے۔ جبھی تو ایک عورت کے لبادے سے اس طرح شکست کھا گئی۔

"چڑیل —" میں چلایا۔

اور وہ نیم بے پروائی اور نیم چوکسی کے ساتھ کسی کام میں مشغول ہو گئی۔

"چڑیل — میں نے صرف ایک کرچھا بھر کوئلوں کا سوال کیا تھا۔ اور وہ بھی چورے کا، لیکن تو نے مجھے وہ بھی نہیں دیا۔" اور پھر میں ہمیشہ گم ہونے کے لئے یخ بستگی کے اتھاہ غاروں میں سما گیا۔

(شمارہ ۱۵۲-۱۵۳ سنہ ۶۷ء)

پاکستان کا منفرد رسالہ

ماہنامہ اردو زبان سرگودھا

مستقل ادبی حیثیت کے مقالے۔ فکر انگیز افسانے

نظمیں اور غزلیں۔ بے لاگ تبصرے، اور آپ کے خطوط

خط وکتابت کا پتہ

ماہنامہ "اردو زبان" سرگودھا

البرٹ کامو
ترجمہ
شاکر پُرشارتھی

مہمان

فرانسیسی کہانی

الجزائری شہیدوں کے نام

۱۹۵۷ء کے نوبل پرائز یافتہ مشہور افسانہ نگار "البرٹ کامو" کی کہانی "مہمان" الجیریا میں فرانسیسی مظالم کے گرد گھومتی ہے۔ "البرٹ کامو" ایک انسان دوست ادیب تھے۔ وہ فرانس کی بربریت پر خاموش نہ رہ سکے۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا، جس طرح محسوس کیا قلم بند کر دیا۔ "البرٹ کامو" کا گذشتہ دنوں ہی ایک حادثے میں انتقال ہوا ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو یقیناً وہ بھی ژاں پال سارتر اور دوسرے فرانسیسی ادیبوں کے ہم نوا ہوتے جنھوں نے حال ہی میں الجیریا کی تحریک آزادی کی عملی حمایت کا اعلان کیا ہے!

(ص)

گذشتہ آٹھ ماہ کی مسلسل خشکی کے بعد اچانک ہی وسط اکتوبر میں پچھلے تین دنوں سے خوف ناک برف باری ہو رہی ہے۔ اور اسی لئے قرب وجوار کے دیہات سے اس اسکول میں آنے والے بیس طالب علم بھی اسی دن سے غائب ہیں۔ درجے کے سیاہ بورڈ پر مختلف رنگوں سے نقشے میں بنے ہوئے اس ملک کے دریا اپنے دہانے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ مگر طالب علم تو موسم ٹھیک ہونے پر ہی آئیں گے۔ اسکول کے اُستاد کو کوئی کام نہیں ہے۔ ٹیلے کے ایک کونے میں بنے ہوئے اسکول کے دو کمرے ہیں جن کے آگے لمبا سا برآمدہ ہے۔ ایک کمرے میں وہ خود رہائش پذیر ہے۔

آتش دان کے سامنے بیٹھ کر جب اُس نے خود کو کافی گرما لیا تو وہ اٹھا ۔۔۔ اور پھر سے درجے میں چلا گیا۔ جنوبی کھڑکی سے اس نے دیکھا کہ پہاڑی کے نیچے، سامنے پھیلی ہوئی برف پر راستہ بناتے ہوئے دو مسافر اسی طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ ایک گھوڑے پر سوار ہے اور دوسرا پیدل۔ یہ ٹیلہ جس پر یہ عمارت تعمیر ہوئی ہے ابھی وہ دونوں اس کی چڑھائی تک نہیں پہنچے ہیں۔ یہاں تک پہنچنے میں انھیں کافی دقت لگے گا۔ یہ بھی خیریت گذری کہ گذشتہ رات سے برف باری رُک گئی ہے۔ مگر دوپہر کے دو بجے بھی یوں لگتا ہے جیسے آفتاب ابھی طلوع ہوا ہو۔

یہ تین دن اس کے لئے بڑے اذیت ناک گذرے ہیں۔ ذہنی اذیت بھی کچھ کم نہیں رہی۔ ان آٹھ مہینوں کے خشک موسم کی وجہ سے اس صوبہ کے غریب عوام ویسے ہی اناج کی قلت سے پریشان تھے۔ سرکار کی طرف سے جو راشن ملتا تھا وہی راشن تو اسکول کے غریب لڑکے اپنے لئے اور اپنے گھر والوں کے لئے لے جایا کرتے تھے۔ ان تین دنوں میں ان پر کیا گذری ہوگی؟

وہ برآمدے میں چلا آیا۔ دونوں مسافر آدھی چڑھائی پار کر چکے تھے۔ گھوڑ سوار کو اس نے پہچان لیا۔ وہ بوڑھا فوجی، اس کا پرانا استاد تھا۔ ٹٹو کے نتھنوں سے جھاگ نکل رہا تھا۔ بوڑھے سپاہی کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رسی سے بندھا ہوا ایک عرب گردن جھکائے، ٹٹو کے پیچھے پیچھے پیدل چلا آ رہا تھا۔ جسم پر مٹیالا، نیلا سا چغہ، کچی اون میں لپٹے ہوئے پاؤں میں عربی چپل اور سر پر ایک چھوٹا سا رومال اس نے لپیٹ رکھا تھا۔ جوں ہی دونوں مسافر برآمدے کے قریب آئے، فوجی سپاہی بول اٹھا،

"اف! یہاں تک کے ایک میل کے سفر میں ہی ایک گھنٹہ لگ گیا!"

"اندر آجاؤ، اور ذرا آگ تاپ لو!"

اپنی کھڑی ہوئی مونچھوں کے درمیان فوجی صرف مسکرا دیا اور ہاتھ کی رسی کو بدستور پکڑے ہوئے، وہ ٹٹو سے نیچے کود پڑا۔ ماسٹر نے ٹٹو کی راس تھام لی اور پچھواڑے لے جا کر اسے باڑے سے باندھ آیا۔ واپس آ کر وہ دونوں کو اپنے کمرے میں لے گیا اور بولا: "آپ دونوں ذرا آرام کریں۔ تب تک میں دوسرے کمرے میں بھی آتش دان روشن کئے دیتا ہوں۔ اس سے زیادہ آسانی رہے گی —"

واپس آ کر اس نے دیکھا کہ فوجی اسی کی چارپائی پر لیٹ گیا ہے، اور بندھے ہوئے عرب کی رسی چھوڑ دی ہے۔ اور آتش دان کے قریب بیٹھا ہوا عرب کھڑکی کے باہر آنکھیں پھیلائے دیکھ رہا ہے۔ ماسٹر نے اس کے بھدے سے ہونٹوں کو دیکھا اس کی ناک ستواں تھی۔ اور آنکھیں سیاہ جیسے دہکتے ہوئے انگارے!!

اور جب اس نے ماسٹر کی طرف نظر اٹھائی تو اس نے دیکھا کہ جہد حیات اور راستے کی سردی کی وجہ سے بدرنگ چہرے پر تکان اور سرکشی کی دھندلائی ہوئی آگ سی پھیلی ہوئی ہے۔

"آپ اس کمرے میں تشریف لے آئیے! میں چائے بنا کر لاتا ہوں"

"شکریہ!" فوجی نے کہا — یہ بھی کیا زندگی ہے۔ میرا تو اب ریٹائر ہونے کو جی چاہتا ہے" پھر اس نے عرب کی طرف دیکھتے ہوئے عربی زبان میں ہی کہا — اے ..... ے چلو!"

عرب اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کو آگے کر کے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

ماسٹر جب چائے لے کر آیا، تو عرب کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر اس نے پوچھا — "کیا اس کے ہاتھ کھول دوں؟"

"ضرور! یہ حفاظت تو محض سفر کے لئے ہی تھی!"

فوجی کا اشارہ پا کر عرب اٹھا ہی چاہتا تھا کہ ماسٹر نے فوراً چائے کا گلاس نیچے فرش پر رکھ دیا اور خود گھٹنوں کے بل بیٹھ کر رسی کھول دی۔ عرب، ماسٹر کو بس جلتی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ اور جب اس کے ہاتھ آزاد ہو گئے تو وہ رسی سے جکڑی ہوئی کلائیوں کی سوجی ہوئی جگہ کو ایک دوسرے سے رگڑنے لگا۔ ماسٹر نے چائے کا گلاس اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ ایک بار اور عرب نے ماسٹر کی طرف دیکھا، اور پھر چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے گلاس خالی کر دیا۔

ماسٹر نے فوجی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیا رات یہیں بسر کیجے گا؟"

"نہیں! میں چھاؤنی لوٹ رہا ہوں۔ اور اس شخص کو تم ٹن جن چھوڑ آنا۔ وہاں پولیس ہیڈ کوارٹرس میں اس کا انتظار کیا جا رہا ہے!" اور فوجی نے دوستانہ مسکراہٹ سے ماسٹر کی طرف دیکھا۔

"بات کیا ہے؟ کیا آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟"

"نہیں بھائی! یہی حکم ہے!"

"حکم؟ میں کسی کا ——" کہتے کہتے ماسٹر جھجک گیا۔ وہ بوڑھے سپاہی کا دل نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ پھر بولا۔

"یہ تو میرا کام نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟ لڑائی کے دنوں میں ہر آدمی کو ہر کام کرنا پڑتا ہے!"

"میں وہ حکم دیکھنا چاہتا ہوں!"

فوجی نے سر ہلایا۔ "نہیں! یہ بھی ایک حکم ہے اور اس کا تعلق تم سے ہے۔ آندھی اٹھنے کے آثار ہیں۔ ہر جگہ بلوے کا ذکر بڑی گرما گرمی سے ہو رہا ہے۔ ایک طرح سے ہم سب مستعد ہیں۔"

مگر ماسٹر کی آنکھوں میں چمک پیدا نہیں ہوئی۔

بوڑھے فوجی نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میں تمہیں چاہتا ہوں۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس سارے صوبے کی نگہبانی کے لئے چھاؤنی میں ہم صرف ایک درجن آدمی ہیں۔ مجھے فوراً واپس لوٹنا ہے۔ اس عرب کی وجہ سے سارے گاؤں میں اشتعال پھیلا ہوا ہے۔ اسے وہاں نہیں رکھا جا سکتا۔ اسے تمہارے سپرد کر کے مجھے فوراً واپس لوٹنے کی تاکید کی گئی ہے۔ کل شام سے پہلے تم اسے ٹن جن ضرور پہنچا دینا۔ تمہارے جیسے جوان کے لئے پانچ چھ میل کا سفر کوئی بڑی بات نہیں۔ ہاں! لوٹ کر پھر وہی تم ہو، تمہارے شاگرد ہیں، اور تمہارا یہ مکتب تو ہے ہی!"

"مگر ..... آخر اس نے کیا کیا ہے؟ —— کیا یہ فرانسیسی زبان بول سکتا ہے؟"

"نہیں! ایک لفظ بھی نہیں۔ ہم ایک ماہ سے اس کی تلاش میں تھے۔ لیکن گاؤں والوں نے اسے چھپا رکھا تھا۔ یہ قاتل ہے!"

"کیا یہ ہمارا مخالف ہے؟"

"شاید! ان کا بھروسہ ہی کیا!"

"اُس نے خون کیوں کیا؟"

"صاف بات کیا ہے۔ اس کا تو کچھ علم نہیں۔ ہاں اتنا معلوم ہے کہ اس نے اپنے چچیرے بھائی کو کلہاڑی سے ذبح کر دیا۔ بالکل بھیڑ کی طرح!" فوجی نے ایک جھٹکے سے گردن کاٹنے کا اشارہ کیا۔

ماسٹر کے دل میں ایکدم اس عرب کے لیے نفرت جاگ اٹھی۔ اسے ان سب لوگوں سے نفرت تھی جو سدا جابر اور خون کے پیاسے ہوتے ہیں۔ ماسٹر نے پھر ایک بار ان دونوں کو چائے پلائی۔ عرب کو چائے دیتے وقت اسے قدرے جھجک سی بھی ہوئی۔ مگر عرب اسی طرح ساری چائے نوش کر گیا۔ فوجی نے ماسٹر کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا "اسے لو، میں چلا!" —— اور جیب سے ایک رسی نکال کر وہ عرب کی طرف مڑا۔

"کیا کر رہے ہو؟"

جواب میں فوجی نے صرف رسّی اسے دکھادی۔

"کوئی فکر نہ کرو۔"

"تمھاری مرضی! —— کوئی ہتھیار تو ہے نہ تمھارے پاس؟"

"ہاں اندر ٹرنک میں ہے! مجھے کسی سے ڈرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"نہیں! تمھیں اپنا ہتھیار ہمیشہ اپنے پاس رکھنا چاہیے۔ ان ہنگامہ پسندوں سے کوئی بھی محفوظ نہیں۔"

"میں اپنی حفاظت کرسکتا ہوں۔ حملہ آور کو بھی میں پہچان سکتا ہوں۔"

"پہچان سکتے ہو؟ اچھا! شاید تمھارے دماغ کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہے؟ میرا لڑکا بھی ایسا ہی تھا۔ اسی لئے میں تمھیں اتنا چاہتا ہوں ——" اور اس نے اپنی جیب سے بھرا ہوا پستول نکال کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں یہ تمھارے لئے چھوڑے جاتا ہوں، مجھے دو کی ضرورت بھی تو نہیں۔"

پستول میز پر رکھ کر جوں ہی وہ جانے لگا۔ ماسٹر نے اسے ایک دم ٹوکتے ہوئے کہا —— "دیکھو استاد! مجھے یہ سب بالکل پسند نہیں۔ حملہ آوروں سے تو میں لڑ سکتا ہوں مگر اس غریب ہتھے کو میں کسی کے حوالے نہیں کروں گا۔ چاہے یہ حکم ہی کیوں نہ ہو۔ تم ان سے کہہ دینا!"

ایک لمحے کے لئے فوجی نے عرب کی طرف دیکھا۔ پھر بولا: "نہیں میں ان سے کچھ نہیں کہوں گا۔ جو تمھارے جی میں آئے کرو۔ مجھے اس قیدی کو یہاں تک لے آنے کا حکم ملا تھا۔ میں نے اس کی تعمیل کردی ہے۔ اچھا اس کاغذ پر دستخط کردو۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں کبھی انکار نہیں کروں گا۔"

"مجھے تم پر اعتماد ہے۔ مگر قانون جو ٹھہرا تمھیں دستخط کرنا ہی ہوں گے۔"

ماسٹر نے دستخط کردیئے۔

بوڑھا سپاہی گویا شرمندگی کے عالم میں اپنا ٹٹو لینے چلا گیا، اور چند لمحوں کے بعد ماسٹر کھڑکی میں سے ایک گھوڑ سوار کو نیچے میدان میں اترتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

بہت دیر تک ماسٹر اسے کھڑکی میں سے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ پھر ایک لمبی سانس کھینچتے ہوئے اس نے قیدی کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ "ذرا ٹھہرو!" عربی میں وہ اتنا کہہ کر اپنے کمرے میں جاتے جاتے پھر پلٹ آیا، اور فوجی کے پستول کو ٹیبل سے اٹھا کر اس نے صندوق میں رکھ دیا۔ اور پھر کچھ کہے بغیر ہی اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ قیدی اسی کمرے میں بیٹھا رہا۔ اس کے ہاتھ اب رسی کے بندھن سے آزاد تھے۔

بہت دیر کے بعد ماسٹر نے چارپائی پر لیٹے لیٹے ہی آنکھیں کھولیں۔ ملحقہ کمرے سے کوئی آہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی اس کا خیال تھا کہ اب وہ اکیلا ہے۔ کیونکہ اس اثنا میں قیدی بھاگ گیا ہوگا۔ اپنے اس خیال سے اسے مسرت بھی ہوئی، مگر اس کا یہ خیال غلط نکلا۔ قیدی اب بھی وہیں تھا۔ اور فرش پر لیٹے لیٹے اپنے بھدے ہونٹ پھیلائے، دہکتی ہوئی سی نظروں سے وہ چھت کی کڑیاں گن رہا تھا۔ ماسٹر کے کہنے پر وہ اس کے کمرے میں چلا آیا، اور اشارہ پاتے ہی وہیں بیٹھ گیا۔

"بھوک لگی ہے؟"

"ہاں! ——"

اُس نے کھانے کی میز دونوں کے درمیان سجادی۔ اسٹوو جلاکر دونوں کے لئے کھانا بنایا۔ اب شام ہو چکی تھی ماسٹر نے لیمپ میز پر رکھ دی، اور قیدی کے سامنے کھانا پروس کر کہا۔

"کھاؤ!—"

قیدی نے روٹی کا ٹکڑا منہ تک اٹھایا، مگر اس کا ہاتھ وہیں رُک گیا۔ بولا —

"اور آپ —؟"

"میں بھی کھاؤں گا۔ تمھارے بعد! تم کھالو۔"

قیدی کے ہونٹ پھڑکے۔ وہ کچھ جھجکا، اور پھر چپ چاپ کھانے پر جٹ گیا۔

قیدی کھا چکا تو ماسٹر نے میز کی دوسری طرف اپنے لئے بھی کھانا پروس لیا۔ قیدی نے دیکھا کہ ماسٹر کا کھانا بھی بالکل وہی ہے جو اس کا تھا۔

اُس نے پوچھا —"کیا آپ منصف ہیں؟"

"نہیں! میں تو صرف کل تک کے لئے تمھارا میزبان ہوں۔"

تھوڑی دیر خاموش رہ کر اس نے پھر پوچھا —"آپ میرے ساتھ ہی کھا رہے ہیں؟"

"مجھے بھی تو بھوک لگی ہے۔"

قیدی خاموش ہوگیا۔

کھانا ختم کرکے ماسٹر باہر سے ایک فولڈنگ چارپائی لے آیا، اور اپنی چارپائی کے پاس ہی بچھادی۔ دیوار کے سہارے کھڑی ایک الماری میں سے اس نے دو کمبل نکالے اور قیدی کے لئے اس پر بڑے سلیقے سے بستر ٹھیک کر دیا۔

رات کا پہلا پہر بیت رہا تھا۔ کمرے کی روشنی میں ماسٹر نے اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی۔ غم اور غصہ کے عکس کے علاوہ، وہی حبشیوں جیسے ہونٹ، کالی مگر چمکدار آنکھیں، اور خاموش جانور کے سے جذبات!

"تم نے خون کیوں کیا؟" اپنی آواز کی کرختگی پر خود ماسٹر کو بھی تعجب ہو رہا تھا۔

قیدی نے اپنی نظریں دور گھما کر کہا —"وہ بھاگ رہا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے بھاگا تھا۔" پھر اس نے اپنی نظریں ماسٹر کی نظروں سے ٹکرادیں۔ ماسٹر نے دیکھا کہ ان میں غم اور اندوہ سے پُر ایک بغاوت آمیز چمک تھی۔

"کیوں؟ تم ڈر رہے ہو؟"

عرب کی آنکھیں کرخت ہوگئیں۔ اس نے نظر پھیرلی۔

"کیا تمھیں اپنے کئے پر افسوس ہو رہا ہے؟"

قیدی نے ماسٹر کی طرف کھلے منہ سے دیکھا۔ شاید وہ ماسٹر کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا۔ ماسٹر کے چہرے پر تلملاہٹ جھلک آئی اُس نے دوسرے بستر کی طرف اشارا کرکے کہا۔

"ادھر سو جاؤ — یہی تمھارا بستر ہے۔"

قیدی نے ایک للچائی ہوئی نظر بستر پر ڈالی۔ مگر وہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ بولا —"مجھے بتائیے نا!"

"کیا —؟"

"کیا وہ فوج دار کل پھر آئے گا؟"

"مجھے نہیں معلوم!"

"آپ ہمارے ساتھ جائیں گے؟"

"مجھے نہیں معلوم؟ — لیکن کیوں؟"

خاموشی سے قیدی اُٹھا۔ اور بتائے ہوئے بستر پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ روشنی اس کی آنکھوں پر پڑ رہی تھی اُس نے آنکھیں بند کرلیں اس کے بستر کے قریب کھڑے ہو کر ماسٹر نے پھر پوچھا —

"کیوں —؟"

"آپ ہی ہمارے ساتھ چلئے گا؟" اور عرب نے پھر سے آنکھیں بند کرلیں۔

ماسٹر نے کچھ سوچا، اور روشنی بجھا دی۔ مگر اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ کھڑکی کے باہر اسے برف گرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ قیدی کی سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ لیٹ گیا۔

ایک لمحے کو ماسٹر نے سوچا کہ کیا وہ پستول سانھ لے کر سوئے؟ لیکن کیا ضرورت ہے! وہ کوئی بچہ تو ہے نہیں۔ اس قیدی عرب کو تو وہ جب چاہے ٹھیک کرسکتا ہے!

مگر ماسٹر سو نہیں سکا۔ اس کمرے میں گذشتہ ایک سال سے وہ اکیلا ہی رہا ہے۔ آج ایک اجنبی کی موجودگی نے گڑبڑ کردی۔ تاہم اس اتفاق میں ایک یگانگت بھی تھی۔ جسے وہ حالات کے تحت، بھول جانے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی بھول نہیں سکا۔ دو شخص خواہ وہ سپاہی اور قیدی ہی کیوں نہ ہوں جب ایک ہی کمرے میں رہنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں تو ایک عجیب سی یگانگت قائم ہو جاتی ہے گویا ہر شام اپنے مختلف قسم کے کپڑے اور وردی اُتار کر کھونٹی پر لٹکاتے ہی بپتے سپنوں اور مجبوریوں کی اس سرزمین میں ان کی یکساں انسانی شخصیتوں میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا ....

مگر ماسٹر یوں سوچنا نہیں چاہتا تھا اُس نے سونے کی کوشش کی۔

کچھ دیر بعد قیدی بڑبڑایا۔ ماسٹر کی بھی آنکھ نہیں لگی تھی۔ قیدی نے پھر دوبارہ حرکت کی۔ وہ چوکنا ہو گیا۔ بازوؤں کے سہارے قیدی آہستہ سا اٹھا، اور بستر پر سیدھا بیٹھ گیا۔ بے حس و حرکت۔ بے آواز۔ اس نے ماسٹر کی طرف دیکھا کہ وہ سو گیا ہے یا نہیں، مگر ماسٹر نے کوئی حرکت نہیں کی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ قیدی بھاگنا چاہتا ہے جلدی سے بھاگ جائے تو اچھا ہے۔ چپ چاپ لیٹا ہوا وہ قیدی کی حرکتوں کا جائزہ لیتا رہا — قیدی نے چور کی طرح دونوں پاؤں بستر سے نیچے اتارے۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر آہٹ لی اور آہستہ آہستہ فرش پر کھڑا ہو گیا۔ ماسٹر اسے پکارنا ہی چاہتا تھا کہ قیدی چل پڑا — بہت آہستہ آہستہ، مگر عام رفتار سے وہ دروازے کی طرف جا رہا تھا — آہستہ سے اس نے دروازے کی زنجیر ہٹائی، اور باہر نکل کر بغیر کسی آواز کے اس نے کواڑ بند کر دیئے۔ ماسٹر نہیں اٹھا۔ اس نے سوچا — وہ بھاگ رہا ہے۔ چلو چھٹی ہوئی — تاہم وہ بڑے غور سے آہٹ لے رہا تھا۔ باہر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ یقیناً وہ بلندی سے نیچے اتر گیا ہوگا۔ تبھی اسے پانی گرنے کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ جس کا وہ کوئی مطلب نہیں سمجھ سکا۔ مگر اچانک ماسٹر نے دیکھا کہ وہ عرب دروازے کی چوکھٹ میں اسی طرح آہستہ آہستہ آکر کھڑا ہو گیا۔ بہت دھیمے سے اس نے دروازہ بند کیا۔ زنجیر چڑھائی اور پھر اپنے بستر پر

آکر لیٹ گیا۔ اب ماسٹر کو قیدی کے سونے کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ بہت جلد ہی سو گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی، اس وقت کافی دن نکل آیا تھا۔ عرب قیدی ابھی تک گھٹنے موڑے کمبل میں لپٹا ہوا سو رہا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر حیوانی جذبات نہیں تھے۔ بلکہ گمبھیرتا اور دشواس کا غم آمیز سکون اس کے چہرے پر جھلک رہا تھا۔ ماسٹر نے اسے سونے دیا، اور اس دوران میں اس نے کافی تیار کرلی۔ اور تب اسے جگایا۔ قیدی ڈر سا گیا۔

کافی ختم کرکے ماسٹر نے اسے باہر لے جاکر ہاتھ روم کا سلیقہ بتا دیا۔ اور خود اندر آکر اس نے بستر اٹھائے۔ پھر کمرہ صاف کیا۔

ماسٹر نے برآمدے کے سامنے کی طرف دیکھا۔ سورج سر پہ چڑھ آیا تھا۔ اور برف پگھلنا شروع ہو چکی تھی۔ اسے بوڑھے فوجی استاد کی یاد آگئی ..... کل وہ بے عزت ہو کر لوٹا ہے۔ اسے دکھ پہنچانے کا اس کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ خود کو بہت کھویا کھویا سا، پریشان محسوس کرنے لگا۔ تبھی قیدی نے قیلولہ کرتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

خلاف طبیعت بھی اس کا دل قیدی میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس نے ایک کنکرا ٹھاکر سامنے پھیلی ہوئی برف کی چادر پر پھینکا۔ کنکر ایک مخصوص آواز سے نیچے وادی میں غائب ہو گیا۔ ...

یہ قیدی خونی ہے۔ قاتل ہے۔ اور قتل سے بڑھ کر قابلِ نفریں جرم اور کیا ہو سکتا ہے؟ ..... لیکن اس یک طرفہ قانون کے حوالے کر دینا بھی کہاں کا انصاف ہے؟ تصور ہی سے اسے ندامت ہونے لگی۔ وہ اپنے آدمیوں کو کوسنے لگا جنھوں نے اسے اس پریشانی کے عالم میں پھنسا دیا تھا۔ اور بالآخر اس کا غصہ جاکر اترا اس قیدی پر۔ جو ایسا بھیانک جرم کرنے کی جرأت کر بیٹھا، اور پھر بھاگ بھی نہیں سکا۔

کچھ دیر کے لئے وہ چہل قدمی کرتا رہا۔

پھر دوسرے کمرے میں چلا آیا اور قیدی کو بھی وہیں بلا لیا۔

اندر آکر قیدی نے دیکھا کہ ماسٹر نے کپڑے پہن لئے ہیں۔ اب وہ جوتا پہن رہا تھا۔ تو اس نے بھی تیاری شروع کردی۔ چغہ تو اس کے بدن پر تھا ہی۔ اس نے چپل پہنے اور سر پر رومال لپیٹ لیا۔ اور ماسٹر کے سامنے آکھڑا ہوا۔

ماسٹر نے دروازے کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا۔

"تم جاؤ!"

مگر جب قیدی نے جنبش تک نہ کی تو بولا۔ "میں بھی چل رہا ہوں"

اس کے پیچھے پیچھے عرب بھی دروازے سے باہر نکل آیا۔ مگر ماسٹر پھر اپنے کمرے میں واپس لوٹ آیا۔ ایک کاغذ میں اس نے کچھ بسکٹ اور کھجوریں وغیرہ لپیٹیں۔ باہر نکلنے سے پہلے اسے کچھ جھجک سی محسوس ہوئی۔ پھر بھی وہ دل کڑا کرکے باہر نکل ہی آیا۔ دروازہ بند کیا۔ آگے آگے وہ تھا، اس کے پیچھے آزاد قیدی۔ دونوں خاموشی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ اس طرح وہ تقریباً ایک گھنٹے تک چلتے رہے۔ اب وہ ایک چٹان کے آگے ایک مختصر سی ہموار چٹان پر آپہنچے تھے۔ یہاں سے لمبی ڈھلوان شروع ہوتی تھی مشرق کی طرف نیچے کے میدان میں دور کھیتوں کے بیچ آبادی کے آثار نظر آرہے تھے۔

ماسٹر نے دونوں طرف دیکھا۔ دور افق کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ آدمی تو کجا۔ کوئی پرندہ تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس نے عرب کی طرف دیکھا۔ جو اپنی ویران آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ماسٹر نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بنڈل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو! اس میں کچھ بسکٹ ہیں، کھجوریں اور مٹھائی بھی ہے

تمھارے لئے یہ دو دن تک کافی رہے گی ۔ ماسٹر نے مشرقی راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پھر کہا — یہ راستہ ٹن جن کو جاتا ہے دو گھنٹے کا سفر ہے۔ ٹن جن میں سرکار ہے، اور پولیس ہے جو تمھاری راہ دیکھ رہی ہے!"

قیدی نے مشرق کی طرف ویران نظریں پھیلا دیں۔

مگر ماسٹر نے اس کی کہنی کو ٹہوکا دیا۔ اور اسے جنوب کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ ایک پگڈنڈی جنوبی چٹانوں میں لگے جا کر غائب ہو جاتی تھی۔ یہ پگڈنڈی تمھیں ان ٹیلوں کے اس پار لے جائے گی۔ تمام دن کے سفر کے بعد ایک چراگاہ آئے گی جہاں عربی قبائلی بستی ہے۔ وہ لوگ تمھارا استقبال کریں گے اور شاید وہ تمھیں پناہ بھی دیں۔"

عرب کے دونوں بھرے ہوئے ہاتھ بدستور سینے کے ساتھ لگے ہوئے تھے اس نے ماسٹر کی طرف دیکھ کر کہا۔ "مگر —؟"

"نہیں! تمھیں کچھ بولنے کی ضرورت نہیں — میں اب لوٹتا ہوں۔"

اور وہ لوٹ پڑا۔ اس نے اسکول کی سمت میں دو لمبے لمبے ڈگ اٹھائے۔ پھر کچھ جھجک کر پیچھے کی طرف دیکھا عرب اسی طرح جامد اور بے حس و حرکت ساوہیں کھڑا تھا۔ ماسٹر پھر چل پڑا۔ اس کے پاؤں سخت اور سرد زمین پر کھٹ کھٹ بجتے رہے۔ کچھ دور تک تو اس نے ادھر نہیں دیکھا۔ پھر جب پیچھے مڑ کر ایک بار دیکھا تو عرب اب بھی اسی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ بس اس کی نظریں اسکول کی طرف لوٹتے ہوئے ماسٹر پر جمی تھیں۔ نہ معلوم ان نظروں میں ماسٹر کے لئے کیا تھا! ماسٹر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے گلے میں کوئی چیز اٹک گئی ہے۔ شاید اسی وجہ سے وہ بول نہیں سکا۔ پھر جیسے اس نے اپنے عزم کو ترجیح دی۔ اس نے دور ہی سے قیدی کو جنوب کی طرف چلے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ اور تیزی سے اپنے گھر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

کچھ دور تک چلنے کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا — عرب کی جگہ خالی تھی۔

ماسٹر جھجکا۔ قریب ہی ایک چٹان اپنا سر اوپر اٹھائے کھڑی تھی۔ جہاں سے شاید وہ دور دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ ماسٹر کا چہرہ پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ جب کہ وہ اوپر پہنچا، سانس روکے ہوئے اس نے جنوب کی طرف نظریں پھیلا دیں۔ جنوب کے راستے میں کھڑی اونچی نیچی چٹانوں کے اوپر نیلا آسمان تھا —" تو کیا ابھی وہ یہاں تک نہیں پہنچ سکا؟ یا کہیں ان چٹانوں ہی میں کھو گیا؟ اسے وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔" اونہہ! اُسے کیا۔ اس کا فرض تو پورا ہو گیا۔ دل میں ایک ہلکا پن سا چھا گیا اور وہ نیچے اُترنے کے لئے مڑا — مشرق کے میدان پر گرمی کی وجہ سے بھاپ کی ایک چادر سی چھا رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ماسٹر نے دھڑکتے ہوئے دل سے دیکھا ۔ ۔ ۔ ۔ کہ وہ عرب 'ٹن جن' کی راہ پر اسی طرح سر جھکائے چلا جا رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی قبر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد ماسٹر اپنے اسکول کے برآمدے میں ریلنگ کے سہارے کھڑا اس ٹیلے پر برستی ہوئی صاف شفاف دھوپ کا نظارہ کر رہا تھا۔ اندر کلاس روم میں لٹکے ہوئے نقشے پر بنے ہوئے اس صوبے کے دریا بدستور اپنے دہانے کی طرف رواں تھے شاید ان کے نیچے ہی کسی نے لکھ دیا تھا: "تم نے ہمارے بھائی کو موت کے ہاتھوں میں سونپا۔ تمھیں اس کی قیمت چکانا ہوگی۔"

ماسٹر نے دوبارہ اپنی نگاہیں باہر پھیلا دیں۔ اس خطۂ زمین پر — جسے وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ آج وہ اکیلا تھا — بالکل اکیلا —!!!

(شمارہ ۱۱۴ — سنہ ۶۱ء)

الائی الک — یوگین پیٹروف
ترجمہ
سید رضا کاظمی

امریکہ مل گیا

(روسی کہانی)

جہاز کے مستول سے چپکا ہوا ملاح چیخ اٹھا: "زمین۔ زمین۔"

زمین کا نشان صاف نظر آرہا تھا۔ کرسٹوفر کولمبس نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کا طویل اور اذیت دہ سفر ختم ہوچکا تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے اپنی دور بین اٹھائی اور پھر اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"سامنے پہاڑی کا سلسلہ نظر آرہا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ ان پہاڑوں میں کھڑکیاں نظر آرہی ہیں۔ میں نے آج سے پہلے کبھی کسی پہاڑ میں کھڑکیاں نہیں دیکھیں!"

دفعتاً ایک ملاح نے چلاکر کہا: "ادھر دیکھئے۔ یہاں کے لوگوں کی ایک کشتی ہمارے جہاز کی جانب آرہی ہے۔"

اور اپنی چوڑی ٹوپیاں اور ڈھیلے ڈھالے لبادے سنبھالتے ہوئے تمام لوگ جہاز کے اس حصہ کی جانب دوڑے، جدھر وہ کشتی بڑھ رہی تھی۔

سبز رنگ کی عجیب سی وردی پہنے ہوئے دو آدمی کشتی سے اتر کر جہاز پر آئے اور ان میں سے ایک نے کولمبس کے ہاتھ میں ایک کاغذ پکڑا دیا۔

کولمبس نے سینہ تان کر کہا — "میں تمہارا ملک دریافت کرنے آیا ہوں - اسپین کی ملکہ ازابیلا کے نام پر میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ یہ زمین۔۔۔۔۔۔"

آنے والے وردی پوش نے کہا "بے کار کی باتیں چھوڑو۔ پہلے اس کاغذ کی خانہ پری کرو، اور ان پر چھپے ہوئے سوالات کا جواب دو۔ اپنا نام، باپ کا نام، پیشہ اور قومیت ظاہر کرو، اور یہ بھی بتاؤ کہ تم شادی شدہ ہو یا کنوارے؟ رات میں دیکھ سکتے ہو یا تمہیں موتیا بند کی بیماری ہے؟ تم لوگ امریکی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش تو نہیں کروگے؟ اور یہ بھی بتاؤ کہ تم لوگ بے وقوف تو نہیں ہو۔

یہ بے سروپا باتیں سن کر کولمبس اپنی تلوار کی طرف لپکا، لیکن وہ بے وقوف نہ تھا۔ اس لئے فوراً ہی اپنے غصے پر

قابو پاکر سنبھل گیا، اور اپنے ساتھیوں سے بولا۔ "ہمیں ان غیر ملکیوں کو ناراض نہ کرنا چاہیئے۔ یہ لوگ بچوں کی مانند ناسمجھ اور بھولے نظر آتے ہیں۔ مجھے غیر ملکیوں کے طور طریقوں اور عادات وخصائل کا بخوبی اندازہ ہے۔"

باوردی شخص نے کہا۔ "کیا تمھارے پاس واپسی کے ٹکٹ اور پانچ سو ڈالر نقد ہیں؟"

"ڈالر؟ ۔۔ ڈالر کیا ہوتا ہے؟" کولمبس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"تم نے سوال نامہ میں لکھا ہے کہ تم بے وقوف نہیں ہو۔ پھر بھی تم نہیں جانتے کہ ڈالر کیا ہوتا ہے؟ آخر تم یہاں کس غرض سے آئے ہو؟"

"میں امریکہ کو روشنی میں لانا چاہتا ہوں، اسے مہذب دنیا سے روشناس کرانا چاہتا ہوں۔"

"تو کیا اس مقصد کے لئے تم کوئی اشتہار دینا یا پبلسٹی کرنا پسند کروگے؟"

"اشتہار؟ ۔۔ پبلسٹی؟ ۔۔ معاف کیجئے یہ الفاظ میں زندگی میں پہلی بار سن رہا ہوں۔"

اُس آدمی نے مسکراکر کولمبس کو سر سے پاؤں تک کچھ اس انداز میں دیکھا جیسے وہ کوئی عجیب وغریب مخلوق ہو۔ پھر ہنس کر کہا۔ "تو تم یہ بھی نہیں جانتے کہ پبلسٹی کیا چیز ہے؟"

"جی نہیں۔"

"اور تم امریکہ کو دریافت کرنا چاہتے ہو؟ اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو کبھی ایسی حماقت نہ کرتا۔"

کولمبس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اُس نے سخت لہجے میں کہا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اس زرخیز خطۂ زمین کو روشنی میں نہیں لا سکتا؟"

"غیر معمولی پبلسٹی کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔" یہ کہہ کر وہ وردی پوش اپنی کشتی میں سوار ہوکر ساحل کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس کے پیچھے دوسری کشتی میں کولمبس بھی ساحل کی جانب چلا۔

ساحل پر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، اور آبی پرندے اُڑ رہے تھے۔ ساحل پر قدم رکھتے ہی کولمبس کا دل خوشی سے پھول اٹھا اس وقت اس کے ہاتھ میں موتیوں کا بنڈل تھا جسے وہ ہاتھی دانت کے بنے ہوئے سامان سے تبادلہ کرنا چاہتا تھا، اور دوسرے ہاتھ میں اسپین کا پرچم تھا جسے وہ اس ملک کی سرزمین پر نصب کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اِدھر اُدھر کافی تلاش کے بعد بھی اُسے کہیں نرم زمین نہ ملی۔ جس پر وہ پرچم گاڑ سکتا۔ اُسے تو بس چاروں طرف اونچی عمارتیں اور کنکریٹ کی سخت سڑکیں ہی نظر آئیں۔

دفعتًا پنسل اور کیمروں سے مسلح ایک مجمع اُس کے قریب سے گذر گیا۔ مجمع نے ترلے مڑے کانوں والے ایک آدمی کو گھیر رکھا تھا۔ وہ ایک مشہور مکے باز تھا جس کی گردن چھوٹی اور موٹی تھی، اور جسم گٹھا ہوا تھا۔ مجمع کی نظریں اُس آدمی پر جمی ہوئی تھیں اور کسی نے کولمبس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔

چند لمحے بعد دو عورتیں جن کے چہرے رنگے ہوئے تھے، اُس کے قریب سے گذریں۔ اور ان میں سے ایک نے اُس کی جانب اشارا کرتے ہوئے دوسری سے کہا۔

"یہ ہاتھ میں جھنڈا لئے ہوئے غیر ملکی کون ہے؟"

"غالباً اسپین کے کسی ہوٹل کی پبلسٹی کر رہا ہے۔" دوسری نے جواب دیا۔

کولمبس اُس سرزمین پر اسپین کا پرچم نصب کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ دو ایک جگہ اُس نے کوشش بھی کی لیکن اس کوشش میں اس کی تلوار بھی ٹوٹ گئی۔ مجبوراً وہ اس زری کے کام سے چمکتے پرچم ہی کو لئے سڑک پر آگے بڑھتا رہا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے موتیوں کے بنڈل کا بوجھ نہ اٹھانا پڑا۔ کیونکہ چُنگی ادا نہ کرنے کے جرم میں کسٹم والوں نے موتیوں کا بنڈل ضبط کرلیا تھا۔

کولمبس نے دیکھا کہ سینکڑوں ہزاروں افراد اپنے اپنے کام میں مشغول اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی اس حقیقت کا احساس نہیں ہے کہ کولمبس نے انھیں اور ان کے ملک کو دریافت کیا ہے؟ کولمبس کو نہایت مایوسی ہوئی۔ اُس نے سوچا کہ ناحق ہی اُس نے اتنی اذیت اٹھائی۔ اتنا طویل سفر کیا۔ طوفانی سمندروں کا سینہ چیر کر یہاں پہنچا جہاں کوئی اس کی طرف توجہ ہی نہیں دیتا۔

دفعتاً اُس نے دیکھا کہ قریب ہی ایک نیٹو (سیاہ فام امریکی) کھڑا اُس کی جانب غور سے دیکھ رہا ہے۔ اُس نے قریب جا کر فخریہ انداز میں کہا۔

"میرا نام کرسٹوفر کولمبس ہے۔"

"کیا کہا تم نے؟" اس نیٹو نے پوچھا۔

"میں کرسٹوفر کولمبس ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں۔ ذرا ہجے کرکے بتاؤ۔"

کولمبس نے اپنے نام کے ہجے کئے تو اُس آدمی نے ہولے سے کہا: "ہاں ہاں مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے تمھارا نام کہیں سُنا ہے۔ غالباً تم ہلکی مشینوں کے تاجر ہو۔"

"جی ہاں۔ میں نے امریکہ دریافت کیا ہے۔"

"کیا واقعی؟ کب؟"

"تھوڑی دیر پہلے۔"

"اوہ۔ یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔ خیر مسٹر کولمبس اب یہ بتاؤ کہ تم چاہتے کیا ہو؟"

"میرا خیال ہے کہ اپنے کارنامے کی بنا پر میں عزت و احترام کا مستحق ہوں۔"

"تو کیا بندرگاہ پر کسی نے تمھارا استقبال نہیں کیا؟"

"نہیں۔ یہاں تو لوگوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ میں نے انھیں دریافت کیا ہے!"

"تو غلطی تمھاری ہی ہے۔ تمھیں اپنی آمد کی اطلاع بذریعہ کیبل (بحری تار) دینی چاہئے تھی۔ جب تم ایک نیا ملک دریافت کرنے نکلے تھے تو تمھیں اخباروں کو اطلاع دینی چاہئے تھی۔ رپورٹروں کو سُنانے کے لئے دو چار چٹ پٹے ٹُٹکلے یاد کرلینے چاہئے تھے اور بندرگاہ پر دس پندرہ فوٹوگرافروں کا انتظام کرلینا چاہئے تھا۔ ان معاملوں میں پبلسٹی کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔"

"پبلسٹی؟ —— میں آج دوسری بار یہ لفظ سن رہا ہوں —— آخر اس کا مفہوم کیا ہے؟ —— کیا یہ کوئی مذہبی نعرہ ہے؟ یا کسی خفیہ جماعت کا کوڈ ورڈ؟"

"بچے نہ بنو۔ پبلسٹی کے معنی پبلسٹی یعنی تشہیر ہے۔ خیر مجھے تم پر ترس آتا ہے۔ میں تمھارے لئے کچھ کرنے کی کوشش کروں گا ——"

"وہ آدمی کولمبس کو ایک ہوٹل میں لے گیا جہاں اُسے چوالیسویں منزل پر ایک کمرہ ملا۔ اُس کمرے میں تنہا چھوڑ کر وہ آدمی باہر چلا گیا۔"

کچھ دیر بعد جب وہ آدمی واپس آیا تو اس کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک چھوٹی کتاب تھی اور وہ مستقل کوئی چیز چبائے جا رہا تھا۔ دوسرے نے کمرے کے وسط میں ایک تپائی رکھ کر اس پر کیمرہ رکھ دیا، اور کولمبس سے کہا۔

"اب ذرا مسکرائیے، ہنسئے —— ارے آپ سمجھتے نہیں۔ اچھا دیکھئے جیسے میں کرتا ہوں ویسے ہی کیجئے۔"

یہ کہہ کر وہ فوٹوگرافر بڑے بھدے انداز میں مسکرانے لگا۔ جسے دیکھکر کولمبس کو ہنسی آ گئی۔ دفعتاً کمرے میں تیز روشنی کی چمک ابھری اور فوٹوگرافر نے آگے جُھک کر کہا۔

"تھینک یو۔"

دوسرے شخص نے جو بدستور کوئی چیز چبا رہا تھا، کولمبس کے قریب آکر اور اپنی کاپی زانو پر پھیلا کر کہا۔

"آپ کا نام؟"

"کولمبس۔"

"ذرا ہجّے بتا دیجئے تاکہ غلطی نہ ہو جائے۔ کو۔ لم۔ لبس۔ ٹھیک ہے۔ ہاں تو مسٹر کولمبس آپ کو امریکہ کیسا نظر آیا؟"

"ابھی تو مجھے اس ملک کو پوری طرح دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا ہے اس لئے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

کچھ دیر تک سوچنے کے بعد رپورٹر نے کہا۔ "اوہ، یہ بات ہے۔ اچھا تو یہ بتائیے کہ آپ کو نیویارک میں کون سی چار چیزیں بہت اچھی لگیں؟"

"میں کچھ دیکھے بغیر کیونکر کوئی رائے ظاہر کر سکتا ہوں۔"

رپورٹر پھر سوچ میں پڑ گیا۔ اُس نے لاتعداد فلم اسٹاروں اور مکہ بازوں کا انٹرویو لیا تھا، لیکن اُسے پہلے کبھی ایسی پریشانی کا سامنا نہ ہوا تھا۔ کچھ سوچنے کے بعد اس نے پوچھا۔

"اچھا یہ بتائیے کہ کون سی دو چیزیں آپ کو پسند نہیں آئیں؟"

کولمبس نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ بغیر پبلسٹی کے بھی میرا کام چل جائے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"

"یہ آپ کا پاگل پن ہے۔" اُس رحم دل نیٹوے کہا۔ "آپ نے امریکہ دریافت کیا، یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ امریکہ آپ کو دریافت کر سکے۔"

"اچھا مسٹر کولمبس یہ بتایئے کہ امریکی عورتیں آپ کو کیسی لگیں؟"

رپورٹر نے پوچھا۔ اور جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اُس نے اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ درمیان میں کئی بار اُس نے اپنا سگریٹ منہ سے نکال کر کان پر رکھ لیا اور کئی بار پنسل دانتوں میں دبا کر چھت کو گھورنے لگا۔ جیسے کسی گہری سوچ میں غرق ہو۔ کچھ دیر بعد اُس نے اپنی نوٹ بک بند کرتے ہوئے کہا۔

"اوکے۔"

اور کولمبس کی مخملی پشت کو تھپتھپا کر اُس سے ہاتھ ملانے کے بعد فوٹوگرافر کے ساتھ چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد نیٹو نے کہا "اب سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ چلو ذرا شہر کی سیر کر لیں۔ چونکہ تم نے یہ ملک دریافت کیا ہے۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ تم اُسے گھوم کر دیکھ بھی لو۔ لیکن یہ پرچم یہیں چھوڑ دو۔"

شہر کی سیر کا اختتام ایک پینتیس سینٹ والا شو دیکھنے پر ہوا۔ جہاں سے شہر میلا کولمبس اُس بلّی کی مانند جس نے اپنا منہ کھولتے ہوئے دودھ میں ڈال دیا ہو، بھاگ آیا۔

اگلی صبح وہی نیٹو اخبار ہاتھ میں لئے ہوئے کولمبس کے ہوٹل والے کمرے میں داخل ہوا۔ اور اخبار کولمبس کے ہاتھ میں ٹھونس دیا۔ کولمبس نے اخبار کے چھبیسویں صفحے پر اپنے دانت نکالے ہوئے چہرے کو پہچان لیا۔ اُس اخبار میں لکھا ہوا تھا کہ کولمبس کے خیال کے مطابق امریکی خواتین تمام دنیا کی عورتوں سے زیادہ حسین و دل کش ہیں اور وہ انھیں دیکھ دیکھ کر پاگل ہو گیا ہے۔ اخبار میں یہ بھی لکھا تھا کہ وہ ملک حبش کے شہنشاہ ہیل سیلا سی کا گہرا دوست ہے۔ اور عنقریب ہارورڈ یونیورسٹی میں جغرافیہ پر لکچر دے گا!

قسمیں کھا کھا کر کولمبس نے نیٹو کو یقین دلایا کہ اس نے رپورٹر سے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ لیکن نیٹو نے یہ کہہ کر اسے خاموش کر دیا کہ اسے پبلسٹی کہتے ہیں۔ اور پبلسٹی نے اپنا اثر دکھا دیا ہے۔ ہالی وڈ کے چند فلم ساز اُسے فلم میں کام کرنے کا آفر دینے کے لئے خود آئے ہیں اور باہر اس کا انتظار کر رہے ہیں!

"دیکھئے مسٹر کولمبس" ایک فلم ساز نے اندر آ کر کہا "ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہماری تاریخی فلم میں کام کریں۔ سچ کہتا ہوں۔ پبلک آپ کو دیکھنے کے لئے سینما گھر پر ٹوٹ پڑے گی۔ اس فلم کی یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ اس کے تمام مکالمے دیہاتی زبان میں ہوں گے۔ ہماری اس فلم کی کہانی الیگزینڈر ڈوما کے مشہور ناول "کاؤنٹ آف مانٹو کرسٹو" پر مبنی ہے۔ لیکن ہم نے آپ کی شخصیت کے پیشِ نظر اس میں ضروری ردّ و بدل کر لیا ہے۔"

کولمبس نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف اس کے ہونٹ ہلتے رہے۔ غالباً وہ دل ہی دل میں اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے دعائیں مانگ رہا تھا۔

فلم ساز کہتا رہا۔ "اس تاریخی فلم میں آپ کو جو کردار سونپا جائے گا وہ کہانی کی جان ہے۔ فلم کا مرکزی کردار ہے۔ وہ اسپین کی ملکہ کی محبت میں سرشار ہے اور ساتھ ہی ساتھ روس کی شہزادی رشا کی محبت میں بھی مست ہے۔ لیکن کارڈنیل رچلو اسکوڈی گاما کو رشوت دے کر تمھیں لیڈی ہملٹن کی مدد سے امریکہ بھجوا دیتا ہے۔ دورانِ سفر

بحری قزاق تم پر حملہ کرتے ہیں ۔ فلم میں یہ منظر تقریباً ایک ہزار فٹ لمبا ہے ۔ ممکن ہے تم اداکاری نہ کر سکو، لیکن اس فلم میں اداکاری کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے ۔"

"تو پھر کس چیز کی اہمیت ہے؟" کولمبس نے ہولے سے پوچھا۔

"پبلسٹی کی"—— فلم ساز نے جواب دیا ۔" عوام تمھیں جانتے ہی ہیں ۔ وہ تمھیں ڈاکوؤں سے برسرِ پیکار دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑیں گے ۔ فلم کا اختتام تمھارے امریکہ کو دریافت کرنے کے واقعہ پر ہوگا ۔ لیکن یہ واقعہ بھی کچھ خاص اہم نہیں ہے ۔ اہم بات ہے تمھاری بحری قزاقوں سے خونریز جنگ ۔ تلوار، فلیتہ والی بندوق اور دوسرے تمام اسلحے جن کی اس بحری لڑائی میں ضرورت ہوگی ہمارے اسٹوڈیو میں موجود ہیں ۔ البتہ تمھیں اپنی داڑھی مونچھ کا صفایا کرانا ہوگا ۔ ہمیں اپنی فلم میں ڈاڑھی نہیں چاہئے ۔ روس کے متعلق بننے والی ہماری لاتعداد فلموں میں تماش بینوں نے اتنی بار داڑھیاں دیکھ لی ہیں کہ اب وہ کسی نئی فلم میں داڑھی مونچھ دیکھنا نہیں چاہتے۔

جب فلم ساز کولمبس سے کنٹریکٹ پر دستخط لے کر چلا گیا تو کولمبس اسپین کی ملکہ کو خط لکھنے بیٹھ گیا ۔ اُس نے لکھا۔

"میں نے بہت سے ملکوں کا سفر کیا ہے ، لیکن ایسے دلچسپ باشندے مجھے کسی ملک میں نظر نہیں آئے ۔ انھیں شور و غل سے دلچسپی اور سکون سے بیزاری ہے ۔ انھوں نے شہروں میں چوڑی چوڑی سڑکوں کا جال بچھا رکھا ہے ۔ یہ تمام سڑکیں آہنی پُلوں پر تعمیر کی گئی ہیں ، اور ان پر ہمہ وقت سینکڑوں آہنی گاڑیاں دوڑتی رہتی ہیں ۔

میں ابھی تک یہ طے نہیں کر سکا کہ یہ لوگ کس قسم کے انسان ہیں ۔ البتہ اس کی تصدیق ہو چکی ہے کہ ان کی مرغوب غذا " ہاٹ ڈاگس" ہے ۔ میں نے بچشمِ خود کئی ایسے ہوٹل دیکھے ہیں ۔ جہاں یہ "گرم کتے" فروخت ہوتے ہیں اور لوگ اسے مزے لے کر کھاتے ہیں ۔

یہاں ہر ایک آدمی ایک خاص شے کی بُو میں ڈوبا رہتا ہے ۔ یہ لوگ اس شے کو گیسولین کہتے ہیں ۔ تمام شاہراہوں پر اس کی بُو پھیلی ہوئی ہے حتیٰ کہ خواتین کے جسم سے بھی اسی کی بُو آتی ہے !

مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگ بُت پرست ہیں ، اور ان بتوں کے نام موٹے موٹے حروف میں اپنی جھونپڑیوں پر لکھ رکھے ہیں ۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ چند مخصوص بتوں کے نام کوکوکولا ۔ کیفے ٹیریا اور گیسولین کی بو والے عظیم دیوتا فورڈ ہیں ۔

یہ لوگ بڑے پیٹو معلوم ہوتے ہیں ۔ ہر وقت کوئی چیز چباتے رہتے ہیں ۔ براڈوے نامی مقام پر دکھائے جانے والے تماشے نے مجھے حیرت زدہ

کر دیا ہے۔
بے شمار لوگ ایک جھونپڑی میں جسے " نائٹ کلب " کہتے ہیں جمع ہو جاتے ہیں اور یہ تماشہ دیکھنے کے لئے جسے یہ لوگ " بربیک " کہتے ہیں، بے تاب نظر آتے ہیں ....
ہوتا یہ ہے کہ چند مقامی خواتین ایک اسٹیج پر جا کر جنگلی جانوروں کی آوازیں چیں چیں، ہیں ہیں کر کے بجنے والی موسیقی کی سُروں پر اپنا لباس آہستہ آہستہ اُتارنے لگتی ہیں، اور لوگ زور زور سے تالیاں بجاتے ہیں۔ جب یہ خواتین بالکل برہنہ ہو جاتی ہیں تو دیکھنے والوں کی بے تابی اور ہلچل نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ وہ لوگ سٹیاں بجاتے ہیں، اور اپنی کرسیوں پر اُچھلتے ہیں ..... لیکن اُسی وقت یہ تماشہ ایک ٹریجڈی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یعنی نہ جانے کیوں اُسی وقت پردہ گرا دیا جاتا ہے اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیتے ہیں ....."

(شمارہ ۱۷۱-۱۷۰ سنہ ۶۵ء)

پُل پُختہ

(صفحہ ۱۱۱۱ سے آگے)

"کسی کو جانتے ہو یہاں؟" حوالدار نے چیخ کر پوچھا
فیضو کوئی جواب نہ دے سکا۔
"کس کے ہاں مزدور ہو؟"
"جی یہاں، اسی پُل پختہ پر ــــ پُل ..... پختہ .... پُل ....."
فیضو کا لہجہ لڑکھڑا گیا۔
سپاہیوں نے مل کر ایک اور قہقہہ لگایا۔
"پُل پختہ ہے کیا چیز؟" حوالدار کا غصّہ کافور ہو گیا۔
"جی پُل ..... پُل پختہ ..... فیضو کے دانت بجنے لگے۔
لیکن جب اس کے حواس بجا ہوئے تو اس نے اپنے آپ کو حوالات کی سلاخوں میں بند پایا۔ مگر یہاں بھی وہ اپنے بچّوں کی بھوک سے زیادہ 'پل پختہ' کے اس مالک کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اُسے ضمانت پر رہا کرانے آنے والا تھا۔

(شمارہ ۳۱۷ سنہ ۶۹ء)

جان اُپڈائک
ترجمہ
محمد علی صدیقی

ہیئٹ دائ

(امریکی کہانی)

۳۴ سالہ جان اُپڈائک موجودہ دور کا بہت ہی ذہین امریکی ناول نگار، افسانہ نویس اور شاعر ہے۔ وہ انتہائی پختہ کار و پختہ ذہن ہے، اور امریکہ کے ادبی حلقے اس کی تحریروں کو فاکنر اور ہمینگوے کی روایت کی بقا کے نام سے موسوم کر رہے ہیں۔ اس نے ہارورڈ کالج میں تعلیم پائی اور پھر بعد میں آکسفورڈ (انگلستان) میں آرٹ کی تعلیم حاصل کی۔ اس کی ادبی زندگی کا آغاز "نیویارک" کی قلمی معاونت سے ہوا۔ اب تک اس کے دو ناول ایک مجموعۂ نظم اور افسانوں کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں — "سینٹور" (CENTAUR) اس کا مشہور ناول اور — "پجن فیدرز" (PIGEON FEATHERS) اُس کے افسانوں کا مشہور مجموعہ ہے۔ وہ ادب میں ماضی کو نت نئے طریقے سے دریافت کرنا چاہتا ہے۔ اسی لئے اس کی مرکزی توجہ انسانی یادداشت اور اس کے الیئے ہیں — اردو افسانے کے قارئین کو اس افسانے کا موضوع کافی نیا معلوم ہوگا۔ لیکن اس سے جدید امریکی افسانے کے رجحان کو سمجھنے میں یقیناً مدد ملے گی۔

مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ آ نہ جائے۔ میں اس وقت چوبیس سال کا تھا، اور میرے اندر وقوع پذیر ہونے والا مذہبی احیاء اپنے شباب پر تھا۔ گرمیوں میں میں نے کرکیگارڈ کو دریافت کیا تھا، اور پھر میں ہر ہفتے اپنے کمرے میں اس کی تخلیقات کے خوب صورت اور مہنگے ایڈیشن لایا کرتا تھا۔ وہ بہت ہی خوب صورت کتابیں ہوتیں۔ بعض بہت ہی ضخیم اور بعض بہت ہی پتلی۔ لیکن ان کی طباعت اور سرورق بہت ہی دیدہ زیب ہوتے۔ ہر صفحے پر چھوٹی چھوٹی سرخیاں بعض الفاظ پر زور دینے کی غرض سے خط شکست کا جگہ جگہ استعمال اور پھر وہ جرمن فلسفے سے مستعار شدہ بندھے مستقل جملے اصطلاحیں

اور توجیہات اور پھر مترجم حضرات اور خود کرکیگارڈ کے نہ ختم ہونے والے ذیلی نوٹ تمام صفحات پر کمبل بنتے ہوئے معلوم ہوتے اور یوں لگتا کہ امتیازات کے چکر سے مفلوج لیکن بپھرا ہوا فلسفی طنز پر طنز لکھتا جا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے کوپن ہیگن کے خالی گھر میں "یہودا" کو ایک ہی وقت میں پھاڑ کھانے کو دوڑ رہا ہے اور پھر اچانک اس کی تعریف کے دریا بہانے لگا ہے۔

میں جن شیطانوں یعنی ہیگل اور اس کے اوتاروں سے دست و گریباں تھا میرے لئے جانے پہچانے نہ تھے اس لئے مجھے کرکیگارڈ اپنے ٹو بیک پر بھوتوں کے ہجوم میں پھنسا ہوا معلوم ہوتا۔ کبھی کبھی خاموش مچھروں کو تھپڑ مارتا ہوا اور کبھی کبھی غیر موجود گیوں پر غصے میں ہلکان ہوتا ہوا۔ غرض عجیب کش مکش دکھائی دیتی تھی۔

یہ ایک ایسا تماشا تھا جو میں نے اپنی عمر میں کبھی صفحات پر بکھرا ہوا نہ دیکھا تھا اور مجھے اس تماشے نے اگست و ستمبر کی شاموں میں بڑا سکون بخشا، اور اس کے ساتھ ہی ہماری رلیسٹ سائڈ ہائی وے پر ٹریفک کی شوں شاں اور میری بیوی کا ہمارے چھوٹے سے باورچی خانے میں کھانے کے برتنوں کی چھن چھن میرے لئے کرکیگارڈ کے مطالعے کا پس منظر بن جاتی۔

ہم اس وقت لب دریا ایک عمارت کی چھٹی منزل میں رہتے تھے۔ سامنے دریائے ہڈسن تھا۔ دریا شام کو سادہ لباس اوڑھ لیتا اور دور کنارے پر جرسی کے چھوٹے چھوٹے مضافات ظلمت کے دست پناہ کے دو ہاتھوں کے درمیان پڑے ہوئے معلوم ہوتے۔ یہ روشنی کی ہلتی ہوئی سلاخیں سیاہ پانی پر منعکس ہوتیں اور جب کشتی دریا کا سکون توڑتی ہوئی آگے بڑھتی تو روشنی کے عکس بھی لرز پڑتے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔ اور جب کشتی دور نکل جاتی تو یہ سب پھر مجتمع ہو جاتے پھر وہی پہلے سی کیفیت پیدا ہو جاتی۔

ماہر ہیئت ہمارے کالج کے دنوں کی بچی بچائی پونجی تھا۔ میں نے اسے دو سال سے نہیں دیکھا تھا۔ جب میں اور ہیریئٹ انڈر گریجویٹ ہی تھے تو ایک شادی شدہ جوڑے نے اس سے ہمارا تعارف کرایا تھا۔ ہیریئٹ اس خاتون سے پہلے سے واقف تھی۔ وہ اسکول میں ساتھ پڑھی تھیں۔ اس لئے میں اور بیلا ہی ایک رسی کے دو مقابل سرے تھے۔ بیلا ہنگرین تھا۔ اس کے والدین کُن (K U N) حکومت کے مظالم سے تنگ آکر اپنے ملک کو خیرباد کہہ آئے تھے۔ وہ اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ ویانا سے وہ لندن آئے اور وہاں سے بیلا کو آکسفورڈ بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد کچھ سال پہلے وہ اس ملک میں ہجرت کر کے آ گئے۔ بیلا کوئی چالیس سال کا تھا گٹھے ہوئے چھوٹے سے جسم کا ٹھوس آدمی۔ اس کے بال بہت ہی گھنے اور سخت تھے اور ایک سلاو (S L A V) بائیسکل سوار کی طرح وہ بغیر مانگ نکالے سیدھے بال بنایا کرتا تھا۔ اس کے کچھ بال سفید پڑ گئے تھے۔ اس نے مجھے کچھ عجیب ٹھوس پن کا تاثر دیا تھا۔ اس کے اعضا، ایک دوسرے سے اس طرح مربوط تھے کہ درمیان میں کہیں بھی کوئی جگہ خالی نظر نہ آتی تھی۔ اس کے پیر کی حرکت سے اس کا سر آپ ہی آپ ہلتا اس سے رخساروں کی ہڈیاں اس کے چہرے میں ایک کھردری اور جارحانہ چوڑائی پیدا کر دیتی تھیں۔ وہ فولادی رم کی عینک لگاتا جو چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ وہ ان دنوں کولمبیا میں پڑھا رہا تھا۔ اور بلا کا ذہین تھا۔ لیکن شاذونادر ہی اپنے مضامین چھپوانے کی جسارت کرتا۔ اس نے اس کے جسم کے گرد اس کی ذہانت کا حصار ہر وقت موجود رکھتا۔

وہ میری بیوی کو پسند کرتا تھا۔ اور ہاں کرکیگارڈ کی طرح وہ بھی کنوارا تھا۔ بڑھاپے کے دنوں میں اس کے فلرٹ سے بھرے ہوئے آداب و اظہار کا دھارا سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ بہت ہی مرصع مگر دھیمے برطانوی لہجے میں بہتا ۔ چاہے یہ تعلق خاطر کا اظہار کھانے کی میز پر ہوتا یا کھانا کھانے کے بعد دوستوں کے کمرے میں لیکن یہ حقیقت ہے کہیں کہیں کا نہ رہتا۔ میں خود کو نہ جانے کیوں بدھو اور نا لائق سمجھتا اور پھر مجھے رہ رہ کر خیال آتا کہ ہیریئٹ میری بیوی نہیں ہے "آہ ہیریئٹ — ہیریئٹ" وہ پکارتا اور ہیریئٹ بولتے وقت "یٹ" کو ایسے بھرپور فرانسیسی وزن بوالہوسی سے ادا کرتا کہ جواب نہیں اور پھر کہتا "آؤ میرے اس بھول بھلیاں بستر پر بیٹھ جاؤ" اور پھر وہ اپنے برابر پڑے ہوئے کشن کو تھپکتا رہتا جو خود اس کے وزن کی بدولت دعوت کناں انداز میں اوپر اُٹھ آتا تھا۔

چاہے یہ بات زیادہ غیر سنجیدہ سمجھی جائے لیکن میں پھر بھی اس عمل کو بدتمیزی پر محمول نہ کرتا میں اس کی نگاہوں میں موجود ہی کہاں تھا۔ جو بدتمیزی سمجھتا اور خاطر خواہ ردعمل کا اظہار کرتا۔ اسے مجھ پر ایک فوقیت حاصل تھی۔ وہ چیزوں کو مجھ سے پرے دیکھ سکتا تھا۔ وہ چیزوں کو بین النجوم فاصلوں کے پار دیکھ سکتا تھا' اور وہ شاید ان سے پار بھی ہو سکتا تھا۔ اسے صرف ایک رکاوٹ کا سامنا تھا۔ اور وہ یہ کہ وہ جنسی بھوک کے پریشان کن مادے کو پار نہ کر سکتا تھا — وہ انسانی داخلیت پسندی کے بادلوں کو پار نہ کر سکتا تھا۔ جیسے اڑتی ہوئی اُمیدیں غیر مادی تعقل کی ہم رکاب ہوں۔ اس کی زبردست اور صاف فکر سے مجھے ہمیشہ ڈر لگتا تھا۔

اور آج جب وہ ہمارے کمرے میں آیا تو چاروں طرف گرم جوشی کی حرارت بکھیرتا ہوا آیا، اور اس نے ایک دم ہی مینو (MENO) اٹھالی جو میرے مطالعے میں تھی۔ میں اس وقت اسے دوران سفر آتے جاتے پڑھ رہا تھا۔ یہ ایک ڈائیلاگ ہے جس میں سقراط باطنی علم کا مظاہرہ کرنے کی غرض سے ایک چھوٹے سے لڑکے سے کچھ اقلیدسی حقیقتیں معلوم کرتا ہے۔

"اے میرے باپ، والٹر، تم اسے کیوں پڑھ رہے ہو؟ کیا اسی کتاب میں اُس نے دو اور دو چار ثابت کیا ہے؟" بیلا نے مجھ سے کہا اور اس انداز میں جیسے کسی دہریے نے چشم زدن میں افلاطونیت اور اس کے تمام ملحقہ گرجے دھڑام دھڑام گرا دیئے ہوں۔

کھڑکی کے پاس والی میز پر ہم نے کھانا کھایا جس میں دریائے ہڈسن روشنی کے ہالے میں کھودی ہوئی ایک بہت ہی ہیبت ناک دراڑ معلوم ہوتا تھا۔ ہم نے ہلکی گفتگو کی۔ میرا ایمان (جودیت اور پیسٹریٹن باہم) میری گرجا کی دعائیں۔ (ایک میتھوڈسٹ گرجا جس میں اندرون شہر کا روحانی خلا کوئی ایک درجن بوڑھی عورتوں کے ہیٹوں پر چھایا رہتا اور جہاں کا پادری مجھے دیکھ کر تعجب سے اخاہ کا نعرہ بلند کرتا ہے) سب وہم کی مدھم مدھم لو وں میں منتقل ہو گئے میں نے اُس کی آنکھوں کے پیچھے خلاؤں اور بخارات کا لامتناہی سلسلہ دیکھا۔ اور ساتھ ساتھ ہی اپنے جسم میں پیدا ہونے والے ہر لمحہ بے جان لیکن مشتعل اعصابی نظاموں کو بھی دیکھا۔ سورجوں کی قطاریں ماچس کی تیلیوں کے سروں کی طرح معلوم ہوتیں۔ سیارے ادھ جلے کوئلے اور کہکشائیں راکھوں کا ڈھیر اور پھر ان کے پار اور بھی کہکشائیں نظر آئیں جو بیمار کن رفتار سے دور ہٹتیوں کی آنکھوں کی دسترس سے باہر ہیں۔ میں نے اسے ایک دفعہ بیان کرتے ہوئے سُنا تھا

کہ ایک چھوٹا ستارہ (جسے سائرس (SIRIUS) کا ساتھی کہتے ہیں) اس قدر ٹھوس ہے کہ عمل کشش سے اس کی روشنی عکس شعاعی کے سرخ حصے پر جا پڑتی ہے۔

میری بیوی کافی سے قبل پھلوں کی خالی پلیٹیں لے گئی، اور اسی اثنا میں میں نے باقی ماندہ ارغوانی شراب اپنے جاموں میں بھرلی۔ بیلا نے سگار سلگایا اور اپنی پوری برقی طاقت سے گفتگو شروع کردی۔ یہ جان کر کہ میں ٹیلی وژن کے لئے کسی قدر مزاحیہ فیچر لکھا کرتا ہوں، اس نے مجھے بی بی سی کے تھرڈ پروگرام کی ایک پیروڈی سنائی۔ اس میں یہ تھا کہ ایک پروگرام میں پہلے برٹرینڈ رسل بائی (II) کے اعشاریہ سے پہلے پانچ سو مقامات پڑھتے ہیں اور پھر بیس منٹ تک ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ خاموش رہ کر عبادت کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد پھر رسل صاحب پائی کے اعشاریہ کے اگلے پانچ سو مقامات پڑھ جاتے ہیں میں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگیا اس لئے اور بھی کہ اس نے یہ مانا کہ رسل پر کسی وجہ سے ہنسا جا سکتا ہے اور عبادت اور LITTLE GIDDING کے مصنف کا بھی لحاظ طور پر وجود تسلیم کیا گیا تھا۔ شاید اسی لئے میں خود کو ذرا ہلکا سا محسوس کرتا رہا۔ کیونکہ میں اپنے توہم زدہ وجود کے بارے میں اس کی رائے سے واقف تھا۔ ذرا جھینپنے کا حق دے کر سفید روشنیوں کی بے پناہ دنیائیں ہویدا ہوگئیں۔ اور مجھے اپنی بیوی جو ہماری آنکھوں کے سامنے ایک کشتی میں تین چائنا کپ اور ایک ٹن پاٹ لئے ہوئے تھی بہت ہی حسین نظر آئی۔

آہ ہر روبیٹ ہرریئٹ (ہرربیٹ برائے ہیریئٹ) شادی کی تھکان بھی تمھاری خوبصورتی کی لو کو مدھم نہ کرسکی۔" بیلا نے کہا

میری بیوی شرم سے دمک اٹھی۔ اُس کے چہرے کا رنگ اُس کی تعریف کا فوری جواب دینے کا عادی ہوگیا تھا۔ اُس نے ٹرے میز پر رکھ دی۔

شراب اور کافی کے امتزاج کی لذت کو محسوس کرتے ہوئے ہم نے بیلا سے اُس کی اس ملک میں آمد کے بارے میں سننا شروع کیا۔ وہ مچیگن یونیورسٹی میں جنرل سائنس کا انسٹرکٹر تھا جہاں درجۂ حرارت مہینوں صفر پر رہتا۔ طلبار کیمپس میں برف سے سنگ تراشی کی مشق کیا کرتے۔ سارے کنٹوپ پہنتے اور سینے کو ڈھکے ہوئے ملتے۔ پہلے پہل اسے کنٹوپوں کی اہمیت سمجھ میں نہ آئی۔ وہ انھیں وسطی یورپ کے تنہا مزارعوں کی ضرورت سمجھتا تھا۔ مہینوں برف کے تھپیڑے کھانے کے بعد اسے یہ ہمت ہوئی کہ وہ اس بچکانہ چیز کو پوچھے اور خریدے۔ کنٹوپ خاطر خواہ آرام دہ ثابت ہوئے۔ وہ انھیں پہنتا رہا۔ حالانکہ امریکی معاشرت میں وہ فیشن میں داخل نہ تھے۔

"میں جانتی ہوں۔" ہیریئٹ نے کہا۔ "کہ سردیوں میں تم ان غریب مینڈیسی ایونیو کے لوگوں کو دیکھتے ہو۔"

"ہاں واللہ" بیلا نے بات کو کاٹتے ہوئے پلیٹ کے کونے میں سگریٹ کے گل سے کھیلتے ہوئے کہا۔

"ہاں اس پر کنٹوپ برے نہیں لگتے۔ کیونکہ وہ بال ہی نہیں کٹواتا ہے۔ اور تم نے ان لوگوں کو کبھی دیکھا ہے جو اپنے بالوں پر چھوٹے چھوٹے ہیٹ پہنے پھرتے ہیں۔ اُن کے کان کس قدر سُرخ ہوتے ہیں!

"اور ہاں" بیلا نے کہا "وہ سٹوڈینٹ کی لڑکیاں کس قدر بڑی بڑی جھالردار ٹوپیاں پہنتی ہیں۔" اپنے کانوں پر انگلیوں کو پھیلاتے ہوئے اور پھر دونوں انگلیوں کے درمیان سگار رکھتے ہوئے اس نے اپنے سر کو اس طرح نچایا کہ اس کا

سر ایک سینگ کی شکل اختیار کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھ بے اختیار پھیلتے رہنے۔ اس کا سینہ پھولتا رہا۔ اور پھر ایسا لگا جیسے اس نے ہمارے لئے ساری دور افتادہ خوشیوں کی شان و شوکت کو چھپٹانا چاہا ہو۔

اس کا سانس پھولنے لگا۔ اور پھر اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "وہ برف کی گیندیں ہیں جو برفانی کھیلوں میں لڑکیاں اپنے سینوں پر پہنتی ہیں۔" اس نے سینہ اس قدر کھینچا کر کہا جیسے ریڈیٹر تیز تیز چل رہا ہو۔ ہمیں یہ سُن کر کہ اس نے برف کا تماشہ دیکھا ہے بڑا تعجب ہوا۔ ہم اسے سیاح کہاں سمجھتے تھے۔ لیکن پھر معلوم ہوا کہ اُس نے شروع ہی میں ملک کو پوری طرح دیکھ لیا تھا۔ اس نے ایک پُرانی ڈوج خرید لی تھی، اور اس پر مغرب تک سفر کر ڈالا تھا۔ اس نے عجیب مقدس انداز میں گرانڈ کینٹین، یوسمائٹ اور سیٹوکس احاطہ بھی دیکھ ڈالا تھا۔ ادھر میکسیکو کی ایک سڑک کے ایک بڑے ٹکڑے کے متعلق اس نے کہا۔ "افوہ وہاں کس قدر سیاہ پہاڑیاں ہیں بے برگ و گیاہ۔ بہت وسیع و عریض سرخ سرخ موڑ ہیں جو ناقابل گمان حد تک بدہیئت ہیں اور میلوں تک چلے گئے ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے ہم دونوں کو دیکھا۔

میں نے اسے اس سے پہلے اس قدر تیزی سے بولتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی سیاہ پلکیں دو کمانوں کی طرح کھڑی ہو گئیں اور اس کا اوپر کا ہونٹ نیچے کے ہونٹ کو آہنی شکنجے میں جکڑتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ جس سے یہ گمان ہو رہا تھا کہ اب دانت گوشت سے پار نکل پڑیں گے۔ یہ کیفیت کافی واضح طور پر بتا رہی تھی کہ وہ کچھ چھپانے میں ناکام ہو رہا ہے۔

وہ مڑ گیا تھا۔

ہمارے چہروں کے نیچے میز پر رکھے ہوئے عکسوں کے ٹکڑوں میں منقسم تمام برتن شراب اور کافی کی بھوری تلچھٹ راکھ اور ایش ٹرے کا ڈھیر جلدی سے ایک کونے میں سمیٹ دیا گیا جو کائناتی ملبے سے مختلف تھا۔

مجھے یہ سب کچھ یاد ہے۔

میز کی تتر بتر حالت دراصل اُس بڑے انتشار کا حصہ تھی جو غیر متعلق روحوں اور ماضیوں کے ڈھیر سے پیدا ہوتی ہے۔ اور جو اپنے ساتھ کمرے میں کرکیگارڈ کی ذیلی عبارتوں کا جمگھٹا بھی لے آئی تھی۔

یادداشت میں (شاید اس لئے کہ ہم چھٹی منزل میں رہتے تھے) یہ منظر ——— یہ نظروں سے اوجھل منظر۔ ایک بڑی بلندی پر ترتیب پاتا ہوا ملتا ہے۔ جیسے ہم ایک ایسے ستارے کے مکین ہوں جو شہر اور دریا کی ظلمت کے اوپر معلق ہو۔ آخر ماضی ظلمت کی ایک وسیع چادر کے علاوہ کیا ہے۔ جس میں بظاہر بے مقصدیت کے ہاتھوں مسخ شدہ لمحات چمکتے رہتے ہیں۔

(شمارہ ۱۵۳-۱۵۲-۱۹۶۷ء)

رضیہ فصیح احمد کے دو مشہور ناول
آبلہ پا　اور　متاعِ درد
ہر بک اسٹال سے مل سکتے ہیں!

لیوگی پیرانڈیلو
ترجمہ
عبدالمجید ملک

چاند میں گھوڑا

(اطالوی کہانی)

لیوگی پیرانڈیلو — LUIGI PIRANDELLO (پیدائش ۱۸۶۷ء، وفات ۱۹۳۶ء) اٹلی کا ایک نامور ناول نگار اور ڈرامہ نویس تھا۔ اس کی کئی شاہکار تخلیقات کے تراجم انگریزی میں ہو چکے ہیں۔ ۱۹۳۴ء میں اسے ادب کا نوبل پرائز بھی ملا تھا۔

(مترجم)

ستمبر میں اس بلند اور بے برگ وگیاہ چکنی مٹی کے میدان پر، جو پرخطر انداز میں افریقہ کے سمندر میں بڑھا ہوا تھا، اداس مفصلات گرمیوں کی بے رحم دھوپ سے جھلسے پڑے تھے اور ابھی تک سیاہی مائل ٹھنٹھوں کی وجہ سے جھبرے دکھائی دیتے تھے جب کہ بادام کے چند منتشر درخت اور لوڑھے زیتونوں کے چند تنے یہاں وہاں نظر آرہے تھے۔ تاہم یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ دولہا کو ممنون کرنے کے لئے عروسی جوڑے کو اپنے ماہ عسل کے کم از کم پہلے چند روز اسی جگہ پر گذارنے چاہئیں۔

دعوت ولیمہ جو ویران بنگلہ کے ایک کمرے میں منعقد ہوئی تھی مدعو مہمانوں کے لئے خوش کن بالکل نہ تھی، وہاں پر موجود تمام لوگ ابھی تک اس الجھن اور الجھن سے زیادہ مایوسی کے اس احساس سے چھٹکارا نہ پا سکے تھے جو اس فربہ اندام نوجوان کے چہرے اور اس کے برتاؤ سے پیدا ہو رہا تھا۔ وہ بمشکل بیس برس کا تھا اس کا منہ سرخی مائل تھا اور اس کی تڑپتی ہوئی سیاہ آنکھوں میں کسی پاگل کی طرح مافوق الفطرت چمک تھی، وہ اپنے اردگرد کی بات چیت سے اب بے بہرہ تھا۔ اُس نے نہ کچھ کھایا تھا نہ پیا تھا لیکن اس کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ سرخ تر اور زیادہ ارغوانی ہوتا جا رہا تھا۔

سب لوگ جانتے تھے کہ اس نے اس لڑکی سے مجنونانہ محبت کی تھی جو اب اُس کے قریب دلہن بنی بیٹھی تھی۔ یہ بھی ہر ایک جانتا تھا کہ اس نے اس لڑکی کی وجہ سے خودکشی تک کی کوشش کی تھی۔ وہ بہت امیر

تھا اور برنارڈ کی تمام جائیداد کا تنہا وارث، جب کہ دلہن محض پیادہ فوج کے ایک کرنل کی جو پچھلے سال ہی اپنی رجمنٹ کے ساتھ سسلی سے آیا تھا۔ بیٹی تھی۔ لیکن اس کے باوجود کرنل نے جس کو جزیرے کے باشندوں کے خلاف تنبیہ کی گئی تھی اس شادی کے لئے اجازت دینے میں تامل کیا تھا، کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی ان نیم وحشی لوگوں میں رہے۔

دولھا کے چہرے اور برتاؤ سے پیدا ہونے والے مایوس کن تاثرمیں اور بھی اضافہ ہوا جب مہمانوں نے اس کا مقابلہ اس کی انتہائی نوجوان دلہن سے کیا۔ وہ تو حقیقتاً ابھی بچی ہی تھی —— تروتازہ، بشاش اور بے تعلق۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ وہ ناخوشگوار خیال کو ہمیشہ ایسی زندہ دلی کے ساتھ جھٹک دیتی ہے جو بیک وقت دل فریب سادہ اور شریر ہو —— ایک ایسی شوخ اور چنچل لڑکی سا انداز جس کو دنیا کا کچھ علم نہ ہو وہ یتیم تھی اور ماں کے بغیر پلی بڑھی تھی، اور یہ تو عیاں تھا کہ وہ ازدواجی زندگی میں بغیر کسی قسم کی تیاری کے داخل ہو رہی تھی۔

وہ تمام لوگ مسکرا رہے تھے۔

لیکن جب کھانے کے بعد اس نے دولھا کی طرف مڑ کر کہا۔

"واللہ، نینو، یہ تم آنکھیں کیوں میچ لیتے ہو؟ مجھے —— نہیں یہ تو جل رہے ہیں! تمھارے ہاتھ کیوں اتنے گرم ہیں؟ دیکھیں پاپا اِس کے ہاتھ کتنے گرم ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں اس کو بخار تو نہیں ہے؟"

تو سب نے ایک سرد مہری سی محسوس کی۔

کرنل نے سنسناہٹ میں حتی المقدور کوشش کی کہ مفصلات سے آنے والے مہمان جلد سے جلد چلے جائیں۔ وہ اس نظارے کو جو اس کے خیال کے مطابق ناشائستہ تھا، ختم کرنا چاہتا تھا۔ تمام لوگ نصف درجن گاڑیوں میں اوپر تلے لد گئے۔ جس گاڑی میں کرنل اور دولھا کی بیوہ ماں سوار تھے وہ بہت آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ اور باقی گاڑیوں سے کچھ پیچھے تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نو بیاہتا جوڑا کچھ فاصلے تک پیدل شہر کی طرف جانے والی شاہراہ کے آغاز تک جانا چاہتا تھا۔

وہاں پہنچ کر کرنل جھکا اور اپنی بیٹی کے سر پر بوسہ دیا۔ وہ کھانسا اور آہستہ سے کہا:

"خدا حافظ نینو"

"خدا حافظ ادا"

دولھا کی ماں سے ہنس کر کہا۔

اور گاڑی دوسروں کو پکڑنے کے لئے خاصی رفتار سے تڑتڑاتی نکل گئی۔

وہ دونوں ایک لمحے تک وہاں کھڑے اس کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ لیکن حقیقتاً صرف ادا ہی دیکھ رہی تھی، کیونکہ نینو کچھ نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کو کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ اس کی نگاہیں اپنی دلہن پر جمی ہوئی تھیں جو اس کے ساتھ تنہا کھڑی تھی —— اس کی —— صرف اس کی —— لیکن یہ کیا؟ —— کیا

وہ رو رہی تھی؟ ——

"ڈیڈی ——"

اِدا نے الوداعی رومال لہراتے ہوئے کہا۔

"وہ، کیا تم دیکھ رہے ہو، وہ بھی ——"

"نہیں اِدا —— اِدا پیاری"

اور ہکلاتے ہوئے، تقریباً سسکیاں بھرتے ہوئے اور شدت سے کانپتے ہوئے، نینو نے اس کو بغل گیر کرنے کی کوشش کی ——

اِدا نے اس کو ایک طرف دھکیل دیا۔

"نہیں براہ کرم مجھے چھوڑ دو"

"میں تو تمھاری آنکھیں خشک کرنا چاہتا تھا"

"شکریہ پیارے۔ میں خود ہی خشک کر لوں گی"

نینو شش و پنج میں کھڑا تھا۔ جب وہ اس کو دیکھ رہا تھا تو اس کا چہرہ قابلِ رحم تھا اور اس کا منہ ادھ کھلا۔

اِدا نے اپنی آنکھیں خشک کر لیں۔

"لیکن کیا بات ہے"

اُس نے نینو سے پوچھا۔

"تم سر سے پاؤں تک کانپ رہے ہو۔ نہیں۔ نہیں نینو۔ خدا کے لئے نہیں —— اس طرح مت کھڑے ہو۔ تم مجھے مضحکہ انگیز لگتے ہو —— اور اگر میں ایک بار ہنسنا شروع کر دوں تو تمھیں معلوم ہے کہ میں کبھی بس نہ کروں گی۔ ایک منٹ ٹھیرو میں تمھیں ہوشیار کرتی ہوں"

اس نے اپنے ہاتھ اس کی کنپٹیوں پر رکھے اور اس کی آنکھ میں پھونک ماری۔ ان انگلیوں کے لمس اور ان ہونٹوں سے آنے والے سانس سے اس نے یوں محسوس کیا گویا اس کی ٹانگیں جواب دے رہی ہوں۔ وہ ایک گھٹنے پر گرنے ہی والا تھا، لیکن اِدا نے اس کو سیدھا پکڑے رکھا، اور زور سے ہنس پڑی۔

"شاہراہ پر ہی؟ پاگل ہوئے ہو کیا؟ آؤ چلیں —— ادھر اس چھوٹی سی پہاڑی کو دیکھو۔ ہم وہاں سے اب بھی گاڑیوں کو دیکھ سکیں گے۔ آؤ چل کر دیکھیں"

اور اس نے اس کو ایک بازو سے پکڑ کر پرجوش انداز میں گھسیٹا۔ اردگرد کے دیہی علاقے سے جہاں بہت سا گھاس پھوس اور وقت کے ہاتھوں منتشر شدہ کئی چیزیں پژمردہ پڑی تھیں۔ گرم ہوا پر کثیف اور قدیم پیاس چھا رہی تھی۔ جس میں نلائی کے کھیتوں میں چھوٹی چھوٹی ڈھیریوں میں تخمیر کے لئے رکھی کھاد کی گرم اور بوجھل باس تھی اور ساج اور خورد پودینے کی تیز خوشبو —— اس کثیف پیاس، اس گرم اور بوجھل باس اور اس چبھنے والی خوشبو کا صرف اس کو ہی شعور تھا۔

وہ جب بھاگتی جارہی تھی تو وہ سن سکتی تھی کہ گنجان جھاڑیوں کے پیچھے سے اور جلے ہوئے ٹھنٹھوں کے کھردرے اور زرد گچھوں کے درمیان سے جنڈول کتنی شگفتگی کے ساتھ گا رہے ہیں۔ اس پراسرار خاموشی میں دور محلے کے کوٹھوں سے آنے والی مرغوں کی الہامی بانگیں بھی سنائی دیتی تھیں، اور بار بار وہ اپنے آپ کو قریبی سمندر سے آنے والی خنک اور صاف ہوا میں لپٹا محسوس کرتی جو بادام کے درختوں پر باقی ماندہ تھکے ہوئے زرد پتوں اور زیتون کے گچھوں میں لگے نوکیلے اور خاکستری پتوں کو جنبش دے جاتی تھی۔

انھیں پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ لیکن وہ اس دوڑ سے اتنا تھک چکا تھا کہ اس سے اب کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ وہ بیٹھ جانا چاہتا تھا، اور اس نے اِدا کو بھی اس کی کمر میں بازو ڈال کر اپنے قریب ہی زمین پر بٹھانے کی کوشش کی۔

لیکن اِدا نے یہ کہہ کر اس کو ٹال دیا۔

"پہلے مجھے ایک نظر دیکھ لینے دو۔"

اس کو اب اندرونی طور پر بے چینی کا احساس ہونے لگا تھا، لیکن وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کی عجیب اور انوکھی سرکشی سے دق ہوکر وہ ایک جگہ نہ ٹھیر سکتی تھی نہ تھمنا چاہتی تھی۔ بلکہ وہ اور آگے بھاگنا چاہتی تھی! وہ اس کو جھنجوڑنا چاہتی تھی اس کا بھی اور اپنا بھی شام تک دھیان بٹائے رکھنا چاہتی تھی۔

نیچے، پہاڑی کی دوسری طرف، ایک تباہ شدہ میدان پھیلا ہوا تھا گویا ڈنٹھلوں کا سمندر ہو۔ اس میں کہیں کہیں سیاہ لہروں میں راکھ بکھری ہوئی تھی۔ کبھی کبھی یہ خام زرد چمک خاردار جھاڑیوں یا میلٹھی کے جھنڈوں سے ٹوٹتی دکھائی دیتی تھی۔ دور، گویا اس وسیع بحر زرد کے دوسرے ساحل پر، ایک بستی کی چھتیں بلند و بالا اور گہرے رنگ کے مکانوں کے اوپر نظر آرہی تھیں۔

اور اب اِدا نے اپنے شوہر کے سامنے وہاں اس بستی تک جانے کی تجویز پیش کی۔ کتنی دیر لگے گی؟ ایک گھنٹہ یا اس سے کم۔ ابھی بمشکل پانچ ہی بجے تھے، لوا جی بنگلے میں ابھی تک نوکر چیزیں ہٹا رہے ہوں گے۔ وہ شام سے پہلے گھر پہنچ جائیں گے۔

نینو نے مخالفت میں کمزور سی کوشش کی ــــ لیکن اس نے اس کو ہاتھوں سے پکڑا اور کھینچ کر کھڑا کردیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ کسی جوان غزال کی طرح سبک اور تیز پہاڑی کی طرف سے نیچے ڈنٹھلوں کے اس سمندر میں بھاگتی جارہی تھی۔

وہ اتنا تیز نہ تھا کہ اس کے ساتھ قدم ملا سکتا۔ لیکن ــــ ہمیشہ سے زیادہ سرخ چہرہ لئے، اور بظاہر حیران سا اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ وہ پسینے میں شرابور ہوچکا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے اس کو ٹھہرنے کے لئے اور ہاتھ پکڑانے کے لئے آوازیں دے رہا تھا۔

"مجھے اپنا ہاتھ تو پکڑا دو۔ کم ازکم اپنا ہاتھ تو پکڑنے دو۔"

وہ چلّایا۔

اچانک اُس نے ایک چیخ ماری اور ٹھہر گئی۔

کائیں کائیں کرتے پہاڑی کوّوں کا ایک جھرمٹ اس کے سامنے سے اڑا تھا۔ اور اس کے سامنے زمین پہ ایک مردہ گھوڑا پڑا ہوا تھا۔ مردہ؟ نہیں نہیں، وہ مردہ تو نہ تھا، اُس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اوہ خدایا! کیسی آنکھیں تھیں وہ؟ عجیب آنکھیں! وہ محض ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا، اف وہ پسلیاں اور وہ گوُھے!

نینو غصے میں بھرا ہوا جھنجھلاتا ہوا اس کے قریب آیا۔

"آؤ چلیں، واپس چلیں فوراً!"

"یہ زندہ ہے۔ دیکھو تو!"

اِدا رحم سے کانپتے ہوئے چلّائی۔

"اس کا سر اٹھاؤ۔ خدایا کیسی آنکھیں ہیں! دیکھو نینو۔"

"ہاں، ہاں ـــ"

وہ اب بھی ہانپتے ہوئے بولا:

"وہ ابھی اس کو یہاں ڈال گئے ہیں۔ چھوڑو اس کو۔ آؤ چلیں۔ کیسا منظر ہے! تمھیں بو نہیں آرہی ــ"

"اور وہ غراب!"

اس نے جھرجھری لے کر کہا۔

"کیا وہ اسے زندہ ہی کھا جائیں گے؟"

"لیکن۔ اِدا۔ خدارا!"

اُس نے اپنے ہاتھ مسلتے ہوئے التجا کی۔

"بس نینو بس!" وہ چلّائی۔

اِدا کے لئے اس کی حماقت اور پشیمانی ناقابلِ برداشت تھی۔

"مجھے جواب دو! اگر وہ اسے زندہ کھا جائیں تو کیا ہوگا؟"

"مجھے کیا معلوم کہ وہ اسے زندہ کھائیں گے یا وہ انتظار کریں گے ـــ"

"حتیٰ کہ وہ وہاں مر جائے! بھوک سے، پیاس سے؟"

اس کا چہرہ خوف اور ترس سے کھنچا ہوا تھا۔

"محض اس لئے کہ وہ بوڑھا ہے اور وہ اب کام نہیں کر سکتا؟ آہ بے چارا جانور! کتنی شرم کی بات ہے۔ کتنی شرم کی بات! کیا ان کسانوں کے سینوں میں دل نہیں ہوتا۔ اور تم جو وہاں اس طرح کھڑے ہو، کیا تمھیں رحم نہیں آتا؟!"

"معاف کرنا۔" اس نے برہم ہوتے ہوئے کہا۔ "تم ایک جانور سے تو اتنی ہمدردی محسوس کرتی ہو ـــ لیکن ــ"

"تو کیا مجھے نہیں کرنی چاہیے؟" اُس نے بات کاٹ دی۔

"لیکن تمھیں مجھ سے بالکل ہمدردی نہیں ہے!"

"تو کیا تم کوئی جانور ہو؟ کیا تم ڈنٹھلوں میں بیٹھے بھوک اور پیاس سے مر رہے ہو؟ تم سمجھتے ہو — اوہ ان کوّوں کو تو دیکھو۔ نینو ادپر ان چکّر کاٹنے والوں کو دیکھو۔ اوہ کیسی خوف ناک، شرمناک اور وحشی چیز ہے دیکھو۔ آہ بے چارا جانور! اس کو اٹھانے کی کوشش کرو۔ آؤ نینو آٹھو۔ ہو سکتا ہے وہ ابھی چل سکتا ہو! نینو اٹھو میری مدد کرو — کچھ ہوش کرو۔"

"لیکن تم مجھ سے کیا کروانا چاہتی ہو؟"

وہ مشتعل ہو کر بھرا۔

"کیا تم یہ توقع رکھتی ہو کہ میں اس کو گھسیٹ کر واپس لے جاؤں؟ اپنے کندھوں پر اٹھاؤں؟ گھوڑے کا کیا ہے؟ تمہیں کیسے وہم ہے کہ وہ چل سکے گا؟ دیکھ نہیں رہی ہو کہ وہ نیم مردہ ہے؟"

"لیکن اگر ہم اس کے لئے کھانے کی کوئی چیز لے آئیں تو؟"

"اور پینے کی بھی؟ ہیں!"

"اوہ نینو تم ظالم ہو۔"

اور اِدا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اپنی جھرجھریوں پر قابو پاتے ہوئے وہ نہایت آہستگی سے گھوڑے کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے لئے جھکی۔ جانور انتہائی کوشش کے بعد گھٹنوں پر اٹھ بیٹھا تھا اور آخری، زبوں اور کربناک حالت میں بھی اس کے سر اور گردن کی شان دار خوبصورتی دکھائی دے رہی تھی۔

نینو نے شاید اپنی رگوں میں کھولتے خون کی وجہ سے یا اس تلخی اور نفرت کی وجہ سے جس کا اظہار اِدا نے کیا تھا یا شاید اس لیسینے کی وجہ سے جو اس کے جسم سے بہہ رہا تھا، اچانک یہ محسوس کیا کہ اس کا سانس جواب دے رہا ہے۔ اس کا سر چکرانے لگا، اس کے دانت کٹکٹانے لگے، اور اس کو اپنے پورے جسم پر پر اسرار کپکپاہٹ کا احساس ہوا۔ اس نے بے اختیار اپنے کوٹ کا کالر اوپر اٹھا لیا، اور جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور دل گیر اداسی کے ساتھ تھوڑی دور ایک چٹان پر گٹھری سا بن کر بیٹھ گیا۔

سورج پہلے ہی غروب ہو چکا تھا، اور دور شاہراہ سے گھوڑوں کی گھنٹیوں کی کبھی کبھی آنے والی آواز سنائی دے رہی تھی۔

اس کے دانت کٹکٹا رہے تھے؟ کیونکہ اس کی پیشانی جل رہی تھی۔ اس کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون اس کو ڈس رہا تھا۔ اور اس کے کانوں میں شور مچا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ دور بجنے والی بہت سی گھنٹیوں کی آواز سن رہا ہو — وہ ساری پریشانی، وہ امید کا درد، اس کی سرد مہری اور تلوّن، وہ آخری دوڑ، اور ادھر پڑا ہوا وہ گھوڑا، وہ قابلِ نفرت گھوڑا — اوہ خدایا — کیا یہ ایک خواب ہی ہے؟ ایک خواب، بھیانک خواب؟ اس کو بخار تو نہیں تھا؟ یا شاید اس سے بھی کوئی بری بیماری؟ آہ! کتنا اندھیرا تھا۔ خدایا کتنی تاریکی!

اور اب اس کی نظر دھندلا رہی تھی۔ اُس نے پکارنے کی کوشش کی۔

"اِدا — اِدا —"

لیکن وہ اپنے خشک منہ سے الفاظ نہ ادا کر سکا۔

اِدا کہاں تھی؟ وہ کیا کر رہی تھی۔

وہ دور کے گاؤں، گھوڑے کے لئے مدد حاصل کرنے چلی گئی تھی۔ اُس نے رُک کر یہ بھی نہ سوچا تھا کہ کسان اس جانور کو وہاں مرنے کے لئے ہی لاتے تھے۔

وہ اکیلا اس چٹان پر بیٹھا بڑھتی ہوئی کپکپاہٹ کا شکار ہوتا رہا، اور جب وہ وہاں کسی بہت بڑے الّو کی طرح سمٹا بیٹھا تھا تو اچانک اُس نے ایک نظارہ دیکھا جو ——— آہ! ہاں ——— اب وہ اس کو صاف دیکھ سکتا تھا ——— ایک خبیث نظارہ، گویا وہ کسی اور دنیا سے تعلق رکھتا ہو۔

چاند ——— ایک عظیم الجثہ چاند "ڈنٹھلوں کے سمندر کے پیچھے سے آہستہ آہستہ بلند ہوتا ہوا، اور اس بہت بڑی دھندلی تانبے کی ٹکیا کے سامنے سے اس گھوڑے کا سیاہ ہٹیلا سر ابھی گردن پھیلائے منتظر ——— شاید وہ ہمیشہ سے اسی طرح تانبے کی قرص پر ٹکا ہوا انتظار کر رہا تھا۔ اوپر بہت اوپر آسمان پر چکر کاٹنے والے کوّوں کی کائیں کائیں اب بھی سنائی دے رہی تھی۔

جب ادا، غصّہ سے بھری اور مایوس، میدان میں اپنا راستہ ٹٹولتی ——— "نینو! نینو!" ——— پکارتی واپس آئی۔ اس وقت تک چاند بلند ہو چکا تھا۔

گھوڑا اگر چکا تھا، جیسے مر چکا ہو۔

اور نینو ——— نینو کہاں تھا؟ اوہ، وہ تو ادھر زمین پر پڑا تھا۔

کیا وہ وہاں نیند میں ڈوب گیا تھا؟

وہ بھاگ کر اس کے پاس گئی، اور اس کے گلے سے نزع کی خرخراہٹ سنی۔ اس کا چہرہ بھی زمین پر تھا، وہ تقریباً سیاہ ہو چکا تھا، اور اس کی نیم وا آنکھیں پھولی ہوئی اور خونیں تھیں۔

"اوہ خدایا!!"

اس نے غشی کی سی حالت میں اپنے ارد گرد دیکھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ گھوے جس میں اُس نے چند خشک دانے پکڑے ہوئے تھے جو وہ اس بستی سے گھوڑے کو کھلانے کے لئے لائی تھی ——— گھبرا کر اس نے چاند کو دیکھا پھر گھوڑے کو اور پھر ——— زمین پر پڑے ہوئے اس آدمی کو ——— گویا وہ مردہ ہو ——— اُس پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ کیونکہ اس کو شبہ ہوا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہی ہے غیر حقیقی ہے۔

خوف زدہ ہو کر وہ واپس اس بنگلے کی طرف بھاگی دیوانہ وار۔

وہ گلے کی پوری طاقت سے اپنے باپ کو آوازیں دے رہی تھی ——— اپنے باپ کو کہ وہ آئے، اور اس کو یہاں سے لے جائے ——— آہ اے خدا! اس آدمی سے دور جو اس کا شوہر تھا، اور جس کے گلے سے خرخراہٹ کی آواز نکل رہی تھی ——— جاں کنی کے اس عالم میں ——— جس کو وہ نہیں سمجھ سکتی تھی ——— اور اس گھوڑے سے دور ——— اس چاند سے اور جو زمین پر اُتر آیا تھا ——— اور آسمان پر کائیں کرتے ان کوّوں سے دور بہت دور ———!!

(شمارہ ۲۱۴ سنہ ۷۹ء)

افکار

کی ۲۵ویں سالگرہ پر

دلی مبارکباد
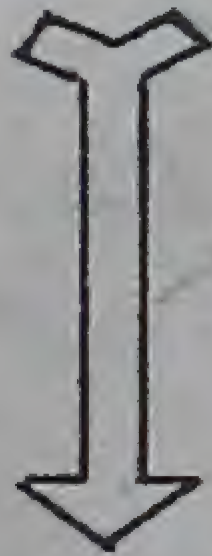
محمد فاروق ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

جوبلی انشورنس ہاؤس

آئی آئی چندریگر روڈ (میکلوڈ روڈ) کراچی

فون: ۲۳۱۵۲۳ - ۵۵ / ۲۳۸۸۵۱ -

تار کا پتہ :- "فاروق ٹیکس"

علامہ اقبال کی سوانح کا
ایک اچھوتا اور گمشدہ ورق

اقبالؒ اور بھوپال

جس میں
غیر مطبوعہ تحریریں، علامہ اقبال کی دستخطی تصانیف، دارالاقبال بھوپال کے بارے میں مستند اور نئے واقعات، حدیث قدسی اور دیگر نیاز مندان بھوپال کی علامہ اقبال سے ملاقات کی تفصیلات اور کئی منفرد تصاویر پہلی بار پیش کی جا رہی ہیں!

صہبا لکھنوی کی ۸ سال کی تحقیق و کاوش کا حاصل

تیاری کی آخری منزلوں میں

افکار

پاکستان کا واحد ماہنامہ ہے ..... جو محکمہ ہائے تعلیمات کراچی، لاہور، راولپنڈی پشاور، کوئٹہ اور جنرل ہیڈ کوارٹرز آرمی ایجوکیشن سے منظور شدہ ہے۔

اور

ملک بھر کی یونیورسٹیاں، کالج اور اسکول لائبریریاں اس کی خریدار ہیں

تقریباً ۵۰،۰۰۰ اہل ذوق
ہر ماہ افکار سے استفادہ کرتے ہیں

مقصود الٰہی شیخ
کی خوب اور خوب صورت
کہانیوں کا مجموعہ

پتھر کا جگر

خوب صورت گیٹ اپ۔ صفحات: ۱۶۰
قیمت: ۲/۵۰ روپے
ملنے کا پتہ: الفاروق پریس
مقابل گورنمنٹ کالج برائے خواتین
نیو ٹاؤن روڈ، کراچی ۵

اردو رسائل کی تاریخ میں ایک اہم اور یادگار نام

ماہنامہ **نیرنگِ خیال** راولپنڈی

جس نے خاص نمبر نکالنے کی طرح ڈالی

جس نے ہر دور میں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی

عید نمبر، موسیقی نمبر، اقبال نمبر

چینی افسانہ نمبر —— اور —— تاثیر نمبر

کے بعد اب

غزل نمبر

پیش کر رہا ہے

جس میں ۱۹۴۷ء سے اب تک پاکستان میں اردو غزل کے مختلف گوشوں اور خد و خال کا مکمل جائزہ ہوگا۔ اور بیش بہا مقالات۔ مشاہیر سے انٹرویو۔ غزل کی تاریخ اور تدریجی ارتقاء پر مضامین اور شعراء کے حالات اور بے شمار خوبیوں کی بدولت

"نیرنگِ خیال" کا "غزل نمبر"

اردو کی تاریخ میں بلا مبالغہ سنگ میل ثابت ہوگا

خط و کتابت

"نیرنگِ خیال" ۱۳-بی لیاقت روڈ راولپنڈی

GIRLS COL... SRINAGA... ACC. NO. 15927 LIBRARY

مکتبہ افکار کی ایک اور فخریہ پیش کش

غالب - ایک صدی

مرتبہ: صہبا لکھنوی

حیات غالب پر ایک مستند کتاب جو صدیوں غالب شناسوں، تحقیقی کام کرنے والوں اور طلبہ وطالبات کی رہنمائی کرے گی۔ غالب کی زندگی، شخصیت اور فن کے ہر پہلو پر محیط ایک لازوال ادبی دستاویز۔

صفحات تقریباً ۱۰۰۰ - بہترین گیٹ اپ - متعدد یادگار تصاویر

تخمینی قیمت: -/۲۵ روپے

تیاری کی آخری منزلوں میں ہے

اپنا آرڈر بک کرا دیجئے

مکتبہ افکار - رابسن روڈ - کراچی

محسن بھوپالی

کے تاریخ ساز اور مقبول عام

قطعات کا مجموعہ

جستہ جستہ

ہر بک اسٹال سے مل سکتا ہے

بیسویں صدی کے آخری مزاح نگار

راجہ مہدی علی خاں

کی

آخری نظمیں

مرتبہ: انور سدید

قیمت: ایک روپیہ پچیس پیسے

ملنے کا پتہ:

مکتبہ اردو زبان - سرگودھا

آپ کی لائبریری کے لئے

مکتبۂ افکار اور اردو دنیا کی خوب اور خوبصورت کتابیں

اسلامیات

سیرت رسول اللہ — پروفیسر سید نواب علی — ۱۲/-
تاریخ صحف سماوی — ” — ۵/-
معارج الدین — ” — ۴/۷۵

ناول و افسانہ

حیدری کی مختصر کہانیاں — ڈاکٹر عبادت بریلوی — ۶/-
چاندی کا گھاؤ — کرشن چندر — ۹/-
ایک وائلن سمندر کے کنارے — ” — ۶/-
سڑک واپس جاتی ہے — ” — ۶/۷۵
ایک عورت ہزار دیوانے — ” — ۵/-
ایک خوشبو اڑی سی — ” — ۵/۲۵
دھواں دھواں سویرا — انور عظیم — ۸/-
اک بوند لہو کی — جوگندر پال — ۴/۲۵

شخصیت و فن

مجاز ایک آہنگ (باضافہ)
دوسرا ایڈیشن — مرتبہ: صہبا لکھنوی — ۱۵/-
جوش نمبر — ” — ۳۱/-
حفیظ نمبر — ” — ۱۰/-
فیض نمبر — ” — ۱۲/-

شاعری

نبض دوراں — پروفیسر شور علیگ — ۶/-
سی حرفی — مختار صدیقی — ۴/۵۰

تنقید و تحقیق

تنقیدی تجربے — ڈاکٹر عبادت بریلوی — ۱۰/-
جدید شاعری — ” — ۱۵/-
مومن اور مطالعۂ مومن — ” — ۱۵/-
ہفت گلشن — ” — ۴/-
شاعری اور شاعری کی تنقید — ” — ۱۲/-
رسالۂ کائنات — ” — ۲/-
مادھونل اور کام کندلا — ” — ۵/-
شکنتلا — ” — ۳/-
تہذیب و تحریر — مجتبیٰ حسین — ۵/-

سفرنامہ

میرے خوابوں کی سرزمین
مشرقی پاکستان — صہبا لکھنوی — ۴/-

زیر ترتیب

غالب ایک صدی — مرتبہ: صہبا لکھنوی

لائبریریوں اور انفرادی خریداروں کے لئے محصول ڈاک کی رعایت
آج ہی طلب فرمائیں

مکتبۂ افکار۔ رابسن روڈ۔ کراچی

ریکارڈ

کس کا؟ دی اسٹینڈرڈ انشورنس کمپنی کا

کیا؟ ۲۷ لاکھ ۸۵ ہزار روپے بطور پریمیم حاصل کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا

کب؟ اپنے قیام کے پہلے بارہ مہینوں میں

کیونکر؟ بیمہ داروں کے تعاون کے باعث

کیسے؟ بیمہ داروں کے مفاد کو ترجیح دے کر!
نئے اور بے مثال منصوبے پیش کر کے
بے مثال خدمت سے
ہر بیمہ دار پر انفرادی توجہ دے کر
مستقبل پر نظر رکھ کر

دی اسٹینڈرڈ انشورنس کمپنی لمیٹڈ

The Standard

ابتدا ہی سے صفِ اوّل میں